FICTION HOUSE

(ناول)

زمین زاد

ڈاکٹر نذر الاسلام

مترجم: ریاض اختر

زمین زاد

(ناول)

ڈاکٹر نذر الاسلام

مترجم: ریاض اختر

فکشن ہاؤس

لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد

e-mail: fictionhouse1991@gmail.com

"Son of The Soil"
by: Nazrul Islam

نام کتاب	:	زمین زاد (ناول)
مصنف	:	ڈاکٹر نذرالاسلام
مترجم	:	ریاض اختر
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرز	:	فکشن ہاؤس لاہور
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	ریاض ظہور
اشاعت	:	2021ء
قیمت	:	1200/-

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، فون: 36307551-36307550-042
فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدرآباد، فون: 2780608-022
فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 32603056-021

فکشن ہاؤس
لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد
e-mail: fictionhouse1991@gmail.com

عرض مترجم

ناول Son of the Soil اتفاقاً خریدا گیا۔ ہوا یہ کہ میں ایک کتاب میلے میں کتابیں خرید رہا تھا کہ اس پر نظر پڑی۔ ناول کے ٹائٹل کے نیچے مصنف کا نام لکھا تھا: ''نذرالاسلام''۔ مزید کچھ دیکھے بغیر اس گمان میں خرید لیا کہ بنگال کے انقلابی شاعر نذرالاسلام کی داستانِ حیات ہے۔ گھر آ کر ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ یہ کسی نذرالاسلام کا تحریر کردہ ناول ہے۔ میں نے پڑھے بغیر رکھ دیا کہ تقریباً پونے آٹھ سو صفحات پڑھنا شاید تضیعِ اوقات ثابت ہو۔ چند ماہ گزر گئے۔ ایک دن سوچا کہ چلیں، وقت گزاری کے لیے اس کا مطالعہ ہی سہی۔

ناول 2005 میں بھارت سے شائع ہوا تھا۔ ناول نگار نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ اس کے بنگالی ناول ''بھومی پترا'' کا انگریزی ترجمہ ہے، اور ترجمہ بھی خود اس نے کیا ہے۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ بنگالی ناول اگر اسی سال نہیں تو شاید ایک برس پہلے شائع ہوا ہوگا۔ نذرالاسلام نے دیباچہ میں وضاحت کی کہ اپنے ضخیم بنگالی ناول کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے اس نے متعدد واقعات اور باتوں کو حذف کرتے ہوئے ایک خلاصہ رہنے دیا ہے۔ اندازہ کرنا پڑا کہ اگر خلاصہ پونے آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے تو اصل ناول کی ضخامت کیا ہوگی۔

چند صفحات پڑھنے کے بعد کہانی، واقعات اور اسلوب نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی رہی، فیصلہ کرنا مشکل ہوتا گیا آیا ناول نیم سوانحی، نیم تاریخی ہے یا سراسر داستان گوئی۔ اس میں مختلف واقعات، شخصیات اور کتابوں کا، مع صفحہ نمبر، حوالہ دیا گیا ہے۔ متحدہ بنگال کی سیاست اور تقسیم ہند کے واقعات، مثلاً بابری مسجد کے تنازعے کو بیان کرتے ہوئے نذرالاسلام نے مقامات اور تاریخوں کے حوالوں سے ناول کو کم وبیش ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت بھی دی ہے۔ ہر ناول بنیادی طور پر داستان گوئی ہے جس میں ناول نگار زیادہ تر تخیلات اور کہیں کہیں من گھڑت باتوں کے خوبصورت امتزاج سے کہانی کا تار و پود بنتا ہے۔ بلاشبہ اس میں اظہارِ ذات اور تاریخی واقعات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے، تاہم ناول کو تاریخی اور تحقیقی کتابوں کی صف سے علیحدہ ہی رکھا جاتا ہے۔

ناول کے مرکزی کردار ''کمال'' کی پیدائش مغربی بنگال کے ضلع مقصود آباد کے ایک انتہائی پسماندہ اور غربت زدہ گاؤں بسنت پور کے ایک مسلم گھرانے میں ہوئی۔ اس گاؤں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن چند رسموں یعنی صوم و صلوۃ اور عیدین کی نمازوں کے علاوہ اسلام سے ان کا تعلق واجبی اور لفظی تھا۔ کمال کے بڑے بزرگ ہندوؤں کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے اور اعلیٰ جاتی ہندوؤں کے قائم کردہ ذات پات کے نظام میں غیر انسانی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ ایک مسلمان بزرگ کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے لیکن ان میں اسلام کی حقیقی روح پیدا نہ ہو سکی۔ کمال ایک متجسس ذہن کا حامل طالب علم تھا جس نے قرآن اور مسلمانوں کی رسمی عبادات پر غور کیا تو مذہب میں اس کی دلچسپی کم ہو گئی۔ بعد ازاں ہندو دھرم کی کتابیں پڑھ کر وہ ایسی شدید الجھن میں مبتلا ہوا کہ سیکولرازم، بلکہ الحاد میں پناہ ڈھونڈی۔

اسکول اور کالج میں ہندو طلباء کا رویہ، مسلمانوں سے تعصب اور بنکم چٹرجی کے مشہور ناول ''آنند مٹھ'' نے کمال

کے خیالات میں ہیجان بپا کر دیا کیونکہ اس ناول کی کہانی نے ہندوؤں کے دلوں میں مسلم دشمنی کی چنگاری کو ہوا دینے، اور بالخصوص نظم ''بندے ماترم'' ترانے نے آگ بھڑکانے میں ایک کردار ادا کیا تھا۔ اگر چہ چند ہندو اساتذہ نے کمال کے دل سے خدشات دور کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی گفتگو بے جان اور غیر مدلل تھی۔ ہاں البتہ ایسے بھی غیر متعصب اساتذہ ملے جنھوں نے بنکم چٹرجی کی انتہا پسندی کا اعتراف کیا۔ کمال نے آنند مٹھ کا تحقیقی نگاہ سے تجزیہ کیا اور جذباتیت کو تج کرتے ہوئے بار بار ایک ہی سوال پوچھا کہ اس میں تو تحریکِ آزادی کی بجائے ہندوؤں کی مسلمانوں سے مخاصمت اور تعصب، اور مسلمان راج کی بجائے انگریزوں کی حکمرانی کو پختہ کرنے اور طول دینے کی خواہش نمایاں ہے۔ اس کے ثبوت میں اس نے آنند مٹھ سے متعدد اقتباسات نقل کیے ہیں جس کا مطالعہ قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

ناول میں ان عوامل کا جائزہ لیا گیا ہے جن کے سبب بنگال جیسے مسلم اکثریتی صوبے میں صدیوں سے مسلمانوں کی حکومت کے باوجود تعلیمی، معاشی اور انتظامی میدانوں میں ہندوؤں کو واضح برتری حاصل رہی۔ بالخصوص جنگِ پلاسی کے بعد بنگال میں مسلمانوں کے زوال میں اپنوں کی سازش کے علاوہ نوابوں کی بد انتظامی اور ہندوؤں کے ساتھ گہری وابستگی کا بیان بھی ہے، اور نوابین بھی وہ جن کا تعلق کبھی بھی بنگال سے نہیں رہا۔

Son of the Soil کی کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے ہمیں سماجی معاملات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت انگیز دوری کے متعدد واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ امکان ہے کہ کمال نے کہیں کہیں رنگ آمیزی اور داستان گوئی کا سہارا لیا ہوگا لیکن ناول کی مجموعی فضا حقائق کے ناقابلِ تردید شواہد کا اظہار ہے۔ انتہائی غربت اور عسرت کے باوجود کمال اپنے جنونِ علم کی تسکین اور ایک مشہور سائنسدان بننے کی خواہش لیے ان تھک محنت، فاقہ کشی اور میلوں پیدل چلنے کا کشٹ اٹھائے دھیرے دھیرے منزل کے نزدیک پہنچ رہا ہے۔ اگرچہ اسے ایک خاندان کی طرف سے مالی معاونت کی پیشکش ہوتی ہے لیکن اس کی خودداری اور بے لچک طبیعت کو گوارا نہیں۔ خود انحصاری اور مالی ترغیبات سے بے اعتنائی کا جذبہ اسے چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کے بعد بالآخر انڈین پولیس سروس میں پہنچاتا ہے۔

ناول کے ہیرو نے پولیس اہلکاروں کی تربیت، عملی میدان میں ان کے طریقۂ تفتیش، سیاستدانوں کی بدمعاملگیوں، انتظامیہ میں دخل اندازی اور قانون شکن عناصر کے ساتھ ان کے گٹھ جوڑ کو جتنی تفصیل سے بیان کیا ہے اس سے قاری کو یقین ہوتا ہے کہ یا تو وہ خود اس شعبہ سے تعلق رکھتا ہے یا ناول کی بنت کے لیے اس نے گہرے مطالعہ اور مشاہدہ سے کام لیا ہے۔

دورانِ تعلیم کمال تاریخِ ہند اور بالخصوص تاریخ بنگال کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتا ہے جس میں تقسیم ہند سے قبل کی سیاست پر اس کی خاص توجہ ہے۔ ناول میں ایک عام قاری کے لیے اس دور کی سیاست کو سمجھنے کا قابلِ ذکر مواد ہے۔ دو قومی نظریہ اور مطالبۂ پاکستان پر ہماری کتابیں ہر پہلو سے روشنی ڈالتی ہیں لیکن غور کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تحریکِ پاکستان کا سارا زور اور جدو جہد ہندوستان کے وسطی صوبوں تک محدود تھی، بنگال کا ذکر کم کم ہی آتا ہے۔ بنگال کے وہ مسلمان سیاستدان جنھوں نے 1940 کے بعد قیامِ پاکستان کی حمایت میں بہت کام کیا، ان کی اکثریت ایک متحدہ بنگال کی حامی تھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حالات کی تند و تیز اور متلاطم خیز لہروں کا بہاؤ ان سب کو قائدِ اعظم کی قیادت تلے لے آیا تھا۔ اگرچہ ناول نگار تقسیم ہند کے ناقدین میں سے ہے پھر بھی ایک دو مقامات پر قائد کی دور اندیشی اور ژرف بینی کا اعتراف کھلے الفاظ میں کرتا ہے۔

ملازمت کے دوران کمال کو مکان کے حصول میں جن تعصبات کا سامنا کرنا پڑا اس سے بھارت میں مسلمانوں کے بارے میں ہندوؤں کے معاندانہ اور متعصبانہ رویے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اگر چہ یہاں اسے انسان دوست اور غیر

متعصب ہندو بہی خواہوں کے دوستانہ برتاؤ کا بھی اعتراف ہے لیکن دل شکنی اور غیریت کی روح سلگانے والی حدت زیادہ واضح ہے۔ انڈین پولیس سروس جیسی باعزت اور طاقتور سروس کا تمام عرصہ کمال کی دیانتداری، اصول پرستی اور اپنی عزتِ نفس کی وجہ سے کانٹوں کی راہ بنا رہا۔ ناول کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہیرو کمال پر بھارت دشمنی، اسے آئی ایس آئی کے ایجنٹ پر طور پر بدنام کرنے کی کوشش، اور سیاست کے کریہہ چہرے کی نقاب کشائی ایک ایماندار پولیس آفیسر کے لیے کانٹوں کی راہ نہیں بلکہ دہکتے کوئلوں پر برہنہ پا چلنے کی روداد ہے۔ دورانِ ملازمت اس کے ساتھ روا رکھے جانے والے متعصبانہ سلوک اور عام سرکاری زبان میں ''کھڈے لائن'' لگانے کی کہانی بھارت کی جمہوری اور سیکولر حکومت کے خلاف ایک چارج شیٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ناول میں بھارتی سیکولرازم، بابری مسجد کا تنازعہ، رتھ یاترا، ایک ہندوتا ریاست کے لیے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے میں خود حکومتی اعانت کے دلخراش واقعات بڑی بے باکی سے بیان کئے گئے ہیں۔ کمال نے جذبات کی رو میں بہنے سے گریز کرتے ہوئے واقعات اور شخصیات کا غیر جانبداری سے تجزیہ کیا ہے۔ وہ دین، دھرم، مسلک اور تعصبات سے بالاتر ہو کر صرف دھرتی کے ساتھ اپنی جرأت اور کمٹمنٹ کا قائل ہے۔ اصول پسندی اور صاف گوئی کا اظہار ناول میں جگہ جگہ پڑھنے کو ملتا ہے جو افسانہ طرازی نہیں بلکہ ناول نگار کی زندگی کا حقیقی رخ ہے جس پر اسے بھارتی میڈیا میں تنقید اور تحسین، دونوں پہلوؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول میں متعدد جگہوں پر اس نے ہندودیش میں مسلمانوں پر روا رکھے جانے والے برتاؤ، جانبدارانہ رویّوں اور حق تلفیوں کی واضح نشاندہی کی ہے۔ قاری کو ان میں جذباتیت کی بجائے واقعیت کا رخ نمایاں دکھائی دیتا ہے کیونکہ تمام واقعات کی تصدیق کے لیے مجھے مستند کتابوں کی مدد لینا پڑی، نتیجتاً کہیں بھی ان میں مبالغہ آمیزی یا جانبداری نظر نہیں آئی۔

ناول کے متعدد مقامات قاری کو اجنبیت کا احساس نہیں دلاتے۔ انتظامی امور میں سیاستدانوں کی دخل اندازی، قانون شکن عناصر سے ان کا گٹھ جوڑ، ان کی پشت پناہی، اس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے والی کیفیت، ایماندار افسروں کو اپنی راہ میں لگانے پر ناکامی کے بعد ''کھڈے لائن'' لگانا، ان کی ترقی اور آگے بڑھنے کی راہ میں روڑے اٹکانا، ایک پاکستانی قاری انہیں پڑھ کر چونکتا نہیں کیونکہ یہ سب ایسے ہماری اپنی داستان کی بازگشت ہیں۔ علاوہ ازیں، ناول نگار نے بابری مسجد کے حوالے سے بی جے پی حکومت کی متعصبانہ اور اسلام دشمن پالیسی کا تفصیلی ذکر کیا ہے جس نے دوقومی نظریہ کی صداقت اور حقانیت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ بھارت کو ہندوتا ریاست بنانے میں حکمرانوں کا مذہبی جنون سیکولرازم کے پرچارکوں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔

ایک مقام پر نذرالاسلام نے بھارت کی تمام سیاسی جماعتوں میں ایک نکتے پر اتفاقِ رائے کو جس طرح بیان کیا ہے اس میں ہمیں اپنے انتخابی اور سیاسی ڈھانچے کی جھلک دکھائی دیتی ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں صرف ایک نکتے پر متفق ہوتی ہیں کہ ان سے امیدواروں اور زیرِ کفالت افراد کی جائیداد کی تفصیل اور قانون شکنی پر مقدمات کے اندراج کی پوچھ گچھ نہ ہو۔

ناول میں کمال کے عشقِ جنون خیز کی داستان بالکل من گھڑت ہے کیونکہ ہیرو کمال کے آخری دنوں کی روداد بڑے دلگیر انداز میں بیان ہوئی ہے حالانکہ ناول نگار حیات ہے اور جن دنوں ناول لکھا گیا تھا اس وقت وہ پولیس میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ ہاں البتہ اس سے منسوب تعلیمی اداروں کے قیام کی باتیں حقیقت پر مبنی ہیں کیونکہ نذرالاسلام نے واقعتاً اس ضمن میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔

ناول نگار کی حیات پر ایک نظر

ناول کے مطالعہ سے قاری اس گمان و خیال اور الجھن میں رہتا ہے کہ اسے محض رومانی اور افسانوی قصہ سمجھے یا نیم تاریخی اور نیم سوانحی۔ مجھے بھی بار بار یہی محسوس ہوتا رہا۔ جب میں نے ناول میں درج واقعات، شخصیات اور کتابوں کے حوالے دیکھے تو ان کی تصدیق کا تجسس پیدا ہوا۔ اس کے لیے مختلف کتابیں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ نذرالاسلام نے تخیل اور تصور سے کام نہیں لیا بلکہ ٹھوس تاریخی حوالوں سے تاریخ، سماجی حقائق اور اپنے تجربے اور تجزیہ سے کام لیتے ہوئے کمال کی زبان میں اپنی داستانِ حیات بیان کی ہے، گویا منصور کے پردے میں نذرالاسلام خود بول رہا ہے۔

ناول نگار کی حیات پر زیادہ مواد نہیں مل سکا۔ لے دے کے اس کے دو چار اخباری انٹرویو اور ایک آدھ تبصرے ہی مل سکے۔ بہت امکان ہے کہ بنگالی اخبارات اور رسائل میں اس کی حیات اور تخلیقات کے بارے میں مواد ہو لیکن بنگالی زبان سے ناواقفیت آڑے آئی۔ سعیِ بسیار کے بعد اس کی زندگی اور کاموں پر ایک مختصر سا خاکہ تیار کیا گیا ہے۔

نذرالاسلام مغربی بنگال کے ضلع مقصود آباد کے ایک چھوٹے سے پسماندہ اور غربت زدہ گاؤں بسنت پور میں 3 فروری 1954 کو مسلم گھرانے میں پیدا ہوا۔ گاؤں میں ایک پرائمری اسکول تھا۔ چونکہ تقریباً ساری آبادی پر افلاس اور غربت چھائی ہوئی تھی اس لیے زیادہ تر بچے ناخواندہ رہ جاتے۔ نذرل کو تعلیم کا شوق تھا لہٰذا اسے اسکول داخل کرا دیا گیا لیکن پرائمری کے بعد باپ، عبدالعزیز، کی خواہش تھی کہ اب یہ کھیتی باڑی میں اس کا ہاتھ بٹائے کیونکہ نو بچوں کی روٹی کا بندوبست کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ نذرل کو مزید تعلیم کے لیے ماں کی تائید حاصل ہوگئی۔ تاہم میٹرک کرنے کے بعد ماں باپ دونوں نے انتہائی مفلسی کے باعث اسے تعلیم منقطع کرنے کو کہا لیکن نذرل نے منت سماجت سے انہیں راضی کر لیا۔ چونکہ غربت بہت تھی اور اس کے بھائی چھوٹی موٹی مزدوری یا کھیتی باڑی میں باپ کا ساتھ دے رہے تھے، ایک چھوٹا بھائی تو تین روپے روز اور کھانے کے عوض ایک گوالے کے ہاں ملازم ہو گیا تھا، پھر بھی اسے مزید تعلیم کرنے کی اجازت مل گئی لیکن نذرل نے اپنے تعلیمی اخراجات خود اٹھانے کا عہد کیا۔

کالج کی تعلیم حاصل کرنے اور بڑا آدمی بننے کی خواہش میں نذرالاسلام کو میلوں پیدل چلنے، فاقہ کشی اور دورانِ تعلیم مزدوری اور معمولی ملازمتیں کرنا پڑیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے سول سیکرٹریٹ میں ملازمت کی اور اسی دوران انڈین سول سروس کے لیے بھی محنت کرتا رہا جو بالآخر رنگ لائی اور وہ 1981 میں انڈین پولیس سروس میں منتخب ہوگیا۔

وہ انتہائی ایماندار اور بااصول پولیس افسر جانا جاتا تھا۔ اگرچہ اسے تضحیک، ان گنت رکاوٹوں اور دباؤ کا سامنا کرنا پڑا، بار بار اسے بیکار اور فضول جگہوں پر تعینات کیا جاتا رہا لیکن اس نے سمجھوتہ کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ ملازمت کے دوران اس نے مختلف مضامین میں ایم اے اور کلکتہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

اسے ابتدا ہی سے لکھنے لکھانے کا شوق تھا۔ کہانیوں کے علاوہ اس نے تحقیقی مضامین، ناول اور مختلف موضوعات پر ان تھک کام کیا۔ 1995 میں اس کے بنگالی ناول ''باکُل''، یعنی مولسری کا درخت، پر اسے ایک اہم اور قابلِ قدر ادبی

ایوارڈ'' آنند پریشکار'' سے نوازا گیا۔ بعد میں مختلف سالوں میں اسے اور بھی ادبی ایوارڈ ملے۔ شاندار اور بے داغ ملازمت پر انڈین پولیس میڈل کا بھی حقدار قرار پایا۔

نذرالاسلام کی اب تک تقریباً اسی (80) تصانیف سامنے آئی ہیں۔ ناول نگاری اور تحقیقی ادبی وسماجی موضوعات اس کے من پسند میدان ہیں۔ اس کی تخلیقی قوت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پولیس سروس میں ہونے اور اپنے فرائض میں کوتاہی نہ کرنے کے باوجود اس نے تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکالا۔ چونکہ اس کی سوائے چند ایک، باقی ساری تصانیف بنگالی زبان میں ہیں اس لیے ہم ان کی ادبی اور تحقیقی کاوشوں کو نقد و جرح کی کسوٹی پر پرکھنے سے قاصر ہیں۔ یہاں یہ لکھنے اور اعتراف کرنے میں باک نہیں کہ ہم نے بنگالی ادب کو شروع ہی سے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس کا ثبوت یہی ہے کہ بنگالی ادب پاروں اور تحقیقی کتابوں کے اردو تراجم انتہائی کم ہیں جس کی وجہ سے ہم وہاں کی روایات، تاریخ، سوچ، اور ادبی چاشنی سے بہت حد تک محروم ہیں۔

نذرل کی ایک اہم اور قابلِ قدر خوبی اس کی حق گوئی ہے۔ اس نے دورانِ ملازمت بھی حکمرانوں پر کھلم کھلا تنقید کی۔ 1995 میں شائع ہونے والی ایک کتاب ''منگل پاتھ'' (بنگالی زبان میں) میں اس نے متعدد وزیروں کی بداعمالیوں اور بدعنوانیوں کا ذکر کیا ہے جس پر اسے دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بنگالی زبان میں لکھی گئی ایک اور کتاب ''پولیس پرسنگ'' میں اس نے برسرِ اقتدار کیمونسٹ پارٹی پر الزامات عائد کیے کہ وہ اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے کس طرح پولیس فورس کا استعمال کرتی ہے۔ حکومت کی طرف سے نذرل کو ڈرایا دھمکایا گیا کہ وہ ایسی باتیں کتاب سے حذف کر دے اور انکار پر اس کے خلاف متعدد الزامات پر باقاعدہ انکوائری کا آغاز کیا۔ معاملہ بنگال ہائی کورٹ تک پہنچا جہاں نذرل پر لگائے گئے تمام الزامات غلط ثابت ہوئے۔

اس کی بے باکی اور حق گوئی کا ایک ثبوت تو زیرِ نظر ناول ہے جس کا انگریزی ترجمہ 2005 میں ہوا جبکہ وہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا لیکن اس نے مختلف واقعات، سیاستدانوں کی بداعمالیوں اور دیگر معاملات پر بے لاگ تبصرہ ہی نہیں کیا بلکہ کاٹ دار تحریر میں حکومتِ وقت پر سخت تنقید بھی کی ہے۔ ایسی تمام باتوں کا نذرل کو نقصان بھی اٹھانا پڑا کہ ایک تو اس کی پوسٹنگ غیر اہم علاقوں اور محکموں میں ہوتی رہی اور پھر یہ کہ کسی نہ کسی بہانے اس کو ترقی سے بھی محروم کیا جاتا رہا۔

مغربی بنگال کی ممتا بینر جی کی وزارتِ اعلیٰ میں نذرالاسلام کے ساتھ تعیناتی، ترقی اور حق تلفی کے تلخ شواہد سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ اس بااصول اور ایماندار پولیس آفیسر کی ملازمت کے آخری چند برس اسے او ایس ڈی بنا کر ضائع کر دیئے گئے، صرف اس ''جرم'' کی بنا پر کہ اس نے ممتا بینر جی کے لیے رشوت حاصل کرنے کی خاطر ٹاؤٹ بننے سے انکار کر دیا تھا۔ صرف یہی نہیں، نذرالاسلام نے اپنے مضامین اور کتابوں کے ذریعے وزیرِ اعلیٰ کی بداعمالیوں، رشوت خوری اور دیگر انتظامی کمزوریوں کے بارے میں کھل کر لکھا۔ ایک بار اس کی کتاب مارکیٹ میں آنے کے فوراً بعد نہ صرف اٹھالی گئی بلکہ ناشر کے دفتر کو بھی چند گھنٹوں کے لیے مقفل کر کے تلاشی لی گئی، اور ساتھ ہی اسے دھمکیوں اور تحریر کردہ باتوں سے منحرف ہونے پر شدید دباؤ بھی ڈالا گیا۔ ان مشکلات اور واقعات کا اظہار اس نے اپنی کتابوں اور انٹرویوز میں کیا ہے۔

نذرلاسلام کے دل میں ہمیشہ سے یہ خلش موجود رہی کہ اس کے علاقے میں تعلیمی سہولیات کی عدم موجودگی سے نئی پود تعلیم سے بے بہرہ ہے لہٰذا اس نے پہلے ادبی ایوارڈ سے وصول ہونے والی اپنی انعامی رقم گاؤں میں پرائمری اسکول کی تعمیر کے لیے وقف کر دی۔ صرف یہی نہیں، اپنی تنخواہ میں نے کچھ رقم بچا بچا کر، کتابوں سے ملنے والی رائلٹی اور دیگر

اعزازات سے حاصل کردہ انعامی رقم مختلف تعلیمی منصوبوں پر وقف کرتا رہا۔ ناول کے اختتامی ابواب میں، جب کمال اپنی کاوشوں سے تعمیر ہونے والے متعدد کالجوں اور اداروں کا ذکر کرتا ہے، فی الحقیقت نذرالاسلام اپنے علاقے کو ترقی دینے کی خاطر ان اقدامات کی تفصیل بیان کر رہا ہے جس میں مبالغہ یا داستان طرازی نہیں۔ اس نے بلاشبہ اسکولوں کے علاوہ کالج، ٹیکنیکل ادارے، میڈیکل اور انجینئرنگ کالج قائم کیے ہیں۔

2014 میں ریٹائرمنٹ کے بعد نذرل نے کولکتہ میں رہائش اختیار کی ہے لیکن اپنے بنیادی نصب العین، یعنی تعلیمی اور دیگر فلاحی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ اسی برس نذرل کو مغربی بنگال میں گورنرشپ کی پیشکش ہوئی جو اس نے قبول نہیں کی۔ بعد ازاں اس نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تاکہ اپنے منصوبوں کے لیے سیاسی پلیٹ فارم بھی استعمال کیا جائے۔ ابھی تک اسے عوامی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی جس کا ثبوت یہ ہے کہ گزشتہ صوبائی انتخابات میں اسے تقریباً ایک ہزار ووٹ ملے تھے۔

نذرالاسلام ساری زندگی اپنے اصولوں اور آدرشوں کو لیے دھرتی کے سپوت ہونے کا ثبوت دیتا رہا لیکن ہر قدم پر اس سے محب وطن بھارتی ہونے کے مزید شواہد مانگے جاتے رہے۔ اس موقع پر بھارت کے مشہور مسلمان اداکار نصیرالدین شاہ کے الفاظ کانوں میں گونجتے ہیں کہ ستر برس سے زیادہ اس زمین پر رہنے کے باوجود ہم سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اپنے بھارتی ہونے کے ثبوت پیش کرو۔ یہی المیہ ہمیں زیرِ نظر ناول میں ملتا ہے۔

دو چار مواقع پر نذرالاسلام نے چند محکمانہ کارروائیوں اور مقدمات کی تفتیش کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ عام قاری کے لیے اس میں چاشنی اور دلچسپی تقریباً معدوم ہے لہٰذا ترجمہ کرتے ہوئے انہیں حذف یا مختصر کر دیا گیا ہے کیونکہ ان تفصیلات کی موجودگی یا عدمِ بیان سے ناول کی مجموعی ہیت، کہانی اور کردار نگاری میں فرق نہیں آتا۔

ترجمہ کے آخر میں حواشی دینا ضروری سمجھا گیا ہے حالانکہ ناولوں میں بالعموم اس کا اہتمام نہیں کیا جاتا کیونکہ عام فہم انداز اور روش کے مطابق کہانی کو کہانی جان کر لکھا جاتا ہے لیکن اس ناول میں واقعات اور شخصیات کے ذکر کا مقصد نذرالاسلام کے نزدیک افسانے کی صورت میں حقیقت نگاری اور تاریخ نویسی بھی ہے۔ ان حقائق کی تصدیق کے لیے مختلف مستند تاریخی کتابوں کا جائزہ لیا گیا تو اندازہ ہوا کہ حواشی شامل ہونے سے قارئین کو تاریخ اور واقعات سے آگاہی ہونی چاہیے، یہی مقصد یقیناً ناول نگار کے پیشِ نظر تھا۔

"جب میرے ذہن میں یہ کہانی تشکیل پا رہی تھی میں نے اسے کسی کے نام منسوب کرنے کا فیصلہ کیا لیکن حالات کے تغیرات نے اب مجھے اس دوشیزہ کا نام لکھنے کی اجازت نہیں دی"۔

پیش لفظ

''دھرتی کا بیٹا'' میرے ناول ''بھومی پترا'' کا ملخص انگریزی ترجمہ ہے۔ اسے میں نے بنگالی زبان میں تحریر کیا تھا بعدازاں اس کے متعدد زبانوں میں تراجم شائع ہوئے۔ انگریزی ترجمہ بنگالی ناول کا لفظ بلفظ ترجمہ نہیں ہے بلکہ بالکل نئی تخلیق ہے۔ بھومی پترا میں 69 ابواب تھے لیکن انگریزی میں 161 ابواب کر دیئے گئے ہیں۔

اس ناول کا ہیرو کمال دھرتی کا سپوت ہے۔ وہ ازروئے پیدائش بنگالی اوز بھارتی ہے۔ اس کے والدین کی مادری زبان بنگالی ہے اور جدِ امجد زمانۂ قدیم سے اس سرزمین پر زندگی بسر رہے ہیں۔

پرکھوں کی طرح کمال کے والدین بھی دھرتی کے سپوت تھے۔ اپنے بچپن ہی سے کمال کی شناخت اس کی دھرتی ماتا ہے۔ اس کے خیال میں اگر وہ قابل ہوا تو ایک روز اس ملک کا سربراہ بھی بن سکتا ہے۔

دھرتی کے اس بیٹے کا مذہب ملک کی اکثریت جیسا نہیں بلکہ اس کے مذہب کی جڑیں کسی دور پار کے دیش میں تھیں۔ بچپن میں وہ اس حقیقت سے لاعلم تھا۔ اسے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اپنے مذہب کے علاوہ بھی دنیا میں کوئی اور مذہب بھی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اچھا انسان بننے کے لیے مذہبی ہونا پڑتا ہے لہٰذا بچپن ہی سے وہ مذہبی احکام پر خلوصِ دل سے عمل پیرا تھا۔ یہ سوچ کبھی بھی اس کے ذہن میں نہ آئی کہ مذہبی ہونے اور بنگالی اور بھارتی ہونے میں رتی بھر بھی ٹکراؤ ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ناانصافیوں کا سامنا کرنے لگا۔

سب سے پہلے تو اس نے جانا کہ یہاں متعدد مذاہب موجود ہیں، کچھ نے اسی دھرتی میں جنم لیا اور کچھ دوسرے ممالک سے آئے ہیں۔ لوگوں کی اکثریت اسی دھرتی میں جنم لینے والے مذہب کے پیروکار ہیں لیکن بنگالیوں کی بہت بڑی تعداد اس مذہب کے ماننے والوں کی ہے جس کی پیدائش کسی اور سرزمین میں ہوئی تھی۔ کمال کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کے پرکھوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر دیارِ غیر سے آنے والے مذہب کو کیوں اختیار کیا تھا۔

دوسری بات کمال نے یہ دیکھی کہ دونوں مذاہب کے لوگ آپس میں کھچے کھچے سے رہتے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہوں نے دھرتی کو تقسیم کرنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

تیسری بات یہ کہ جہاں ایک طرف تقسیم کی باتیں ہو رہی تھیں وہیں اکثریتی جماعت کے ذہن میں کمال کے ہم مذہبوں کے بارے میں معاندانہ جذبات پائے جاتے تھے اور اس کو بھی بغیر کسی خطا اور جرم کے عداوت کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔

یہ حقیقت بھی کمال پر عیاں ہوگئی کہ اس ملک میں کسی اچھے مقام پر پہنچنے کے لیے قابلیت ہی واحد معیار نہیں، مذہبی شناخت بھی بہت ضروری ہے۔ اپنے مذہب پر کاربند رہتے ہوئے وہ ایک خاص حد تک ہی ترقی کر سکتا ہے۔ اس صورتِ حال میں حب الوطنی کا جذبہ دل کی گہرائیوں میں جنم نہیں لے سکتا، نہ ہی مضبوط ہو سکتا ہے جیسا کہ وہ اب تک گمان کرتا آیا ہے۔

کمال کی سمجھ میں آنے والی پانچویں حقیقت یہ تھی کہ مذہب اللہ یا بھگوان کا نہیں بلکہ انسان کا تخلیق کردہ ہے۔ انسان ہی نے قادرِ مطلق کا تصور ایجاد کیا۔ وقت اور ہم عصر معاشروں میں چند ذہین طبع افراد نے اصول وضوابط اور

رسمیں وضع کیں جن پر عام لوگ عمل پیرا ہونے لگے جنہوں نے کچھ عرصہ بعد مذہب کی صورت اختیار کر لی۔ یہی سبب ہے کہ ہر مذہب میں اچھی باتیں بھی ہیں اور از کار رفتہ بھی۔ اکثریت کے عقائد سے متعلقہ بہت سی ایسی دقیانوسی رسمیں پارلیمنٹ نے ختم کر دیں لیکن کمال نے جس مذہب کو ورثے میں پایا اس میں ابھی بھی بہت سی قابلِ اعتراض رسمیں موجود ہیں جنہیں بدلنے کی ضرورت ہے۔

کمال سو فیصد سیکولر ذہن کا مالک اور اپنے ملک اور اہلِ وطن کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہے لیکن اکثریتی جماعت کے تقریباً تمام افراد کی نگاہ میں وہ اقلیتی فرقہ میں ہونے کے سبب ملکی مفاد کے بارے میں مخلص نہیں۔ اس کے ہر سیکولر کام کو فرقہ وارانہ کہنا جبکہ ایسے ہی کاموں پر اکثریتی فرقہ کے افراد کو قومی خدمت قرار دینا عام سی بات ہے۔ جب وہ اسکول میں اپنی جماعت کا مانیٹر بننے کے لیے سامنے آتا ہے تو اس کو اقلیتی فرقے کا طالب علم کہتے ہوئے رد کر دیا گیا۔ ملازمت کے لیے بھی اسے ایسے سلوک سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پولیس سروس میں اس کی تعیناتی کا معاملہ ہوا تب بھی اسے اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھنے والے افسر کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ اسے کبھی بھی افسروں کی برادری کا رکن نہیں سمجھا۔ یہ اس کے لیے بہت تکلیف دہ ہے مگر زیادہ دکھ تو اس بات کا ہے کہ ایک روزنامے کا صحافی بغیر کسی ثبوت کے اس پر کوئی نہ کوئی الزام لگاتا رہتا ہے حتیٰ کہ ہمسایہ ملک کی خفیہ ایجنسی کے ساتھ تعلق بھی جوڑ دیا گیا، صرف اس لیے کہ نام ہی سے وہ اقلیتی مذہب کا فرد لگتا ہے۔ یہی صحافی اکثریتی فرقہ کے کسی ایک شخص پر بھی ایسے بے سروپا الزامات لگانے کی ہمت نہیں کر سکا۔

ایک اور تکلیف دہ بات یہ ہے کہ سیکولر ہونے اور کسی بھی مذہبی رسم و رواج پر عمل نہ کرنے پر اس کے اپنے فرقے کے لوگ بھی اس کو کسی معاملہ میں اعتماد میں نہیں لیتے۔

اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والے بنیاد پرستوں کے اس دعویٰ کو کمال کبھی بھی قبول نہیں کر سکا کہ صرف ان کا اپنا مذہب ہی دنیا کا واحد سچا مذہب ہے۔ اسی طرح وہ اکثریتی فرقے کے بنیاد پرستوں کے اس دعویٰ کے بھی خلاف ہے کہ اس ملک میں رہنے کا حق صرف اُن کے دھرم والوں کو حاصل ہے۔ یہاں کے باسیوں کے چند پرکھوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا مگر اس تبدیلی کے سبب اپنی سرزمین سے ان کی محبت میں کوئی رکاوٹ اور کمی نہیں آئی۔ اس کا ایمان ہے کہ اپنی دھرتی کے تمام مصائب اور مسرتوں پر اس کا برابر حق ہے۔ اسے یقین ہے کہ کسی اور شخص کے دل میں اس سے زیادہ ملک کی خوشحالی اور بہبود کا درد نہیں ہے۔

علاوہ ازیں، اقلیتی فرقے کے لیے جداگانہ انتظام اور طریق کار اسے قبول نہیں۔

وہ بہت حساس ذہن کا مالک ہے۔ یہ حساسیت بعض اوقات اس کے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ وہ مشرقی بنگال کے اس ہندو رہنما کے دکھ کو سمجھ سکتا ہے جس نے آزادی کی جنگ لڑی مگر تقسیم کے بعد پاکستان میں دوسرے درجے کا شہری قرار پایا۔ غیر ملکی آقاؤں سے آزادی کی خواہش نے اسے پہلے سے زیادہ برے حالات میں پھنسا دیا۔ کمال اس مصیبت زدہ شخص کے دکھ کو محسوس کر سکتا ہے جو صوبہ بہار سے محض دو وقت کی روٹی کی خاطر کلکتہ آیا، مسلم لیگ سے وابستہ ہوا اور جب ملک کا بٹوارا ہوا تو سے مشرقی پاکستان آنا پڑا۔ مشرقی پاکستان جب بنگلہ دیش بنا تو اس بیچارے کو غیر بنگالی کہہ دیا گیا۔ پھر وہ مہاجر بن کر کراچی بھیجا گیا۔ اب مقامی لوگ اسے پاکستان سے بھی باہر دھکیلنے کی کوشش میں ہیں۔ کیا دنیا بھر میں کوئی ایک ایسا ملک ہے جسے وہ کم نصیب اپنا کہہ سکے؟

ان دماغ سوز حالات میں وہ (کمال) اپنے ملک اور اہلِ وطن کے لیے کیا کرتا ہے، یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

15اگست 1967، بھارت کا بیسواں یوم آزادی۔ اسکول میں ترنگا لہرانے کے علاوہ ایک ثقافتی تقریب کا بھی اہتمام تھا۔ اپنے بنگالی استاد نرمل ساہا کے کہنے پر کمال کو ایک تقریر کرنا تھی۔ وہ اسکول جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس کا باپ خادم بیلوں اور ہل کے ساتھ کھیت کو جانے ہی والا تھا۔ کمال کر تیار دیکھ کر اس نے پاس آ کر پوچھا کہ آج چھٹی والے دن وہ کہاں جارہا ہے؟ کمال یوں چونکا کہ جیسے کسی نے اسے چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ اس نے جواب دیا "اسکول تو آج بند ہے مگر مجھے جانا ہے"۔

"کیوں؟"

"آج یوم آزادی منایا جارہا ہے"۔

خادم سمجھ نہ پایا کہ اس کا بیٹا کیا کہہ رہا ہے۔ ہچکچاتے ہوئے وہ بڑبڑایا کہ دوسرے تو نہیں جارہے۔ کمال نے جواب دیا کہ دوسرے آج تقریر نہیں کریں گے، صرف میں ہی کروں گا۔ خادم حیران رہ گیا۔ اس کا بیٹا تقریر کرے گا! اس نے آہستگی سے کہا، "تقریر تو وہ کرتے ہیں جنہوں نے چناؤ میں حصہ لینا ہوتا ہے۔ علی صاحب اسی لیے تقریر کرتے ہیں۔ کیا تم بھی کسی چناؤ میں حصہ لے رہے ہو"؟

کمال الجھن میں پڑ گیا کہ باپ کو کیسے سمجھائے۔ اس نے جواب دیا "نہیں، میں کسی چناؤ میں حصہ نہیں لے رہا"۔

"پھر؟"

"میری تقریر آزادی کے بارے میں ہے"۔

"آزادی؟ وہ کیا؟"

"اس کا مطلب ہے اپنی مرضی سے فیصلے کرنا"۔

"خوب! کس کی آزادی؟"

"ہندوستان کی"۔

"ہندوستان؟" وہ آہستگی سے بولا جیسا کہ اپنے آپ سے ہمکلام ہو۔ چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد پھر بولا: "ہندوستان کیا ہے؟ یہاں سے کتنی دور ہے؟ ۔۔۔۔سلطان پور سے پرے یا پھر شبنگر کے پاس؟"

کمال جان گیا کہ آزادی اور ہندوستان کا تصور باپ کی سمجھ سے بالا ہے، پھر بھی اس نے سمجھانے کی کوشش کی: "ہمارے ملک کا نام ہندوستان ہے"۔

بیٹے کے جواب نے خادم کو مزید الجھن میں مبتلا کر دیا۔ اس کے خیال میں کمال عجیب بات کر رہا تھا۔ وہ کیسے مان لے کہ اس کے گاؤں کا نام بسنت پور نہیں بلکہ ہندوستان ہے۔ یہ نام تو پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ جھجکتے ہوئے پوچھنے لگا، "کیا اس گاؤں کا نام بسنت پور نہیں ہے؟"

کمال کو مایوسی ہوئی: "بسنت پور ہمارے گاؤں کا نام ہے، ملک کا نہیں"۔

خادم گاؤں اور ملک میں فرق سمجھ نہ پایا۔ بیٹے کے جواب نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ کمال نے سمجھاتے ہوئے

جواب دیا،'' آج کے دن ہم سب آزاد ہوئے تھے''۔ خادم حیرت زدہ تھا۔'' ہم سب؟ یعنی کہ میں اور تمہاری ماں بھی؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ اپنی ماں کو بلاؤ۔ میں دیکھوں تو سہی وہ کیا سمجھی ہے''۔

کمال کے آواز دینے سے پہلے ہی اس نے پکارا،'' کمال کی ماں اِادھر آؤ!''۔ اس کی ماں مریم تیزی سے اس طرف آئی۔ خادم نے اس سے پوچھا،'' کیا تمہیں پتہ ہے کہ تم آزاد ہو چکی ہو؟''

مریم نے غصے میں الٹا سوال کیا'' کیا دماغ چل گیا ہے؟ یہ اسکول جانا چاہتا ہے، جانے دو۔ اتنا شور شرابہ کس لیے؟''

خادم نے اپنی سبکی محسوس کی مگر کچھ بولا نہیں۔ مریم نے بیٹے کو جانے کا کہا۔ وہ جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اسے تو پتہ ہے آزادی کیا ہے مگر اس کے والدین بالکل بے خبر ہیں۔ اس کی وجہ صرف تعلیم اور شعور کی کمی ہے۔ انہیں بھی تو علم ہونا چاہیے۔ مگر کیسے علم ہو؟ وہ سوچنے لگا۔ ان کے گاؤں میں تو پرائمری اسکول تک نہیں۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی ایک اسکول کی بنیاد رکھے گا۔

....

علی الصبح کمال نیند سے بیدار ہوا۔ اندھیرا کم ہو چلا تھا مگر سورج ہنوز طلوع نہیں ہوا تھا۔ مشرق کی جانب آسمان قدرے روشن دکھائی دیا، گویا سورج طلوع ہونے ہی والا ہے۔ سورج نکلنے سے قبل نمازِ فجر کی ادائیگی ضروری تھی۔ اس نے لنگوٹ اٹھایا اور نزدیکی کنویں کی طرف چل دیا۔ کمر کے گرد رسی باندھ، کنویں میں چھلانگ لگا کر تھوڑا سا پانی نکالا اور گھر واپس آ کر وضو کیا اور ہاتھ منہ پونچھ کر جائے نماز پر کھڑا ہو گیا۔

بچپن ہی سے وہ دیکھ رہا تھا کہ مذہبی لوگ سب کی نظروں میں اچھے انسان سمجھے جاتے تھے۔ وہ خود بھی ایک اچھا شخص بننا چاہتا تھا لہٰذا اوائلِ عمر ہی سے مذہبی رسوم کی ادائیگی شروع کر دی تھی۔ مذہب کے پانچ بنیادی احکام یعنی ایمان یا کلمہ، پنجگانہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ، کا اسے علم تھا۔ آخری دو احکام صاحبِ ثروت لوگوں پر فرض تھے، گویا پہلے تین احکام اور فرائض کا تعلق کمال سے تھا جنہیں وہ صدقِ دل سے ادا کرتا تھا یعنی خدائے واحد پر ایمانِ کامل، پنج وقتہ نماز کی ادائیگی اور ماہِ رمضان میں روزوں کی پابندی۔ اس صبح بھی حسبِ معمول نماز ادا کرنے کے بعد اس نے قمیص پتلون پہنی اور کتابیں اٹھا کر اسکول کی جانب روانہ ہوا۔

....

کمال ابھی راستے ہی میں تھا کہ عبدل دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا،'' کیا تمہیں پتہ ہے کہ روزِ قیامت بہت نزدیک ہے؟'' نیک سیرت کمال کو مذہبی اجتماعات میں شرکت کرنے کے سبب علم تھا کہ روزِ قیامت کیا ہے۔

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ ایک نہ ایک روز سب کو اللہ کے حضور پیش ہونا ہے جہاں ان کے اچھے برے کاموں کا حساب ہوگا۔ اس روز سورج ان کے سروں تک آ پہنچے گا۔ فرشتہ اسرافیل صور پھونکے گا جس سے تمام متوفین اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کر اللہ کے سامنے اپنے اعمال کی سزا و جزا پائیں گے۔ یہ سب کچھ میدانِ حشر میں ہوگا اسی لیے اسے یومِ حشر بھی کہتے ہیں۔ بنگالی شاعر نذرالاسلام نے کہا ہے'' یومِ حشر میں اللہ ہی منصف ہوگا''۔

عبدل کی بات سن کر کمال ڈر گیا اور پوچھا'' کتنا نزدیک ہے روزِ قیامت؟'' عبدل نے اس انداز میں جواب دیا جیسے کہ وہ بہت تعلیم یافتہ ہو،'' بہت نزدیک''۔

'' تم کیسے جانتے ہو؟''

'' عالموں نے بتایا ہے۔ ابا نے خود سنا ہے''۔

کمال کو علم تھا کہ عالم عربی زبان میں پڑھے لکھے شخص کو کہتے ہیں لیکن اس علاقہ میں جس نے چار حرف عربی میں پڑھ لیے، عالم کہلاتا ہے۔ اس نے پوچھا، ''کیا سنا تھا؟''

''روزِ قیامت کی نشانیاں ظاہر ہو رہی ہیں''۔

''وہ نشانیاں کیا ہیں؟''

''کچھ نشانیاں چھوٹی ہیں اور کچھ بڑی''۔

''چھوٹی نشانیاں کیا ہیں؟''

''اللہ پر ایمان میں کمی، بڑے علاقوں کی شہرت میں کمی اور معمولی اور چھوٹی جگہوں کی شہرت میں اضافہ، کم ظرف لوگوں کا عروج، جنسی خواہشات کی غلامی، فتنہ فساد اور بغاوتوں میں اضافہ، بارشوں اور اجناس کی پیداوار میں انحطاط، قحط اور زلزلوں میں شدت، وغیرہ''۔

کمال بڑے شوق اور توجہ سے عبدل کی بات سن رہا تھا جو مزید بتا رہا تھا، ''چھوٹی چھوٹی ساری نشانیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ بڑی نشانیاں باقی رہ گئی ہیں''۔

''بڑی نشانیاں کون کون سی ہیں؟''

''دجال اور امام مہدی کا ظہور''۔

''دجال کون ہے؟''

''وہ ایک شیطان ہے۔ جب دنیا گناہوں سے بھر جائے گی، وہ اس وقت ظاہر ہوگا۔ وہ ایک پہاڑ کی مانند طویل الجثہ اور اس کے ہاتھ بڑے بڑے درختوں کی طرح ہوں گے''۔

کمال ذہن میں دجال کی تصویر کشی کرنے لگا۔ ادھر عبدل کہے جا رہا تھا کہ ''اس کے ایک ہاتھ میں علم اور دوسرے میں تلوار ہوگی۔ اس کے حکم کی نافرمانی کرنے والے کو قتل کر دیا جائے گا''۔

''پھر وہ کرے گا کیا؟''

''وہ اللہ پر ایمان کا خاتمہ کر کے لوگوں کو گناہوں یعنی شیطان کی راہ اختیار کرنے کی ترغیب دے گا۔ اس کے متعدد ساتھی بھی ہوں گے۔ کسی کے پاس شراب ہوگی تو کسی کے پاس خنزیر کا گوشت۔ اپنی راہ پر لگانے کے لیے اس کے کچھ ساتھی خطرناک ہتھیاروں کا سہارا لیں گے تو کچھ خوبصورت دوشیزاؤں کو استعمال کریں گے۔ تقریباً سارے ہی لوگ ان کی پیروی کر لیں گے''۔

کمال سوچ میں پڑ گیا کہ ان حالات میں کیا ہونا چاہیے۔ عبدل گویا ہوا، ''اور پھر امام مہدی کا ظہور ہوگا''۔

''امام مہدی کون ہے؟''، کمال نے استفسار کیا۔

''امام مہدی حضرت محمد کی اولاد میں سے ہوں گے۔ ان کا اپنا نام محمد اور والد کا نام عبداللہ ہوگا، یعنی نبی اکرم اور ان کے والد کے نام پر ہوں گے۔ ان کی پیدائش خراسان میں ہوگی''۔

کمال کو بالکل پتہ نہیں تھا کہ خراسان کہاں ہے۔ ''تمہیں علم ہے خراسان کہاں ہے؟''، اس نے پوچھا۔

''نہیں مجھے نہیں پتہ۔ یہ کہیں عرب کی طرف ہے۔ امام مہدی کی پیدائش اور پرورش خراسان میں ہوگی۔ اپنے بچپن میں وہ بالکل گمنام ہوں گے۔ جوان ہونے پر وہ مدینہ تشریف لائیں گے اور یہاں حکمرانی کریں گے۔ وہیں سے وہ تمام مشرقی ممالک کو فتح کر کے پھر دجال پر قابو پا کر اسے زندہ دفن کر دیں گے''۔

''پھر کیا ہوگا؟''

''پھر روزِ قیامت کا آغاز ہوگا''۔

....

چھٹی ہونے پر کمال گھر کی جانب چل دیا۔ پرتالا کے مقام پر اس نے ایک بار پھر وہی منظر دیکھا جو وہ بچپن ہی سے دیکھتا چلا آیا تھا۔ ایک آدمی ایک قبر پر زور زور سے چھڑی مار رہا تھا۔ جب اس نے یہ منظر پہلی بار دیکھا تو متعجب ہو کر پوچھا تھا، ''یہ کون سی جگہ ہے؟'' ایک عمر رسیدہ شخص نے جواب دیا تھا ''یہ خراسانی کی قبر ہے''۔

''خراسانی کون؟''، کمال نے سوال کیا۔

''ایک زندہ پیر''۔

کمال زندہ پیر کا مطلب جانتا تھا۔ جب لوگ کسی دیوی دیوتا کے چرنوں میں اپنے کام کے پورا ہونے کی نیت سے کچھ بھینٹ دیتے اور کام ہو جاتا تو لوگ اسے جگرا تا دیوتا یا جگرا تا دیوی کہنے لگتے۔ اسی طرح کوئی اللہ والا خدا سے براہِ راست تعلق کی بنا پر ان کے ناممکن کام سنوار دے تو وہ زندہ پیر سمجھا جاتا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ لوگ اس زندہ پیر کی قبر کو کیوں پیٹ رہے ہیں۔

''نیکی کے لیے''، جواب ملا۔

زیادہ تر بنگالیوں کے ذہن میں نیکی کا مطلب تھا، اچھے کام کرنا۔ لیکن قبر کو پیٹنا کیسی نیکی تھی؟ اسی بوڑھے نے جواب دیا، ''یہ میں تو نہیں جانتا''، پھر قدرے تامل کے بعد کہنے لگا، ''تمہارے گاؤں کا ایثار الدین فقیر اس رسم سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس سے پوچھو''۔

کمال نے کئی لوگوں سے سن رکھا تھا کہ ایثار الدین فقیر کا تعلق خراسانی روایات اور رسموں سے ہے۔ اس کی مافوق الفطرت قوتوں کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کے قبضے میں جن بھی ہیں۔ وہ ان سے ہر قسم کا کام لے سکتا ہے۔ وہ پانی کے اوپر چلنے اور ہوا میں اڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔ قرآن کریم کی آیات پڑھ کر وہ پانی پر دم کرتا جس سے لوگوں کو شفا مل جاتی ہے۔ اس کی پڑھائی میں اتنی طاقت ہے کہ شیر چیتے راستہ چھوڑ دیتے اور بھوت پریت بھاگ جاتے ہیں۔ لوگ آسیبی امراض کے علاج کی غرض سے اپنے مریضوں کو اس کے پاس لاتے۔

ایسی باتوں نے کمال کے دل میں بھی پانی پر چلنے، ہوا میں اڑنے اور شیروں کو اپنے پاؤں میں لوٹتا دیکھنے کی خواہش پیدا کر دی۔ جنوں اور بھوتوں کو قبضے میں کر کے ان سے ناممکن کام کرانے کی آرزو مچلنے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو عام لوگوں سے بہت اونچا تصور کیا۔

کمال کے دادا کا نام بھی ایثار الدین تھا۔ اس نام کی مناسبت سے کمال ایثار الدین فقیر کے بہت نزدیک اور رشتہ کے احترام میں انہیں دادا کہتا تھا۔ وہ بھی اس سے محبت کرتے تھے۔ جمعہ کی نماز دونوں اکٹھے ہی ادا کرتے۔ ایثار الدین فقیر کی کمال سے محبت کا یہ عالم تھا کہ جب ایک بار امام مسجد موجود نہ تھے، انہوں نے کمال کو امام مقرر کیا اور خود بھی عام نمازیوں کی طرح اس کی امامت میں نماز ادا کی۔ اس عزت افزائی نے اسے بہت حوصلہ دیا اور ایک دن ان سے کہنے لگا، ''دادا جی! آپ مجھے یہ سب کچھ سکھا دیں''۔

دادا نے پوچھا، ''سب کچھ کیا؟''

کمال نے پر جوش انداز میں جواب دیا، ''پانی پر چلنا، ہوا میں اڑنا، درندوں اور بھوت پریت کو قبضے میں کرنا، یہ سب کچھ''۔

دادا جی مسکراتے رہے اور جب کمال کی بات ختم ہو گئی تو انہوں نے ایک مصنوعی ناراضی طاری کر کے پوچھا: "تم میرے پاس یہی چیزیں سیکھنے آئے ہو؟" کمال نے قدرے پریشان ہو کر جواب دیا: "جی ان۔۔۔نہیں"۔

"پھر تمہارے کہنے کا مقصد کیا ہے؟"

"میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور وہ سب کچھ سیکھنا چاہتا ہوں جو علم آپ کے پاس ہے"۔

"لیکن جو تم کہہ رہے ہو میں تو بالکل نہیں جانتا"۔

"پھر لوگ ایسا کیوں بتاتے ہیں؟"

"لوگوں کی سوچ غلط ہے اسی وجہ سے وہ ایسی باتیں کرتے ہیں"۔

کمال یہ سمجھا کہ فقیر دادا اسے کچھ بتانا نہیں چاہتے۔"اگر آپ یہ علم نہیں جانتے تو پھر لوگوں کی خواہش پر بدروحوں اور آسیبوں کو بھگانے کے لیے قرآن مجید کی آیات کیوں تلاوت کرتے ہیں؟"

دادا کا جواب بڑا سیدھا سادہ تھا، "وہ اس لیے کہ اس گاؤں میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔اگر ہو بھی تو لوگوں میں اسے بلانے اور علاج کرانے کی سکت نہیں۔انہیں اور خود مریضوں کو یقین ہے کہ میری وجہ سے افاقہ ہو سکتا ہے یہ یقین انہیں ذہنی طور پر حوصلہ عطا کرتا ہے اور بعض اوقات مریض تندرست بھی ہو جاتے ہیں"۔

"گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بعض مریض محض اسی وجہ سے شفایاب ہوتے ہیں؟"

"مریض کی مثبت سوچ ہی اسے تندرست کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے"۔

"مگر یہ سوچ، یہ حوصلہ مندی انہیں دوسروں سے مل کر کیوں حاصل نہیں ہوتی؟"

"کیوں نہیں؟ ان کا اعتماد حاصل کرلو، پھر دیکھو کہ محض تمہاری موجودگی ہی ان کا علاج ہے"۔

"تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ قرآنی آیات کی تلاوت سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟"

"بالکل یہی بات ہے"۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ خراسانی پیر کی روایات اور رسموں کے پیروکار نہیں ہیں؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔میں بالکل ان کی راہ پر چلنے والا ہوں"۔

"خراسانی کو تو سب کچھ آتا تھا۔آپ کیوں اس سے لاعلم ہیں؟" کمال نے تعجب کا اظہار کیا۔

"کون کہتا ہے کہ خراسانی کو یہ سارا علم حاصل تھا؟"، دادا نے پوچھا۔

"لوگ کہتے ہیں"۔

"لوگ تو میرے بارے میں بھی یہی کہتے ہیں"۔

"جی بالکل، وہ یہی کہتے ہیں"۔

"لیکن میں تو جانتا ہوں کہ میں بے علم ہوں۔میرے خیال میں خراسانی کو بھی ایسا علم حاصل نہیں تھا۔لوگ اس کا احترام کرتے تھے اس لیے انہیں یہ گمان تھا کہ خراسانی یہ سب کچھ کرنے پر قادر تھا"۔

کمال کے پاس مافوق الفطرت قوتوں کے حصول کی خواہش سے دست برداری کے سوا اور کوئی راستہ نہ بچا۔دادا کی بات سن کر اس نے سوال کیا: "پھر لوگ خراسانی کی اتنی عزت کیوں کرتے تھے؟"

"وہ ایک صاحب علم اور اللہ والا تھا اسی وجہ سے لوگ اس کا احترام کرتے تھے"۔

"خراسانی کا تعلق کہاں سے تھا؟"

''وہ خراسان سے آیا تھا''۔

''اسے اسی وجہ سے خراسانی کہا جاتا ہے؟''، کمال نے پوچھا۔

''ہاں۔ اس کا اصل نام ابوظفر سکندر علی الخراسانی البغدادی تھا۔ لوگوں میں وہ خراسانی کے نام سے مشہور تھا''۔

''وہ یہاں کیوں آیا تھا؟''

''مجھے علم نہیں مگر سنا ہے کہ اس کی آمد کے وقت یہاں کوئی مسلمان نہیں تھا''۔

کمال جاننا چاہتا تھا کہ واقعی یہاں کوئی مسلمان نہیں تھا اور خراسانی نے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا تھا؟

''نہیں، خراسانی نے آکر لوگوں کو مسلمان نہیں کیا تھا بلکہ لوگ خود ہی اس سے میل ملاپ کے بعد مسلمان ہونا شروع ہوئے تھے۔ اس دور میں یہاں کالی دیوی کی پوجا ہوتی تھی اور اس کی مناسبت سے اس علاقے کو کالی حلہ کہتے تھے۔ اس علاقے کا مشرقی حصہ اب بھی یہی کہلاتا ہے۔ مغربی علاقے کو البتہ اب پرتالہ کہتے ہیں۔ بنگالی مہینے کرتک کے چاند نکلنے پر کالی دیوی کی پوجا کا جشن منایا جاتا تھا۔ جانوروں، یعنی بیل وغیرہ کی قربانی دی جاتی تھی۔ کسی زمانے میں انسانی قربانی بھی ہوتی تھی۔ لوگوں نے انسانی خون بہتے ہوئے دیکھا ہے۔ پروہتِ اعظم، کپالک، سے منسوب داستانیں رنگ آمیزی میں بے مثال ہیں۔ کالی دیوی کی پوجا کے سبب وہ آسمانوں میں بھی قیام کر سکتا تھا۔ اگر کپالک کسی کی تپسیا سے خوش ہوتا تو اسے روحانی قوت عطا کر دیتا۔ اب وہ شخص ہر دکھ درد اور بیماری کا علاج، دشمنوں کو تباہ و برباد اور دولت میں اضافہ کرنے کا اہل ہو جاتا۔ اور اگر کپالک ناراض ہوتا تو اس شخص کی بربادی لازم تھی۔ اسی وجہ سے یہ علاقہ باعثِ خوف تھا اور سوائے خاص موقعوں کے کوئی شخص یہاں آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔

''ایک روز لمبی داڑھی اور بڑی سی توند والا ایک فقیر یہاں آگیا۔ اس نے ٹخنوں تک اونی جبہ اوڑھ رکھا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ کپالک اس کے سامنے آیا اور پھر دونوں اپنی اپنی طاقت دکھانے لگے۔ وہ دونوں آسمان کی جانب اڑے اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ کسی کو بھی مات نہیں ہوئی اور یوں کپالک نے دوسرے فقیر کی وہاں موجودگی گوارا کر لی۔ اس واقعہ کا چشم دید گواہ تو کوئی نہیں مگر لوگوں میں ایسا ہی مشہور ہوا اور پھر وہ اس فقیر کے پاس آنے لگے۔ یہی لوگ پھر مسلمان بھی ہو گئے''۔

''وہ مسلمان کیسے ہوئے؟''، کمال جاننا چاہتا تھا۔

فقیر ایثار الدین نے وضاحت کی، ''ہندو چار ذاتوں یعنی برہمن، کھشتری، ویش اور شودر میں منقسم تھے۔ برہمن باقی لوگوں کو شودر اور اچھوت سمجھتے تھے۔ نیا فقیر طاقتور ہونے کے باوجود ہندوؤں کی نظر میں اچھوت ہی تھا۔ اس کے پاس آنے والے کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا، یہاں تک کہ کوئی ہندو اس کے کھانے پینے کی چیزوں کو سونگھ یا چکھ لے وہ بھی اپنے دھرم سے نکل جاتا۔ اگر کسی عورت کی نگاہ بھی اس پر پڑ جاتی، اسے بھی دھرم سے خارج سمجھا جاتا۔ اس طرح بہت سے ہندو اپنی اپنی برادری سے خارج ہوتے گئے اور پھر وہی لوگ بعد میں مسلمان ہوتے گئے۔''

کمال نے سوال کیا، ''جب لوگوں نے دیکھا کہ فقیر سے ملنے جلنے پر ہندو اپنے دھرم سے خارج کر دیے جاتے ہیں، پھر وہ کیوں جاتے رہے؟''

''اگر ہندو سماج میں ان کی حالت بہتر ہوتی تو یقیناً وہ کبھی نہ جاتے۔ لیکن ذات پات کے نظام نے ہندوؤں کی اکثریت کو زندگی کی سہولیات سے محروم کر رکھا تھا اس لیے اپنے دھرم سے خارج ہو جانے پر انہیں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس خراسانی کے ساتھ عملی لحاظ سے نہ سہی، کم از کم انہیں برابری کا احساس تو ہو رہا تھا۔ اس وجہ سے لوگوں کی کثیر تعداد وہاں آنے لگی تھی''۔

''لوگ خراسانی کے پاس آتے، مسلمان ہوتے رہے، بس اور کچھ نہیں؟''

''ہاں! بس اتنا ہی۔ تبدیلی مذہب کے لیے کوئی رسم نہیں ہوتی تھی، نہ ہی کوئی مذہبی تعلیم دی جاتی۔ کیا تمہیں پتہ نہیں کہ ہمارے گاؤں کے لوگ سوائے دو عیدوں اور محرم کے اور کچھ نہیں جانتے۔ بلکہ وہ تو اب بھی ہندوانہ رسم و رواج، تہوار اور درگا دیوی کی عبادت کرتے، کالی پوجا کی رات چاول کی بجائے روٹی اور پھل کھاتے اور شب برآت پر قبرستان میں دیئے جلاتے ہیں۔ بابا خراسانی سے ملنے جلنے کے سبب وہ مسلمان ہوتے گئے مگر ان کے پیشوں حتیٰ کہ خاندانی ناموں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تمہارا باپ خادم منڈل ابھی تک دوسروں کی زمین پر کاشت کاری کرتا ہے۔ بادھو منڈل کا کام بھی یہی ہے۔ جارگچھ کے آنند ہلدار کی طرح براہی کے صمد ہلدار کا پیشہ بھی ماہی گیری ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ درگا پوجا کے روز آنند منڈپ میں جاتا ہے اور عید کے روز صمد عید گاہ کو، اس کے علاوہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہ ایک جیسے ہیں۔ کسی زمانے میں وہ ہر لحاظ سے ایک ہی تھے''۔

کمال کے منہ میں تو جیسے زبان ہی نہ ہو۔ فقیر نے اتنی وضاحت سے اسے سمجھایا تھا کہ مزید کچھ پوچھنے کی حاجت نہ رہی۔

جب اس نے پہلی بار قبر پر چھڑیاں پڑتی دیکھیں، وہ سیدھا فقیر ایثار الدین کے گھر آیا جو اس وقت لکڑی سے ہل بنا رہا تھا۔ دوسرے پیروں فقیروں کی طرح نذر نیاز لینے کی بجائے وہ محنت کر کے کماتا تھا۔ وہ اپنے علاقے کا مشہور بڑھئی تھا اور مناسب مزدوری پر کام کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ کمال کے دل میں اس کا احترام تھا۔ کمال کو آتے دیکھ کر ایثار الدین نے کام روک کر پوچھا، ''کوئی خاص بات؟''

''نہیں۔ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا کہ لوگ خراسانی کی قبر پر چھڑیاں کیوں مارتے ہیں؟''

ایثار الدین نے قدرے محتاط لہجے میں کہا، ''میرے بچے! یہ ایک الگ کہانی ہے جسے تم اس وقت نہیں سمجھ پاؤ گے''۔

''اگر آپ مجھے تفصیل سے بتائیں گے تو میں سمجھ جاؤں گا''۔

فقیر نے گہری سانس لی اور دھیرے سے کہا، ''تفصیل سے بھی ہر بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ صرف سمجھنے کی خواہش ہی کافی نہیں ہوتی، اس کے لیے قابلیت اور ذہنی پختگی لازمی ہے''۔

کمال نے جواب دیا، ''مجھ میں سمجھنے کی اہلیت ہے۔ اب بتائیں کیا بات ہے''۔

فقیر چند لمحے خاموش رہا۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں نے کمال کو نہ بتایا تو تو کسی اور کے پاس جا کر الٹی سیدھی باتیں سنے گا۔ ''خیر! اگر تم اتنے ہی خواہشمند تو میں بتائے دیتا ہوں۔

''یہ کہانی اس زمانے سے متعلق ہے جب اس کے مریدوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ اس کے ساتھ رہائش پذیر لوگوں میں ایک ادریس نامی شخص بھی تھا۔ اس کی بہن لیلیٰ انتہائی خوبصورت تھی۔ وہ پیر صاحب کا کھانا پکاتی تھی۔ سلائی کڑھائی میں بھی اس کا جواب نہیں تھا۔ ہر شخص اس کی عزت کرتا۔ خود پیر صاحب کے دل میں بھی لیلیٰ کی بہت قدر تھی۔ یہیں پر شمشیر نامی ایک شخص لیلیٰ کے ساتھ تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا مگر وہ رضامند نہیں تھی۔ پھر ایک دن انکشاف ہوا کہ لیلیٰ حاملہ ہے۔ پیر صاحب اس سے شادی کرنے کو تیار ہو گئے مگر شمشیر نے کہا کہ سب سے پہلے اس بات کا فیصلہ ہونا چاہیئے کہ یہ جرم کس سے سرزد ہوا ہے۔ جو لوگ خود بھی لیلیٰ سے تعلقات قائم کرنے کے خواہاں تھے مگر اس کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر پائے تھے، وہ بھی شمشیر کے ہمنوا ہو گئے۔ انہوں نے تجویز دی کہ لیلیٰ ہی سے پوچھا جائے۔ اس نے تو خاموشی اختیار کی مگر پیر صاحب نے زنا کا اقرار کر لیا۔ شمشیر موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے پیر صاحب کے ہاتھوں پر قرآن رکھتے ہوئے پوچھا کہ کتاب الٰہی میں زنا کی سزا کیا ہے؟ پیر صاحب کو تو گویا کسی نے بالکل ریزہ ریزہ کر دیا ہو۔ انہوں نے قرآن کھول کر سورۂ نور کی آیت پڑھی، 'زنا کے مرتکب عورت اور مرد دونوں کو سو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس مت کھاؤ اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو اور ان کو سزا دیتے

وقت اہلِ ایمان کا ایک گروہ موجود رہے"۔

شمشیر نے پیر صاحب سے جواب طلب کیا،'اب آپ کو کیا سزا ملنی چاہیے؟' خراسانی نے جواب دیا،'سو کوڑے'۔

"یہ ایک ڈرامائی صورتِ حال تھی۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ پیر صاحب کو معاف کر دینا چاہیے مگر شمشیر کا کہنا تھا کہ خود پیر صاحب نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اللہ کی شہنشائیت میں تمام لوگ برابر ہیں۔ یہ سن کر سب لوگ خاموش ہو گئے۔ شمشیر نے سوال کیا، یہ سزا کون دے گا؟ پیر صاحب کا رنگ پیلا زرد ہو گیا۔ انہوں نے شمشیر کی طرف دیکھ کر جواب دیا،' تم۔ اگر تم تھک جاؤ تو کسی دوسرے کو باقی کوڑے مارنے کا کہہ دینا'۔

"شمشیر نے پوچھا، اگر آپ سو کوڑے کھانے سے پہلے ہی وفات پا گئے تو؟"

"باقی میری قبر پر مارنا"، پیر صاحب کا جواب تھا۔

"شمشیر نے پیر صاحب کو اپنا جبہ اتارنے کو کہا۔ وہاں موجود تمام لوگوں نے اس پر اعتراض کیا اور پیر صاحب کو معاف کر دینے کی تجویز دہرائی۔ پیر صاحب نے لوگوں کو سمجھایا کہ جب فیصلہ ہو جائے تو سزا دے دینی چاہیے۔ انہوں نے جبہ اتارا اور سزا کے لئے تیار ہو گئے۔ شمشیر نے چھڑی سے مارنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد پیر صاحب نیچے گرے، دیکھا تو ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ لوگوں نے شور مچایا کہ وہ اپنی رضا سے دنیا چھوڑ گئے ہیں۔ شمشیر بعد ازاں ان کی قبر پر چھڑیاں برساتا رہا۔ تھک جانے پر اس نے پاس کھڑے ایک لڑکے سے قبر کو مضروب کرنے کو کہا۔ اس نے سوال کیا کہ آخر اب چھڑیاں مارنے سے کیا حاصل ہوگا۔ شمشیر کا جواب تھا، یہی تو نیکی ہے، اور نیکی کمانے کی خاطر لڑکے نے قبر کو پیٹنا جاری رکھا۔

"جنگل کی آگ کی طرح یہ بات قرب و جوار میں مشہور ہو گئی کہ خراسانی کی قبر پر چھڑیاں مارنا نیکی اور ثواب کا کام ہے۔ اس دن سے لوگ اپنی خواہشات کی تکمیل یا گناہوں کے کفارے کے لیے خراسانی کی قبر پر چھڑیاں مارتے آ رہے ہیں"۔ فقیر ایثار الدین نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بات ختم کی۔

کمال گم سم تھا۔ اس المناک انجام نے اس کے دل میں ہلچل پیدا کر دی۔ وہ وہاں سے چل دیا مگر دل بہت بوجھل تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ فقیر ایثار الدین کیوں یہ ساری داستان سنانے کو ہچکچا رہا تھا۔

....

اتوار کی وجہ سے اسکول بند تھا لہٰذا کمال گھر میں بیٹھا جغرافیہ کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے ایک خیال نے اسے مسرور کر دیا اور وہ کتاب بند کر کے کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

اس کے گاؤں بسنت پور اور چند دیہاتوں پر مشتمل ایک پولیس اسٹیشن تھا۔ چند تھانوں کو ملا کر سب ڈویژن اور چند سب ڈویژنوں پر مشتمل ایک ضلع تھا۔ اس کے اپنے ضلع مقصود آباد کی طرح کچھ اضلاع مل کر صوبہ مغربی بنگال کی تشکیل کرتے تھے، اور اسی طرح کئی صوبوں پر مشتمل ہندوستان کی ریاست تھی۔ ایسی ہی تمام ریاستیں مل کر دنیا کی شکل میں سامنے تھیں۔ گویا کمال دنیا کا ایک اٹوٹ انگ ہے۔ اس لحاظ سے وہ دنیا کے کسی اور فرد سے کمتر نہیں۔ تمام افراد ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔

لیکن یہ کیا؟ سارے لوگ ایک جیسی زبان نہیں بولتے، حتیٰ کہ ہندوستان کے باسیوں کی زبانیں مختلف ہیں۔ مغربی بنگال کے لوگ اس کی مانند بنگالی بولتے ہیں۔ اس کے ماں باپ کی زبان بھی بنگالی ہے اور خود اس نے بغیر کسی کوشش کے زبان سیکھ لی تھی، ہاں البتہ اسکول میں وہ انگریزی بھی سیکھ رہا ہے۔ اس کے ماں باپ اور ہمسایوں میں سے کوئی بھی بنگالی کے علاوہ دوسری زبان بول یا سمجھ نہیں سکتا۔ اس لحاظ سے سارے لوگ سو فیصد بنگالی ہیں۔ کیا انہیں اس حقیقت کا علم ہے کہ وہ صرف بنگالی

ہیں؟ کمال پڑھائی چھوڑ کر اپنی ماں مریم کے پاس جا بیٹھا جو اس وقت کھانا پکا رہی تھی۔

کمال کی ماں کا نام مریم ایک پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے نام پر تھا۔ عربی اور فارسی میں پیغمبر کا نام عیسیٰ ہے جبکہ عبرانی اور انگریزی میں یسوع بولا جاتا ہے، اسی طرح دوسرے نبیوں یعنی ڈیوڈ کو داؤد، موزز کو موسیٰ اور مریم کو میری کہتے ہیں۔ لیکن اس وقت کمال کے ذہن میں اور ہی کچھ تھا۔ وہ مریم کے پاس جا بیٹھا تو وہ متعجب ہو کر اپنے اس بڑے بیٹے کو دیکھنے لگی۔ ماں کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے سوال کیا: ''ماں! کیا تمہیں پتہ ہے کہ ہم بنگالی ہیں؟''

''کیا کہا؟ بنگالی؟'' ماں نے تیوری چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں! بنگالی''۔

ماں نے قدرے تامل کے بعد کہا: ''لیکن پدما کے اس پار رہنے والے بنگال میں ہیں۔ میرے بڑے ماموں کی وہاں شادی ہوئی تھی۔ تمہارا چچا کالو اس کا سالا ہے۔ میرے ماموں مذاق کیا کرتے تھے کہ تم تو بنگال ہو اور جواب میں کالو کہتا تھا کہ تم تو گھاٹی ہو۔ پھر ہم بنگال کیسے ہوئے؟ ہم تو گھاٹی ہیں''۔

''ماں! میں بنگال نہیں، بنگالی کہہ رہا ہوں۔ بنگال اور گھاٹی دونوں ہی بنگالی ہیں۔ ہم بنگالی بولتے ہیں لہٰذا ہم بنگالی ہیں۔ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، یعنی اپنے دین کی وجہ سے مسلمان ہیں۔ ہم کلمہ گو ہیں، نماز پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں، اسی وجہ سے مسلمان ہیں اور بنگالی اس لیے کہ یہ ہماری زبان ہے''۔

یہ سن کر مریم پریشان سی ہوگئی۔ ''زبان؟ کیا مطلب؟''

کمال نے سمجھاتے ہوئے بتایا: ''دیکھو ماں! تم بولتی ہو تو میں آسانی سے سمجھ جاتا ہوں اور جب میں کوئی بات کرتا ہوں، تم سمجھ لیتی ہو۔ اسی کو زبان کہتے ہیں''۔

مریم خالی خولی نگاہوں سے بیٹے کو دیکھنے لگی۔ وہ مزید وضاحت کرتے ہوئے بولا: ''تم روئی دھننے والے تمیز کو تو جانتی ہی ہو نا۔ وہ بھی مسلمان ہے۔ کیا تم اس کی بات سمجھ لیتی ہو؟''

''لوگ کہتے ہیں کہ وہ بہاری ہے''۔

''وہ اس لیے بہاری کہلاتا ہے کہ صوبہ بہار سے آیا ہوا ہے۔ وہ بہار کی بولی بولتا ہے۔ میں نے یہ پوچھا تھا کیا تم اس کی باتیں سمجھ لیتی ہو؟''

''میں کیسے سمجھ سکتی ہوں۔؟ وہ عجیب سے لفظ بولتا ہے''۔

ماں کا جواب سن کر کمال کو حوصلہ ہوا: ''چونکہ اس کی بولی ہماری بولی سے مختلف ہے تم اس لیے نہیں سمجھ سکتی ہو۔ اس کی زبان بنگالی نہیں بلکہ ہندی کی مقامی بولی ہے''۔

وہ اب بھی بیٹے کو ہونقوں کی طرح دیکھ رہی تھی۔ کمال نے پوچھا: ''میں جو لفظ بول رہا ہوں کیا تم سمجھ رہی ہو؟''

''ہاں!''

''تم اس لیے سمجھ رہی ہو کہ ہماری زبان ایک ہے، ہم بنگالی ہیں''۔

مریم کے پلے کچھ نہیں پڑا کہ اس کا بیٹا کہنا کیا چاہتا ہے۔ وہ مشکوک انداز سے کمال کو دیکھ کر سوچنے لگی کہ دیکھنے میں تو وہ بڑا ہوتا جا رہا ہے مگر ذہن بچوں کی طرح ہے۔ وہ سوائے اس کے اور کچھ نہ کہہ سکی: ''ہاں! میں سمجھ گئی ہوں۔ ہم بنگالی ہیں''۔

کمال خوش ہو کر دوبارہ کتاب دیکھنے لگا۔

....

کمال کی پیدائش اور پرورش ایک چھوٹے سے گاؤں بسنت پور میں ہوئی تھی، جہاں زیادہ تر مسلمان رہتے تھے۔ تمام لوگ غریب اور ان پڑھ تھے۔ تقریباً ساری کی ساری زمین دوسرے علاقے والوں کی ملکیت تھی۔ یہاں کے کسان تھوڑی سے فصل کے بدلے کھیتی باڑی کرتے تھے۔ چند ایک کسانوں کے پاس اپنی تھوڑی سی زمین تھی مگر ناکافی ہونے کے سبب وہ دوسروں کی زمین بھی کاشت کرتے جس سے بے زمین مزارعین کو خریف اور ربیع کے موسم میں کام، تنخواہ اور کچھ کھانے کو مل جاتا۔ خشک سالی کا زمانہ فاقہ کشی میں کٹتا۔

کمال کے والد خادم کے پاس صرف ایک ایکڑ زمین تھی لیکن وہ ایک ایکڑ لکشمی پور کے بابو رام چندر بینر جی اور اتنی ہی اجیت پور کے رادھے شیام پال کی زمین بھی کاشت کرتا تھا۔ مزید ایک ایکڑ زمین نیل گنج کے اندر کریکر کی ملکیت بھی کاشت کے لیے مل جاتی تھی۔ اس کی ایک نواسی کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) کے مقامی لیڈر صبیح الرحمن کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی۔ کمال کسانوں کے حق میں نکالے جانے والے پارٹی کے چند جلوسوں میں شرکت بھی کرتا رہا تھا۔ حال ہی میں اس نے سوشلسٹ یونٹی سنٹر آف انڈیا (SUCI) میں شمولیت اختیار کی تھی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ کیمونسٹ پارٹی سے زیادہ بائیں بازو کے نظریات کی حامل جماعت ہے۔

مروجہ قانون کے مطابق خادم اپنی بیوی کی دادی سے ایک چوتھائی زمین یا اس کی قیمت کا حقدار تھا مگر صبیح الرحمن کی خواہش تھی کہ خادم اپنے حق سے دستبردار ہو جائے۔ کمال کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی لیڈر اپنے دعوؤں کے برعکس بھی جا سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ صبیح کو اپنے اصولوں پر کاربند رہنے پر قائل کر لے گا۔ جب اس کی صبیح سے ملاقات ہوئی تو اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ہم بعد میں کسی وقت اس معاملہ پر گفتگو کریں گے۔ کمال انتظار ہی کرتا رہ گیا مگر گفتگو کی بجائے خادم کو عدالتی نوٹس موصول ہوا جس کے مطابق اندر کریکر نے خادم سے گذشتہ تین برسوں سے فصل میں اپنا حصہ نہ ملنے پر بے دخلی کا مقدمہ دائر کیا تھا۔ خادم نے وکیل تو کر لیا مگر یا تو وہ بک گیا تھا یا پھر عدالت میں دفاع نہ کر سکا۔ کمال کی رائے تھی کہ انہیں اندر کریکر کے دعویٰ کے مطابق رقم عدالت میں جمع کرا دینی چاہیے۔ وکیل کا مشورہ بالکل مختلف تھا کہ خادم بیانِ حلفی میں کہے کہ مقدمہ درج ہونے کے بعد اس نے مطلوبہ رقم زمیندار کو دے دی تھی۔ یہ مشورہ نہ صرف دروغ گوئی کے زمرے میں آتا تھا بلکہ عقلِ سلیم بھی ماننے کو تیار نہیں تھی۔ کمال سمجھ نہیں سکا کہ وکیل نے ایسا غیر اخلاقی اور نقصان دہ مشورہ کیوں دیا ہے؟ فریقِ ثانی کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے یا محض اپنی حماقت کی وجہ سے؟ جب کمال نے اس پر اعتراض کیا تو وکیل نے سیخ پا ہو کر یہ کہتے ہوئے اسے کمرے سے نکال دیا: "میں چودہ سالوں سے وکالت کر رہا ہوں اور تم مجھے قانون سکھانے آگئے ہو، نکلو باہر میرے کمرے سے ورنہ میں یہ مقدمہ چھوڑ دوں گا"۔

خادم نے وکیل کا مشورہ تو مان لیا مگر عدالت میں ثابت نہ کر سکا اگرچہ اس نے بہت کہا کہ کوئی زمیندار بھی وصولی کی رسید نہیں دیتا۔ اس نے صبیح الرحمن کے بارے میں بھی عدالت کو بتایا کہ وہ اس کے گھر آ کر مجبور کرتا رہا تھا کہ خادم اپنے حق سے دستبردار ہو جائے۔ مقدمہ چلتا رہا، تاریخ پر تاریخ پڑتی رہی، خادم کو ہر بار عدالت حاضر ہونا پڑتا۔ وکیل کی فیس اور دیگر اخراجات الگ، ان سب نے اسے زیر بار کر دیا۔ وہ مقدمہ ہار گیا۔

دل گرفتہ کمال کی دوسرے زمینداروں کے بارے میں اچھی رائے نہیں تھی۔ ایک بار رادھے شیام کے بھائی راجہ رام نے بغیر کسی خطا کے خادم کو بے عزت کیا۔ ہوا یہ تھا کہ خادم ایک روز گنا بیلنے والے کے پاس کھڑا تھا کہ نشے میں دھت راجہ رام وہاں آ پہنچا اور خادم کو کہنے لگا کہ تم نے فصل کٹنے کے بعد ہم سے صفائی کے لیے چاول لیے تھے مگر واپس بھوسہ کیا ہے۔ تم دھوکے باز اور مکار ہو۔ کیا تم نے ہمیں فقیر سمجھ رکھا ہے؟" اس کے منہ میں جو آیا، کہتا رہا۔ لوگ تماشا دیکھنے لگے۔ خادم پریشانی

کے عالم میں وہاں سے رادھے شیام کے پاس شکایت کے لیے پہنچا۔ اس نے بتایا کہ دراصل معاملہ یہ تھا کہ گھر کی ملازمہ نے چاولوں کی صفائی کرتے ہوئے بھوسہ الگ کر رکھا تھا۔ راجہ رام نشے کی حالت میں آیا اور بھوسہ دیکھ کر اول فول بکنے لگا۔ ہم سب خاموش رہے کیونکہ نشے کی حالت میں ہم اس سے کوئی بات نہیں کرتے۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس حد تک چلا جائے گا۔ اس نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس پر ہمیں افسوس ہے۔

اظہارِ افسوس تو بلاشبہ مخلصانہ تھا مگر اس سے خادم کے دل پر لگے زخم کا مداوا نہ ہوسکا کیونکہ اپنے عزیز واقارب اور دیگر لوگوں کی موجودگی میں اس کی عزتِ نفس کو گھائل کیا گیا تھا۔ کمال سوچ رہا تھا کہ اگر ایسا ہی رویّہ اس کے باپ کا راجہ رام کے ساتھ ہوتا تو کیا یوں آسانی سے معافی تلافی ہوسکتی تھی؟ بالکل نہیں۔ غربت نے اس کے باپ کو ایک ایسی جگہ لاکھڑا کیا تھا جہاں نقصان ہی نقصان تھا۔ اس کا باپ سارا سال ان کی زمینیں کاشت کرتا پھر بھی وہ صرف آدھی فصل کا حقدار ٹھہرتا، بقیہ نصف زمین کا مالک ہونے کی وجہ سے زمیندار کو حاصل ہوتی۔

رام چندر بینر جی کا معاملہ تو اس سے بھی خراب تھا۔ وہ کٹائی کے دنوں کے علاوہ کبھی بھی اپنی زمین پر نہیں آیا۔ اپنی نگرانی میں فصل کے حصے بخرے اس طرح کرواتا کہ خادم کو کبھی بھی اپنا حق پورا نہ ملتا۔ اجلے اور استری شدہ لباس میں ملبوس وہ کھڑا سگریٹ نوشی کرتا رہتا۔ معلوم ہوا کہ وہ میٹرک پاس ہے اور مقصود آباد کے سب رجسٹرار آفس میں کلرک ہے۔ کمال کی درخواست پر اس نے اپنا پتہ لکھا تھا، ''شری جکتا بابو رام چندر بینر جی''۔

پتہ دیکھ کر کمال قدرے الجھن میں پڑ گیا۔ اسے اپنے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی بات یاد آگئی کہ برطانوی عہد میں تمام اعلیٰ نوکریاں گوروں کے لیے مخصوص تھیں جنہیں عام لوگ ''صاحب'' کہتے تھے۔ آج کل ان عہدوں پر ہندوستانی تعینات ہیں مگر ابھی بھی وہ ''صاحب'' کہلاتے ہیں۔ آزادی سے قبل نچلے درجے کے عہدوں پر بالعموم مقامی لوگ ہی بھرتی کیے جاتے تھے جنہیں ''بابو'' کہا جاتا تھا۔ کسی ہندوستانی کے لیے ہیڈ کلرک بن جانا نوکری کی معراج تھی۔ اسے ''بڑا بابو'' کہتے تھے۔ کمال سمجھ نہ پایا کہ رام چندر نے اپنے نام میں ''بابو'' کا اضافہ کیوں کیا ہے۔ پوچھنے پر اس نے جواب دیا کہ زمیندار ہونے کی حیثیت سے وہ پیدائشی بابو ہیں۔ کمال کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھا، مگر خاموش رہا۔ فصل کی کٹائی صفائی ہوتے ہوتے اندھیرا پھیل گیا۔ رام چندر اکیلا واپس جانے میں ہچکچا رہا تھا اس لیے کمال اس کی رہائش گاہ تک ساتھ گیا۔

وہاں پہنچنے کے بعد کمال کو دھچکا سا لگا کیونکہ رام چندر نے اسے ایک بوری دیتے ہوئے گھر سے باہر گندے سے کمرے میں شب بسری کے لیے کہا۔ اسے بہت دکھ ہوا کیونکہ اس کے اپنے گھر میں گلی کے کتے کو بھی سردیوں میں ٹھٹھرنے کو باہر نہیں چھوڑا جاتا تھا، اور پھر رام چندر کے ساتھ وہ اپنی مرضی سے تو نہیں آیا تھا بلکہ زمیندار بھوت پریت کے خوف سے اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ کمال نے اپنی سبکی محسوس کرتے ہوئے فوری طور پر گھر کی راہ لی۔

دریا کنارے پہنچنے پر علم ہوا کہ مسافروں کی آخری کشتی روانہ ہوچکی ہے۔ اب وہ کیا کرے؟ گھر جانا بھی ضروری تھا لٰہذا اس نے گھاٹ سے ایک کشتی کھولی اور دریا کے دوسرے کنارے تک پہنچا۔ آدھی رات کو گھر پہنچنے پر اس کے ماں باپ سخت پریشان ہوگئے۔ پوچھنے پر اس نے سارا ماجرا سنا کر سوال کیا ''آخر اس نے ایسا سلوک کیوں کیا؟''

''کیونکہ وہ ہندو ہے''، خادم نے دکھی دل سے جواب دیا۔

''لیکن آنند کاکا اور گوپال بھی تو ہندو ہیں!''۔

''ہاں! وہ بھی ہندو ہیں''۔

''مگر انہوں نے تو میرے ساتھ کبھی ایسا سلوک نہیں کیا۔ وہ تو مجھ سے شفقت کرتے ہیں''۔

خادم نے قدرے تامل کے بعد جواب دیا،''وہ ہمارے جیسے ہیں مگر رام چندر ذرا مختلف ہے''۔

اس فرق کو کمال فوری طور پر نہ سمجھ پایا۔اس کا جواب اسے کچھ عرصہ بعد ملا۔یہ فرق صرف مذہب کے معاملہ میں نہیں بلکہ رہن سہن اور مالی حالات میں بھی تھا۔کمال ایک غریب کسان کا بیٹا اور رام چندر امیر شخص تھا،لہٰذا وہ اپنا مہنگا اور صاف ستھرا لحاف اسے کیوں کر دیتا۔اس قسم کے واقعات نے کمال کو مالی اور سماجی فرق پر غور کرنے پر مائل کیا ورنہ اسے تو طویل عرصہ تک علم ہی نہ ہو سکا تھا کہ اس کے اپنے مذہب کے علاوہ کوئی اور مذہب بھی ہے اور یہ کہ اس کے مذہب نے ہندوستان کی دھرتی میں جنم نہیں لیا تھا۔

....

اسکول میں سرسوتی پوجا کی تقریب منائی جاتی تھی۔اسلام بت پرستی اور کسی غیر اللہ کی عبادت سے منع کرتا ہے،لہٰذا اس تقریب میں کمال کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر وہ ان دنوں مذہبی فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہا تھا۔اس کے دوستوں نے اسکول میں ٹھہرنے کو کہا تو وہ مان گیا۔سب طلبا مل جل کر اس جگہ کی سجاوٹ کرنے میں مصروف تھے جہاں سرسوتی دیوی کی مورتی کو رکھا گیا تھا۔اس کے ایک استاد نے اسے اسٹیج کی سجاوٹ کے لیے کہا کیونکہ دوسرے لڑکے صحیح کام نہیں کر رہے تھے۔وہ خوشی خوشی اس طرف کیا مگر مسئلہ یہ آن پڑا کہ اسٹیج کی سجاوٹ کے لیے رنگین کپڑے کیسے لٹکائے جائیں۔کئی سالوں سے مختلف تقریبات میں شرکت کے سبب وہ جانتا تھا کہ خوبصورتی کیسے پیدا کی جاتی ہے لہٰذا یہاں بھی اس نے اپنا ہنر اور تجربہ آزمایا۔تمام اساتذہ اور لڑکوں نے سجاوٹ کو بہت پسند کیا۔

کمال کا ہم جماعت گوتم ہنس مکھ لڑکا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ وہ ہیڈ ماسٹر کا بیٹا ہونے کے سبب قدرے لیے دیئے اور محتاط رہتا تھا۔اس نے آہستگی سے کچھ کہا۔ایک اور ہم جماعت سمیر نے دھیرے سے پوچھا،تم کہاں تھے؟

''باہر،سگریٹ پی رہا تھا''۔

''سگریٹ پی رہے تھے یا لڑکیوں کو تاڑنے میں مصروف تھے؟''

''اوہ بھگوان! کیا کہہ رہے ہو؟ میں ایک شریف لڑکا ہوں''۔

''یعنی تم باہر کوئی اچھا کام کر رہے تھے''۔

''ہاں،بالکل''،گوتم نے مذاق میں جواب دیا۔

ان کے ایک اور دوست آننت نے دخل اندازی کرتے ہوئے پوچھا،''کیا سپنا آ گئی ہے؟''

گوتم نے قدرے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا،''اس کا نام مت لو۔ہمارے دوست کمال کو برا لگے گا۔سپنا تو اس کی ہے''۔

سپنا کا نام اپنے نام سے جڑتے سن کر کمال کے دل میں ایک عجیب سی مسرت کی لہر اٹھی۔وہاں سے اٹھ کر وہ رسوئی میں آ گیا جہاں کچھ لڑکے لچیاں اور شوربہ تیار کر رہے تھے۔کمال بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔اتنے میں سنسکرت کے استاد شیام داس چیٹر جی دیوی کی بھینٹ چڑھانے کے لیے کچھ پوریاں لینے وہاں آ گئے۔آننت نے ان کے پاس جا کر ہولے سے کہا،''سر! یہ پوریاں بھینٹ نہیں چڑھائی جا سکتیں''۔

شیام نے بلند آواز سے پوچھا،''کیوں؟''

کمال نے آننت کو یہ کہتے سنا،''کیونکہ کمال کے ہاتھ انہیں لگ چکے ہیں''۔

شیام نے پوریاں وہیں رکھیں اور باہر نکل گیا۔کمال کے جذبات کو ٹھیس سی لگی۔اس نے اپنے آپ سے سوال کیا،''اگر میرے ہاتھوں کا لمس اتنا ہی قابلِ اعتراض ہے تو یہاں میرا کیا کام؟ میرے خیال میں لوگوں کا کہنا ٹھیک ہی ہے کہ

ہندو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ واقعی وہ نفرت کرتے ہیں۔ بے شک وہ نفرت کرتے رہیں مگر میری یہاں موجودگی کیوں ان کی نفرت کا سبب بنی ہے؟''

وہ خاموش ہو کر اسکول سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پیالی دریا کے کنارے پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اسے ایک اور تکلیف دہ واقعہ یاد آ گیا۔

درگا دیوی اور چند دوسرے دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کو دریا میں بہانے کی رسم دیکھنے کمال بھی کشتی میں باقی لوگوں کے ساتھ جانے کا خواہش مند تھا۔ ایک بار اس نے سپنا سے اس خواہش کا ذکر کیا تو اس نے کہا: ''یہ کون سی بڑی بات ہے۔ مقررہ روز آ جانا، ہم دونوں باقیوں کے ساتھ کشتی میں بیٹھ جائیں گے''۔

مقررہ روز کمال وہاں پہنچ گیا۔ سپنا نے اپنے بڑے بھائی سے کہا: ''دادا! ہم بھی کشتی میں جائیں گے''۔ یہ سن کر وہاں کھڑے پجاری نے سوال کیا: ''کیا وہ لڑکا مسلمان نہیں ہے؟''

''جی ہاں، وہ مسلمان ہے''۔

''کیا ایک ملیچھ کی موجودگی میں درگا ماتا کو دریا میں بہایا جائے گا؟''، پجاری نے پوچھا۔

سپنا کا بھائی گڑبڑا کر بولا: ''نہیں، نہیں، بالکل نہیں''۔ اور پھر اپنی بہن کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا: ''کشتی میں تم دونوں کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں۔ تم اکیلی آ جاؤ''۔

سپنا نے بڑی بے چارگی سے کمال کی طرف دیکھا جو بالکل خاموش کھڑا تھا۔ سپنا دھیرے سے کشتی میں جا بیٹھی۔ توہین اور خجالت کا مارا ہوا کمال کنارے پر کھڑا کشتی کو دریا میں جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ کبھی بھی کسی پوجا کی تقریب میں نہ گیا۔ اب اس نے پنجگانہ نماز بھی ترک کر دی۔ ترکِ صلوٰۃ کا سبب بھی ایک واقعہ تھا۔

ہوا یہ تھا کہ اسکول میں وقفے کے دوران نمازِ ظہر کی ادائیگی کے لیے کمال مسجد جایا کرتا تھا۔ ایک روز سمیر نے اس سے خواہش کا اظہار کیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ کمال اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ جب وہ مسجد میں داخل ہونے لگے تو دروازے پر ایک شخص نے کمال کو ٹوکا: ''تم اسے اپنے ساتھ کیوں لائے ہو؟ دیکھا نہیں اس نے نیکر پہنی ہوئی ہے؟'' کمال کو یاد آ گیا کہ اسلامی قوانین کی رو سے مردوں کے لیے ٹخنوں سے ناف تک اور عورتوں کے لیے ٹخنوں سے چہرے تک کو ڈھانپنا لازم ہے مگر اس کے گاؤں والے سختی سے اس کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ یہاں کا موسم عرب کے موسم سے بہت مختلف ہے جس کی وجہ سے مکمل ستر پوشی موزوں نہیں سمجھی جاتی تھی، اور پھر لوگوں کو گرمی کے دنوں میں کھیتوں، کھلیانوں اور گھروں میں کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ کمال نے اس شخص کو جواب دیا: ''بہت سے لوگ اپنی بیٹی بیٹوں کو نیکر ہی میں جمعہ اور عیدین کی نمازوں کے لیے لے جاتے ہیں''۔

''کیونکہ وہ بہت چھوٹے ہیں اس لیے، مگر یہ لڑکا تو بڑا ہے''۔

اس دوران اور لوگ بھی دروازے پر جمع ہو گئے۔ شور سن کر امام مسجد بھی وہاں تشریف لے آئے۔ وہ کمال کے دینی رجحان کو نظرِ تحسین دیکھتے تھے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ انگریزی اسکول کا طالب علم ہونے کے باوجود اس کا مذہب کی طرف لگاؤ تھا۔ انہوں نے بات سن کر بڑی ملائمت سے کمال کو کہا: ''بیٹا! تم تو مذہبی احکام کو خوب جانتے ہو''۔

''جی مجھے بخوبی یاد ہے۔ اور خود آپ ہی نے تو ایک واقعہ سنایا تھا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں کشیدگی کے دوران کچھ کفار مارے خوف کے مسجد میں آ گئے۔ رسول اللہ وہاں موجود تھے۔ آپ نے انہیں مسجد ہی میں رکے رہنے کی اجازت دے دی اور جب نماز کا وقت آیا تو ان سے فرمایا کہ تم لوگ یہیں مسجد میں اپنے طریقے کے مطابق نماز پڑھ سکتے ہو۔ وہ مشرکین اسلامی قوانین کی پیروی نہیں کر رہے تھے اس کے باوجود اس سے مسجد کے تقدس پر کوئی حرف نہیں آیا۔ میں اپنے دوست کو ساتھ لایا ہوں

اور آپ لوگ۔۔۔۔۔'' لوگوں نے امام کی طرف دیکھا۔ سمیر سر جھکائے باہر آ گیا۔ کمال بھی اس کے پیچھے پیچھے مسجد سے نکل آیا۔

اس واقعہ کے بعد کمال نے دوبارہ مسجد کا رخ نہ کیا لیکن اس کی کایا کلپ محض ایسے واقعات کے سبب نہ تھی۔ حال ہی میں اسے جن دل شکن حالات سے واسطہ پڑا ان میں سے ایک چند روز قبل نویں جماعت کے سائنس سیکشن میں کلاس مانیٹر کے چناؤ کا واقعہ تھا۔ چھٹی سے آٹھویں جماعت تک وہ کلاس مانیٹر رہ چکا تھا۔ شبیر نے اس کا نام تجویز کیا۔ کمال کو علم نہیں تھا کہ دوسرے اسکولوں میں مانیٹر کے انتخاب کا طریقۂ کار کیا ہے جبکہ اس کے اپنے اسکول میں بالعموم کسی اچھے طالبِ علم ہی کو مانیٹر چنا جاتا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ حسبِ معمول اس سال بھی اسے ہی مانیٹر بنایا جائے گا مگر آننت نے اس کے نام پر اعتراض کرتے ہوئے نارائن کا نام تجویز کر دیا۔ کم و بیش تمام طلباء نے اس کی حمایت کی، اور یوں نارائن کلاس کا مانیٹر بن گیا۔

کمال کو بہت دکھ ہوا کہ آخر کس بنا پر اسے مانیٹر بننے کا اہل نہیں سمجھا گیا۔ وقفے کے دوران ایک طالبِ علم پری مل نے اس سے استفسار کیا، ''تمہیں پتہ ہے کیا ہوا تھا؟'' کمال نے ''نہیں'' میں جواب دیا۔ پری مل نے اسے تفصیل سے بتایا کہ کلاس شروع ہونے سے قبل سمیر آننت اور دوسرے طلباء سے اس موضوع پر بات کر رہا تھا کہ ایک مسلمان لڑکا کمال ہی کیوں ہر برس مانیٹر بنایا جاتا ہے؟ کلاس میں ہندو طلباء کی تعداد زیادہ ہے لہٰذا ہمیں ایک ہندو ہی کو منتخب کرنا چاہیے۔ اس نے نارائن کا نام تجویز کیا مگر نارائن اس سے متفق نہ ہوا۔ دوسرے لڑکوں نے اسے سمجھا کہ وہ مخالفت نہ کرے اور اگر وہ پھر بھی اتفاق نہیں کرتا تو اس کی بجائے کسی اور ہندو لڑکے کا نام تجویز کر دیا جائے گا، مگر کمال کو مانیٹر نہیں بننے دیں گے۔ اب نارائن کو متفق ہونا ہی پڑا اور پھر جو کچھ ہوا، تم جانتے ہی ہو۔

پچھلی جماعتوں میں مسلمان طلباء کی تعداد زیادہ تھی۔ پری مل کی بات سن کر کمال سوچنے لگا، کیا وہ اپنی قابلیت اور اہلیت کی وجہ سے نہیں بلکہ مسلمان طلباء کی تعداد کے سبب مانیٹر بنتا رہا ہے؟ اسے بالکل اچھا نہ لگا کہ محض مسلمان ہونے کے ناتے اس کا چناؤ ہوتا تھا۔ وہ اپنی اہلیت کی بنا پر آگے بڑھنے پر یقین رکھتا تھا مگر اب پتہ چلا کہ گذشتہ برسوں میں اس کے مانیٹر بننے کے پسِ پردہ اس کا مسلمان ہونا واحد سبب تھا۔ اس دفعہ مذہب ہی اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا کیونکہ کلاس میں اب ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اگر یہی بات ہے تو کیا وہ کبھی بھی وزیرِ اعلیٰ یا وزیرِ اعظم کے عہدے تک پہنچنے کے قابل ہو سکے گا؟ بالکل نہیں، اگر مذہب ہی واحد کسوٹی ہے تو مسلمان کبھی بھی ان علاقوں میں اعلیٰ ترین عہدوں پر پہنچنے کی توقع نہیں کر سکتے جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔

مقصود آباد ضلع میں مسلمان اقلیت میں نہیں تھے، بر اہی ضلع میں مسلمانوں کی تعداد اٹھاسی فیصد تھی اسی لیے اسکولوں میں مسلمان طلباء بھی زیادہ تھے مگر تعلیم اور معاشی میدان میں مسلمان ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے۔ چند ایک مسلم گھرانوں میں معاشی خوشحالی کے باوجود حصولِ تعلیم ان کی ترجیح نہیں تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ اچھے اساتذہ کی کمی کے سبب امتحانات میں مسلمان طلباء کوئی بہتر کارکردگی دکھانے سے قاصر تھے۔ اسکولوں میں سائنس کا مضمون اچھے نمبروں سے مشروط تھا، لہٰذا اس مضمون میں مسلمان طلباء کی تعداد انتہائی قلیل تھی۔ کمال کے اپنے سیکشن میں صرف تین مسلمان لڑکے تھے۔ اس کے لیے بڑا تکلیف دہ انکشاف تھا کہ اگر مسلمان طلباء کی تعداد زیادہ ہوتی تو وہ بآسانی کلاس کا مانیٹر منتخب ہو جاتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ سے وہ کبھی اس قسم کے چناؤ میں حصہ نہیں لے گا۔

لیکن فرقہ واریت کے زہر میں ڈوبے اس نظام میں ایسے واقعات سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ ابھی چند روز پہلے اس کے ہیڈ ماسٹر نے دعویٰ کیا کہ بک بینک سے موصول ہونے والی کتابوں کو اس نے منصفانہ طریقے سے تقسیم کیا ہے۔ ''ہمیں دسویں جماعت کے حساب کی چار کتابیں ملی تھیں، میں نے ایک کتاب مسلمان طالبِ علم کو، ایک ہندو کو اور دو کتابیں بالترتیب سیکنڈری سکول اور ST طلبا کو دی ہیں۔ کیا یہ تقسیم مناسب نہیں؟''

کمال نے داد دینے کی بجائے کہا، ''سر! اگر اس میں مذہب کا کوئی دخل نہیں تھا تب تو آپ کا فیصلہ صحیح ہے اور اگر کتابوں کی تقسیم مذہب کی بنا پر ہوئی ہے تو پھر یہ درست نہیں''۔

''کیسے؟''

''اس علاقے کے مسلمان ہندوؤں کی نسبت بہت غریب ہیں۔ اس اسکول میں 75 فیصد سے زیادہ مسلمان طلباء زیرِ تعلیم ہیں، لیکن آپ نے صرف 25 فیصد مسلمانوں کو اور باقی 75 فیصد کتابیں ہندوؤں میں تقسیم کی ہیں''۔

''تمہیں پتہ ہے کہ ہمارے آئین میں شیڈیولڈ کاسٹ وغیرہ کو تحفظ دیا گیا ہے''۔

''لیکن سر! سناتن بابو بتا رہے تھے کہ یہ تحفظ اسکولوں میں داخلے اور ملازمت کے لیے ہے، کتابوں کی تقسیم کے واسطے نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ کاسٹ ہندوؤں کے لیے آئین میں کوئی تحفظ نہیں''۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کچھ متردد ہوئے، پھر پوچھنے لگے، ''یہ باتیں تمہیں کس نے بتائی ہیں؟''

''سر! کسی نے بھی نہیں''۔

''میرا خیال ہے تم کچھ چھپا رہے ہو''۔

کمال ہیڈ ماسٹر صاحب کو باور نہ کرا سکا کہ وہ کچھ بھی نہیں چھپا رہا۔ یہ باتیں اسے کسی نے بھی نہیں بتائی تھیں۔ اگر ہیڈ ماسٹر صاحب کا دماغ حساس ہوتا اور وہ کسی اقلیتی فرقہ کے گھر میں جنم لیتے تو کمال کی مشکل سمجھ پاتے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔

....

جلوس میں کمال آگے آگے گلا پھاڑ کر نعرے لگا رہا تھا ''انقلاب زندہ باد، کمیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ) زندہ باد۔ اس سال ووٹ کا حقدار کون؟ درانتی، ہتھوڑا اور ستارہ۔ دنیا بھر کے غریبو! متحد ہو جاؤ، انقلاب زندہ باد''۔

وہ کمیونسٹ پارٹی کے جلسوں میں شرکت اور انتظام کرنے میں پیش پیش رہتا۔ جماعت کے رہنماؤں کی تجاویز اور مطالبات اس کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے تھے، مثلاً پارٹی کا نعرہ تھا ''زمین کاشتکار کی''۔ کمال چاہتا تھا کہ اس نعرے کو فی الفور عملی شکل مل جانی چاہیے۔ پارٹی بڑے زور شور سے مطالبہ کر رہی تھی کہ زمینداروں کی غیر کاشت شدہ زمین بے اراضی کسانوں میں تقسیم کر دی جائے۔ کمال کے خیال میں بھی زمین کی موجودہ غیر مساوی تقسیم منصفانہ نہیں تھی۔ ایک طرف تو وہ زمیندار تھے جو ہر قسم کی آسائش سے مستفید ہو رہے تھے اور دوسری جانب ایسے لوگ بھی تھے جنہیں دو وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی تھی۔ یہ تفریق ختم ہونی چاہیے۔ ہر ایک کو اتنا ہی ملنا چاہیے جتنا اس کا حق ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کا نصب العین بھی ملک میں پرولتاری حاکمیت کا قیام تھا۔

جب جلوس جلسہ گاہ پہنچا، پورا میدان لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ اسٹیج پر اس کا پسندیدہ گلوکار نغمہ سرا تھا، ''ہم ہوں گے کامران، ہم ہوں گے کامران، اک دن ہم ہوں گے کامران''۔ کمال کو یقین تھا کہ ایسا سوشلسٹ معاشرہ یقیناً ایک روز قائم ہوگا جب غیر مساوی نظام اور لوگوں کا استحصال ماضی کا قصہ رہ جائے گا۔ اس نے جلوس میں آئے ہوئے اپنے آدمیوں کو جلسہ گاہ کے شمالی حصہ میں پہنچنے کو کہا۔

موسیقی اور نغمہ سرائی ختم ہونے کے بعد جلسے کی باقاعدہ کارروائی کے آغاز کا اعلان ہوا۔ قانون ساز اسمبلی کے امیدوار عبدالعلی کے ساتھ بابو رام چندر بینرجی کو بھی اسٹیج پر بیٹھے دیکھ کر کمال کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اپنے ساتھ ہونے والا اس کا رویہ کمال کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اسے یہ منظور نہ تھا کہ جن لوگوں کے خلاف پارٹی کی تحریک اور جدوجہد تھی، اور جو غریبوں سے نفرت کرتے تھے، آج وہ اسٹیج پر براجمان ہیں۔ وہ تو اب تک بینرجی جیسے لوگوں کے خلاف کھڑا تھا۔ اگر یہ ان کے رہنما ہیں تو پارٹی

پروگرام کی پیروی چہ معنی دارد؟ اس کی جدوجہد پھر کس کے خلاف ہے؟

وہ بھاگا بھاگا ممبر لوکل کمیٹی کے پاس گیا اور بولا، ''فضل صاحب! رام چندر بینرجی کانگرس کے حمایتی ہیں۔ یہ ہمارے جلسہ میں اسٹیج پر کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟ ہماری ساری جدوجہد تو ان ہی لوگوں کے خلاف ہے۔ اگر وہ ہمارے رہنما بن گئے تو ہم کس کے خلاف احتجاج کریں گے؟''

''وہ آئے ہیں، چلے جائیں گے۔ ہم انہی لوگوں کو استعمال کر کے اپنی منزل تک پہنچیں گے''۔

''کون کس کو استعمال کرے گا؟ کیا ہم اپنے مقصد کے حصول کے لیے ان کو استعمال کریں گے یا پھر وہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر پارٹی کی لیڈرشپ کو سیڑھی بنائیں گے؟''

فضل صاحب کوئی معقول جواب نہ دے پائے۔ کمال نے کہا، ''میں اس جلسہ میں شامل نہیں ہوسکتا جہاں رام چندر ہمارا نیتا بنا بیٹھا ہو۔ میں جا رہا ہوں''۔ کمال یہ کہہ کر چل دیا۔ فضل صاحب نے روکنے کی ناکام کوشش کی، ''کمال ابھی رکو۔ میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں، اور عبدالعلی صاحب سے بات کروں گا مگر وہ اس وقت اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے تک انتظار کرلو اور انہیں اسٹیج سے نیچے آنے دو''۔

کمال نے فضل صاحب کی بات نہ مانی اور خاموشی سے جلسہ گاہ سے باہر آ گیا۔

....

آج یومِ رید تھا۔

'رید' اصل میں 'عید' کی بگڑی صورت تھی۔ بنگال کے اس علاقے میں 'ی' سے پہلے 'ر' کا اضافہ کردیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے عید کو 'رید' کہا جاتا تھا۔ عید مسلمانوں کا بہت بڑا تہوار ہے۔ ایک قمری سال میں دو عیدیں، یعنی عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ منائی جاتی ہیں۔ مقامی زبان میں انہیں 'روزرید' اور 'قربانی رید' کہتے ہیں۔ اوّل الذکر یکم شوال اور ثانی الذکر دس ذی الحج کو مناتے ہیں۔ 'فطر یا فطرانہ' اس خیرات اور مدد کو کہتے ہیں جو ماہِ رمضان کے اختتام اور عید کی نماز سے قبل غریبوں کو دینا لازم ہے۔ عید الفطر چونکہ روزوں کے بعد آتی ہے اس لیے مقامی لہجے میں اسے 'روزِرید' کہا جاتا ہے۔ عیدالاضحیٰ اس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے جب حضرت ابراہیم نے بحکمِ الٰہی اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل کی قربانی دینا چاہی تھی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر گلے پر چھری پھیر دی اور جب پٹی اتاری تو بیٹے کی جگہ ایک دنبے کو ذبح حالت میں دیکھا۔ اس واقعہ کی یاد میں صاحبِ ثروت مسلمان بھیڑ، بکرے، دنبے یا اونٹ کی قربانی دیتے ہیں اور اسی مناسبت سے اس دن کو 'قربانی رید' کہتے ہیں۔

مسلمانوں کے تہوار عیدین اور محرم قمری مہینے کے حساب سے منائے جاتے ہیں۔ شمسی سال کے 365 دنوں کے مقابلہ میں قمری سال میں چند دن کم ہوتے ہیں۔ فرض کیجیے اگر عید اس برس دس جنوری کو تھی تو پچھلے برس یہ تیس یا اکتیس دسمبر کو ہوئی ہو گی۔ ہندوؤں کے تہوار شمسی اور قمری دونوں مہینوں کے حساب سے طے کیے جاتے ہیں۔ مثلاً وجے دشمی کا تہوار بنگالی مہینے کارتک (اسون) میں چاند کی دس تاریخ کو منایا جاتا ہے، اس لحاظ سے درگا پوجا ہر سال ستمبر یا اکتوبر کو مناتے ہیں۔ پہلے یا بعد میں منانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان تہواروں کے برعکس عیدین ہر سال گذشتہ برس کی نسبت دس دن پہلے منائی جاتی ہیں۔

گذشتہ شام دیکھا گیا شوال کا چاند ماہِ رمضان کے اختتام کا اعلان تھا۔ مسلمان منہ میٹھا کرنے اور عید کی نماز کے بعد ایک دوسرے سے معانقہ کریں گے۔ کمال کے خاندان میں سب نے غسل کیا، نئے کپڑے پہنے، آنکھوں میں کاجل اور کپڑوں پر عطر وغیرہ لگا کر جوش وخروش سے عید کی تیاری شروع کردی۔ کمال کے دل میں کوئی جوش، کوئی خوشی نہیں تھی۔ وہ سب سے الگ تھلگ بیٹھا رہا۔

یہاں کم وبیش تمام تہوار مذہب کی بنیاد پر منائے جاتے تھے۔ اپنے بچپن میں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمام تہواروں، یعنی عیدین، محرم اور پوجا وغیرہ میں شرکت کرتا تھا۔ جیسے جیسے وہ مذہب سے دور ہوتا گیا، ایسے سب تہوار اس کے لیے ختم ہوتے رہے۔ وہ ان مواقع پر لوگوں سے ملنے جلنے سے بھی کترانے لگا تھا۔

کمال اپنے خیالات میں گم تھا کہ ماں کی آواز نے اسے چونکا دیا، ''تم نے ابھی تک غسل بھی نہیں کیا۔'' وہ بڑی ملائمت سے کہہ رہی تھی، ''آج بھی اگر تم باہر نہیں نکلے تو لوگ پتہ نہیں کیا کیا باتیں بنائیں گے۔ بہتر ہے کہ تم بھی چلو''۔

''ماں! تمہیں پتہ ہے کہ میں نماز نہیں پڑھتا''۔

''اگر تم نماز نہیں پڑھنا چاہتے تب بھی باہر نکلو، اِدھر اُدھر گھومو پھرو۔ کیا تمام لوگ اس وقت نماز ہی کے لیے باہر نکلے ہوئے ہیں؟''

''سارے بڑے بوڑھے نماز کے لیے گئے ہیں۔ وہاں موجود رہ کر نماز نہ پڑھنا دوسروں کی توہین ہے''۔

''ایسی ہی بات ہے تو جاؤ نماز پڑھو۔ تم پہلے بھی تو نماز ادا کیا کرتے تھے، اگر یہ قابلِ اعتراض کام ہے تو پہلے کیوں کرتے رہے ہو؟''

کمال اپنے والدین اور ہمسایوں کو سمجھانے سے قاصر تھا کہ وہ نماز پڑھنے سے اب کیوں بھاگتا ہے۔ وہ اتنے باشعور نہیں تھے کہ اس کی بات سمجھ پاتے۔ وہ خود تو اسلام کے پیروکار تھے اور اسے بھی اپنے جیسا بنانا چاہتے تھے۔ کمال نے جب بھی سمجھانا چاہا، الٹا اپنے آپ کو دکھ اور افسوس ہوتا۔ آخر اس نے اس موضوع پر ان سے بات کرنا ہی چھوڑ دی۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ پہلے وہ مذہبی احکام پر عمل پیرا تھا کیونکہ وہ ایک اچھا انسان بننے کا خواہشمند تھا اور اس کے نزدیک 'اچھا' اور 'مذہبی' ہونا ہم معنی تھے۔

خادم نے عیدگاہ سے واپس آکر بڑے طیش میں اپنی جائے نماز پھینکتے ہوئے کہا، ''عام طور پر مشہور ہے کہ تعلیم یافتہ بچوں کے والدین عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ میرا بیٹا تعلیم حاصل کر رہا ہے مگر میری حالت دیکھو''۔ کمال کی ماں کمرے سے باہر آئی مگر مجرموں کی طرح کھڑی رہی۔ خادم نے بیلوں کے لیے چارہ کترنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ بڑبڑا رہا تھا، ''لوگ کہتے ہیں کہ بچوں کو تعلیم دینے سے ماں باپ کی عزت ہوتی ہے۔ میری یہ عزت ہے! لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ کمال نماز کے لیے کیوں نہیں آیا؟ کیا اس کا اللہ پر ایمان نہیں ہے؟ میں نے انہیں جواب دیا، مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ جاؤ، اسی سے معلوم کرو''۔ مارے غصے کے اس نے درانتی سے اپنا بایاں انگوٹھا زخمی کر لیا۔ خون دیکھ کر کمال بھاگا بھاگا باپ کے پاس آیا مگر خادم نے اسے جھڑک دیا اور دائیں ہاتھ سے اپنے زخمی انگوٹھے کو دبائے ہوئے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ مریم نے جلدی سے دو چار گیندے کے پھول توڑے اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر انہیں مسلا اور گودا سا بنا کر خادم کے زخمی انگوٹھے پر لگانا ہی چاہتی تھی کہ اس کی خشمگیں نگاہیں دیکھ کر وہیں کی وہیں رک گئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے خادم اپنی بیوی سے بھی ناراض ہو۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ کمال کی غلطیوں اور خطاکاریوں کی ذمہ دار بہت حد تک اس کی ماں ہے۔ تلخ لہجے میں وہ گویا اپنے آپ سے بولا، ''پرائمری کے بعد میں اسے ہائی اسکول بھیجنے پر رضامند نہیں تھا لیکن اس نے میرا ساتھ نہیں دیا بلکہ بیٹے کی خیر خواہی کرتی رہی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کمال کا آج اللہ پر ایمان نہیں رہا''۔

کمال کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ نمازیں، حتیٰ کہ عید کی نماز چھوڑ دینے پر لوگوں نے اس کے باپ کو جلی کٹی سنائی ہوں گی اور اسی وجہ سے وہ اس قدر پریشان ہے۔ لیکن کمال کے نزدیک یہ مذہبی رسمیں بالکل فضول تھیں۔ وہ اس ممنوعہ پھل کے ذائقہ سے آشنا ہو چکا تھا جس نے اسے شعور اور آگہی عطا کی تھی۔

....

کمال بچپن ہی سے ایک اچھا انسان بننے کا خواہشمند تھا۔ جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی تھی اس میں مذہبیت اور اچھائی ہم معنی تھے۔ اچھا آدمی بننے کے لیے وہ صدقِ دل سے مذہبی احکام کی بجا آوری کرتا اسلام کے بارے میں زیادہ علم نہ رکھنے کے باوجود کلمہ گوئی اور نماز روزے کی ادائیگی اس کا معمول تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات کبھی بھی نہیں آئی تھی کہ نماز روزے کی پابندی کیے بغیر بھی کوئی شخص اچھا ہو سکتا ہے۔

بچپن ہی سے وہ دیکھتا آرہا تھا کہ ساتھ والے گاؤں کے لوگ اللہ کی بجائے بھگوان کی عبادت کرتے ہیں۔ مسجد میں نماز پڑھنے کی بجائے وہ مندر میں پوجا پاٹ کے لیے جاتے۔ اگر وہ خود مسلمان خاندان میں پیدا نہ ہوا ہوتا تو اچھا انسان بننے کی خواہش میں کسی مندر میں جا کر پوجا کرتا۔ بھگوان کی پوجا کرنے والوں کو ہندو اور اللہ کی عبادت کرنے والوں کو مسلمان کہا جاتا تھا۔ اس کی اپنی مسلمانی بسنت پور گاؤں کے سبب تھی کیونکہ وہاں اسلام کے علاوہ اور کوئی مذہبی اثر نہیں تھا۔ شروع شروع میں تو اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ جس مذہب کی وہ پیروی کر رہا ہے اسے اسلام کہتے ہیں نہ وہ یہ جانتا تھا کہ اس دین کے بانی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیدائش کسی اور سرزمین پر ہوئی تھی۔

بڑی کلاسوں میں جانے پر ہی کمال کو ان باتوں سے آگاہی ہوئی۔ اب اس نے جانا کہ اسلام اور ہندومت کے علاوہ بھی متعدد مذاہب ہیں، مثلاً عیسائیت، یہودیت، بدھ مت، جین مت، سکھ دھرم، جاپان کا شنٹومت، ایران کا زرتشتی دین اور چین میں کنفیوشس کی تعلیمات۔ سب کچھ جان کر کمال بڑا متذبذب ہوا۔ وہ اس گتھی کو نہ سلجھا سکا کہ دنیا کے سات براعظموں میں سے صرف ایشیا، اور اس میں بھی ہندوستان اور مشرقِ وسطیٰ، بالخصوص فلسطین میں بڑے بڑے مذاہب نے جنم لیا تھا۔ ہندو مت، بدھ مت، جین مت اور سکھ دھرم کی جنم دھرتی اس کا اپنا ملک ہندوستان تھا۔ مہاتما بدھ کی پیدائش ہمسایہ ملک کی سرحد کے پاس ہوئی تھی۔ ہندومت کسی ایک شخص کے ذہن کی پیداوار نہیں۔ پوجا پاٹ کی رسموں، اصولوں، ضابطوں اور قوانین پر صدیوں سے عمل ہوتا آیا ہے جنہیں ہندومت کا نام دیا گیا۔ خود ہندوؤں کی مختلف ذاتوں، فرقوں اور علاقوں میں مذہبی رسموں کے سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً، تامل ہندوؤں میں ماموں بھانجی کی شادی معیوب نہیں سمجھی جاتی جبکہ بنگال میں یہ ممکن نہیں۔ شیو دیوتا کے پجاری، اسے برا بھلا کہنے والے، حتیٰ کہ بے دین لوگوں کو بھی ہندو کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام اور عیسائیت میں ایسا نہیں۔ مسلمان بننے کے لیے کلمہ پڑھنا، نماز روزے کی پابندی اور صاحب استطاعت لوگوں پر حج کی ادائیگی بنیادی شرائط ہیں۔ کمال کے والدین، عزیز و اقارب اور ہمسایوں نے اس کے دل میں یہ بات بٹھادی تھی کہ ان پر عمل کرنے سے ہی انسان اچھا بنتا ہے۔ ایک اچھا شخص اس دنیا میں بنظرِ احترام دیکھا جاتا اور آخرت میں دائمی مسرت اور امن کی زندگی پاتا ہے۔ بصورتِ دیگر اسے دنیا میں نفرت اور بعد از وفات جہنم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ قوانین خدائے مطلق کی جانب سے ہیں۔

ان قوانین کا تفصیلی اور باریک بینی سے مطالعہ کمال کا مقصد بن گیا تاکہ ان پر عمل پیرا ہو کر وہ ایک اچھا انسان بن سکے۔ مطالعہ سے اسے معلوم ہوا کہ اسلامی قوانین اور اصولوں کے تین بنیادی ماخذ ہیں: قرآن، حدیث اور سنتِ نبوی۔ پیغمبرِ اسلام پر احکام الٰہی کا نزول قرآن کی صورت میں موجود ہے، انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ احادیث کی مختلف کتابوں میں محفوظ ہے، اور ان کے اپنے اعمال کو سنت کہا جاتا ہے (اگر چہ کچھ علماء کی نظر میں سنت اور حدیث میں کوئی فرق نہیں، بلکہ احادیث کو بھی تین اقسام میں منقسم کیا گیا ہے، یعنی جو نبی اسلام نے فرمایا، وہ کام جن پر انہوں نے عمل کیا، اور جن کی اجازت یا ممانعت کی)۔ قرآن، حدیث اور سنت کو شریعت کہتے ہیں۔

کمال ہائی اسکول میں آنے تک شریعت پر عمل کرتا رہا، یعنی پنج وقتہ نماز کی ادائیگی اور ماہِ رمضان کے روزوں کی پابندی وغیرہ۔ لیکن نویں جماعت میں آ کر اس کی ذہنی کایا پلٹ ہوگئی۔

ہوا یہ کہ ساتویں جماعت سے اس نے بنگالی اور انگریزی کے علاوہ عربی زبان بھی بطور اختیاری مضمون پڑھنا شروع کر دی۔ سنسکرت یا عربی زبانوں میں سے کسی ایک کو اختیاری مضمون کی حیثیت حاصل تھی۔ چونکہ وہ قرآن پڑھ چکا تھا اس لیے عربی زبان ہی اس کا واحد انتخاب تھا۔ دو سال پڑھنے سے اسے عربی کی کچھ شد بد حاصل ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ عربی زبان سیکھ کر قرآن کو بہتر طور پر سمجھ سکے گا مگر نویں جماعت میں آ کر اس نے عربی کی بجائے سائنس کا مضمون اختیار کر لیا۔ چونکہ عربی بطور زبان مزید نہ پڑھی جا سکی اس لیے اس نے قرآن کے بنگالی اور انگریزی تراجم پر اکتفا کیا۔

قرآن کی تلاوت اور نمازوں کی پنجگانہ ادائیگی میں قرآنی سورتوں کے معنی اور مفہوم سے اگرچہ وہ آگاہ نہیں تھا اس کے باوجود یہ سب کچھ قابلِ قدر تھا۔ مثلاً قرآن کی پہلی سورۃ فاتحہ میں ہے:

اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔
تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے، رحمٰن اور رحیم ہے، روزِ جزا کا مالک ہے۔
ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔
ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔

سب الفاظ بالکل آسان اور قابلِ فہم ہیں۔ نماز کی ہر رکعت میں اس سورۃ کا پڑھنا لازم ہے، گویا ایک دن میں چوالیس مرتبہ، اور نمازِ جمعہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ سورۃ باون بار پڑھی جاتی ہے۔ کمال سمجھنا چاہتا تھا کہ نماز میں اس سورۃ کو چھوڑنا گناہوں کے زمرے میں کیوں آتا ہے؟ لیکن چھوٹے سے گاؤں اور ہندو اساتذہ میں سے کوئی اس کی رہنمائی کرنے کا اہل نہیں تھا۔ کوئی ایسا صاحبِ علم شخص بھی نہ ملا جو اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکے۔ اس کے ذہن میں گناہ اور نیکی کا تصور یہ تھا کہ کسی شخص کو ہلاک کرنا اور اسے اس کے حق سے محروم کرنا گناہ اور دوسروں کی مدد کرنا نیکی ہے۔

اس کے ذہن میں اسی قسم کے متعدد سوالات کلبلا رہے تھے۔ اسلام بت پرستی کو گناہ کہتا ہے اور اس کا مرتکب جہنم کا سزاوار۔ لیکن ہندو اپنی نجاتِ اخروی کے لیے مختلف دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں۔ مذہبی عقیدے کی رو سے اللہ یا بھگوان ہی فیصلہ کرتے ہیں کہ کون کہاں پیدا ہوگا۔ بچہ بالعموم اپنے ماں باپ اور پرکھوں ہی کا مذہب اختیار کرتا ہے۔ ہندو گھرانے میں جنم لینے والا دیوی دیوتاؤں کی پوجا کو دھرم سمجھتا ہے جبکہ مسلمان گھر میں پیدا ہونے والا بتوں کی پوجا کرنے کو گناہ سمجھتا ہے۔ گویا ہر بچے کا دین دھرم وہی ہے جو اس کے ماں باپ کا ہے، اور یقیناً ہر بچہ اپنے بڑوں کے طریقۂ عبادت ہی کو افضل اور درست سمجھتا ہے۔

کمال کو پیغمبر اسلام کی بے پناہ ذہانت پر کوئی شک نہیں تھا۔ انہوں نے پیدائش سے وفات تک ہر کام کے لیے قواعد وضوابط تشکیل دیئے ہیں۔ اگر انہیں اللہ کی طرف منسوب نہ کیا جاتا تو شاید کوئی شخص بھی ان پر عمل کرنے کا روادار نہ ہوتا۔ زمانہ قدیم ہی سے ایک خالقِ مطلق کا تصور پایا جاتا ہے۔ مختلف مذہبی رہنماؤں نے اس ہستی کو اپنے اپنے ناموں سے موسوم کیا، مثلاً عیسیٰ نے خداوند کہا تو محمد نے اللہ۔ محمد نے خود کو اللہ کا پیغمبر کہا۔ ہندوستان میں ہندو، بدھ اور جین دھرموں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ جب دنیا گناہوں اور برائیوں سے بھر جاتی ہے تو اس کی پُوترتا کے لیے بھگوان اوتار، بدھا اور تھرتھنکر کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایشیائے غرب کے زرتشتیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ جب لوگ مذہب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں تو خدا ان کی اصلاح کے لیے نبیوں پیغمبروں کو مبعوث کرتا ہے۔ یہ ہستیاں اپنے ہر حکم کو خالقِ کائنات سے منسوب کرتی ہیں۔ ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ جیسے نبیوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ تقریباً ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے پیغمبروں کی پیشگوئی بھی کی تھی۔ حضرت محمد کی استثنائی حیثیت تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کا آخری پیغمبر کہا۔ پاکستان میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے

کی بنیاد بھی یہی تھی کیونکہ یہ لوگ غلام احمد کو نبی مانتے ہیں جو حضرت محمد کے دعویٰ اور اعلان کے بالکل خلاف ہے۔

''قرآن ایک الہامی کتاب ہے جو پیغمبرِ اسلام پر نازل ہوئی اور یہ کہ وہ اللہ کے آخری نبی ہیں''۔ یہ دو عقیدے تغیر شدہ حالات کے پیشِ نظر مسلم معاشرے میں تبدیلی نہیں لا رہے۔ حضرت محمد بلاشبہ انتہائی ذہین تھے۔ ان کی تعلیمات اپنے زمانے اور علاقے کے مطابق موزوں یا بہترین ہوسکتی ہیں۔ مثلاً اس دور میں عرب خواتین کی حالت ناگفتہ بہ حد تک قابلِ رحم تھی۔ دولت مند لوگ سینکڑوں عورتوں سے شادی کرنے کے علاوہ متعدد عورتوں کو خرید کر باندی بنا لیتے۔ یہ باندیاں مالک کی مناسب توجہ سے محروم رہتیں، اور پھر یہ بھی تھا کہ انہیں بالعموم دوسروں سے میل ملاپ کی کم ہی اجازت تھی۔ متعدد مرد ایک عورت سے جنسی تعلقات قائم کرتے اور بچے کی پیدائش پر ان میں سے کسی ایک کو اس کا باپ تسلیم کیا جاتا۔ ایسے معاشرے میں نبی اسلام کا حکم کہ بیویوں کی تعداد چار سے زیادہ نہیں ہوگی اور یہ کہ وہ والدین اور خاوند کی وراثت میں حصہ دار ہیں، ایک زبردست ترقی یافتہ اقدام تھا۔ ان کا حصہ مردوں کے مساوی نہیں، لیکن آج کے زمانے میں جبکہ عورتیں مردوں کے مساوی حقوق کی مالک ہیں، اس قانون میں ترمیم ہونی چاہیے تاکہ مسلمان عورتوں اور مردوں میں مساوات قائم ہو۔

اس زمانے میں غلامی کا رواج تھا۔ سورۃ النساء کی آیت نمبر تین میں حکم ہے:

''اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو، یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں۔ بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرینِ صواب ہے''۔

اسی سورۃ کی آیت نمبر چوبیس میں ہے:

''اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں، البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو (جنگ میں) تمہارے ہاتھ آئیں''۔

اس سے اگلی آیت میں ہے:

''۔۔۔۔۔ جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں (محصنات) سے نکاح کر سکے اسے چاہیے کہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمہارے قبضہ میں ہوں۔ ۔۔۔۔ ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کر لو''۔

چونکہ دورِ جہالت میں غلامی کا رواج تھا، اس کے مدِ نظر یہ علاج معقول اور صحیح تھا۔ اب چونکہ غلامی کا دور ختم ہو چکا ہے اس لیے ان احکام پر نظرِ ثانی کی جاسکتی ہے۔

....

کمال سمجھنا چاہتا تھا کہ اللہ قادرِ مطلق، غالب اور علیم و خبیر ہے، پھر وہ اس قسم کے ناقابلِ تبدل احکام کیسے دے سکتا ہے۔ علاوہ ازیں، ان میں تکرار بھی بہت ہے۔ ایک ہی بات کو بار بار کہا جا رہا ہے۔ علیم و خبیر، رحمٰن و رحیم اور دیگر کئی صفاتِ الٰہی کی تکرار بڑی واضح ہے۔ پھر اس کی نگاہ میں سورۃ التحریم کا نزول بھی محمد رسول اللہ کی عائلی زندگی میں اللہ کی جانب سے معاونت کی مثال ہے۔ ان کی متعدد بیویاں تھیں جن کے درمیان فطرۃً کچھ کشمکش رہتی تھی۔ ایک روز آپ نے اپنی زوجہ حفصہ کی غیر موجودگی میں ان کے گھر پر مریم کے ساتھ چند گھڑیاں گزاریں۔ حفصہ کو علم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوئیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کو شہد بہت پسند تھا۔ وہ ہر روز صبح کے وقت زینب کے گھر جا کر شہد کھایا کرتے تھے۔ ان کی ازواج عائشہ اور حفصہ کو یہ پسند

نہ تھا۔ ایک روز ان دونوں نے رسول اللہ سے کہا کہ ان کے منہ سے کچھ بد بو آ رہی ہے۔ اس پر آپ نے شہد کھانا چھوڑ دیا۔ اس وقت سورۃ التحریم کی پہلی آیت نازل ہوئی:

''اے نبی! تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے؟ (کیا اس لیے کہ) تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو؟''

علاوہ ازیں، خدا کے بارے میں اس کا عقیدہ یہ ہو گیا کہ انسان کی تخلیق میں کسی قادرِ مطلق اور الوہی قوت کا کردار نہیں بلکہ اس کے برعکس خالقِ کائنات کا تصور انسان کے ذہن کی پیداوار ہے۔

....

نرمل ساہا اسکول میں بنگالی ادب پڑھاتے تھے۔ کمال کو اس مضمون سے لگاؤ تھا۔ اس کی ایک مختصر کہانی اسکول میگزین کے پچھلے شمارے میں شائع ہو چکی تھی۔ اسے لگا کہ وہ اس میں ادیب بننے کے جوہر موجود ہیں لیکن ادیب بننے کے لیے صرف امتحانی نقطۂ نگاہ سے پڑھنا کافی نہیں، اسے عالمی ادب کے شاہکار ادبی پاروں سے بھی روشناس ہونا ہوگا۔ اس خیال اور سوچ نے اسے مسٹر ساہا کے نزدیک کر دیا جو بنگالی ادب کا استاد ہونے کے علاوہ لائبریری کے انچارج تھے، اور انہیں کتابوں کے انتخاب کا اچھا ذوق بھی تھا۔ کمال لائبریری سے کتابیں لے جا کر اتوار کے روز مطالعہ کرتا اور اگلے دن ساہا صاحب کے ساتھ ان پر گفتگو کرتا۔ گذشتہ اتوار اس نے رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتا نجلی ختم کی تھی۔ نہ صرف ساتھی طلباء بلکہ کچھ اساتذہ کو بھی یقین نہ تھا کہ کمال اس عمر میں گیتا نجلی جیسی کتابوں کو سمجھ پایا ہے مگر اسے اور ساہا صاحب کو اس بے یقینی کی قطعاً پروا نہیں تھی۔

ساہا صاحب مشہور بنگالی ادیب بنکم چندر چٹو پادھیائے کے بہت معتقد تھے۔ اس کی کتاب آنند مٹھ پر گفتگو کرتے ہوئے وہ جذباتی ہو جاتے جو ان کے خیال میں ''ایک ناول ہی نہیں تھا بلکہ اس نے بہت سے لوگوں کے دلوں میں غیر ملکی راج سے نجات پانے کی آگ بھڑکا دی تھی۔ یہ کتاب آزادی کے متوالوں کے نزدیک ایک مذہبی نوشتہ تھا۔ ہمارا قومی ترانہ اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔ بے شمار لوگ اس ادبی شاہکار سے حب الوطنی کے جذبات کی تحریک پاتے ہیں''۔

متعدد کتابیں پڑھنے کے باوجود کمال اس کے مطالعہ سے تا حال محروم تھا جس کے سبب وہ خود کو تقصیروار سمجھتا تھا۔ پیریڈ ختم ہوتے ہی وہ لائبریری گیا مگر اسے آنند مٹھ نظر نہ آئی جس پر اس نے بنکم چندر کی تحریروں کا مجموعہ عاریتاً لیا اور کلاس میں بیٹھ کر جستہ جستہ ورق گردانی کی۔ اس کا ابتدائیہ شاندار اور ابواب مصنف کی فکری تخلیق کی نشاندہی کرتے تھے۔ ناول کے دسویں باب میں ایک کردار بھابندا کی زبانی کہلوایا گیا کہ اسے اپنا قومی ترانہ مل گیا ہے۔ اسے پڑھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ بھابندا ایک دوسرے کردار مہندر سے بات کر رہا تھا:

''۔۔۔۔۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا ملک بھی ہے جہاں کے لوگ اپنا روپیہ پیسہ محفوظ جگہ رکھنے کے باوجود مطمئن نہ ہوں؟ راج گدی میں لگے مقدس پتھروں کی حفاظت نہ ہو؟ اپنی بہو بیٹیوں اور ان کی کوکھ میں موجود بچوں کی سلامتی نہ ہو؟ جہاں رحم مادر میں پلنے والے بچے کو شکم چیر کر نکالنے اور مار ڈالنے کا کام نہ ہو؟ دوسرے ملکوں کے حکمران اپنی رعایا کی حفاظت کرتے ہیں مگر مسلمان حکمران تو ہماری قطعاً پروا نہیں کرتا۔ دھرم، ذات پات اور عزت خراب کی جاتی ہے، اب تو زندگی بھی اسی لپیٹ میں آ گئی ہے۔ اگر داڑھی والوں کو یہاں سے باہر دھکیلا نہ گیا تو کیا ہمارے رسم و رواج، رہن سہن اور پوتر مقامات محفوظ رہ جائیں گے؟

''ان کو کیسے باہر نکالا جائے؟'' مہندر نے پوچھا۔

''دھکے مار مار کے''۔

اس گفتگو میں کمال کو کہیں بھی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کا ذکر نہ ملا۔ لے دے کے ہندوؤں کے رسم ورواج، رہن سہن اور اشیائے مقدسہ کے تحفظ کی باتیں تھیں اور وہ بھی مسلمانوں سے، انگریزی راج کا کوئی ذکر نہ تھا۔ آخر مسلمانوں کو دیش نکالا کیوں دیا جائے؟ ہندو رسم ورواج کو انہوں نے کیسے تباہ کیا؟ گوپال داد اور آنند کا کے مذہبی عقائد میں اس کے باپ نے کیسے خرابی پیدا کی؟ کیا بنکم چندر خبطی تھا؟ مسٹر ساہا اس ناول کو کیوں اتنا پسند کرتے ہیں؟

کمال نے از سر نو اس کا مطالعہ کیا مگر تحریکِ آزادی سے متعلق کچھ بھی نہ پایا۔ مسٹر ساہا نے کس طرح مسلمانوں اور کمال کی دیش بدری کو تحریکِ آزادی سمجھ لیا ہے؟ بات تو ہو رہی ہے بارِیش لوگوں کو ملک سے نکالنے کی تاکہ ہندوؤں کے رہن سہن کا تحفظ ہو سکے۔ اس عدمِ تحفظ اور اہانت پر مشتمل الفاظ نے کمال کے دماغ میں مخالفانہ جذبات کو جنم دیا۔ اس نے انہیں اپنے دل ودماغ سے جھٹک دینے کی کوشش کی۔ ناول کے اس پیرایہ کو متعدد بار پڑھا تاکہ کہیں سے بھی کوئی ایسا اشارہ ملے کہ اس کی اپنی ذات ان الفاظ کا ہدف نہیں۔ بنکم چندر نے غالباً ''مسلمان حکمران'' کو ملک سے نکالنے کی بات کی ہے، اس کا اشارہ عام مسلمانوں کی طرف نہیں۔ مگر یہاں ''بارِیش لوگوں'' کے الفاظ نے کمال کو الجھن میں ڈال دیا۔ ''مسلمان حکمران'' تو ایک شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ ''بارِیش افراد'' جمع کا صیغہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمران کے ساتھ دیگر لوگ بھی شامل ہیں جنہیں دیش نکالا دینے کی بات ہو رہی ہے۔ تاہم کمال اپنی ہی اس دلیل اور تفہیم سے متفق نہ ہو سکا۔ پھر اس نے خیال کیا کہ بنکم چندر نے حکمران اور اس کے قریبی ساتھیوں کو ''بارِیش لوگ'' کہا ہوگا۔

اس نے پھر سے پڑھنا شروع کیا مگر جلد ہی اسے پھر الجھن نے گھیر لیا۔ بنکم چندر نے لکھا تھا:

> ''اس کو پلے باندھ لو۔ ایک انگریز اپنی جان خطرے میں دیکھ کر بھی راہِ فرار اختیار نہیں کرتا جبکہ مسلمان معمولی سی بات پر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ انگریزوں میں عزم وارادے کی پختگی ہے، وہ اپنے کاموں کو تکمیل تک پہنچاتے ہیں، لیکن مسلمان ان سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ وہ صرف دولت کے لیے اپنی جان قربان کر سکتے ہیں۔ اب آئیں لفظ ''حوصلہ مندی'' کی طرف۔ توپ کا گولہ کسی ایک جگہ پر ہی گرتا ہے، دس بیس جگہوں پر نہیں، لہٰذا ایک گولہ گرنے سے دوسو لوگوں کو بھاگنے کی ضرورت ہی نہیں مگر مسلمانوں کا پورا ٹولہ ہی بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس گولہ باری متواتر ہو رہی ہو تو ایک انگریز سپاہی بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔''

یہاں ''مسلمان حکمران'' کا کوئی حوالہ نہیں، بلکہ مسلمانوں کا عمومی ذکر ہے۔ مسلمانوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے ناول نگار غلط سلط اور غیر منطقی باتیں لکھنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اوّلاً یہ کہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ ''انگریزی'' اور ''انگریز'' ایک لسانی شناخت جبکہ ''مسلمان'' مذہبی پہچان ہے۔ برطانوی باشندے جن کی مادری زبان انگریزی ہے، وہ سب انگریز کہلاتے ہیں، لیکن دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والوں کو مسلمان، مسلم یا محمڈن کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف ایک شخص جس کی مادری زبان انگریزی ہو، اسلام قبول کر کے مسلمان ہو سکتا ہے، بلکہ بہت سے انگریزوں نے اسلام قبول کر رکھا ہے، وہ سب مذہب کے فرق کے باوجود انگریزی بولتے ہیں۔ یہ فرق یا تو مکمل لاعلمی پر دلالت ہے یا محض داستان گوئی۔ آخر بنکم چندر نے ایسا کیوں لکھا؟

بہرحال کمال نے مطالعہ جاری رکھا۔ کہیں بھی بدیشی راج کے خلاف کسی تحریک کا ذکر نہیں تھا۔ صرف مسلمانوں پر ہی لعن طعن اور ان کے خلاف ہندوؤں کی اشتعال انگیزی تھی۔ ناول کے دوسرے حصہ کے تیسرے باب میں شانتی کی تھامس کے ساتھ گفتگو اس کا واضح ثبوت تھا جب شانتی اس سے سوال کرتی ہے کہ ''لڑائی تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہے، تم لوگ بیچ میں کہاں سے آ گئے ہو؟''

ہندو مسلمان چپقلش کو تحریکِ آزادی کا نام کیسے دے دیا گیا؟ اس دھرتی کے ایک عام ہندو کو کیوں مسلمان کے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے؟ کیا مذہب کے نام پر لوگوں کو تقسیم کرنا آزادی حاصل کرنے کے مترادف ہے؟ کمال کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ناول کے مطابق ہندو گروہوں کی صورت میں مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا کر لوٹ مار کر رہے تھے۔ اگر آنند کا کا اور گوپال دادو بھی انہی کی طرح میرے گھر کو نذرِ آتش کرنے آ گئے تو؟ نہیں، نہیں، ایسا بالکل نہیں ہوگا بلکہ وہ تو آ کر لگی آگ کو بجھائیں گے، کمال نے خود کو تسلی دیتے ہوئے سوچا۔

پھر بنکم چندر نے ایسی غیر حقیقی اور امکانات سے تہی داستان سرائی کیوں کی ہے؟ کیا اس کا مقصد ملک میں گوروں کی حکومت قائم رکھنا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو کس حساب سے ان کی حکومت کو انگریز راج کے خلاف تحریکِ آزادی کہا جا رہا ہے؟ ایسے ہی سوالات کمال کے دماغ میں کچوکے لگا رہے تھے۔ وہ ساری رات جاگتا رہا۔ اگلی صبح اس نے چند ایک اور ناولوں پر نگاہ ڈالی۔ اس نے دیکھا کہ ان میں بھی اس قسم کی بے جواز اور لایعنی باتیں موجود ہیں۔ درگیش نندنی، مرینلنی، سیتارام وغیرہ اس کی چند مثالیں تھیں۔

ایک اور ناول ''راج سنگھا'' کے آٹھویں حصہ کے پانچویں باب میں چنچل کماری اودھے پوری کو کہتی ہے:

> ''اگر بادشاہ سلامت ملک بھر کی تمام مساجد، بشمول جامع مسجد، دلی، کو مسمار کر دیں اس صورت میں تمہیں رہائی مل سکتی ہے''۔

اسی طرح ''سیتارام'' کے تیسرے باب میں بنکم چیٹر جی کے الفاظ ہیں:

> ''گھر واپس آ کر رام اپنی عمر رسیدہ ملازمہ سے پوچھتا ہے، 'کیا مسلمان لڑکوں کو قتل کرتے ہیں؟' اس کی ملازمہ جواب دیتی ہے، ''کیا مطلب؟ وہ گائے کا گوشت کھاتے اور نماز پڑھتے ہیں۔ لڑکوں کو کیوں قتل کریں گے؟''

کمال نے تو اس گمان میں آنند مٹھ کا مطالعہ کیا تھا کہ اس کے استاد کے مطابق اس سے تحریکِ آزادی میں لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مطالعہ کے بعد اس کے اپنے دل میں بھی ایسے ہی جذبات پیدا ہوں گے لیکن ناول نے تو اسے انتہائی مایوس اور دل گرفتہ کر دیا تھا۔ ناول نگار نے بلاضرورت مسلمانوں کی اس قدر تضحیک کی تھی کہ کمال کا دل گھائل ہو کے رہ گیا۔ مسلمانوں کو دیش بدر کرنے کی باتیں کیسے اس کے دل میں جگہ پاتیں؟ انگریز حکومت کے قیام کی خواہش کو وہ کس طور انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک سمجھ سکتا تھا؟

اگلے روز وہ ذرا جلدی اسکول چلا گیا۔ جیسے ہی مسٹر ساہا پہنچے، اس نے ان سے متعدد سوال کیے۔ ساہا صاحب نے دھیمی سی مسکراہٹ سے جواب دیا، ''ہاں، آنند مٹھ میں چند ایک مقامات پر مسلمانوں کے خلاف کچھ باتیں ہیں لیکن ان کا اشارہ مسلمان حکمرانوں کی طرف ہے، سب مسلمانوں کی طرف نہیں''۔ یہ سن کر کمال ششدر رہ گیا۔ کیا اس نے ناول کو صحیح طور پر نہیں سمجھا؟ اس نے کتاب کھولی، دوبارہ پڑھا، مگر نہیں، اسے سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنے استاد سے کتاب کا ایک پیرا پڑھنے کی درخواست کی۔

ساہا صاحب نے عینک لگائی اور پڑھنے لگے:

> ''سب کچھ کہہ دیا گیا ہے، مسلمان مغلوب ہو گئے ہیں۔ اب یہ ملک ہندوؤں کا ہے۔ سب مل کر باآواز بلند نعرہ لگاؤ، ہری رام! لوگوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ کچھ ہندو ایک جتھے کی صورت میں گاؤں کے مسلم علاقے میں گئے، گھروں کو نذرِ آتش کر کے تمام مال اسباب لوٹ لیا۔ بہت سے مسلمانوں نے داڑھیوں کا صفایا کر کے بدن

پر کیچڑ کا لیپ کر لیا اور ہری رام ہری رام جپنے لگے۔ پوچھنے پر ہر کوئی یہ جواب دیتا، 'میں تو ہندو ہوں'۔ دہشت کے مارے مسلمان گروہوں کی شکل میں شہروں کی جانب بھاگے۔۔۔۔۔ 'اللہ اکبر! کیا اتنا طویل عرصہ یہاں گزارنے کے بعد قرآن شریف کے فرمودات باطل ہو گئے ہیں؟ روزانہ پنجگانہ نماز ادا کرنے کے باوجود ہم ہندوؤں کے لگائے ہوئے صندلی نشان ختم نہیں کر سکے۔ دنیا محض دھوکہ اور فریب ہے"۔

ساہا صاحب نے کتاب بند کی، عینک اتاری اور ماتھے پر ہاتھ پھیرا، گویا کہ وہ ان الفاظ کی توجیہ سوچ رہے ہوں۔ ان کے اس انداز سے تقویت پاتے ہوئے کمال نے اپنے جذبات کا اظہار ضروری سمجھا۔ ''سر! یہ لوگ مسلمانوں کا پیچھا کر کے ان پر تشدد کرتے ہیں، جتھوں کی شکل میں جا کر مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگاتے اور لوٹ مار کرتے ہیں۔ اس میں تو حکمران طبقے کا دور دور تک کوئی حوالہ یا اشارہ نہیں۔ یہ عام ہندوؤں کی مسلمانوں پر تشدد کی منہ بولتی تصویر ہے''۔

ساہا صاحب نے ماتھے سے ہاتھ اٹھایا اور کچھ سوچ کر آہستگی سے بولے، ''بظاہر تو ایسا ہی ہے، لیکن مجھے پتہ ہے کہ ناول نگار کا اصل مقصد انگریز حکومت کے خلاف بغاوت کے جذبات ابھارنا ہے''۔ کمال نے بے صبری سے پوچھا، ''سر! ناول نگار کے اصل مقصد کا آپ نے سراغ کیسے لگایا ہے؟''

ساہا صاحب خاموش رہے۔ کمال نے ان سے ناول واپس لے کر آخری باب کا ایک صفحہ ساہا صاحب کے سامنے کرتے ہوئے کہا: ''سر! کیا آپ یہ پڑھیں گے؟''

ساہا صاحب نے عینک لگا کر پڑھا، ''ڈاکٹر بولا، 'تمہارا کام ختم، مسلم راج کا خاتمہ ہو گیا ہے''۔

''مسلم راج کا تو خاتمہ ہو گیا مگر ہندو راج تا حال قائم نہیں ہوا۔ انگریز کلکتہ میں ابھی تک طاقت میں ہیں''۔

''ہندو راج اتنی جلدی قائم ہونے والا نہیں۔ تمہاری موجودگی سے خون خرابہ ہی ہوگا، اس لیے تم جاؤ''۔

''یہ سن کر ستیہ آنند کو بہت دکھ ہوا، اوہ بھگوان! اگر اب ہندو راج قائم نہیں ہوتا تو پھر بادشاہ کون ہوگا؟ کیا مسلمان دوبارہ حکومت کریں گے؟''

''نہیں''، اس نے کہا، ''انگریز ہی حکمران ہوں گے''۔

''انگریز فی الحال تو کاروبار میں مصروف ہیں، انہیں اپنے نفع نقصان سے غرض ہے۔ وہ حکومت کرنے کے خواہش مند نہیں، بلکہ انہیں ملک کی باگ ڈور سنبھالنے پر مجبور کیا جائے گا''۔

....

ساہا صاحب نے کتاب بند کی اور ہچکچاتے ہوئے تسلیم کیا:

''ہاں! اس سے تو یہی تاثر ملتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے پر انگریز راج قائم ہوگا، لیکن اتنے زیادہ پڑھے لکھے لوگ غلط تو نہیں کہتے کہ بنکم چندر کا مقصد گوروں سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ میرا تمہیں مشورہ ہے کہ رضاالکریم کی کتاب بھی پڑھو''۔

''سر! کون سی کتاب؟''

''کیا تم نے پہلے کبھی رضاالکریم کا نام سنا تھا؟ وہ ایک عالم فاضل شخص ہے۔ اس کی ایک کتاب کا نام ہے ''بنکم چندر اور مسلمان معاشرہ''۔ اس کتاب میں وہ لکھتا ہے کہ بنکم چندر کی تحریروں میں مسلمانوں سے مخاصمت اور عداوت کا کوئی ذکر نہیں''۔

''لیکن سر! بنکم چندر نے جو کچھ لکھا ہے اسے کریم صاحب بدل تو نہیں سکتے۔ ہمارے سامنے بنکم جی کی اپنی

تحریر کردہ کتاب ہے، اور یہ بڑی بنیادی تحریر ہے۔ باقیوں نے ان کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ اگر کوئی کتاب کسی بنیادی تحریر کے بارے میں متضاد تاثر کی حامل ہو تو اس صورت میں ثانوی تحریر کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟''

''پھر بھی تم یہ کتاب ضرور پڑھو''۔

کمال غیر مطمئن ہو کر وہاں سے چلا آیا۔

....

آنند مٹھ نے کمال کے جذبات کو بہت گھائل کیا۔ دریائے پیالی کے گھاٹ پر ہونے والا واقعہ اس کے دل و دماغ پر پہلے ہی سے نشتر لگا رہا تھا۔ قرآنی فرمودات بھی اسے بے کل کیے جاتے تھے لیکن اس کے پاس کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس سے وہ ان نکات پر گفتگو کر سکتا۔

اس کے والدین بہت محبت کرتے تھے لیکن دماغ کو الجھانے والے نکات پر ان سے یا گاؤں میں کسی اور سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ کمال کے خیال میں سیکنڈری اسکول کے اساتذہ بھی اس معاملے میں اس کی کوئی خاص رہنمائی کرنے کے اہل نہیں تھے۔ ساہا صاحب کا نقطۂ نظر اسے مطمئن کرنے میں ناکام رہا۔ ضروری نہیں کہ کمال کسی دوسرے شخص سے متفق ہی ہوتا لیکن کم از کم اسے یہ تاثر تو ملنا چاہیے تھا اس کا مخاطب بات سمجھ بھی رہا ہے۔ ہاں البتہ پرائمری اسکول کے استاد امر پال کمال کے خیالات کو بلا تعصب سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس نے سوچا کہ دماغ میں ہلچل پیدا کرنے والے نکات پر امر پال کے ساتھ گفتگو کی جائے۔

اتوار کا دن تھا۔ صبح مطالعہ سے فارغ ہونے کے بعد اس نے امر پال کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کپڑے تبدیل کر رہا تھا جب اس کی ماں مریم نے پوچھا کہ وہ چھٹی کے دن کہاں جا رہا ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ اجیت پور جا رہا ہے۔

''کیوں؟''، ماں نے پوچھا۔

وہ ماں کو کیسے سمجھائے کہ اجیت پور جانے کا مقصد کیا ہے، لہٰذا اس نے مختصر سا جواب دیا، ''ایک ضروری کام ہے''۔

مریم کو کمال کے کہیں آنے جانے پر اعتراض نہیں تھا، وہ تو اس کے باپ کو ناشتہ بھیجنے کی فکر میں تھی جو علی الصبح کھیتوں کو چلا گیا تھا۔ ''تمہارا باپ صبح ہی صبح ناشتہ کیے بغیر ہل جوتنے چلا گیا ہے۔ اس کو کھانے پینے کی کوئی چیز بھیجنی ہے''۔

کمال کے چھوٹے بھائی دوسروں کے ریوڑ چرانے گئے ہوئے تھے کیونکہ مالی حالت گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ اگر وہ اپنے باپ کو ناشتہ دینے نہ جاتا تو پھر اس کی ماں ہی کو جانا پڑتا، اس لیے اس نے پوچھا، ''باپو کس کھیت میں گیا ہے؟''

''پال کی دلدلی زمین میں''۔

''تم کھانا تیار کر دو میں دے کر وہیں سے اجیت پور چلا جاؤں گا''۔

مریم نے خادم کے لیے روکھی سوکھی تیار کی اور کمال لے کے چل پڑا۔ اس کے گھر سے پال کی زمین تک دو راستے جاتے تھے۔ گاؤں کے تین حصے تھے: پچھم پاڑا (مغربی حصہ) یا منڈل پاڑا، شیخ پاڑا اور ملا پاڑا۔ ان کا گاؤں پچھم پاڑا کے شمال میں تھا جہاں کے زیادہ تر باسی اپنے آپ کو منڈل کہتے تھے، اسی مناسبت سے گاؤں کا نام منڈل پاڑا ہو گیا۔ یہاں کا امیر ترین شخص، بسواس، پچھم پاڑا کے انتہائی شمال میں رہائش پذیر تھا جس کے سبب ارد گرد کا علاقہ بسواس پاڑا کہلاتا تھا۔ مشرقی حصے کے زیادہ تر باسی شیخ کہلاتے ہیں لہٰذا گاؤں کا نام شیخ پاڑا مشہور ہو گیا۔ ان دیہاتوں میں سے گزرنے والی تنگ سڑک کے شمال میں

بسنے والے خود کو ملّا کہتے تھے، اور گاؤں کا نام بھی اسی مناسبت سے ملّا پاڑا کہلانے لگا۔

مسلمانوں میں نیم خواندہ مذہبی لوگ مُلّا کہلاتے ہیں۔ عرب سے ہجرت کر کے آئے ہوئے ثروت مند جو محمد رسول اللہ کے خانوادے سے تعلق نہیں رکھتے، انہیں شیخ کہتے تھے۔ ان کی پیروی کرتے ہوئے بہت سے مسلمان بھی اپنے آپ کو شیخ کہلوانے لگے۔ کمال کو یقین ہے کہ اس کے گاؤں کا کوئی شخص بھی کسی عرب مہاجر کی نسل سے نہیں ہے۔ وہ فی الحقیقت نچلی ذات کے ہندوؤں، یعنی اچھوتوں اور شیڈولڈ کاسٹ، کی لڑی میں سے تھے۔ اپنی ساخت، رنگ روپ اور قدو قامت کے لحاظ سے اس بستی کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں کے آباواجداد ایک ہی تھے۔ ہندوؤں کی اعلیٰ ذات کے لوگ اچھوتوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے اور انہیں زندگی کی بے شمار سہولتوں سے محروم کر رکھا تھا۔ جب انہوں نے اسلام میں مساوات کے اصولوں کی بابت کچھ سنا تو وہ اپنے پرکھوں کے دھرم کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے۔ مذہب کی تبدیلی کی وجہ سے لباس اور مذہبی رسموں میں معمولی فرق کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں آیا۔ جسامت، رنگ ڈھنگ حتیٰ کہ خاندانی نام بھی ایک جیسے تھے۔ کمال کا باپ منڈل کہلاتا تھا، یہی عرفیت ہندوؤں میں بھی تھی جس کی وجہ سے اس گاؤں کو منڈل پاڑا کہا جاتا تھا۔ صرف یہی نہیں، دوسرے قریبی دیہاتوں میں بھی منڈل رہائش پذیر تھے۔ ان کا پیشہ وہی تھا جو منڈل پاڑا کے باسیوں کا تھا، یعنی کاشت کاری۔

کمال دلدلی علاقہ کے کنارے کی جانب والی سڑک پر چل پڑا۔ آگے جا کر کھیتوں کی پگڈنڈی پر ہولیا۔ جہاں سے دلدل شروع ہوئی، وہاں پگڈنڈی نہیں تھی۔ بانس کی چھوٹی چھوٹی کھپچیاں گاڑ کر کھیتوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ بارشوں میں سارا علاقہ پانی میں ڈوب جاتا پگڈنڈیوں کا سراغ بھی نہ ملتا تو اس وقت یہی بانس کے ٹکڑے رہنمائی کرتے تھے۔

کمال نے اپنے باپ کو صرف ایک لنگوٹی اور پاؤں میں خام چمڑے کی چپل پہنے ہل چلاتے دیکھا۔ اس نے باپ کی مشقت کے بارے میں سوچا جو علی الصبح اٹھتا، بیلوں کو چارہ دے کر ہل کندھے پر اٹھائے کام پر چل دیتا۔ کھیت میں سارا دن محنت مشقت کرتا اور روکھی سوکھی کھا کر پھر کام پر جت جاتا۔ شام سے ہل کو کندھے پر رکھے وہ گھر لوٹ آتا۔ ہاتھ منہ دھونے اور بیلوں کو چارہ ڈالنے کے بعد گھر کے دوسرے کاموں میں لگ جاتا۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ بازار کو چل پڑتا۔ رات گئے وہ سب کاموں سے فارغ ہو کر تھکا ماندہ بستر پر گر جاتا۔

سارا سال اسی مشقت میں بیت جاتا، پھر بھی دو وقت کا پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوتا۔ اس کے اسکولوں کے اساتذہ چند گھنٹوں کے لیے پڑھاتے، ہفتہ اتوار اور دوسری چھٹیوں میں انہیں اسکول آنے کی ضرورت ہی نہ تھی، پھر بھی انہیں اتنی تنخواہ مل جاتی کہ زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔ گرمیوں اور پوجا کی تعطیلات میں انہیں کام تو نہ کرنا پڑتا مگر تنخواہ پوری ملتی۔ سمیر کا باپ بھوپن پور کو لیکٹوریٹ میں ملازم تھا۔ دفتر وہ جاتا نہیں تھا مگر ہر مہینے تنخواہ وصول کر لیتا۔ اس کے برعکس سارا سال سخت محنت کرنے کے باوجود کمال کے باپ کو دو وقت کی مناسب روٹی بھی میسر نہ ہوتی۔ یہ سراسر ناانصافی ہے، کمال سوچتا۔

کمال کا باپ زمین کے جس ٹکڑے پر کاشت کاری کرتا تھا وہ اجیت پور کے رادھے شیام پال کی ملکیت تھی۔ وہ براہی میں ایک دفتر میں کلرک تھا، باقاعدگی سے تنخواہ حاصل کرتا مگر اپنی زمین پر بالکل کام نہیں کرتا تھا۔ غالباً اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ زمین ہے کہاں، جبکہ کمال کا باپ الف سے یے تک سارا کام اپنے ہاتھوں سے کرتا، یعنی زمین جوتنا، بوائی، دیکھ بھال، فصل کی کٹائی اور صفائی وغیرہ، اس کے باوجود اسے پیداوار میں صرف آدھا حصہ ملتا ہے کیونکہ سرکاری کاغذات میں اس کھیت کا مالک اس کا باپ نہیں بلکہ رادھے شیام پال تھا۔ یہ تو بالکل ناانصافی ہے۔ رادھے شیام کو ملازمت سے جو تنخواہ ملتی وہ اس کے اہلِ خانہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہے لیکن اس کے باپ کو جو صلہ ملتا ہے اس سے گھر نہیں چلتا۔

خادم نے کمال کو کھانا لاتے دیکھا تو کھڑا ہو گیا۔ اس نے کھانا زمین پر رکھا اور بیلوں کے پاس چلا گیا۔ خادم نے بیٹے

سے پوچھا،''اتنی جلدی؟''

''میں اجیت پور جارہا ہوں''۔

''کیوں؟''

کمال کے لیے یہ مشکل کی گھڑی تھی۔ باپ کو کیا سمجھائے، لہٰذا اس نے بس اتنا ہی کہا،'' مجھے کچھ کام ہے''۔ خادم نے اور کوئی سوال نہ کیا۔ وہ اپنے بیٹے کی سرگرمیوں کو نہ سمجھا سکا۔ پرائمری کے بعد اس نے کمال کو پڑھائی ختم اور اپنے ساتھ کھیتی باڑی کرنے کو کہا تھا لیکن وہ نہ مانا۔ ماں کی اشیر باد بھی اسے حاصل تھی لہٰذا اسے ہائی اسکول میں داخلہ لینے کی اجازت مل گئی۔ خادم سوچتا مانا کمال پڑھائی میں اچھا جارہا ہے، مگر بعدازاں فائدہ کیا ہوگا؟ اسے اپنے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں تشویش رہتی۔ کسان کا بیٹا ہونے کے ناتے اس کا کہیں ملازمت حاصل کرنا مشکل تھا۔ ہائی اسکول میں بھیجنے کا نتیجہ اسے خراب کرنے کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا کیونکہ ایک طرف تو وہ ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہتا اور دوسری جانب کاشتکاری بھی نہ کرتا۔ آخر کار بیکاری اسے فاقہ کشی تک لے آتی۔ لیکن کمال نے ایسے پندونصائح پر قطعاً کان نہ دھرے۔ مزید پڑھنے کی خواہش میں وہ ضد پر اڑا رہا، لہٰذا کیا ہوسکتا ہے؟ خادم نے سوچا کہ ٹھیک ہے، پڑھتا ہے تو پڑھتا رہے۔

''پتاجی! کھانا کھانے کے بعد برتن یہیں رہنے دیں، میں واپسی پر لے لوں گا''۔

''تمہیں دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں، میں خود ہی گھر لے جاؤں گا تم جاؤ جہاں جارہے تھے''۔

کمال دلدل کے دوسرے کنارے کی جانب چل دیا۔ اجیت پور جانے کا کوئی خاص راستہ نہیں تھا لہٰذا وہ نیل کے کارخانے سے آگے براہی اور بھوبن پور کے پاس سے گزر کر وہاں پہنچ سکتا تھا۔ نیل کا متروکہ کارخانہ درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ آگے جا کر عیسائیوں کا واحد قبرستان تھا جس میں متعدد پرانی قبریں تھیں۔ وہ جب بھی یہاں سے گزرتا، اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوجاتی۔ اس کے اپنے گاؤں میں بھی قبرستان تھا لیکن کسی قبر پر کوئی کتبہ نہیں لگا دیکھا جبکہ یہاں ہر ایک پر کتبہ لگا تھا۔ کمال انہیں پڑھنے لگا:

''الزبتھ برنارڈ کی یاد میں
پیدائش،03 ستمبر 1833
وفات،12 جنوری 1861''

کمال کو علم نہ تھا کہ الزبتھ برنارڈ کون تھی، دیکھنے میں کیسی تھی، ہوا کیا تھا کہ وہ صرف اٹھائیس برس کی عمر میں انتقال کرگئی، کیا اس کی موت قدرتی تھی یا کسی حادثے کا سبب، یا کیا وہ نیل ودھرو میں ماری گئی تھی؟ کمال کو علم نہ تھا کہ اس علاقے میں واقعی کوئی بغاوت ہوئی تھی؟ کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں تھا نہ کسی بڑے بوڑھے سے اس کی بابت کچھ سنا۔ کمال کے دل میں اس بارے جاننے کی خواہش تو تھی کہ یہاں عیسائی کیوں دفن ہوئے تھے، مگر کس سے پوچھے؟ یہی سوچتے سوچتے وہ آگے کو چل پڑا۔ خیالوں اور سوچوں میں گم اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ وہ پال صاحب کے گھر پہنچ گیا ہے۔

پال صاحب اخبار کا مطالعہ کررہے تھے۔ کمال کو دیکھ کر انہوں نے مسرت کا اظہار کیا کیونکہ وہ ان کا بڑا عزیز اور پیارا شاگرد تھا۔ گلے لگا کر اسے اپنے پاس بنچ پر بٹھایا اور اس کی پیشانی کو چھوتے ہوئے پوچھا،''میرے بچے! کیسے ہو؟''

کمال کو یوں محسوس ہوا جیسا کہ وہ ایک بڑے برگد کی ٹھنڈی چھاؤں تلے آگیا ہو۔ اس نے احتراماً جواب دیا،''سر! اچھا ہوں''۔

''میرے بچے! تم ہر سال اپنی جماعت میں اوّل آتے رہے ہو، مجھے فخر ہے کہ تم میرے شاگرد تھے۔ خوب دل لگا

کے پڑھو، بہتر سے بہتر نتیجہ حاصل کرو، تمہیں بہت آگے جانا ہے، سب سے بڑی بات یہ کہ تمہیں ایک اچھا انسان بننا ہے۔ ایک سچا انسان، میرے بچے!''۔

کمال اپنے آنسو نہ روک سکا، ''سر! میں پوری پوری کوشش کروں گا''۔

''جذباتی مت ہو۔ تمہیں ایک طویل سفر طے کرنا ہے، اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے ایک طویل سفر۔ اب بتاؤ یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟''

کسی تمہید کے بغیر کمال گویا ہوا، ''بہت عرصہ سے چند سوالات نے مجھے الجھن میں ڈالا ہوا ہے۔ اسی سلسلہ میں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں''۔

پال صاحب اس کے سامنے سیدھے بیٹھتے ہوئے بولے، ''بتاؤ میرے بچے! کیا الجھن ہے تمہارے ذہن میں؟''

کمال نے پہلے تو اس واقعہ کا ذکر کیا جب دریائے پیالی کے کنارے وہ سپنا کے ساتھ اس کشتی میں بیٹھنے کے لیے آگے بڑھا تھا جس میں دیوی کی مورتی لے جائی جا رہی تھی۔ پال صاحب بولے، ''بہت بڑی لعنت ہے یہ۔۔۔۔ میں ہندوؤں کی بات کر رہا ہوں۔ تمہارے بڑے بھی کسی زمانے میں ہندو تھے اس لیے میں تمہیں بھی ان میں شامل کرتا ہوں''۔

کمال کو پال صاحب سے گفتگو کر کے بڑی طمانیت ہوتی کیونکہ وہ کسی ایک طرف کی بات نہیں کرتے تھے۔ ان کی باتوں سے مترشح ہوتا کہ اس دھرتی کے تمام لوگوں کو وہ اپنا ہی سمجھتے ہیں۔ کمال کے لیے یہ حوصلہ افزا بات تھی۔

پال صاحب کہنے لگے، ''یہ بہت بڑی لعنت ہے کہ ہم نے لوگوں کی اکثریت کو جیون کے بنیادی حقوق سے محروم کیا ہوا ہے۔ کوئی کمتر اور نچلی ذات کا ہے تو کوئی اچھوت، اور کسی کو ذات برادری سے نکال باہر کیا ہوا ہے۔ نتیجہ بربادی ہے۔ بہت سی بیرونی طاقتیں آئیں، ہمیں شکست دی اور حکمران بن گئے۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں نے ہمارے لوگوں کو بڑی آسانی سے اپنے مذہب میں شامل کر لیا۔ ہم نے اس سنگین صورتِ حال سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اگر حالات ایسے ہی رہے تو ہماری بربادی لازم ہے۔ دلگیر نہیں ہونا، نہ ہی ان سے نفرت کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ تمہارے ہی بھائی بندے ہیں۔ وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں، انہیں صحیح اور درست راہ پر لانے کی کوشش کرو''۔

کمال نے یقین دلاتے ہوئے جواب دیا، ''سر! میں اپنی پوری کوشش کروں گا''۔

''مجھے تم سے یہی امید ہے۔ یاد رکھو کہ وہ تمہارے اپنے ہیں، اسی دھرتی کے باسی ہیں، اپنے لوگوں کو پرے مت دھکیلو۔ تمہیں چاہیے کہ ان کی اصلاح کرو اور اپنے قریب لاؤ''۔

اپنے استاد کی باتیں سن کر کمال کو دریائے پیالی کے کنارے لگا زخم اب اتنا تکلیف دہ محسوس نہ ہوا۔ حوصلہ پا کر اس نے چند قرآنی احکامات کا ذکر کیا، ''سر! ہندو دھرم میں ذات پات کی تقسیم ناروا ہے لیکن اس میں کسی دوسرے شخص کو غلام بنانا، بیٹیوں کی نسبت بیٹوں کو وراثت میں زیادہ حصہ دینا اور مردوں کو چار شادیوں کی اجازت نہیں ہے''۔

پال صاحب نے مسکرا کر جواب دیا، ''تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ آج کے زمانے میں تو نہیں مگر ماضی میں ٹھیک تھا۔ کسی دور میں ہندو حکمران بھی بہت برے تھے۔ محمد نے مکہ سے مدینہ 622 عیسوی میں ہجرت کی، 632 عیسوی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انہی دس برسوں میں اسلام کے اہم اصولوں کی تبلیغ ہوئی۔ کم و بیش تمام ریت رواج قبل از اسلامی دور کے تھے۔ ہندو عورت کو سوائے خیرات وغیرہ کے اور کچھ نہیں ملتا تھا۔ کیا تم نے ستی اور کلینیت کے بارے میں کچھ نہیں سنا؟

کمال نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ پال صاحب فرما رہے تھے:

''ایک کلن شخص سو سے بھی زیادہ عورتوں سے شادی کر سکتا تھا۔ اسے تو یاد ہی نہیں رہتا کہ کون اس کی بیوی ہے۔

خاوند کے دیہانت پر تمام بیویوں کو ستی ہونا پڑتا تھا۔تم نے غلامی کا ذکر کیا ہے۔اس معاملہ میں ہندو مذہبی تعلیمات کا دنیا بھر میں تو کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتا۔تاہم بہت سی بری رسموں کا رام موہن اور ودیا ساگر جیسے مصلحین کی کوششوں سے خاتمہ ہو گیا ہے۔ آزادی کے بعد بھی ان رسموں کو ختم کرنے کے لیے قانون سازی کی گئی''۔

''کس قسم کی قانون سازی،سر!؟''

''1949 میں قدامت پرست ہندوؤں کی شدید مخالفت کی وجہ سے پارلیمنٹ سے ہندو کوڈ بل (Hindu Code Bill) منظور نہ ہوا،لیکن بعدازاں اسے قسطوں میں منظور کر لیا گیا۔اس کے علاوہ اور بھی چند قوانین منظور ہوئے۔ہندو قانونِ وراثت،1955 کے تحت والدین کی وراثت میں بیٹیوں کو بیٹوں کے مساوی حصہ دار تسلیم کیا گیا۔1956 کے ہندو میرج قانون کی رو سے کوئی شخص بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کر سکتا''۔

''ایسی ترامیم مسلمانوں کے قوانین میں بھی ہونی چاہییں''،کمال نے رائے زنی کی۔

''اس کے لیے بالغ نظری بہت ضروری ہے''۔

''سر!میں بھی اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کروں گا''۔

''میں تمہیں ایک کتاب دیتا ہوں''،یہ کہتے ہوئے پال صاحب کتابوں کی الماری کی طرف گئے۔وہ غالباً کوئی خاص کتاب تلاش کر رہے تھے،وہاں نہ ملی دوسری الماری میں دیکھنے لگے۔آخر ایک سفید جلد والی پرانی سی کتاب نکالی اور کمال کو دیتے ہوئے کہا،''اسے پڑھو تاکہ تمہیں ماضی کے ہندو قوانین سے آگاہی ہو''۔

کمال نے کتاب دیکھی۔یہ پنہانن ترکارتنا کی مرتب کردہ منو سمہتا تھی۔کتاب دینے کے بعد پال صاحب نے پوچھا،''اور کیا بات کرنا چاہتے تھے؟'' کمال نے آنند مٹھ کا ذکر کیا۔

''سر!بہت سے لوگ آنند مٹھ کی تعریف کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ لوگوں کے نزدیک ان کی مذہبی کتابوں کا جو مقام ہے بالکل ایسا ہی مقام آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے نزدیک اس ناول کا ہے۔ہمارا قومی ترانہ''بندے ماترم''اسی ناول سے لیا گیا ہے۔کہا جاتا ہے کہ محبِ وطن لوگ آج بھی اس سے تحریک اور جذبہ پاتے ہیں۔میں نے بھی بڑی توقعات سے اس کا مطالعہ کیا لیکن بدقسمتی سے مجھ پر اس کا الٹا اثر ہوا ہے۔ناول تحریر ہونے کے وقت ملک پر انگریز حکمران تھے جو عقیدتاً عیسائی تھے،لیکن ناول نگار نے اس دیش سے مسلمانوں کو باہر نکالنے اور انگریزی راج کے قیام کی بابت لکھا ہے پھر اس کو کس طرح صدائے آزادی کہا جا سکتا ہے؟''

''تمہارا ردِعمل ٹھیک ہے۔ایک صحیح الدماغ شخص بالکل ایسا ہی سمجھے گا۔مشکل یہ ہے کہ انیسویں صدی میں بنگالیوں کا قوم پرستی سے متعلق علم سراسر کتابی تھا،عملی نہیں''۔

''کیا مطلب،سر؟''

''انگریزی کتابوں کے مطالعہ سے انہیں مغرب میں ہونے والی قوم پرستی کی تحریکوں سے حوصلہ افزائی ہوئی لیکن طبقاتی مفاد غیر ملکی،یعنی انگریز راج کے خلاف سدِ راہ تھا''۔

''کیوں سر؟''

''اس وقت مڈل کلاس نئے کاروباری طبقے،زمیندار،سرکاری ملازمین اور وکلاء وغیرہ پر مشتمل تھی''۔

''سر!اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''نیا کاروباری طبقہ حکومتی ملازمین کے ایجنٹ کے طور پر کمائی کر رہا تھا۔ Permanent Settlement اور Sun

Set قوانین کی وجہ سے کاروباری لوگوں نے زمینیں خریدیں اور زمیندار بن گئے۔ جب فارسی کی بجائے انگریزی سرکاری زبان قرار پائی تو انگریزی پڑھے لکھے طبقہ نے سرکاری ملازمتوں اور دیگر پیشوں، مثلاً وکالت پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ یوں ان کا طبقاتی مفاد بدیشی راج کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ انگریزی حکومت کے خلاف ان کے قوم پرستانہ جذبات ماند پڑ گئے لیکن اپنے جذبات کا اظہار تو کسی نہ کسی طریقے سے کرنا ہی تھا۔ اس کے لیے انہوں نے فنونِ لطیفہ اور ادبیات کا سہارا لیا اور انگریز حکومت کو ہدف بنانے کی بجائے مسلمانوں کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے لگے"۔

"کیا یہی کچھ ہوا تھا؟"

"نہیں۔ بدیشی راج کی سازش بھی اس کی ذمہ دار تھی"۔

"کیسی سازش؟"

"اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر انہوں نے ہندو مسلم اختلافات اور عداوت کو ہوا دی"۔

کمال گم سم ساری باتیں سن رہا تھا۔ پال صاحب نے اپنی بات جاری رکھی، "پلاسی کی جنگ میں غداری کے باعث انگریزوں نے مسلمانوں سے راج پاٹ چھین لیا۔ فطری طور پر وہ مسلمان اشرافیہ پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھے لہٰذا ہندو اشرافیہ کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے یہ تاثر دینا شروع کیا کہ اگر انگریز حکومت نہ سنبھالتے تو مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں ہندو دھرم اور ثقافت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور یہ انگریز ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کے ظلم وستم کی راہ روکی ہے۔ اس قسم کے پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر ایشور گپتا جیسے لوگوں نے 1857 کی پہلی جنگِ آزادی میں شامل ہونے والے سپاہیوں سے اظہارِ نفرت کرتے ہوئے انگریزوں کی مدح سرائی شروع کر دی"۔

کمال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سپاہیوں کا انگریز عیسائیوں کے خلاف ہتھیار اٹھانا جنگِ آزادی کی جانب پہلا قدم تھا مگر ایشور گپتا نے ہندوستانی سپاہیوں کے خلاف اور ان انگریزوں کی حمایت میں لکھا جنہوں نے اپنے ناجائز قبضہ کی خاطر ہندوستانیوں کو زنجیروں میں باندھ رکھا تھا۔ پال صاحب مزید بتا رہے تھے، "اپنے پراپیگنڈا کو سچ ثابت کرنے کے لیے ان عیار انگریزوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں مثلاً کننگھم کی History of Sikh، ڈف کی تصنیف History of Marathas اور ٹوڈ کی Annals and Antiquities of Rajasthan وغیرہ۔ ان کتابوں میں مصنفین نے حکمرانوں اور رعایا کے درمیان ہونے والی کشمکش کو ہندو مسلمان مخاصمت کے روپ میں پیش کیا ہے۔ بنکم چندر جیسے اہلِ قلم نے بھی اس کی تقلید میں ارادۃً مسلمانوں کے خلاف زورِ قلم دکھانا شروع کر دیا۔ بنکم چندر اس جرم کا مرتکب واحد ادیب نہیں تھا۔ ایشور گپتا، رنگا لال، ہیم چندر، نوین چندر جیسے شعراء کے ساتھ ساتھ جیوتیندر ناتھ، من موہن اور گریش چندر کے علاوہ متعدد ڈرامہ نگاروں نے بھی مسلمانوں کے خلاف تعصب اور دشمنی کے جذبات کو ہوا دی"۔

اسی نکتے پر وضاحت چاہتے ہوئے کمال نے پوچھا، "سر! ابھی آپ نے ایسا کیوں کہا ہے کہ ان ادیبوں اور شاعروں نے انگریزوں کی خوشہ چینی اور پیروی کرتے ہوئے مسلمانوں کی کردار کشی شروع کی؟"

"کیونکہ انہوں نے انگریز مصنفین کے استعمال کردہ مواد ہی کو بنیاد بنایا تھا۔ تم نے بنکم چندر کے ناول 'راجہ سنگھ' کا حوالہ دیا ہے۔ اس نے ٹوڈ کی مذکورہ بالا کتاب میں سے داستانوں کو جمع کر کے اپنے ناول میں جگہ دی۔ رنگا لال کی تصنیف 'پدمنی اپکھیان' کی بنیاد بھی اسی کتاب سے اٹھی ہے۔ ایسی کتابوں کے ردِ عمل میں مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کے خلاف لکھنا شروع کر دیا، مثلاً ادریس علی کی تحریروں کو دیکھ لو۔ بنکم چندر نے اپنے ناول میں ایک ہندو لڑکے اور مسلمان لڑکی کے عشق کی کہانی لکھی ہے، ادریس علی نے ردِ عمل اور جوشِ انتقام میں 'بنکم دوہیتا' نام سے ناول تحریر کیا جس میں بنکم کی بیٹی ایک مسلمان لڑکے سے بیاہ رچاتی ہے"۔

''سر! آپ نے جن کتابوں کے نام لیے ہیں، مجھے کہاں سے مل سکتی ہیں؟ میں پڑھنا چاہتا ہوں''۔

''فرقہ بندی کا زہر گھولنے والی مسلمان مصنفین کی بہت سی کتابیں بنکم چندر کے معیار جیسی نہیں۔ ان کی تحریریں جلد ہی طاقِ نسیاں پر رکھی گئی تھیں جبکہ بنکم چندر کے اعلیٰ ادب پارے زماں ومکاں کی قید سے ماورا ہیں''۔

''بنکم چندر نے اس راہ کا انتخاب کیوں کیا؟''

''بنکم چندر کے مقام کو مدِ نظر رکھ کر ان مسائل اور مشکلات کا احاطہ کرو جن سے وہ دوچار تھا۔ اس دیش کا وہ پہلا گریجویٹ تھا۔ مغربی ادبیات کے مطالعہ نے اس کے دل میں قوم پرستی کی آگ بھڑکائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی تصانیف کے ذریعہ اس کا اظہار کرنا چاہتا تھا لیکن ان دنوں وہ بدیشی حکمرانوں کے تحت ڈپٹی مجسٹریٹ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اگر وہ انگریزوں کے خلاف لکھتا تو نہ صرف اس کی ملازمت جانے بلکہ قید وبند کا بھی امکان تھا۔ غیر ملکی آقاؤں نے قاضی نذرالاسلام کو بھی تو گرفتار کرلیا تھا۔ اس صورتِ حال میں بنکم چندر نے مسلمانوں کے خلاف لکھ کر اپنے قوم پرستانہ جذبات کا اظہار کیا اور یوں وہ ان امکانی مصائب سے بھی بچ گیا۔ صرف یہی نہیں، وہ دیش کی تاریخ سے بخوبی آگاہ اور ہندوؤں کی حالتِ زار پر اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف بہت بغض تھا جس کی جڑیں زمانہ ماضی میں پیوست تھیں''۔

کمال کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پال صاحب کی باتوں کا مقصد کیا تھا۔ لہٰذا اسے پوچھنا ہی پڑا کہ 'جڑوں کا ماضی میں پیوست ہونا' کیا معنی رکھتا ہے؟ پال صاحب نے جواب دیا:

''تمہیں علم ہے کہ ہندوستان پر حکومت کرنے والے لاتعداد حکمران مسلمان تھے لیکن عام مسلمان ملکی حالات کے بالکل ذمہ دار نہیں، ان کا اپنے حاکموں کے ساتھ تعلق تو دور کی بات، رابطہ تک نہیں تھا۔ بہت سے نائب سلطان، دیوان، نواب غیر بنگالی ہی نہیں بلکہ ہندوستانی بھی نہیں تھے۔ سراج اور علی وردی غیر بنگالی تھے۔ ان کا اپنے علاقے کے عام مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے برعکس وہ ہندو اشرافیہ کو دوست جانتے تھے۔ ان کے ظلم وستم کا ذمہ دار عام مسلمانوں کو نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ تم تو ان باتوں کو سمجھتے ہو لیکن عامۃ الناس تاریخ کو اس تنقیدی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ وہ تو بس اتنا جانتے ہیں کہ مسلمان ان پر حکومت اور جور وستم کرتے تھے، اور اب موقع ہاتھ میں آیا ہے ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہونا چاہیے''۔

''سر! بنکم چندر عام لوگوں کی مانند ضعیف الاعتقاد نہیں بلکہ اپنے زمانے کے مروجہ معیار کی رو سے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے''۔

پال صاحب وضاحت کرنے لگے، ''وہ ہندوؤں کے قدامت پرست طبقے کے نمائندگی کرتے تھے جس کی مسلم دشمنی نمایاں تھی۔ یہ طبقہ تو ہندوؤں کی سماجی اصلاح کے بھی خلاف تھا۔ بنکم جی کے دو ناول 'وس بھرکشا' اور 'کرشن کانت کی وصیت' دراصل ودیا ساگر کی اس مہم کے خلاف ایک خاموش اقدام تھا جس کا مقصد ہندو بیواؤں کو دوسری شادی کا حق دلانا تھا۔ بنکم چندر کے تعصب کا یہ عالم تھا کہ اس کی نگاہ میں مشرقی بنگال کے لوگ قابلِ نفرت تھے''۔

''سر! آپ کس بنا پر کہہ رہے ہیں؟''

''سب کچھ اس کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس نے اپنے ناول 'کرشن کانت کی وصیت' میں ہری درا گرم کے ذاکیے کے بارے میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں انہی سے مشرقی بنگال کے لوگوں کی بابت اس کی نفرت ظاہر ہوتی ہے''۔

''کیا الفاظ تھے؟''

''پال صاحب اٹھ کر کتابوں کی الماری کی طرف گئے، ایک کتاب نکالی اور ایک صفحہ کمال کو پڑھنے کے لیے کہا۔ لکھا تھا:

''وہ بکرم پور، مشرقی بنگال کا رہائشی ہے۔ دیگر معاملات میں وہ گاؤدی اور بے وقوف ہوسکتا ہے مگر اپنے

کاموں میں گانٹھ کا پکا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ شریف آدمی کچھ جاننے کے لیے آیا ہے''۔

کمال نے کچھ سمجھتے ہوئے کتاب واپس کی اور پال صاحب سے کہنے لگا،''سر! اس زمانے میں بھی تو آپ جیسے لوگ موجود ہوں گے، پھر فرقہ بندی کیسے ہوگئی؟ انہوں نے مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا جیسی تنظیموں کی تشکیل میں مزاحمت کیوں نہ کی؟''

''شاہد خان صاحب سے ملاقات کرو۔ وہ تمہیں وضاحت سے بتائیں گے''۔

''سوارپ پور ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر راحت خان کے والد؟''

''بالکل وہی''۔

''سر! کیا وہی شاہد خان جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مسلم لیگ میں ہوا کرتے تھے؟''

''ہاں، کچھ عرصہ وہ اس جماعت میں رہے ہیں۔ مسلم لیگ تو ان کی ایک شناخت ہے، وہ اور بہت کچھ بھی تھے لیکن اب اس کے بارے میں وہ کوئی بات نہیں کرتے''۔

''کیا مطلب؟''

''کیا تمہیں علم ہے کہ وہ مسلم لیگ میں کیسے آئے تھے؟''

''سر! کیسے؟''

''کیا تم نے نیل کی فیکٹری کے بچے کھچے آثار دیکھے ہیں؟ شاہد کا والد حبیب خاں وہاں کلرک تھا۔ اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو اس امید پر اسکول بھیجا تھا کہ بعدازاں انہیں اچھی ملازمت مل جائے گی مگر نتیجہ کچھ اور نکلا''۔

''وہ کیا، سر!؟''

''بڑا بیٹا واحد ایک دہشت گرد تنظیم میں شامل ہوگیا اور پھر پولیس مقابلہ میں مارا گیا۔ بڑے بھائی کی موت نے شاہد خان کے دل میں غیر ملکی آقاؤں کے خلاف جذبات پیدا کردیے۔ اس نے گاندھی جی کی عدمِ تعاون تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ بعدازاں وہ کانگرس کے رکن کی حیثیت سے ہندوؤں اور مسلمانوں سے مل کر کام کرتا رہا''۔

''پھر وہ مسلم لیگ میں کیسے آیا؟''

''شاہد غیر معمولی لحاظ سے محنتی اور پر جوش تھا۔ اس کی کوششوں کے سبب ضلع میں کانگرس کافی مضبوط ہوگئی۔ فطری طور پر وہ ضلعی سطح کی قیادت کا خواہشمند تھا جو کانگرس کے علاقائی نیتاؤں کو منظور نہ ہوا۔ اس پر اعتدال پسند مسلمان سیاسی رہنماؤں نے اسے قائل کرلیا کہ کانگرسی نیتا عوام میں آکر جو چاہیں کہتے رہیں، حقیقت میں یہ صرف ہندوؤں کی جماعت ہے۔ نتیجتاً اس کا جھکاؤ انجمن کی طرف ہوگیا''۔

''سر! انجمن کیا ہے؟''، کمال نے سوال کیا۔

''یہ صرف مسلمانوں کی جماعت تھی۔ اس وقت کونسل کے تقریباً تمام ہندو اراکین نے زمینداروں کے موجودہ جابرانہ اور وسیع تر اختیارات میں اضافے کے حق میں ووٹ دیا۔ کم و بیش تمام زمیندار ہندو تھے جس پر فضل حق اور اکرم خان وغیرہ قوم پرست مسلمان رہنماؤں نے کانگرس سے ناتا توڑ کر ضلع میں کرشک پرجا پارٹی (KPP) کی تشکیل کی۔ شاہد خان نے اس میں شمولیت اختیار کی اور 1937 کے انتخابات میں کامیاب ہوگیا۔ فضل حق بنگال کا وزیر اعظم منتخب ہوا۔ بعدازاں جب وزارتِ عظمیٰ بچانے کی خاطر وہ مسلم لیگ میں شامل ہوا تو شاہد خان بھی اس جماعت میں آگیا''۔

''پھر شاہد خان نے کانگرس میں کیسے شمولیت اختیار کی؟''

''1947 کی تقسیمِ ہند نے سارا منظر نامہ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اب مسلمانوں کی بجائے ہندو نیتاؤں کی پوزیشن

مضبوط ہوگئی۔ راحت خان بھی کانگریس میں چلا آیا''۔

کمال تذبذب میں تھا کہ یہ کیا ہوا؟ شاہد خان نے فضل الحق کی طرح مسلم لیگ کی رکنیت لی۔ تقسیم کے بعد راحت خان کانگریس میں چلا آیا۔ اس معمے کو سمجھنے کے لیے اسے شاہد خان کے پاس جانا ہوگا۔ اپنے استاد سے اجازت لے کر کمال چل دیا تاہم پال صاحب نے کہا کہ جب بھی اسے کوئی مسئلہ درپیش ہو، وہ آ کر ان سے مل سکتا ہے۔ چلتے چلتے انہوں نے کمال کو نصیحت کی، ''دل لگا کر پڑھو، تمہیں بہت آگے جانا ہے''۔

....

اپنے استاد کے گھر سے واپس لوٹتے ہوئے کمال نے نیل کی فیکٹری، دلدلی زمین اور براہی بخشی پور کو جانے والا راستہ اختیار نہ کیا بلکہ مشرق کی جانب جا کر اسکول اور بازار کے پاس سے ہوتے ہوئے پیالی کے ساتھ ساتھ والے کچے راستے پر چل دیا۔ اگر چہ یہ سڑک بھی براہی بخشی پور والی سڑک کو ملتے ہوئے اس کے گھر کی جانب جاتی تھی لیکن یہاں سے گھر کا فاصلہ زیادہ تھا، اصل مقصد یہ تھا کہ راستے میں سپنا کا گھر پڑتا تھا۔ آخر کیوں وہ اس راہ پر آیا ہے، کمال خود بھی نہ سمجھ سکا۔

سپنا بچپن ہی سے اس کی ہم جماعت تھی۔ قدرے دراز قد، دبلی پتلی اور گہرے نین نقش والی لڑکی پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ کمال اسے پسند کرتا تھا اور حالیہ دنوں میں تو وہ ہر پل اس کے ساتھ رہنے اور اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کا سوچتا، مگر وہ ایسا کیوں سوچتا تھا؟ کیا اس لیے کہ سپنا ایک لڑکی تھی؟ یقیناً ایسا ہی تھا۔ اس کی جماعت میں اور بھی لڑکیاں تھیں مگر سوائے سپنا کے وہ کسی کی جانب اس قدر جھکاؤ محسوس نہیں کرتا تھا۔ شروع میں اپنے ساتھ پڑھنے والی کلاس کی حسین ترین لڑکی راجکماری پڑھائی میں واجبی ہونے کے باوجود اسے اچھی لگتی تھی۔ اس کے برعکس آنما پڑھنے لکھنے میں تیز ہونے کے علاوہ گانا بھی خوب گاتی تھی جبکہ سپنا بے سری تھی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ دونوں کا ساتھ ممکن نہیں وہ اسی کو چاہتا تھا۔ اب تک تو وہ جان چکا تھا کہ سپنا کی دنیا کمال میں کا داخلہ ممنوع ہے۔

سپنا اپنے علاقے کے امیر ترین شخص نپک چیٹر جی کی بیٹی تھی جبکہ کمال کا باپ دیہاڑی دار مزدور۔ وہ کیسے اس کے خیالات میں کھویا رہ سکتا تھا؟ دونوں خاندانوں کے بیچ دولت کی خلیج تو شاید کبھی نہ کبھی پُر ہو ہی جاتی کیونکہ کمال کو اپنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا کہ وہ ایک روز ضرور کامیاب ہوگا مگر دونوں کے درمیان مذہبی دیوار قائم تھی۔ سپنا ہندو برہمن خاندان سے تھی جو دوسرے ہندوؤں کو بھی کمتر سمجھتے تھے جبکہ کمال کا تعلق بالکل کسی اور مذہب سے تھا۔ ان حالات میں ملاپ کی کوئی صورت بنتی نظر نہ آتی۔ یہ سفاک حقیقت اس کے لیے تکلیف دہ تھی مگر وہ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ سپنا کی کشش اس کے لیے بالکل ایسے تھی جیسے مقناطیس لوہے کی کیلوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ کمال اس کی طرف کھنچتا تو جاتا تھا مگر اس کیل کی مانند جو سپنا کی اہل نہیں۔ دھتکارے جانے اور توہین کا خوف اسے آگے بڑھنے سے روکتا۔ چھوڑنا یا اس کی قربت حاصل کرنا دونوں اس کے بس میں نہیں تھے۔

پیالی دریا سڑک کے ساتھ ساتھ بل کھاتا بہہ رہا تھا۔ کنارے کے دوسری جانب کسان کھیتی باڑی میں مصروف تھے۔ کنارے پر ایک مرغابی دانہ دنکا چن رہی تھی اور ایک آبی پرندہ دریا کے بیچوں بیچ پتھر پر کھڑا تھا۔ اوپر ایک پتنگ اڑ رہی تھی جسے دیکھ کر اسے جیونن داس کی نظم کا ایک ٹکڑا یاد آ گیا جس میں پتنگ کی کچھی کے خم کو خمیدہ ابرو سے تشبیہ دی گئی تھی۔ سپنا کی آنکھیں ایسی تو نہیں مگر بڑی بڑی اور گہری ضرور تھیں۔ کیا انہیں چشمِ غزالی کہا جا سکتا ہے؟ نہیں! کمال ایک بار تقریری مقابلہ میں حصہ لینے کلکتہ گیا۔ وہاں اس نے پہلی مرتبہ ہرن دیکھا مگر اس کی آنکھیں تو خوبصورت نہیں تھیں، اس معاملہ میں گائے اسے بہتر لگی۔ شاید گزرے زمانے میں کسی شاعر نے ایک دوشیزہ کی آنکھوں کا موازنہ چشمِ آہو سے کیا ہوگا اور پھر یہی اندازِ بیان ہر دور میں مقبول و

معروف رہا۔

اسی قسم کے ناقابلِ قبول موازنے اور تقابل عام پائے جاتے ہیں۔ کہیں تو کسی دوشیزہ کی چال کو ہنس کی چال کہا گیا اور کہیں ہاتھی کے خرام سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کمال سمجھنے سے قاصر تھا کہ شاعروں اور ادیبوں نے کس بنا پر ہاتھی کی چال میں حسن تلاش کر لیا، یا ہاتھی اور ہنس میں مماثلت کیسے ڈھونڈ لی۔ کچھ تو اس سے بھی آگے چلے گئے، یعنی جوان لڑکی کی مدور چھاتیوں کو پہاڑی ٹیلے بنا دیا۔ شاید اسی لیے افلاطون نے کہا تھا کہ شاعروں کو پابندِ سلاسل کر دینا چاہیے۔ کمال کا خیال تھا کہ چشمِ آہو اور دوشیزہ کی آنکھوں میں قدرے بہتر نسبت ہے۔ مگر سپنا کی آنکھیں تو ہرنی کی آنکھوں جیسی نہیں تھیں پھر بھی ان میں ایک انفرادیت تھی۔ تاہم کمال اس کا اظہار اپنے کسی دوست یا خود سپنا سے نہ کر سکا تھا۔

چلتے چلتے وہ سپنا کے گھر تک پہنچ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ اس کے گھر جائے؟ اگر جائے تو کیوں؟ اگر سپنا گھر کے بیرونی حصہ میں ہو تو پھر کوئی مسئلہ نہیں اور بالفرض اس کا چھوٹا بھائی دکھائی دے تو اسے پیغام دیا جا سکتا ہے۔ سپنا کا باپ گھر میں ہو تو اسے کیا کہا جائے؟ کیا اس کو بتایا جائے کہ وہ سپنا سے ملاقات کو آیا ہے؟ اور کیا اسے سپنا سے ملاقات کی کوئی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ ابھی تو کل ہی ان کی اسکول میں ملاقات ہوئی تھی۔ فی الحقیقت کمال کو سپنا سے ملاقات کی کوئی ضرورت تھی ہی نہیں۔

وہ گھر کی طرف چل دیا۔ چلتے چلتے اس نے اس کمرے کی کھڑکی کی جانب دیکھا جہاں بیٹھ کر سپنا بالعموم مطالعہ کیا کرتی تھی مگر کھڑکی بند تھی۔ غالباً وہ اس سے آرام کر رہی ہوگی۔ یہ سوچ کر کمال تیزی سے آگے چل پڑا۔

....

غسل کرنے اور کھانا کھانے کے بعد کمال نے 'منوسمہتا' (Manu Samita by Pabhanan Tarkaratna) نکالی مگر اس کا دھیان سپنا کی طرف چلا گیا۔ مذہب اور ذات پات کا فرق اس کے ذہن پر بری طرح حاوی تھا۔ اس نے ذاتوں سے متعلق لکھے باب پر نظر ڈالی۔ چاروں ذاتوں کے فرق نے اس کے ذہن کو جھنجوڑ دیا۔ یہ اس دھرتی کا طے شدہ اصول تھا تاہم پارلیمنٹ نے کسی حد تک اس میں تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ قانون کی نگاہ میں ان اصولوں اور ضابطوں کی کوئی وقعت نہیں لیکن نجی مذہبی محفلوں اور اجتماعات میں ان پر پورا پورا عمل ہوتا ہے۔

کمال نے شودروں سے متعلق منو کی تعلیم کو دیکھا:

''برہما کا حکم ہے کہ باقی تینوں ذاتوں کی بلا کراہت خدمت شودروں کا فرض ہے''۔ (1/91)

کمال حیران رہ گیا۔ محمد نے اپنا حکم اللہ کے نام سے جاری کیا اور منو نے برہما کے نام سے۔ کمال آگے پڑھنے لگا:

''برہمن کا نام باعثِ برکت، کھشتری طاقت کی نشانی، ویش دولت کا اشارہ لیکن شودر حقارت کے لائق''۔ (31/2)

''برہمن کو اپنی عرفیت 'شرما' یا اس جیسی رکھنا چاہیے، جس کا مطلب ہے مسرت، کھشتری کو 'ورما'، جو تحفظ کی نشاندہی ہے، ویش کے لیے 'بھٹی' بہتر ہے جو دولت کا شارہ ہے جبکہ شودر خود کو 'داس' یعنی غلام کہلوائے۔ (32/2)

''دوج کی پہلی شادی اس کی اپنی ذات کے اندر ہونا قابل ترجیح ہے۔ بعد کی شادیوں میں یہ ترتیب لازم ہے: شودر عورت صرف شودر ہی سے بیاہ کرے گی، ویش شادی کے لیے ایک شودر اور ایک اپنی ذات میں سے عورت لے سکتا ہے، کھتری ان دونوں ذاتوں کے علاوہ ایک عورت اپنی ذات میں سے لے گا، جبکہ

برہمن ان تینوں کے ساتھ ساتھ برہمن عورت کے ساتھ بھی بیاہ رچانے کا حق دار ہے"۔(3/13)

کسی شودر اور عام شخص کے سامنے ویدوں کا جاپ نہیں ہوگا،(4/9)

اگر کوئی شودر اس جگہ جا بیٹھے جو برہمن کے لیے مخصوص ہے تو اس کے کولھوں کو گرم سلاخ سے داغ کر ملک بدر کر دیا جائے، یا اس کے کولھو کو اس طرح کاٹا جائے کہ اس کی موت واقع نہ ہو۔(8/281)

برہمن کے لیے سزائے موت نہیں ہے، یہ سزا صرف دوسروں کے لیے ہے۔(8/379)

شودر بے شک کتنی ہی کمائی کرنے کی صلاحیت کیوں نہ رکھتا ہو، اسے کچھ بھی پس انداز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ دولت کے سبب وہ مقدس تعلیمات سے بے بہرہ رہ کر برہمن کی توہین کا مرتکب ہو سکتا ہے۔(10/29)

....

کمال کے استاد پال صاحب نے اسے بتایا تھا کہ قرآن کے تفویض کردہ حقوق سے ہندو عورتیں محروم تھیں۔اس کو ذہن میں رکھ کر اس نے منو کی عورتوں سے متعلق تعلیمات کا مطالعہ شروع کر دیا۔منو کا کہنا ہے:

بچپن میں عورت اپنے پتا کے زیرِ سایہ، جوانی میں پتی کے اور پتی کے انتقال کے بعد بیٹوں کی نگرانی میں جیون بِتائے گی۔وہ کبھی بھی خود مختار نہیں رہ سکتی۔(5/148)

باپ، پتی یا بیٹوں سے الگ جیون گزارنے کا مطلب ہے کہ اس نے اپنے میکے اور سسرالی خاندانوں کو رسوا کیا ہے۔(5/149)

پتی چاہے کتنا ہی آوارہ مزاج، دوسری عورتوں کے ساتھ تعلقات میں ملوث اور علم سے بے بہرہ ہو، پتنی اس کی دیوتا سمان خدمت کرتی رہے۔(5/154)

پتنی اپنے پتی سے الگ ہو کر برت، چڑھاوا یا بھینٹ وغیرہ نہیں دے سکتی، ایسا کرنے کی صورت میں اس کا ٹھکانا نرک ہے۔(5/155)

پتی کی موت کے بعد وہ دوسری شادی نہیں کرے گی بلکہ کسی دوسرے مرد کا نام تک نہیں لے سکتی۔(5/157)

اپنی موت تک ہر دکھ درد کو برداشت کرنا، ضبطِ نفس اور ہر اس فرض کی بجا آوری اس پر لازم ہے جو ایک بیوی کی ذمہ داری ہے۔(5/158)

منو کا کہنا تھا کہ دنیا میں تمام نفسانی خواہشات، لوبھ لالچ، بننے سنورنے کا شوق، حسد و رشک، عیاری اور اعمالِ بد عورت کی وجہ سے ہیں۔(9/7)

مذہبی کتابوں کی رُو سے عورت کوئی نذر نیاز نہیں دے سکتی، نہ ہی وہ منتر جاپ کر سکتی ہے۔(9/18)

مذہبی قوانین کسی ودھوا کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دیتے۔(9/65)

کمال کو یقین کرنا پڑا کہ منوسمرتی میں بیان کردہ عورت کی صورتِ حال قرآن میں بیان کردہ مسلمان عورت سے بہت بری تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ منو اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کی تعلیمات میں تبدیلیاں آتی گئیں جن کے تحت ہندو عورت کو مردوں کے مساوی حقوق مل گئے۔مسلم قوانین کو بھی حالات کی مناسبت سے تبدیل ہونا چاہیے۔

....

کمال ذہنی کرب سے چھٹکارانہ پا سکا۔اپنے باپ خادم منڈل اور ہمسایہ گاؤں کے آنند کاکا اور لکشمی پور کے گوپال

دادو کے باہمی تعلقات کی روشنی میں اسے کسی قسم کی ہندو مسلم کشمکش دکھائی نہ دی۔ اگر کوئی فرق تھا تو وہ عید یا پوجا پاٹ کے موقعوں پر تھا۔ اس کا باپ عید کی نماز پڑھنے عید گاہ کو جاتا جبکہ آنند کا کا اور گوپال دادو اپنی پوجا کے لیے مندر کو، اس کے علاوہ اور کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ پہلا موقع جب اسے کسی قسم کی کشمکش دکھائی دی وہ گذشتہ برس کلاس مانیٹر کے چناؤ پر تھی۔ ایک طالبِ علم کا خیال تھا کہ جب کلاس میں ہندوؤں کی اکثریت ہے تو مانیٹر بھی ہندو ہونا چاہیے، اور پھر طلباء کی اکثریت اس رائے کی حامی نکلی۔ ان کے ذہن میں بس مذہب ہی قابلِ غور ایک نکتہ تھا، کسی دوسری صفت کو قابلِ توجہ نہ سمجھا گیا۔

اب کمال کسی مذہب کے احکام پر عمل پیرا نہیں رہا۔ اسے خدا کے وجود پر یقین نہیں تھا۔ اس کے خیال میں خدا کا تصور انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔ اس نے نماز روزہ ترک کر دیا، اور حج زکوٰۃ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یوں اسے کسی طور مسلمان نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کسی مذہب کے محدود دائرے میں پابند کرنے کا قائل نہیں تھا نہ ہی کسی مذہب کی نمائندگی اس کی خواہش تھی، لہٰذا مذہب کے نام پر کسی رُو رعایت کو روا بھی نہیں سمجھتا تھا۔ خود کو ایک کُل کا جز و بنائے رکھنا ہی مطمعِ نظر تھا، مگر یہ بات کسی طور بھی قابلِ قبول نہیں تھی کہ محض مذہب کی بنیاد پر کسی کو اپنے حق سے محروم کر دیا جائے۔ لیکن اس کے ہم جماعتوں کے لیے یہی ایک معیار تھا۔

غالباً اسی ذہنیت کے تحت بنکم چندر نے مسلمانوں کو دیش سے نکالنے اور انگریزوں کی تاج پوشی کی باتیں کی تھیں۔ اور اسی تعلیم و تبلیغ نے اس کے ہم جماعتوں کو بھی یہی سوچ اختیار کرنے پر مائل کیا تھا۔ کمال کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ بنکم چندر نے بنگالی غیر بنگالی، ہندوستانی اور غیر ملکی مسلمانوں میں امتیاز کئے بغیر انگریزوں کی حکمرانی کا نعرہ کیوں لگایا۔ انگریزوں میں عیسائیوں کے علاوہ مسلمان یا کسی اور مذہب کے پیروکار بھی ہو سکتے تھے۔ کمال کے دل میں بار بار یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ آخر بنکم چندر نے ایسی باتیں کیوں کیں؟

وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت کا سبب کیا ہو سکتا ہے اور اکثریت کے باوجود مسلمان کیوں معاشی اور تعلیمی میدان میں ہندوؤں سے پیچھے ہیں؟ اس نے اپنے استاد امر پال سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا، ''جن ہندوؤں کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا وہ نچلی ذاتوں یا اچھوت ذات سے تعلق رکھتے اور پہلے ہی سے بہت پسماندہ تھے۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا کیونکہ انہیں ترقی کے مواقع نہیں مل سکے تھے''۔

''سر! آپ کس بنیاد پر یہ کہہ رہے ہیں؟''

''عہدِ وسطیٰ کے مسلمان سلاطین، صوبیداروں اور نوابوں نے ان کی حالت بہتر بنانے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی جبکہ اس کے برعکس ان کے ہندو اشرافیہ کے ساتھ تعلقات بڑے خوشگوار تھے''۔

''کیا مطلب؟''

''میں خالی خولی دعوے نہیں کر رہا، یہ تاریخی حقائق ہیں۔ مثلاً علی وردی کے عہد میں انیس بڑے زمینداروں میں سے اٹھارہ اور نواب سراج الدولہ کی انتظامیہ کے سات میں سے چھ اعلیٰ عہدیدار ہندو تھے، واحد مسلمان فوجوں کا سپہ سالار میر جعفر تھا''۔

''سر! پھر کیا ہوا؟''

''برطانوی دور میں بھی مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے کی جانب کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا''۔

''لیکن کہا تو یہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کو تحفظات بھی دیے گئے تھے''۔

''بالکل صحیح۔ اپنے دورِ حکومت کے آخری دنوں میں انگریزوں نے واقعی مسلمانوں کو مراعات دی تھیں مگر مقصد یہ تھا کہ آزادی کے لیے لڑنے والے ہندوؤں سے انہیں دور رکھا جائے، اس سے عام مسلمان کا بھلا نہ ہوا، ہاں کلکتہ کے چند مسلمان

اشرافیہ نے ضرور فائدہ اٹھایا''۔

''لیکن سر! اب تو دیس کو آزاد ہوئے بھی تیس برس ہو گئے ہیں''۔

''درست کہ ہمیں آزادی ملے تیس برس ہو چکے ہیں لیکن ذات پات اور مذہب پر مبنی سیاست میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ روز بروز تیزی ہی آ رہی ہے۔ شیڈولڈ ذاتوں اور قبائل کے لیے مخصوص مراعات دس سال کے لیے تھیں، لیکن ہر عشرے کے بعد اس میں توسیع ہوتی رہی۔ نتیجتاً، ہندو دھرم میں رہنے کے باوجود تعلیمی اداروں، مقابلے کے امتحانات، ملازمتوں، حتیٰ کہ ترقی کے لیے بھی شودروں کو تحفظات دیے گئے لیکن دائرۂ اسلام میں آنے والا شودر اس سے محروم ہے۔ انہیں باقی شہریوں کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ شیڈولڈ ذاتیں اور قبائل ان سے بہتر ہونے کے باوجود تا حال تحفظات اور مراعات سے مستفید ہو رہے ہیں۔ نتیجتاً، مسلمان ان فوائد سے بھی محروم ہیں جو انہیں عدمِ تحفظات سے حاصل ہو سکتے ہیں''۔

کمال کو مسلمانوں کی حالتِ زار کا قدرے اندازہ ہو گیا۔ اسے اُن پر ترس آنے لگا۔ اُس کے کچھ پُرکھوں نے اعلیٰ جاتی ہندوؤں کے ظالمانہ برتاؤ سے بچنے کی خاطر اسلام قبول کیا تھا۔ وہ مساوات کے لیے مسلمان ہوئے تھے جو انہیں حاصل نہ ہو سکی۔ کمال کے لیے یہ حیران کن بات تھی۔ اسے اسلام سے کوئی ہمدردی نہ تھی البتہ عام مسلمانوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ موجود تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو ٹٹولا کہ اس کے دل میں ایسے ہی جذبات کیا غیر مسلموں کے لیے بھی ہیں؟ بالکل تھے۔ درحقیقت کسی قسم کا امتیازی سلوک اس کے لیے باعثِ تکلیف تھا۔

پال صاحب نے پوچھا: ''میں نے تمہیں شاہد صاحب سے ملنے کو کہا تھا۔ ملاقات ہوئی''؟

''نہیں سر! میں جا نہیں سکا۔ اب میں یقیناً جاؤں گا''۔

....

آنند مٹھ کے واقعہ کے بعد کمال نے نرمل ساہا صاحب کے ساتھ مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ہاں البتہ اسکول میں چند ایسے اساتذہ تھے جن کے ساتھ ایسی باتیں کی جا سکتی تھیں۔ کمال ہچکچاتے ہوئے ساہا صاحب کے پاس گیا مگر انہوں نے علی صاحب کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔

علی صاحب اس کے اسکول میں استاد تھے مگر اب صوبے کی قانون ساز اسمبلی کے رکن ہونے کی حیثیت سے زیادہ جانے پہچانے جاتے تھے۔ وہ عرصہ سے کمیونسٹ پارٹی کے بھی رکن تھے۔ اس وقت وہ اساتذہ کے کمرے میں تھے۔ کمال نے ان سے یہی سوال کیا۔ ان کا جواب تھا:

''تمہیں ہندو مسلم حوالے سے نہیں سوچنا چاہیے۔ اس سارے قضیئے کا جدلیاتی مادیت کے نقطۂ نظر سے جائزہ لو۔ اصل میں یہ معاشی مسئلہ ہے۔ سرمایہ دار اور بورژوا طبقے غریبوں، مزدوروں اور محنت کشوں کا استحصال کرتے ہیں۔ طبقاتی جدوجہد ہی اس کا واحد حل ہے''۔

کمال کو یہ جواب تسلی بخش نہ لگا۔ کمیونسٹ پارٹی کے اراکین ہر بات کا تجزیہ کارل مارکس، سرمایہ دار، پرولتاری، بورژوا اور طبقاتی جدوجہد جیسی مخصوص اصطلاحات سے کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے تمام تر طبقاتی جدوجہد حوالے فنِ خطابت دکھانے کے لیے تھے، اصل کشمکش کی وضاحت کے لیے نہیں۔ اس وقت ساہا صاحب بھی کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے بھی شاہد صاحب سے ملنے کا مشورہ دیا۔

شاہد صاحب دلدلی میدان کے پار مل چتر گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ گھر اگرچہ دور تھا تاہم اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تذبذب میں تھا کہ یہ سارے سوالات ان سے کیسے پوچھے گا کیونکہ دونوں میں کوئی شناسائی نہیں تھی۔

ابوالعلی کا باپ ظفر علی شاہد خان کے گھر کام کرتا تھا۔ اس کی رہائش بھی وہیں تھی تاہم کبھی کبھار وہ اپنے گھر آیا کرتا تھا۔ کمال نے سوچا کہ وہ ابوالعلی کے ساتھ شاہد خان کے پاس جائے لیکن شادی کے بعد وہ تعلیم چھوڑ چھاڑ کر مکمل کنبہ پرور شخص بن گیا تھا۔ گھر میں اس کی موجودگی مشکل ہی تھی۔ تاہم کوشش میں تو کوئی حرج نہیں۔ شام سے وہ ان کے ہاں گیا۔ اس کی بیوی سلمٰی باہر والے حصے میں جھاڑو دے رہی تھی۔ کمال کو دیکھ کر اس نے لمبا سا گھونگھٹ لیا اور جلدی سے اندر چلی گئی۔ اس کی خوش دامن ملیکہ باہر نکلی تو اس سے ابوالعلی کا پوچھا۔ جواب ملا کہ وہ کھیتوں کو پانی لگانے گیا ہوا ہے۔ یہ بتا کر وہ اندر جانے کو مڑی مگر جیسے اچانک کوئی بات یاد آ گئی ہو، اس نے کمال سے کہا کہ اگر اسے برا نہ لگے تو ایک بات پوچھنی ہے۔

کمال نے جواب دیا، ''جی! ضرور پوچھیں''۔

''لوگ کہتے پھر رہے ہیں کہ تمہیں خدا کے وجود پر یقین نہیں۔ کیا واقعی ایسا ہی ہے؟''

کمال گڑبڑا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ گاؤں کے لوگوں کو کیسے بتائے کہ اس کے ذہن میں کیا ہے۔ وہ لوگ اپنی عقل اور شعور کے مطابق ہی سوچتے سمجھتے ہیں۔ عبدالعلی کی ماں نے بھی ادھر ادھر سے باتیں سنی ہوں گی۔ اگر وہ اسے سمجھانے بیٹھ گیا تو سارا دن گزر جائے گا اور عبدالعلی کے ساتھ جانے کا پروگرام چوپٹ ہو جائے گا۔ لہٰذا اس نے جواب دینے کی بجائے اتنا ہی کہا کہ اسے ابوالعلی سے کوئی ضروری کام ہے۔

''وہ اس وقت ٹیوب ویل کے پاس ہوگا''۔

جواب سن کر کمال اسی طرف چل دیا۔

....

چھٹی کے بعد کمال اسکول سے باہر نکلا تو ابوالعلی حسب وعدہ دروازے کے باہر اپنی سائیکل لیے کھڑا تھا۔ کمال بھاگ کر اس کے پاس گیا اور اسے چلنے کو کہا مگر وہ دروازے کے پار کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسکول کی آخری گھنٹی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہوئی تھی۔ اساتذہ اور طلباء اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ نویں جماعت کی سائنس کے طلباء ابھی تک کیمسٹری کی تجربہ گاہ میں تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی باہر آ گئے۔ اُن کی ہم جماعت ثریا بھی نکل کر سائیکل اسٹینڈ کی جانب چل دی اور اپنی سائیکل لے کر دروازے کی طرف آنے لگی۔

کمال اسکول کے تمام طلباء کو نہیں جانتا تھا مگر ثریا سے شناسائی تھی۔ اس کے اسکول میں سائنس طلباء کی صرف پندرہ نشستیں تھیں۔ سالانہ امتحان میں نمایاں کارکردگی دکھائے بغیر سائنس کے مضمون میں داخلہ ملنا ناممکن تھا۔ اس علاقے میں حسب معمول لڑکیوں کی تعداد لڑکوں کی نسبت کم تھی اور سائنس میں تو نہ ہونے کے برابر۔ گذشتہ برس سائنس کی واحد طالبہ ثریا لکشی پور ہائی اسکول سے یہاں آئی تھی، اسی وجہ سے کمال اسے جانتا تھا۔ ممکن ہے ثریا بھی اسے جانتی ہو کیونکہ محنتی اور قابل طالب علم ہونے کی وجہ سے تقریباً سارا اسکول اس سے شناسا تھا۔ یہی نہیں، فی البدیہہ تقریری مقابلوں کے باعث وہ پورے ضلع میں جانا جاتا تھا۔ پچھلے برس بھی اس نے اسکول کے لیے انعام حاصل کیا تھا۔

ثریا نے سفید ریشمی ساڑھی، جس کے کناروں پر سرخ گوٹ لگی تھی، پہن رکھی تھی۔ ابوالعلی نے اسے آواز دے کر اپنی جانب بلایا۔ اسے دیکھ کر وہ خوشی سے کھل اٹھی، ''ابول بھائی! آپ یہاں؟ بھابھی کیسی ہیں؟''

''وہ اکثر تمہیں یاد کرتی ہے''۔

''انہیں ہمارے گھر لائیں نا''۔

''ہاں ضرور۔ اس وقت تو تم کمال کو اپنے گھر لے جاؤ''۔

اس اچانک اور غیر متوقع جواب پر وہ حیران رہ گئی۔ اس نے پاس کھڑے کمال پر نظر ڈال کر سوالیہ نگاہوں سے ابوالعلی کو دیکھا تو اس نے بتایا، ''کمال ہمارا ہمسایہ ہے''۔

ثریا جاننا چاہتی تھی کہ وہ ان کے گھر کیوں جانا چاہتا ہے؟ ''کمال تمہارے دادا ابو سے ملنے کا خواہشمند ہے''، ابوالعلی نے اس کی الجھن دور کر دی۔

''اتنی بات تو وہ خود بھی کہہ سکتا تھا؟''

''یہ تو تم کمال ہی سے پوچھ سکتی ہو''، ابوالعلی نے جواب دیا۔

ثریا نے کمال کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا، ''کمال بھائی! کیا تم مجھے نہیں جانتے؟''

''ہاں! میں جانتا ہوں''۔

''پھر مجھ سے کیوں نہیں کہا؟ میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟''

''مجھے علم ہے کہ تمہارا نام ثریا خان ہے، تم گیت بھی خوب گاتی ہو، کلاس نہم میں سائنس کی طالبہ ہو اور سائیکل اچھی چلا لیتی ہو۔۔۔۔۔۔''۔

کمال کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ثریا نے قہقہہ لگایا، ''مجھے پتہ ہے تم شاعری بھی کرتے ہو''۔

''لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم شاہد خان صاحب کی پوتی ہو''۔

''کیوں نہیں پتہ تھا؟ سب کو معلوم ہے۔ تم کیسے نہیں جانتے؟'' ثریا معترض تھی۔

''اچھا، تو کیا تمہیں میرے دادا کا پتہ ہے؟''

ثریا نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ ہلائے ہی تھے کہ خاموش ہو گئی۔ پھر کہنے لگی، ''میں تمہارا مطلب سمجھ گئی ہوں۔ ابول بھائی! آئیں چلیں، سائیکل پر بیٹھو اور جلدی سے پہنچو''۔

ابوالعلی نے سائیکل کمال کو دیتے ہوئے کہا، ''میں نہیں جا رہا، تم کمال کو اپنے ساتھ لے جاؤ''۔

ثریا سائیکل پر بیٹھی، کمال اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ براہی بھوبن پور سڑک پر تھے۔ اگرچہ وہ اپنی اپنی سائیکل پر تھے پھر بھی کمال کو شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اگر وہ اکیلا ہی جاتا تو بہتر تھا۔ اسے گاؤں اور شاہد خان کے گھر کا پتہ تھا مگر ان کے گھر میں کسی سے بھی اس کی شناسائی نہیں تھی۔ لکشمی پور موڑ پر پہنچ کر ثریا نے پیچھے مڑ کر کمال کو دیکھا اور کچی سڑک پر مڑ گئی۔ ابھی وہ چند قدم ہی گئے ہوں گے کہ ثریا کی سائیکل کی اگلی ٹیوب پھٹ گئی۔ اس نے نیچے اتر کر ٹائر دیکھا اور کمال کو وہیں انتظار کرنے کا کہہ کر نزدیکی دکان دار سے کہنے لگی، ''جلیل چچا! میں اپنی سائیکل یہاں چھوڑے جا رہی ہوں، ظفر چچا آ کر لے جائیں گے''۔ جلیل نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ پھر وہ کمال کے پاس آئی، ''آئیں چلیں''۔ وہ سائیکل ہاتھ میں پکڑے پیدل چلنے لگا۔ ثریا نے اعتراض کیا۔

''اس طرح تو ہمیں بہت دیر ہو جائے گی۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ تم بیٹھو، میں سائیکل چلاتی ہوں''۔

''نہیں! میں چلاؤں گا''۔

ابوالعلی کی سائیکل میں پیچھے بیٹھنے کی گدی نہیں تھی اس لیے ثریا کو کتابوں کا بیگ اپنی گود میں رکھے اگلے ڈنڈے پر بیٹھنا پڑا۔ کمال بیٹھتے ہی لگا تھا کہ اسے پھاتک چاچا کی بات یاد آ گئی۔

پھاتک رشتہ میں اس کا چچا ہونے کے علاوہ ہم جماعت بھی تھا۔ آٹھویں جماعت میں فیل ہونے کے سبب اس نے اسکول چھوڑ کر دس پاڑا ہائی اسکول میں نویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔ پچھلے سال تک وہ دونوں اکٹھے ہی اسکول آتے جاتے

تھے۔ایک لڑکی سرسوتی سرکار سائیکل پر آیا کرتی تھی مگر خود چلانے کی بجائے ایک ملازم اسے بٹھا کر لایا کرتا تھا۔یہ منظر دیکھ کر پھاٹک نے ایک بار کمال سے کہا تھا،''تمہاری مہربانی ہوگی اگر مجھے بھی کسی ایسی ہی ملازمت پر لگوادو۔میں بلا اجرت کام کروں گا اور ضرورت پڑنے پر سائیکل کی مرمت بھی اپنے پلے سے کراؤں گا''۔

ثریا نے کمال کے خیالات کا تانا بانا ادھیڑ دیا،''تم بیٹھتے کیوں نہیں؟سائیکل چلاؤ۔''

اس نے سائیکل چلانا شروع کر دیا۔ثریا اس سے پوچھنے لگی،''کیا تم اس طرف پہلی دفعہ آئے ہو؟میرے دادا سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟تم امتحانات میں اتنے زیادہ نمبر کیسے لے لیتے ہو؟''

''تم بھی تو اچھے نمبر لیتی ہو''۔

''نہیں تو''۔

''پھر تمہیں سائنس میں داخلہ کیسے مل گیا؟''

''اوہ!حساب میں میرے سو میں سے اکیاون نمبر تھے۔مگر تمہارے نمبر تو سو بٹا سو تھے۔کیا ہم دونوں میں کوئی موازنہ ہے؟''

'چاہو تو تم بھی پورے نمبر لے سکتی ہو''۔

''وہ کیسے؟کیا اس معاملہ میں تم میری مدد کرو گے؟''

کمال ابھی جواب نہ دینے پایا تھا کہ وہ گھر پہنچ گئے۔دونوں سائیکل سے نیچے اترے۔ظفر آگے بڑھا،''کمال تم؟''

ثریا نے جواب دیا،''یہ دادا ابو سے مل کر کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔اس کو ان کے پاس لے جاؤ اور تعارف بھی کرا دینا''، یہ کہتے ہوئے وہ خود زنان خانے چلی گئی۔ظفر نے کمال سے حال احوال پوچھا اور پھر اسے لے کر خان صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم پہنچے۔آرام دہ کرسی پر ایک باوقار عمر رسیدہ شخص بیٹھا کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا۔ظفر نے کمال کو سرگوشی میں بتایا کہ یہی شاہد صاحب ہیں۔انہوں نے سر اٹھا کر دونوں کو دیکھا۔

''حضور!یہ آپ سے ملنے آیا ہے''۔

''کون ہے یہ؟''

''جی!یہ کمال ہے،میرے گاؤں میں رہتا ہے''۔

''تمہارے گاؤں میں؟''

''جی سرکار!یہ وہی کمال ہے جو براہی ہائی اسکول میں ہمیشہ فرسٹ آتا ہے''۔

''اچھا تو یہ تمہارے گاؤں میں رہتا ہے؟''

''صرف گاؤں ہی میں نہیں،بلکہ یہ ہمارا ہمسایہ بھی ہی۔میرا بیٹا اس کا ہم جماعت تھا''۔

''مت ذکر کرو تم اپنے بیٹے کا۔وہ آٹھویں جماعت میں تھا جب تم نے اس کی پڑھائی ختم کر کے خوشی خوشی اس کے پاؤں میں شادی کی زنجیر ڈال دی تھی''۔

''سرکار!آپ ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں؟بیٹا جوان ہو گیا تھا،کیا اس کی شادی نہ کرتے؟جوان بچوں کی شادی کرنا تو ماں باپ کا فرض ہے''۔

''بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔شادی کرنا تمہارا فرض تھا،کیا انہیں تعلیم دینا فرض نہیں؟''

''سرکار! میں نے اسے تعلیم تو دلوائی ہے''۔

''کیا سات جماعتیں پڑھ لینا تعلیم ہے؟''

''حضور! کیا ہمارے گھرانوں کے بچے آپ جیسی ملازمت حاصل کر سکتے ہیں؟ جب بیٹے نے کھیتی باڑی ہی کرنی ہے تو کیوں نہ اسے پہلے ہی اس کام پر لگا دیا جائے؟ اور اگر وقت پر ان کی شادی نہ کی جائے تو ان کے بگڑنے کا خدشہ رہتا ہے''۔

''چپ کرو! مہربانی کر کے ایسا مشورہ کمال کے باپ کو نہ دینا''۔

''سرکار! کمال کا باپ خادم منڈل مجھ سے زیادہ سمجھدار ہے، اسے میرے مشورے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو کافی عرصہ سے اس کی شادی کی فکر میں تھا۔ لڑکی والوں کی طرف سے کئی بار لوگ آئے بھی۔ اگر کمال بھاگ نہ جاتا تو اس کی شادی میرے بیٹے سے بھی پہلے ہو جاتی''۔

''بہت اچھا ہوا۔ کم از کم کمال تو تمہارے بیٹے کی طرح بے وقوف نہیں نکلا''۔

ظفر کو کوئی جواب نہ سوجھا تو اس نے کام کرنے کا بہانہ بنا کر اپنی جان چھڑائی۔

شاہد خان نے رسالہ ایک طرف رکھا اور براہی ہائی اسکول میگزین اٹھا کر ایک صفحہ کھولا اور کمال سے پوچھا، ''کیا تم یہی کمال ہو؟''

کمال نے دیکھا کہ جہاں شاہد صاحب اشارہ کر رہے تھے وہاں اس کا نام بحیثیت سٹوڈنٹ ایڈیٹر چھپا ہوا تھا۔ اس نے ہاں میں جواب دیا۔ شاہد صاحب خوش ہوئے اور مزید کہا، ''یہاں تمہارے نام سے ایک کہانی بھی شائع ہوئی ہے۔ کیا عنوان ہے کہانی کا؟'' پھر انہوں نے رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک کہانی نکالی، ''ہاں یہ ہے! 'سپنا'، تمہارا سپنا کیا ہے؟''

کمال نے جواب دیا، ''بلاشبہ میرے بھی کچھ سپنے ہیں۔ فی الحال آپ کے پاس آنے کا مقصد کچھ معلوم کرنا ہے''۔

''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ کرسی میرے قریب ہی گھسیٹ لو''۔

کمال نے اپنی کرسی ان کی کرسی کے مقابل رکھ کر سوال کیا، ''ہمارے علاقے میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ پُرامن طور پر رہ رہے ہیں۔ پھر مسلمان اور ہندو لیڈروں کو ملک تقسیم کرنے کی کیا سوجھی تھی؟''

سوال سن کر شاہد صاحب نے یوں اپنا پہلو بدلا گویا بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ انہوں نے الٹا سوال کیا، ''کیا تم نے یہی سوال اپنے تاریخ کے استاد سے پوچھا تھا؟''

''جی ہاں! پوچھا تھا مگر انہوں نے اپنی فہم کے مطابق جواب دیا، پھر میں نے پال صاحب سے بھی بات کی تھی''۔

''کون پال صاحب؟''

''اجیت پور کے پال صاحب، جو ٹھکولا پرائمری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے''۔

''اوہ! کمل پال کا بیٹا۔ اس کا باپ گاندھی کی تحریکِ عدم تعاون میں ہمارے ساتھ تھا''۔

''میں بھی انہی واقعات کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں''۔

''کون سے واقعات؟''

''آپ پہلے کانگرس میں تھے، پھر کرشک پرجا پارٹی میں آ گئے، بعد ازاں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ کیوں؟''

شاہد خان کچھ شپٹا سے گئے۔ وہ سیدھے ہو کر بیٹھے اور پوچھا، ''تمہیں ان سب باتوں کا کیسے پتہ چلا ہے؟ چلو! ٹھیک ہے۔ اب تم مزید کیا جاننا چاہتے ہو؟''

''میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس علاقے کی اکثریتی آبادی نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے اسلام کیوں قبول کیا

تھا اور کیوں وہ تعلیمی اور معاشی لحاظ سے اس قدر پسماندہ ہیں؟''

''کیا تم نے پال صاحب سے نہیں پوچھا تھا؟''

''جی! پوچھا تھا''۔

''تو انہوں نے کیا بتایا؟''

کمال نے ان کے ساتھ ہونے والی باتیں تفصیل سے خان صاحب کو بتائیں۔ پھر اس نے کہا،'' مان لیا کہ ہندوؤں اور بدھوں کے حالات تبدیلیِ مذہب سے بھی پہلے دگرگوں تھے، اور یہ کہ ان کی حالت میں بہتری لانے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کئے گئے، اور پھر یہ کہ ہندو اشرافیہ کے معاشی حالات مسلمانوں سے اس وقت بھی بہتر تھے جب یہاں مسلم حکومت قائم تھی، مطلب یہ کہ کچھ دولتمند مسلمان تو اس وقت بھی موجود ہوں گے۔ علی وردی کے دورِ حکومت میں انیس میں سے اٹھارہ انتہائی دولتمند زمیندار ہندو تھے، واحد صاحب ثروت مسلمان زمیندار کہاں چلا گیا ہے؟''

''بہت اچھا سوال ہے۔ انگریزوں کی آمد کے ساتھ مسلمانوں میں زوال آنا شروع ہو گیا یہاں تک کہ وہ خاک نشین ہو گئے''۔

''وہ کیسے؟''

''یہ مسلمانوں کے زوال کا بڑا دلخراش باب ہے۔ کیا تم نے بڑے میاں کا نام سنا ہے؟''

نہ صرف نام بلکہ کمال نے ان سے منسوب بہت داستانیں بھی سن رکھی تھیں۔ ان سب میں مشہور اس کی داستانِ عشق تھی۔ بڑے میاں کی شادی ایک بہت بڑے زمیندار کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ بڑے میاں کا خاندان علاقے بھر میں مشہور تھا لیکن شادی کے بعد پتہ چلا کہ ان کی صرف شہرت ہی تھی، اندر سے وہ کھوکھلے تھے۔ اس کے سسر نے بیٹی کو میکے بلوایا اور پھر خاوند کے پاس بھیجنے سے انکار کر دیا۔ بڑے میاں کو بڑا صدمہ ہوا، اس کا باپ تو زیادہ ہی نڈھال ہو گیا۔ اپنے ساتھیوں اور دیگر خاندانی لوگوں کو بلا کر اس نے ان سے کہا کہ میں اپنے بیٹے کی دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں، اس کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کرو۔ کسی نے دوسری شادی پر اعتراض کیا تو اسے جواب ملا،'' اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے''۔ اس پر خاندان کے لوگوں نے لڑکی کی تلاش شروع کر دی۔

بڑے میاں اپنی بیوی سے محبت کرتا تھا اور کسی صورت دوسری شادی کا خواہشمند نہیں تھا۔ اس نے اپنی ماں سے بات کی، ماں نے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جب ہمارا بیٹا دوسری شادی کا خواہشمند نہیں ہے، تم کیوں اس پر تلے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا۔

یہ سن کر بڑے میاں آگ بگولہ ہو گئے،'' کون کہتا ہے وہ شادی نہیں کرے گا؟ اس کا باپ بھی کرے گا''

ماں تو یہ سن کر خاموش ہو گئی لیکن پاس کھڑی ایک ملازمہ منہ پر کپڑا رکھ کر مسکرانے لگی۔ ادھر بڑے میاں اپنے سسرال جانے کی سوچ رہا تھا لیکن باپ کے غصے کی وجہ سے کوئی قدم نہ اٹھا سکا۔ وہ بلا مقصد ادھر اُدھر ٹہلتا رہتا۔ ایک شام کو جب وہ سڑک پر پھر رہا تھا ایک ملازمہ نے اس کو لفافہ دیا اور غائب ہو گئی۔ اس نے کھول کر دیکھا۔ اس کی بیوی نے اسے لکھا تھا:

''چوہدری! ہمارے گھر کے اندر پچھواڑے میں آم کا درخت ہے، رات دس بجے وہاں آ جانا۔ سب کے سو جانے کے بعد میں کھڑکی سے ساڑھی باندھ کر نیچے اتر آؤں گی۔ اگر تمہیں تاخیر ہو گئی تو سمجھو کہ میں ہمیشہ کے لیے تم سے بچھڑ جاؤں گی''۔

تمہاری پالی

خط پڑھ کر بڑے میاں جوش میں آ گئے۔ پالی اس سے اتنی محبت کرتی ہے! میں ضرور جاؤں گا لیکن اگر چوکیدار نے پکڑ لیا تو مار مار کر اس کا بھرکس نکال دے گا۔ یہ سوچ کر بڑے میاں خوفزدہ ہو گئے۔ بیوی کے بلانے پر اس کا جانا والدین کو بالکل منظور نہ ہوتا، لہٰذا اس نے کسی کو بتائے بغیر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ رات کو اپنا پسندیدہ گھوڑا 'رانا' نکالا اور بیوی کو لانے چل دیا۔ وہاں پہنچ کر آم کے درخت سے گھوڑا باندھا۔ اب مصیبت یہ کہ ایک تو گھنی جھاڑیاں اوپر سے مچھروں کی بہتات، انہوں نے کاٹ کاٹ کر سوار اور سواری دونوں کا برا حال کر دیا۔ بڑے میاں تو خیر برداشت کر گیا مگر گھوڑا کبھی دُم ہلاتا، کبھی زور زور سے گردن ادھر ادھر کرتا اور اپنے سُم زمین پر مارتا۔ بڑے میاں نے اسے شانت رکھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ جانور تھا، اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پالی ابھی تک کھڑکی میں نہیں آئی تھی۔

دس بج گئے، ساڑھے دس ہو گئے مگر پالی غائب۔ کیا یہ کوئی سازش تو نہیں تھی؟ وہ سوچنے لگا۔ یہ سوچ کر اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ خود تو پریشان تھا ہی، گھوڑا بے قابو ہو رہا تھا۔ اس کے ہنہنانے کی آواز سن کر کسی نے پوچھا، "کون ہے؟" بڑے میاں بہت گھبرائے۔ ایک بار تو اس کے ذہن میں آیا کہ بھاگ چلو، مگر اس صورت میں اسے پالی کو چھوڑنا پڑتا، ایسا وہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سوچا، جو ہو سو ہو۔ چوکیدار قریب آ گیا، وہ بڑے میاں کا واقف کار تھا۔ اس نے بڑی لجاجت سے کہا، "مہر جان! کرم کرو۔ میں اپنی بیوی کو بس ایک نظر دیکھ لوں پھر چلا جاؤں گا"۔ یہ کہہ کر اس نے چوکیدار کو کچھ پیسے بھی دیئے۔ چوکیدار نے بھی سوچا کہ سودا نقصان دہ نہیں ہے، لہٰذا مان گیا۔

اسی اثنا میں ایک اور چوکیدار نے کھڑکی میں ایک سفید ساڑھی کے ساتھ پالی کو لٹکتے دیکھ کر شور مچا دیا۔ شور سن کر دوسرے لوگ بھی بھاگے بھاگے آ گئے۔ پالی کے اوسان خطا ہوئے تو گھبراہٹ میں اس کا ہاتھ چھوٹا اور وہ بلندی سے نیچے آ گری۔ بڑے میاں نے ایک شکرے کی طرح اسے اٹھایا اور گھوڑے پر ڈال یہ جا وہ جا۔ چوکیداروں نے گھوڑوں پر ان کا پیچھا کیا۔ وہ اتنے قریب آ گئے تھے کہ میاں بیوی کا پکڑے جانا ممکن تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے بڑے میاں نے سڑک سے ہٹ کر بغلی راہ پر بچ دلدلی پانی میں گھوڑا اڈال دیا۔ چوکیدار انہیں دیکھ نہ پائے اور تیزی سے آگے نکل گئے۔ یہ دونوں میاں بیوی گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے دوسرے کنارے جا لگے۔ اس دن سے بڑے میاں علاقہ بھر میں رومانی داستان کے ہیرو کے طور پر مشہور ہو گئے۔

کمال پانچویں جماعت میں تھا جب اس کے ایک ہم جماعت جمیل نے اسے یہ کہانی سنائی تھی۔ بڑے میاں کی بیٹی جالی بھی اس کی ہم جماعت تھی اس لحاظ سے کہانی بہت دلکش لگتی تھی۔ یہ قصہ سننے کے بعد تو جالی بھی اسے پریوں کی کہانی کا ایک کردار لگنے لگی۔ کمال اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا مگر کر نہ پایا۔ جب وہ آٹھویں جماعت میں تھا تب اس نے جمیل سے اپنے دل کی بات کہی۔ جمیل اسے اپنے گھر لے گیا۔ جالی ساتھ والی گھر میں رہتی تھی، اس لیے جمیل اسے وہاں بھی لے گیا۔ جالی نے اپنے پرکھوں کے متعدد کارنامے سنائے جواب اسے یاد نہیں تھے۔

کمال نے شاہد خان کے استفسار پر بتایا کہ وہ بڑے میاں کے گھر بھی گیا تھا۔ "کیا تمہیں علم ہے کہ اس کے خاندان پر زوال کیسے آیا؟"، شاہد خان نے پوچھا۔

"جی ہاں! ان کے ایک بزرگ میر بہار خان بہت بڑے زمیندار تھے۔ اس نے میر مدن کی قیادت میں جنگِ پلاسی میں حصہ لیا تھا مگر زندہ نہ لوٹ سکے"۔

"بالکل صحیح۔ تمہیں میر بہار خان سے لے کر خاندان کے موجودہ سربراہ بڑے میاں شرافت حسین چوہدری تک آتے آتے ان کے خاندانی زوال کی وجوہ کا علم ہے، اسی میں تمہیں اپنے سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے"۔

"وہ کیسے؟"

''ایک بار پھر ان کے گھر جاؤ اور بڑے میاں کو مل کر میرا حوالہ دو۔ تمہیں ہر چیز کا علم ہو جائے گا۔ ان کے خاندان کی تاریخ سے متعلق تمام باتیں تحریری صورت میں موجود ہیں''۔

کمال کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عین اس وقت ثریا ایک ہاتھ میں شیرینی کی پلیٹ اور دوسرے میں پانی کا گلاس لیے داخل ہوئی۔ خان صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''یہ میری پوتی ہے اور تمہارے ہی اسکول میں پڑھتی ہے۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟'' کمال کے کچھ کہنے سے قبل ہی ثریا بول اٹھی، ''جب آپ نے میرا تعارف ہی نہیں کرایا تو یہ کیسے جان سکتا ہے؟''

شاہد خان نے مسکراتے ہوئے کہا، ''میری جان! کیا تمہارے تعارف کی کوئی ضرورت ہے؟ تم بڑی ہو گئی ہو، یہ کام خود بھی کر سکتی ہو''۔

''اگر آپ ایسا ہی سمجھتے ہیں تو یہ پوچھا ہی کیوں تھا؟''

''ہاں! یہ میری غلطی ہے''۔

''ایک نہیں، بلکہ دو غلطیاں''

''محترمہ! میری دوسری غلطی کیا ہے؟''

''کیا آپ کو پتہ ہے کمال کہاں کا رہنے والا ہے؟''

''بسنت پور''، خان صاحب نے جواب دیا

''کیا یہ دلدلی علاقے کے اِس طرف ہے یا دوسری جانب؟''

''دوسری جانب''۔

''وہاں پہنچنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟''

''تقریباً ایک گھنٹہ''۔

''اب کیا وقت ہوا ہے؟''

خان صاحب نے گھڑی دیکھ کر بتایا، ''ساڑھے چھ''۔

''اور آپ نے ابھی تک اس کو روکے رکھا ہے؟''

''میں نے نہیں روکا بلکہ اس نے مجھے روکا ہوا ہے۔ یہ سوال پر سوال پوچھ رہا ہے، میں تو صرف جواب دینے کی کوشش کر رہا ہوں''۔

''میں سمجھ گئی۔ آپ کو باتوں کے لئے کوئی شخص چاہیئے تھا۔ اب ختم کریں، اگر ضروری ہوا تو یہ کل پھر آ جائے گا''۔

کمال دادا پوتی کی باتیں سن کر محظوظ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں یہ منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے بہت مزا آیا، مگر یہ بھی احساس ہوا کہ اسے واپسی میں تاخیر ہو رہی ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ثریا نے اسے شیرینی کھانے کے لیے کہا۔ خان صاحب بولے، ''یہ چھوٹی سی ڈکٹیٹر ہے، معمولی سا بھی اختلاف رائے برداشت نہیں کرتی۔ اسے میری شکل میں انتہائی تابعدار شخص ملا ہوا ہے۔ اب یہ اپنا دائرۂ اثر وسیع کرتی جا رہی ہے۔ مٹھائی کھا لو، چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں''۔

ثریا نے جھوٹ موٹ کی ناراضی کا اظہار کیا۔ خان صاحب نے بھی اس کی تیوریاں دیکھ کر یہ ظاہر کیا جیسے ڈر گئے ہوں۔ کمال نے تھوڑی سے مٹھائی لی اور کمرے سے باہر آ گیا۔ ثریا بھی اس کے ساتھ باہر نکلی۔ اسے خدا حافظ کہہ کر وہ سائیکل پر سوار ہو گیا۔ واپس آتے ہوئے کمال کافی خوش تھا۔ اس کے دل میں آئی کہ پیچھے مڑ کر ثریا کو دیکھے مگر حجاب آڑے آ گیا۔

....

اگلے دن کمال جالی سے ملا اور اس کے باپ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ ملاقات اگلے اتوار کو طے ہوئی۔ پروگرام کے مطابق جالی اس کو گھر لے گئی۔ کمرے کے اندر ایک درمیانی عمر کا خوش شکل آدمی رائفل صاف کر رہا تھا۔ یہ دونوں اندر داخل ہوئے تو اس شخص نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ جالی نے تعارف کرایا، ''ڈیڈی! یہ ہمارے اسکول کا ہونہار طالب علم کمال ہے، آپ سے ملنا چاہتا تھا''۔ کمال کو اندازہ ہوا کہ رومانی داستان کا ہیرو بڑے بڑے میاں شرافت حسین چوہدری یہی ہے۔ اس نے ادب سے سلام کیا، بڑے میاں نے اسے دعا دی۔ جالی نے بتایا کہ کمال ہمارے خاندان کے زوال کے سلسلہ میں کچھ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ بڑے میاں نے نرمی سے جواب دیا، ''تمہیں علم ہے کہ مجھے بہت سے معاملات کو صحیح پتہ نہیں۔ لٹو آج گھر میں ہی ہے، اسے اس کے پاس لے جاؤ''۔

وہ دونوں باہر نکلے تو جالی نے بڑے فخر سے کمال کو بتایا کہ لٹو چچا ہمارے خاندان میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے پہلے فرد تھے۔ انہوں نے کے این کالج سے بی اے آنرز اور کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا، اب کلکتہ ہی میں سکاٹش چرچ کالج میں تاریخ پڑھا رہے ہیں۔ ان کی رہائش بھی وہیں ہے، یہاں کبھی کبھار ہی آتے ہیں۔ وہ یہاں کل رات آئے تھے۔

''نام کیا ہے ان کا؟''

''لطافت حسین چوہدری، مگر گھر والے سارے انہیں چھوٹے میاں کہتے ہیں۔ ابو اور دادا ابو انہیں لٹو کہہ کے بلاتے ہیں''۔

وہ اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں چچا لٹو ایک رسالہ پڑھ رہے تھے۔ جالی نے کمال کی آمد کا مقصد بتایا اور یہ بھی کہ ابو کے کہنے پر وہ یہاں آئے ہیں۔ انہوں نے رسالہ رکھتے ہوئے کمال سے پوچھا کہ وہ ایسی باتیں کیوں جاننا چاہتا ہے؟ اس نے شاہد خان سے کی گئی باتیں دہرائیں۔ چھوٹے میاں نے تحمل سے سب کچھ سن کر جواب دیا:

''نوابی دورِ حکومت کے آخر آخر میں تجارت اور زمینداری میں ہندوؤں کی اجارہ داری قائم ہو چکی تھی، پھر بھی ہمارے بزرگوں کی طرح چند مسلمان زمیندار موجود تھے۔ بنگال، بہار اور اوڑیسہ پر نواب کی حکومت تھی لہٰذا قدرتی طور پر مالیات، انتظامیہ اور فوج میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ مسلمان اشرافیہ، جس میں ہمارے بزرگ بھی شامل تھے، اونچے عہدوں پر تعینات تھے۔ تاہم کمپنی کی حکومت میں انہیں زمینداریوں اور اچھے عہدوں سے فارغ کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں انگریزی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے وہ سرکاری ملازمتوں کے بھی اہل نہ رہے۔ رفتہ رفتہ اشرافیہ خاندان ختم ہو گے۔ ادھر وہابی اور فرائضی جیسی جہادی تحریکیں شروع ہو گئیں''۔

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا۔ شاہد صاحب نے کہا تھا کہ آپ کے خاندانی حالات سے آگاہی ان سوالات کو سمجھنے میں مدد دے گی''۔

چھوٹے میاں بڑبڑائے، ''ہاں، ٹھیک ہے۔ اچھا بیٹھ جاؤ''۔

کمال قریبی کرسی پر بیٹھ گیا، جالی نے بھی ساتھ والی کرسی لے لی۔

چھوٹے میاں نے جالی کی طرف دیکھتے ہوئے سرزنش کی، ''تم کیوں بیٹھ گئی ہو؟ سلام صاحب پڑھانے کے لیے آئے ہوئے ہیں، وہ برا مانیں گے''۔

جالی نے بے پروائی سے جواب دیا، ''وہ برا منائیں گے تو مناتے رہیں۔ میں پہلے اپنے خاندان کی تاریخ کے بارے سنوں گی، پھر پڑھوں گی''۔

چھوٹے میاں نے کمرے کے کونے میں رکھا ہوا ایک صندوق کھولا، اس میں سے چند تصویریں اور کچھ کاغذات لے کر واپس آ بیٹھے، ''ریکارڈ صحیح طریقے سے نہیں رکھا گیا، مجھے بھی چیدہ چیدہ باتوں کا علم ہے''۔

''آپ کو جو کچھ بھی معلوم ہے چلیں وہ ہی بتا دیں''۔

''بہتر''، چھوٹے میاں نے کہنا شروع کیا،'' ہمارے بزرگ ایک قدیم زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں''۔

''کتنا قدیم خاندان ہے؟''، جالی نے پوچھا۔

''میرے بچے! یہ تو مجھے علم نہیں کہ کتنا پرانا خاندان ہے لیکن نوابوں کے زمانے میں بھی وہ بڑے زمیندار تھے۔ ہمارے ایک بزرگ میر بہار خان پلاسی کی لڑائی میں میر مدن کی قیادت میں لڑے اور شہادت پائی''۔

''ہمیں چوہدری کس لیے کہا جاتا ہے؟''، جالی نے سوال کیا۔

''خان اور چوہدری زمینداروں کے خطاب ہیں۔ ہمارے پرکھوں کے زمانے میں دو قسم کی زمینیں تھیں۔ نصف زمین اس شرط بھی لی جاتی تھی کہ مالیانہ کا ایک حصہ نواب کی حکومت کو دیا جائے گا۔ باقی نصف حصہ جاگیر کی صورت میں تھا جس کا مقصد نواب کے لیے جنگی خدمات بجالانا تھا۔ اس زمین سے حاصل کردہ مالیانہ نواب کی حکومت کو دینے کی بجائے لڑائی کے زمانے میں اس کے لیے جنگ کرنا ہوتی تھی۔ جن لوگوں نے فوج میں شمولیت اختیار کی انہیں خان کہا گیا۔ اصل میں عہدِ سلاطین میں سو سپاہیوں کے انچارج کو خان کہا جاتا تھا۔ بعدازاں سپاہیوں کی تعداد میں کمی بیشی ہوتی رہی لیکن خان کا لقب مستعمل رہا''۔

''پھر ہم چوہدری کیسے کہلانے لگے؟''، جالی نے استفسار کیا۔

''ہمارے کچھ بزرگ جنہوں نے فوج میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی اور بدستور زمینداری کرتے رہے، وہ چوہدری کہلانے لگے۔ ہم انہی کی اولاد میں سے ہیں''۔

جالی کے سوال کرنے سے پہلے ہی کمال نے پوچھ لیا،'' آپ نے میر بہار خان کا ذکر کیا ہے۔ ان کی شہادت کے بعد کیا ہوا؟''

چھوٹے میاں نے بتایا،'' ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑا بیٹا نادر حسین بھوبھن علاقے کا قاضی تھا۔ چھوٹا بیٹا منیر حسین باپ کی طرح فوج میں تھا۔ بیٹی نہار ابانو گوپال باغ کے قانون گو بدرالدین بیگ کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی''۔

''جب سارے لوگ اتنے خوشحال تھے پھر زوال کیسے آیا؟''

''جنگِ پلاسی کے نتیجہ میں مسلمان اشرافیہ کی حقیقی قوت برطانوی عیسائیوں کو منتقل ہوگئی''۔

''لیکن ہندو اشرافیہ کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا؟''

''نہیں، نہیں۔ ہندو اشرافیہ کے لیے صرف آقاؤں میں تبدیلی ہوئی تھی مگر مسلمانوں تو آقا سے رعایا بن گئے تھے''۔

''نوابوں کے معاملہ میں تو یہ صحیح ہے مگر عام مسلمانوں کے لیے بھی محض حکمرانوں کی تبدیلی تھی''۔

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ نوابوں کے دور میں ریاست کی حاکمیت مسلمانوں کے پاس تھی۔ اسلامی عدالتی نظام رائج تھا، فیصلوں کے لیے قاضی مقرر تھے، نتیجتاً عدالتوں میں اعلیٰ عہدے مسلمانوں کے پاس تھے۔ 1772 میں تمام انتظامی امور ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس چلے گئے۔ اس نے عدالتی نظام میں اصلاحات نافذ کیں اور یوں تمام اعلیٰ عہدے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلتے گئے جن پر برطانوی عیسائیوں کی تعیناتی ہونے لگی۔ مقامی لوگ زیادہ سے زیادہ مترجم کی ملازمت کے اہل تھے تاکہ وہ انگریزوں کی معاونت کرسکیں۔ اسی اکھاڑ پچھاڑ میں ہمارے بزرگ نادر حسین بھی آ گئے اور ان سے بھوبن پور کا عہدۂ قضاۃ چھین لیا گیا''۔

''زمینداری کیسے ختم ہوئی؟''

''1765 میں کمپنی نے مغل شہنشاہ سے دیوانی اختیارات حاصل کر لیے اور زیادہ سے زیادہ مالگزاری اکٹھا کرنا ہدف

بنالیا۔اس کے لیے جابرانہ انداز اختیار کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ بنگالی کیلنڈر کے مطابق 1176 یعنی 71-1770 عیسوی کے قحط میں تقریباً ایک تہائی آبادی فاقہ کشی سے مرگئی۔ کمپنی نے زمین کی آبادکاری کے لیے پانچ سالہ نیلامی کا نظام رائج کیا جس کی رو سے سب سے زیادہ بولی دینے والا کامیاب ٹھہرتا۔ بعد میں اسے یک سالہ، پھر دس سالہ اور آخر کار 1779 میں Permanent Settlement کے تحت کر دیا گیا جس کی رو سے سب سے زیادہ قیمت لگانے والا زمین کا مالک قرار پاتا۔اس وقت زیادہ تر اعلیٰ ذاتوں کے ہندوؤں پر مشتمل ایک نیا کاروباری طبقہ بھی پیدا ہو چکا تھا جس نے کمپنی کے برطانوی عیسائیوں کے ایجنٹوں کی حیثیت سے اچھی خاصی دولت اکٹھی کر لی تھی۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر زمینداری خریدی اور یوں نئے زمیندار بن گئے۔ پرانے زمینداروں پر نیلام میں حصہ لینے کی پابندی نہیں تھی۔ چند ایک کو کامیابی بھی ملی جن میں ہمارا خاندان بھی شامل تھا مگر Sunset Law کے تحت سب کچھ چھن گیا۔اس قانون کی رو سے مقررہ مدت کے آخری دن سورج غروب ہونے تک مالیہ جمع کرانے کی پابندی تھی بصورتِ دیگر زمین کسی اور کو بذریعہ نیلام دے دی جاتی۔غروب آفتاب کی مناسبت سے اسے ''قانونِ غروبِ آفتاب'' (Sunset Law) کہا جاتا تھا۔ہم جیسے بہت سے پرانے زمیندار اس قانون کی زد میں آ گئے''۔

''کیسے؟''

''نئے زمینداروں کا سوائے مالیہ اکٹھا کرنے کے عام لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ یہ مالیہ وہ خود وصول نہیں کرتے تھے۔ مزروعہ مالک (absentee landlord) ہونے کے سبب خود تو وہ زیادہ تر کلکتہ میں رہتے اور ان کے نام پر کوئی دلال وغیرہ مالیہ جمع کرنے کے لیے مزارعین پر بہت ظلم کرتے۔اس کے برعکس پرانے زمیندار اپنی زمینوں پر ہی رہتے اور لوگوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم رکھتے، مالیہ کی وصولی کے لیے وہ جبر اور ظلم کرنے سے حتیٰ الامکان اجتناب کرتے، نتیجتاً حکومت کی مقررہ کردہ آخری تاریخ تک وہ خزانے میں مطلوبہ مالیہ جمع نہ کرا سکتے جس پر ان کی زمینداری کی نیلامی ہو جاتی۔ نادر حسین کی زمینداری بھی ایسے ہی ختم ہوئی تھی''۔

''آپ نے کہا ہے کہ نیلامی میں زمینداری خریدنے والے سارے ہندو تھے''۔

''سارے نہیں،زیادہ تر ہندو تھے۔ چند ایک مسلمان بھی تھے،جیسا کہ نواب آف ڈھاکہ،مسلم لیگ کے بانی نواب سلیم اللہ کے بزرگ کشمیر سے آئے تھے۔ انہوں نے چمڑے کے کاروبار میں بہت دولت کمائی، زمینداری خریدی اور یوں زمیندار بن گئے''۔

''وہ زمیندار تھے،پھر نواب کیسے بن گئے؟''

''بدیشی حکمرانوں کی خوشامد اور حاشیہ برداری کر کے''۔

کمال یہ بات سمجھ نہ سکا۔ چھوٹے میاں نے سمجھایا کہ،''وہ انگریزوں کے انتہائی تابعدار خوشامدی تھے۔ پہلی جنگِ آزادی میں انہوں نے ہم وطنوں کے خلاف انگریزوں کی مدد کی جس پر خوش ہو کر انہوں نے اس خاندان کے عبدالغنی کو نواب کا خطاب دیا۔اس دن سے یہ نواب کہلانا شروع ہوئے۔صرف نواب آف ڈھاکہ ہی نہیں، بہت سے دیگر راجے، مہاراجے اور نواب بھی ایسے ہی خطاب یافتہ تھے۔ قاسم بازار کے مہاراجہ اور کندی کے راجہ سے لے کر نواب آف فتح آباد تک سب نے خوشامد کر کے خطاب حاصل کیے تھے''۔

''آپ نے کہا ہے کہ نواب آف ڈھاکہ کے بزرگ کشمیر سے آئے تھے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بنگالی نہیں تھے''؟

''ہاں! وہ بنگالی نہیں تھے۔صرف وہی نہیں بلکہ کئی اور زمیندار بھی غیر بنگالی تھے۔ مثلاً بردوان کے مہاراجے پنجابی اور فتح آباد کے نواب ایرانی تھے''۔

چونکہ فتح آباد کمال کے گاؤں سے قریب تھا اس لیے مارے تجسس کے اس نے پوچھا، ''وہ لوگ یہاں کیسے آئے؟''

''وہ قالینوں کے کاروبار سے وابستہ تھے۔ تجارت کرتے کرتے یہاں آباد ہو گئے۔ نادر حسین کی زمینداری کے لیے سب سے زیادہ بولی ان کی تھی، یوں وہ زمیندار بن گئے اور ہم عام لوگوں کی صف میں آ گرے''۔

''آپ نے کہا تھا کہ کچھ مقامی لوگ عدالتی اہلکار کی حیثیت سے ملازم ہو گئے تھے، نادر حسین نے کیوں ملازمت نہیں کی؟''

''نادر حسین شہر کے اعلیٰ ترین عدالتی عہدے پر تعینات تھا، نچلے درجے کی ملازمت پر آنا اس کے لیے بہت مشکل تھا، لہٰذا اس نے ملازمت نہیں کی ہاں البتہ اس کا بیٹا قادر حسین ملازم ہو گیا۔ پھر اس کے بیٹے مدار حسین کو بھی ملازمت مل گئی، لیکن 1837 میں نوکری سے الگ ہونے کے بعد وہ یا اس کا بیٹا پھر ملازمت میں نہیں آئے''۔

''کیوں؟''

''1837 میں فارسی کی بجائے انگریزی سرکاری زبان قرار پائی۔ ہندو اشرافیہ نے انگریزی پڑھ لکھ کر سرکاری ملازمتوں پر اجارہ داری قائم کر لی جبکہ مسلم اشرافیہ نے انگریزی تعلیم کے حصول پر بالکل توجہ نہ دی''۔

''انہوں نے انگریزی کیوں نہ سیکھی؟''

''انگریزی پڑھنا تو ایک طرف انہوں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ انہیں یہ زبان سیکھنی چاہیے''۔

''وہ کیوں اس سوچ سے بیگانہ رہے؟''

''کیونکہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حقیقی اقتدار تو چھین لیا تھا مگر دکھاوے کے لیے نواب کو مسند پر بٹھائے رکھا۔ 1772 میں انہوں نے نواب کو انتظامی امور سے بھی سبکدوش کر دیا مگر اس کے مصارف کی ادائیگی کرتے رہے''۔

''یہ ادائیگی کب تک ہوتی رہی؟''

''آزادی تک۔ نواب کاظم علی مرزا سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کا رکن تھا۔ آزادی کے بعد بھی وہ مختلف سیاسی جماعتوں سے وابستگی کے باعث پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوتا رہا۔ اس کا کزن سکندر مرزا پاکستان چلا گیا جہاں وہ بعد ازاں وزیرِ اعظم بنا''۔ (سکندر مرزا پاکستان کا وزیرِ اعظم نہیں بلکہ صدر بنا تھا۔ مترجم)

''آپ کے کہنے کا مطلب کیا ہے؟''

''مسلمانوں کو اس حقیقت کا قطعاً احساس نہ ہوا کہ ان کی نوابی ختم ہو چکی ہے۔ 1757 کی جنگِ پلاسی نے مسلمانوں کا حقیقی اقتدار ختم کر دیا۔ 1765 میں انگریزوں نے دیوانی حاصل کر لی۔ 1772 میں نواب سے انتظامی اختیارات لے لیے اور یوں سیاہ و سفید کے مالک بن گئے، لیکن اپنے وظیفہ خوار نواب کو ہی مسند نشین بنائے رکھا۔ 1837 تک فارسی زبان کو کاروبارِ ریاست کے لیے جاری رکھا جس سے مسلمان اس خوش فہمی میں رہے کہ ان کا اقتدار تا حال قائم ہے۔ معمولی معمولی ملازمتوں کے لیے وہ فارسی ہی پڑھتے رہے، انگریزی کی جانب دھیان تک نہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 1837 میں جب فارسی کی بجائے انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ ملا تو بیچارے مسلمان کوئی ملازمت حاصل نہ کر سکے''۔

جالی نے چھوٹے میاں کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا، ''آپ کے والد صاحب کا نام تو شہادت حسین ہے، دادا کا نام کیا تھا؟''

''صداقت حسین۔ انہوں نے انگریزی نہیں پڑھی تھی اس لیے انہیں کوئی ملازمت بھی نہیں ملی''۔

''انہوں نے انگریزی کیوں نہیں پڑھی؟''، جالی نے سوال کیا۔

''میں نے بتایا ہے کہ انہوں نے انگریزی پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی، پھر یہ بھی تھا کہ اس دور میں یہاں کوئی

انگریزی اسکول نہیں تھا۔ براہی ہائی اسکول جہاں تم پڑھ رہے ہو، اس کی بنیاد 1900 میں رکھی گئی تھی، اس وقت اس کا نام براہی انگلش اسکول تھا۔ تمہارے باپ کا شمار ان طلباء میں ہوتا ہے جو تقریباً ابتدا ہی میں داخل ہوئے تھے، میں ان کے بعد گیا تھا"۔

"آپ نے میر بہار کی ایک بیٹی کا بھی ذکر کیا تھا، اس کا کیا بنا؟"

"میں نے بتایا نا کہ اس کی شادی گوپال باغ کے قانون گو بدرالدین بیگ کے ساتھ ہوئی تھی چند سالوں بعد وہ کھل شاہ دیوان کا پیشکار بن گیا"۔

"کھل شاہ دیوان کا مطلب کیا تھا؟"

"نواب کا چیف ریوینو افسر دیوان کہلاتا تھا اور تن دیوان فوج اور دیگر عہدے داروں کا انچارج تھا۔ مالیات کے انچارج کھل شاہ دیوان کی اعانت پیشکار کرتا تھا۔ کچھ عرصہ تو یہ نظام چلتا رہا لیکن 1772 اور اس کے بعد ریوینو اکٹھا کرنے کی غرض سے ہر ضلع میں انگریز کلکٹر تعینات ہوگئے۔ بدرالدین اور دیگر ریوینو افسر فارغ کر دیے گئے"۔

"بدرالدین تجربہ کار تھا، کسی بھی کلکٹر کے ساتھ اس کی تعیناتی ہو سکتی تھی"۔

"جس شخص نے اچھے عہدے پر کام کیا ہو اس کے لیے ادنیٰ کام کرنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی تھا کہ کمپنی کے افسران مسلمان اشرافیہ کے مخالف تھے، اس لیے ان لوگوں کے لیے ملازمت کا حصول آسان نہیں تھا"۔

"مسلم اشرافیہ کے ساتھ ان کے مخالفانہ رویّے کا سبب کیا تھا؟"

"انگریزوں نے مسلم اشرافیہ سے اقتدار چھینا تھا لہٰذا ان کے ذہن میں ہر وقت یہ خدشہ رہتا تھا کہ مسلمان اشرافیہ اپنے اقتدار کی بازیافت کر سکتے ہیں۔ اس لیے وہ مسلمانوں سے ہر وقت مشکوک رہنے لگے"۔

"اگر یہ بات تھی تو میر بہار کا دوسرا بیٹا منیر حسین فوج کی ملازمت کیسے کرتا رہا؟"

"وہ بھی اپنی ملازمت جاری نہ رکھ سکا تھا"۔

"کیوں؟"

"نوابی دور میں فوج میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ فوج کا انچارج یعنی بخشی بالعموم مسلمان ہی ہوتا تھا۔ نچلے درجے کے کمان دار اور سپاہی ہندو ہو سکتے تھے مگر ان کی تعداد کم تھی۔ پلاسی کی جنگ کے بعد صورتِ حال بدل گئی"۔

"کیا ہوا تھا؟"

"تمام تر قوت و اختیار فاتح انگریزوں کو منتقل ہوگیا۔ نواب کی حیثیت ان کے کٹھ پتلی کی سی تھی۔ اس کے اخراجات پر کمپنی کی فوج دن بدن مضبوط ہوتی گئی۔ پے در پے شکستوں نے میر قاسم کی فوج کو تباہ کر دیا۔ نواب میر ظفر نے انگریزوں کے کہنے پر اسی ہزار سپاہیوں اور افسروں کو فوج سے فارغ کر دیا۔ منیر حسین بھی ان میں شامل تھا۔ ان کی جاگیر کا بڑا حصہ ضبط کر لیا گیا"۔

"ساری جاگیر کیوں ضبط نہیں کی گئی تھی؟"

"کیونکہ منیر حسین کا بیٹا خیرات حسین ابھی تک سلطان پور میں فوجدار تھا جس کی وجہ سے جاگیر میں اس کا حصہ ضبط ہونے سے عارضی طور پر بچ گیا۔ 1781 میں فوجدار کا عہدہ ختم ہونے پر خیرات حسین کی ملازمت اور اس کی جاگیر کا خاتمہ ہوگیا۔ ہمارے خاندان میں سرکاری نوکری کرنے والا خیرات حسین آخری آدمی تھا"۔

"آپ کے خاندان کی گزر بسر کیسے ہوتی تھی؟"

"ہمارے خاندان کے پاس کچھ لیکھراج زمین تھی جس پر مالیہ معاف تھا۔ اس سے حاصل ہونے والی آمدن پر ہماری گزر بسر ہوتی تھی"۔

''کیا یہ زمین اب بھی آپ کی ملکیت میں ہے؟''

''نہیں۔اس کو 1828 میں ضبط کرلیا گیا تھا۔ہیسٹنگز کو علم ہوا کہ لیکھ راج زمینوں کی وجہ سے ایک چوتھائی مالگزاری کم وصول ہوتی ہے۔اس کے دل میں کچھ شکوک پیدا ہوئے۔ 1793 میں لارڈ کارنوالس نے حکمنامہ جاری کیا کہ تمام لیکھ راج کی دستاویز ایک سال کے اندر اندر کلکٹر کو پیش کی جائیں، حکم عدولی یا مشکوک دستاویز کی بنا پر زمین ضبط کرلی جائے گی اور ضبط شدہ زمین سے حاصل ہونے والے پہلے سال کے مالیہ کا ایک چوتھائی کلکٹر کے پاس رہنے دیا جائے گا۔نتیجتاً کلکٹروں کو خواہش ہوئی کہ زیادہ سے زیادہ زمینوں کو ضبط کیا جائے۔ 1828 میں لیکھ راج زمینوں پر ملکیت قائم رکھنا مزید مشکل بنا دیا گیا۔زمین کی ضبطگی کے خلاف اپیل عام عدالت کی بجائے صرف سپیشل کمشنر کے پاس دائر ہوسکتی تھی۔مخبر کو بھی معاوضہ ملتا تھا۔اگر لیکھ راج مالک مقررہ تاریخ پر پیش نہ ہوتا تو اس کی زمین ضبط کرلی جاتی۔کلکٹر ہر جائز ناجائز طریقے سے زمینیں ضبط کرنا چاہتے تھے۔ خیرات حسین کے بیٹے لال حسین کی لیکھ راج اس بنیاد پر ضبط کی گئی کہ وہ مقررہ تاریخ کو پیش نہیں ہوا تھا۔وہ حاضر کیسے ہوتا کیونکہ اسے اطلاع ہی نہیں ملی تھی۔بہرصورت لیکھ راج بھی ہاتھوں سے گئی، گویا ہمارے خاندان کی بربادی مکمل ہوگئی''۔

یہ کہتے کہتے چھوٹے میاں گلوگیر ہوگئے۔کمال بھی بے چینی محسوس کرنے لگا پھر بھی اس نے سوال کر ڈالا''اب لال حسین کی اولاد کہاں ہے؟''

''ان میں سے کوئی بھی حیات نہیں۔ 1871 میں لال حسین کے بیٹے جلال حسین کو جہادیوں کا ساتھ دینے پر انڈیمان کی سزا سنائی گئی جہاں پر اسرار حالات میں اس کا انتقال ہوگیا''۔

''چچا جان! جہاد کیا ہے؟''، جالی نے پوچھا

''ظلم اور ناانصافی کے خلاف جنگ کو جہاد کہا جاتا ہے۔کمپنی کے دور میں مسلمان اشرافیہ بالکل ختم ہوکر رہ گئی تھی۔ انہیں یہ خیال آیا کہ اللہ کی راہ سے ہٹ جانے کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہوئی ہے اس لیے انہوں نے احیائے دین کی تحریکیں، مثلاً وہابی اور فرائضی تحریکیں شروع کیں تاکہ غیر اسلامی عناصر ختم کرکے خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جائے''۔

کمال نے فرائضی لفظ سنا ہوا تھا کیونکہ اس کے پڑوسی گاؤں میں چند افراد فرائضی کہلاتے تھے جن کی مناسبت سے گاؤں کے اس حصہ کو فرائضی پاڑا کہا جاتا تھا۔اس کی ماں کے گاؤں کا نام بھی فرائضی پاڑا تھا۔کمال کو فرائضیوں اور باقی مسلمانوں میں اگر کوئی فرق نظر آیا تو دورانِ نماز چند فروعی باتوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔نماز میں صف بندی کرتے ہوئے وہ ایک دوسرے کے ساتھ بالکل جڑ کر کھڑے ہوتے، اپنے ہاتھ ناف کے اوپر باندھنے کی بجائے سینے پر باندھتے اور سورۃ فاتحہ کے اختتام پر بآوازِ بلند''آمین'' کہتے۔اگر کسی اجتماع میں فرائضی اور دوسرے مسلکی مسلمان باجماعت نماز پڑھتے تو ان فروعات کی وجہ سے کچھ الجھن پیدا ہوجاتی۔کمال نے ایک بار ایثار الدین فقیر سے بھی اس پر بات کی تھی لیکن اس نے ان باتوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور آرام سے کہا تھا،''محمد ﷺ سینے پر ہاتھ باندھتے تھے مگر کبھی کبھار تھکن کے سبب ناف پر بھی باندھ لیتے۔سورۃ فاتحہ کے بعد نمازی کبھی آہستگی اور کبھی قدرے اونچی آواز سے''آمین'' کہتے۔کیا یہ ایسی باتیں ہیں جن پہ ایک دوسرے سے لڑائی کی جائے؟''

کمال نے محسوس کیا کہ زندگی کے مسائل پر فقیر کی گہری نگاہ ہے۔کوئی اور دوسرا شخص اتنے سادہ اور قابلِ قبول انداز میں یہ فرق نہیں سمجھا سکتا تھا۔وہ خود بھی جان گیا لیکن لفظ''فرائضی'' کی معنویت سے بے خبر تھا لہٰذا اس نے فقیر سے پوچھا تو اس نے وضاحت کی:''فرض کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے فرمودات پر عمل کرنا۔ایسا کرنے والوں کو فرائضی کہا جاتا ہے۔فرید پور کے حاجی شریعت اللہ نے احکامِ الٰہی پر عمل کو لازمی قرار دیا اس لیے انہیں فرائضی کہا گیا''۔

''اور وہابی سے کیا مطلب ہے؟''

''اٹھارویں صدی میں عرب کے عبدالوہاب نے مسلمانوں میں رائج تمام غیر اسلامی رسم ورواج ختم کرکے رسول اللہ ﷺ کی راہ پر چلنے کی تحریک شروع کی۔ مستشرقین نے انہیں وہابی کہنا شروع کردیا۔ رائے بریلی کے سید احمد اور بنگال کے تیتو میر کی تحریکوں کو وہابی کہا جانے لگا''۔

''وہابی کیا کرتے تھے؟''

''ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اس لیے دشمنوں، یعنی برطانوی حکومت کے خلاف جنگ کرنا اور اس سرزمین کو دارالاسلام بنانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ سید احمد بریلوی اور ان کے پیروکار کہتے تھے کہ چونکہ سکھ مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے سے روک رہے ہیں اس لیے ان کے خلاف جہاد ہونا چاہیے۔ انہوں نے بنگال کے طول وعرض کے دورے کرکے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی۔ لال حسین کا بیٹا جلال حسین اس میں شامل ہوگیا''۔

''وہ تو سکھوں کے خلاف جہاد میں شامل ہوا تھا پھر اسے انڈیمان (کالا پانی) کیوں بھیج دیا گیا؟''

''1847 میں انگریزوں نے سارے علاقے کا انضمام کرلیا اور یہ اعلان کیا کہ جہاد فی الحقیقت ان کے خلاف ہے۔ حکومت نے جہادیوں کے خلاف سازش کرنے کے متعدد مقدمات بنائے۔ جلال کو 1869 میں گرفتار کیا گیا۔ 1871 میں اسے سزا سنائی اور یوں اس کی نسل ختم ہوگئی''۔

چھوٹے میاں کی آواز میں دلگدازی سے کمال متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ واقعی ایک تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ واقعات وحالات کو بخوبی بیان کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اس نے خاندان کے زوال کی خوبصورتی سے تصویر کشی کی تھی۔ کمال نے اس سے رخصتی کی اجازت طلب کی۔ جالی نے شکایت آمیز لہجے میں اپنے چچا سے کہا،

''چچا جان! آپ نے مجھے تو کبھی بھی یہ باتیں نہیں بتائی تھیں۔ اگر کمال یہاں نہ آتا تو ہم بالکل نہ جان پاتے''۔

''میری بچی! کیا تم نے کبھی جاننے کی کوشش کی تھی؟''

''بات کو ادھر ادھر نہ کریں۔ تیار رہیے گا اگلے ہفتہ میں بہت سے سوال پوچھوں گی''۔

''بسر وچشم۔ آج صبح کی پڑھائی کا کیا ہوا؟ تمہارے استاد صاحب انتظار کر رہے ہوں گے''۔

''چچا جان! مہربانی سے انہیں بتادیں کہ میں شام کو پڑھائی نہیں کروں گی''۔

''اور اپنے باپ سے ڈانٹ کھاؤ گی۔ نہیں، میں یہ نہیں کرسکتا۔ بہتر ہے کہ خود ہی بات کرو، ہاں البتہ میں تائید کروں گا''۔

''مجھے آپ کی تائید کی ضرورت نہیں۔ میں ابا جان سے خود ہی بات کرلوں گی۔ اس وقت میں کمال کو الوداع کہہ آؤں''۔

چھوٹے میاں نے ہاں میں سر ہلایا۔ جالی کمال کو باہر تک چھوڑنے آئی۔ وہ اسے خدا حافظ کہہ کر بوجھل دل سے چلا دیا۔

....

اسکول میں تھوڑی دیر کا وقفہ ہوا لیکن کمال کلاس میں بیٹھا کیمیا کی کتاب میں سے ایٹم کی ساخت سمجھنے کی کوشش کر تا رہا۔ کسی نے اسے پشت سے کہا،''وہ تمہیں بلا رہی ہے''۔

''کون؟''

''اس کے دوست سمیر نے سرگوشی کی،''سائنس کلاس کی نویں کی طالبہ''۔ کمال نے سر اٹھا کر دیکھا تو ثریا کو دروازے کے قریب کھڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے پاس جا کر پوچھا،''خیریت؟'' وہ چند قدم آگے چل دی گویا وہ اس سے کوئی

خاص بات کرنا چاہتی ہے۔ چلتے چلتے کہنے لگی، ''دادا ابو تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے''۔

''کیا مطلب؟''

''تم ان سے دوبارہ بھی ملنا چاہتے تھے نا''۔

''اوہ! ہاں''

''تو پھر آئے کیوں نہیں؟ کیا تمہیں ہمارے ہاں آنا اچھا نہیں لگتا؟''

''نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہارے دادا ابو سے باتیں کر کے مجھے مزہ آیا تھا، رہی تم سے گفتگو، وہ تو میں اسکول میں بھی کرسکتا ہوں''۔

''کتنی بار تم نے مجھ سے باتیں کی ہیں؟''

''کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ تم نے کوئی بات کرنا چاہی ہو اور میں نے جواب نہیں دیا؟''

''کیا یہ لازمی ہے کہ میں ہی ابتدا کروں؟''

''نہیں، نہیں، میں خود بھی پہل کرسکتا ہوں''۔

''تو پھر، کرتے کیوں نہیں؟''

''آئندہ کیا کروں گا۔ اب بتاؤ کیا بات ہے؟''

''تم ہمارے گھر کیوں نہیں آئے؟''

''تمہارے دادا ابو نے مجھے چند باتوں کی وضاحت کے لیے بڑے میاں سے ملنے کو کہا تھا۔ چونکہ میں مل نہیں سکا تھا اس لیے تمہارے گھر بھی نہیں آیا''۔

''لیکن جالی نے تو بتایا تھا کہ تم پچھلی اتوار ان کے گھر گئے تھے''۔

''بالکل، میں گیا تھا''۔

''تمہارے سوالات کا تسلی بخش جواب ملا؟''

''کسی حد تک''۔

''بڑے میاں نے کیا بتایا؟''

''انہوں نے تو کچھ نہیں بتایا، مجھے اپنے چھوٹے بھائی کے پاس بھیج دیا تھا''۔

''انہوں نے کیا بتایا؟''

''انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ جنگِ پلاسی کے بعد انگریزوں کے بنگال پر غاصبانہ قبضے کے نتیجہ میں مسلم اشرافیہ پر زوال کیسے آیا''۔

''اس کے بعد تو تمہیں ہمارے گھر آنا چاہیے تھا''۔

''میں ایک دو روز میں آؤں گا''۔

''ایک دو روز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دادا ابو نے کہا تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ ہی لے کر آؤں''۔

''کیسے ممکن ہے؟ میرے گھر والوں کو خبر ہی نہیں''۔

''تمہارے گاؤں کے چند لڑکے اسی اسکول میں پڑھتے ہیں کسی کے ہاتھ گھر اطلاع کر دو''۔

''میں سائیکل نہیں لایا۔ تمہارا گاؤں یہاں سے فاصلے پر ہے، پیدل جاتے جاتے دیر ہو جائے گی''۔

''میری سائیکل ہے نا، میں نے پیچھے ایک گدی لگوالی ہے''۔

''اور واپسی کیسے ہوگی؟''

''میری سائیکل لے آنا''۔

اب نہ جانے کا کوئی بہانہ نہ رہا، ''اچھا میں اپنے گھر اطلاع بھیج دیتا ہوں۔ اگر مجھے جانا ہوا تو تمہیں بتادوں گا''۔

''او کے۔ مجھے بتادینا''، یہ کہتے ہوئے ثریا لڑکیوں کے کمرے میں چلی گئی۔

کمال واپس آکر کلاس میں بیٹھ گیا۔ کچھ لڑکے اشاروں کنایوں میں ایک دوسرے سے بزبانِ خاموشی باتیں کررہے تھے۔ کمال نے ظاہر کیا کہ جیسے وہ کچھ نہیں سمجھا۔ اس پر ہم جماعتوں نے خاموشی توڑنا مناسب جانا۔ شمیم نے کمال کو مخاطب کیا، ''باس! کامیابی کا گر کیا ہے؟ جیسے ہی کوئی لڑکی اسکول میں داخل ہوتی ہے تم پکڑ لیتے ہو''۔

''فضول باتیں مت کرو''، کمال نے ڈانٹا۔

''اس میں فضول بات کون سی ہے؟ یہ لڑکی دوسرے اسکول سے ابھی چندروز پہلے ہی آئی ہے، اور اب وہ کلاس میں آکر تمہیں بلاتی ہے''۔

''بکواس نہیں کرو''۔ کمال نے پھر ڈانٹا مگر بیرون بیمے دروں جیسی کیفیت میں آدھا سچ بولتے ہوئے بتایا، ''میں اس کے دادا کو جانتا ہوں، ان ہی کے ذریعہ میری اس سے شناسائی ہوئی تھی''۔

جواب سن کر شمیم کو حوصلہ ہوا، ''اوہ! ہاں ٹھیک ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں؟------ ہاں یاد آیا،-----'دادا جی کھاتے ہیں، دادی کھاتی ہیں، ہلکے پھلکے بسکٹ'۔ دوستو! ہم بھی کہہ سکتے ہیں، 'دادا جی جانتے ہیں، دادی اماں جانتی ہیں، کوئی گڑ بڑ نہیں'۔ آؤ دوستو! ہم سب مل کر گائیں، 'دادا ابو، دادا ابو جانتے ہیں------''

شمیم کی فی البدیہہ شاعری پر لڑکے باآوازِ بلند شروع ہوگئے، ''دادا ابو جانتے ہیں------''۔

نرائن نے کہا، ''لڑکی کی آنکھیں قاتلانہ ہیں''۔ ناصر نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا، ''میں نے سنا ہے کہ لڑکی پڑھنے میں بھی بہت تیز ہے۔ اگر اس قسم کی لڑکی مجھے بلائے تو ساری جماعت کو کھانا کھلاؤں گا''۔

پیچھے بیٹھے ہوئے پری مل نے گرہ لگائی، ''ناصر! دعوت دے ہی دو، وہ تم سے ضرور بات کرے گی، اور اگر نہ کرے تو ہم اس کی منتیں کریں گے''۔

''سمیر نے اعتراض کیا، ''کیوں اس لڑکی کے بارے میں بیہودہ باتیں کررہے ہو؟''

شمیم نے اسے سختی سے جھڑکتے ہوئے کہا، ''بڑا ترس آرہا ہے اس لڑکی پر، مگر تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کمال پہلے ہی اسے اپنے لیے مخصوص کرچکا ہے''۔

سمیر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ باقی لڑکے کلاس میں داخل ہوگئے، ان کے ساتھ ہی حساب کے استاد مسٹر سنیال بھی داخل ہوئے۔ کمال کو احساس ہوا کہ ثریا کے ساتھ اس کے سائیکل پر جانا مناسب نہیں ہوگا۔ اس کے ہم جماعتوں کو اس پر پھبتیاں کسنے کا موقع مل جائے گا لہٰذا اس نے آج نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ کلاس ختم ہونے کے بعد وہ ثریا کی کلاس میں گیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ تجربہ گاہ کی جانب گیا، ثریا اسے دیکھ کر باہر آگئی۔ کمال نے کہا، ''میں اپنے گھر اطلاع نہیں دے سکا ہوں۔ میں ایک دو روز میں ضرور آؤں گا''۔

ثریا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کمال کلاس کی طرف چل پڑا جہاں کیمیا کے استاد پہنچ چکے تھے۔

آخری پیریڈ بنگالی زبان کا تھا۔ کلاس ختم ہوئی، سارے لڑکے گھروں کو چل دیئے۔ اس نے بھی تیز تیز قدم اٹھائے۔

پنساری کے دکان کے قریب سپنا سے ملاقات ہوگئی۔ دونوں کچی سڑک پر چلتے باتیں کرتے کرتے دوراہے پر پہنچ گئے اور وہاں سے اپنی اپنی راہ پکڑی۔

....

اتوار کی صبح کمال نے ہاتھ منہ دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے اور بل چترا کی جانب چل پڑا۔ آگے جا کر وہ بس میں سوار ہوا اور لکشمی پور دوراہے پر پہنچ کر اتر گیا۔ وہاں سے پیدل چلنے لگا۔ ثریا کے گھر پہنچتے پہنچتے پونے دس ہو گئے۔ گھر کے بیرونی حصہ اور برآمدے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کسی کے باہر آنے کا انتظار کیا جائے یا دستک دے کہ اتنے میں قریباً تیرہ سال کا ایک لڑکا باہر نکلا۔ اس نے کمال سے پوچھا کہ وہ کس سے ملنا چاہتا ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ شاہد خان صاحب سے ملاقات کے لیے آیا ہے۔ لڑکے نے بے نیازی سے جواب دیا، ''وہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے کیونکہ وہ آرام کر رہے ہیں''۔ جواب سن کر کمال نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا، ''پھر ثریا کو بلا لاؤ''۔

''وہ نہیں آسکتی کیونکہ پڑھ رہی ہے''۔ غالباً بہن کو کسی لڑکے کا پیغام دینا اسے ناگوار گزرا تھا۔

کمال خود کو ہیچ سمجھنے لگا اور اسے کچھ نہ سوجھا کہ اب کیا کرے۔ اسی تذبذب میں تھا کہ اسے ثریا کی آواز سنائی دی، ''کس سے باتیں کر رہے ہو؟'' لڑکے نے کمال کو بتایا یہ جوشانہ آپا ہیں۔ بنگالی زبان میں جوشانہ کا مطلب ہے 'چاندنی' اور آپا، بڑی بہن کو کہتے ہیں۔

''ایک لڑکا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کسی سے ملاقات نہیں کریں گی۔ کیا آپ اسے ملنا چاہتی ہیں؟''

یہ سن کر ثریا شرمندہ ہوگئی اور ترت بولی، ''پپن! وہ کوئی برا لڑکا نہیں ہے''۔

''کون ہے یہ؟''

''کمال ہے''۔

''کمال کون؟''

''یہ میرے ہی اسکول میں پڑھتا ہے''۔

''یہ آپ سے کیوں ملنے آیا ہے؟''

''مجھ سے نہیں، دادا ابو سے ملاقات کے لیے آیا ہے''۔

''ان سے ملنے تو بڑے بوڑھے لوگ ہی آتے ہیں''۔

''پپن! جوان لوگ بھی تو بوڑھے ہو جاتے ہیں''۔

پپن کی سمجھ میں نہ آیا کہ ثریا نے کیا کہا ہے۔ اتنے میں ثریا باہر نکل آئی اور کمال سے پوچھا کہ وہ کب آیا ہے۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ ہاں البتہ میں یہاں کچھ دیر اور کھڑا رہتا تو یقیناً واپس چلا جاتا''۔

ثریا خجل ہو کر کہنے لگی، ''اوہ! تم پپن کی بات کر رہے ہو۔ وہ تو ایسا ہی ہے۔ جب تک وہ کسی کو واپس نہ بھیج دے، اسے خوشی نہیں ہوتی''۔

''کیا اس کا نام پپن ہے؟''

''نام تو جاوید خان ہے مگر پیار سے سب اسے پپن کہتے ہیں''۔

''جیسے تمہیں جوشانہ کہتے ہیں''۔

''ہاں یہ میرا گھریلو نام ہے''۔

''کس نے رکھا تھا؟''

''میرے نانا نے''۔

''کیوں؟''

ثریا نے حیا سے سر جھکا لیا اور دھیرے سے بولی،''میں فالگن مہینے کی چودھویں شب کو پیدا ہوئی تھی۔میرے نانا نے چاندنی کی مناسبت سے میرا نام رکھ دیا''۔

''ہاں!واقعی تم ایسی ہی ہو''۔

ثریا نے جلدی سے موضوع بدل کر کمال سے پوچھا،''تمہیں گھر میں کیا کہتے ہیں؟''

کمال اس سوال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔اگر چہ اسے ایک عرفی نام سے بلایا جاتا تھا مگر اس نے بتایا کہ ہمارے گھر میں بس ایک ہی نام ہوتا ہے۔

''اگر صرف ایک ہی نام ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔اب آؤ!دادا ابو کے پاس چلیں''،اور پھر پپن کی طرف دیکھ کر کہا،''دادا ابو کو بتاؤ''۔

''کیا کہنا ہے انہیں؟''

''انہیں کہو کہ کمال آیا ہے''۔

پپن کو غالباً بہن کا حکم دینا پسند نہیں آیا۔اس نے زبان نکال کر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا اور پتلون کی بیلٹ کستا ہوا درونِ خانہ چلا گیا۔ثریا اپنے بھائی کے بچگانہ انداز پر ہنسنے لگی اور کمال کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔وہ صحن کے مغربی کمرے میں داخل ہوئے۔خان صاحب الماری سے کچھ کتابیں نکال کر میز پر رکھ رہے تھے۔ثریا ان کے پاس جا کر بولی''آپ کمال کا پوچھ رہے تھے،وہ آ گیا ہے''۔

''میری بچی!کیا میں اکیلا ہی پوچھ رہا تھا؟''شاہد خان نے اپنی پیاری پوتی کو چھیڑتے ہوئے کہا،''اور کوئی نہیں پوچھ رہا تھا؟''

ثریا نے جھوٹ موٹ کی ناراضی کا اظہار کیا،''دادا ابو!مذاق مت کیجیے''۔

''اچھا نہیں کروں گا۔بتاؤ اور میں کیا کروں؟''

''اب آپ کسی کام کے نہیں رہے۔آپ کو ایک اچھا سامع مل گیا ہے۔بس لیکچر دینا شروع کر دیں۔میں امی سے کہہ کر ناشتہ وغیرہ بھجواتی ہوں''۔

ثریا کمرے سے جانے ہی لگی تھی کہ خان صاحب نے کہا،''جوشانہ سنو!غصے سے کیوں جا رہی ہو؟''وہ رکی اور بولی،''جی فرمائیں''۔

''تم چلی گئیں تو میں لیکچر کیسے شروع کروں گا؟''

''کیوں؟آپ شروع کیوں نہیں کر سکتے؟''

''میری خواہش ہے کہ تم بھی سنو''۔

''مجھے بھاشن وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں،ہاں البتہ کہانی سنانی ہے تو مجھے بلا لیں''۔

''چلو ٹھیک ہے۔میں کہانی سناؤں گا۔جلدی سے واپس آ جاؤ''۔

ثریا جواب دیے بغیر کمرے سے چلی گئی۔ خان صاحب نے چند کتابیں کمال کے آگے سرکائیں اور کہا،

''تم نے کہا تھا کہ تم صحیح صورتِ حال جاننا چاہتے ہو۔ اگر واقعی ایسا ہے تو صرف کلکتہ سے شائع ہونے والی کتابوں سے زیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔ ڈھاکہ سے شائع ہونے والی کتابوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے، بلکہ صرف ڈھاکہ سے طبع شدہ کتابیں بھی خاص سودمند نہیں ہوں گی، دونوں طرف سے شائع ہونے والی کتابیں پڑھو''۔

کمال خان صاحب کی کتابوں کو دیکھنے لگا۔ کچھ کتابیں ڈھاکہ اور کچھ کلکتہ سے شائع ہوئی تھیں۔ ڈھاکہ کی مطبوعات میں یہ کتابیں شامل تھیں: قاضی عبدالودود کی 'ششواتا بانگا'، ابو الہاشم کی In Retrospection، بدر الدین عمر کی 'سمپر ادا یکتا' (فرقہ واریت)، ایم، آر، اختر موکل کی 'کولکتہ کیندرک'، ایم، اے، رحیم کی 'بنگلار مسلماندر اتہاس'، اے، آر، ملک کی The British Policy and the Muslims of Bengal، کے، ایم، رشید الدین کی 'بنگلہ دیش اتہاس' کے علاوہ ابو المنصور احمد اور محمد منیر الزمان کی تصانیف۔ ان کو دیکھتے ہوئے کمال نے شائستگی سے پوچھا، ''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں کہ دونوں طرف کی طبع شدہ کتابیں پڑھنی چاہئیں؟''

''کیونکہ جب ہم فرقہ واریت کے ماحول میں پرورش پاتے ہیں تو اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے کہ ہمارے ذہنوں میں فرقہ واریت کے کچھ نہ کچھ اثرات داخل ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات اس فرقہ بندی کی ذہنیت سے مکمل چھٹکارا پانا ممکن نہیں ہوتا اور یوں ہم فرقہ وارانہ مسائل اور تنازعات کا غیر جانبداری سے تجزیہ نہیں کر سکتے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہم صرف ایک فرقہ کے ماحول میں پرورش پاتے ہیں، اگر زیادہ تر لوگوں کے دلوں میں کسی دوسرے فرقہ کے بارے میں مخالفانہ جذبات موجود ہوں تو ہم ان کے اثرات سے بچ نہیں سکتے۔ کلکتہ سے شائع ہونے والی کتابوں میں تم دیکھو گے کہ نہرو رپورٹ کی ایک تجویز کے مطابق جن صوبوں میں مسلمان اقلیتوں میں ہیں وہاں ان کے لیے نشستیں مخصوص کر دی جائیں، لیکن بنگال اور پنجاب جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، وہاں ان کے لیے نشستیں مخصوص کرنے کا کوئی ذکر نہیں۔ جناح نے ان دونوں صوبوں میں بھی مسلمانوں کی نشستیں مخصوص کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ ان کتابوں میں تمہیں کہیں نہیں ملے گا کہ جناح کے مطالبہ کی بنیاد کیا تھی اور نشستیں مخصوص نہ کرنے کے لیے کن شرائط پر زور دیا گیا تھا''۔

کمال ان واقعات کے اسباب سمجھنے کا متمنی تھا۔ اس نے پڑھ رکھا تھا کہ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے ساتھ ہی ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے موتی لال نہرو کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی تھی تاکہ متفقہ اور قابلِ قبول آئین کی تجاویز تیار کرے۔ کمیٹی نے بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کے لئے نشستیں مخصوص کرنے کی سفارش نہیں کی تھی۔ جناح کے ان صوبوں میں نشستیں مخصوص کرنے کے مطالبہ سے دیگر جماعتوں نے اتفاق نہ کیا۔ نتیجتاً اتفاقِ رائے نہ ہو سکا اور یوں یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ کمال سمجھنے سے قاصر تھا کہ جب بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، جناح کو اس مطالبہ کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کے خیال میں اگر کسی کو تحفظ درکار تھا تو اقلیت میں ہونے کے سبب ہندو تھے، اس کے برعکس جناح کا مسلمانوں کے لیے مخصوص نشستوں کا مطالبہ ناقابلِ فہم تھا۔ کمال کے خیال میں جناح کوئی اچھا شخص نہیں تھا کیونکہ اس کا مطمعِ نگاہ عامتہ الناس کی بہتری نہیں تھی۔ لیکن شاہد خان کی باتیں سن کر وہ یقین کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اس مطالبہ کے پسِ پردہ کوئی وجوہات ضرور تھیں اس لیے اس نے سوال کیا، ''کیا آپ مجھے سمجھائیں گے کہ جناح نے ایسا مطالبہ کیوں کیا؟''

شاہد خان نے جواب دیا، ''اس وقت بالغ رائے دہی کا قانون نہیں تھا۔ ووٹ دینے کی کچھ شرائط تھیں، یعنی جائداد کی کم از کم مالیت، ٹیکس دینے کی اہلیت یا مقررہ تعلیمی معیار کا حامل ہونا۔ اگرچہ ان صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی مگر ان شرائط کو پورا کرنے والے بہت تھوڑے تھے۔ دریں حالات مسلمانوں کا انتخابات میں کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے

جناح نے مطالبہ کیا تھا کہ بالغ رائے دہی کا حق ملنے تک اپنی آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کی نشستیں مخصوص کی جائیں''۔

یہ سننے کے بعد کمال کے دل میں جناح کے خلاف بھڑکنے والے جذبات کم ہونے لگے۔ وہ شخص تو آبادی کے تناسب سے نشستیں مانگ رہا تھا، اس سے زیادہ نہیں، نہ ہی بالغ رائے دہی کے نفاذ کے بعد بھی مخصوص نشستوں کا مطالبہ تھا۔ کمال کو پوچھنا پڑا،

''جب سیاسی رہنما خود ہی مسلمانوں کی دوسرے صوبوں میں مخصوص نشستوں کی تائید کر رہے تھے، وہ بنگال اور پنجاب میں آبادی کے تناسب سے کیوں ان کی مخصوص نشستوں کے خلاف تھے؟''

''وجہ بڑی سیدھی سادی تھی۔ جن علاقوں میں مسلمان اقلیت میں تھے وہاں نشستیں مخصوص ہونے کے باوجود قیادت ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں رہتی۔ لیکن بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت کے سبب حالات مختلف ہوتے، یعنی نشستیں مخصوص ہوجانے کے بعد مسلمان ان دونوں صوبوں میں برتر پوزیشن میں رہتے۔ 1937 کے انتخابات کے بعد یہی صورتِ حال بنی تھی۔ یہ ہندوؤں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا مگر جناح مسلمانوں کی مخصوص نشستوں کا مطالبہ کر رہا تھا''۔

کمال نے اس انداز میں کبھی نہیں سوچا تھا، نہ ہی کسی کتاب کے مطالعہ سے ایسی بات اس کے ذہن میں آئی تھی۔ اب تو ساری بات کھل کر سامنے آگئی۔ بات واضح تھی کہ جناح کا بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کے لیے مخصوص نشستوں کا مطالبہ مسلمانوں کے اقتدار کی خاطر تھا جو ہندو قیادت کو قطعاً منظور نہیں تھا کیونکہ اس طرح وہ ان صوبوں میں اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ دونوں طرف سے کسی اصول، کسی حب الوطنی، کسی وطن دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شاہد صاحب بتا رہے تھے:

''یہی سبب ہے کہ لکھنؤ معاہدہ میں مسلمانوں کو دوسرے صوبوں، مثلاً بہار اور یوپی میں ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دی گئیں، لیکن بنگال میں صورتِ حال بالکل برعکس تھی''۔

''بنگال میں کیا تھا؟''، کمال نے سوال کیا۔

''یوپی میں مسلمان آبادی کا چودہ فیصد تھے جبکہ مخصوص نشستوں کا تناسب تیس فیصد تھا لیکن بنگال میں چون فیصد آبادی کے مقابلہ میں انہیں چالیس فیصد نشستیں ملیں''۔

''وجہ؟''

''اس وقت کے صاحبِ اختیار غیر بنگالی مسلمان اور ہندو دونوں اس فارمولے سے مستفید ہو رہے تھے۔ بنگالی مسلمان سیاسی رہنماؤں پر کچھ دباؤ تھا لیکن موجودہ صورتِ حال میں بنگالی ہندو اور غیر بنگالی مسلمان سراسر فائدے میں تھے''۔

لکھنؤ پیکٹ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ سوال متواتر کمال کے ذہن میں پیدا ہوتا رہا کہ آخر کس وجہ سے دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کو اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دی گئی تھیں مگر بنگال میں کم نشستیں ملیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے پسِ پردہ سیاسی رہنماؤں کی خودغرضی کام کر رہی تھی، لیکن اب ساری بات کھل گئی۔ وہ بڑی توجہ سے شاہد خان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بھی خوش تھے کہ ان کا واحد سامع اس قدر دلچسپی لے رہا ہے، لہٰذا وہ مزید وضاحت کرتے ہوئے بولے:

''1937 کے انتخابات کے بعد کرشک پرجا پارٹی کانگرس سے مل کر مخلوط حکومت بنانے کی خواہاں تھی مگر دونوں جماعتوں کی قیادت صرف ایک نکتے پر متفق نہ ہوسکی کہ حکومت کے کس پروگرام کو ترجیح دی جائے۔ کانگرس کی خواہش تھی کہ سوراج (حکومتِ خود اختیاری) اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کو اولیت دی جائے جبکہ کرشک پرجا زمینداری کے بلا معاوضہ خاتمہ اور مہاجنی کنٹرول ایکٹ کے نفاذ پر زور دے رہی تھی۔ کلکتہ سے شائع ہونے والی کتابوں سے اندازہ نہیں ہوتا کہ کرشک پرجا ان دونوں پروگراموں کو کیوں ترجیح دینا

چاہتی تھی، دوسری طرف ڈھاکہ سے طبع شدہ کتابیں پڑھ کر تم سمجھ نہیں سکتے کہ کانگرس کا اپنے پروگراموں پر ترجیحاً عمل درآمد کا مقصد کیا تھا''۔

کمال کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا، ''کرشک پرجا کی قیادت کا خیال تھا کہ اگر حکومت تحریکِ آزادی میں حصہ لینے والے سیاسی قیدیوں کی رہائی کا قانون پاس کرلیتی ہے تو گورنر اپنا حق استرداد استعمال کرے گا۔ ایسا ہونے کی صورت میں اصولی طور پر حکومت کو مستعفی ہونا پڑتا۔ اس جماعت کی ساری انتخابی مہم دو نکات پر مرکوز تھی، اول، زمینداری کا خاتمہ اور دوم، سودی کاروبار پر کنٹرول کا قانون بنانا۔ مسلم لیگ کی مہم میں سارا زور اس بات پر تھا کہ کرشک پرجا کی حیثیت کانگرس کے دم چھلے کی سی ہے اور یہ کہ وہ خود اپنے پروگرام پر عمل کرنے میں سنجیدہ نہیں۔ اس کے تناظر میں اگر حکومت ناکامی کی صورت میں مستعفی ہو جاتی ہے تو آئندہ انتخابات میں اس کی کامیابی مشکوک ہے''۔

''کانگرسی قیادت سوراج اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کو کیوں ترجیح دے رہی تھی؟''

''کانگرس کا خیال تھا کہ ان دونوں اقدامات کا تعلق دیش کی عزت سے ہے، خاص طور پر اس وقت جب ہزاروں بنگالی انڈیمان میں قید سیاستدانوں کی رہائی کے حق میں بھرت رکھے ہوئے ہیں۔ زمینداری اور سودی کاروبار کے خاتمہ کے لیے قانون سازی قیدیوں کی رہائی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی''۔

کمال کے نزدیک دونوں جماعتوں کے دلائل جاندار تھے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ دونوں جماعتوں کے بیچ کوئی مفاہمت یا سمجھوتہ ممکن تھا یا نہیں؟ شاہد خان نے بتایا کہ کرشک پرجا کے ایک رہنما نے یہ تجویز دی تھی کہ پہلے زمینداری اور سودی کاروبار کے خاتمہ پر قانون سازی کی جائے اور اس کے بعد سوراج اور قیدیوں کی رہائی پر۔ اگر گورنر ویٹو کردے تو حکومت مستعفی ہو جائے، مگر کانگرس قیادت نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔

''کیوں؟''

''ممکن ہے کچھ اور وجوہ بھی ہوں مگر بنیادی وجہ یہ تھی کہ کانگرس بلا معاوضہ زمینداری کا خاتمہ بالکل نہیں چاہتی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ گاندھی کی عوامی تحریک کے نتیجہ میں عام لوگ بھی کانگرسی قیادت سنبھالنے کے اہل ہو گئے تھے مگر بنگال میں ہندو زمیندار اور غیر بنگالی کاروباری طبقہ کا سیاسی تسلط ہنوز قائم تھا جو زمینداری خاتمہ کے شدید مخالف تھے، بلکہ اس کے برعکس وہ مزروعہ زمینداروں کی جابرانہ قوت میں مزید اضافے کے خواہاں تھے۔ اسی وجہ سے تقریباً تمام ہندو رہنماؤں نے زمینداروں کی قوت میں اضافے کے حق میں ووٹ دیے تھے حتیٰ کہ سبھاش چندر بوس جیسے رہنما بھی اس معاملہ میں پیچھے نہ رہے''۔

کمال دم بخود سن رہا تھا۔ یہ احساس اس کے لیے تکلیف دہ تھا کہ اصولوں کی بجائے ذاتی مفادات، خود غرضی اور تنگ نظری نے تاریخ کا راستہ متعین کیا تھا۔ خان صاحب کہہ رہے تھے، ''1905 میں بابو لوگ حب الوطنی، دھرتی ماتا کی سالمیت اور بنگالیوں کے اتحاد جیسے بلند بانگ اور خوشنما نعرے الاپ رہے تھے لیکن ان کی تحریک کی اصل جڑیں کہیں اور تھیں''۔

''کیا مطلب؟''

خان صاحب اپنی کرسی سے اٹھے، 'کلکتہ کیندرک' کے عنوان سے تحریر کردہ ایک کتاب کھول کر کمال کو ایک صفحہ پڑھنے کو کہا۔ اس نے پڑھنا شروع کیا:

''اونچی ذات کے ہندو زمیندار اور انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان ان پانچ وجوہات سے تقسیمِ بنگال کے مخالف تھے:

اوّل: کلکتہ کے سرمایہ داروں کو تشویش تھی کہ مشرقی بنگال کی چٹاگام بندرگاہ اور آسام کے ذریعے درآمد برآمد

ارزاں رہے گی لہٰذا بہت سے کاروباری لوگ کلکتہ سے چٹاگام منتقل ہو جائیں گے۔ [ماخذ: بنگال حکومت کا میمورنڈم، مورخہ 3 فروری، 1904، از: شری ناتھ رائے، سیکریٹری بنگال چیمبر آف کامرس]

دوم: کلکتہ کے وکلاء پریشان تھے کہ ڈھاکہ میں ہائی کورٹ کے قیام سے ان کے بہت سے موکل ہاتھ سے نکل جائیں گے۔

[ماخذ: گورنر جنرل آف انڈیا لارڈ منٹو (1905-10) کا مکتوب بنام لارڈ مورلے، سیکرٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان، مورخہ 5 فروری، 1906]

سوم: کلکتہ کے اخبارات مالکان کو اندیشہ تھا کہ ڈھاکہ سے اخبارات اور رسائل کا اجرا ان کے اخبارات و رسائل کی اشاعت کو کم کر دے گا۔ [ماخذ: اخبار 'بنگالی'، کلکتہ، مورخہ 05 ستمبر، 1905]

چہارم: بڑے بڑے ہندو زمیندار جو رہتے تو کلکتہ میں تھے مگر ان کی زمینیں مشرقی بنگال میں تھیں، پریشان تھے کہ نئی صورتِ حال میں انہیں مالیہ وغیرہ اکٹھا کرنے کے لیے ڈھاکہ میں بھی ایک دفتر قائم کرنا پڑے گا جو ان پر مالی بوجھ کا سبب ہوگا۔ مزید براں، اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا کہ مشرقی بنگال کے مسلمان مزارعین مالیہ کی عدم ادائیگی کے لیے کوئی تحریک شروع کر دیں۔

[ماخذ: پی، کے، ٹھاکر، سیکرٹری برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کا مکتوب مورخہ 19 فروری، 1905، بنام حکومتِ بنگال]

پنجم: اعلیٰ جاتی ہندوؤں کے لیے یہ سوچ پُرتشویش تھی کہ بنگالی بولنے والوں کی اکثریت نئے صوبے کو منتقل ہو گئی تو اس سے ان کی اجارہ داری اور حلقۂ اثر میں بہت کمی ہو جائے گی۔ [ماخذ: لارڈ منٹو کا لارڈ مورلے کو خط، مورخہ 03 فروری، 1906]''

....

اسکول میں پڑھائی جانے والی تاریخ کی کتابوں میں ان باتوں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ نصابی کتابیں پڑھ کر ذہن میں تو یہ آتا تھا کہ سیاسی رہنماؤں کی ساری جدوجہد ملکی مفاد کی خاطر تھی۔ شاہد خان کی دی ہوئی کتاب پڑھنے کے باوجود کمال اسے تسلیم کرنے میں متامل تھا۔ اس نے کتاب میز پر رکھی اور جھجکتے ہوئے پوچھا، ''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ رہنماؤں کے مدِ نظر اپنے معاشی مفادات کا تحفظ تھا، گویا آپ اس حقیقت سے منکر ہیں کہ ان کی جدوجہد دیش کے لیے تھی؟ کیا وہ محب الوطن نہیں تھے''۔

شاہد خان نے الٹا اس پر سوال کر دیا، ''1947 میں یہ حب الوطنی کہاں تھی؟''

''وہ 1947 میں بھی حب الوطن تھے''، کمال نے جواب دیا۔

''پھر بنگال کو دو نیم کیوں کیا گیا؟''

''کیونکہ ان کے پاس اور کوئی راستہ رہ ہی نہیں گیا تھا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ قیامِ پاکستان تھا۔ اگر بنگال کی تقسیم نہ ہوتی تو پورا صوبہ پاکستان کو چلا جاتا۔ تقسیم سے کم از کم یہ تو ہوا کہ بنگال کا ایک حصہ ہندوستان کو مل گیا''۔ نصابی کتابوں کے مطالعہ سے ذہنوں میں یہی تاثر پیدا ہوتا تھا اور کمال کا جواب بھی یہی تھا کہ تاریخ کی کتابوں میں بڑا واضح لکھا ہوا ہے۔

''اچھا! میں تمہیں ایک اور کتاب دکھاتا ہوں''۔

وہ کرسی سے اٹھے اور الماری سے ایک کتاب نکالی، عنوان تھا: Sardar Patel Correspondence, 1945-50, 4th Part, edited by Durgadas

''یا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ کتاب جعلی ہے؟''

''جی نہیں''۔

''کیا تم کہو گے کہ کتاب کے مندرجات میں غلط بیانی ہے؟''

''مجھے تو علم نہیں کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے''۔

خان صاحب نے کتاب کا ایک صفحہ کھولتے ہوئے کمال سے پڑھنے کو کہا۔ کمال نے دیکھا۔ یہ ایک خط تھا جو 11 مئی، 1947 کو شیام پرشاد مکر جی نے سردار پٹیل کو بھیجا تھا۔ کمال نے پڑھنا شروع کیا:

''77 استوش مکر جی روڈ، کلکتہ۔

11 مئی، 1947

مائی ڈیئر سردار جی!

اس حتمی صورتِ حال پر ہماری تشویش بالکل فطری ہے۔ خود مختار بنگال کے نکتے پر سرت بابو کی سہروردی سے بات چیت کی کوشش بہت بڑی شرانگیزی ہے۔ ہندوؤں میں اس کی قطعاً پذیرائی نہیں، نہ ہی وہ ہندوؤں کے ایک بھی جلسہ عام میں خطاب کرنے کی ہمت کر سکے ہیں۔ امید ہے کہ آپ خود مختار بنگال کی بات کسی جگہ زیرِ بحث لانے کی اجازت نہیں دیں گے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ دہلی میں ماہِ رواں کی 17 تاریخ کو ایک کانفرنس ہو رہی ہے جہاں شرکا کو ایک حتمی اسکیم دی جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ اس آخری مرحلے میں مسلم لیگ کیبنٹ مشن پلان کو قبول نہیں کرے گی۔ اگر جناح صاحب حالات کی مجبوری کے تحت اس پر بات بھی کرنا چاہیں تو براہِ کرم اس سوال کو زیادہ زیرِ بحث نہ لایا جائے۔ کیبنٹ مشن پلان میں ایک ڈھیلے ڈھالے اور کمزور وفاق کا ذکر ہے، اگر ایسا ہو گیا تو بنگال میں ہماری سلامتی ختم ہو جائے گی۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ پاکستان کا قیام عمل میں آئے یا نہ آئے، موجودہ صوبہ بنگال کو دو صوبوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔

مجھے علم نہیں کہ آیا وائسرائے عبوری حد بندی کریں گے یا نہیں، مگر بردوان اور پریذیڈنسی ڈویژن، جیلپیگری (Jalpaiguri) اور دارجلنگ میں ایسا کیا جا سکتا ہے۔ باؤنڈری کمیشن بعد ازاں تھانوں کی بنیاد پر حتمی فیصلہ کر لے۔

بنگال حکومت کے خاتمہ کا اعلان نئے اعلامیہ میں شامل ہونا انتہائی اہم ہے۔ اگر فوری طور پر قدم نہ اٹھایا گیا تو اس کے نتائج بڑے سنگین ہوں گے۔ اگر حکومت کو ایک دن بھی کام کرنے دیا گیا تو صوبے، اور بالخصوص کلکتہ کے لئے تباہ کن ہوگا۔ اگر علاقائی حکومتوں کے قیام میں کچھ تاخیر ہو تو سیکشن 93 کا نفاذ کیا جائے جس کے تحت مشیروں کی نمائندہ کونسل عارضی طور پر کام کرے۔

آپ کے خیال میں اگر میرا دہلی آنا ضروری ہے تو بلا تکلف مطلع کیجیے۔

اسی قسم کا ایک خط میں پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی ارسال کر رہا ہوں۔

مخلص

شیام پرشاد مکر جی

بنام: قابلِ احترام سردار ولبھ بھائی پٹیل،

نئی دہلی''

....

کمال تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ شیام پرشاد مکر جی، جس کا وہ پرستار تھا، ایسا خط لکھ سکتا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں تو لکھا ہوا ہے کہ اس نے جی جان سے بنگال کی وحدت کی کوشش کی تھی، اسی بنا پر کشمیر کے دورے کے دوران (بظاہر دل کا دورہ پڑنے سے) اس کا دیہانت ہو گیا۔ اسے بھارت کیسری کے اعزاز سے نوازا گیا، اور وہی شخص پٹیل کو لکھ رہا ہے کہ ''پاکستان کا

قیام عمل میں آئے یا نہ آئے ،موجودہ صوبہ بنگال کو دو صوبوں میں منقسم کر دیا جائے‘‘۔آخر کس لیے؟

شاہد خان نے کمال سے استفسار کیا’’کیا تم نے پڑھ لیا ہے؟‘‘

کمال نے اپنے ممدوح کے لیے دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا،’’صحیح تو نہیں لکھا مگر تقسیم بنگال کی وکالت کیوں جبکہ اس وقت پاکستان بنا ہی نہیں تھا؟‘‘

’’بڑی سادہ سی بات ہے‘‘، خان صاحب نے سمجھایا،’’1905 میں اکثریت کے باوجود مسلمان ووٹروں کی تعداد بہت کم تھی لہٰذا فرقہ واریت ماحول میں قیادت ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں رہتی۔اس تناظر میں صوبے کے معمولی سے حصے کی بھی علیحدگی بہت مضرت رساں ہوتی اس لیے تقسیم بنگال کو روکنا بہت ضروری تھا تا کہ ہندوؤں کو سارے صوبے میں حکومت اور استحصال کرنے کا سنہری موقع مل جاتا۔لیکن 1947 میں مسلمان بنگال کی سیاست میں قدم جما چکے تھے اس لیے فرقہ واریت کے ماحول میں ہندو نیتاؤں کا مستقبل غیر منقسم بنگال میں زیادہ روشن نہیں تھا‘‘۔

’’کیوں؟‘‘

’’کیا کشمیر ہندوستان میں نہیں؟‘‘

’’جی!ہے‘‘۔

’’کیا آج تک کوئی غیر مسلم وہاں حکومت کا سربراہ بنا ہے؟ چلو!کشمیر کو چھوڑو۔کیا 1937 سے 1947 تک کوئی غیر مسلم بنگال کا وزیرِ اعظم رہا ہے؟

’’وزیرِ اعظم؟‘‘اس گمان میں کہ لفظ’وزیرِ اعظم‘ شائد غلط بولا گیا ہے،کمال نے دھیرے سے اپنے شک کا اظہار کیا۔

خان صاحب نے سمجھایا کہ غیر منقسم بنگال میں حکومتی سربراہ کو وزیرِ اعظم کہا جاتا تھا۔کمال نے اپنے ذہن میں نام دہرائے:فضل الحق،ناظم الدین،سہروردی،سب مسلمان تھے،پھر اسے تسلیم کرنا پڑا کہ اس عرصہ میں کوئی غیر مسلم وزیرِ اعظم نہیں رہا۔خان صاحب مزید کہہ رہے تھے:

’’اس سے ہندو قیادت کو یقین ہو گیا کہ غیر منقسم بنگال کی فرقہ وارانہ فضا میں ان کا کوئی مستقبل نہیں۔اگر انہیں اقتدار چاہیے تو بنگال کے اس حصے کو جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے،الگ ہونا چاہیے،بے شک وہ حصہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔جب تک ان کی قیادت کو کوئی خطرہ نہیں تھا،بنگال کی وحدت حب الوطنی سمجھی گئی۔جب یقین ہو گیا کہ صوبے کو تقسیم کیے بغیر وہ اقتدار حاصل نہیں کر سکتے،تقسیمِ بنگال کی وکالت حب الوطنی بن گئی۔شیام پرشاد جیسے نیتا ہندو مہاسبھا اور کانگرس کے الگ الگ اور مشترکہ جلسوں میں تقریریں کرنا شروع ہو گئے‘‘۔

کمال پھر الجھ گیا،’’کیا ہندو رہنما تقسیمِ بنگال کے حق میں جلسے کر رہے تھے؟‘‘

’’برخوردار!ہے تو تلخ بات مگر حقیقت یہی ہے‘‘۔شاہد صاحب نے بتایا کہ ایک یا دو نہیں بلکہ ہندو قیادت نے 1947 میں تقسیمِ بنگال کے حق میں چھہتر (76) جلسے کیے تھے،کانگرس نے انسٹھ (59)،ہندو مہاسبھا نے بارہ اور دونوں نے پانچ بار مشترکہ جلسے کیے۔

کمال ان اعداد کی درستگی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کیونکہ ہندو مہاسبھا ایک فرقہ پرست جماعت تھی جبکہ کانگرس سیکولر ہونے کی دعوئی دار۔اس نے بڑی شائستگی سے پوچھا:

’’دونوں جماعتوں نے مشترکہ جلسے کیسے کر لیے اور وہ بھی تقسیم بنگال پر؟‘‘

’’کیا تمہیں سچائی تسلیم کرنے میں کوئی مشکل آ رہی ہے؟یہ سب کچھ ایک نقطۂ نظر ہے جو کتابوں سے کشید کیا گیا ہے۔

مسلم لیگ نے کانگرس پر ہمیشہ ہندو جماعت ہونے کا الزام لگایا، اور بنگال کی کانگرسی قیادت نے چالیس کی دہائی میں اسے سچ ثابت کر دکھایا''۔

شاہد خان کی وضاحت کردہ صورتِ حال ابھی بھی کمال کے لیے ناقابلِ تسلیم تھی مگر اسے جھٹلانے کے لیے اس کا علم ناقص تھا، لہٰذا اس گفتگو میں اس کی دلچسپی کم سے کم ہوتی گئی۔ عین اس وقت ثریا رکابیوں میں کچھ کھانے کی چیزیں لیے کمرے میں داخل ہوئی جسے دیکھ کر کمال نے اطمینان کی سانس لی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' ثریا نے کمال سے استفسار کیا۔ وہ تو خاموش رہا لیکن شاہد خان صاحب بولے،

''دیکھو! یہ نتیجہ ہوتا ہے غلط تعلیم کا۔ کمال میری باتیں ماننے کو تیار نہیں''۔

ثریا نے دونوں رکابیاں میز پر رکھیں، اپنے دادا کی طرف دیکھ کر بولی، ''بہت قابلِ اعتراض بات ہے۔ ہوسکتا ہے کہ خالی پیٹ کی وجہ سے آپ اس کو مناسب طریقے سے سمجھا نہیں پا رہے، یا یہ نہیں سمجھ رہا۔ پہلے کچھ کھا لیں، اس کے بعد پھر سے کوشش کریں''۔

''یقیناً، مگر ہم تین ہیں اور پلیٹیں دو۔ کیا حساب ہوگا؟ ایک پلیٹ اور لاؤ''۔

''ضرورت نہیں کیونکہ میں کھا چکی ہوں''۔

''یہ بھی تو قابلِ اعتراض ہے۔ ہمارے بغیر تم نے کیوں کھا لیا ہے؟''

''آپ فضول سے موضوع پر متواتر بولے جا رہے تھے، پھر میں کس کا انتظار کرتی؟ اب آپ تھکے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ کچھ کھا پی لیں، قوت آجائے گی۔ اس کے بعد آپ لمبی گفتگو کرسکتے ہیں''۔

''میری بچی! ایک وقت میں اتنے فاؤل''۔

خان صاحب زمانۂ طالبِ علمی میں ایک اچھے کھلاڑی تھے۔ وہ خوشگوار مزاج میں ہوتے تو کھیلوں کی اصطلاحات استعمال کرتے۔ بحث میں ہارنے پر خود ہی کہہ دیتے، ''وکٹ اڑ گئی''۔ اگر مدِ مقابل دلائل میں بودا ثابت ہوتا تو اسے کہتے، ''تمہیں بیٹ پکڑنے کی مزید ضرورت نہیں''۔ اگر کوئی موضوعِ گفتگو سے ہٹ جاتا تو اسے کہتے، ''گیند کو گول میں پھینکو''۔ اور کسی کے نامناسب الفاظ کو وہ ''فاؤل'' کہتے۔ اپنی پوتی کو اس وقت یہی کہا تھا کہ ''ایک وقت میں اتنے فاؤل''۔

''پھر کیا کیا جائے؟'' ثریا نے پوچھا۔

''جرمانے کے طور پر تمہیں ہمارے ساتھ پھر سے کھانا پڑے گا''۔

''ٹھیک ہے''۔ ثریا دادا ابو کی پلیٹ سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا لے کر بولی، ''اب آپ کھائیں''۔

''میرے سر پر سوار رہو گی تو میں بھلا خاک کھاؤں گا۔ کرسی پر بیٹھ جاؤ''۔

ثریا پاس رکھی ہوئی کرسی میں بیٹھ گئی۔ کمال دادا پوتی کی مصنوعی لڑائی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ خان صاحب نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''چلو! بھئی، ہم اپنی باتیں جاری رکھیں''۔

پلیٹیں خالی ہوئیں تو ثریا نے انہیں ایک جگہ رکھ کر دادا سے کہا، ''یاد ہے آپ نے مجھ سے کہانی سنانے کا وعدہ کیا تھا؟''

''ہاں یاد ہے''۔

''پھر شروع ہو جائیں''۔

''کون سی کہانی؟''

ثریا کے جواب دینے سے پہلے ہی کمال بول اٹھا، ''آپ کے بڑے بھائی نے ایک دہشت گرگروہ میں شمولیت

اختیار کر لی تھی اور سوراج کے لیے ڈکیتی کرتا ہوا مارا گیا تھا"۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"پال صاحب نے مجھے ایک بار بتایا تھا۔ کیا آپ ساری کہانی سنائیں گے؟"

"کہانی؟ ہاں اب یہ کہانی ہی ہے"۔ خان صاحب کی آواز بھرا گئی۔ "اس کی موت میرے لیے ابھی تک ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ میں نے آج تک اس کو سچ نہیں مانا۔ زندگی کی توانائیوں سے بھرپور ایک نوجوان یوں اچانک ختم ہو جائے! اس حادثے نے میری زندگی کو بہت متاثر کیا"۔

"وہ کیسے؟"

"میں نے کبھی بھی سیاست میں آنے کا سوچا نہیں تھا"۔

"پھر سیاست میں کیسے آ گئے؟"

"وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ میرے ذہن میں آیا کہ اس کے شروع کیے ہوئے کام کو نامکمل کیسے چھوڑ دیا جائے، لہٰذا میں نے اس کی تنظیم سے خفیہ بات چیت کی۔ وحید کا چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے انہوں نے مجھے فوراً قبول کر لیا"۔

"ان دنوں آپ کیا کام کر رہے تھے؟"

"بھوبن پور کے کاشی ناتھ کالج میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا"۔

ثریا جاننا چاہتی تھی کہ بڑے دادا ابو کیا کرتے تھے۔ شاہد خان نے بتایا کہ "وہ مجھ سے تین سال قبل کالج میں داخل ہوئے تھے۔ یہ کالج اس وقت دہشت گرد انقلابیوں کا مرکز تھا۔ تم جانتے ہی ہو کہ چٹا گام کے اسلحہ ڈپو میں ہونے والی ڈکیتی کا ہیرو سوریا سین اور ڈھاکہ کے کلکتہ بازار میں پولیس کے ہاتھوں شہید ہونے والا لٹنی بگاچی اسی کالج میں پڑھتے تھے۔ اس سے پہلے 1903 میں بھوپیش چندر ناگ اور پلن داس ڈھاکہ میں گرفتار کئے گئے تھے۔ اوّل الذکر کو بھوپن پور جیل میں رکھا گیا تھا۔ رہائی کے بعد اس نے کاشی ناتھ کالج میں داخلہ لے لیا اور بالآخر یہیں لیکچرار مقرر رہا۔ مسٹر ناگ سے متاثر ہو کر چند طلباء نے دہشت گرد تنظیم انوشلن سمیتی میں شمولیت اختیار کر لی۔ میرے بڑے بھائی بھی ان میں سے ایک تھے"۔

"وہ کب تنظیم میں شامل ہوئے تھے؟"

"یہ تو مجھے علم نہیں۔ پہلی بار مجھے اس وقت پتہ چلا جب کچھ طلباء براہی میں یاترا اسٹیج کے نزدیک میٹنگ کا اہتمام کر رہے تھے"۔

"یاترا اسٹیج کے نزدیک؟"

"ہاں! لگتا تو عجیب سا ہے مگر وہ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ پولیس تمام خفیہ اجلاسوں پر نظر رکھتی تھی لہٰذا اس سے بچنے کے لیے ایسی جگہوں پر اجلاس کئے جاتے جہاں عام لوگوں کی آمد معمولی بات سمجھی جاتی، یعنی شادی گھر اور یاترا اسٹیج وغیرہ۔ میں تو محض اتفاق سے یاترا اسٹیج میں ہونے والی میٹنگ میں جا پہنچا تھا"۔

"وہاں کیا ہوا؟"

"مجھے دیکھ کر وہاں سناٹا چھا گیا۔ شاید انہوں نے مجھے پولیس کا مخبر سمجھا تھا۔ میں خود بھی پریشان ہو گیا۔ ہاں جب میرے بھائی نے تعارف کرایا تو وہ لوگ ہیرو ہیروئن اور ان کے لباس کی باتیں کرنے لگے۔ بڑے بھائی نے مجھے جا کر ڈرامہ دیکھنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ ہمیں کچھ کام ہے، بعد میں ہم بھی آ جائیں گے۔ میں واپس آ گیا"۔

"آپ کو کیسے علم ہوا کہ وہ انوشلن سمیتی کا اجلاس تھا؟"

''اگلے دن ایک ڈاکیے سے روپوں کا بھرا ہوا تھیلا لوٹا گیا اور ایک ملازم گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ رات کو میں نے اپنے بھائی سے پوچھا، 'یہ کیا کیا؟ وہ غریب آدمی اپنی روٹی روزی کے لیے کام کرتا تھا۔ تم لوگوں نے اسے قتل کیوں کیا؟' بڑے بھائی کی آواز میں پچھتاوا تھا، ''ہمارا ارادہ اسے مارنے کا نہیں تھا۔ ہم اسے چند طمانچے لگا کر تھیلا چھیننا چاہتے تھے مگر اس نے شیامل کو بڑی مضبوطی سے بانہوں میں جکڑ لیا، اگر وہ مارا نہ جاتا تو ہم سب گرفتار ہو سکتے تھے'۔ میرا بھائی اس ہلاکت پر بہت پریشان تھا، اسی کیفیت میں اس نے مجھے ساری باتیں بتا دیں''۔

''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''اگلے دن وہ بھوبن پور سے چلا گیا۔ چند ہفتوں کے بعد واپس آیا تو قدرے متردد تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا، 'بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ قیادت کی خواہش ہے کہ ہمارے اہلِ وطن بدیشی مال کا بائیکاٹ کر کے صرف اپنی اشیاء خریدیں۔ میری ذمہ داری اس گاؤں میں لگائی گئی ہے'۔ میں نے اسے کہا، 'گاؤں والوں کو سمجھاؤ اور ان سے بائیکاٹ کی درخواست کرو'۔ اس پر اس نے گاؤں کے بزرگوں کی ایک خفیہ میٹنگ بلائی''۔

''میٹنگ میں کیا فیصلہ ہوا؟''

''مدد کرنے کا وعدہ تو سب نے کر لیا مگر سودیشی چیزیں خریدنے اور بدیشی مال کے بائیکاٹ پر تیار نہ تھے۔ گاؤں کے سرپنچ مدن منشی نے سوال کیا، 'تم ہمیں سودیشی اشیاء خریدنے کا تو کہہ رہے ہو مگر ساری چیزیں ملیں گی کہاں سے؟ بازاروں میں یہ ملتی نہیں ہیں، اور اگر کہیں مل بھی جاتی ہیں تو ان کی قیمت ہماری پہنچ سے باہر ہے'۔ پھر تو سوال پر سوال ہونے لگے۔ سارے سوالوں کا بنیادی نکتہ ایک ہی تھا۔ ایک آدمی کہنے لگا، 'ایک اچھی ساڑھی تین روپے میں مل جاتی ہے جبکہ سودیشی ساڑھی کی قیمت دس روپے سے کم نہیں، اور پھر پہننے کے لائق بھی نہیں، تین ہی مہینوں میں اس کی دھجیاں نکل آتی ہیں۔ لوگ زیادہ قیمت دے کر گھٹیا چیزیں کیوں خریدیں؟' میرے بھائی کے پاس کوئی اطمینان بخش جواب نہیں تھا۔ لہٰذا بدیشی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی اشیاء کی خریداری کی مہم کامیاب نہ ہو سکی۔ چند دنوں کے بعد پرگ پور میں ڈکیتی کی ایک واردات سے واپسی پر پولیس نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا''۔

''کیا آپ کو ڈکیتی کے بارے میں پتہ تھا؟'' ثریا نے پوچھا۔

''میں نے بعد میں سنا تھا''۔

''کہاں سے؟''

''جس لڑکے کو میرے بھائی نے بچانے کی کوشش میں خود مارا گیا، اسی نے بتایا تھا''۔

''اس نے اور کیا بتایا؟''

''پرگ پور کے زمیندار کا گھر دریا کنارے تھا اس لیے وہ لوگ ڈکیتی کی غرض سے کشتی کے ذریعے وہاں گئے تھے۔ اس واردات میں چوکیدار مارا گیا۔ وہاں سے نکلتے ہوئے ایک لڑکا بلرام درانتی لگنے سے زخمی ہو گیا۔ گھائل ہونے کے سبب اس کا چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کو اٹھا کر کشتی میں لٹایا اور وہاں سے نکل آئے لیکن زمیندار کے لوگ دوسری کشتی میں ان کا پیچھا کرنے لگے۔ اگر وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلتے تو پکڑے جاتے اس لیے وہ کشتی سے اتر گئے۔ زمیندار کے لوگوں نے پیچھا جاری رکھا۔ جان بچانے کے لیے تنظیم کے کارکنوں کا تیزی سے بھاگنا لازم تھا مگر بلرام کے زخمی ہونے کی وجہ سے رکاوٹ ہو رہی تھی۔ اسے اٹھا کر بھاگنا بڑا مشکل تھا۔ رفتار کم کرتے تو پکڑے جاتے اور اگر بلرام کو وہیں چھوڑ کر خود آ جاتے تو وہ زمیندار کے آدمیوں کے ہاتھ لگ جاتا، پھر اس نے تنظیم کے کارکنوں کے نام بتا دینے تھے جس پر سب گرفتار ہو جاتے۔ اس ٹیم کے لیڈر نے فیصلہ کیا

کہ بلرام کو مار کر اس کی گردان جدا کر کے دھڑ وہیں پھینک دیا جائے۔ پولیس اس کی شناخت نہیں کر سکے گی۔ فیصلہ اکیلے ٹیم لیڈر کا نہیں تھا، بلکہ واردات پر جانے سے قبل ہی بلرام سمیت سب نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ پکڑے جانے کی بجائے مر جانا بہتر ہوگا۔ لیکن جب شومئی قسمت نازک وقت سامنے آیا تو بلرام بھائی کی ٹانگ سے لپٹ کر اپنی جان بچانے کی دہائی دینے لگا۔ وہ دونوں ہم جماعت بھی تھے۔ میرے بھائی نے بھی منت کی کہ بلرام کی گردن نہ ماری جائے۔ ان کے درمیان تھوڑی بہت گرمی سردی بھی ہوئی اس پر باقیوں نے میرے بھائی اور بلرام کو وہیں چھوڑا اور خود نکل آئے۔ بھائی نے گھائل دوست کو کندھوں پر اٹھایا اور یہ سوچ کر آہستہ آہستہ چل پڑا کہ اسے کسی گھر میں لے جا کر ڈاکٹر کو بلا لائے گا مگر وہ پولیس کے گھیرے میں آ گیا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ پولیس کو ڈرانے کے لیے میرے بھائی نے ریوالور سے فائر کر دیئے تا کہ ان کا پیچھا کرنے والے قدرے سست ہو جائیں، لیکن ہوا کچھ اور۔ گولی ایک سپاہی کو لگی اور وہ دم توڑ گیا جبکہ دو چار سپاہی زخمی ہو گئے۔ جوابی فائرنگ میں چھاتی پر لگنے والی گولی نے بھائی کو بھی ہلاک کر دیا۔ پوسٹ مارٹم اور مختلف کارروائیوں سے گزرنے کے بعد تیسرے دن ہمیں اس کی میت ملی''۔

قصے کے اس ڈرامائی اور المناک انجام نے ماحول کو سوگوار اور خاموش کر دیا۔ کمال نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا، ''بلرام کا کیا بنا؟''

''اسے انڈیمان جلاوطن کر دیا گیا لیکن بے پناہ تشدد بھی اس سے باقی ساتھیوں کے نام نہ اگلوا سکا۔ وہ وہاں دس برس قید رہا۔ رہائی کے بعد وہ ہمارے پاس آیا تھا''۔

''کیا وہ حیات ہے؟''

''بالکل، اس نے اب دو منزلہ گھر تعمیر کیا ہے۔ اس کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہیں۔ بیٹی ڈاکٹر ہے جبکہ بیٹا امریکہ میں انجینئر''۔

''گویا زندگی ٹھیک ٹھاک گزر رہی ہے۔ کیا وہ آپ کے بھائی کو یاد کرتا ہے؟''

''بہت۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام بھی بھائی کے نام پر وحید رکھا ہے، وحید پال''۔

وسیع القلب وحید خان کی بے لوث اور پر خلوص قربانی کی داستان نے اس ماحول کو یکسر تبدیل کر دیا جو تھوڑی دیر قبل محسوس ہو رہا تھا۔ کمال اس المناک مگر دلیرانہ انجام کے بارے میں سوچنے لگا۔ دنیا ایسے لوگوں سے خالی نہیں جو دینا جانتے ہیں، اور ایسے بھی ہیں جنہیں صرف لینا آتا ہے، وہ کسی کو کچھ دے ہی نہیں سکتے۔ وحید خان پہلی قسم کے لوگوں میں تھا۔ ایسے لوگوں کی قربانیوں کے طفیل دیش آزاد ہوا جبکہ لوٹ مار کرنے والے دوسری قبیل کے لوگ ہیں۔ شاہد خان کے بارے میں کمال گومگو کی کیفیت میں تھا کہ انہیں کس قسم کے لوگوں میں شامل کیا جائے۔ بہر حال اس نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا، ''آپ بتا رہے تھے کہ وحید خان کا بھائی ہونے کی وجہ سے تنظیم نے آپ کو فوراً قبول کر لیا۔ بعد میں کیا ہوا؟''

''سب سے پہلے کسی فیکٹری یا کسی کارخانے میں چھوٹے موٹے کام کرنا پڑتے تھے، پھر ایک حلف اٹھانے کے بعد مجھے سماجی کارکن بنایا گیا''۔

''سماجی کارکن؟'' کمال نے تشکیک آمیز لہجے میں کہا، ''لوگ تو کہتے ہیں کہ جگناتر اور انوشلن سمیتی دونوں زیر زمین کام کرنے والی تنظیمیں تھیں''۔

''مجھے جگناتر کے بارے میں کوئی علم نہیں مگر انوشلن سمیتی بلاشبہ زیر زمین تنظیم تھی۔ کسی کو ابتدا ہی میں خفیہ تنظیم کی رکنیت نہیں دی جاتی تھی۔ سماجی کارکن کی حیثیت سے دیے گئے کاموں اور ذمہ داریوں کو بہ احسن پورا کرنے اور تنظیم سے وفاداری اور افادیت کا ثبوت دینے کے بعد دوسرا حلف نامہ اٹھانا پڑتا تھا۔ خفیہ سوسائٹی میں اراکین کی درجہ بندی تھی۔ نظم و

ضبط، باقاعدگی اور قوتِ کردار کی کسوٹی سے کامیاب گزرنے کے بعد رکن کو ایک اور حلف اٹھا کر تنظیم کی کارروائیوں میں حصہ لینے کا اہل گردانا جاتا تھا۔ ان تمام مراحل کے بعد ہی رکن کو فیصلہ کن حیثیت ملتی تھی''۔

''آپ کا پہلا حلف کیا تھا؟''

''مجھے کوتوالی پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔ نیرو سین گپتا کے ہاتھ میں میرا ہاتھ دے کر مجھ سے حلف لیا گیا جو کچھ اس قسم کا تھا: 'میں کمیتی سے کبھی بھی الگ نہیں ہوں گا، تنظیم کے قواعد وضوابط کی پابندی اور مقتدرِ بالا کے ہر حکم کو بلاچون وچرا بجالاؤں گا، پریشلک (نگران کمیٹی) کے سامنے کذب بیانی کروں گا نہ ہی اس سے کوئی بات پوشیدہ رکھوں گا'۔ میں نیرو سین گپتا کے بولے ہوئے الفاظ دہراتا رہا۔ چند دنوں کے بعد دوسرا حلف اٹھانے پر مجھے خفیہ تنظیم کا رکن بنالیا گیا''۔

''دوسرا حلف کیا تھا؟''

''میں کمیتی کے اندرونی معاملات کسی دوسرے پر فاش نہیں کروں گا۔ پری شلک کی اجازت کے بغیر جائے مقررہ سے نہیں جاؤں گا۔ کمیتی کے خلاف ہونے والی ہر سازش سے اسے آگاہ اور اس کی ہدایت کے مطابق سازش کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا''۔

''ایک رکن کی حیثیت سے آپ کے فرائض کیا تھے؟''

''دوسرے حلف کے بعد مجھے ساتھیوں کی اعانت کرنے کے کچھ کام سونپے گئے لیکن کسی کارروائی کا انچارج نہیں بنایا گیا، حتیٰ کہ مجھے کسی ایسی میٹنگ میں جانے کی اجازت نہیں تھی جہاں اہم فیصلے ہونے تھے۔ صرف بنیادی اراکین ہی ان اجلاسوں میں شرکت کرتے تھے۔ میں ہمیشہ بے کل رہتا کیونکہ تنظیم میں شمولیت کا مقصد اپنے بڑے بھائی کی موت کا انتقام لینا تھا۔ میں زیادہ دیر صبر نہ کرسکا اور اپنے لیڈر نیرو سین گپتا سے درخواست کی کہ بنیادی رکن بنا کر مجھے کچھ کام کرنے دیا جائے۔ میرا جوش اور شوق دیکھ کر گپتا بہت خوش ہوا۔ اس نے ایک شخص ہیپلاپ کو کہا کہ مجھے بنیادی رکن بننے کی تیاری کرائے۔ اس نے مجھے دو کتابیں، گیتا اور آنند مٹھ، دیں''۔

آنند مٹھ کا نام سن کر کمال کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوا۔ اس کے بنگالی زبان کے استاد ساہا صاحب نے آنند مٹھ کو آزادی کے متوالوں کی گیتا قرار دیا تھا۔ کمال نے کتاب تو پڑھ رکھی تھی مگر اب خانصاحب کے اس زمانے کے تاثرات جاننا چاہتا تھا، ''ان کتابوں کو آپ نے کیسا پایا؟''

''بڑی صاف بات ہے کہ میں گیتا کے باطنی مفہوم کو سمجھ نہیں سکا تھا''، انہوں نے صاف گوئی سے تسلیم کیا۔

''آپ کے تاثرات کیا تھے؟''

''گیتا کی تعلیم کے بارے میں میرا تاثر تھا کہ نتائج کی توقع کیے بغیر کام کرتے جاؤ''۔

''اس میں کیا تھا جو آپ سمجھ نہیں سکے تھے؟''

''مجھے نتائج کی توقع ہوتی ہے۔ میں اگر کام کرتا ہوں تو نتیجہ بھی چاہتا ہوں ورنہ کام کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ تھی وہ بات جو میں گیتا کے مطالعہ سے سمجھ نہیں پایا تھا، تاہم میری حوصلہ شکنی نہیں ہوئی۔ ہاں البتہ آنند مٹھ پڑھ کر میں ضرور بددل ہوا تھا''۔

''کیوں؟''

''مجھے لگا کہ بنکم چندر مسلمانوں کو ملک بدر کر کے انگریزوں کو اقتدار سونپنے کا پیغام دے رہا ہے۔ میں تو انگریزوں کو سبق سکھانے کا خواہش مند تھا پھر کیسے اس سوچ کی حوصلہ افزائی کرتا کہ مسلمانوں کو دیش سے نکال کر انگریزوں کو حکمران بنایا جائے''۔

کمال کو خوشی ہوئی کہ شاہد صاحب نے بھی وہی کہا ہے جو اس کے اپنے دل میں تھا۔ ''پھر آپ نے کیا کیا؟''، اس نے پوچھا۔

''اگلے روز میں نے ہپلاب کے سامنے یہ نکتہ اٹھایا۔ اس کا جواب تھا، ''غالباً تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ دوبارہ پڑھو۔ میں اسے پڑھتا رہتا ہوں، مجھے تو اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نظر نہیں آتی''۔

''کیا آپ نے اسے دوبارہ پڑھا؟''

''نہیں، نہ ہی میں نے کسی سے اس کا ذکر کیا کیونکہ میں تنظیم کی بنیادی رکنیت اور کچھ کام کرنے کی خواہش میں بے چین ہو رہا تھا''۔

''آپ بنیادی رکنیت کے لیے پھر کب گئے؟''

''چند دن بعد''۔

''آپ کو رکنیت کیسے ملی؟''

''مجھے رکنیت نہیں مل سکی''۔

''کیا؟ انہوں نے آپ کو رکنیت نہیں دی؟''، ثریا نے پوچھا

''یہ تو نہیں کہا جا سکتا''۔

''پھر؟''

''ہوا یہ کہ کوتوالی تھانے کے نزدیک اپنے خلوت خانے میں جا کر ہپلاب نے کہا، 'بنیادی رکنیت تمہیں دو دن بعد ملے گی'۔ میں نے خوشی خوشی پوچھا، 'اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟' اس نے کہا کہ کل سارے دن میں صرف ایک دفعہ ہی 'ہبی شانا' کھانا ہو گا، پھر میں بتاؤں گا کہ اگلے دن کیا کرنا ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ یہ کون سی خوراک ہے۔ پوچھنے پر وہ بڑے غصے سے بولا، 'تمہیں پتہ نہیں ہبی شانا کیا ہے؟ اچھا میں بھیج دوں گا'۔ ہبی شانا ملا تو میں نے دیکھا کہ دلیے کی طرح گھی میں ابلے ہوئے چاول تھے۔ میں نے محض بنیادی رکنیت کی خاطر انہیں تناول کیا اور اگلے روز کا منتظر ہو گیا''۔

کمال کو ساری باتیں بہت دلچسپ لگیں۔ اس نے کتابوں میں دہشتگردوں کے بارے میں پڑھ رکھا تھا مگر آپ بیتی پہلی بار سن رہا تھا۔ ''اگلے دن کیا ہوا؟''

''وقتِ مقررہ پر میں اس خفیہ جگہ پہنچا تو ہپلاب نے مجھے گنگا اشنان کرنے کو کہا۔ اشنان کے بعد اس نے مجھے پہننے کے لیے نئی دھوتی کرتہ دیا۔ پھر مجھے بنیادی رکنیت کے لیے سدیشوری کالی مندر لے جایا گیا۔ وہاں سین گپتا خوشبو، دیا، صندل اور چڑھاوے کی چند دوسری چیزیں لیے ہمارا منتظر تھا۔ ہمارے پہنچنے پر بلیدان کے لیے آگ جلائی گئی۔ ہم ننگے پاؤں مندر میں داخل ہوئے لیکن اندر جاتے ہی مجھے بے چینی شروع ہو گئی''۔

''وہ کس لیے؟''

''ایک تو اس واسطے کہ میری پرورش مسلمان گھرانے میں ہوئی تھی۔ قبل ازیں میں نے مندروں کو دور ہی سے دیکھا تھا، کسی کے اندر نہیں گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ میں بچپن ہی سے سنتا آیا تھا کہ بت پرستی گناہ ہے، جبکہ یہاں میں ایک مورتی کے سامنے حلف اٹھانے آیا ہوں۔ سین گپتا نے ایک کتاب سے کچھ پڑھنا شروع کیا جس کا مطلب میرے پلے نہ پڑا۔ ہپلاب نے بتایا کہ یہ سنسکرت چند ھو گیا اپنشد ہے۔ اس کے ناقابلِ فہم اشلوک، اگنی کنڈ (جس گڑھے میں قربانی کے لیے آگ جلائی جائے) اور اگربتیوں کے دھوئیں نے ماحول کو بہت بوجھل کر دیا تھا۔ ہپلاب مجھ سے آگے چل رہا تھا۔ سب سے پہلے ایک اور ساتھی کی

رکنیت سازی شروع ہوئی''۔

''رکنیت سازی کیسے ہوئی؟''

''اسے زمین پر بیٹھنے کو کہا گیا۔ سین گپتا نے اس کے سر پر گیتا اور گیتا کے اوپر تلوار رکھی۔ خود اس کی دائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ لڑکے نے تلوار اور گیتا ہاتھ میں پکڑی اور آگ کے پاس رکھا حلف نامہ پڑھا''۔

''حلف نامے میں کیا لکھا تھا؟''

''لکھا تھا، 'مقصد کے حصول تک میں اس تنظیم سے الگ نہیں ہوں گا۔ میں ماتا، پتا، بھائی، بہن وغیرہ کی محبت یا فریب محبت میں آ کر اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتوں گا، نہ ہی اپنے لیڈر کے حکم کی بجا آوری میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کروں گا۔ حلف نامے کی خلاف ورزی پر برہمنوں، والدین اور تمام وطن دوستوں کا مجھے آگ میں جل کر راکھ ہونے کا شراپ حاصل ہو گا۔ میں اپنی جان اور دنیا کی تمام نعمتوں کو ٹھکرا کر سمیتی کی تعلیمات کا پرچار کروں گا۔ میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں میں سے کسی ایک پر بھی سمیتی کے خفیہ مقاصد کا انکشاف نہیں کروں گا'۔ حلف ختم ہونے کے بعد اس لڑکے کو دودھ، گھی اور گڑ کا آمیزہ پینے کے لیے دیا گیا''۔

''آپ کو کھانے پینے کے لیے کیا ملا تھا؟''

''مجھے علم نہیں کہ سین گپتا نے کیا گمان کیا کیونکہ اس نے بپلاب کو میرے بارے میں بس اتنا کہا کہ یہ فی الحال حلف کے تیار نہیں''۔

''کیا اب بھی آپ بت پرستی کو گناہ سمجھتے ہیں؟''

''نہیں، بالکل نہیں''۔

''اب آپ کیا سمجھتے ہیں؟''

''نماز یا بت پرستی نیکی ہے نہ گناہ۔ یہ سراسر وقت کا ضیاع ہے''۔

کمال نے گہری سانس لی کیونکہ اس کا اپنا بھی یہی خیال تھا لیکن ایک سوال اس کے ذہن کو الجھا رہا تھا کہ دہشت گرد دیش کی خاطر مسکراتے ہوئے جان تک دینے کو تیار رہتے تھے۔ کیا انہیں اس بات کا احساس تھا کہ بھینٹ چڑھانا اور کالی دیوی کی مورتی کے سامنے حلف اٹھانا دوسرے مذاہب کے لوگوں پر کتنا گراں گزرتا ہو گا؟ اس کے دماغ میں ایک متوازی خیال بھی گھوم رہا تھا کہ تنظیم کا غیر ہندوؤں کو مندر لے جانے کا فیصلہ وسیع القلبی کی دلیل تھی، اس کے برعکس کسی غیر مسلم کو مسجد میں لے جانے کی مثالیں خال خال ملتی ہیں۔

ادھر ثریا وحید خان کی المناک موت کا سن کر بہت ملول ہو گئی تھی اس لیے خاموشی سے بیٹھی رہی۔ وہ کھڑی ہوئی تو دادا ابو نے پوچھا، ''میری بچی! کیا ہوا؟'' ثریا نے مختصر سا جواب دیا، ''آپ باتیں کریں، میں ابھی آئی''۔ یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر چلی گئی۔ خان صاحب نے معذرت خواہانہ لہجے میں کمال سے کہا:

''بیٹا! میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بولنا شروع کروں تو بولتا ہی چلا جاتا ہوں۔ میں لوگوں کو بیزار کر دیتا ہوں۔ تمہیں بھی تو اس وقت جانا ہو گا۔ جاؤ بیٹا''۔

''نہیں، میرا جانے کا ارادہ نہیں۔ میں یہاں بار بار نہیں آ سکتا۔ آج آیا ہوں تو ساری بات سن کر ہی جاؤں گا''۔

''بتاؤ، اب اور کیا سننا چاہتے ہو؟''

''آپ کانگرس میں کیسے آئے؟''

''کالی دیوی کے مندر میں ہونے والے واقعہ کے بعد تنظیم میں میری دلچسپی نہ رہی، پھر بھی میں وہاں جاتا رہا مگر شیوا جی میلے کے بعد تو میں نے جانا چھوڑ دیا''۔

''شیوا جی میلہ کیا ہے؟'' کمال نے پوچھا۔

''تم نے تاریخ کی کتابوں میں شیوا جی کے بارے میں پڑھا ہوگا''۔

''جی، میں نے پڑھا ہے۔ اس نے طاقتور مغل حکومت کے خلاف اپنی بادشاہت قائم کی تھی''۔

''لیکن ہمارے رہنما تو اس کی پوجا کرتے ہیں کہ اس نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے جبر سے نجات دلائی تھی''۔

''کون سے رہنما؟''

''مثلاً بال گنگادھر تلک۔ اس نے 1893 میں گنپتی میلہ اور دو سال بعد شیوا جی میلے کا اجرا کیا۔ سخارام گنیش دیوسکر اور چند ایک دیگر رہنماؤں نے ان میلوں کو بنگال میں شروع کیا۔ شیوا جی اور دیوی بھوانی کی پہلی بار پوجا 1902 میں کلکتہ میں ہوئی۔ انقلاب پسندوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بپلاب وغیرہ نے بھوبن پور میں بھی شیوا جی کی پوجا شروع کرا دی۔ اس پر میں نے انہیں چھوڑ دیا''۔

''کیوں؟''

''سترھویں صدی عیسوی میں مغل حکومت کے مدِ مقابل مرہٹے اپنی بالا دستی قائم کرنے کے خواہشمند تھے۔ شیوا جی کی ساری جدوجہد کا مقصد اپنی بادشاہت کا قیام تھا۔ مغلوں کی فوج میں ہندو سالار اور سپاہی تھے اور اسی طرح مرہٹہ فوج میں مسلمان سالار اور سپاہی موجود تھے۔ تاریخی حقائق کو مسخ کر کے شیوا جی کو دیوی دیوتاؤں کا دلارا اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے نجات دہندہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں ایک طرف ہندو کارکنوں کے حوصلوں کو تقویت پہنچی، وہیں دوسری جانب میرے جیسے مسلمانوں کی دل شکنی ہوئی اور وہ تنظیم سے الگ ہوتے گئے''۔

''کیا آپ نے قیادت کی توجہ اس طرف مبذول نہیں کرائی تھی؟''

''میں نے کوشش کی تھی مگر انہوں نے پروا نہیں کی۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ آیا وہ ارادۃً انجان بنے ہوئے تھے یا اس مسئلے کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اگر وہ سمجھ جاتے تو۔۔۔۔۔۔۔''۔

خان صاحب کچھ کہتے کہتے رک گئے جس پر کمال نے پوچھا، ''تو کیا؟''

''اگر بنگالی مسلمانوں کے سامنے حقائق رکھے جاتے تو شیوا جی کی مخالفت نہ کرتے، اور اگر بنگالی ہندوؤں کو علم ہوتا کہ شیوا جی کے ورثا نے ان پر کیسے کیسے مظالم کئے تھے تو وہ کبھی بھی اسے اپنا نجات دہندہ نہ سمجھتے''۔

کمال کا ذہن اس بات پر الجھ سا گیا، لہٰذا اس نے استفسار کیا: ''یہ کیا بات ہے، میں سمجھا نہیں؟''

''کیا تم نے یہ لوک گیت نہیں سنا، 'بچہ سو رہا ہے، سارا گاؤں خاموش ہے، بارگی ملک میں آ چکے ہیں''۔

''سنا ہوا ہے''۔

''جانتے ہو بارگی کون لوگ تھے؟''

کمال ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اس لیے وہ خالی خولی نظروں سے خان صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے خود ہی وضاحت کی:

''مرہٹوں کی بنگال میں مہم جوئیوں کے دوران بارگی نام کے ایک جتھے نے 1741 سے 1751 تک بنگال کے مغربی حصے میں لوٹ مار کا بازار گرم کئے رکھا۔ وہ نہ صرف لوگوں کا سارا ساز و سامان لوٹتے بلکہ عورتوں کی عصمت دری بھی کرتے تھے۔

انہوں نے تو مندروں کو بھی نہ چھوڑا۔ ہم عصر شاعر گنگا رام نے ان کے مظالم اور دہشت سے متعلق بڑی خیرہ کن تصویر کشی کی ہے"۔

خان صاحب کتابوں کی الماری کی طرف گئے اور ایک کتاب نکال کر کمال سے اسے یہ نظم پڑھنے کو کہا:

"تمام لوگ اس طرف بھاگے
بارگیوں نے جگہ کو گھیر لیا،
انہوں نے بیچارے لوگوں کا ہر جگہ پیچھا کیا،
زر و جواہر اور دیگر سامان لوٹ لیا،
لوگوں کے ہاتھ اور کان کاٹ دیئے،
ایک ہی وار سے گردن اڑا دیتے،
اور خوبصورت عورتوں کو قیدی بنا کر،
ان کے ہاتھ رسی سے باندھ کر،
باری باری ان کی عصمت دری کی جاتی،
وہ تکلیف سے چلاتی رہتیں،
بارگیوں نے ایسے بے شمار گناہوں کا ارتکاب کیا،
پھر ان مظلوم عورتوں کو رہا کر دیتے۔
کھیتوں میں لوٹ مار کرنے کے بعد بارگی گاؤں میں داخل ہو کر
بڑے بڑے گھر نذرِ آتش کر دیتے،
کیا جھونپڑی، کیا مکان، کیا مندر
سب کچھ راکھ کر دیتے"۔

کمال نے بڑی توجہ سے نظم پڑھی مگر وہ حقائق سے نابلد تھا۔ خان صاحب نے اسے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر پوچھا،

"کیا ہوا، کیا سوچ رہے ہو؟"

"آپ بالکل صحیح کہہ رہے تھے۔ لیکن قیادت آپ کا نقطۂ نظر کیوں نہیں سمجھ سکی؟"

"میں نہیں جانتا ان کی سوچ کیا تھی، آج بھی مجھے علم نہیں"۔

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"سمیتی کی کارروائیوں سے خود کو الگ کرنے کے علاوہ میں نے کچھ نہیں کیا"۔

"کانگرس میں آپ کیسے آئے؟"

خان صاحب کے جواب دینے سے قبل ہی ثریا اندر داخل ہوئی اور بولی، "دادا ابو! کھانا تیار ہے۔ امی کہہ رہی ہیں کہ آپ غسل کر لیں"۔ انہوں نے اسے مذاق میں لیتے ہوئے کہا، "تمہارا حکم ہی میرے لیے کافی ہے، اپنی امی کو کیوں بیچ میں لا رہی ہو؟"۔ ثریا نے جواب دینے کی بجائے کمال کو بھی ہاتھ منہ دھونے کو کہا۔ اس نے گھڑی دیکھی، بارہ بج رہے تھے، پھر کہنے لگا، "مجھے اب جانا چاہیے"۔

"ضرور جاؤ مگر کھانا کھانے میں کیا حرج ہے"۔

"پھر کسی دن سہی۔ آج مجھے ذرا جلدی جانا ہے۔ بس دو چار چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھنا تھیں"۔

ثریا نے اسے مجبور نہیں کیا۔

''میں آج تیل لگا کر نہاؤں گا۔ مجھے تھوڑا سا تیل اور تولیہ لادو''، شاہد خان نے ثریا کو تیل اور تولیہ لانے کو کہا۔ وہ باہر گئی تو انہوں نے کمال سے پوچھا، ''جلدی بتاؤ اور کیا جاننا چاہتے ہو؟''

''آپ کانگرس میں کیسے گئے؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے، بتانے کے لیے وقت چاہیے''۔

''میں یقیناً تفصیل سننا چاہوں گا مگر آج مختصراً بتادیجیے''۔

''میں نے سوچ سمجھ کر کانگرس میں شمولیت نہیں کی تھی۔ میں تو بڑے بھائی کی ہلاکت کے سبب برطانوی حکومت کا سخت مخالف تھا۔ انوشلن سمیتی میں جانے کا مقصد انتقام لینا تھا لیکن مجھے ان کا طریقۂ کار پسند نہیں آیا۔ ان سے ترکِ تعلق کر کے میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد میں بی اے میں پڑھ رہا تھا جب گاندھی نے علی برادران سے مل کر تحریکِ عدمِ تعاون شروع کی۔ اگلے برس بھوبن پور میں کانگرس کا دفتر قائم ہوا۔ دیش بندھو چترنجن داس یہاں آیا۔ سنا تھا کہ یہ شخص ہائی کورٹ میں وکالت کے ذریعے پندرہ سے بیس ہزار روپے ماہانہ کما رہا تھا۔ گاندھی کی آواز پر اس نے وکالت چھوڑ کر تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔ سنا تھا کہ شروع شروع میں محمد علی جناح، مدن موہن مالویہ اور بپن چندر پال جیسے نیتا تحریک کے مخالف تھے لیکن کانگرس کی ہم نوائی کے سبب بہت سے لوگ اس میں شامل ہو گئے۔ میں گاندھی کو پسند کرتا تھا لہٰذا کالج کے دیگر طلباء کے ساتھ میں نے بھی کالج چھوڑا اور تحریک میں شامل ہو گیا''۔

''پھر کانگرس چھوڑ کر کرشک پرجا میں شمولیت کیوں کر ہوئی؟''

''اس دوران بہت سے واقعات رونما ہوئے۔ ان کا ذکر کیے بغیر تم کچھ نہ سمجھ پاؤ گے''۔

''یہ واقعات میں کسی اور دن سن لوں گا۔ آج وقت بھی کم ہے اور آپ نے غسل بھی لینا ہے''۔

''ٹھیک ہے، پھر کسی دن آنا، میں تمہیں بتادوں گا''۔

''میں یقیناً آؤں گا لیکن آج چند لفظوں میں بتادیں کہ کرشک پرجا کیوں گئے ورنہ مجھے چین نہیں آئے گا''۔

''جب ہمیں محسوس ہوا کہ کانگرس ہندوؤں اور بالخصوص ہندو زمینداروں اور کاروباری طبقے کی جماعت ہے اور اس میں رہ کر عام آدمی کی خدمت نہیں ہو سکتی تو ہم نے فضل الحق، اکرم خان اور دوسرے لوگوں کے اشتراک سے کرشک پرجا کی بنیاد رکھی''۔

''اور پھر کرشک پرجا کے بعد آپ نے مسلم لیگ میں شمولیت کر لی؟''

''میں کانگرس چھوڑنے کے بعد کرشک پرجا میں آ گیا لیکن مسلم لیگ میں شامل ہونا ایک الگ سی داستان ہے۔ مخلوط حکومت میں کرشک پرجا اپنے پروگرام پر عمل درآمد میں ناکام ہو گئی۔ اس کے زمینداری ختم کرنے اور وزیروں کی تنخواہ ایک ہزار روپے سے کم رکھنے کے وعدے ہوا ہو گئے۔ فضل الحق اور دوسرے رہنماؤں کے بیچ تنازعات پیدا ہوئے جس پر فضل الحق کرشک پرجا چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔ اس کا مقلد ہونے کی وجہ سے میں بھی اس کے ساتھ چلا آیا''۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مسلم لیگ میں آپ کی شمولیت صحیح فیصلہ نہیں تھا؟''

''بلاشبہ''۔

''کیوں؟''

''ہم نے مسلم لیگ کی حمایت کر کے بلاواسطہ ہندو مہا سبھا کے ہاتھ مضبوط کر دیے تھے، نتیجہ تقسیم کی صورت میں تباہ کن تھا''

''اگر ایسا ہی ہے تو کانگرس میں دوبارہ کیوں شامل ہوئے تھے؟''

''نہیں، میں نے اس کے بعد کسی جماعت میں شمولیت نہیں کی''۔

''کیا آپ کا بیٹا رشید خان کانگرس میں نہیں؟''

''میرا بیٹا کانگرس میں ہے مگر میں نہیں''۔

''کیا آپ ابھی بھی مسلم لیگ کے حمایتی ہیں؟''

''نہیں، اب میں کسی جماعت کا حمایتی نہیں۔ ارادی یا غیر ارادی طور پر میں کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ رہا ہوں۔ اب میں کسی تنظیم سے وابستگی ضروری نہیں سمجھتا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے رہنماؤں کی منافقت سے نفرت ہوگئی ہے''۔

''کوئی مثال؟''

''مثلاً کاظم علی مرزا کو دیکھ لو۔ وہ مسلم لیگ کے سرکردہ رہنماؤں میں سے تھا۔ اس کی ہر ممکن کوشش تھی کہ اس کا ضلع پاکستان میں شامل ہو۔ ایسا ہونے کی صورت میں وہ مسلم لیگ ہی میں رہتا۔ چونکہ ایسا نہ ہو سکا اس لیے وہ لال گولا سے کانگرس کے ٹکٹ پر اسمبلی کا رکن منتخب ہو گیا۔ اس بے اصول اور فضول سیاست سے مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اب مجھے دوسروں سے نہیں، تم سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ بلکہ میں تو اپنے بیٹوں اور پوتی پوتوں سے بھی اس موضوع پر گفتگو نہیں کرتا۔ میری بیٹیوں اور بیٹوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے، ان کی اولاد بھی پڑھ رہی ہے لیکن وہ دیش اور دیش کے لوگوں کے متعلق بالکل نہیں سوچتے۔ حتیٰ کہ وہ تب بھی نہیں فکر کرتے جب۔۔۔۔۔''۔

خان صاحب قدرے جذباتی ہو گئے تھے۔ ثریا اس وقت تک کمرے میں آ چکی تھی، کہنے لگی، ''دادا ابو! مجھے پتہ ہے آپ کو ہم سے ایسی باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا، پھر کمال کو کیوں جانے دے رہے ہیں؟ اسے جانے سے منع کریں''۔ خان صاحب نے سنجیدگی سے کہا، ''میری بہت سی خواہشات تھیں۔ میں نہیں جانتا نتیجہ کیا ہوگا''۔

ثریا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کمال اٹھ کھڑا ہوا اور جانے کی اجازت طلب کی۔

خان صاحب نے الوداع کہتے ہوئے اسے دوبارہ آنے کو کہا۔ کمال باہر آیا۔ ثریا بھی باہر دروازے تک اس کے ساتھ آئی۔

....

ہیڈ ماسٹر داس گپتا صاحب آئندہ ہائر سیکنڈری امتحانات میں طلباء کی کارکردگی کے بارے میں چند اساتذہ کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا، ''کمال، بجیت اور سمیر تو بہتر ہی ہوں گے، مگر سوال یہ ہے کہ کس حد تک بہتری دکھائیں گے''۔ بنگالی زبان کے استاد نرمل ساہا نے بتایا، ''سمیر اور بجیت تو بلاشبہ محنتی اور بہت اچھے طالب علم ہیں، وہ یقیناً بہتر نتائج دکھائیں گے۔ کمال میں جوہر تو بہت ہیں مگر وہ دوسرے کاموں میں اس قدر مصروف رہتا ہے کہ اس سے زیادہ توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ وہ بیک وقت اچھا طالب علم، اچھا مقرر، ایک اچھا باحث (debater) اور پتہ نہیں کیا کیا بننا چاہتا ہے''۔

انگریزی کے استاد پردیپ نندی نے رائے زنی کی، ''پہلے وہ کبھی کھیلوں وغیرہ میں اتنی دلچسپی نہیں لیتا تھا لیکن میں نے دیکھا ہے کہ پچھلے کچھ عرصہ میں اس نے متعدد کھیلوں میں حصہ لیا اور انعامات بھی جیتے ہیں۔ گروپ 'اے' میں دوڑوں کے مقابلے میں وہ اوّل آیا تھا''۔

ہیڈ ماسٹر نے اتفاق کرتے ہوئے کہا، ''وہ ہر میدان میں بہترین نتائج حاصل کرنا چاہتا ہے''۔ حساب کے استاد کا کہنا تھا، ''اسے تو بحث مباحثے اور فی البدیہہ تقریریں کرنے کا جنون ہے۔ ضلعی اسکولوں کے مابین تقریری مقابلوں کی تاریخیں وہی ہیں جن دنوں حساب کے امتحانات ہونے ہیں۔ اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ اس کا امتحان کسی اور تاریخ کو لے لیا جائے

کیونکہ وہ تقریری مقابلوں میں شرکت کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی مشکل لگتا ہے کہ کھیلوں کے منتظمین امتحان کی وجہ سے اپنے پروگرام میں ردوبدل کریں۔ اگر ایسا ہوا تو کمال کھیلوں میں شرکت کے لیے امتحان چھوڑنے کو تیار ہے"۔

سوشیالوجی کے استاد سناتن پال معترض ہوئے، "لیکن سر! تقریری مقابلوں میں ضلع بھر میں پہلا انعام اسی نے جیتا تھا اس لیے اس کا حق بنتا ہے کہ وہ امتحان کے لیے کسی دوسری تاریخ کی درخواست کرے"۔

"میں مانتا ہوں کہ اس نے اسکول کے لیے بہت سے اعزازات جیتے ہیں لیکن میرا اشارہ ان کاموں میں اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپیوں کی طرف ہے۔ اگر وہ اسی طرح غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا تو پڑھائی کے لیے وقت کیسے نکالے گا؟"

فزکس کے استاد کا کہنا تھا، "میں اس کی ایک اور دلچسپی کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہوں گا اور وہ ہے مذہب۔ ایک بار میں ششماہی امتحانات کی نگرانی کر رہا تھا۔ جمعہ کا دن تھا، طلباء کو نماز کی ادائیگی کا موقع دیا جانا تھا مگر اس نے وقتِ مقررہ سے آدھ گھنٹہ پہلے پرچہ حل کر کے میرے حوالے کیا اور نماز پڑھنے مسجد کو چلا گیا"۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے پوچھا کہ اس کا پرچہ کیسا تھا۔ جواب ملا، "اس کے نمبر سب سے زیادہ تھے۔ اگر وہ کچھ اور بھی لکھتا تو اس سے بھی زیادہ نمبر حاصل کر سکتا تھا"۔

"مہربانی سے اسے سمجھانے کی کوشش کرو"۔

"اگر وہ کمرۂ امتحان میں پورا وقت دینے کی بجائے مسجد جانے کو ترجیح دیتا ہے تو پھر اسے قائل کرنا مشکل ہوگا"۔

"لیکن مجھے تو یہ پتہ چلا ہے کہ حال ہی میں اس نے نماز روزے میں دلچسپی لینا ترک کر دیا ہے۔ وہ تو اب عیدین کی نمازیں بھی پڑھنے نہیں جاتا"۔

ایک اور استاد بولے، "وہ اپنی حدود پار کر چکا ہے اس لیے اس کا زیادہ دیر ایسے چلنا مشکل ہے"۔

ساہا صاحب نے کہا، "اگرچہ اس نے نماز روزہ ترک کر دیا ہے مگر تاریخ کا مطالعہ بڑی باریک بینی سے کر رہا ہے۔ کبھی وہ شاہد خان سے ملنے جاتا ہے تو کبھی بڑے میاں سے، یعنی اس کی غیر نصابی سرگرمیاں جاری ساری ہیں"۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے مشورہ دیا کہ ایک بار اسے سمجھانا مناسب ہوگا۔ ساہا صاحب نے بتایا کہ وہ کمال کو سمجھا چکے ہیں، بہر طور وہ پھر اسے سمجھائیں گے، اور بہتر ہوگا اگر ہیڈ ماسٹر صاحب بھی ایک دفعہ اسے بلا کر بات کریں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اتفاق کیا اور یوں یہ میٹنگ ختم ہوگئی۔

....

اساتذہ کی میٹنگ ختم ہونے کے بعد کمال کو ہیڈ ماسٹر کا بلاوہ آگیا۔ اسے اس بلاوے کے مقصد کی سمجھ نہ آئی۔ اسے بلایا تو پہلے بھی جاتا تھا، کبھی کھیلوں کے سلسلہ میں، کبھی تقریری مقابلوں کے لیے، کبھی کسی اور ثقافتی تقریب کی خاطر، مگر فی الحال تو کوئی ایسا پروگرام اس کے علم میں نہیں تھا، نہ ہی اس نے کوئی قابلِ اعتراض کام کیا تھا جس کے لیے اسے بلایا جاتا۔ بہر حال وہ بے یقینی کی کیفیت میں ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔ کیمیا کے استاد وہاں کوئی گفتگو کر رہے تھے، انہوں نے اسے دیکھ کر پوچھا: "کیا تمہیں یہاں کوئی کام ہے؟" کمال کے بولنے سے قبل ہی ہیڈ ماسٹر نے بتایا کہ میں نے اسے بلایا ہے۔

"اوہ! ٹھیک ہے۔ پھر میں اپنی کلاس میں جاتا ہوں"، یہ کہہ کر استاد صاحب باہر نکل گئے۔ میز کی دوسری طرف رکھی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہیڈ ماسٹر نے کمال کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ادھر ادھر کی باتیں پوچھنے کے بعد بولے:

"تمہاری پڑھائی کیسے جارہی ہے؟ سالانہ امتحانات نزدیک ہیں، یہی دن ہیں محنت کرنے کے۔ بعد میں تم کالج چلے جاؤ گے"۔

''جی سر!''۔

''کیا خوب محنت کر رہے ہو؟''

''جی ہاں!''۔

''لیکن میں نے سنا ہے کہ تم تاریخ میں گہری دلچسپی لے رہے ہو۔اس ہفتہ تم بل چترا گئے تھے، پچھلے ہفتہ فیرار پور''۔

کمال سمجھ نہ سکا کہ ہیڈ ماسٹر کو کیسے خبر ہوئی۔ایک بار تو وہ ہتکھولہ بھی گیا تھا مگر ماسٹر صاحب نے اس کا ذکر نہیں کیا۔کیا ثریا نے بتایا تھا؟ لیکن اس نے تو خود اپنے گھر بلایا تھا۔ یا پھر جمیل یا جالی نے بتایا ہوگا لیکن انہیں تو بل چترا جانے کا علم ہی نہیں۔ پھر کون ہو سکتا ہے؟ ادھر ہیڈ ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے''میں انہیں فضول نہیں سمجھتا مگر ان میں وقت بہت صرف ہوتا ہے، یہی وقت تمہیں امتحانات کی تیاری میں لگانا چاہیے۔ یہ بات اپنے ذہن میں رکھو۔اب تم اتنے بڑے تو ہو گئے ہو کہ ان باتوں کو سمجھ سکو۔ان کاموں کو تم بعد میں بھی کر سکتے ہو مگر امتحان کے لیے موقع نہیں ملے گا۔کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''سر! میں محنت کروں گا''۔

''ہاں میں جانتا ہوں مگر تم ابھی تک نہیں سمجھ سکے ہو۔ہم بھی کبھی اسی سوچ سے گھائل ہوئے تھے۔تمہیں سمجھانا میرا فرض تھا،اب کیا کرتے ہو، یہ تمہارا کام ہے، لیکن ہم سب کو تم سے اعلیٰ کارکردگی کی امید ہے۔یہی کہنے کے لیے میں نے تمہیں بلایا تھا''۔

....

کمال ہیڈ ماسٹر صاحب کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے خیر خواہ ہیں اور انہوں نے جو کچھ کہا وہ سب ٹھیک ہے۔وہ کچھ نہ بولا! ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے کلاس میں جانے کو کہا۔کلاس میں آیا، دیکھا کہ نرمل ساہا صاحب پہلے ہی سے موجود ہیں۔وہ خاموشی سے آ کر بیٹھ گیا، اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شمیم نے سرگوشی سے پوچھا،''ہیڈ ماسٹر صاحب نے کیوں بلایا تھا؟'' کمال نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا،''بعد میں بتاؤں گا''۔

جیسے ہی کلاس ختم ہوئی اور ساہا صاحب باہر گئے تو سپنا نے بتایا کہ ہم سب وقفے میں سجیت رائے کے گھر اکٹھا ہوں گے، انہوں نے کہا تھا کہ سب کو آنا ہوگا۔جمعہ کو انہیں ایک گھنٹے کا وقفہ ہوتا تھا۔قبل ازیں وقفہ ہوتے ہی کمال جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد میں چلا جاتا مگر آج کل وہ یا تو لائبریری میں ہوتا یا کمرے میں بیٹھا کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف دکھائی دیتا۔لہٰذا اب رائے صاحب کی رہائش گاہ میں جانے کی کوئی حرج نہیں۔وہاں جا کر دیکھا تو بہت سے ہم جماعتوں کو پہلے ہی سے بیٹھے پایا جن میں سپنا بھی تھی۔اسے وہاں دیکھ کر کمال حیران رہ گیا کہ وہ کیسے آ گئی ہے کیونکہ اس کا باپ امیر آدمی اور کانگرسی نیتا تھا۔کیمونسٹ پارٹی (مارکسسٹ) کا دعویٰ تھا کہ کانگرس امیروں کی جماعت ہے جبکہ سپنا کیمونسٹ پارٹی کے طلباء ونگ کی سرکردہ رکن تھی۔یہ کیسے ممکن ہے؟ کمال بڑا متجسس تھا۔

پہلے تو سپنا نے ایک مختصر تقریر کی، پھر رائے صاحب بولنے لگے۔کمال بس اتنا ہی سمجھ پایا کہ رائے صاحب کی تقریر میں امریکہ کی پشت پناہی پر اسرائیل کی مسجدِ اقصیٰ پر بمباری کا ذکر ہو رہا تھا۔اس ظالمانہ کارروائی پر احتجاج کرتے ہوئے تمام اسکول بند کرنے کا فیصلہ ہوا۔رائے صاحب طلباء سے یقین دہانی چاہتے تھے کہ ان کا اسکول بھی نہ کھلے۔گیارھویں جماعت کا طالب علم تپن بھی وہاں موجود تھا۔اس نے سوال کیا،''سر! اسکول بند کرنے سے اسرائیل کا کیا نقصان ہوگا، نقصان ہوگا تو ہمارا''۔

رائے صاحب نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا،''ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس بربریت کو ہماری تائید حاصل نہیں''۔

''اس سے امریکہ اور اسرائیل پر کوئی اثر نہیں ہوگا، اس کے برعکس ہماری پڑھائی کا حرج ہوگا۔ہمارا سلیبس مکمل نہیں ہوگا اور نتیجہ بھی اچھا نہیں آئے گا''۔

رائے صاحب نے سپنا کی طرف دیکھا تو اس نے کہا،" یہ ہمارا آدمی ہے، ہمارے ہر اجلاس میں شامل ہوتا ہے"۔

تپن نے وضاحت کی،" گاؤں میں کمیونسٹ پارٹی برگداروں کے تعاون سے زمینداروں کے خلاف کام کر رہی ہے۔ میرا باپ بھی ایک برگدار ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں ایسی تمام میٹنگز میں شرکت کرتا ہوں اس کے باوجود میں اسکول بند کرنے کی تائید نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے غلط کار پر کوئی اثر نہیں ہوگا"۔

" پھر تمہاری رائے کیا ہے؟"

" اسکول میں وقفے کے دوران ایک اجلاس منعقد کر کے احتجاجی مراسلہ بھیجا جائے۔ اسکول کی بلا وجہ بندش کسی طور بھی مناسب نہیں"۔

اگرچہ رائے صاحب کو یہ تجویز پسند نہیں آئی مگر انہوں نے اسے رد بھی نہ کیا۔ تپن کے جانے کے بعد اسمبلی کے رکن عبدالعلی آگئے۔ رائے صاحب کے کہنے پر سپنا نے علی صاحب کو تپن کی مخالفت کا بتایا جس پر وہ کہنے لگے،" تپن اس قسم لڑکا نہیں ہے یقیناً کسی نے اسے پٹی پڑھائی ہوگی۔ کون ہے وہ شخص؟ ہمیں دیکھنا ہوگا"۔

کمال کو اس کا رویہ پسند نہ آیا۔ تپن نے تو ایک تجویز دی تھی اور کسی نے بھی اشارۃً تک نہیں بتایا تھا کہ اس میں خامی کیا ہے مگر یہ لوگ سوچ رہے ہیں کہ اس نے کسی کی شہہ پر مخالفت کی ہے۔ کمال سپنا کو بتا کر اسکول کو چل دیا۔ مین گیٹ پر اس کی ملاقات تپن سے ہوگئی۔ اس نے اپنی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

" یہ کیا بات کہ بمباری کہیں اور ہوئی ہے، کسی اور نے کی ہے اور ہم اپنی کلاسیں ختم کر دیں۔ کیا یہ معنی خیز بات ہے؟"

کمال نے جواب دیا،" مگر طلباء کو علم ہونا چاہیے۔ باشعور طلباء اس قسم کے وحشیانہ اقدام کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں"۔

تپن نے ناراض ہو کر کہا،" باشعور؟ نظر انداز؟ کلاسیں ختم ہونے سے کس کا نقصان ہے؟ اپنے باشعور اساتذہ سے کہو ہمیں چھٹی والے دن پڑھائیں۔ تمہیں ثبوت مل جائے گا کہ وہ کتنے باشعور ہیں"۔

" لیکن اسکول کی بندش کا فیصلہ اساتذہ کا نہیں، طلباء کا ہے"۔

" طلباء کا؟ کون سے طلباء کا؟ فیصلہ تو رائے صاحب اور علی صاحب جیسوں کا ہے"۔

" فیصلہ یہاں یا کلکتہ میں نہیں ہوا بلکہ طلباء کے لیڈروں نے کیا ہے"، کمال نے کہا۔

" کیا تمہیں پتہ ہے طلباء کے لیڈر کون ہیں؟ ان میں سے کوئی بھی طالب علم نہیں بلکہ وہ کبھی طالب علم رہے ہی نہیں۔ کچھ لوگ برسوں پہلے پڑھتے تھے مگر اب یا تو وہ کہیں ملازمت کر رہے ہیں یا سیاست کو منافع بخش پیشہ بنا کر نیتا بنے بیٹھے ہیں"۔

" کیا مطلب؟"

" میں تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں۔ آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے مت چلو۔ کھلے دماغ سے دیکھو تو سب کچھ سمجھ جاؤ گے"۔ تپن نے اپنی راہ لی اور کمال اپنی کلاس میں آ گیا۔ کانگرس کے سٹوڈنٹ ونگ چتر پرشاد کے ایک لڑکے رمیز نے اس کے پاس آ کر پوچھا،" کیا تم کل کی ہڑتال کے حامی ہو؟ ہماری کوشش ہوگی کہ اس اقدام کی مخالفت کر کے اسکول کھولے رکھیں۔ اساتذہ آئیں اور ہم پڑھیں"۔

" مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہو؟"

" کیونکہ تم اقدار کی باتیں کرتے ہو۔ یہ ہم کل دیکھیں گے کہ تم کن قدروں کی بات کرتے ہو"۔

کمال کے جواب دینے سے پہلے ان کا استاد کمرے میں داخل ہوا، اور رمیز وہاں سے چل دیا۔

....

ہائر سیکنڈری کے سالانہ امتحانات نزدیک تھے۔ کمال کے اساتذہ کو اس سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ وہ خود بھی خواہشمند تھا یہی وجہ ہے کہ پڑھائی پر اس کی توجہ بہت زیادہ تھی۔ ہیڈ ماسٹر کی باتیں سننے کے بعد اس نے اپنی غیر نصابی سرگرمیاں کم کر دی تھیں مگر اس کے باوجود شاہد خان سے ملنے کا متمنی تھا۔ گزشتہ روز کھانے کے وقفے میں وہ ثریا سے ملا تو وہ بتانے لگی کہ دادا ابو اس کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔

''میں آؤں گا۔ خان صاحب ٹھیک ہیں؟''

''ہاں ٹھیک ہیں۔ تم کب آؤ گے؟''

کمال نے چند لمحے سوچ کر پوچھا، ''کیا وہ کل گھر پر ہی ہوں گے؟''

''ہاں بالکل''، ثریا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''انہیں پتہ چلا کہ تم آ رہے ہو تو ان کا کوئی پروگرام ہوا بھی تو ختم کر دیں گے''۔

''اچھا، میں کل آؤں گا''۔

''کس وقت؟''

چونکہ وہ خان صاحب سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا اس لیے جلدی آنے کا وعدہ کیا۔ ثریا خوش ہو کر بولی۔ ''میں انہیں بتا دوں گی''۔

اگلے روز وہ صبح آٹھ بجے پہنچا تو ثریا کو اپنا منتظر پایا جو اسے دادا ابو کے پاس لے گئی۔ وہ بھی اس کا انتظار کر رہے تھے، ''بہت دنوں بعد آئے ہو۔ کیا ہو رہا تھا؟ پڑھائی؟''

کمال خاموش رہا۔ خان صاحب نے کہا، ''شرم کس بات کی؟ فائنل امتحان ہیں اس لیے ڈٹ کر محنت ہو رہی ہوگی۔ اچھا بیٹھو''۔ وہ پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا، ثریا اس کے پہلو میں جا بیٹھی۔ کمال نے بات شروع کی، ''آج آپ کی سیاسی زندگی کے بارے میں بات ہو جائے''۔

''سیاسی زندگی؟''، خان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا، ''ہاں وہ بھی ایک زندگی ہے''۔

''اس روز آپ نے متعدد واقعات کا حوالہ دیا تھا۔ آج کچھ بتا دیجیے''۔

''اب آپ کی باتیں شروع ہو جائیں گی۔ میں تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گی''، یہ کہتے ہوئے ثریا کھڑی ہو گئی۔ خان صاحب معترض ہوئے، ''تم کہاں جا رہی ہو؟ یہیں بیٹھو''۔

''مجھے کانگرس اور کیمونسٹوں کے اسکینڈلوں سے کوئی دلچسپی نہیں''۔

''اچھا بتاؤ، تمہیں کیا پسند ہے، ہم اسی پر بات کر لیں گے''۔

''مجھے حساب کے کچھ سوالات حل کرنے ہیں۔ اگر مجھے کوئی مشکل ہوئی تو میں کمال سے مدد لوں گی۔ حساب کا کام مکمل کرنے کے بعد واپس آ جاؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت تک آپ کے سیاسی اسکینڈل بھی ختم ہو چکے ہوں گے''، یہ کہہ کر ثریا باہر چلی گئی۔

''ہاں، اب بتائیں آپ نے کانگرس میں کیوں شمولیت کی تھی؟''، کمال نے سوال کیا۔

شاہد صاحب گویا ہوئے، ''تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں اپنے بھائی کے قاتل حکمرانوں کے سخت خلاف تھا۔ دہشت گرد گروہ میں جانے کا مقصد انتقام لینا تھا۔ ضرورت سے زیادہ مذہبی تعلیمات اور راسخ العقیدگی نے مجھے اس گروہ میں نہ رہنے دیا۔ گاندھی کی عدمِ تعاون تحریک نے مجھے بدیشی حکمرانوں کے خلاف کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔ دوسروں کے ساتھ میں نے بھی

کالج چھوڑا اور تحریک میں شمولیت اختیار کر لی''۔

''تحریک کے کاموں کی نوعیت کیا تھی''۔

''ہمارا کام تھا جلسے جلوسوں کا انتظام کرنا۔ ہم نے لوگوں کو قائل کرنا شروع کیا کہ وہ بدیشی چیزوں کا بائیکاٹ کر کے ملکی اشیاء خریدیں۔ ہم نے غیر ملکی چیزیں فروخت کرنے والی دکانوں کے سامنے احتجاج کئے''۔

''آپ کس قسم کے نعرے لگاتے تھے؟''

''موقع محل کے لحاظ سے جو بھی مناسب ہوا، لیکن کچھ نعرے ملتے جلتے تھے''۔

''وہ کس قسم کے نعرے تھے؟''

بندے ماترم، اللہ اکبر، خدا کا پیارا محمد علی، شکشت دھرم مہاتما گاندھی''۔

کمال توجہ سے سن رہا تھا، پوچھنے لگا، ''کیا تمام شرکاء یہی سارے نعرے لگاتے تھے؟''

''تم یہ ساری باتیں کیوں جاننا چاہتے ہو؟ ایسے سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اللہ اکبر کے نعروں میں ہندوؤں کو دلچسپی کیا ہو سکتی تھی، اور وہ مسلمان جنہوں نے آنند مٹھ پڑھی ہو گی وہ کیوں بندے ماترم کے نعرے لگاتے؟''

''بڑے کام کا نکتہ اٹھایا ہے تم نے۔ تحریک چوں چوں کا مربہ تھی اسی لیے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے''۔

''کیا مطلب؟''

''تمہیں علم ہی ہے کہ گاندھی کی عدم تعاون تحریک کا ایجنڈا کیا تھا: یعنی خلافت کا تحفظ، پنجاب میں قتلِ عام کے خلاف احتجاج اور ہندوستان میں سوراج۔ ہندوؤں کو خلافت سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی اور ادھر مسلمانوں کی تمام تر ہمدردیاں خلافت کے ساتھ تھیں لہٰذا اِن کے نزدیک سوراج کا مطالبہ غیر اہم تھا۔ اس لیے حتمی نتیجہ تسلی بخش نہیں نکلا، لیکن ایک بات ہے، تحریک کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لیے سنسنی خیزی ضرور آ گئی تھی''۔

''لیکن بہت سے کانگرسی رہنماؤں نے اس کی مخالفت کی تھی''۔

''صحیح ہے، لیکن گاندھی اس وقت تک کانگرس کا اعلیٰ ترین نیتا بن چکا تھا، اس کی مخالفت بے سود ثابت ہوئی۔ اس کی عدمِ تعاون تجویز پر غور کرنے کے لیے چار ستمبر 1920 کو کلکتہ میں کانگرس کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ چترنجن داس، بپن چندر پال، محمد علی جناح، مدن موہن مالویہ جیسے رہنماؤں نے تجویز کی مخالفت کی اس کے باوجود اسے قبول کر لیا گیا''۔

''محمد علی جناح مسلم لیگ میں جبکہ مدن موہن مالویہ ہندو مہا سبھا میں تھے پھر انہوں نے کانگرس کے اجلاس میں کیسے شرکت کی؟''

''یہ کانگرس کی ایک اور کمزوری تھی۔ اس وقت اس کی حیثیت چھتر سایہ تنظیم جیسی تھی، ہر کوئی اس میں شرکت کرنے کا اہل تھا۔ مسلم لیگ یا ہندو مہا سبھا کے رکن ہوتے ہوئے بھی لوگ کانگرس میں شامل ہو سکتے تھے۔ جناح تو اس وقت کانگرس ہی کا رکن تھا۔ ناگپور میں منعقدہ کانگرس کے سالانہ اجلاس میں اس نے عدم تعاون تحریک کی مخالفت کی لیکن اس کی بات نہ مانی گئی جس پر اس نے اپنی سبکی محسوس کرتے ہوئے کانگرس سے قطع تعلق کر لیا۔ پنڈت مالویہ مزید کچھ عرصہ کانگرس میں رہا۔ جب اس کے پلیٹ فارم سے عدمِ تعاون کا اعلان کیا گیا تو بہت سے لوگ اس کے ساتھ مل گئے۔ کے، این کالج کے متعدد طلباء نے کالج چھوڑا اور ان کی طرح مجھو بن پور کے کئی لوگوں نے تحریک میں شمولیت اختیار کی''۔

''کالج چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے تعلیم ختم کر دی''۔

''نہیں، طلباء کو تعلیم دینے کی خاطر نیشنل اسکول کھولے گئے جہاں انہیں قوم پرستی کے نظریہ پر مبنی تعلیم دی جاتی تھی''۔

''کیا آپ بھی داخل ہوئے تھے؟''

''ہاں! پڑھا بھی اور پڑھایا بھی''۔

''وہ کیسے؟''

''ہم میں سے جنہوں نے اسکول کی تعلیم ختم کی وہ اسکول ہی میں پڑھاتے جبکہ کالج کے فارغ التحصیل طلباء ہمیں تعلیم دیتے تھے''۔

اس انتظام سے کمال بہت متاثر ہوا۔ اس نے پوچھا ''اس کے بعد کیا ہوتا رہا؟''

''تحریک نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ 17 ستمبر 1921 کو برطانوی شہزادے کی بمبئی آمد کے موقع پر پورے ملک میں ہڑتال ہوئی۔ کانگریس نے قانون شکنی کا اعلان کیا جس پر حکومت نے چترنجن، آزاد اور سبھاش چندر بوس کو گرفتار کر لیا۔ ادھر ہمارا حوصلہ بھی بڑھا لیکن پانچ فروری 1922 کو چوری چورا سانحہ کی وجہ سے گاندھی نے یہ کہتے ہوئے تحریک کے اختتام کا اعلان کر دیا کہ اب یہ پُرتشدد ہوگئی ہے۔ اس کے بعد اس نے چرخے اور وطن پرستانہ تعلیم پر زور دیا''۔

''اس وقت آپ نے کیا کیا؟''

''ہم تقریباً بے روزگار تھے۔ جب تک تحریک جاری رہی، ہم مصروف رہے۔ اس کے ختم ہوتے ہی نیشنل اسکولوں کی تعداد کم ہونا شروع ہوگئی لیکن سوراجیہ تحریک شروع ہوتے ہی پھر سے فعال ہوگئے''۔

کمال نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ رہائی کے بعد چترنجن داس، موتی لال نہرو اور چند دیگر رہنماؤں نے مل کر سوراجیہ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ داس اس کا صدر اور نہرو سیکرٹری مقرر ہوئے۔ سوراجیہ پارٹی نے 1923 کے انتخابات میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی لیکن اس نے حکومت سازی میں حصہ نہ لیا۔ اس پس منظر میں کمال نے سوال کیا، ''کیا آپ نے سوراجیہ دل میں شمولیت کی؟''

''صرف میں ہی نہیں بلکہ بنگال کانگرس کے کم وبیش تمام رہنما مثلاً، جیتندر موہن سین گپتا، سبھاش چندر بوس وغیرہ سوراجیہ پارٹی میں چلے گئے۔ تمام جماعتوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے چترنجن داس نے مسلمان رہنماؤں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو معاہدۂ بنگال کے نام سے مشہور ہے''۔

کمال نے معاہدۂ بنگال کے بارے میں پڑھ رکھا تھا اور یہ بھی کہ چترنجن داس کے دیہانت کے بعد ہندو نیتاؤں نے بڑی جلد بازی میں معاہدہ ختم کر دیا، مگر اس معاہدے کے مندرجات کا اسے علم نہیں تھا۔ اس لیے اس نے شاہد صاحب سے سوال کیا کہ اس میں تھا کیا؟ انہوں نے وضاحت سے بتایا:

''معاہدہ میں یہ طے پایا تھا کہ اس کا نفاذ حقِ خود اختیاری کے حصول کے بعد ہوگا، جداگانہ حلقۂ انتخاب کے اصول کی بنیاد پر ہندو مسلمان آبادی کے تناسب سے ان کے اراکین کی تعداد کا تعین ہوگا، مقامی حکومتوں میں اکثریتی آبادی کو ساٹھ فیصد اور باقیوں کو چالیس فیصد نشستیں ملیں گی، سرکاری ملازمتوں کا پچپن فی صد مسلمانوں کے لیے مخصوص ہوگا، اور جب تک مسلمان اپنے کوٹے کے مطابق نوکریاں حاصل نہیں کر لیتے، 80 فیصد ملازمتیں ان کے لیے مخصوص رکھی جائیں گی۔ کسی بھی مذہبی فرقہ سے متعلق بل کو اسی فرقہ کے دو تہائی اراکین کی حمایت درکار ہوگی۔ مساجد کے سامنے سے گزرنے والے جلوسوں میں موسیقی کی ممانعت ہوگی۔ مذہبی قربانیوں کے لیے گاؤ کو ذبح کرنے کی اجازت ہوگی''۔

یہ شرائط سننے کے بعد کمال نے استفسار کیا، ''کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ معاہدۂ بنگال کے تحت مسلمانوں کو بہت زیادہ

مراعات دی گئی تھیں؟''

''بلاشبہ، اور بالخصوص 80 فیصد ملازمتوں کی شق ہندوؤں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی۔ جب تک چترنجن زندہ تھے اس معاہدہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کی ہمت کسی میں نہیں ہوئی لیکن اس کے دیہانت کے بعد تو ہندو رہنماؤں نے اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا''۔

''کانگرسی رہنماؤں کے رویّے سے آپ کو مایوسی تو بہت ہوئی ہوگی؟''

''صرف مایوسی نہیں اور بھی متعدد واقعات ہوئے تھے، مثلاً فوری بعد گورنر کی Executive Council کے فنانس ممبر پربھاش چندر مترا کا پیش کردہ انتہائی اہم بنگال مزارعین (ترمیمی) بل تھا۔ تقریباً تمام ہندو اراکین نے اس کی حمایت کی جبکہ سوائے چار باقی سب مسلمان اراکین اس کے مخالف تھے۔ اس نے دونوں فرقوں کے مابین خلیج کو گویا مکمل کر دیا، مگر اس قسم کا واقعہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔

''ہوا یہ تھا کہ 1926 کے انتخابات میں بھوبن پور سے برج بھوشن گپتا کانگرس کا امیدوار اور قاسم بازار کا مہاراج کمار شری سریش چندر نندی اس کا طاقتور حریف تھا۔ ہم برج بھوشن کی کامیابی کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ ایک دن کانگرس رہنما بپن چندر پال بھوبن پور میں انتخابی مہم کے لیے آیا۔ کیا تم گمان کر سکتے ہو کہ وہ ہمارے امیدوار کے لیے نہیں، جو کانگرس ہی کا امیدوار تھا، بلکہ حریف، یعنی نندی کے لیے آیا تھا؟ کیا ان کو گولی نہیں مار دینی چاہیے تھی؟''

خان صاحب جذباتی ہو گئے مگر کمال نے انہیں ٹھنڈا کیا، ''کانگرسی قیادت کے پاس مہاراج کمار کی حمایت کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی''۔

شاہد خان کی برہمی ابھی تک قائم تھی۔ ''میں جانتا ہوں کہ بس ایک ہی وجہ تھی۔ مہاراج کمار اور اس کا باپ مہندر چندر نندی دونوں ہندو مہاسبھا کے تاحیات مربّی تھے''۔

''آپ کو کیسے پتہ ہے؟''

''ان کی کارروائیاں ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔ 1915 میں گیا میں منعقدہ پہلی ہندو مہاسبھا کانفرنس کی صدارت باپ نے کی تھی اور 36-1935 میں بردوان میں ہونے والی صوبائی ہندو مہاسبھا کانفرنس، 1943 میں امرتسر کی کل ہند مہاسبھا کانفرنس، اور 1945 بھوبن پور میں ہونے والی ضلعی کانفرنس بیٹے کی صدارت میں ہوئی تھیں''۔

''کوئی اور وجہ بھی تھی؟''

خان صاحب ابھی تک جذباتی تھے، بولے، ''جب 1931 میں بھوبن پور کا مولوی عبدالصمد جداگانہ انتخابات کی منسوخی کے حق میں بول رہا تھا، سریش چندر جداگانہ انتخاب کا کٹر حمایتی تھا''۔

''وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟''

صاف سی بات ہے۔ وہ ہندو مہاسبھا کا رہنما اور علاقائی سیاست میں مصروف تھا۔ ضلع میں مسلمانوں کی اکثریت تھی جو ظاہر ہے اسے ووٹ نہ دیتے اس لیے مخلوط انتخابات میں اس کی کامیابی ممکن نہ تھی جبکہ جداگانہ انتخابات میں اسے ہندوؤں کے ووٹ مل جاتے اس لیے وہ جداگانہ انتخابات کا حمایتی تھا''۔

''پھر آپ نے کیا کیا؟''

''ہمارے شدید احتجاج پر جلسہ منسوخ ہو گیا''۔

''پھر؟''

''وہی ہوا جو متوقع تھا۔ پولیس نے ہمیں گرفتار کرلیا۔ انتخابات بڑے پرامن ہوئے مگر ہم دو ہزار ووٹوں سے ہار گئے۔ اگر ووٹنگ منصفانہ ہوتی تو ہمیں کوئی گلہ نہیں تھا لیکن کانگرس قیادت کی غداری کے سبب ہم شکست کھا گئے۔ اس صورتِ حال میں میرا کانگرس میں رہنے کا کیا جواز تھا؟''

''پال صاحب تو کہتے ہیں کہ آپ کانگرس کے سرگرم رکن تھے اور اس کے لیے ان تھک محنت کی تھی جس کے صلے میں آپ ضلعی کانگرس کے صدر یا سیکرٹری بننے کے خواہاں تھے، اور جب قیادت نے آپ کی خواہش پوری نہ کی تو آپ الگ ہو گئے''۔

''میں اس الزام کو مکمل طور پر نہیں جھٹلاتا، لیکن یہ غلط ہے کہ میں نے ضلع میں پارٹی عہدہ نہ ملنے کے سبب کانگرس سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ سارے ہندوؤں کا زمینداروں کی حمایت میں ووٹ دینے کا مطلب تھا کہ کانگرس میں رہ کر ہم اپنے نصب العین کو حاصل نہیں کرسکتے۔ اکرم خان، نوشیر علی اور فضل الحق وغیرہ اور ہم نے قطع تعلق کا فیصلہ کرلیا''۔

''آپ ابھی تک علیحدہ ہیں۔ کانگرس میں دوبارہ کب شامل ہوں گے؟'' ثریا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

''خان صاحب نے شگفتہ مزاجی سے جواب دیا، ''ہم تمہارے بغیر کیسے شامل ہوسکتے ہیں؟ کیا کررہی ہو؟''

''کچھ سوال مجھ سے حل نہیں ہو رہے، کمال کی مدد درکار ہے''۔

''ٹھیک ہے مگر تمہیں اس کے لیے فضول سے بہانے کی ضرورت نہیں تھی۔ لے جاؤ اسے اپنے ساتھ''۔

کمال کو خجالت محسوس ہوئی۔ کہنے لگا، ''ابھی ہماری بات پوری نہیں ہوئی۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کرشک پرجا سے مسلم لیگ میں جانا کیسے ہوا؟''

''پہلے ثریا کی مدد کرو، پھر ادھر آنا۔ میں منتظر ہوں۔ مجھے تو اس بلا کی آنکھوں سے ڈر لگ رہا ہے''، شاہد خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوں! دادا ابو!''۔

''جاؤ، میری بچی!''

وہ کمال کے ساتھ باہر چلی گئی۔

....

ثریا کے کمرے کی سجاوٹ میں سادگی اور حسن کا امتزاج قابلِ تحسین تھا۔ دروازے اور کھڑکیوں پر سفید پردے لٹک رہے تھے۔ کھڑکی کے پاس رکھے پلنگ پر سفید چادر بچھی تھی اور اس کی ساتھ مطالعہ کی میز پر بھی سفید کپڑا تھا۔ ایک جانب دودھیا شیشے لگے ہوئے الماری تھی جس میں ترتیب سے کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ چند کتابیں، کاپیاں، قلم اور سفید پھولوں سے سجا ہوا گلدان میز پر موجود تھے۔ دوسری طرف کپڑے لٹکانے کا اسٹینڈ تھا جس پر ساڑھی، شلوار قمیص اور گلوبند لٹک رہے تھے۔ ذرا پرے کر کے ایک مقفل صندوق تھا۔ غالباً اس میں زیورات وغیرہ رکھے ہوں گے، کمال نے گمان کیا۔ سوائے ایک ہلکی سی زنجیر کے ثریا نے کوئی قیمتی زیور نہیں پہن رکھا تھا۔ کمال کو علم نہیں تھا کہ زنجیر سونے کی تھی یا کسی اور دھات کی۔ ثریا اس وقت سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز میں ملبوس تھی۔ پلنگ کی پائنتی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کمال کو کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس، سفید پلنگ پر بیٹھی ثریا پریوں کی کہانی کی شہزادی دکھائی دے رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ وہ سونے کی طلسماتی چھڑی لگتے ہی جاگ جائے گی۔ کمال نے اس سے قبل اسے اس روپ میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اب تک کسی لڑکی کے کمرے میں گیا ہی نہیں تھا، اسے اپنے کمرے میں لے جانے والی ثریا پہلی لڑکی تھی۔ کمال نے خیالوں کی دنیا سے باہر نکلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کس سوال میں تمہیں مشکل پیش آرہی ہے؟''

''بہت سے سوالات میں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ اعداد کو کسی خاص عدد سے تقسیم کرنے کو کہا گیا ہے۔ مثلاً یہ سوال: پانچ اور چھ پر تقسیم ہونے والا چار ہندسوں والا چھوٹے سے چھوٹا عدد کون سا ہے۔ پھر یہ سوال: چار اور پانچ پر تقسیم ہونے والا چار ہندسوں والا بڑے سے بڑا عدد۔ ایسے سوالوں کو حل کرنے کا فارمولا کیا ہے؟''

''کیا تمہیں چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے ہندسے کا پتہ ہے؟''، کمال نے پوچھا۔

''ہاں معلوم ہے''۔

''ایک عدد کا کم سے کم ہندسہ کیا ہے؟''

''ایک''۔

''اور چار اعداد کا ہندسہ؟''

''1000''

''1111 کیوں نہیں؟''

''کیونکہ 1111 ہزار سے بڑا ہے''۔

''پھر 0000 کیوں چھوٹا نہیں ہے؟''

''0 اور 0000 میں کوئی فرق نہیں''۔

''اچھا یہ بتاؤ اگر تم 1000 میں سے ایک نفی کر دو تو باقی کیا رہے گا؟''

''999''۔

''کیا یہ چار اعداد پر مشتمل ہے؟''

''نہیں، تین اعداد ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کم سے کم عدد معلوم کرنے کے لیے ہمیں اس میں کچھ جمع کرنا ہوگا''۔

''اور زیادہ سے زیادہ عدد معلوم کرنے کے لیے کچھ منہا کرنا ہوگا۔ اب علم ہو گیا ہوگا کہ کیا منہا اور کیا جمع کرنا ہے۔

کمال کے سمجھانے کے بعد ثریا بولی، ''سمجھ میں آ گیا ہے''۔ اس کے چہرے پر رونق آ گئی، ''کیا تم مجھے بعد میں بھی حساب کے سوال سمجھا دیا کرو گے؟''

''ہاں، بالکل۔ آج کے لیے تم سمجھ گئی ہو نا؟''

ثریا نے اثبات میں سر ہلایا، کمال بولا، ''اب مجھے ایک گیت سنا دو''۔

وہ بیک وقت خوش بھی ہوئی اور پریشان بھی۔ ''اچھی بات ہے کہ تم مجھ سے گیت سننا چاہتے ہو مگر میں اچھی گائیکہ نہیں ہوں''۔

''وہی گیت سنا دو جو تم نے اسکول کی تقریب انعامات میں سنایا تھا''۔

''تم نے سنا تھا؟ مگر اس وقت میرے پاس ہارمونیم نہیں ہے''۔

''گانے کے لیے ہارمونیم لازمی نہیں۔ مجھے بغیر موسیقی گیت سننا اچھا لگتا ہے۔ چلو! اب سناؤ''۔

ثریا شرما گئی مگر خاموش رہی۔ کمال نے اسے پھر سے گانے کو کہا۔ وہ رابندر ناتھ ٹیگور کا مشہور گیت دھیمے سروں میں گانے لگی، ''تم میرے دل کی تمنا ہو.......''۔ کمال مبہوت ہو کر سنتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس سے ان دونوں کے سوا کچھ نہیں۔ وہ گاتی رہی۔ اس کے آواز کی نغمگی پردوں سے، پلنگ سے ہر چیز سے جھلک اور چھلک رہی تھی، اس کی اپنی ہی دنیا تھی،

اس نے گیت ختم کیا تو وہ بولا، ''شاندار!''۔اب ثریا نے اس سے درخواست کی، ''اب تمہاری باری''۔

''اگر میں بغیر ساز کے گا سکتا تو دنیا کا مسرور ترین شخص ہوتا''۔

''کیا تمہیں گیت گانا اچھا لگتا ہے؟''

''بہت زیادہ''۔

''کیا تم شاعری بھی کرتے ہو؟''

''ہاں، کبھی کبھار''۔

''پھر اپنی شاعری سناؤ''۔

''اس وقت مجھے یاد نہیں''۔

''کوئی بات نہیں۔ کسی نظم کا چھوٹا سا ٹکڑا ہی سنا دو''۔

''کافی کوشش کے بعد ہی کوئی نظم کہی جا سکتی ہے۔ میں اتنا اچھا شاعر نہیں کہ جب چاہوں، شاعری کر لوں۔ ہاں البتہ کہانی لکھ سکتا ہوں، بالکل ایسے ہی جیسا میں کوئی مضمون آسانی سے لکھ پاتا ہوں''۔

''یہ بڑی شاندار بات ہے۔ میرے لیے تو مضمون لکھنا بڑا مشکل ہے''۔

کمال کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ہین کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ایک نظر کمال کو دیکھا۔ پھر ثریا کو دیکھ کر کہنے لگا، ''جو شانا دیدی! آپ کو امی بلا رہی ہیں''۔ اس نے چند ثانیے پھر کمال کو دیکھا اور بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ ثریا نے کہا، ''پلیز! میرا انتظار کرو، میں ابھی آئی''، اور کمرے سے چلی گئی۔

کمال کو اپنا بیٹھنا گراں گزرا۔ وہ خود سے سوال کرنے لگا، ماں نے کیوں بلایا ہے؟ کیا انہیں میرا یہاں آنا اور ثریا کا گیت گانا برا لگا ہے؟ مگر ثریا جلد ہی واپس آ گئی اور کہنے لگی، ''ہاتھ منہ دھو لو، امی کہتی ہیں کہ کھانا ہمارے ساتھ ہی کھاؤ''۔ کمال نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا، ''مجھے اب واپس جانا ہے''۔

''پھر شام کو آنا''۔

''شام کو مجھے مطالعہ کرنا ہے۔ اگر میں اس وقت واپس نہ گیا تو پڑھنے کا پروگرام گڑبڑ ہو جائے گا''۔

''ٹھیک ہے۔ سالانہ امتحان نزدیک ہیں، میں تمہارا پروگرام خراب نہیں کرنا چاہتی''۔

''اب اجازت؟ میں پھر آؤں گا''۔

وہ دونوں کمرے سے باہر مین گیٹ تک آئے۔ کمال نے اجازت لی اور سائیکل پر سوار چل پڑا۔ ثریا وہاں کھڑی رہی۔

....

دوپہر کے وقت کمال حساب کے سوالات حل کر رہا تھا۔ اگلے روز ہونے والی مشقیں بھی سمجھ لی تھیں۔ اس نے حساب کی کتاب بند کی اور بیالوجی کی کتاب کھولی۔ اگلی پریکٹیکل کلاس میں استاد نے لال بیگ کا پیٹ چاک کر کے انہیں اس کے بنیادی عناصر کے بارے میں بتانا تھا۔ پہلی ہی تصویر نے اس کے دل پر کراہت آمیز منفی اثر کیا۔ کیا وہ اپنے ہاتھوں سے اس کی چیر پھاڑ کرے گا؟ بیالوجی پڑھنے سے اس کی حساسیت مزید منفی ہو گئی۔

اس نے پڑھ رکھا تھا کہ علم طب سیکھنے کے دوران مردہ جسم کو کھول کر دیکھا جاتا ہے، اور ڈاکٹر بننے کے بعد ساری زندگی بیماریوں ہی کا علاج کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ایک لال بیگ پر نشتر زنی کرنا اسے بالکل پسند نہ آیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ طب

کی بجائے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرے گا۔اس کے لیے اسے حساب، طبیعیات اور کیمیا میں محنت کرنا ہوگی۔ان دنوں اس کی کلاس میں حرارت کے بارے میں پڑھایا جارہا تھا۔اس نے طبیعیات کی کتاب کھولی مگر پڑھنے کو جی نہ چاہا۔باہر دیکھا، شام ہو چلی تھی۔اس نے کتابیں سمیٹیں اور باہر نکل گیا۔اب وہ رات ہی کو پڑھے گا۔

وہ کچی سڑک پر چل رہا تھا۔مختلف سڑکیں آگے جا کر ایک دوسرے سے مل جاتی تھیں۔وہ مشرق کی جانب چل پڑا۔آگے ایک جنگل تھا، آبادی سے دور، چند تالابوں اور گھنے درختوں سے بھرا ہوا جنگل، بہت بڑا جنگل۔شمال سے آنے والی ایک سڑک جنگل کے مغربی حصے سے مل کر اس کے گاؤں کو تقریباً دو مساوی حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ان کے گاؤں کا شمالی حصہ سڑک کے دونوں طرف آباد تھا۔اس جگہ سے گاؤں کے تینوں یعنی شمالی، مشرقی اور مغربی حصوں کا فاصلہ ایک جتنا تھا۔نزدیک ہی چند گھنے درخت تھے۔یہیں کسی شریفہ کے درخت پر ایک نئی نویلی دلہن نے پھندا لگا کر خودکشی کی تھی اسی لیے اس حصہ کو ''پھندا جنگل'' کہا جاتا تھا۔لوگوں کا یقین تھا کہ لڑکی کی لاش بھوت بن کر جنگل میں پھرتی رہتی ہے، صرف وہ ہی نہیں، وہاں اور بھی کئی بھوت پریت بستے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد کوئی شخص اس جنگل میں آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔جنگل میں بہت سے وحشی درندے بھی تھے، ایک بار تو لوگوں نے شیروں کو دیکھا بھی تھا۔اگرچہ اب شیر تو نہیں مگر چیتے، گیدڑ اور جنگلی بلیاں ضرور موجود تھیں۔اب تھوڑی ہی دیر میں گیدڑوں کے غول چیختے چلاتے سنائی دیں گے۔

کمال اس دلدل کے پاس جا بیٹھا جہاں دونوں سڑکیں مل رہی تھیں۔دلدلی حصہ کے پار، کھجور کے پیڑوں کے پیچھے، مغربی افق پر تھکا ماندہ سورج آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا۔سفید سارسوں کا جھنڈ جنگل میں رین بسیرے کے لیے لوٹ رہا تھا۔دلدل کے پایاب پانی میں مچھلیاں تیر رہی تھیں۔کنارے پر ایستادہ درختوں کے سایے پانی پر منعکس تھے، اور ساتھ ہی کمال کے ذہن میں کچھ چہرے فروزاں ہو گئے۔ثریا کا چہرہ، اور پھر فوراً بعد سپنا کی صورت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔

کمال سپنا کو بہت پسند کرتا تھا، اس سے بار بار ملنا چاہتا تھا۔اس کی رہائش قریبی گاؤں ہتھکولا میں تھی لیکن وہ وہاں جانے میں اتنا آزاد نہیں تھا۔انیا کا گھر سپنا کے گھر سے قریب تھا جس کا باپ ایک قریبی اسکول میں استاد تھا اور اسے کمال سے بڑی انسیت تھی۔انیا سے ملنے میں اسے وہ دشواری نہیں ہوتی تھی جو سپنا سے ملنے پر محسوس کرتا تھا۔چند روز پہلے وہ انیا کے ہاں گیا تھا۔اسے دیکھتے ہی وہ بول اٹھی، ''کیا ہے؟ سوپی (سپنا) سے ملنا ہے؟''

کمال میں 'ہاں' کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔جواب سے پہلو تہی کرتے ہوئے اس نے الٹا سوال کیا، ''کیا میں تم سے نہیں مل سکتا؟''

انیا جو کمال سے زیادہ ہوشیار تھی، بولی، ''ہاں! مل تو سکتے ہو مگر ابھی تک ملے نہیں''۔

''تو پھر اس صورت میں مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا''۔

''بلاشبہ۔اور جب آ ہی گئے ہو تو بیٹھو''۔

کمال ڈرائنگ روم میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔انیا نے چھوٹے بھائی کو بلایا اور کہا، ''سپنا کو بلا لاؤ''۔

''کیا کہوں انہیں؟''

''کہو میں نے بلایا ہے''۔

وہ تقریباً بھاگتا ہوا گیا اور چند ہی منٹوں میں سپنا آ موجود ہوئی، ''خیریت؟''

انیا نے کمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''بلانے کا سبب تمہارے سامنے موجود ہے۔تم آپس میں باتیں کرو، میں کچھ کھانے پینے کے لیے لے آؤں''۔

کمال نے اعتراض کرتے ہوئے کہا، ''کھانے پینے کو چھوڑ و، تم کوئی گیت سناؤ''۔

''سپنا بھی گانا سیکھ رہی ہے۔ اس سے کہو۔''

''مگر میں تمہارا گانا سننا چاہتا ہوں''۔

انیا نے بے رحمانہ انداز میں جواب دیا، ''تم میرا گانا سننے نہیں آئے ہو۔ تمہارے آنے کا مقصد سپنا سے ملنا ہے، اپنا کام کرو''، کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئی۔ کمال کو بہت عجیب سا لگا۔ سپنا مارے شرم کے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ کمرے میں گھمبیر فضا چھا گئی۔ آخر کمال نے بولنے میں پہل کی، ''کیا تمہارا انگریزی کا سلیبس مکمل ہو گیا ہے؟''

''نہیں، لیکن اگلے ہفتے مکمل ہو جائے گا۔ کیا تم نے اپنے سالانہ امتحانات کی تیاری پوری کر لی ہے؟''

''میں کلاس میں پڑھنے کے دوران ہی تیاری کر لیتا ہوں''۔

''کیا اتنے دنوں بعد تمہیں یاد رہتا ہے؟''

''ایک دفعہ پڑھ لینا میرے لیے بہت ہے''۔

''بہت خوب۔ میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ بنگالی زبان کے لیے کون سا مضمون تیار کر رہے ہو؟''

''میں مضمون زبانی یاد نہیں کرتا، صرف یہ دیکھتا ہوں کہ مضمون کی شروعات کیسے ہو، کس انداز سے لکھنا ہے، پھر میں لکھ لیتا ہوں۔ میں بالکل نہیں سوچتا کہ امتحان کے لیے کس موضوع پر مضمون لکھنا ہے''۔

''مجھے بھی تکنیک سکھا دو''۔

''اس میں کوئی تکنیک نہیں ہوتی۔ بتاؤ تم کس پر مضمون لکھنا چاہتی ہو؟''

''اوں۔۔۔۔۔ مری زندگی کا نصب العین''۔

''اچھا بتاؤ، تم کیا بننا چاہتی ہو؟ ٹیچر؟''

''بالکل یہی''۔

''اس صورت میں سب سے پہلے تم لکھو گی کہ نصب العین کی زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ پھر لکھو کہ میرا مقصد معلمہ بننا ہے۔ اب اگلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ تم معلمہ کیوں بننا چاہتی ہو؟ پھر یہ کہ مجھے اس کے لیے کیا کرنا ہوگا، معاشرے کو اس سے کیا حاصل ہوگا، پھر آخر میں نتیجہ اور اختتام۔ اگر تم ہر نکتے پر کم از کم دس دس فقرے لکھ لو تو تمہارا مضمون مکمل ہے۔ صرف فقرے لکھ لینے سے مضمون نہیں بنتا بلکہ چند پُر کشش جملوں کا لکھنا ضروری ہے۔ کہیں کہیں حسب حال اچھے سے اقتباسات بھی دینے ہوتے ہیں۔ اقتباسات لکھنا تو آسان کام ہے۔ اگر تمہیں کچھ ایسے جملے یاد ہیں جو زیرِ تحریر مضمون کی مناسبت سے ہوں تو لکھ دو، اور اگر سند کے ساتھ لکھو تو مضمون دو آتشہ ہو جائے گا اور بالفرض مصنف کا نام یاد نہیں تو نام مت لکھو''۔

''اور اگر کوئی اقتباس یاد ہی نہ ہو تو؟''

''پھر بھی کچھ نہ کچھ تو لکھنا ہوگا۔ سب سے پہلے اپنے خیالات کو مجتمع کرو، ابتدائیہ لکھو، مثلاً 'شاعر کہتا ہے'، یا یہ کہ 'ایک نامور مصنف کا کہنا ہے'، اور پھر جو کچھ کہنا ہے، کہہ ڈالو''۔

''تمہارے لیے تو ٹھیک ہوگا کیونکہ تم مضمون نگاری بھی کرتے ہو اور شاعری بھی، مگر میں کیا کروں؟''

''کوشش کرو، شاعری تم بھی کر سکتی ہو''۔

ابھی سپنا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ انیا ایک ٹرے پکڑے کمرے میں داخل ہوئی جس پر کھانے پینے کی چیزیں پڑی تھیں۔ انہوں نے چائے نوش کی۔ انیا نے سپنا کو مخاطب کیا، ''سپنا! کیا تم شاعری سیکھ رہی ہو؟''

''نہیں میری بہنا! میں تو مضمون نگاری سیکھ رہی ہوں''۔

''اوہ مضمون (essay)؟ گویا تم کسوٹی (assay) سیکھ رہی ہو؟''

انیا کی ذو معنی بات نے کمال کو قدرے نا آسودہ کر دیا اس لئے وہاں سے جلدی اٹھ آیا پھر دوبارہ وہاں نہیں گیا، نہ ہی اسے جانا چاہیے تھا۔ وہ سپنا کو کہیں راستے میں یا اسکول میں مل لیتا تو بہتر تھا۔ وہ یہ بات سن کر کیا سوچتی ہوگی؟''

''تم یہاں، میرے بیٹے؟''

کمال اپنی سوچوں میں گم چلا جا رہا تھا کہ آواز سن کر پیچھے مڑ کے دیکھا تو پریش کی بیوی ہالی مون کھڑی تھی، پریش پال یا پریش سین نہیں بلکہ پریش شیخ کی بیوی۔ اس کے گاؤں کے تمام مرد و زن مسلمان ہیں لیکن بنگالی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے اس لیے عربی ناموں کا تلفظ صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے، لہٰذا بہت سے لوگوں کا نام روایتی بنگالی یا سنسکرت میں ہے، مثلاً، ہری، پریش، کال چند، کملا وغیرہ، مگر سب کا نہیں۔ وہ مسلم نام بھی رکھتے ہیں، جیسا کہ، محمد علی، سیف اللہ، قمر النہار، وغیرہ۔ ہالی مون اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ دیہاتی رشتہ داری کے مطابق پریش اس کا چچا لگتا تھا، اس لحاظ سے ہالی مون اس کی چچی تھی۔ اس نے پھر سے کہا، ''تم یہاں، بیٹے؟ میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی''۔

''کیوں؟''

''اس پانی پر دم کر دو''۔

علاقے کے لوگ جن بھوت اور جادو پر یقین رکھتے تھے۔ وہ سانپ کے کاٹے کا علاج بھی جھاڑ پھونک سے کرتے، کسی پر بندش لگانے کا عمل، پانی چھینک کر اپنا مطلب نکالنا اور عملِ تنویم وغیرہ کو جادو ٹونہ سمجھتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ اگر کوئی نیک شخص قرآنی آیات پڑھ کر کسی بیمار پر پھونک مار دے تو اس کی بیماری ختم ہو جاتی ہے۔ اگر مریض نزدیک نہ ہو تو پانی پر دم کروا کر اس یقین سے پلایا جاتا تھا کہ اس سے مریض کو شفا حاصل ہو جائے گی۔ ان اعتقادات کی رُو سے شفایابی کا انحصار دم کرنے والے کی پاکبازی اور مریض کی قوتِ اعتقاد پر تھا۔ دم کرنے والا جتنا زیادہ نیک ہے، علاج اتنا ہی بہتر ہوتا، اور مریض جس قدر با اعتقاد ہوتا، اتنی جلدی شفایابی حاصل ہوتی۔

بچپن ہی سے کمال کی شہرت خوش اخلاق، نیک اور حق پرست کی تھی۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اس سے اتنی محبت کرتے تھے کہ ایک بار اسے نمازِ جمعہ کے لیے امام مقرر کر کے باپ دادا کی عمر کے بزرگوں نے اس کی امامت میں نماز پڑھی تھی، اسی لیے لوگ اس کے پاس پانی دم کرانے آتے۔ لیکن کچھ عرصہ سے اس نے مذہبی رسم و رواج پر عمل کرنا ترک کر دیا تھا لہٰذا اب اسے مذہبی شخص نہیں سمجھا جاتا تھا، اور لوگوں نے ان سے پانی وغیرہ پر دم کرانا چھوڑ دیا تھا۔ پھر ہالی مون کیوں آئی ہے؟ کہنے لگا،

''چچی! آپ جانتی ہیں کہ میں اب روزہ نماز چھوڑ چکا ہوں، اس لیے پانی پر کیسے دم کر دوں؟''

''تم مجھ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ میں سب جانتی ہوں''۔ اس نے زور دے کر کہا۔

''کیا جانتی ہیں آپ؟''

''یہی کہ تمہارا اللہ سے براہ راست تعلق ہے''۔

یہ سن کر کمال کو دھچکا سا لگا۔ پوچھا، ''کس نے بتایا آپ کو؟''

''میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔ لوگ آم کے درخت تلے بیٹھے باتیں کر رہے تھے''۔

''کیا باتیں کر رہے تھے؟''

''لوگ فقیر انثار الدین کے سامنے بیٹھے کہہ رہے تھے کہ کمال جیسا اچھا لڑکا کیسے بگڑ گیا؟ وہ آج کل نماز روزے کی

پروانہیں کرتا۔ فقیر ایثار الدین نے بڑی ناخوشگواری سے جواب دیا تھا، 'یہ سب کچھ سرِ عام کرنا ضروری نہیں'۔ یہ سن کر لوگ پریشان ہو گئے۔ فقیر نے یہ کیوں کہا؟ اس کا کوئی خاص مطلب ہوگا۔ انہوں نے بڑی شائستگی سے پوچھا، 'آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟' فقیر نے سادہ الفاظ میں وضاحت کی، 'جب تمہارا پیر کہیں دور دراز جگہ رہتا ہو، تم اس سے ملنے وہاں جاتے ہو یا نہیں؟'۔ سب نے ہاں میں جواب دیا۔ اب اس نے دوسرا سوال کیا، 'اگر وہ تمہارے ہی گھر میں رہتا ہو تو کیا پھر بھی اس سے ملنے لمبا سفر کرتے ہو؟' سب نے کہا، نہیں۔ فقیر نے کہا، 'نہیں جاتے، کیونکہ تم اسے اپنے ہی گھر میں مل لیتے ہو'۔ سب لوگ خاموش ہو گئے۔ فقیر نے بات جاری رکھی، 'اللہ ہمیشہ کمال کے ساتھ رہتا ہے'۔ سب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ فقیر کہہ رہا تھا، 'وہ اللہ کی موجودگی میں نماز پڑھتا ہے'۔ اس مخفی بات کے انکشاف پر ہر کوئی گنگ رہ گیا۔ فقیر کہہ رہا تھا، 'اسے سب کے سامنے نماز پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ فضل ایک کونے میں بیٹھا تھا، وہ پاس آ کر بولا، 'لیکن آپ تو نماز پڑھتے ہیں۔ کیا کمال آپ سے بھی بڑا پیر ہو گیا ہے؟' فقیر نے جواب دیا 'پیر تو وہ بہت پہلے سے تھا مگر تم لوگ جانتے نہیں تھے، تمہیں اب بھی نہیں پتہ۔ ایسی باتیں جاننے کے لیے باطنی نظر کی ضرورت ہے'۔ اس کے بعد تو کوئی شخص نہ بول سکا۔ فقیر اٹھ کھڑا ہوا اور چل دیا۔'' چچی کی بات ختم ہوئی تو کمال نے کہا، ''اور آپ میرے پاس آ گئی ہیں''۔

''ہاں میرے بچے! تمہارا چچا سخت بیمار ہے۔ اسے کھانسی اور تیز بخار ہے۔ یہ پانی دم کر دو۔ اگر اس کا انتقال ہو گیا تو میرا کون ہے اس کے علاوہ؟''

اس کی آرزومندی نے کمال کو بہت متاثر کیا۔ بغیر کوئی بات کیے اس نے ہالی مون سے پانی کا گلاس لیا، چند ثانیوں کے لیے منہ کے سامنے رکھا اور واپس کر دیا۔ وہ لے کر چلی گئی۔ کمال کو اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ پریش چچا تپ دق میں مبتلا ہے جس کے لیے اچھی خوراک اور دوا دارو کی ضرورت ہے۔ یہ پانی تو بالکل فائدہ مند نہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ہم وطن حقیقت کو کب سمجھیں گے، مگر اس کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے، اور تعلیم اسکولوں کالجوں کے بغیر نہیں ملتی۔ اس کے گاؤں میں تو پرائمری اسکول تک نہیں، لہٰذا اسکول قائم کرنا ضروری ہے۔

کمال وہاں زیادہ دیر تک نہ بیٹھا اور اٹھ کر مشرق کی جانب چلنے لگا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر گاؤں کی بڑی مسجد تھی جس پر سفید پھولوں سے بھرا ایک گھنا درخت بھینی بھینی خوشبو بکھیر اور سایہ دے رہا تھا۔ اس کی وجہ سے ماحول میں نمایاں اور خوشگوار تبدیلی دکھائی دے رہی تھی۔ بچپن ہی سے اس مسجد میں آنے کے سبب کمال اور اس درخت کے بیچ ایک تعلق سا پیدا ہو چکا تھا۔ اگرچہ اب اس نے یہاں آنا ترک کر دیا تھا پھر بھی مسجد اور درخت نے ابھی تک اسے اپنے حصار میں جکڑے رکھا تھا۔

تھوڑا سا آگے، جنگل کے اندر فقیر ایثار الدین کی کٹیا تھی۔ دوسرے پیروں فقیروں کے برعکس وہ کسی سے کچھ لینے کا روادار نہ تھا۔ ایک اچھا اور مشہور بڑھئی ہونے کی وجہ سے اردگرد گاؤں کے لوگ اس سے لکڑی کی چیزیں، مثلاً ہل، چھکڑے کے پہیے، میز کرسیاں وغیرہ بنوانے یا مرمت کے لیے آتے تھے۔ اسی وجہ سے اس کے گھر کے سامنے لکڑی کے گٹھے وغیرہ پڑے رہتے۔ گھر کے مغرب میں لیموں کا ایک بڑا سا درخت تھا اور اس کے پیچھے بلند و بالا درختوں سے بھرا جنگل۔ دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے قصوں کہانیوں میں بتایا گیا گھر ہو جس کا اس بے درد دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ کمال کے لیے اس گھر میں ایک کشش اور فقیر ایثار الدین کے لیے شدید لگاؤ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس اجاڑ جگہ میں رہنے والا، جس کی کوئی باقاعدہ تعلیم نہ ہو، کیسے اتنا وسیع القلب اور عملی نقطۂ نظر کا حامل ہو سکتا ہے؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس ویران خرابے میں قدرتی مسکن نے اسے آزاد خیال کر دیا ہو۔ کمال گھر کی جانب بڑھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک بلی اسے دیکھ کر بھاگ گئی، پتہ نہیں وہ پالتو تھی یا جنگلی بلی۔

کمال واپس پلٹا اور گاؤں کے مشرقی جانب چل پڑا۔ وہ صادق کے گھر جانا چاہتا تھا جو پرائمری میں اس کا ہم جماعت تھا۔ پرائمری کے بعد وہ اور ابوالعلی گنگا رام پور ہائی اسکول چلے گئے۔ ابول نے تو پڑھائی چھوڑ دی جبکہ صادق ابھی بھی پڑھ رہا تھا۔ کمال اس کے گھر پہنچا۔ وہ ایک چھوٹے بچے سے صادق کے بارے میں پوچھنے ہی لگا تھا کہ اس کا بھائی رشید آ گیا۔ اس نے آتے ہی سوال کیا، ''بُرا مت مانو، تم سے ایک سوال پوچھنا ہے''۔ کمال سمجھ گیا رشید کیا پوچھنا چاہتا ہے اس لیے اس نے گریز پائی کرتے ہوئے کہا، ''جس سے کسی کو کوئی دکھ پہنچے، ایسے سوال نہیں پوچھنے چاہئیں''۔ رشید کو خدشہ ہوا کہ سوال پوچھنے کا موقع ہاتھ سے نکلا جاتا ہے، لہٰذا کہنے لگا، ''مگر پوچھنا بھی ضروری ہے''۔ ''اگر ایسا ہے تو پوچھو''، کمال نے کہا۔

''لوگ کہتے ہیں کہ تم اللہ پر ایمان نہیں رکھتے۔ کیا یہ درست ہے؟''

''کیا اس سے تمہاری ذات پر کوئی اثر ہوتا ہے؟''

''گویا لوگ ٹھیک کہتے ہیں؟''

''کیا تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو؟''، کمال نے الٹا اس سے پوچھا۔

''بلاشبہ''۔

''کیا تم نے کبھی اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھا ہے؟''

''نعوذ باللہ، استغفار اللہ۔ تمہیں یہ شیطانی الفاظ نہیں کہنے چاہئیں۔ سوائے فرشتوں اور نبیوں کے، اللہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا لیکن روزِ حساب سب اسے دیکھ پائیں گے''۔

''ٹھیک ہے، میں اس دن اس پر ایمان لے آؤں گا''۔

''یہ ابلیسانہ الفاظ مت بولو۔ یہ گناہ ہے جو لوگوں کو جہنم کی طرف لے جائے گا''۔

''یقین مانو، تمام لوگ جنت کے خواہشمند ہیں لیکن میں جہنم میں جانا چاہتا ہوں''۔

رشید نے شک آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ کوئی شخص جہنم میں بھی جانے کا خواہشمند ہو سکتا ہے۔ اگرچہ سب لوگ جنت میں داخل نہیں ہوں گے مگر خواہش تو سب کی یہی ہوتی ہے، اور یہاں ایک ایسا لڑکا کھڑا ہے جو جہنم میں جانا چاہتا ہے۔ کیا یہ پاگل تو نہیں ہو گیا؟

اس وقت تک کچھ اور لوگ بھی وہاں آ چکے تھے۔ رشید نے پہلے لوگوں کو، پھر کمال کو دیکھا۔ ان میں خاموش طبع، ٹھنڈے مزاج اور نفیس خصلت کا حامل محمد علی بھی تھا۔ اس نے پوچھا، ''میرے بیٹے! تم ایسا کیوں کہتے ہو کہ اللہ پر تمہارا ایمان نہیں؟''

کمال نے اس کی جانب مڑتے ہوئے کہا، ''میں نے تو ایسا کبھی نہیں کہا''۔

''پھر تم ابھی ابھی کیا کہہ رہے تھے؟''

''اگر اللہ کائنات میں ہر جگہ موجود ہے، اسے اپنا کام کرنے دو۔ میں اس کی تلاش میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا''۔

''پھر تم کیا کرو گے؟''

''میں اپنا کام کروں گا''۔

''پھر؟''

''اگر اللہ موجود ہے تو پھر اسے فیصلہ کرنے دو کہ میرا مقام جنت ہے یا دوزخ۔ بہرحال میں ایسی باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا''۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کے ہونے کا اقرار کرتے ہو''۔

''نہیں، ایسا بھی نہیں''۔

''کیوں؟''

''میں کیوں اقرار کروں؟ میں اسے دیکھ نہیں سکتا، چھو نہیں سکتا، پھر اقرار کیسا؟''

''کیا تم ہوا کی موجودگی تسلیم کرتے ہو؟''

''ہاں، بالکل''۔

''کیا تم اسے دیکھ سکتے ہو؟''

''لیکن میں اسے محسوس تو کر سکتا ہوں۔ علاوہ ازیں سائنس نے ثابت کیا ہے کہ ہوا کا وزن اور دیگر اوصاف ہیں''۔

''اوہ! میں بھول گیا تھا کہ تم سائنس کے طالبِ علم ہو۔ اسی سائنس نے تمہارا ذہن خراب کر دیا ہے''۔

کمال نے اس پر کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ محمد علی نے دوسرے لوگوں کو دیکھا اور اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر گویا یہ اشارہ کیا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ رشید نے آگے آ کر پوچھا'' بابا کمال، کیا تم خادم کے بیٹے ہو نا؟''

''ہاں، میں انہی کا بیٹا ہوں''۔

''تم اس کو کیسے ثابت کر سکتے ہو؟''

''کیونکہ میری ماں نے بتایا ہے''۔

''یعنی معاملہ الٹ بھی ہو سکتا ہے؟''

''صرف میری ماں ہی یقین سے کہہ سکتی ہے''۔

''بس اور کچھ نہیں''۔

کمال کا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ وہ لوگوں کو اپنی بات سمجھانے میں ناکام رہا۔ اسے لگا کہ پوری بستی میں سوائے فقیر ایثار الدین کے کوئی شخص اتنا کھلے ذہن کا نہیں کہ اسے سمجھ سکے، مگر لوگ تو ادھر ادھر کی بحث کر کے اس کا مزاج خراب کرنے پر تلے رہتے تھے۔

وہ واپس جنگل کی جانب چل پڑا اور دلدلی جگہ پہنچ کر ایک کنارے پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچتا رہا کہ لوگوں کو کیسے سمجھائے کہ عقل، شعور اور منطق کو بنیاد بنا کر باتوں کا فیصلہ کیا کریں۔ اس کا جواب تعلیم کے سوا کچھ نہیں، اور اس کے لیے تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے، جبکہ گاؤں میں پرائمری اسکول تک نہیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ خود ایک اسکول قائم کرے گا۔

....

دوپہر کا وقت تھا جب کمال ثریا کے گھر پہنچا جہاں دروازے پر چن اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے شاہد خان کے کمرے میں لے گیا جو ایک کرسی پر آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ چن نے ان کے کندھے کو ہلایا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں تو کمال کو سامنے کھڑے دیکھا۔ وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور بولے،'' تم آ گئے۔ بیٹھ جاؤ''۔ کمال نے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا،'' آپ نے مجھے بلایا تھا''۔

''میں کیا کرتا۔ کیا تم آج کل اپنی مرضی سے آ رہے ہو؟ کیا تم اور کچھ جاننا نہیں چاہتے؟''

''جی! جاننا تو چاہتا ہوں مگر سالانہ امتحانات سر پر کھڑے ہیں''۔

''محنت کر رہے ہو، اچھی بات ہے۔ اب چند منٹ کے لیے اپنے امتحانات بھول جاؤ، دماغ کو آرام دو اور مجھے بتاؤ تم کیا جاننا چاہتے تھے؟''

کمال نے چند لمحے سوچ کر سوال کیا، ''آپ میں سے کچھ لوگ کانگرس میں تھے، چند ایک ہندو مہا سبھا میں اور کئی مسلم لیگ میں''۔

''بالکل ایسا ہی تھا''۔

''آپ کسی ایک نکتے پر متفق نہیں ہوئے تھے اور اگر اتفاقِ رائے ہوا بھی تو ملک کی تقسیم پر۔ آپ لوگوں نے ملک کو دو نیم کر دیا''۔

خان صاحب قدرے پریشان ہو گئے۔ کمال نے پوچھا، ''کیا آپ کو اس پر کوئی پشیمانی ہے؟''

خان صاحب کچھ دیر خاموش و ساکت رہے، پھر کرسی سے اٹھ کر ایک صندوق کھولتے ہوئے بولے، ''میں اپنے احساسات کا اظہار کروں گا مگر یہ چند خطوط صورتِ حال واضح کر دیں گے''۔ یہ کہنے کے بعد انہوں نے ایک خط کمال کو دیا۔ اس نے دیکھا کہ لکیر دار کاغذ پر خوبصورت تحریر میں ایک خط تھا جس کے ساتھ ایک لفافہ بھی تھا۔ لفافے پر شاہد خان، موضع اور ڈاکخانہ بل چتر، ضلع مقصود آباد، صوبہ مغربی بنگال، بھارت اور ارسال کنندہ کا نام اکھیل منڈل، 61 مین روڈ، ضلع راجشاہی، مشرقی پاکستان لکھا تھا۔ خط پر 14 اگست، 1952 کی تاریخ اور شہر کا نام راجشاہی لکھا تھا، یعنی تقسیمِ ہند کے پانچ برس بعد لکھا گیا خط۔ کمال نے پڑھنا شروع کیا:

''ڈیئر شاہد

تمہارا خط ملا۔ مجھ سے تم ایسی توقع کیسے کر سکتے ہو؟ سارے انتظامات تم لوگوں کے تھے۔ تم لوگوں نے مجھے میری ہی جنم بھومی میں پردیسی بنا دیا۔ صرف میں ہی نہیں، میرے جیسے لاکھوں لوگ اپنے ہی وطن میں غیر ملکی بن گئے۔ ہمیں اپنی دھرتی پر دوسرے درجے کا شہری بنا دیا گیا۔ تم لوگوں کے ساتھ کیا ہوا، تمہی بہتر جانتے ہو۔ آپ لوگ غیر ذمہ داری کا ثبوت دے کر پاکستان کا مطالبہ کرتے رہے، پاکستان، پاکستان کے نعرے مارتے رہے۔ ہم ایک ہی ملک میں پیدا ہوئے، ایک ہی ماحول میں پلے بڑھے، ایک جیسا کھانا کھایا، پانی پیا، پھر یہ آپ لوگوں کے ذہن میں کیسے آ گیا کہ اب علیحدہ وطن، یعنی پاکستان لیے بغیر ہم رہ نہیں سکتے؟ چند خود غرض لوگوں نے تان اڑائی اور آپ لوگ بے وقعت پالتو بندروں کی مانند اس غیر منصفانہ مطالبہ پر ناچنے لگے۔ جب تک ملک دو ٹکڑے نہیں ہوا، آپ کو چین نہیں آیا۔

ہماری جماعت کے کچھ رہنما وزیر بننے کے لالچ میں مر مٹے اور ملک کو تقسیم کرنے پر رضامند ہو گئے۔ آپ نے لکھا ہے کہ ''مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان تھا مگر تقسیمِ بنگال نہیں''، مگر آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ تقسیمِ ہند کی باتیں ہونے پر بہت سے ہمارے اور ہندو مہا سبھا کے نیتاؤں نے تقسیمِ بنگال کے حق میں تحریک شروع کر دی تھی۔ انہیں ایک ہی خدشہ تھا کہ کہیں سارا بنگال پاکستان کو نہ چلا جائے۔ مجھے اعتراف ہے کہ ہماری جماعت میں ایسے لوگ بھی تھے جو ہر حال تقسیمِ بنگال چاہتے تھے چاہے صوبے کی ساری آبادی ہندوستان میں رہنے کو تیار ہو۔ اس کے پسِ پردہ قیادت کی تنگ نظر خود غرضی کا بڑا ہاتھ تھا۔ چونکہ متحدہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس لیے ہندو نیتاؤں کو یقین تھا کہ بنگال کی تقسیم کے بغیر انہیں وزارتِ عظمیٰ ملنا

ناممکن ہے، اس کا امکان صوبے کی تقسیم کے بعد صرف مغربی بنگال کے قیام میں تھا۔ یہی سبب ہے کہ پاکستان بنے یا نہ بنے، وہ بنگال کی تقسیم ضروری سمجھتے تھے۔ انہیں سپنوں کی تعبیر مل گئی۔ اب کوئی غیر ہندو مغربی بنگال کا وزیر اعلیٰ نہیں بن سکتا۔

اگر ہمارے رہنما تقسیمِ بنگال کا مطالبہ نہ کرتے تو کیا ہوتا؟ پورا بنگال پاکستان کو مل سکتا تھا۔ آپ کا گھر پاکستان میں ہوتا پھر آپ مجھے بہتر طور پر بتا سکتے کہ ہندوستان میں غیر ہندوؤں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ ہندوستان کم از کم اصولی لحاظ سے تو سیکولر ہے جبکہ پاکستان اپنے آپ کو اسلامی ملک کہہ رہا ہے۔ ملک کا مذہب اسلام ہے لیکن بتاؤ اس میں میرا قصور کیا ہے؟ اسی دھرتی پر جنم لینے اور اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی میں دوسرے درجہ کا شہری ہوں۔ میں غیر منقسم ہندوستان میں پیدا ہوا مگر آپ لوگوں نے مجھے پاکستان کا شہری بنا دیا۔ ہاں، میں ہندوستان آسکتا ہوں مگر کیوں آؤں؟ وہاں تو میں پیدا نہیں ہوا بلکہ میرا جنم مشرقی حصے میں ہوا تھا، تو میں اپنی جنم بھومی کیوں چھوڑ دوں؟ مگر یہ بتائیں آپ پاکستان کیوں نہیں آتے؟ کیا آپ کے دماغ میں بھی وہی ہلچل ہے جو ادھر ہے؟ علاوہ ازیں، جن لوگوں نے میرے ساتھ تحریکِ آزادی میں کام کیا، مجھ پر ان لوگوں کے سلسلہ میں کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ الگ بات کہ آزادی کے نام پر ان کے ساتھ بہت بڑا مذاق ہوا ہے۔ نہرو اور پٹیل کی طرح میں محض اقتدار کے خود غرضانہ لالچ کی خاطر انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ سرحدی گاندھی خان غفار خان گاندھی سے انتہائی متاثر تھے۔ وہ کانگرس میں تھے اور جناح کے ساتھ لفظی مناقشت ہوتی رہتی تھی، مگر ہمارے رہنماؤں نے اسے جناح کے لوگوں کے حوالے کر دیا یعنی ان لوگوں کے حوالے جنہیں وہ خود ''بھیڑیے'' کہا کرتا تھا۔

جب ہمارے رہنماؤں نے تقسیمِ ہند قبول کر لی اور شمال مغربی سرحدی صوبہ پاکستان میں شامل ہو گیا تو سرحدی گاندھی نے مایوسی کے عالم میں کہا ''تم ہمیں بھیڑیوں کے آگے ڈالے جا رہے ہو''۔ حقیقت یہی ہے کہ ہم نے انہیں بھیڑیوں کے منہ میں ڈال دیا تھا، لیکن اپنے جیسے منافق رہنماؤں کو دیکھو۔ آپ لوگ تو مطالبۂ پاکستان کے پُرجوش حامی تھے، پاکستان مل گیا مگر آپ لوگ یہاں نہیں آرہے بلکہ تا حال ہندوستان میں ہیں۔ میں تو آپ جیسوں کو کھینچ کے یہاں لانے کا خواہشمند ہوں تاکہ اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ اپنے مطالبہ سے کیا حاصل ہوا ہے۔

چند ماہ قبل یہاں کے نوجوانوں نے بنگالی زبان کی توقیر بحال کرنے کی کوشش کی۔ آپ کی پاکستانی پولیس نے ان پر گولیاں برسا کر انہیں مار ڈالا۔ وہ نعرہ کہاں گیا کہ ''تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں؟'' مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے آپ کے بڑے بھائی تو یہ کہتے ہیں کہ اردو، صرف اردو سرکاری زبان ہوگی۔ یہاں آئیں اور اپنے عزیز از جان بھائیوں کو بتائیں کہ صرف اردو ہی نہیں، ہم بنگالی کو بھی سرکاری زبان بنانا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھیے آپ کے بھائی آپ کا کیا حال کرتے ہیں۔ آپ لوگ ہندوستان میں محفوظ رہ کر کچھ بھی نہیں کر رہے۔

ہندو مہا سبھا اور کانگرس کی فرقہ وارانہ قیادت کی اشتعال انگیزیوں سے متاثر ہو کر مشرقی بنگال کے ہندوؤں نے جو تحریک چلائی تھی وہ اب اس کا پھل کھا رہے ہیں۔ بہت سے لوگ ہندوستان جا چکے ہیں۔ میں بھی آسکتا ہوں، لیکن آؤں گا نہیں۔ میں یہاں پیدا ہوا تھا، یہیں میری پرورش ہوئی، میں مروں گا بھی یہیں۔ پھر

اپنے پرکھوں کی طرح مجھے پدما کی پانیوں میں ڈال کر خلیج بنگال کی جانب بہا دیا جائے گا۔ مجھے علم نہیں کہ اس دنیا میں میرا دوبارہ جنم کس صورت میں ہوگا۔ کوئی بھی صورت ہو، میں بنگال ہی میں دوبارہ جنم لینے کی آرزو کرتا ہوں۔ تمنا ہے کہ اس وقت میرا وطن ایک ہو جائے، میرے ہم وطن متحد ہو جائیں۔
اگر ممکن ہو ایک بار ہمارے یہاں تشریف لائیں۔ اپنی آنکھوں سے تقسیم کے زہر آلود نتائج دیکھیں۔ میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں، تقسیم نے تو مجھے اور زیادہ بوڑھا کر دیا ہے۔ زیادہ عرصہ زندہ رہنے کی امید نہیں، ہاں، آپ سے ملنے کی بڑی خواہش ہے۔ ہم مل جل کر کام کرتے تھے۔ کیا ہوا اگر اب ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں۔ فی الحال کہنے کو اور کچھ نہیں۔

صرف تمہارا
اخیل''

خط کی زبان نے کمال کو افسوں زدہ کر دیا۔ خاموشی سے کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد اس نے پوچھا، ''کون ہے یہ؟''

''یہ کانگرس کا مسلمہ اور ہر شک و شبہ سے بالا مقامی رہنما، بالکل خالص، کھرا، اس کے قول و فعل میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ نایاب نسل کا ایک فرد ہے جس نے آخری لمحے تک تقسیم کی مخالفت کی''۔

''آپ کو کیسے جانتا ہے؟''

''1927 میں گاندھی بھوبن پور آیا تو ایک میٹنگ میں میری اخیل سے پہلی ملاقات ہوئی۔ پھر میں نے کرشک پرجا میں شمولیت اختیار کر لی مگر ایک دوسرے سے ہمارا رابطہ رہا۔ جب میں مسلم لیگ میں شامل ہوا تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا۔ اس نے مجھے خط لکھنا چھوڑ دیا مگر تقسیم ہند کے بعد یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا''۔

''اس نے بہت خوب لکھا ہے، اور اپنے دل کی گہرائیوں سے لکھا ہے۔ اس نے آپ پر الزام تراشی بھی کی ہے۔ کیسا لگا آپ کو؟''

''اس نے بالکل صحیح لکھا ہے۔ اگر وہ مجھے دو چار تھپڑ بھی لگا دے تو میں نچنت (مطمئن) ہو جاؤں گا۔ بلاشبہ ہم نے اس جیسے بہت لوگوں کو تکلیف دی ہے''۔

خان صاحب کے اعتراف نے کمال کو حوصلہ دیا۔ اس نے پوچھا، ''آپ نے کیسے یقین کر لیا کہ پاکستان کے قیام سے مسلمانوں کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے؟''

''کیا تم ہپناٹزم کے بارے میں جانتے ہو؟ ہم بالکل مسحور ہو چکے تھے۔ جادوگر بھی ناظرین کو مسحور کر کے اپنا کام دکھاتے ہیں۔ وہ لوگوں کو دولخت کر کے پھر سے یک جان کر دیتے ہیں۔ شیرینی تیار کر کے تماشائیوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگر وہ ایسا کرنے کے اہل ہوتے تو دولت میں کھیلتے اور انہیں جادو کے کھیل دکھانے کی ضرورت نہ ہوتی، لیکن وہ اتنا خوبصورتی سے کھیل دکھاتے ہیں کہ سب کچھ سچ لگتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ہمیں بنگال میں کچھ امکانات نظر آ رہے تھے۔ غیر منقسم بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ سارا بنگال پاکستان کو جا سکتا تھا لیکن بہار اور یوپی کا سوچو۔ دونوں صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ وقت کے کسی موڑ اور لمحے میں ان دونوں صوبوں کا پاکستان میں جانا ممکن نہیں تھا لیکن وہاں کے مسلم لیڈر مطالبۂ پاکستان کے زبردست حمایتی تھے۔ کیسے؟ میں خود بھی سمجھنے سے قاصر ہوں۔ پتہ نہیں وہ کیسے سمجھ رہے تھے کہ پاکستان کے قیام سے ان کے مسائل حل ہو جائیں گے''۔

''کیا ان کی سوچ واقعی ایسی ہی تھی؟''

''میں کیا کہوں؟ ایک ایسے ہی رہنما کا لکھا ہوا خط تم خود پڑھ لو''، انہوں نے بنڈل میں سے ایک اور خط نکال کر کمال کو دیا۔ بھیجنے والے کا نام اور پتہ انگریزی میں تھا:

''از طرف: مسلم مہاتو، مہاجر بستی، کراچی، پاکستان، بنام شاہد خان، موضع اور ڈاک خانہ بال چتر، ضلع مقصود آباد، مغربی بنگال، بھارت'' خط انگریزی میں تحریر کردہ لگتا تھا مگر غور سے دیکھا تو رومن انداز میں لکھا گیا خط دراصل ہندی میں تھا۔ خان صاحب نے بتایا، ''یہ شخص زیادہ پڑھا لکھا نہیں۔ وہ تو اردو بھی نہیں لکھ سکتا اس لیے اردو رومن طرزِ تحریر میں لکھتا ہے''۔

اب پتہ چلا کہ یہ خط ہندی میں نہیں بلکہ اردو میں ہے۔ کمال کو اردو اور ہندی طرزِ تحریر میں فرق کا علم تھا مگر سننے پر دونوں زبانوں میں اسے کوئی خاص فرق محسوس نہ ہوتا۔ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ دونوں زبانوں میں کیا فرق ہے؟ شاہد صاحب نے بتایا کہ یہی زبان جب ناگری سکرپٹ میں لکھی جاتی ہے تو ہندی کہلاتی ہے، اور اگر اسے فارسی انداز میں لکھیں تو یہ اردو ہے۔

''پھر آپ کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ خط اردو میں لکھا گیا ہے؟''

''میں خط لکھنے والے کو جانتا ہوں''۔

''کیسے؟''

''مسلم لیگ تکی پاڑا کے رہنما سلام نے اس کا مجھ سے تعارف کرایا تھا''۔

''کیا یہ بھی مسلم لیگ کا رہنما تھا؟''

''نہیں۔ اس کا نام مسلم مہاتو تھا''۔

کمال نے حیرت سے کہا، ''مگر مہاتو تو ہندوؤں کی ایک ذات ہے''۔

''اس ذات کے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے، کچھ ہندو ہی رہے۔ تمہارا باپ خادم منڈل مسلمان ہے لیکن بھدو منڈل ہندو۔ اگر تم تلاش کرو تو بھدو منڈل نام کا مسلمان تمہیں اپنے گاؤں میں بھی مل جائے گا''۔

کمال نے غور کیا تو واقعی بھدو منڈل نامی ایک مسلمان اس کے گاؤں میں تھا، اور اسی نام کا ہندو ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا۔ شاہد صاحب گویا ہوئے، ''اس کا تعلق ضلع پٹنہ، صوبہ بہار سے تھا۔ ان کے گاؤں کا ایک شخص جوگرو مہاتو یہاں کے پٹ سن کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اس کے باپ نے اپنے بیٹے کو جوگرو کے ساتھ نوکری کے لیے بھیج دیا۔ شروع میں وہ جوگرو کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ 1946 کے فسادات میں جوگرو اس کے سامنے ہی ہلاک ہوا۔ خوفزدہ ہو کر وہ اپنے گاؤں چلا گیا تو معلوم ہوا کہ فسادیوں نے اس کا سارا خاندان ختم کر دیا ہے''۔

''کتنے افسوس کی بات ہے''۔

''بعد کے واقعات تو اس سے بھی زیادہ المناک ہیں''۔

''کیسے؟''

''تقسیم کے بعد وہ مشرقی پاکستان چلا گیا۔ زبان کے معاملہ پر ہونے والے فسادات میں فوج نے اسے اپنا حمایتی سمجھتے ہوئے اپنے حق میں نکلنے والے جلوس میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ اسے دیکھ کر احتجاج کرنے والے مشتعل ہو گئے تاہم پاکستانی حکومت کی عملداری تک خاموش رہے، لیکن بنگلہ دیش کے قیام کے بعد اسے ملک سے نکل جانے کو کہا گیا۔ وہ ایک بار پھر سے جلاوطن ہو کر مغربی پاکستان چلا گیا مگر وہاں بھی اسے مسائل کا سامنا ہے''۔

''کس قسم کے مسائل؟''

''یہ خط پڑھو، تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا''۔

کمال نے پڑھنا شروع کیا:

''شاہد بابو!

میں ایک غریب آدمی تھا۔ جہاں پیدا ہوا وہی میری جنم بھومی تھی، بڑی سادہ سی بات ہے۔ آپ بابوؤں نے مل کر میرے لیے مشکل کھڑی کر دی۔ میرے گاؤں کے جوگرو چچا نے مجھے ملازمت دلائی۔ میری روٹی پانی کا بندوبست کیا۔ آپ لوگ ہی کہا کرتے تھے،'تم مسلمان ہو اور چونکہ مسلمانوں کو ہندوستان میں خطرہ ہے، اس لیے ہمیں تمہاری مدد چاہیے، اپنے دین کی خاطر آگے بڑھو'۔ میں مان گیا۔ اس جرم میں میرے اہلِ خانہ اور چچا جوگرو کو ہلاک کر دیا گیا۔

آپ لوگ کہتے تھے،'لے کے رہیں گے پاکستان'، اور پھر پاکستان بن گیا۔ آپ تو یہاں نہیں آئے مگر مجھے آنا پڑ گیا۔ نیتاؤں کے ساتھ کیا بیتی، آپ ہی جانتے ہیں۔ کہا گیا کہ صرف اردو ہی پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس میں برائی کیا ہے کیونکہ اردو تو مسلمانوں کی زبان ہے، لیکن بنگالیوں نے طوفان اٹھا دیا۔ ان کا کہنا تھا،'ہم بنگالی زبان کو بھی سرکاری درجہ دینے کا مطالبہ کرتے ہیں'۔ رہنماؤں کے پلے کچھ نہ پڑا۔ انہوں نے جنگ شروع کر دی اور یوں بنگلہ دیش وجود میں آیا۔ سب بھول بھلا گئے کہ'میں بھی مسلمان ہوں، تم بھی مسلمان ہو'، اب اس کی جگہ یہ نعرے لگنا شروع ہوئے،'ہم بنگالی، تم غیر بنگالی، بنگال چھوڑ دو'۔ مجھے ایک بار پھر سے وطن چھوڑنا پڑا، اور میں مہاجر بن کر، ایک اجنبی بن کر، مغربی پاکستان آگیا۔ اِدھر مقامی لوگوں نے شور مچا دیا،'یہ زمین باہر سے آنے والوں کی نہیں، دھرتی کے بیٹوں کی ہے'۔ ان کا مطالبہ ہے،'باہر سے آنے والو! واپس جاؤ'۔ مجھے بتاؤ میں کہاں جاؤں؟

میں ہر جگہ نامطلوب ہوں، تقسیمِ ہند کے بعد بھارت میں نامطلوب کیونکہ میں مسلمان تھا، غیر بنگالی ہونے کے سبب بنگلہ دیش میں، اور یہاں اس لیے کہ باہر سے آیا ہوں۔ میری اپنی تو کوئی سرزمین نہیں۔ تم ایک تعلیم یافتہ شخص ہو، مجھے بتاؤ میرا ملک کون سا ہے، کیا دنیا میں میرا کوئی وطن ہے بھی یا نہیں؟

مسلم''

سادہ الفاظ میں لکھے گئے خط نے کمال کے جذبات کو جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ مسلم بڑا سیدھا سادہ آدمی تھا۔ وہ کسی بھی جھگڑے میں ملوث نہیں رہا۔ لیڈروں نے اسے مسلم لیگ میں شامل ہو جانے کو کہا۔ پھر تقسیمِ ہند کے بعد اسے مشرقی پاکستان آنا پڑا۔ غیر بنگالی ہونے کی وجہ سے بنگلہ دیش میں اس کے لیے جگہ نہیں تھی۔ مغربی پاکستان میں بھی اسے قبول نہیں کیا گیا، گویا وہ پھر سے مہاجر ہو گیا۔ اسے مذہب اور جماعت کی وجہ سے اپنی جائے پیدائش چھوڑنا پڑی۔ وہ جہاں کہیں بھی گیا، زبان اور جنم بھومی کی بنیاد پر نشانۂ ستم بنا۔

انیل منڈل اور مسلم مہاتو دونوں تقسیمِ ہند کا شکار ہوئے جبکہ رہنما اپنے اپنے علاقوں میں وزیر مشیر بن بیٹھے۔ عام لوگ ابھی تک لعنت ملامت اور پھٹکار کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

کمال کو معلوم تھا کہ اس کے باپ خادم منڈل کی مانند عام آدمی کا تقسیمِ ہند کی سیاست میں کوئی لین دین نہیں تھا لیکن وہ پاکستان کے قیام کی وجہ سے ہندوؤں کے دل میں موجود بغض اور کینہ کا شکار ہوتا رہا۔ اسی طرح مشرقی بنگال کے عام ہندو اس کے باپ کی طرح بنگال کی سیاست میں ملوث نہیں رہے، مگر وہ بھی نشانہ بنے۔ جو ہندو وہاں رہ گئے وہ اکھیل منڈل کی مانند دوسرے درجے کے شہری قرار پائے۔ جو سرحد پار چلے گئے، یا انہیں اس پار جانے پر مجبور کر دیا گیا، وہ مقامی لوگوں کی عداوت اور دشمنی کے شکنجے میں پھنس گئے۔ کمال کے خیال میں اگر ملک تقسیم نہ ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔

شاہد خان نے سوال کیا، ''اب بات واضح ہوئی؟''

''ہاں! قابلِ افسوس ہے۔ آپ اس بارے میں کیا سوچتے ہیں؟''

''میرے خیال میں اس کے ذمہ دار ہم ہی ہیں''۔

کمال کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ خان صاحب بولے،

''فی الحال میرے بتانے کی اور کوئی بات نہیں۔ اب اپنے بارے میں بتاؤ۔ ہائر سیکنڈری کے بعد کیا ارادے ہیں؟''

کمال نے چند سیکنڈ خاموشی کے بعد جواب دیا، ''میں کاشی ناتھ کالج میں داخلہ لینے کی سوچ رہا ہوں''۔

''مجھے یقین ہے کہ تم اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گے اور انجینئرنگ یا میڈیکل میں داخلہ مل جائے گا''۔

کمال جانتا تھا کہ وہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گا مگر ڈاکٹری کی طرف جانے کا ارادہ نہیں تھا، اور اس کا ذمہ دار براہی کا مبین الدین تھا۔

براہی میں کوئی ایم بی بی ایس ڈاکٹر نہیں تھا۔ ایک مبین الدین تھا مگر وہ ایم بی بی ایس نہیں تھا۔ گاؤں کے تقریباً سب لوگ غریب تھے۔ معمولی مرض کے لیے وہ طبیبوں کے پاس نہیں جاتے تھے، ہاں البتہ شدید بیماری کی صورت میں مبین الدین کے پاس جانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ جاتا تھا۔ اس کا سب سے پہلا سوال ہی یہ ہوتا تھا، ''پیسے ہیں؟'' اگر جواب 'نہیں' میں ہوتا تو وہ بیمار کو گھر جا کر دیکھنے سے انکار کر دیتا۔ کمال کو بعد میں اندازہ ہوا کہ اس کا گھر جانا یا نہ جانا برابر تھا۔ پیسے نہ ہونے کی صورت میں گھر والے دوا کہاں سے خریدتے، اور اچھی خوراک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صرف نسخہ ہی بیماری کا علاج نہیں ہوتا، اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ معالج کو بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ کہاں سے کھائے؟ کمال سوچے سمجھے بغیر ہی معالج کو شقی القلب بنا بیٹھا کہ ایک شخص مر رہا ہے اور وہ اس سے پیسوں کا پوچھ رہا ہے۔ پیسے نہیں، تو علاج نہیں۔ وہ اس قسم کا معالج نہیں بننا چاہتا تھا۔ اسی پس منظر میں اس نے خان صاحب کو جواب دیا،

''میں ڈاکٹر بننے کا خواہش مند نہیں ہوں، انجینئرنگ ٹھیک ہے مگر میری ترجیح سائنسدان بننا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہاں آنرز کرنا چاہتا ہوں۔ اگر دل چاہا تو ایم ایس سی کروں گا ورنہ بی ٹیک اور ایم ٹیک۔ سائنس کالج میں کیمیکل انجینیئرنگ اور الیکٹرونکس دونوں پڑھائے جاتے ہیں''۔

''ہاں یہ تو ہے مگر تم میڈیسن کرنے کے بعد بھی تو سائنسدان بن سکتے ہو''۔

''یہ ہو سکتا ہے مگر میں عام تنخواہ دار سائنسدان بننے کا شوقین نہیں''۔

''پھر؟''

''میں ایسی ایجادات کرنے کا خواہش مند ہوں جو دنیا کو بدل دیں''۔

خان صاحب سن کر خوش ہوئے اور پوچھنے لگے، ''مثلاً کیسی ایجادات؟''

کمال آج کی نہیں کل کی سوچ رہا تھا، کہنے لگا، ''بالفرض میں دھان کی ایسی قسم ایجاد کروں جس کی پیداوار اتنی ہو کہ

خوراک کی کمی پوری ہوجائے، کیا اس سے دنیا میں تبدیلی آئے گی یا نہیں؟'' یہ کہتے ہوئے کمال کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی،
خان صاحب نے پوچھا، ''اور اس کے علاوہ؟''

''اور یہ کہ ابھی تک کینسر کا علاج دریافت نہیں ہوا۔ اگر میں علاج دریافت کرلوں تو کیا دنیا میں شاندار تبدیلی نہیں آجائے گی؟''

خان صاحب نے مسرور ہو کر کہا، ''ہاں، دنیا بدل جائے گی''۔ کمال بھی خوش ہوگیا۔

خان صاحب نے بات آگے بڑھائی، ''کینسر علاج کی دریافت کے لیے تمہیں میڈیسن پڑھنا ہوگی''۔

کمال کا جواب تھا، ''میں نے پال صاحب سے بات کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ آنرز کے بعد فارمیسی پڑھنے سے مقصد حاصل ہوسکتا ہے''۔

خان صاحب نے بھی تائید کی، ''ٹھیک ہے لیکن اگر تم میڈیسن کی تعلیم حاصل کرلو تو ڈاکٹر بن جاؤ گے۔ کہیں ریسرچ یا ملازمت نہ بھی ہو تو پھر بھی لوگوں کی خدمت کر کے مناسب کمائی کر سکتے ہو۔ کمائی اور خدمت شانہ بہ شانہ چلیں گے''۔

''بات تو ٹھیک ہے''۔

''تو پھر میڈیسن پڑھو۔''

''نہیں۔ اس کے لیے کافی پیسہ درکار ہے جو میرے پاس نہیں''۔

''پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ضرورت ہو تو میں تیار ہوں''۔

کمال کو جان کر از حد مسرت ہوئی کہ خان صاحب اس سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ میڈیسن کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ مگر وہ ان کا احسان کیسے لے سکتا ہے؟ اس لحاظ سے تو وہ ان کا مقروض ہوجائے گا، اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا خاموش رہا۔ خان صاحب نے بڑے خلوص سے کہا،

''شائد تم یہ سوچ رہے ہو کہ مجھ سے پیسے کیوں لو؟ تمہارا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ چلو رشتہ بنا لیتے ہیں''۔

''رشتہ؟'' کمال نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہاں، تم ہمارے داماد بن جاؤ۔ مجھے جوشانہ کے رویّے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں کہ اس سے زیادہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تمہیں میری تجویز کیسی لگی؟''

ایسی تجویز کا اچانک آنا کمال کے لیے حیران کن تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کیا جواب دے، لہٰذا چپ رہا۔ کمال سے کوئی جواب نہ بن کر خانصاحب نے پوچھا، ''کیا تمہیں میری پوتی پسند نہیں؟''

''نہیں، نہیں، یہ بات نہیں''، کمال نے جلدی سے کہا۔

''پھر کیا بات ہے؟''

''میں تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں، اس سے پہلے شادی کا خواہشمند نہیں''۔

''کس نے تعلیم ختم کرنے کو کہا ہے؟ میڈیسن کی تعلیم حاصل کرو، جوشانہ بھی میڈیسن پڑھنا چاہتی ہے۔ اس سال تم داخل لو، اگلے برس وہ داخلہ لے لے گی۔ اوسط قابلیت کے بہت سے طلباء آنرز کرتے ہیں مگر سب کو میڈیسن میں داخل نہیں ملتا۔ تمہیں موقع مل جائے گا، اسے کیوں ضائع کرتے ہو''۔

خان صاحب کا استدلال کمال کو صحیح لگا، لیکن یہ دلیل ان لوگوں کے لیے زیادہ مناسب اور بہتر ہے جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت اور کمائی وغیرہ کو ذہن میں رکھے ہوئے ہیں۔ مگر کمال جیسے طلباء جو اپنی ایجادات کی وجہ سے دنیا کو تبدیل

کرنے کے خواہاں ہوں، ان کے لیے یہ منطق قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔ اس کا جواب تھا، ''اس وقت میں جو کرنا چاہتا ہوں، کرنے دیجیے، انجینئرنگ یا میڈیسن تو بعد کی بات ہے''۔

خان صاحب کو دھچکا سا لگا۔ انہیں اس جواب کی توقع نہیں تھی، کہنے لگے، ''ٹھیک ہے، آنرز کرلو''۔

کمال سمجھ گیا کہ خان صاحب کے جذبات مجروح ہوئے ہیں لیکن وہ ان کی تجویز ماننے سے قاصر تھا۔ کچھ دیر اور یہاں بیٹھنا خان صاحب کے لیے باعثِ تکلیف ہوسکتا تھا، چنانچہ کھڑا ہوگیا، ''اب میں چلتا ہوں، دوبارہ آؤں گا''۔

خان صاحب نے صرف سر ہلایا۔ کمال باہر کو چل دیا۔ جوشانہ یا پَپن اس کے ساتھ نہیں آئے۔ اس نے سائیکل لی اور گھر کو روانہ ہوگیا۔

....

سالانہ امتحان نزدیک ہونے کی وجہ سے طلباء کو فارغ کردیا گیا تھا۔ اگرچہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے انگریزی کی سپیشل کلاس کا انتظام کیا مگر وہی پرانے محاورات، فقروں کی تشکیل، گرائمر وغیرہ کی بازگشت، لیکن یہ سارا انتظام اوسط قابلیت کے طلباء کے لیے تھا تاکہ وہ کامیاب ہوجائیں۔ کمال اسکول جانے کی بجائے گھر بیٹھ کر امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس وقت وہ باہر دالان میں بنچ پر لیٹا پرماتھ چوہدری کی ''منتر شکتی'' کے باطنی معنوں کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اتنے میں گاؤں کا مکھیا نادر بخش اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ کمال اٹھ بیٹھا۔ وہ رشتہ میں اس کا چچا لگتا تھا۔ بڑا ہونے کے سبب خادم منڈل اسے بڑا بھائی کہتا اور اس مناسبت سے کمال اسے بڑا باپ کہہ کر بلاتا تھا۔ حالات نے اسے تعلیم حاصل نہیں کرنے دی تھی حالانکہ اس کی ذہانت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو اسکول بھیجا مگر وہ بھی تعلیم جاری نہ رکھ سکا جبکہ کمال بدستور پڑھ رہا تھا، اور اسی وجہ سے وہ اسے پسند کرتا تھا۔ گاؤں میں کوئی بھی مسئلہ ہو، وہ کمال سے مشورہ کرتا۔ کوئی فیصلہ کرنے کے بعد وہ کمال سے پوچھتا آیا فیصلہ درست تھا۔ خود کمال کو لوگوں کے مقدمات سننے کا شوق نہیں تھا۔ نادر بخش اسے اکثر کہتا، ''یہ بے بس لوگ ہیں، میں ان کا خیال رکھتا ہوں لیکن میں تو ہمیشہ یہاں نہیں رہوں گا، تمہیں ہی ان کی دیکھ بھال کرنا ہوگی، ان میں سے کوئی اس قابل نہیں''۔ کمال سمجھ رہا تھا کہ چچا نادر کا اپنے بعد اسے مکھیا بنانے کا خیال ہے۔

آج اس نے آتے ہی بلاتمہید سوال کیا، ''دریائے فرخا کے پانی کی تقسیم کے سلسلہ میں ریڈیو سے کبھی چالیس کیوسک اور کبھی پچاس کیوسک پانی کی بات ہوتی ہے۔ کیوسک کیا ہے؟''

کمال نے چند لمحے سوچ کر جواب دیا، ''ایک مکعب فٹ میں ایک سیکنڈ پانی آنے کی مقدار کیوسک کہلاتی ہے''۔

نادر بخش نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کمال کی طرف دیکھا۔ اس نے وضاحت کی، ''کیا آپ کو سیکنڈ کا پتہ ہے؟ ایک منٹ کا ساٹھواں حصہ''۔

اس نے نہ سمجھتے ہوئے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ کمال نے اپنی گھڑی نکالی اور بتایا، ''سب سے بڑی سوئی جلدی جلدی گھوم رہی ہے۔ ہر ٹک ٹک کا مطلب ہے ایک سیکنڈ''۔ نادر بخش کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ کمال سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیوسک کے بارے میں کیسے سمجھائے۔ اچانک اس کی نظر ایک مستطیل ڈبے پر پڑی۔ اس نے اسے پکڑا اور سمجھانے لگا، ''فرض کریں اس کی لمبائی چوڑائی برابر، یعنی ایک فٹ ہے۔ اسے پانی سے بھر دیں تو اس کی مقدار ایک مکعب فی فٹ ہوگی۔ اگر یہ پانی کسی خاص جگہ سے ایک سیکنڈ میں گزرے تو ہم اسے کیوسک کہیں گے''۔ نادر بخش کا چہرہ پھر چمک اٹھا۔ کمال نے مزید وضاحت سے سمجھایا، ''تالاب بنانے کے لیے آپ لوگوں نے بیس فٹ لمبی، پانچ فٹ چوڑی اور ایک فٹ گہری زمین تیار کی، یعنی ایک سو مکعب فٹ۔ یہاں سے ایک سیکنڈ میں جتنا پانی گزرے گا اسے ہم سو کیوسک کہیں گے''۔

نادر بخش بہت خوش ہوا۔ وہ جانے ہی لگا تھا کہ اسے کوئی بات یاد آ گئی اس لیے دوبارہ بیٹھ گیا اور بولا، ''میں نے سنا ہے کہ شاہد خان نے اپنی پوتی کے ساتھ تمہاری شادی کی بات کی ہے۔ کیا واقعی؟''

کمال نے شرماتے ہوئے جواب دیا، ''جی ہاں''۔

''تمہارے باپ نے بتایا تھا کہ تم نے انکار کر دیا ہے۔ کیا ایسا ہی ہے؟''

''جی یہ ٹھیک ہے''۔

''یہ بات تو ہمارے خواب وخیال میں بھی کبھی نہیں آئی کہ شاہد خان ہمیں اپنی پوتی کا رشتہ دے گا۔ تم راضی کیوں نہیں ہوئے؟''

کمال نے واضح کیا کہ وہ فی الحال شادی نہیں کر سکتا کیونکہ ابھی مزید تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ ہے۔ نادر نے پھر سوال کیا، ''یہ بھی سنا ہے کہ شاہد خان تمہیں میڈیسن پڑھنے کے لیے کہہ رہا تھا مگر تم نہیں مانے۔ آخر کیوں؟''

''اگر وہ میری تعلیم کے اخراجات اٹھاتے تو میرا آپ سے رشتہ نہ رہتا بلکہ میں ان کا ہو کے رہ جاتا''۔

''وہ کیسے؟''

''پہلی بات یہ کہ میں اگر ان سے اخراجات لیتا ہوں تو پھر ان کی مرضی کے مطابق چلنا پڑتا۔ دوسری بات، شادی کے بعد میں ان کا رشتہ دار بن جاتا۔ یہ لباس جو میں آج کل پہنتا ہوں، ان کے معیار کا نہیں، لہٰذا وہ شرمندگی محسوس کرتے۔ ان کی پسند کا لباس پہننے کا مطلب ہے مزید پیسوں کی ضرورت، گویا ان کا اور زیادہ دست نگر ہونا۔ پھر یہ کہ اگر وہ یا میری بیوی ترش رُو ہوئے تو اس صورت میں میں بولنے کے بھی قابل نہیں رہوں گا، یعنی ان کے رحم وکرم پر رہنا۔ میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا''۔

نادر بخش کچھ دیر خاموش رہا پھر معذرت خواہانہ لہجے میں بولا،

''میں نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاہد خان جیسا آدمی ہمارے ساتھ رشتہ داری کرنے کا خواہشمند ہے، اس لیے ہمیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن تم ٹھیک کہتے ہو۔ سیسو بھاگن کے فورمین کا بیٹا اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں بھوبن پور میں رہتا تھا۔ ایک بار فورمین بیٹے سے ملنے کو گیا مگر بیٹے نے باپ کو پہچاننے سے انکار کر دیا اور کہا یہ شخص ہمارا ملازم ہے۔ فورمین نے بھی اچھا جواب دیا، ''یقیناً میں ملازم ہوں مگر اس کا نہیں، اس کی ماں کا ہوں''۔ یعنی جیسا منہ ویسا تھپڑ''۔ اتنا کہہ کر نادر بخش خاموش ہو گیا، پھر پوچھا، ''تم کیا کرو گے؟''

میں وہی کروں گا جو کر سکتا ہوں۔ آزاد رہوں گا اور اپنی مرضی سے کام کروں گا''۔

''جب اتنی سوچ بچار کے بعد تم نے ایک فیصلہ کر لیا ہے تو اب میں کیا کہہ سکتا ہوں''، یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

کمال نے محسوس کیا کہ پٹ سن سے بنی باڑ کے پیچھے سے کوئی گزر رہا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ ماں ہی ہو گی اور اس نے ساری باتیں سن لی ہیں۔ اسے علم تھا کہ اس کے والدین خان صاحب کی پوتی کے ساتھ اس کی شادی کے خواہش مند ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس شادی سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ خان صاحب کا ان کے ساتھ رشتہ داری نبھانا تو درکنار، یہ لوگ الٹا اپنے بیٹے کو کھو دیں گے۔

ذہنی پریشانی کے سبب وہ کتاب پر توجہ نہ دے سکا۔ ثریا کا تصور دماغ میں آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ اس نے حساب کی کتاب نکالی، سوال حل کرنے کی کوشش کی مگر ثریا پھر سے خیالات میں ہلچل مچانے لگی۔ تنگ آ کر اس نے بیالوجی کی کتاب کھولی لیکن توجہ مرکوز نہ ہو سکی۔ اب بنگالی ادب کی کتاب کھل گئی، پھر وہی صورتِ حال۔ اس نے سوچا کہ فی الوقت پڑھائی موقوف کر کے تھوڑی سی منزگشت کرے اور رات کو پوری توجہ سے مطالعہ کرے۔ اٹھنے کے لیے جیسے ہی اس نے سر اونچا کیا، سامنے ثریا

کو کھڑے دیکھا۔ وہ اسے اپنا وہم سمجھا۔ کمال نے خود کو یقین دلانے کے لیے کہ وہ ثریا نہیں، اس کا ہیولہ ہے، اپنی آنکھیں ملیں۔ مگر وہاں ثریا ہی تھی جو پوچھ رہی تھی، ''کیا ہوا؟ کیوں اپنی آنکھیں مل رہے ہو؟''

''اوہ! کچھ نہیں ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تم یہاں آئی ہو''۔

ثریا نے تلخی سے پوچھا، ''کیوں؟ کیا میرا یہاں آنا ممکن نہیں؟''

''ایسی تو بات نہیں، تمہارے آنے کا امکان بہت کم تھا، اور پھر تم نے بتایا بھی تو نہیں تھا''۔

''کیا تم نے مجھے کبھی بھی یہاں آنے کو کہا ہے؟''

''نہیں''۔ اور پھر تھوڑی سے نوک جھونک کے بعد کمال نے ثریا سے آنے کا مقصد پوچھا۔

''میں چند روز سے تمہاری تلاش میں تھی، تم آج کل اسکول بھی نہیں آ رہے ہو اس لیے میں چلی آئی۔ آج ہفتہ ہے، جلدی چھٹی ہو گئی ہے''۔

''کیا گھر والے پریشان تو نہیں ہوں گے، اگر تمہیں پہنچتے ہوئے تاخیر ہو گئی تو؟''

''میں نے امی کو بتا دیا تھا کہ میں دیر سے آؤں گی''۔

''کیا انہوں نے وجہ نہیں پوچھی؟''

''کیا میں بری لڑکی ہوں کہ وہ مجھ سے پوچھتے؟''

''لیکن برے لڑکے تو تمہارے پیچھے لگ سکتے ہیں''۔

''اگر کوئی اچھا لڑکا میرے پیچھے نہیں پھرتا تو پھر برے لڑکے ہی آیا کریں گے''، ثریا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''تم یہاں کیسے آئی ہو؟''

''کیا یہاں آنا مشکل ہے؟ تمہارے گاؤں کے نام کا پتہ تھا، لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے رہنمائی کر دی۔''

کمال نے باہر دیکھا تو ثریا کی سائیکل آم کے درخت کے نیچے دکھائی دی۔ اس کا بستہ ہینڈل کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ وہ ثریا کی طرف دیکھ کر بولا، ''اب بتاؤ؟ کیا کام ہے؟''

''بتادوں گی، ذرا آرام تو لینے دو''۔

''ہاں، بالکل۔ واپسی پر لمبا راستہ طے کرنا ہوگا۔ ناشتے کے بعد سے ابھی تک تم نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہوگا۔ انتظار کرو، میں گھر سے ہو کے آتا ہوں۔ اور ہاں، مٹھائی وغیرہ تو نہیں ہوگی، اسے خریدنے کے لیے بڑا ہی جانا پڑتا ہے۔ چاول یا روٹی مل جائے گی۔ کیا کھالو گی؟''

''مجھے اپنی ماں کے پاس لے جاؤ، انہیں بتاؤں گی''۔

''تم یہیں بیٹھو، میں انہیں یہاں بلا لیتا ہوں''۔

کمال شرم محسوس کر رہا تھا۔ وہ عمر کے اس دور سے گزر چکا تھا جب لڑکی اور لڑکے میں کوئی خاص فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن نویں جماعت ہی سے وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے متعلق عجیب سے جذبات محسوس کرنے لگا۔ اس کے اپنے گاؤں میں کوئی ایسی لڑکی نہیں تھی کیونکہ شادی کے بعد سب یہاں سے جا چکی تھیں، اور گاؤں میں آنے والی شادی شدہ لڑکیوں کے لیے کوئی مخصوص جذبہ دل میں تھا نہیں۔ ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ثریا کی طرح پڑھی لکھی، مہذب اور روشن خیال نہیں تھی، لیکن سپنا کے بارے میں اس کے خیالات مختلف تھے۔ وہ دونوں پہلی جماعت سے اکٹھے تھے، وہ پڑھائی میں بہت اچھی تھی، کمال کے ساتھ اس کے تعلقات خوشگوار تھے، مگر نویں جماعت میں آنے کے بعد کمال نے اپنے دل میں عجیب سی کیفیت محسوس

کی۔وہ ساری زندگی سپنا کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ثریا کے بارے میں بھی اس کے ایسے ہی جذبات تھے اور خان صاحب کی تجویز کے بعد تو ان میں ہلچل مچ گئی تھی۔بہرطور، بہت تامل کے بعد وہ اندر گیا۔اس کی ماں مریم کھانا تیار کر رہی تھی۔اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا،''ماں!میری ایک ہم جماعت آئی ہے۔وہ اسکول سے سیدھا ادھر ہی آ رہی ہے، کچھ کھانے پینے کے لیے ہے؟''

''باسی روٹی پڑی ہے مگر ٹھنڈے سالن کے ساتھ نہیں کھا سکو گے۔اسے کہو تھوڑا سا انتظار کرلے، میں چاول ابال رہی ہیں''۔

ثریا کمال کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔ماں کی بات سن کر اس نے کہا،''مجھے روٹی بہت پسند ہے۔وہی دے دیں۔کیا تھوڑا سا شوربہ ہے؟''

''ہاں، آلوؤں کا شوربہ ہے، ساتھ تھوڑا سا شیرہ بھی ہے''۔

''شاندار، بس یہی دے دیں''۔

''تم دونوں باتیں کرو، میں آتی ہوں''۔

وہ دونوں باہر دالان میں آکر بنچ پر بیٹھ گئے۔''کیا پڑھ رہے تھے؟''، ثریا نے پوچھا۔

''میں کسی مضمون پر بھی توجہ نہیں دے سکا ہوں''۔

''کیوں؟''

''پتہ نہیں، مگر ایک بات واضح ہے کہ جب کبھی میں کوئی چیز سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو میری توجہ پوری ہوتی ہے لیکن جب امتحانی نقطۂ نظر سے پڑھنا چاہوں تو توجہ نہیں رہتی۔شاید اسی وجہ سے سوائے ناولوں کے نصابی کتابیں پڑھنا مجھے اب مشکل محسوس ہوتا ہے۔بہرطور، میں پوری توجہ سے مطالعہ کی کوشش کروں گا۔دیکھو۔۔۔۔''

اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی ماں آ گئی۔اس کے ایک ہاتھ میں چاولوں کی پلیٹ اور دوسرے میں پانی کا گلاس پکڑا تھا۔ثریا نے جلدی سے یہ چیزیں ماں کے ہاتھ سے لے لیں۔ماں اندر چلی گئی۔''کھاؤ''، کمال نے ثریا سے کہا۔

''اکیلی؟''

''میں نے تھوڑی دیر پہلے کھانا کھا لیا تھا، اور پھر مجھے ٹھنڈی روٹی پسند بھی نہیں''، کمال نے جواب دیا۔

''تھوڑا سا کھالو''۔

کمال نے روٹی کا ایک لقمہ لیا اور چبانے لگا۔کھانے کے بعد کمال نے ثریا سے پوچھا،''تم کوئی بات کرنا چاہ رہی تھیں۔کہو!''۔

ثریا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ہولے سے کہا،''ایک بڑی سنجیدہ بات ہے۔کسی ایسی جگہ بیٹھتے ہیں جہاں کوئی دخل اندازی نہ کر سکے''۔

''یہاں تو کوئی نہیں ہے''۔

''مگر کوئی کسی وقت آ بھی تو سکتا ہے''۔

''ہاں! یہ بات تو ہے۔چلو آؤ، سبزہ زار میں بیٹھتے ہیں۔اگر کوئی ہمیں وہاں دیکھ بھی لے تو پاس نہیں آئے گا''۔

''ٹھیک ہے۔وہیں چلتے ہیں''۔

گھر سے نکل کر وہ تھوڑی دیر چلتے رہے۔راستے میں ثریا نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا،''وہ کیا ہے''۔

''وہ حوضی (چھوٹا حوض) ہے''۔

ثریا کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر جان گیا کہ وہ یہ بات نہیں سمجھی، لہٰذا اسے وضاحت کرنا پڑی،''یہاں ایک ٹیوب ویل نصب کیا گیا ہے جو بجلی کے پمپ کے ذریعے زیرِ سطح پانی کھینچتا ہے جسے زمین کے اندر بنائی گئی پختہ نالیوں سے اردگرد پہنچایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں ان پر نلکے بھی لگے ہیں۔ ان جگہوں پر حوضیاں بنی ہیں تا کہ پانی ادھر ادھر ضائع ہونے کی بجائے ان میں اکٹھا ہوتا رہے۔ وہ دیکھو، پانی مغربی کھیت کی طرف جا رہا ہے۔ اگر یہ سمت بند کر کے بالفرض مشرقی سمت کھول دی جائے تو پانی اسی طرف جانا شروع ہو جائے گا۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھ لو کہ آب پاشی کے لیے بنایا ہوا ایک چھوٹا سا مرکز ہے جہاں سے پانی کھیتوں کو دیا جاتا ہے''۔ پھر ثریا سے پوچھنے لگا،''تمہارے گاؤں میں بھی تو ٹیوب ویل لگا ہوا ہے، کیا یہ چیز وہاں نہیں دیکھی؟''

''میں اس طرف کبھی گئی ہی نہیں۔ جس راستے سے گزر کر میں اسکول جاتی ہوں وہاں ٹیوب ویل نہیں ہے۔ کیا ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔ آؤ بیٹھیں''۔

وہ دونوں حوضی کے کنارے آ بیٹھے۔ پانی کی سرسراہٹ، پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اور اوپر سے ہوا میں ہلکورے لیتا ثریا کا سکارف کمال کے چہرے کو چھو رہا تھا۔ اس نے آج بھی سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے کوئی گیت گنگنا رہی تھی اور کمال ہمہ گوش سن رہا تھا۔ پھر وہ آہستگی سے بولی۔

''دادا ابو نے تمہیں میڈیسن پڑھنے کو کہا تھا۔ تم کیوں نہیں مانے؟''

''تمہیں پتہ ہی ہے کہ میڈیسن کی تعلیم کتنی مہنگی ہے۔ ہماری حالت تم نے دیکھ لی ہے، کیا میرے والدین اتنا خرچہ برداشت کر سکتے ہیں؟''

''دادا ابو نے تو سارا خرچہ اٹھانے کی حامی بھری تھی''۔

''کسی پر بوجھ ڈالنے سے میری عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔ مالی مدد کے ساتھ کچھ پابندیاں اور تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ کسی سے مالی مدد لینے کا مطلب ہے کہ مجھے ایسے کام بھی کرنا پڑ سکتے ہیں جنہیں میں کبھی بھی نہ کرنا چاہوں۔ ایسا کرنا تو موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اور اگر میں نہ کروں تو ناشکرا ٹھہرایا جاؤں، پھر یہ کہا جائے گا کہ دیکھو، ہمارے پیسوں پر پڑھ کر ڈاکٹر بنا ہے اور آج ہماری پروا نہیں کرتا۔ مجھے یہ سننا گوارا نہیں''۔

''تم ہمیں غیر کیوں سمجھتے ہو، تم ہمارے خاندان ہی کا حصہ بنو گے۔ تمہیں یہ خدشہ کیوں ہے کہ ایسے کام کرنے کو کہا جائے گا جنہیں تم پسند نہیں کرتے؟''

ثریا کی بات میں وزن تھا۔ کمال نے تحمل جواب دیا،''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم لوگ ایسا ضرور کہو گے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اس بات کا امکان ہو سکتا ہے''۔

''اچھا ٹھیک ہے، ان سے پیسہ مت لو۔ تمہارے اخراجات میں پورے کروں گی، بس تم میڈیسن کی تعلیم حاصل کرو''۔

یہ تجویز ثریا کے دل سے نکلی تھی جس سے انکار مشکل تھا، مگر اس نے پوچھا،''اتنی رقم تم لاؤ گی کہاں سے؟''

''میں اپنے خاندان کی پہلی اولاد ہوں۔ مجھے انہوں نے کئی لاکھ کے زیورات دیے ہیں۔ وہ سارے تمہارے۔۔۔۔''۔

کمال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا،''اگر وہ تمہاری اپنی کمائی سے لیے ہوتے تو مجھے اعتراض نہیں، لیکن وہ سارے تحائف ہیں۔ جب تک تم ان کی باتیں مانتی رہو گی، وہ خوش ہوں گے، اور جیسے ہی تم ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم

اٹھانا چاہوگی، زیورات تم سے واپس لے لیے جائیں گے''۔

ثریا نے معترض ہوتے ہوئے کھل کر پوچھا، ''کیا تم مجھ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہے ہو؟''

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا، پھر آہستگی سے بولا، ''ایسی کوئی بات نہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں اس وقت تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے بعد ہی شادی کروں گا''۔

''کیا اس وقت مجھ سے شادی کرو گے؟''

کمال کے لیے اس سوال کا جواب بڑا مشکل تھا۔ چند لمحے سوچ کر اس نے جواب دیا۔

''یہ کہنا مشکل ہے کہ اس وقت میرے ذہن میں کیا ہوگا لیکن اگر تمہارا فیصلہ مجھ سے شادی کا ہے تو اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا۔ مگر یہ بھی خیال رہے کہ معاملہ الٹ بھی ہوسکتا ہے۔ تم ایک امیر گھرانے سے ہو لہٰذا بہت جلد اور بڑی آسانی سے کسی مقام پر پہنچ جاؤ گی۔ میرے لیے شاید مشکل ہو اور یہ بھی امکان ہے کہ شاید اس وقت تم مجھ سے شادی پر رضامند نہ ہو''۔

اس نے تفصیلاً جواب دینے کی بجائے بس اتنا کہا، ''ٹھیک ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوجاؤ''۔ جواب مبہم تھا کہ آیا اس نے کمال کی باتوں سے اتفاق کیا ہے یا نہیں۔ تاہم یہ واضح تھا کہ اسے دکھ ہوا تھا اور وہ کمال سے ناراض بھی لگ رہی تھی۔

دونوں میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ پہلو بہ پہلو بیٹھے رہے۔ کمال قدرے پریشان تھا جبکہ وہ غصے میں تھی، کہنے لگی، ''اٹھو، اب چلتے ہیں''۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ چلنے لگے۔ گھر پہنچ کر اس نے اپنی سائیکل لی تو کمال نے پوچھا، ''کیا میں تھوڑی دور تک تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں؟'' جواب دینے کی بجائے ثریا سائیکل لے کر چل پڑی۔ وہ ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مسجد کے پاس پہنچ کر کہنے لگا، ''سائیکل پر بیٹھ جاؤ، تمہیں دیر ہورہی ہے''۔ اور پھر وہ سائیکل پر سوار تھوڑی دیر میں آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ کمال بوجھل دل سے گھر کو لوٹ گیا۔

بلاشبہ وہ اچھی بیوی ثابت ہوتی مگر کمال اسے قبول کرنے کے لائق نہیں تھا۔ اس کی تجویز ماننے کا مقصد اپنی خودداری کو مجروح کرنا تھا، اور انکار اسے دکھ دینے کے مترادف۔ اسے بڑی خوشی ہوتی اگر ثریا اس کی بات سے اتفاق کر لیتی، لیکن وہ غیر یقینی صورتِ حال میں کیوں انتظار کرتی۔ علاوہ ازیں اس کی خواہش تھی کہ کمال ڈاکٹر بنے، اور اگر وہ ڈاکٹر نہ بن پائے تو شاید ثریا بعد میں اسے پسند نہ کرے۔ وہ اپنے آپ کو گروی نہیں رکھنا چاہتا تھا، اسے پیشکش قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی مگر اپنی آزاد شخصیت کی قیمت پر نہیں۔

....

سالانہ امتحان میں بیٹھنا کمال کے لیے دوبھر ہو رہا تھا۔ اس کا امتحانی مرکز بھوبن پور کا کالجیٹ اسکول تھا۔ گھر سے روزانہ آنے جانے کی مشکل سے بچنے کا واحد حل بھوبن پور میں قیام تھا۔ باپ کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ کمال کے لیے وہاں کوئی جگہ کرایے پر لی جاتی۔ اس کے دوست شمیم نے دستِ تعاون بڑھایا، وہ اس طرح کہ اس کا بھائی قاسم بھوبن پور کے۔ این۔ کالج کا طالب علم تھا، لہٰذا شمیم اور کمال دونوں اس کے پاس قیام پذیر ہوگئے۔

پہلا پرچہ بنگالی زبان کا تھا۔ کمال امتحانی مرکز میں اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ اردگرد اس کے اپنے اور بھوبن پور کے ایشور چندر انسٹیٹیوٹ کے طلباء بیٹھے تھے۔ کمال کے نزدیک یہ انتظامات نامناسب اور غیر منصفانہ تھے کیونکہ بھوبن پور کے کسی طالب علم کا امتحانی مرکز اس کے علاقے براہی میں نہیں بنا تھا جبکہ اسے براہی سے یہاں امتحان دینے کے لیے آنا پڑا ہے۔

پرچہ شروع ہونے کی اطلاعی گھنٹی بجی جس کا مطلب تھا کہ تمام طلباء اپنی کتابیں کاپیاں وغیرہ ہال کے باہر رکھ دیں مگر یہاں معاملہ الٹ دکھائی دیا۔ مقامی طلباء نے میزوں پر کتابیں اور کاپیاں رکھ دیں۔ اگلی گھنٹی بجنے پر نگران سوالوں جوابوں کے

پرچے لیے اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے میزوں پر رکھی کتابوں کا پیوں کو نظر انداز کر کے پرچے تقسیم کرنا شروع کر دیے۔ کمال نے جلدی سے رول نمبر اور دیگر مطلوبہ کوائف لکھے۔ اتنے میں تیسری گھنٹی بجی جس پر نگرانوں نے سوال نامہ تقسیم کیا۔ کمال سمجھنے سے قاصر تھا کہ طلباء کی نگرانی کا مقصد کیا ہے کیونکہ انہوں نے کتابیں کھول کر نقل شروع کر دی تھی۔ باہر سے چند ایک لوگوں نے اندر آ کر لڑکوں کو بتایا کہ سوالوں کے جوابات کتاب کے کس صفحے پر ہیں۔ نگران بھی ان کی مدد کر رہے تھے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ یہ دیکھ کر کمال اپنے پرچے پر کماحقہٗ توجہ نہ دے سکا۔ کم و بیش ہر کوئی نقل کرنے کے علاوہ اونچی آواز میں باتیں بھی کر رہا تھا۔ ان حالات میں اپنی یاداشت کے سہارے کچھ لکھنا ممکن نہ رہا۔ اس کے پاس کتاب بھی نہیں تھی اور بالعموم امتحان سے پہلے وہ کتاب دیکھتا بھی نہیں تھا۔ ایک دفعہ اس نے نگران کو شکایت کرنا چاہی مگر اس کی پشت پر بیٹھے طالب علم نے اس کے سر پر کسی چیز سے ضرب دے کر اسے خاموش رہنے کو کہا۔ بیچارہ کمال پریشانی میں پرچہ صحیح طور پر حل نہ کر سکا۔ مزید لکھنے کے لیے جب اس نے نگران سے اضافی پرچہ مانگا تو اس کے بازو میں بیٹھے طالبِ علم نے اس کا حل شدہ پرچہ چھین لیا۔ اس نے واپس لینا چاہا تو اسی طالبِ علم نے تحکمانہ لہجے میں کہا، "جاؤ، اضافی پیپر پر لکھو، میں اپنا پرچہ حل کرنے کے بعد ہی تمہیں واپس کروں گا، اور اگر تم نے زبردستی کی کوشش کی تو میں اس پر سیاہی گرادوں گا"۔ کمال سراسیمہ ہو گیا۔ اب اسے اچھے نتائج کی توقع نہ رہی، اور اگر جوابی پرچہ خراب کر دیا گیا تو پھر کامیابی کیسی؟ کوئی بھی نگران نزدیک نہیں تھا۔ وہ بے بس اور چپ چاپ بیٹھ کر باقی سوالوں کے جواب لکھنے لگا۔

تنبیہی گھنٹی نے بتا دیا کہ اب صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ لڑکے نے چھینا گیا حل شدہ پرچہ اسے واپس کر دیا۔ آخری گھنٹی ہوتے ہی کمال نے حسبِ عادت پرچہ نگران کے حوالے کر دیا۔ بہت سے لڑکے ابھی بھی نقل میں مصروف تھے۔ نگران ان کی منتیں کر رہے تھے کہ مہربانی کر کے اب لکھنا ختم کریں۔ کمال باہر نکلا تو اپنے استاد سودیش سنیال پر نظر پڑتے ہی آنسو نہ روک سکا۔ استاد نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ بھیگی آنکھوں سے بولا "سر! اگر اسی طرح امتحان دینا ہے تو میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مہربانی کر کے سنٹر کے انچارج کو کہہ کر مجھے کسی الگ تھلگ جگہ بٹھا دیں، بے شک وہ مجھے اپنے ہی کمرے میں بیٹھنے کی اجازت دے دیں۔ مسٹر سنیال نے انچارج سے درخواست کی مگر اس نے یہ کہتے ہوئے صاف صاف الفاظ میں انکار کر دیا، "ارے میاں! لڑکوں کو نقل کی اجازت دی ہے اسی لیے تو امتحان بہت پُرامن ہو رہا ہے۔ کیا تم انہیں نقل کی اجازت دیے بغیر قابو کرنا چاہتے ہو؟ وہ تو بم پھینک دیں گے"۔ کمال نے بولنا چاہا تو اسے لگی لپٹی بغیر کہہ دیا، "کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر تم امتحان دینے کے خواہشمند ہو تو وہیں بیٹھ کر دو، ورنہ گھر جاؤ"۔ سنیال صاحب اسے باہر لے آئے۔ کمال کو اسی حال میں، اسی نشست پر بیٹھنا پڑا۔

ہوسٹل واپس آ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ اسے اپنی کامیابی کی بہت امید تھی جس پر اس کے مستقبل کا انحصار تھا لیکن پہلے ہی روز امیدوں کا خون ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ مقامی طلباء آتے ہی نقل کے لیے ہیں کیونکہ ان کے پاس کتابیں اور کاپیاں موجود تھیں۔ یہی نہیں، ان کی مدد کے لیے تجربہ کار لوگ بھی آئے ہوئے تھے جبکہ اس کے اپنے اسکول کے طلباء تو صحیح معنوں میں محنت کر کے امتحان دینے آتے تھے، اس کھلے عام نقل کی وجہ سے نتیجہ انتہائی خراب ہونا ہے۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے وہ رات گئے اشکبار رہا۔

اگلے روز وہ بھی اپنی کتابیں لیے کمرۂ امتحان میں آ گیا، اور نقل کرتا رہا۔ کسی نے بھی اس سے جوابی پرچہ نہ چھینا۔ پہلے دن والا منظر سامنے تھا، اور وہی منظر آخر تک قائم رہا۔ طبیعیات کا پرچہ دیتے ہوئے اس نے ایک طالبِ علم کو انگریزی میں جواب لکھتے دیکھا۔ اس کے پاس طبیعیات میں استعمال ہونے والی نرل (transparent) پلاسٹک کی بنی چیزیں موجود تھیں جن کی مدد سے وہ ان کی شکلیں بنا رہا تھا۔ کمال کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ایسی چیزیں بھی مل جاتی ہیں۔ وقفے میں اس نے لڑکے سے ان

چیزوں کا پوچھا۔ اس کا جواب چشم کشا تھا۔ یہ ساری اشیاء اس کے باپ نے جو ایک کالج میں لیکچرار تھا، اسے دی تھیں۔ کمال لاعلم تھا کہ آیا امتحانات میں ایسی چیزوں کے استعمال کی اجازت ہے؟ انگریزی زبان میں پرچہ حل کرنے کا مشورہ اس کے باپ نے دیا تھا تاکہ زبان کے فرق سے یہ تاثر ملتا کہ یہ طالب علم باقی لڑکوں سے بہتر ہے اور یہ کہ اس نے پرچے میں نقل نہیں کی۔ کیا بوالعجبی تھی کہ وہ تیار شدہ نوٹس دیکھ کر پرچہ حل کر رہا تھا۔

امتحان کے آخری پرچہ کے بعد کمال فوری طور پر ہوسٹل آیا۔ واپسی کے لیے اپنا سامان صندوق میں بند کیا، صرف لالٹین باہر رکھی جو وہ گھر سے اس لیے لایا تھا کہ مبادا بجلی چلی جائے اور وہ تیاری نہ کر سکے۔ مگر حالات ایسے تھے کہ وہ توجہ سے مطالعہ نہ کر سکا تھا۔ اپنے قیام اور خورونوش کے اخراجات ادا کرنے کے بعد اس کی جیب میں صرف دس روپے باقی رہ گئے جو واپسی کے لیے بہت تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں کنڈکٹر اس سے صندوق اور لالٹین کا کرایہ نہ مانگ لے، اس نے رکشہ نہ لیا اور صندوق سر پر اٹھائے، ہاتھ میں لالٹین لٹکائے بسوں کے اڈے پر آ گیا۔ کنڈکٹر نے صندوق اور لالٹین کا کرایہ نہ مانگا، اور یوں اس کے ساڑھے آٹھ روپے بچ گئے۔

....

کمال گاؤں پہنچ گیا۔ موسم برسات کا آغاز تھا۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ دھان کی فصل پانی میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ ندی نالوں کے علاوہ دریائے بیراب کا پانی بھی فصلوں کو ڈبوتا گاؤں کو زیرِ آب کر چکا تھا۔ ہر سو پانی ہی پانی تھا۔ بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی جس نے دریا کے پانی میں مل کر چراگاہ کو سمندر کی صورت دے دی تھی۔

اس علاقے کے تمام دریاؤں، یعنی بیراب، جلنگی اور پیالی، کا پانی دریائے پدما سے حاصل ہوتا تھا۔ فرخا بیراج نے پدما کا رخ بھگراتھی کی جانب موڑ دیا تھا جس کی وجہ سے پدما میں سطحِ آب نیچی ہونے سے بگری علاقے کے دریا پایاب ہو گئے تھے۔ ان کی تہ میں ریت وغیرہ بھر جانے سے بارش کا پانی زمین میں جذب نہیں ہونے پایا تھا اس لیے اردگرد کے علاقوں میں پھیل گیا۔ سڑکیں پانی میں ڈوب گئیں، اور اب پانی گھروں کی طرف بہہ رہا تھا۔ ڈھلانوں میں بنے گھر ڈھے چکے تھے۔ وہ اپنے گھر کی طرف بڑھا تو دیکھا کہ پانی باہر دالان تک آ چکا تھا۔ گھر چونکہ قدرے بالائی سطح پر تھا اس لیے پانی وہاں تک نہ پہنچ پایا لیکن رسوئی اور مویشیوں کا باڑا پانی میں ڈوبے ہوئے تھے، تاہم بیل ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔ ان کا چارہ وغیرہ پانی میں مل کر خراب ہو گیا تھا۔ جانوروں کو خوراک پہلے ہی کم ملتی تھی، پھر فاقوں کی وجہ سے بیمار ہوئے اور بالآخر مر گئے۔ ان کی متعفن لاشیں وہیں پڑی تھیں جن پر گدھ منڈلا رہے تھے۔ آمدورفت کے لیے لوگوں نے کیلے کے درخت کاٹ کر انہیں آپس میں باندھ کر عارضی انتظام کیا ہوا تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ اب کسی شخص کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ متعلقہ محکمے کے لوگ کشتیوں کے ذریعے خورونوش کا کچھ سامان لائے مگر وہ ان کی ضروریات سے کم تھا۔ کسی کو پلاسٹک کا ٹکڑا ملا، کسی کو چاول اور کوئی دالیں وغیرہ ہی لے سکا۔ محکمے والے واپس لوٹ گئے اور پھر پلٹ کر نہ آئے۔ لوگوں کو اپنی مدد آپ کرنا پڑی۔ خوش قسمتی سے بارش رک گئی اور بیراب میں پانی کی مقدار کم ہونے لگی۔ سڑکیں نظر آنے لگیں لیکن چراگاہ تا حال غرقاب تھی، دلدلی علاقے اور چراگاہ میں دھان کی فصل مکمل طور پر تباہ ہو گئی، پٹ سن کو نقصان پہنچا مگر کم۔ امید بندھی کہ اگلے برس کی فصلیں اچھی ہوں گی۔

کمال کے باپ خادم کی اپنی کوئی زمین نہیں تھی مگر وہ دلدلی حصے میں شراکت داری کی بنیاد پر دو ایکڑ زمین پر کاشت کرتا تھا۔ یہیں سے اس کا سال بھر کا خرچ پورا ہوتا تھا مگر امسال فصل کے ختم ہو جانے سے اسے کچھ حاصل نہیں ہونا تھا۔ اگر تسلی تھی تو

ایک ایکڑ رقبے میں پٹ سن کی فصل بیچنے سے قدرے امید بندھی رہی۔ بیل دم توڑ چکے تھے، اب ہل جوتنے کے لیے بیلوں کی نئی جوڑی خریدنا تھی۔ پٹ سن کی فصل تیار ہونے پر چھکڑے میں جوتنے کے لیے کوئی جانور نہیں تھا۔ اسے اپنے بیٹوں کے ساتھ مل کر گٹھے اٹھانا پڑے جنہیں صفائی ستھرائی کے بعد کرایے کے ایک چھکڑے پر براہ راست بازار برائے فروخت لے گیا۔ مختلف جگہوں سے قیمت معلوم کرنے کے بعد اسے ٹھاکر کی قیمت زیادہ لگی لیکن ادائیگی چار دن بعد ہونا تھی۔ یہاں بالعموم ایسا ہی ہوتا تھا۔ فروخت کنندہ سے آڑھتی اور وہاں سے کارخانے کے مالک تک سب ہی بغیر پیسوں کے کاروبار کرتے تھے۔ کسانوں کے پاس ادھار دینے کے سوا اور کوئی متبادل راہ نہیں تھی۔ فصل آڑھتی سے ہوتی ہوئی کارخانہ دار تک پہنچتی، وہ مصنوعات کی تیاری کے بعد رقم آڑھتی کو دیتا ہے، جو درجہ بدرجہ نیچے جاتے جاتے کسان کو آخر میں ملتی۔ خادم کو پندرہ سو روپیہ ملنا تھا جس سے وہ بیل خرید سکے گا۔

چار روز بعد جب خادم اپنی رقم لینے گیا تو گودام کو تالہ لگا دیکھا۔ مالک اپنا کاروبار ختم کر کے غائب ہو گیا تھا۔ خادم نے ادھر ادھر بہت دھکے کھائے مگر بے سود۔ وہ پولیس کے پاس بھی گیا جنہوں نے اس سے ثبوت مانگا۔ وہ بیچارہ ثبوت کیا دیتا، نہ رسید، نہ کہیں اندراج اور نہ گواہ۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ پولیس نے مالک کو بچانے کے لیے اس سے رشوت لے لی تھی۔ خادم کو سچ جھوٹ کا علم نہیں تھا مگر اس کی کہیں بھی شنوائی نہ ہوئی۔ وہ مالک کا اتہ پتہ معلوم کر کے اس کے گھر جا پہنچا لیکن رقم کی ادائیگی کے لیے تاریخ پر تاریخ دینے کے باوجود خادم کو ایک پائی نہ ملی۔ وہ مایوسی کے عالم میں سارا دن چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ مریم اسے دلاسہ دیتی کہ بُرا وقت کٹ جائے گا اور اچھا وقت ضرور آئے گا۔ خادم کو ان طفل تسلیوں پر یقین نہ تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو گئی تھیں۔ کھیت میں بھی دھان نہ رہا۔ کھجور کے درختوں کے نزدیک والا کھیت گروی تھا، قرض کی ادائیگی کیسے ہو، گویا باقی زمین بھی فروخت کرنی پڑے گی، اور پھر بیل خریدنے ہیں ورنہ وہ کاشتکاری کیسے کرے گا؟

انہی حالات میں کمال کے امتحان کا نتیجہ نکلا جو اگرچہ اس کی توقعات کے مطابق نہیں تھا پھر بھی بہت اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوا تھا۔ حساب میں تو اس کی کارکردگی شاندار تھی اور اسی بنیاد پر اسے انجینئرنگ یا میڈیسن میں داخلہ مل سکتا تھا۔ انجینئرنگ کے لیے داخلہ ٹیسٹ پاس کرنا ضروری تھا مگر میڈیسن کے لیے نہیں، گویا اسے داخلہ ملنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی تاہم حالات سازگار نہ تھے۔ اس کے اساتذہ بھی خوش تھے۔ امر پال صاحب کو اس سے بھی بہتر نتیجے کی توقع تھی مگر امتحانی مرکز میں جو کچھ ہوا تھا وہ اس سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے کمال کی حوصلہ افزائی کی کہ امتحانی نتیجہ ہی سب کچھ نہیں، اسے ابھی بہت ترقی کرنا ہے۔ اس کے باپ پر اس کامیابی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا البتہ ماں بہت مسرور تھی تاہم اس نے بیٹے کو صاف الفاظ میں کہا: ''مزید مت پڑھو، اب اپنے باپ کا بازو بنو۔ وہ گھریلو دباؤ کو برداشت کرنے کا اہل نہیں رہا، بہتر ہے کوئی ملازمت تلاش کرو''۔ کمال کو معلوم تھا کہ اس کا باپ شدید دباؤ میں ہے لیکن وہ تعلیم ترک کر کے ملازمت کرنے کا متمنی نہیں تھا۔ ماں مطمئن نہ تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ ''ہمارے اور بچے بھی ہیں، ہمیں ان کا بھی کچھ سوچنا ہے''۔ یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ اسکول میں داخلہ کے بعد خادم نے محض کمال کی تعلیم کو مدِنظر رکھتے ہوئے دوسرے دو بیٹوں کو پڑھائی سے محروم رکھا تھا۔ ایک بیٹا اسکول میں داخل ضرور ہوا مگر اس نے تعلیم چھوڑ کر تین روپیہ ماہوار اور کھانے کے عوض گوالے کے ہاں نوکری کر لی۔ یہ تین روپے بھی گھر اور کمال کی تعلیم پر خرچ ہوتے جو اس لیے کے باعثِ کرب تھے۔ ادھر گھر والے یہ سمجھتے ہوں گے کہ لڑکا بڑا خود غرض ہے۔ مثالی شخص بننے کی تگ ودو میں کامیابی صرف تعلیم ہی سے ممکن تھی، اسی لیے وہ یہ راہ بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سوچتے سوچتے وہ کے، این، کالج گیا، فارم لیے اور داخلہ کے امتحان میں بیٹھ گیا۔ امتحان تو اس نے پاس کر لیا مگر داخلے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اس مقصد کے لیے اس نے زرعی کارکن کی حیثیت سے چھوٹا موٹا کام شروع کر دیا اور بالآخر فیس جمع کرنے کے قابل ہو گیا۔

....

کمال صبح ساڑھے سات بجے والی بس میں سوار ہو کر تقریباً دس بجے کالج بس اسٹینڈ پہنچ گیا، گویا وہ ساڑھے دس والی کلاس میں بیٹھ سکتا تھا۔ کلاس شروع ہونے میں چونکہ ابھی تھوڑا سا وقت تھا اس لیے وہ مقصود آباد بس ایسوسی ایشن کے دفتر گیا۔ کالج فیس تو اس نے جمع کرادی تھی مگر بس میں آنے جانے کا کرایہ پورا نہیں تھا۔ اگر وہ عارضی کام پر جاتا تو وقت پر کالج پہنچنا ممکن نہ تھا اور اگر کالج کو ترجیح دیتا تو کرایہ کہاں سے آتا؟ لہٰذا اس نے یہی مناسب سمجھا کہ چند روز کام کرے اور چند روز کالج میں حاضر ہو۔ جلد ہی اسے محسوس ہوا کہ یہ بندوبست اس کی تعلیم میں حارج ہو رہا ہے۔ اسی پس منظر میں وہ ایسوی ایشن کے دفتر گیا تاکہ بس کا رعایتی پاس حاصل کر کے مالی پریشانی کا کچھ مداوا ہو۔ اس کے گاؤں کے ایک شخص نے اسے ایک رقعہ دیا جس کے مطابق ثریا کے باپ رشید خان نے آنے جانے کے لیے ایک مفت پاس کا بندوبست کر دیا تھا۔ اس نے رقعہ پڑھا، پہلے تو اپنی بے عزتی محسوس کی، پھر پریشان ہو گیا۔ شاہد خان کے گھر والے اپنی بچی ثریا کی شادی اس کے ساتھ کرنا چاہتے تھے، یہ نہیں مانا، اب انہوں نے اسے مفت پاس دے دیا ہے، کیا وہ اس کے ساتھ ہمدردی جتا رہے تھے؟ یا یہ ثابت کرنا تھا کہ کمال کس قدر بے بس ہے؟ اس نے سوچا کہ پاس واپس کر دے لیکن پھر ذہن میں آیا کہ شاید وہ لوگ واقعی اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف اسے خوشی ہو رہی تھی کہ اب وہ بلا تعطل روزانہ وقت پر کالج جایا کرے گا۔ اس نے پاس استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن جب پاس کو دوبارہ دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو ایک مہینہ پہلے جاری ہوا تھا، گویا اس کی تجدید کرانا ہوگی۔ گزشتہ دو تین روز سے وہ ایسوی ایشن کے دفتر میں جانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہر بار جھجک آڑے آجاتی۔ اب وہ چلا ہی گیا۔

پاس پر ایسوسی ایشن کے صدر نے دستخط کیے ہوئے تھے اس لیے وہ سیدھا اس کے دفتر گیا۔ دروازے پر اس کے نام کی تختی لگی تھی، ''بھولا ناتھ پال چوہدری''۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ سامنے میز کی دوسری طرف دھوتی پہنے ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے سر اونچا کر کے پوچھا، ''کس سے ملنا ہے؟'' کمال نے اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا اور ساتھ ہی تجدید کے لیے درخواست آگے کر دی۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر خشک لہجے میں کہنے لگا، ''یہ نہیں ہوگا''۔

''کیوں؟''

''اس کے ساتھ تمہیں اپنے کالج کے شتر پریشد کے سیکریٹری یا صدر کا سرٹیفکیٹ بھی لگانا ہوگا۔ کمال یہ سمجھا کہ شاید اس کا اشارہ کالج کی طلباء یونین کے عہدیداروں کی طرف ہے۔ اس نے کہا،'' کالج میں شتر پریشد نہیں بلکہ طلباء کی یونین ہے۔ کیا مجھے اس کے جنرل سیکریٹری سے دستخط کرانا ہوں گے؟''

''نہیں، شتر پریشد کے کسی رکن سے سفارش نامہ چاہیے''۔

''جی! میں سمجھ گیا''۔

کمال جان گیا کہ یہ دراصل اسے حکمران جماعت کا مرہونِ منت بنانے کا ایک ہتھکنڈا ہے۔ وہ بچپن ہی سے کمیونسٹ پارٹی کا رکن تھا۔ جماعت کے کئی رہنماؤں کی کارگزاری سے متفق نہ ہونے کے باوجود اس نے جماعت چھوڑ کر کانگرس میں شمولیت کا کبھی نہیں سوچا تھا، اب گویا پاس کی تجدید کے لیے یہ جال بچھایا گیا ہے، یعنی وہ ان کے پاس جائے اور اسی آڑ میں اس کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیں۔ ایسا تو نہیں ہوگا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ سفارش کے لیے کبھی بھی کانگرس کے کسی رکن سے نہیں ملے گا، بہتر یہی ہے کہ وہ چند روز کام کرے اور اگلے کچھ دن کلاسوں میں حاضری دے۔

وہ تیزی سے چل پڑا۔ دور سے اس نے کالج کے گیٹ پر ایک ہجوم دیکھا۔ نزدیک پہنچا تو گیٹ بند تھا اور باہر طلباء کی مختلف تنظیمیں نعرے لگا رہی تھیں، ''سوویت یونین زندہ باد، امریکی سامراج مردہ باد، امریکہ جواب دو، ساتواں بحری بیڑہ بحرِ ہند میں کیوں ہے؟ امریکی سامراجیت کے گندے ہاتھ توڑ دو، بنگلہ دیش سے چلے جاؤ''۔ کمال کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ گھر سے

پڑھنے کے لیے آیا تھا مگر یہاں تو گیٹ بند ملا۔ مختلف تنظیمیں اور سیاسی جماعتیں امریکی بحری بیڑے کی موجودگی کے خلاف، روس کی حمایت اور پاکستان سے بنگلہ دیش کی آزادی کے حق میں نعرہ زن تھیں۔ طلباء تنظیموں کا شور شرابا یقیناً صحیح تھا مگر کالج کی بندش سے امریکی بحری بیڑے کی ممکنہ کارروائیوں پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟ کمال اس سوال کا جواب جاننا چاہتا تھا۔ پوچھنے پر ایک طالبِ علم رہنما نے الٹا اس سے سوال کیا، ''کیا ہمیں احتجاج نہیں کرنا چاہیے؟''

''لیکن اس مقصد کے لیے تو میمورنڈم پیش کرنا ہی کافی تھا''۔

''تمہارا میمورنڈم کس نے پڑھنا ہے؟''

''یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ہم احتجاج کے لیے ایک یا دو کلاسیں زیادہ پڑھ لیتے''۔

''کیا امریکی صدر یہاں آ کر دیکھتا کہ تم دو ایک کلاسیں زیادہ پڑھ رہے ہو؟''

''اس نے تو یہ بھی نہیں آ کے دیکھنا کہ ہم نے احتجاجاً اپنی کلاسوں کا بائیکاٹ کیا ہے''۔

طلباء رہنماؤں کو کمال کے اعتراضات برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ ایک نے دھمکی کے انداز میں پوچھا، ''کون ہے یہ۔ بڑی باتیں کر رہا ہے؟'' دوسرا بولا، ''بے تکی باتیں مت کرو''۔ ماحول میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ نزدیک ہی لیبارٹری کا ایک ملازم کھڑا تھا، اس نے کمال کو آہستہ سے کہا، ''ان کے ساتھ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس طرف آ جاؤ''۔ یہ کہہ کر وہ کمال کو ہجوم سے باہر لے آیا۔ وہ بڑا پریشان ہوا۔ اس کی ہمدردیاں ہمیشہ سے اس جماعت کے ساتھ تھیں اور ان کی حمایت جاری رکھنے کی خاطر اس نے بس کا پاس نہیں لیا تھا جس کی اسے اپنی تعلیم کے لیے شدید ضرورت تھی، اب یہی بے کار قسم کے لوگ طلباء کے رہنما بنے پھرتے ہیں۔ اس نے لائبریری جانے کا سوچا مگر دروازے بند تھے۔ یہ کارروائیاں طلباء کے مفاد کے منافی تھیں، انہیں ختم ہونا چاہیے، اس نے عالمِ مایوسی میں سوچا اور واپس چل پڑا۔

....

کمال سونے کی غرض سے بستر پر لیٹ تو گیا لیکن رات گئے تک نیند نہ آئی، وہ پہلو بدلتا رہا۔ اگلا دن اتوار تھا اس لیے صبح دیر تک سوئے رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دیر سے اٹھا تو اپنے نام کا ایک رنگین لفافہ دیکھا جو صبح ہی صبح ظفر دے گیا ہوا تھا۔ اس نے کھول کر دیکھا۔ یہ شادی کا دعوت نامہ تھا:

''محترم!

میری پوتی ثریا خان، عرف جوشانہ، دختر رشید خان اور راحیلہ، کی شادی ڈاکٹر رفیق اختر اور صومیہ اختر کے صاحبزادے جمیل اختر، ساکن درگاہ روڈ، کلکتہ، کے ساتھ طے پائی ہے۔ آپ سے شرکت کی درخواست ہے۔

مخلص،

شاہد خان''۔

کمال کو بہت دکھ ہوا۔ وہ سمجھ نہ پایا ثریا کا اس کے گھر آنے اور شادی کی بات چھیڑنے کا مقصد کیا تھا۔ اس وقت اگرچہ اس نے شادی سے انکار کر دیا تھا مگر یہ بھی کہا تھا کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے بعد شادی کرے گا۔ کمال کو اندیشہ تھا کہ ثریا امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس لیے شاید وہ طویل عرصہ اس کا انتظار نہ کرے۔ اس کے خدشات درست ثابت ہوئے لیکن اب اسے دکھ کیوں ہو رہا ہے؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا، ''کیا اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہونا ثریا کی شادی کا سبب ہے؟ اگر سپنا کی طرف سے یہی تجویز آتی تو کیا وہ انکار کر پاتا؟ کیا ثریا کے ساتھ شادی نہ ہونے کی وجہ سپنا ہے؟ اگر یہی بات ہے تو ثریا کی فیصلہ درست ہے''۔

دالان میں ظفر اس کے والدین سے گفتگو کر رہا تھا۔ ''ثریا کا ہونے والا دلہا میڈیسن کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ثریا نے بھی امسال میڈیسن میں داخلہ لے لیا ہے''۔ اس کی ماں بولی، ''وہ واقعی چاندنی جیسی سندر اور بہت سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ جب وہ یہاں آئی تھی مجھے ماں کہہ کے بلاتی رہی ہے۔ اس کا رکھ رکھاؤ اور رویہ بہت عمدہ اور اچھا تھا۔ میرے بیٹے نے اس کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا پتہ نہیں اس کے دماغ میں کون سی شہزادی ہے''۔

اگر کوئی شہزادی تھی بھی تو کمال کا ذہن صاف نہیں تھا۔ اس کے دل و دماغ میں کوئی تو بہر طور نادیدہ صورت تھی۔ وہ سپنا کے بارے میں سوچتا مگر سپنا کے خیالات کیا تھے؟ اُس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا، نہ کمال اس سے پوچھنے کی ہمت کر سکا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ سپنا اس کی کبھی بھی نہیں ہو سکتی پھر بھی اسے خوابوں میں بسائے رہتا۔ اس نے کمال کے ذہن سے ثریا کو نکال کر خود اس کے من آنگن پر قبضہ جما رکھا تھا، مگر ان دونوں کے بیچ سب سے بڑی رکاوٹ مذہب کا فرق تھا۔

....

قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان آنے والے مسلمان ایران، افغانستان، ترکی، عرب اور ایتھوپیا سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو شکست دی۔ وہ اور ان کی اولاد یہاں کے حکمران بنے۔ اچھوتوں اور دیگر ادنیٰ ذاتوں کے ہندوؤں نے کچھ تو اعلیٰ جاتی ہندوؤں کے ہاتھوں ہونے والی محرومیوں اور ظلم و ستم سے نجات پانے اور کچھ صوفیوں کے اثرات کی وجہ سے اسلام قبول کیا۔ مسلمان حکمرانوں کی نوازشات کا حصول بھی قبولِ اسلام کا ایک محرک تھا۔ ابتدائی دور کے مسلمان بیرونی ممالک سے آئے تھے، بعد ازاں مقامی لوگ بھی ان کے حلقۂ مذہب میں آتے گئے۔ ان کی تعداد کچھ بھی رہی ہو، جیسے غیر منقسم بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود وہ سب ہندوؤں کی نگاہ میں بدیشی تھے۔ دورِ حاضر کی 99.99 فیصد مسلمان آبادی ہندوؤں اور بدھوؤں کے ترکِ مذہب کے سبب تھی۔ اب ان میں انتہائی قلیل آبادی ممالکِ غیر سے آنے والے لوگوں کی اولاد میں سے تھی۔

ایک اور بات بھی قابلِ غور تھی۔ تبدیلیِ مذہب سینکڑوں برس قبل کا واقعہ تھا۔ کمال کی ہم عصر نسل نے اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول نہیں کیا تھا بلکہ بچپن ہی سے اپنے پرکھوں کو اسلام پر عمل کرتے دیکھا۔ اس کی نظر میں مذہب کا وہی مقام تھا جو اپنے اسکول، اپنے گاؤں، ماں باپ اور دوسری مقامی چیزوں کا تھا۔ طویل عرصہ تک تو اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اسلام کے علاوہ بھی کوئی اور مذہب ہے۔ تاریخ کی کتابوں کے مطالعہ سے اسے معلوم ہوا کہ اسلام نے تو کسی اور دھرتی پر جنم لیا تھا جبکہ وہ اسے اپنی دھرتی پر جنم لینے والا مذہب سمجھتا رہا کیونکہ اس نے آنکھ کھولتے ہی یہی دیکھا تھا۔

پچھلے ہفتے وہ اپنے استاد امر پال کے گھر سے واپسی پر اپنے گہرے دوست سمیر پال سے ملا جو اس کے اسکول میں پڑھتا تھا، اب اس نے راشٹریہ سیوک سنگھ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اس کی شمولیت سے کمال کو دکھ ہوا تھا کیونکہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ سمیر کسی فرقہ بندی والی جماعت میں شامل ہو جائے گا۔ اب وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ راشٹریہ سیوک کے لوگ کرتے کیا ہیں؟ اس کے علم میں آنے والی چند باتیں تکلیف دہ تھیں اس لیے وہ سمیر سے پوچھنا چاہتا تھا۔ سمیر نے واضح کیا کہ ہندوؤں کا مطلب بالعموم تمام ہندوستانی لیا جاتا ہے۔ کمال کہنے لگا ''یہ تمہارا ذاتی خیال ہو سکتا ہے۔ کئی لوگ اپنا حقیقی چہرہ چھپانے کی غرض سے ایسا دعویٰ کرتے ہیں کیونکہ سوائے مسلمانوں اور عیسائیوں کے باقی تمام جینی، بدھوں اور سکھوں کو اس میں شامل کیا گیا ہے''۔ سمیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ کمال نے لائبریری سے چند کتابیں نکلوائیں، یعنی آل انڈیا ہندو مہا سبھا کا آئین اور Khaki's Shorts Saffron Flags جبکہ گوالکر کی We are Nationhood Defined سمیر سے لی تھی۔

کمال نے ہندو مہا سبھا کے آئین میں درج ''ہندو'' کی تعریف پڑھی:

''ہر ایسا شخص ہندو ہے جو بھارت ورش کو اپنا دیش اور پوتر دھرتی سمجھتے ہوئے خود کو ہندو کہتا اور اس دھرتی پر

جنم لینے والے دوسرے مذاہب، یعنی سنتانی، آریا سماج، جین مت، بدھ مت، براہما اور سکھ دھرم کی پیروی کرتا ہے''۔

سمیر نے پہلو تہی کرتے ہوئے کہا، ''یہ تعریف ہندو مہا سبھا نے کی ہے، راشٹریہ سیوک سنگھ نے نہیں''۔

اس وقت تک کمال کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہندو مہاسبھا، جن سنگھ، راشٹریہ سیوک سنگھ، بجرنگ دل، بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشوا ہندو پرشاد سب کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہے۔ وہ کبھی تو ایک ہونے کا دعویٰ کرتے اور کبھی اپنی اپنی سہولت کے مدِ نظر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے۔ کمال کہنے لگا، ''سوائے راشٹریہ سیوک سنگھ اور وشوا ہندو پرشاد کے، باقی چار پانچ جماعتیں ہندو مہاسبھا کی رکن تھیں۔ راشٹریہ اور ہندو مہاسبھا کے درمیان کیا فرق ہے؟ اگر تمہارے پاس ''ہندو'' کی کوئی اور جامع اور واضح تعریف ہو تو مجھے بتاؤ''۔

سمیر نے گوالکر کی کتاب مطبوعہ ناگ پور 1938 سے ورق گردانی شروع کر دی۔ کمال نے اسے کہا، کتاب مجھے دو، میں تمہیں دکھا دیتا ہوں۔ سمیر سے کتاب لے کر کمال نے صفحہ نمبر ستائیس کھولا اور اسے پڑھنے کو دیا۔ وہ پڑھنے لگا:

''ہندوستان میں رہنے والے غیر ہندو یا تو ہندو ثقافت اور زبان اختیار کریں، ہندو دھرم کا احترام کریں، سوائے ہندو قوم کی عظمت کے اور کوئی خیال ان کے ذہن میں نہ آئے۔ انہیں اپنی عدمِ رواداری اور اس دھرتی اور صدیوں سے موجود ثقافت کے ساتھ ناشکر گزاری کا رویہ ترک کر کے محبت اور جاں سپاری کے مثبت اندازِ فکر کو اپنانا ہوگا۔ مختصر ترین الفاظ میں کسی اور ملک کے ساتھ اپنا بندھن ختم کریں یا پھر ہندو قوم کی باجگزاری قبول کریں جہاں انہیں کوئی حق حاصل نہیں ہوگا، کسی قسم کی مراعات، ترجیحانہ سلوک، حتیٰ کہ شہریوں کے عام حقوق بھی انہیں حاصل نہیں ہوں گے''۔

سمیر پڑھ چکا تو کمال نے نرم لہجے میں کہا، ''تم ایک ہندو ہو، اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں۔ تم نے ایک ہندو گھرانے میں جنم لیا اس لیے ہندو ہو۔ میں ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہونے کے سبب مسلمان ہوں۔ میرا اس میں کیا قصور ہے؟ تم ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے اس لیے ہندو ہو، میں مسلمان خاندان میں پیدا ہو کر مسلمان بنا، پھر یہ کیا کہ سارے شہری حقوق تمہارے جبکہ میرا کوئی حق نہیں؟''

''ہندو ہو جاؤ، تمہیں سب کچھ مل جائے گا''۔

''تم مسلمان نہیں بنے ہو، میں ہندو دھرم کیوں اختیار کروں؟''

''کیونکہ اسلام کہیں اور سے آیا ہے''۔

''کیا تم نے کبھی اپنے آپ سے سوال کیا ہے کہ اتنی کثیر تعداد میں لوگوں نے اپنے پرکھوں کا مذہب کیوں چھوڑا اور کس لیے باہر سے آنے والے مذہب کو قبول کیا؟''

''تم بتاؤ اس کا سبب کیا ہے؟''

کمال نے وضاحت کرتے ہوئے کہا، ''ہندو سماج کے نام نہاد رہنماؤں نے ایسے اصول وضوابط وضع کیے جن کے تحت غریبوں کی بہت بڑی تعداد اپنی کم ترین ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم ہو گئی۔ انہیں شودر، اچھوت اور غیر جاتی لوگ بنا دیا گیا۔ جس دھرم کا نام لے کر ان پر غیر منصفانہ اور ظالمانہ نظام تھونپا گیا اس دھرم سے انہیں کوئی محبت نہ رہی۔ اس صورتِ حال میں ابھی تک کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ تم نے مجھے ہندو بننے کو کہا ہے۔ اگر میں ایسا کرلوں تو کس قسم کا ہندو بنوں گا؟ براہمن، کھشتری، ویش یا شودر؟ میں اس مذہب کی جانب کیوں پلٹوں جس میں تمام ہندوؤں کو مساوی سلوک کی ضمانت نہیں دی گئی؟ تم

لوگوں کو اتحاد میں پرونے کے لیے دھرم کا استعمال کر رہے ہو، باقی لوگوں کو چھوڑو، صرف تمام ہندوؤں کو مساوی درجہ دے دو۔ اگر ایسا ہو جائے، باقی لوگ خود بخود اس طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ اس کے برعکس اگر تم ستم گری اور اکثریت کو محرومی سے دو چار کرنے کے لیے دھرم کو بطور ہتھیار استعمال کرو گے تو کوئی شخص بھی اس طرف نہیں آئے گا، اور جب وہ دھرم کو مذہب کو قبول نہیں کرتے تو غدار کہلاتے ہیں''۔

''کس نے کہا ہے کہ وہ غدار ہیں؟''

''تمہارے گورو کہتے ہیں''، اور کمال نے اسی کتاب کا صفحہ نمبر 127 کھولا۔ سمیر نے پڑھنا شروع کیا۔

''بلاشبہ ان کا جنم اسی دھرتی میں ہوا ہے، لیکن کیا انہوں نے حق نمک ادا کیا ہے۔۔۔۔نہیں۔ مذہب کی تبدیلی کے ساتھ ہی قوم کے ساتھ ان کی محبت اور وابستگی کا رخ بھی بدل گیا۔۔۔۔ انہوں نے دھرتی کے دشمنوں کے ساتھ اپنی شناخت کا اظہار کیا۔ ان کے مقدس مقامات کسی دوسری سرزمین میں ہیں۔ وہ اپنے آپ کو شیخ اور سیّد کہتے ہیں۔ ابھی تک وہ یہی سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں ان کی آمد کا مقصد یہاں اپنی حکومت قائم کرنا ہے۔ ہماری نظر میں یہ عقیدے اور مذہب کی تبدیلی نہیں بلکہ قومی شناخت کو تبدیل کرنے کا عمل ہے۔ دھرتی ماتا کو منجدھار میں چھوڑ کر دشمنوں کی صفوں میں جاملنا غداری نہیں تو اور کیا ہے؟''

سمیر نے کتاب سے سر اٹھاتے ہوئے سوال کیا،'' کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں سارے مسلمان یک آواز ہو جاتے ہیں مگر آپس میں ان کا سر پھٹول ہوتا رہتا ہے؟ کیا تمہیں اس سے بھی انکار ہے کہ پاک و ہند کے درمیان کرکٹ میچوں میں یہاں کے مسلمان پاکستان کی حمایت کرتے ہیں؟''

''چند لوگوں کی خطا کاری پر تمام مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھہرانا قابلِ اعتراض بات ہے۔ سارے مسلمان ایسا نہیں کرتے، چند ایک ضرور یہ حرکت کرتے ہیں۔ کچھ ہندو بھی تو بڑے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ تم نے اخبارات میں پڑھا ہی ہوگا کہ ہماری فوج کے کچھ افسر پاکستان کے لیے جاسوسی کرتے تھے۔ پتہ چلا کہ اس حرکت میں ملوث سارے افسر ہندو تھے۔ کیا ان چند ہندوؤں کی غداری پر تم سارے ہندوؤں کو غدار کہو گے؟ اگر نہیں تو چند مسلمانوں کی خطا پر سارے مسلمان کیوں خطا کار قرار دیے جاتے ہیں؟''

....

ایسے چبھتے ہوئے سوالات نے سمیر کو خاموش کر دیا مگر خود کمال کے اپنے ذہن میں بے شمار سوالات کلبلا رہے تھے۔ وہ یہ بات نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ پاک و ہند کے کرکٹ میچ میں ہندوستانی مسلمان پاکستان کی حمایت کیوں کرتے ہیں۔ اس کا واضح مطلب تو یہ ہوا کہ وہ جس ملک میں رہتے ہیں اسے اپنا نہیں سمجھتے۔ جس ماحول میں ان کی پرورش ہوئی اور جو سلوک ان کے ساتھ روا رکھا گیا اس کی وجہ سے ملک کے بارے میں ان کے خیالات اچھے نہیں، مگر پاکستان کی طرف جھکاؤ چہ معنی دارد؟

اس کی جڑیں تحریکِ پاکستان میں پائی جاتی ہیں۔ مسلمانانِ ہند نے پاکستان کے خدوخال واضح ہوئے بغیر اس کی حمایت کرنا شروع کر دی تھی۔ ان کے بہت سے رشتہ دار پاکستان چلے گئے جبکہ وہ خود وہیں موجود رہے۔ اپنے ملک میں رہنے والے دوسرے مذاہب کے لوگوں کی نسبت پاکستان سے زیادہ قربت کا سبب مذہبی یک جہتی ہے کیونکہ وہاں ان کے رشتہ دار بھی بستے ہیں۔ دوسرے فرقوں کی مخالفت اور مخاصمت نے انہیں اور زیادہ الگ تھلگ کر دیا۔ وہ اس ملک کو اپنا نہ سمجھ سکے۔ ناقابلِ قبول اور غیر مناسب ہونے کی وجہ سے ان سوچوں اور خیالات کو ختم ہونا چاہیے مگر اس کے لیے ان کی ذہنی اور معاشی حالت میں تبدیلی لازمی ہے جو موثر تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ اگر مختلف فرقوں کے لوگوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو فروغ دیا

جاتا، اسی صورت میں وہ اس ملک کو اپنا سمجھتے اور پاک و ہند کرکٹ میچ میں اپنے ملک کی حمایت کرتے۔

تعلیم کے بارے میں سوچتے ہوئے کمال نے خود کو خوش قسمت محسوس کیا۔ اس نے ایسے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی جہاں سیکولر بنیادوں پر سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ایک مدرسہ تعلیمی نظام بھی قائم ہے۔ مدرسوں کی تین اقسام ہیں: ہائی مدرسہ، سینیئر مدرسہ اور خارجی مدرسہ۔ ہائی مدرسہ میں بنگالی، انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، عربی یا فارسی مضامین پڑھائے جاتے ہیں، گویا طلباء کو فارسی یا عربی کی تعلیم دے کر ان کے ذہنوں کو زیرِ بار کیا گیا ہے۔ ان مدارس میں سے زیادہ تر کا معیار اوسط درجے سے بھی کم ہے، یہی وجہ ہے کہ اچھے تعلیمی اداروں کے طلباء سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں اور یوں وہ میڈیسن، انجینئرنگ اور ایڈمنسٹریشن وغیرہ میں داخلہ لینے میں ناکام رہتے ہیں۔ سینئر مدارس کے نصاب میں عربی یا فارسی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ خارجی مدارس میں صرف الٰہیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان مدارس کے فارغ التحصیل طلباء کو سوائے مساجد اور اسی قسم کے مدرسوں کے علاوہ اور کہیں ملازمت ملنا مشکل ہے۔ وہ تاحیات بالعموم بے روزگار رہتے اور اجتماعات میں تقاریر کرنے اور فتاویٰ دینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اس تعلیم کی وجہ سے ان کی اپنے ملک کے ساتھ وابستگی نہیں ہو پاتی۔ اسی طرح ہندوؤں میں بھی گورو کل نظام ہے جہاں سائنسی تعلیم کی بجائے مذہبی، اور وہ بھی کسی خاص مسلک کے احکام کے سوا اور کچھ نہیں سکھایا جاتا۔ چونکہ ہندو دھرم نے اسی دھرتی میں جنم لیا تھا اس لیے اس تعلیم کو بڑی آسانی سے حب الوطنی سمجھتے ہوئے عام مسلمانوں کو غدار قرار دے دیا جاتا ہے کیونکہ اسلام کسی اور دیش میں پیدا ہوا تھا۔

حضرت محمد عرب میں پیدا ہوئے، ان کی زبان عربی تھی، چونکہ وہ امّی تھے اس لیے عربی زبان میں ہی تبلیغ دین کی تھی۔ قرآن کی زبان بھی عربی ہے اس وجہ سے پوری دنیا کے مسلمان عربی زبان اور عرب خطے کو مقدس سمجھتے ہیں۔ اسلام کے ایک اور حکم یعنی حج نے اس اعتقاد کو مزید مستحکم کر دیا۔ صاحبِ ثروت مسلمان بغرضِ حج مکہ اور مدینہ جاتے ہیں۔

حضرت محمد کی تبلیغ کے وقت اسلام عرب کے ایک چھوٹے سے حصے تک محدود تھا اس لیے اس دور کے مسلمانوں کے لیے حج ایسا ہی تھا جیسا کسی بنگالی کے لیے گیا یا کاشی تک کا سفر۔ لیکن اسلام کے پھیلاؤ کے بعد منظر نامہ تبدیل ہو گیا، مثلاً ہندوستان کے عام مسلمانوں کے لیے حج کی غرض سے مکہ مدینہ جانا بڑا مشکل مگر صاحبِ ثروت کے لیے باعثِ سعادت اور آسان ہے۔ کسی عربی کو اس مقصد کی خاطر ہندوستان آنے کی ضرورت نہیں۔ فاصلے اور دوسرے ملک کے محلِ وقوع کے تناظر میں یہ حکم منصفانہ نہیں، لیکن عام مسلمانوں نے اپنے طور پر ہی عرب کو مقدس درجہ دے دیا۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ عربی زبان کو حضرت محمد اور قرآن کی زبان ہونے کے سبب دوسری زبانوں سے زیادہ مقدس و مکرم نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح حضرت محمد کی پیدائش کے سبب عرب دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ متبرک نہیں۔ یہ اپنی تحقیر کے مترادف ہے جسے کسی طور بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کیا کوئی عربی اپنی سرزمین کے علاوہ بھی کسی اور ملک کو مقدس سمجھتا ہے؟

حضرت محمد 570 عیسوی میں مکہ میں پیدا ہوئے اور 632 عیسوی میں رحلت فرمائی۔ وہ ناخواندہ مگر انتہائی دانشمند تھے۔ اپنے دور کے لوگوں کو انہوں نے احکام اور اصول و ضوابط دیے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتے تھے۔ مسلمان یہاں سے دوسرے ممالک میں پہنچے۔ صوفیوں اور مسلمان فاتحین کی وساطت سے یہی تعلیمات اور احکام ہندوستان میں آئے۔ اعلیٰ جاتی ہندوؤں کے ہاتھوں نشانۂ ستم اور محرومیوں کا شکار ہونے والے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ کمال کے ذہن میں آیا کہ "ہمارے دل میں ان خود غرض اور جابر صفت لوگوں کے بارے میں تو بغض اور نفرت کے جذبات ہو سکتے ہیں مگر اس دھرتی کے لیے ایسے خیالات نہیں ہونے چاہئیں۔ ہمیں اپنی دھرتی سے پریم کرنا چاہیے اور ہر وہ کام جو اس دھرتی کے مفاد میں نہ ہو،

اس کی مخالفت ہونی چاہیے۔ یہ ملک ہم سب کا ہے۔ اگر کسی ہموطن سے خطا ہو جائے تو اسے درست کرنا ہوگا۔ اگر راشٹریہ سیوک سنگھ یا کسی اور تنظیم کی جانب سے کوئی غلط اقدام اٹھایا جاتا ہے تو انہیں راہِ راست پر لانے کی ذمہ داری ہماری ہے۔ وہ بھی ہمارے اہلِ وطن ہیں۔ ہمیں ان کے ساتھ مل جل کر رہنا ہے اور انہیں بھی اس سچائی کو سمجھنا ہوگا''۔

....

کمال انہی سوچوں میں گم تھا، ادھر اس کے والدین ظفر سے باتیں کر رہے تھے۔ کمال کو ماں باپ پر ترس آیا کہ انہیں ملک کے گھمبیر مسائل کا ادراک نہیں۔ ان کی سوچ کا دائرہ اپنی ذات، خاندان، ہمسایہ گاؤں، بھوبن پور قصبے اور زیادہ سے زیادہ کلکتہ، جو طول و عرض میں چوبیس میل سے زیادہ نہیں تھا، تک محدود تھا۔ وہ کھیتوں اور گھروں میں کام کرتے، جو مل جاتا کھا پی لیتے، میسر شدہ خوراک کھاتے، ان کا پاک بھارت کرکٹ میچوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کے دل میں ملک کے لیے عداوت یا محبت کے جذبات نہیں تھے۔ اپنا گاؤں ہی ان کی دنیا تھی۔ کمال کو بخوبی یاد تھا کہ یومِ آزادی کے موقع پر جب اسکول میں تعطیل تھی، اسے باپ کو سمجھانا مشکل ہو رہا تھا کہ چھٹی کے باوجود وہ آج اسکول کیوں جا رہا ہے۔

گاؤں کا مکھیا نادر بخش آیا اور اس کے پاس بیٹھ کر کہنے لگا، ''تم نے شاہد خان کی خواہش کے باوجود میڈیسن کی تعلیم حاصل کرنے سے انکار کیا ہے۔ تمہیں امدادی کاموں کے لیے ملازمت کی پیشکش ہوئی، وہ بھی تم نے ٹھکرا دی۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ تمہارے باپ کی مالی حالت اچھی نہیں۔ وہ عمر رسیدہ ہے اور پورے خاندان کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے کیا تمہیں اس کا بوجھ نہیں بٹانا چاہیے؟''

کمال دل میں نادم تھا۔ اس کا باپ ہائی اسکول بھیجنے کی بجائے اسے اپنے ساتھ کاشتکاری میں لانا چاہتا تھا، ماں البتہ تعلیم کے حق میں تھی مگر چاہتی تھی کہ کمال ہائی اسکول کے بعد کوئی ملازمت کر لے تاکہ گھر کی مالی حالت میں قدرے بہتری آئے۔ کمال معمولی نوکری کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کوئی شاندار کام کرے گا۔ اس نے کالج میں داخلہ لیا مگر اخراجات کی رکاوٹ آئی اور وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکا جس کے باعث مزاج میں تلخی در آئی تھی۔ بخش صاحب کی باتوں سے اسے دکھ ہوا۔ اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا، ''کچھ دیر انتظار کر لیجیے، میں کوئی اچھی ملازمت کر لوں گا''۔

عمر رسیدہ نادر بخش کے لیے ماننا مشکل تھا کیونکہ اس نے کسانوں کے بچوں کو دیکھا تھا جو تعلیم میں کوئی خاص پیشرفت نہ کر سکے تھے۔ اگر کوئی امتحان میں کامیاب ہو بھی گیا تو اسے نوکری نہ مل سکی۔ نہ نوکری ملی، نہ کاشتکاری کر سکے، وہ بے روزگار ہی ادھر ادھر پھرتے اور والدین پر بوجھ بنے رہے۔ براہی، عزت پور اور لکشمی پور کے اشرافیہ گھرانوں کے بابوؤں کے بچوں کا معاملہ مختلف تھا۔ چند ایک کو چپڑاسی یا کلرک کی معمولی سی نوکری مل گئی تھی۔ اس نے شک آلود انداز میں کہا، ''بابوؤں کے بچوں کا معاملہ اور ہے، تم کیا کرو گے، ایک کسان کا بچہ کیا کر سکتا ہے؟''

''اس ملک میں کوئی ایسا قانون نہیں ہے کہ کسان کا بچہ کوئی اچھی ملازمت نہیں کر سکتا۔ میں کسی اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں استاد لگ سکتا ہوں۔ براہی میں بی، ڈی او کا دفتر ہے، میں وہاں ملازم ہو سکتا ہوں۔ آپ نے بھوبن پور کے ایس پی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو تو دیکھا ہی ہے، میں ان کی طرح کا افسر بن سکتا ہوں''۔

نادر بخش قدرے پریشان ہو گیا کیونکہ بابوؤں کے بچے تک وہاں نہیں پہنچ پائے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ کلرک بھرتی ہو گئے، اور اس گاؤں کا ایک لڑکا لاف زنی کر رہا ہے کہ وہ افسر بنے گا۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں، اس کے دماغ میں خلل ہے، احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ وہ جانے لگا تو کمال سے پوچھ بیٹھا،

''بڑا مختلف سوال ہے۔ کیا جے بنگلہ کا قیام مناسب تھا؟''

کمال سمجھ گیا کہ یہ سوال مکھیا کی طرف سے نہیں، اس نے کسی اور سے سنا اور اب تصدیق کرنے آیا ہے۔

1947 میں تقسیمِ ہند کے بعد مشرقی بنگال پاکستان میں شامل ہوا جہاں اسے مشرقی پاکستان کہا جانے لگا۔ ملک کی 56 فیصد آبادی کی زبان بنگالی تھی۔ مشرقی پاکستان کے کسی علاقے میں اردو نہیں بولی جاتی تھی، صرف سرحد پار سے آنے والے کچھ مہاجرین اردو بولتے تھے، اس کے باوجود پاکستانی رہنما، مثلاً محمد علی جناح اور لیاقت علی خان وغیرہ اردو کو قومی زبان بنانے کے خواہاں تھے۔ بنگالیوں کا مطالبہ تھا کہ بنگالی کو بھی سرکاری زبان تسلیم کیا جائے مگر مغربی پاکستان کی قیادت رضامند نہیں ہوئی۔ بنگالیوں نے اپنی زبان کے حق میں تحریک شروع کر دی۔ نتیجتاً مشرقی بنگال میں بنگلہ دیش کے نام سے ایک آزاد مملکت ظہور میں آئی۔ تحریک کے دوران بہت سے لوگ یہاں آ گئے اور جے بنگلہ، یعنی بنگال کی فتح کے نعرے مارنے لگے۔ اب بھی بہت سے لوگ بنگلہ دیش کو جے بنگلہ کہتے ہیں۔ نادر بخش نے پوچھا تھا، ''کیا جے بنگلہ کا قیام درست تھا؟'' کمال نے الٹا اس سے سوال کیا، ''آپ کی کیا رائے ہے؟''

''حاجی حسن کہہ رہا تھا کہ مسلم ریاست کمزور ہو گئی تھی''۔

اس ملک کے بے شمار لوگوں کا یہی خیال تھا۔ مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ انہوں نے بنگلہ دیش کے قیام کی خاطر بہت جانوں کی قربانی دی۔ مغربی بنگال کے ہندو بہت شاداں جبکہ مسلمان بنگالی اس پر خوش نہیں تھے۔ بہت سے لوگوں نے تحریکِ پاکستان کی حمایت کی تھی اس لیے وہ تقسیمِ پاکستان کی وجہ سے پریشان ہو گئے۔ کمال نے جواب دیا، ''ہماری مادری زبان ریاست کی سرکاری زبان بن گئی ہے''۔

''یہ تو ٹھیک ہے مگر لوگ کہتے ہیں کہ اردو بھی مسلمانوں کی زبان ہے''۔

''آپ ایک نیک اور پاکباز انسان ہیں۔ کیا آپ کو اردو آتی ہے؟''

''مجھے کیسے آئے گی، میں تو ان پڑھ آدمی ہوں''۔

''لیکن آپ بنگالی تو جانتے ہیں''۔

''ہاں''۔

''کیا یہ اچھا نہیں کہ بنگالی سرکاری زبان بن گئی ہے''۔

''ہاں! اچھا تو ہے''۔

''اب آپ خود ہی بتائیں کہ جے بنگلہ کا قیام بہتر ہے یا نہیں؟''

''میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں۔ اردو سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوا''، یہ کہتے ہوئے نادر بخش وہاں سے چلا گیا۔

....

کمال جانتا تھا کہ کسی کو کوئی بات سمجھانے کے لیے پہلے اس کے ذہن کو ٹٹولنا چاہیے۔ اس دن امر پال صاحب بھی یہی نکتہ ذہن نشین کرانا چاہتے تھے۔ کمال نے ان سے استفسار کیا تھا کہ ہندو کس وجہ سے مسلمانوں کو غیر ملکی، اجنبی اور مخاصمانہ نظروں سے دیکھتے ہیں؟ پال صاحب نے وضاحت کی تھی کہ ''اس سوچ کے پسِ پردہ بہت سی وجوہات ہیں۔ ابتدائی دور میں آنے والے مسلمان غیر ملکی تھے۔ بعد ازاں جب یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تب بھی انہیں غیر ملکی ہی سمجھا جاتا رہا۔ دوسری بات یہ کہ اسلام اس دھرتی کا دھرم نہیں۔ اس کے احکام، رسم و رواج اور تمدن یہاں سے مختلف تھے۔ تیسرا سبب یہ کہ بہت سے مسلمان خود کو فخریہ طور پر ترکی، ایران، عرب، افغانستان اور ایتھوپیا سے آنے والے مسلمانوں کی نسل میں شمار کرتے تھے۔ چوتھی وجہ دونوں، یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سماجی اور تہذیبی اختلافات ہیں۔ ہندو بیاہ شادی کے موقع

پر اپنے گاؤں کے مسلمانوں کو مدعو نہیں کرتے جبکہ دور پار کے ہندوؤں کو دعوت دی جاتی ہے۔ یہی رویہ مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ ہے۔ اگرچہ مستثنیات ہیں مگر انتہائی کم۔ کھانے پینے کی عادات اور پاکی ناپاکی کے موہوم تصورات بھی ذمہ دار ہیں، یعنی بچپن ہی سے ہم سب ''ہم'' اور ''وہ'' کی تفریق میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگ ان بھول بھلیوں سے باہر نہیں نکل پائے۔ اگرچہ یہ ٹھیک نہیں مگر حقیقت یہی ہے''۔

کمال بھی اس تجزیہ کو درست سمجھتا تھا۔ ناقص خیالات کے چکر میں پڑ کر ہندو اپنے مسلمان ہمسایے کو اپنا نہیں سمجھ سکا۔ ان میں دوری قائم رہی۔ یہی حال مسلمانوں کا تھا کہ وہ اپنے ہندو ہمسایوں کو نظر انداز کر کے دور پار، حتیٰ کہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو اپنا سمجھتے تھے۔ اپنے مذہب کی خاطر وہ ہمسایوں کی مخالفت پر تیار ہو جاتے۔ یہ جذبات ان کو وطن مخالفت کی جانب دھکیل دیتے۔ پاک بھارت کرکٹ میچوں کے دوران پاکستان کی حمایت کرنے کا سبب بھی یہی ہے۔ اس صورتِ حال کا خاتمہ ایک ہی طریقے سے ممکن ہے کہ ہم مذہب سے قطعِ نظر ''وہ'' کی سوچ ترک کر کے ''ہم'' کے جذبات کی آبیاری کریں، مگر اس کا حصول کیسے ہو، کمال سوچ میں پڑ گیا۔

....

نئے چاند کی آمد کے سبب آسمان ہنوز تاریکی کی دبیز چادر میں لپٹا ہوا تھا ہاں البتہ ان گنت تاروں کی مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ چند لوگ باہر کھیتوں میں بیٹھے دکھائی دیے۔ کمال نے وقت دیکھا۔ نصف شب کا سمے تھا۔ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ان کی جانب چل دیا۔ ایک نامعلوم سی لہر اس کی رگوں میں دوڑنے لگی۔ صورتِ حال پُرخطر تھی۔ اگر پولیس کو خبر ہوتی تو اس کا پکڑے جانا یقینی تھا مگر کمال خطرہ اٹھانے کو تیار تھا۔ وہ آزادی کی خاطر مقامی لوگوں کو مسلح جدوجہد کے لیے منظم کر رہا تھا۔ اس نے جیب میں رکھے پستول کو ٹٹولا۔ کسی انتہائی صورتِ حال میں اس کے استعمال کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ تقریباً ایک سومیٹر کی دوری سے اس نے کوڈ ورڈ ''نیلا چاند'' کہا۔ فوراً جواب ملا، ''عظیم ساحل''۔ گویا معاملات ٹھیک تھے، مگر یہ بھی تو سکتا ہے کہ پولیس نے وہاں بیٹھے لوگوں کو گرفتار کر لیا ہو اور خفیہ الفاظ جاننے کے بعد کمال کے لیے جال تیار کیا ہو۔

ان لوگوں کو کمال کا نام نعیم بتایا گیا تھا۔ عام طور پر کسی کو اپنے ساتھیوں کے اصل نام کا علم نہیں ہوتا تھا تا کہ گرفتاری کی صورت میں دوسرے لوگ بھی نہ پکڑے جائیں۔ مختلف لوگوں کو ایک ہی شخص کے مختلف نام بتائے جاتے۔ ہائی کمان کے لیے وہ 'ببلب' تھا۔ اسے اپنے افسر کا نام 'انیر بن' بتایا گیا تھا۔ ان سب کی کارروائیاں زیرِ زمین اور خفیہ تھیں، مگر کمال پھر بھی ان میں دلچسپی لے رہا تھا۔

ہائی اسکول کے زمانے ہی سے اس کا رجحان بائیں بازو کی طرف تھا۔ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) کے کچھ رہنماؤں کے غیر ذمہ دارانہ رویے سے دل برداشتہ ہو کر اس نے کیمونسٹ پارٹی (مارکسزم۔لینن ازم) میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اپنی غربت اور دیگر مسائل کے سبب تمام تر کوششوں کے باوجود وہ کالج میں نمایاں کارکردگی نہ دکھا سکا۔ ان حالات میں مارکسزم لینن ازم گروپ کے نظریہ سے متاثر ہو کر وہ اس میں شامل ہو گیا۔ اسے نظریاتی رہنما الا کے، جس کا نام اسے انیر بن بتایا گیا تھا، سے ملاقات کے لیے پیر کی دوپہر کو جج کورٹ کے احاطے میں بلایا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ منتظر رہا مگر مقررہ وقت گزرنے کے باوجود بھی کوئی شخص نہ ملا، نہ ہی کسی قسم کا اشارہ دیا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ گیٹ کے نزدیک کسی نے اسے روک کر پوچھا، ''کیا تم نعیم ہو؟ میں انیر بن ہوں۔ میرے ساتھ آؤ''۔

وہ باتیں کرتے ہوئے عدالت کے قریب چلے گئے۔ کمال نے اس سے پہلا سوال یہ کیا، ''تم لوگ یہ کیوں کہتے ہو

کہ چین کا چیئر مین ہمارا بھی چیئر مین ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ کہنے سے ہمارا مطلب ہے کہ اس کی حکمتِ عملی آزادی کے لیے ہماری رہنمائی کرے گی۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد سرحدوں کا خاتمہ ہو جائے گا''۔

گفتگو ہوتی رہی اور کمال قائل ہو کر لوٹ آیا۔ اس کو سارن پور میں لوگوں کو منظم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس نے علاقے کا تین بار دورہ کیا اور ایک شخص صمد کو اپنا نائب مقرر کیا جس نے کالج کی تعلیم ترک کر دی تھی۔ وہ اسی علاقے کا رہائشی تھا اور لوگوں سے ملاقاتیں اسی کی وساطت سے ہوتی تھیں۔ آج کی خفیہ میٹنگ شروع ہوئی۔ صمد نے تعارف کرایا۔ کمال ان لوگوں کو تنظیم کے مقاصد بتانے ہی والا تھا کہ ایک شخص شبیر نے استفسار کیا، ''ہمیں ہتھیار کب ملیں گے؟'' کمال کو اس کا سوال اور انداز اچھا نہ لگا۔ سب سے پہلے تو انہیں مشن کے بارے میں جانکاری ہونی چاہیے اور پھر ضروری ہوا تو ہتھیار بھی مل سکتے ہیں، لیکن مشن کی غرض و غایت جانے بغیر ہتھیاروں کا حصول نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے، اس لیے اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک اور شخص رفیق نے کہا کہ ہدایت اللہ کو ختم کر دینا چاہیے۔ کمال نے اس کی وجہ پوچھی تو کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے برعکس شمس نے تجویز دی، ''نادر پردھان کو ہٹا دیا جائے''۔ اب کمال نے وجہ پوچھنے کی بجائے اصل موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ بات چیت ہوتی رہی مگر کمال کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ یہ لوگ محنت کشوں کے مسلح انقلاب سے بالکل لاعلم ہیں۔ سارے اپنی اپنی برتری کے سپنوں میں گم دکھائی دیے۔ تنظیم سے کمال کی اپنی وابستگی ذاتی محرومیوں کے باعث تھی تاہم اس کی نگاہ میں ایک مشن بھی تھا جو ان لوگوں کے احاطۂ خیال سے پرے تھا لہٰذا انہیں طویل طبقاتی جدوجہد کے لیے تیار کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اس نے چند نظریاتی اصولوں کی وضاحت کے بعد اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے صمد کو ان کے مطابق عمل کرنے کی تاکید کی۔

بہت دیر ہو چکی تھی۔ رفیق نے کمال کو اپنے گھر شب بسری کی دعوت دی، مگر اسے قبول کرنا خطرناک ہو سکتا تھا، لہٰذا اس نے کوئی خطرہ نہ لیا اور اپنے گاؤں کو چل پڑا۔ سبزہ زار کے بعد سڑک سیدھی گاؤں کو جاتی تھی۔ اس وقت ناگہانی ضرورت مثلاً کسی کی وفات کا سندیسہ دینے کے سوا سفر کرنا بالکل غیر معمولی بات تھی۔ اس نے برگد کے درخت تلے کچھ دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اوپر شاخ پر ایک الو بول رہا تھا، چند چمگادڑیں اڑ رہی تھیں۔ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کمال سوچنے لگا کہ کمیونسٹ پارٹی (مارکسزم) کا بیانیہ درست لگتا ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ ہنوز انقلاب کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ بے چین ہو رہا تھا، ''وہ کب تیار ہوں گے؟ انہیں کیسے تیار کیا جا سکتا ہے؟'' مزید سوچنے سے قبل ہی مچھروں کے غول نے اس پر یلغار کر دی۔ وہ کھڑا ہو گیا، دور گاؤں سے مرغوں کی بانگیں سنائی دینے لگیں۔ یہ رات ختم ہونے کا اعلان تھا۔ لوگ بیدار ہو کر اپنے روزمرہ کاموں میں مصروف ہونے والے ہیں۔ کمال گاؤں کی جانب چل دیا۔

....

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ صبح تھی۔ کمال کا ٹھنڈے پانی میں نہانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ رات گئے گھر پہنچا تو اس وقت نہانے کی بجائے آرام کرنا مناسب سمجھا تھا لیکن اب تو غسل کرنا ہی چاہیے۔ اس کی ماں مریم اٹھ کر چاول بنا رہی تھی۔ پکانے کے بعد اس نے ایک پلیٹ کمال کے آگے رکھی جسے اس نے جلدی جلدی ختم کیا اور کتاب لے کر بھاگ کھڑا ہوا تا کہ ساڑھے سات بجے کی بس پکڑ کر دس بجے تک کالج بس اسٹینڈ پہنچ جائے۔ اس صورت میں ساڑھے دس والے پہلے پیریڈ میں شرکت ہو سکتی تھی۔ اگلی بس کی روانگی کا وقت آٹھ بجے تھا مگر کالج پہنچتے پہنچتے آدھا پیریڈ ختم ہو جاتا۔ کوشش کے باوجود وہ سات بج کر چالیس منٹ پر پہنچ سکا۔ معلوم ہوا کہ بس تو روانہ ہو چکی ہے۔ اگلی بس کو بیس منٹ بعد آنا تھا۔ وہ مایوسی کے عالم میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا کہ خوامخواہ بیس منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔

آٹھ بج گئے لیکن بس کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا، سوا آٹھ ہو گئے لیکن بس غائب۔ چائے والے نے کہا ممکن ہے بس کہیں اور چلی گئی ہو، اب شاید نہ آئے۔ کمال کو ساڑھے آٹھ والی بس کا انتظار کرنا تھا۔ بے چینی میں وہ سڑک پر گیا کہ غالباً دور سے بس آتی دکھائی دے۔ بالآخر آٹھ بج کر چالیس منٹ پر، یعنی ایک گھنٹہ انتظار کے بعد، مسافروں سے کھچا کھچ بھری بس آ گئی۔ چونکہ پہلی بس نہیں آئی تھی اس لیے دو بسوں کے مسافر اس میں بیٹھے تھے۔ اندر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی لہٰذا بس کی چھت کے علاوہ بہت سے مسافر دروازے سے لٹکے ہوئے تھے۔ بس جیسے ہی رکی، کمال نے بھاگ کر دروازے پر لگے لوہے کے ڈنڈے کو پکڑ لیا۔ لوگوں نے شور مچا دیا کہ بالکل گنجائش نہیں ہے، اگلی بس پر آ جانا، مگر کمال کے لیے ممکن نہیں تھا، اور پھر اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ اگلی بس کی حالت یہ نہیں ہو گی؟ اس نے دھکم پیل کر کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ بس روانہ ہوئی اور وہ دروازے میں لٹکتا رہ گیا۔

دوسرا کنڈکٹر بس کے پہلو سے یوں چھت پر چڑھا جیسے بلی درخت پر چڑھتی ہے۔ وہ چھت پر بیٹھے مسافروں سے کرایہ وصول کرنے اوپر گیا تھا۔ بھیڑ کے دباؤ میں کمال کو لگتا تھا کہ وہ ابھی گر کر مر جائے گا۔ بس اگلے سٹاپ پر رکی۔ اترنے والے بڑی تگ و دو کے بعد بس سے باہر آنے میں کامیاب ہوئے۔ انہیں باہر نکلنے کی جگہ دینے کے لیے کمال دروازے سے ایک طرف کھسک گیا۔ منتظر مسافروں کا ایک ریلہ آیا اور اسے دھکا دے کر بس کے اندر پہنچا دیا۔ اگرچہ وہ چاروں طرف سے پھنسا ہوا تھا تاہم گرنے کا اب کوئی خدشہ نہ رہا۔ لوگ ایسے ایک دوسرے سے چمٹے کھڑے تھے جیسے کھجوروں کو ڈبوں میں رکھا جاتا ہے۔ کنڈکٹر متواتر بولے جا رہا تھا، ''دروازہ چھوڑ دو، بس کے اندر بہت جگہ ہے، اندر آ جاؤ''۔ ایک بوڑھے شخص نے اعتراض کیا، ''تم ہمیں اندر آنے کا حکم تو دے رہے ہو، کدھر سے آئیں؟ تمہارے خیال میں اندر فٹ بال کھیلنے کی گنجائش ہے''۔ ایک نوجوان نے مذاق کرتے ہوئے کہا، ''دادا جی! آپ پہلے ہی سے میدان میں ہیں، چلیں ہم میچ کھیلتے ہیں''۔ بوڑھے نے غصے سے اس کو دیکھا۔ ادھر کنڈکٹر کہہ رہا تھا، ''اگر لوگ طریقے سے کھڑے ہوں تو اندر ابھی بھی دس مسافروں کی گنجائش ہے''، اور دس مسافروں کی جگہ نکالنے کے لیے اس نے دروازے میں کھڑے لوگوں کو اندر کھینچنا شروع کر دیا۔ بس چلی تو اس کی رفتار چھکڑے سے زیادہ نہیں تھی۔

سڑک تنگ تھی اور طرفہ تماشا یہ کہ مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے مہاجرین نے سڑک کے کنارے خیمے لگا رکھے تھے۔ مخالف سمت سے بھی گاڑیاں آ رہی تھیں۔ بس اسٹاپ تھوڑے تھے مگر سڑک پر کسی بھی شخص کا اٹھا ہوا ہاتھ دیکھ کر ڈرائیور بس روک لیتا۔ پینتیس کلومیٹر کا فیصلہ ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا۔ منزلِ مقصود پر پہنچتے ہوئے گیارہ بج گئے۔ کمال نے بس سے اترتے ہی دوڑ لگا دی، پھر بھی کالج پہنچتے ہوئے ساڑھے گیارہ بج گئے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کا آمنا سامنا مسٹر گنگو پادھیائے سے ہوا مگر انہوں نے منہ پھیر لیا۔ کلاس کے دروازے پر پہنچ کر دیکھا تو اس وقت بوس صاحب تختۂ سیاہ پر کوئی سوال حل کر رہے تھے۔ چند ہم جماعتوں نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا مگر وہ متامل تھا۔ بوس صاحب نے اسے دیکھا تو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ الجبرا کا کوئی فارمولا سمجھا رہے تھے لیکن کمال کوشش کے باوجود بھی سمجھ نہ پایا۔ یہ اس کے لیے ایک اور مسئلہ تھا کیونکہ وہ اس سے پہلے ان کی کسی کلاس میں نہیں آ سکا تھا۔ کتاب بھی نہیں تھی کہ گھر میں پڑھ لیتا۔ کلاسوں میں وقت پر نہ آنے کا نقصان واضح تھا۔

رات کو دیر تک جاگنے سے نیند بھی پوری نہ ہوئی تھی، پھر گھر سے کالج تک کا تکلیف دہ سفر، اب کلاس میں غنودگی محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھنے اور سوال پر بھرپور توجہ دینے کی کوشش کرتا رہا۔ اتنی تکلیف اٹھانے کا مقصد ایک ہی تھا، اپنے آپ کو کسی مقام پر پہنچانا۔ لیکن کیا یہ کامیابی تھی؟ یہ تعلیم اسے مشہور سائنسدان بننے میں مدد نہیں دے سکتی۔ اگر وہ بنیادی باتیں ہی نہیں سیکھ پایا تو سائنسدان کیسے بن سکتا ہے؟ غربت کے باعث وہ پڑھائی میں اب تک ہونے والے نقصان کا ازالہ نہیں کر سکتا

تاوقتیکہ اسے کسی شخص یا ادارے کی مالی معاونت حاصل نہ ہو۔کیا بہتر نہیں تھا کہ شاہد خان صاحب کی پیشکش قبول کر لیتا؟

اس کی اسکول کی تعلیم مضبوط بنیادوں پر استوار تھی، یہی وجہ ہے کہ کالج میں ابتدائی طور پر اسے بہت اچھا اور محنتی طالب علم سمجھا گیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کلاسوں میں اس کی حاضری کم ہوتی گئی۔ کتابوں کی عدم دستیابی کے سبب وہ صحیح طور پر مطالعہ کرنے سے قاصر تھا، علاوہ ازیں اس نے بہت سی کلاسیں چھوڑ بھی دی تھیں، لہٰذا وہ بتدریج باقیوں سے پیچھے رہ گیا۔

ایک روز گنگو پادھیائے صاحب نے اسے کلاس سے باہر پکڑ لیا اور پوچھا، ''تم کل کلاس میں کیوں نہیں آئے تھے؟''
کمال اصل بات بتانے میں ہچکچا رہا تھا مگر پروفیسر صاحب کے مجبور کرنے پر اس نے صاف صاف بتا دیا کہ ان کی مالی حالت بہت خستہ ہے۔

''مالی حالت اور کلاسوں سے غائب رہنے کا آپس میں کیا تعلق ہے؟''

''سر! میں بس میں آتا ہوں اور جب کرایہ نہیں ہوتا، مجھے چھٹی کرنا پڑتی ہے''۔

پروفیسر صاحب قدرے پریشان نظر آئے، ''اچھا، اب تم کلاس میں جاؤ''۔

اگلے روز انہوں نے کمال کو بتایا کہ ان کی درخواست پر ہوسٹل انتظامیہ اسے مفت رہائش دینے پر راضی ہے۔

''لیکن سر! کھانے پینے کے اخراجات کتنے ہوں گے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ وہ انتظامیہ کی ذمہ داری ہے''۔

کمال اسے قبول نہیں کر سکا۔ اس کے خیال میں یہ تجویز شاہد صاحب کی پیشکش سے بھی زیادہ بُری ہے کیونکہ یہاں وہ متعدد طلباء کا مقروض ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے پروفیسر صاحب سے معذرت کی، ''سر! میں اس طریقے سے یہاں رہنا نہیں چاہتا''۔

''اور تم روزانہ گھر سے یہاں آنے کے بعد پڑھائی پر بھی توجہ نہیں دے سکو گے''۔

''سر! میں کوئی متبادل راہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں''۔

بالآخر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ اسے تین طلباء کو پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔ جس پر اسے بگن پاڑا منتقل ہونا پڑا۔ اب وہ کلاسوں میں بلاناغہ آنے لگا۔ مگر ایک مشکل تھی کہ پڑھانے کے لیے اسے صبح شام جانا پڑتا جو اس کی اپنی تعلیم میں حارج تھا۔ ان حالات کی وجہ سے اس کے مزاج میں تلخی بھی آنے لگی تھی۔ اس کی نظر میں کسی کے گھر جا کر پڑھانا، وہ بھی امیر گھرانے کے ایسے بچوں کو جو تعلیم کے نام سے بدکتے تھے، دنیا میں اس سے زیادہ ذلت آمیز اور کوئی ملازمت نہیں تھی۔ وہ ملازمت جاری نہ رکھ سکا اور یوں دوبارہ گاؤں اور کالج کے درمیان روزانہ سفر کی تکلیف برداشت کرنے لگا۔ بس کے کرایے کے لیے اس نے براہی میں ایک معمولی سی نوکری تلاش کر لی۔ وہ کالج سے واپسی پر براہی اتر کر لڑکے کو پڑھاتا اور رات گئے گھر لوٹتا۔ وقت نہ ہونے کی وجہ سے اپنی کلاسوں اور پڑھائی میں خاص توجہ نہ دے پاتا، بلکہ آہستہ آہستہ بیزار بھی رہنے لگا۔ اسے اب سمجھ آئی کہ جو طلباء کلاس میں توجہ نہیں دیتے اور پڑھائی میں خاطر خواہ محنت نہیں کرتے، وہ کن مسائل سے دوچار رہتے ہیں۔

خیالات کا تانا بانا اس وقت ٹوٹا جب گھنٹی کی تیز آواز سنائی۔ دیکھا کہ بوس صاحب لیکچر ختم کر کے باہر جا رہے تھے۔ وہ بھی دوسروں کے ساتھ کلاس سے باہر آیا۔ شعبۂ معاشیات کے طالب علم تپن نے اس کے پاس آکر آہستہ سے کہا کہ آج ساڑھے سات بجے ایک میٹنگ ہے، اسے بھی بلایا گیا ہے۔

''اگر میں ساڑھے سات بجے میٹنگ میں آیا تو گھر کیسے پہنچ پاؤں گا کیونکہ آخری بس سات بج کر دس منٹ پر روانہ ہوتی ہے''۔

''تمی کے ساتھ ٹھہر جانا''۔

''میں گھر کیسے اطلاع دوں گا، اور پھر واپسی پر مجھے براہی میں ایک طالب علم کو بھی پڑھانا ہوتا ہے۔ وہ میرا انتظار کرے گا''۔

''کسی طریقے سے انہیں مطلع کرنے کی کوشش کرو''۔

''ٹھیک ہے''۔

کمال نے کہہ تو دیا مگر کوشش نہیں کی۔ اب اسے ایسی میٹنگوں میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس کے مالی حالات ناگفتہ بہ تھے، اسی بنا پر علی صاحب نے کیمونسٹ پارٹی میں شمولیت کے لیے اسے راضی کر لیا تھا۔ اس نے پارٹی میں شمولیت کے بعد جلسے جلوسوں میں حصہ لیا اور رہنماؤں کی بلائی گئی میٹنگز میں جاتا رہا۔ کالج کے زمانے میں نکسل وادیوں سے متاثر ہو کر اس کا جھکاؤ ان کی طرف ہو گیا۔ انہوں نے معالجین کو اپنی فیسیں کم کرنے پر مجبور کیا، جاگیرداروں سے فالتو زمینیں لے کر غریب کسانوں میں تقسیم کیں اور سود خوری پر قابو پایا۔ کمال کے لیے ان اقدامات میں بہت کشش تھی۔

بلاشبہ معالجین کے والدین بچوں کو ڈاکٹر بنانے میں زرِ کثیر خرچ کرتے ہیں مگر حکومت ان سے بھی زیادہ اخراجات کرتی ہے۔ حکومت کا یہ بیسہ درحقیقت عام آدمی کی جیب سے نکلتا ہے مگر ڈاکٹر بعد ازاں غریبوں سے لاپروا ہو جاتے۔ سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے وہ تنخواہیں، ذاتی پریکٹس نہ کرنے کا الاؤنس وصول کرنے اور سرکاری رہائش گاہوں میں رہتے ہوئے بھی ذاتی پریکٹس کرنے سے باز نہیں آتے، اور پھر ڈیوٹی کے وقت اسپتالوں میں موجود نہیں ہوتے۔ اوپر سے ذاتی پریکٹس میں اتنی بھاری فیسیں مانگتے ہیں جنہیں برداشت کرنا عام لوگوں کے بس میں نہیں ہوتا۔

نکسل وادیوں نے تمام معالجین کو پابند کیا کہ وہ کسی مریض سے دس روپے سے زیادہ فیس نہیں لیں گے، بصورتِ دیگر انہیں نتائج کا سامنا کرنا ہوگا، اور نتائج کیا تھے؟ سب کو علم تھا۔ کمال ان اقدامات سے بہت خوش تھا۔

کیمونسٹ پارٹی (مارکسزم) نے غریب کسانوں، بٹائی پر کاشتکاری کرنے والوں اور بے زمین لوگوں کے حق میں بہت اعلانات کیے تھے لیکن جب اس کے باپ پر، جو حصے داری کی بنیاد پر کاشتکاری کرتا تھا، جاگیردار نے مقدمہ کیا تو اس نے پارٹی ہی کے ایک رہنما کو اپنا وکیل مقرر کر لیا۔ کمال کے اعتراض پر وکیل نے جواب دیا یہ تو میرا پیشہ ہے۔ اس نے جماعت کے رہنماؤں سے سوال کیا، ''ایک شخص جو میرے باپ کو بے دخل کرنے کے مقدمہ میں جاگیردار کا ساتھ دے رہا ہے، کیمونسٹ پارٹی کا رہنما کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس کا جواب دینا کسی نے گوارا نہیں کیا۔

کمال نے کئی بار پارٹی رہنماؤں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کوشش کی کہ اس کے گاؤں میں زیادہ تر کھیتوں کی ملکیت براہی، لکشمی پور اور عزت پور کے جاگیرداروں کے پاس ہے جو خود اچھی ملازمتوں پر بھی فائز ہیں، اگر انہیں اپنی زمینوں سے کوئی آمدن نہ ہو، تب بھی وہ اچھا خاصا گزارا کرنے کے اہل ہیں۔ اس کے برعکس اس کے گاؤں کے زیادہ تر کاشتکار بے زمین اور غریب ہیں جو زمین کے ایک ٹکڑے سے اپنی ضروریات بمشکل پوری کرتے ہیں۔ لیکن اس کی درخواستوں پر کسی رہنما کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ان پر اثر ہوتا بھی کیسے؟ جاگیردار اور سود خور تو پارٹی میں شامل تھے۔ پارٹی میٹنگ میں کمال نے جب ایک سود خور کو اسٹیج پر بیٹھے دیکھا تو پارٹی کے ساتھ اس کا رومان ختم ہو گیا، اور وہ نکسل باڑیوں کی جانب جھک گیا۔

لیکن نکسل وادیوں کے روا رکھے قتل و خون کی وہ حمایت نہ کر سکا۔ یہ صحیح ہے کہ ابتداً سزا دینے کے معاملہ میں وہ بہت محتاط تھے، صرف بہت برے افراد ہی کو نشانہ بنایا جاتا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صورتِ حال میں تبدیلی آگئی۔ بہت سے بدطینت اور بدخصلت لوگ بھی نکسل وادیوں میں آملے، دوسری جماعتوں نے بھی سازش کے تحت ایسے لوگوں کو ان میں

شامل کرا دیا۔ انہوں نے قتل و خون میں بے احتیاطی کی انتہا کر دی جس کی وجہ سے عام لوگ ان کے مخالف ہو گئے۔ وہ مارے خوف کے کھلم کھلا مخالفت تو نہ کر سکے مگر خفیہ طور پر ان کے خلاف کام کرتے رہے۔

نکسل وادیوں کا اسکولوں اور کالجوں کو نذرِ آتش کرنا کمال سے برداشت نہ ہوا۔ امیر لوگ اپنے بچوں کو تعلیم کی غرض سے دوسرے علاقوں، حتیٰ کہ بیرونِ ملک بھی بھیج سکتے ہیں مگر غریب کیا کریں؟ لٰہذا تعلیمی اداروں کی تباہی سے غریب بری طرح متاثر ہوئے۔ کمال نے رہنماؤں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ ان کی دلیل بڑی عجیب تھی کہ تعلیمی اداروں سے صرف سرمایہ داروں کے گماشتے، یعنی بورژوا طبقہ ہی نکلتا ہے۔ کمال اس سے متفق نہ ہوا۔ تاریخ اور فلسفہ جیسے مضامین کی تعلیم کے لیے تو یہ دعویٰ کسی حد تک ٹھیک ہے مگر دیگر مضامین، مثلاً میڈیسن، انجینئرنگ، حساب وغیرہ کے لیے کوئی جواز نہیں بنتا۔ کیا کسی کمیونسٹ ملک میں مستطیل کو مربع سمجھا جا سکتا ہے، کیا (a+b)2 کسی طور بھی a2+b2+2ab کے علاوہ ہو سکتا ہے؟ بالکل نہیں، اور یوں وہ نکسل وادیوں سے بھی پرے ہٹ گیا۔ اب وہ ان کی میٹنگز میں باقاعدگی سے شمولیت سے گریز کرنے لگا۔ میٹنگ کا دعوت نامہ ملنے کے بعد اس نے نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ہر جمعہ کی دوپہر کا ایک خالی پیریڈ مسلمان طلباء کو نماز کی ادائیگی کے لیے مخصوص تھا۔ کمال نے کافی عرصہ سے نماز ترک کر دی تھی اس لیے وہ مسجد جانے کی بجائے لائبریری چلا جاتا۔ کالج کی فیس واجب الادا تھی جس کے سبب اس کے لائبریری کارڈ کی تجدید نہ ہو سکی، پھر بھی وہ چلا جاتا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ اس کی ملاقات شعبۂ معاشیات کی سنجوگتا اور شعبۂ انگریزی کی نسرین سے ہوئی۔ اوّل الذکر براہی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی بھتیجی تھی۔ کمال اسے اسی حیثیت سے جانتا تھا۔ وہ پڑھائی میں بہت اچھی تھی اور ہائر سیکنڈری امتحان میں آرٹس طلباء و طالبات میں ضلع بھر میں اوّل آئی تھی۔ کالج میں داخلہ لینے کے بعد اس نے خود کمال سے اپنا تعارف کرایا تھا۔ یوں اس کے ساتھ اچھے تعلقات شروع ہی سے قائم ہو گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر کمال کی خیریت دریافت کی۔ کمال نے بھی اس کا حال پوچھا۔ وہ بولی، ''اچھی ہوں۔ نسرین تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تم نے اس کے ساتھ بدتمیزی کی ہے''۔

کمال سوچ میں پڑ گیا یہ کب کی بات ہے؟ آخر اسے یاد آیا کہ ایک روز لائبریری سے واپسی پر نسرین کے حسب و نسب پر کوئی بحث ہوئی تھی۔ کمال کو اس کے دعویٰ سے اتفاق نہیں تھا کہ وہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے اس نے سوال کیا، ''مان لیا کہ تمہارا خاندان بڑا اعلیٰ ہے مگر اس میں تمہارا اپنا کمال کیا ہے؟'' اس پر نسرین کے دوست اندرناتھ نے اعتراض کیا، ''ارے میاں! کیا تمہیں علم ہے کہ نسرین فتح آباد کے نواب کی اولاد میں سے ہے؟''

یہ سنتے ہی کمال بھڑک اٹھا، ''مجھے علم نہیں کہ نوابوں کی پیدائش فتح آباد میں ہوئی تھی مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ ان کی تاریخ باعثِ شرم ہے۔ وہ اپنے کن کارناموں پر فخر کرتے ہیں؟

نسرین بھی طیش میں آ گئی لیکن اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اندرناتھ کہنے لگا، ''دماغ خراب ہے تمہارا؟ میں نے خود اپنی آنکھوں سے نوابوں کے محلات دیکھے ہیں۔ ہمارے گاؤں کا سدھا کر بسواس ان کا ملازم رہ چکا ہے، وہ ابھی بھی زندہ ہے''۔

''اس سے کیا یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ نسرین نواب خاندان سے ہے، حالانکہ فتح آباد کے نواب ملکی مفاد کے خلاف کام کرنے والوں میں سے تھے؟''

''کیا مطلب؟''، اِندر نے پوچھا۔

کمال نے وضاحت کی، ''نسرین کے آباؤ اجداد ایران سے آئے تھے۔ ان کا قالینوں کا کاروبار تھا۔ برطانوی حکومت میں وہ ان کے ایجنٹ بن گئے۔ وہ انگریز تاجروں سے درآمد شدہ کپڑا خرید کر گراں قیمت پر فروخت کرتے اور اُن کے

لیے ریشم اور سوتی پٹڑا خریدتے، یوں ان کے ایجنٹ بن کر اچھا خاصا مال کمایا۔ پھر Permanent Settlement اور Sunset Law کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فیرار پور کے چوہدریوں سے زمینیں خرید کر خود بھی زمیندار بن گئے۔ 1857 کی جنگِ آزادی میں انہوں نے غیر ملکی حکومت کی مدد کی اور صلے میں نواب کا خطاب حاصل کیا۔ کیا یہ ہے وہ تاریخ جس پر یہ لوگ فخر کرتے ہیں؟''

نسرین اپنے خاندان کے پس منظر سے بالکل لاعلم تھی اس لیے وہ کچھ نہ بول سکی۔ اِندر بھی خاموش ہوگیا۔ کمال نے مزید کہا، ''افسوس ہے کہ نسرین ابھی تک نواب زادی ہے، نواب زادی نسرین جہاں چوہدری۔ زمینداری کا نظام 1955 میں ختم ہوگیا، برطانوی راج رخصت ہوا، برسوں پہلے سب کچھ ختم ہوگیا مگر خطاب کا نشہ ختم نہیں ہوسکا''۔

اس توہین اور طیش کے سبب نسرین کا رنگ زرد ہوگیا۔ وہ اس سانپ کی مانند تھی جو صرف پھنکار سکتا تھا، حملہ کرنے کے قابل نہیں۔ اِندر خاموش کھڑا رہا۔ کمال نے باتیں تو ٹھیک کی تھیں مگر اس کا انداز درست نہیں تھا۔ خود کمال بھی سمجھ میں نہ پایا کہ اچانک بھڑک اٹھنے کا سبب کیا تھا، اور نسرین سے کیوں اس تلخ لہجے میں بات کی حالانکہ اُس کی جانب سے کوئی ایسی ویسی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔

نسرین کالج میں کمال سے ایک برس پیچھے انگلش آنرز کی طالبہ تھی۔ وہ اس سے شناسا نہیں تھا۔ انٹر کالج مباحثہ کے مقابلہ میں کمال نے اوّل انعام جیتا، تب نسرین اس کے پاس آئی اور اپنا تعارف کرایا۔ اس وقت اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو کمال کو بُری لگتی مگر اس کے یہ تعارفی الفاظ اسے چبھ سے گئے، ''کیا تم نے فتح آباد کے نواب خاندان کا نام سنا ہے؟ میرا تعلق اس خاندان سے ہے''۔

کمال سمجھ نہ پایا کہ نسرین نے کیا غلط بات کی تھی جو اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ خود ایک غریب گھرانے سے تھا، کیا یہی سبب تھا اس کی اپنی دل آزاری اور تلخ لہجے کا؟ وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ نسرین کے ساتھ اس دن کا تلخ رویّہ اسے خود بھی پسند نہیں تھا لہٰذا اس نے سنجوگتا سے معذرت کی، ''اگر اسے میرے رویّے سے دکھ پہنچا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ میرا ایسا بالکل ارادہ نہیں تھا۔ چلو! بتاؤ کیا کہنا ہے؟''

نسرین آگے بڑھی اور سنجوگتا سے بولی، ''میں مسٹر منڈل سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں''۔

اس وقت تک وہ باٹنی ڈیپارٹمنٹ کے سامنے برگد کے درخت تلے آچکے تھے۔ کمال نے نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''پلیز، پوچھو''۔

نسرین نے پوچھا، ''اگر کوئی شخص اعلیٰ خاندان سے ہو تو کیا اسی وجہ سے اسے بُرا کہا جاسکتا ہے؟ کیا امیر گھرانے میں جنم لینا پاپ ہے؟''

جواب دیتے ہوئے کمال کے لہجے میں طنز نمایاں تھا، ''امیر گھرانے میں جنم لینا پاپ کیسے ہوا؟ ہاں، میری طرح غریب گھر میں پیدا ہونا ضرور گناہ ہے۔ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہونا کسی بہت بڑی نیکی کا اجر ہے۔ نیکی کا پھل دیکھ لو۔ تم فتح پور کے نواب خاندان سے ہو۔ جو چاہو، پہن لو۔ تم نے بھوبن پور میں رہنے کے لیے کرایے پر ایک خوبصورت گھر لے رکھا ہے، خدمت کے لیے فتح پور سے ملازمہ بھی آئی ہوئی ہے، کالج آنے جانے کے لیے گاڑی ہے، کیا یہ ساری چیزیں کسی نیکی کا اجر نہیں؟ اور مجھے دیکھو! میں صبح چھ بجے اٹھتا ہوں، جو روکھی سوکھی مل جائے، کھا کر بس پکڑنے کے لیے دوڑ پڑتا ہوں۔ بس میں ڈھائی گھنٹے گزارہ کر، دھکے کھا کر بس سے اترتا ہوں، اور پھر کالج کی طرف دوڑ لگا دیتا ہوں۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ دو پیریڈ نکل چکے ہیں۔ کالج کے بعد پھر سے بس اسٹینڈ کی طرف بھاگنا، مسافروں سے بھری بس میں سفر کرکے براہ راست اتر کر محض بس کرایے کی خاطر ایک لڑکے کو پڑھانا، اور جب میں گھر پہنچتا ہوں تو آدھی سے زیادہ رات بیت چکی ہوتی ہے۔ یہ ہے گناہ''۔

''مسز گنگو پادھیائے نے تو تمہیں ہوسٹل میں رہنے کو کہا تھا''۔

''پتہ ہے شرط کیا تھی؟ میں ان کی شرائط پر کیوں ہوسٹل میں رہوں؟''

''تم رہنے کے لیے تیار ہو جاؤ، اخراجات میرے ذمہ''۔

''میں تمہاری مدد کیوں لوں؟ تم میری کیا لگتی ہو؟''

سنجو گتا نے محسوس کیا کہ صورتِ حال بہت گھمبیر ہوگئی ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں اس نے کہا، ''نسرین! یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ پہلے تم کمال کے قریب ہو جاؤ پھر اس کے بعد ہی ایسی پیشکش ہو سکتی ہے''۔ سنجو گتا نے اپنے الفاظ کی وضاحت نہ کی۔ کمال نے اعتراض کیا، ''ایسی بات مت کرو''۔

''ٹھیک ہے، نہیں کروں گی۔ کیا تم لائبریری نہیں جاؤ گے؟ آؤ نسرین چلیں۔ اس سے بعد میں بات کریں گے''۔

وہ تینوں چل دیے۔ فزکس ڈیپارٹمنٹ پہنچ کر سنجو گتا اور نسرین تجربہ گاہ میں چلی گئیں، کمال سیڑھیاں چڑھ کر لائبریری چلا گیا۔ اس کا ہم جماعت پُورن لائبریری سے باہر نکل رہا تھا۔ کمال نے اسے اپنے ساتھ واپس لائبریری جانے کو کہا۔

''کس لیے؟''

''مجھے چند کتابیں لینی ہیں، اس کے لیے تمہارا کارڈ چاہیئے''۔

پُورن نے اپنا کارڈ اسے دیا اور کمال مطالعہ گاہ میں داخل ہو گیا۔ الماری سے Bettlehem کی تصنیف India Since Independence نکال کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ابھی اس نے کتاب کھولی بھی نہ تھی کہ نسرین سامنے والی کرسی پر آ بیٹھی۔ کمال نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ہولے سے پوچھا، ''کیا تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟'' نسرین نے جواب دیا، ''گھر والے مجھے اپنی ضرورت سے زیادہ پیسے بھیج دیتے ہیں جو میں کپڑوں کی خریداری، کھانے پینے اور فلمیں دیکھنے پر خرچ کر دیتی ہوں۔ اگر میں وہی رقم تمہاری تعلیم پر خرچ کروں تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟''

''کیا یہ جاننا ضروری ہے کہ میں اعتراض کیوں کرتا ہوں؟''

''بالکل''۔

''تم میری مدد کیوں کرنا چاہتی ہو؟ میں غریب ہوں اس لیے؟''

''ہاں''

''میں تمہاری مدد لینا ضروری نہیں سمجھتا''۔

''کیوں؟ تعلیم کے لیے پیسوں کا نہ ہونا تمہارے دکھ کا سبب ہے۔ میں سمجھتی ہوں، لیکن اس کے لیے تمام امیروں سے نفرت نہیں کی جا سکتی۔ اگر میں امیر گھرانے میں پیدا ہوئی ہوں تو اس میں میری خطا کیا ہے؟''

''میں نے کب کہا ہے کہ یہ تمہاری خطا ہے''۔

''پھر مجھ سے ناراض کیوں ہو؟''

''میں تمہیں سمجھا نہیں سکا تھا کہ تم لوگوں سے میں قطعاً ناراض نہیں ہوں۔ میں تو دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف ہوں۔ کچھ لوگوں کے پاس ان کی ضروریات سے زیادہ دولت ہے جسے وہ اللے تللوں میں خرچ کرتے ہیں اور کسی کے پاس کم سے کم ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا، اور وہ صبح شام دکھ جھیلتے ہیں''۔

''اس نظام کو بدل دو''۔

''ایسا کروں گا مگر میری زندگی کے یہ دن لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے میں دوبارہ کالج نہیں آ

سکوں گا''۔

''اس وجہ سے میں تمہیں مجبور کر رہی ہوں کہ میری مدد سے اپنی تعلیم مکمل کرو''۔

''ضرور مگر اس طرح نہیں جو تم کہتی ہو۔ وقت ہو گیا ہے، آؤ اب چلتے ہیں۔ مجھے طبیعیات کی کلاس میں جانا ہے''۔

وہ دونوں اٹھے اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ کمال اپنی کلاس کی طرف چل دیا، نسرین اپنے ڈیپارٹمنٹ کی جانب۔ کمال کی کلاس میں 'روشنی' پر لیکچر دیا جا رہا تھا۔ وہ چونکہ اسکول میں پڑھ چکا تھا اس لیے سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی۔ اگر اس کے پاس کتابیں اور مطالعہ کا وقت ہوتا تو تمام مضامین سمجھ لیتا، اور اس کے لیے تو مطالعہ باعثِ لطف تھا۔ کاش کالج اس کے گھر سے نزدیک ہوتا! گھنٹی بجنے سے کلاس کے خاتمہ کا اعلان ہوا۔ کمال کمرے سے نکل کر مرکزی عمارت کی طرف جا رہا تھا کہ برگد کے درخت کے پاس کالج کا ثقافتی سیکرٹری رانا داس بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا اور پوچھا، ''کمال! کیا تم نے اگلے پیر کو ہونے والی مباحثے کی تیاری کر لی ہے؟ تم نے گرلز کالج کی رینا کو شکست دینی ہے۔ ذہن میں رکھو''۔ کمال نے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور کہا، ''میں پوری پوری کوشش کروں گا''۔ رانا داس نے جواب دیا، ''مجھے سوائے اوّل انعام کے اور کچھ نہیں سننا''۔ کمال مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔

کیمسٹری آنرز کا پریکٹیکل، وقت تین گھنٹے: انہیں تجربہ گاہ میں مختلف کیمیائی مواد کے ساتھ کام کرنا تھا جس سے وہاں مختلف گیسیں بھی پیدا ہو جاتی تھیں۔ پروفیسر نے طلباء کو خالی پیٹ تجربہ گاہ میں آنے سے منع کیا تھا مبادا گیس کی وجہ سے کسی کی طبیعت خراب ہو جائے۔ لہٰذا تمام طلباء گھروں سے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آئے تھے، چند ایک نے کینٹین سے خرید لیا۔ کمال گھر سے خالی پیٹ آیا تھا اور اس وقت بھی کھانے کو کچھ نہ تھا، نہ ہی اتنے پیسے تھے کہ کینٹین سے کچھ خرید لیتا۔ بہر حال، اسی حالت میں اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ کام کرتے کرتے دیکھا تو ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ اگر اسے تاخیر ہوئی تو سوا چھے بجے کی بس چھوٹ جاتی۔ تجربہ مکمل کیے بغیر اس نے سامان متعلقہ نگران کے حوالے کیا اور بس کے لیے دوڑ لگا دی۔ جیسے ہی وہ اسٹینڈ پہنچا، بس آہستہ سے چلنے لگی۔ وہ دوڑ کر اس میں سوار ہو گیا۔

کالج کے لیے صبح جلدی آنے کے سبب سارا دن وہ بھوکا رہتا جس نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ اسے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس نے بس کے فرش پر بیٹھ جانا چاہا، چونکہ یہ مناسب نہیں تھا اس لیے وہ کسی نہ کسی طور کھڑا رہا۔ صبح والی بس کی نسبت یہ بہتر تھی مگر کمال کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے براہی بہت دور ہو گیا ہو۔ ساڑھے آٹھ بجے وہ براہی پہنچا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے نیچے اترا۔ ابھی اسے پڑھانے کے لیے بھی جانا تھا۔ طالبِ علم کا باپ ایک سرکاری ملازم تھا جو دس بجے سے شام پانچ بجے تک نوکری کرتا مگر اتنی تنخواہ مل جاتی کہ گھر کی ضروریات پوری کرنے کے بعد اپنے بیٹے کے لیے ایک استاد بھی رکھ سکتا تھا۔ اس کے برعکس کمال کا باپ کھیتوں میں سارا دن محنت کرتا مگر فصل مالک کے گھر چلی جاتی۔ اس کے پاس خاندان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے پیسے نہ ہوتے۔ کمال بس کا کرایہ بھی نہ نکال سکتا، اس لیے اسے کالج سے واپسی پر بھی کام کرنا پڑتا۔ وہ ہولے ہولے چلتا رہا۔

دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک دی۔ کمال کو دیکھ کر لڑکے نے الجبرا کی کتاب نکالی اور بتایا کہ کل استاد صاحب اس پر کچھ سمجھائیں گے مگر وہ گھر سے پڑھ کر جانا چاہتا ہے تاکہ کلاس میں آسانی ہو۔ لڑکے کی بات حوصلہ افزا تھی، لیکن کمال شدید بھوک کے باعث بہت نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ اندر گوشت اور گوبھی پکنے کی خوشبو نے اس کی توجہ الجبرا کی طرف نہ ہونے دی، پھر بھی وہ کوشش کر کے لڑکے کو سمجھاتا رہا جو مطمئن نظر آ رہا تھا۔ بعد ازاں اس نے طبیعیات کی کتاب کھولی اور ''سراب'' پر کچھ سمجھنا چاہا۔ دفعتاً کمال کے ذہن میں آیا کہیں وہ خود بھی تو سراب کے پیچھے نہیں بھاگ رہا۔ وہ ایک تاریخ ساز سائنسدان بننے کا متمنی تھا

مگر مطالعہ کے لیے اسے مناسب وقت نہ ملتا کیونکہ محض بس کے کرایہ کی خاطر وہ کسی اور کے بچے کو پڑھانے پر مجبور تھا۔ ملک کا مستقبل بھی تو سراب کی مانند ہے، اس نے سوچا۔

ساڑھے دس بجے تک لڑکا پڑھتا رہا۔ فارغ ہونے کے بعد کمال تھکا ہارا، بے حال، گھر کی جانب چل پڑا۔ راہ میں اسے گیدڑوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں جس سے اندازہ ہوا کہ آدھی رات بیت چکی ہے۔ چند روز پہلے بارش ہونے سے راستے میں جگہ جگہ کیچڑ تھا جس میں اس کی چپل پھنس گئی۔ کیچڑ سے چپل نکال کر اس نے ہاتھوں میں پکڑی اور ننگے پاؤں چل پڑا۔ نیند کا غلبہ بُری طرح حاوی تھا، چونکہ راستہ جانا پہچانا تھا اس لیے وہ ادھ کھلی آنکھوں اور نیم بے ہوشی میں چلتا رہا۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ وہ تو سڑک کے کنارے کسی جھاڑی میں چلا گیا ہے۔ کپڑے کیچڑ سے بھر گئے، نیند اُڑ گئی، جھاڑی سے نکل کر وہ پھر سے چل پڑا۔ بالآخر گھر آ گیا۔ سب لوگ سوئے ہوئے تھے، کتا بھی گہری نیند میں تھا، ایک لالٹین ہنوز روشن تھی۔ کمال کو ایک دانشور کی بات یاد آئی کہ ''غریب شخص کی دولت اس کی قابلیت ہے''۔ کون سے قابلیت؟ کیسی محنت؟ قابلیت اور سخت محنت سے بھی غربت جیسی محرومیوں پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔

....

آخری کلاس ختم ہوتے ہی کمال باہر نکل کر تیزی سے گیٹ کی طرف چلا۔ کالج اور سنٹرل جیل کی درمیانی سڑک عبور کرنے کے بعد وہ جنوب مغرب کی جانب روانہ ہوا۔ سڑک کی دوسری جانب جانے ہی والا تھا کہ ایک رکشہ اس کے سامنے آ کر رکا جس میں سے مینا مجمدر باہر نکلی۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی پری اچانک آسمانوں سے اتر کر اس کے سامنے آ گئی ہو۔ رکشے سے اترتے ہی وہ بولی، ''آخر تمہیں پکڑ ہی لیا۔ میں نے تمہیں بہت تلاش کیا''۔

''میں کالج ہی میں ہوتا ہوں، وہاں کیوں نہیں آئی ہو؟''

''آنے کا ارادہ تو تھا مگر تمہارے کالج کے طلباء بہت بدتمیز ہیں''۔

''وہ کیسے؟''

''انہیں کسی لڑکی سے بات کرنے کا سلیقہ ہی نہیں ہے''۔

''کیا مطلب؟''

''ایک روز میں آئی تھی۔ پہلے میں شعبۂ طبیعیات گئی، پھر کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ جانا چاہتی تھی مگر معلوم نہیں تھا وہ کس طرف ہے۔ وہاں دو لڑکے کھڑے تھے، ان سے پوچھا۔ مجھے دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ آئی، ایک نے بڑی بدتہذیبی سے سوال کیا، 'وہاں کس لیے جانا چاہتی ہو؟ کیا ہم پسند نہیں آئے؟' کتنی فضول اور طیش دلانے والی حرکت ہے''۔

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے جواب دیا، 'میں یہاں کسی لڑکے کو پسند کرنے نہیں آئی، اگر ایسا ہو بھی تو بہترین لڑکے کو پسند کروں گی، تم جیسے ایروں غیروں کو نہیں'۔

''انہوں نے کیا کہا؟''

''وہ بالکل خاموش ہو گئے مگر ان کے رویّے سے مجھے اتنا افسوس ہوا کہ کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ جانے کی بجائے میں واپس آ گئی''۔

''اچھا اب بتاؤ، مجھے کیوں تلاش کر رہی تھیں؟''

''بتاتی ہوں مگر کہیں بیٹھ تو جائیں''۔

کمال اندر سے پریشان تھا کیونکہ چند منٹ کی تاخیر سے ساڑھے چھ والی بس نکل جاتی۔ غالباً اس نے بھی کمال کی بے چینی محسوس کر لی اور پوچھا، ''کیا میرے ساتھ بیٹھنا ناگوار لگتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو کوئی بات نہیں، تم جاؤ''۔

''نہیں، نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں''، کمال نے جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے''، یہ کہتے ہوئے وہ کمال کے سامنے بیٹھ گئی۔ کمال کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی لڑکی اس طرح مکمل تنہائی میں اس کے سامنے بیٹھی ہو۔ دل میں عجیب سے احساس نے جنم لیا۔ یہ پہلی لڑکی تھی جسے اردگرد ہونے والے حالات و واقعات سے آگاہی تھی۔ توہمات اور مذہبی تنگ نظری سے ماورا ہونے کے سبب وہ کمال کو اپنی ہم خیال لگی۔ اس کی ہم نشینی میں آزادانہ بات چیت کرنے کی وجہ سے اس کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا تھا۔

ان کی پہلی ملاقات ٹاؤن ہال میں ہوئی تھی جہاں وہ دونوں ضلعی کالجوں کے درمیان ہونے والے تقریری مقابلہ میں شامل تھے۔ کمال نے موضوع کی مخالفت میں اور مینا نے حق میں بولتے ہوئے پہلا پہلا انعام جیتا تھا۔ وہ اس کے پاس آئی اور انعام جیتنے پر مبارکباد دی۔ اس کے بعد تو وہ دونوں ہر تقریری مقابلہ میں ایک دوسرے کے حریف ہونے لگے۔ تقریباً ہر مقابلہ میں کمال نے پہلا انعام جیتا لیکن اس کے اپنے کالج میں ہونے والے مقابلہ میں یہ اعزاز مینا کے نام رہا۔

ایک دوسرے کے حریف ہونے کے باوجود ان کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے۔ ان کی ملاقاتوں کا مقام کالج آنے جانے کے راستے میں واقع میدان تھا۔ کمال کو کالج آنے جانے کے لیے اسی میدان سے گزرنا پڑتا تھا اور مینا کا ہوسٹل بھی میدان کے شمال مغربی حصے کی طرف تھا، اس لیے کبھی کبھار کی ملاقاتیں اسی جگہ ہوتی تھیں۔

ایک بار مینا اپنے بالوں کے جوڑے میں سفید گلِ یاسمین لگا کر آئی۔ باتوں کے دوران کمال نے ایک پھول اتار لیا جس پر اس نے بناوٹی ناراضی کا اظہار کیا مگر کمال کو اندازہ تھا کہ وہ ناراض نہیں ہوئی تھی۔ ایک اور موقع پر دونوں ایک درخت کی چھاؤں میں باتیں کر رہے تھے۔ چند لڑکوں نے گزرتے ہوئے کچھ جملے کسے۔ بعد میں مینا کے ہوسٹل کی کچھ لڑکیوں نے اسے بتایا کہ اس منظر کو دیکھ کر تو لوگ مرے جاتے تھے۔ اس نے پروا کیے بغیر جواب دیا، اگر کوئی بلاوجہ مرنا چاہے تو مرے۔ کمال کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگا تھا۔

لیکن ایک دن اس کے پروفیسر شکتی ناتھ جھا نے اسے برآمدے میں روک کر تنبیہ کی، ''میں نے سنا ہے کہ مینا تمہارے قریب آ رہی ہے، محتاط رہو، وہ سی، آئی، اے کی ایجنٹ ہے''۔ کمال سیاسی رہنماؤں سے رابطوں کے سبب اس کے مضمرات سے آگاہ تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ سی، آئی، اے طلباء اور اساتذہ کو اپنا ایجنٹ بنا کر ان کی نشاندہی پر کمیونسٹوں یا ممکنہ اشتراکیوں کا نظریاتی اور جسمانی طور پر صفایا کرتی ہے۔ وہ مینا کے بارے میں متجسس ہو گیا۔ اب اس کے ساتھ نہ آزادانہ ملاقاتیں ہو سکتی تھیں نہ قطع تعلق۔ لہٰذا محدود قسم کے تعلقات رہ گئے۔ یہی بے چینی اور اضطراب اسے گھیرے رکھتا۔ اب جبکہ مینا اس کے سامنے تھی، اس نے اچانک کمال کو کہا کہ وہ شادی کرنا چاہتی ہے، اس کے لیے کوئی لڑکا تلاش کرے۔ وہ یہ غیر متوقع اور اچانک بات سن کر ششدر رہ گیا۔ بہرحال خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے پوچھا، کس قسم کا لڑکا ہونا چاہیے؟

''کشادہ ذہن کا مالک اور میری سوچ سے مطابقت رکھتا ہو''۔

''مذہب، زبان وغیرہ؟''

''کوئی پابندی نہیں''۔

''میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا میں کشادہ ذہن اور تمہاری سوچ کے مطابق ہوں یا نہیں؟''

''بالکل ہو''۔

''پھر مجھ سے شادی کیوں نہیں کرتی ہو؟''

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ کیا تم رضا مند ہو؟''

''کیوں نہیں!''

''تو چلو، کل ہم میرج آفیسر کے پاس چلتے ہیں''۔

اب تو کمال بے دست و پا ہو گیا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ شادی کے لیے فوراً تیار ہو جائے گی۔ لہٰذا معذرت خواہی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا،'' یہ میری خوش بختی ہے کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو مگر افسوس! میں فی الحال شادی نہیں کر سکتا''۔

''کیوں؟''

''شادی کا مطلب ہے چند ذمہ داریاں اور میں ابھی اس قابل نہیں ہوا''۔

''کیا مطلب؟''

''ہم بہت غریب لوگ ہیں۔ مجھے تو خود بھی دو وقت کا کھانا نہیں ملتا، شادی کیسے کر سکتا ہوں؟''

''تم فکر مند کیوں ہوتے ہو۔ میں تمہاری ملازمت کا بندوبست کر دوں گی''۔

''میرے اہلِ خانہ نے مجھ سے کچھ توقعات وابستہ کر رکھی ہیں، میں انہیں مایوس نہیں کر سکتا''۔

''اگر ایسی بات ہے تو میرے لیے کوئی اور لڑکا تلاش کرو''۔

''میں کوشش کروں گا''۔

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد مینا اسے الوداع کہہ کر ہوسٹل چلی گئی اور وہ بوجھل دل سے بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہوا۔ اسے مینا کا اتنی جلدی شادی کی بات کرنا اچھا نہ لگا۔ اس نے یقین دہانی کرائی تو تھی کہ اس کے لیے کوئی بر ڈھونڈے گا لیکن جس لڑکی کو اپنے من میں بسایا ہوا اس کی شادی کے لیے کوئی لڑکا تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ اسے انتظار کرنے کے لیے کہنا بھی سہل نہیں۔ کیا وہ خود انتظار کرنے کا فیصلہ نہیں کر سکتی؟ کمال کو کچھ نہ سوجھا۔

....

ملازمت کے حصول کی سوچ نے اس کے دل و دماغ کو جکڑ رکھا تھا۔ ایک علی الصبح اٹھ کر اس نے ہاتھ منہ دھویا اور گنگا رام پور میں بولن منڈل کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ زرعی تجارتی امدادِ باہمی سوسائٹی میں مینیجر کی آسامی خالی تھی۔ بولن منڈل سوسائٹی کا چیرمین تھا۔ کمال نے اپنی درخواست اسی کو دی تھی جس نے اسناد وغیرہ دیکھنے کے بعد اسے ملازمت پر رکھنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔ بولن کا باپ اس کے اسکول میں استاد تھا اس لیے اسے ان کے گھر کا پتہ تھا۔

وہ سائیکل سے اترا۔ بہت بڑے گھر میں متعدد حصے اور دروازے تھے مگر کمال کو علم نہیں تھا کہ کس دروازے پر دستک دینی ہے۔ نزدیک ہی ایک چائے کے کھوکھے پر چند بنچ پڑے تھے۔ وہ وہاں بیٹھنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک ملازمہ گھر سے باہر آئی۔ اس سے بولن منڈل کا پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ بابو جی سو رہے ہیں اور آٹھ بجے سے پہلے بیدار نہیں ہوں گے۔ کمال نے سوچا کہ وہ کہیں ادھر ادھر بیٹھ کر انتظار کر لے تا کہ اگر منڈل کو جلدی اٹھ کر کہیں جانا ہو تو یہیں ملاقات ہو جائے۔ اپنی سائیکل ادھر ہی کھڑی کر کے وہ چائے کے کھوکھے پر جا بیٹھا اور لوگوں کی فضول سی گفتگو سننے لگا۔ ایک نوجوان پاس بیٹھے عمر رسیدہ شخص سے پوچھ رہا تھا،'' چچا، اپنی بوڑھی گائے کا کیا کرو گے؟''

''میں بیچ دوں گا''، بوڑھے نے جواب دیا۔

''اسے خریدے گا کون؟''

''کلام''۔

ایک اور بوڑھے شخص نے لقمہ دیا،''میں سمجھ گیا۔وہ جوان؟اچھا،وہ اسے خریدیں گے اور کاٹ پیٹ کر کھا جائیں گے''۔

ایک نوجوان نے دخل اندازی کی،''ظاہر ہے وہ ذبح کر کے کھانے کے لیے ہی تو خرید رہے ہیں ورنہ اتنی کمزور گائے کیوں خریدیں؟اس حقیقت کا تو آپ سب کو اچھی طرح علم ہے پھر فروخت کیوں کر رہے ہو؟''

''من ماتھ!تم تو مسلوں کے حمایتی ہو،کس لیے؟''

''نہیں ایسی بات نہیں۔میں تو صرف تم لوگوں کی منافقت پر اعتراض کر رہا ہوں۔تمہیں پتہ ہے کہ ۱۰۰ سے خرید کر ذبح کریں گے اور کھا جائیں گے،پھر بھی تم اسے بیچ رہے ہو۔اگر تم گاؤ ماتا کو دیوی مانتے ہو تو اسے فروخت کیوں کرتے ہو؟کیا لوگ اپنی ماتا کو بیچتے ہیں؟''

''میں مانتا ہوں کہ غلمائی کو گائے فروخت نہیں کرنی چاہیے،لیکن بتاؤ تم نے ملیچھوں سے بدتر لوگ کہیں دیکھے ہیں؟وہ گائے کا گوشت کھاتے،داڑھیاں بڑھاتے اور میلے کچیلے کپڑے پہنتے ہیں''۔

باتوں میں مصروف وہ سارے ہندو تھے۔انہیں نے کمال کو بھی ہندو سمجھا،یا اس کی بالکل پروا نہیں کی۔اس گفتگو سے کم از کم کچھ مسلمانوں کے اس خیال کو تقویت ملی کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف دشمنی اور نفرت پائی جاتی ہے۔ کمال کو باتیں سن کر دکھ ہوا،وہ تو ہندوؤں کو اپنا ہم وطن اور ساتھی سمجھتا ہے مگر مسلمانوں کے بارے میں ان کے خیالات کتنے ناروا ہیں،انہیں درست ہونا چاہیے۔کیا اسے ان کی بات چیت میں دخل اندازی کر کے ان کی سوچ کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے؟وہ اسی سوچ میں تھا کہ اس کی نظر منڈل صاحب پر پڑی جو دروازے سے باہر نکل کر ادھر ادھر کچھ دیکھ رہے تھے۔ملازمہ بھی باہر آ گئی۔کمال بھاگ کر ان کے پاس گیا۔ادھر کھوکھے پر گفتگو جاری رہی۔

''اوہ!تم آ گئے؟''،منڈل صاحب نے اسے دیکھ کر کہا،''میں نے پچھلی میٹنگ میں یہ معاملہ اٹھایا تھا،تاہم ابھی تک منظوری نہیں ہوئی''۔

کمال پوچھ نہ سکا کہ کب تک منظوری کی توقع ہے۔فائدہ بھی کوئی نہیں تھا۔منڈل صاحب اسے کوئی سی بھی تاریخ بتا دیتے جو شاید غلط ہوتی۔اس نے سر ہلایا اور سائیکل پر سوار ہو گیا۔ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ آئندہ سے ایسی بے ثمر اور توہین آمیز ترغیبات میں اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے مقابلے کے امتحان کی تیاری کرے گا۔درخواست تو پہلے ہی سے جمع کرا چکا تھا،اب اسے محنت کرنا ہوگی۔

بی،ایس،سی کا نتیجہ اس کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔اسے علم تھا کہ نتیجہ خاطر خواہ نہیں ہوگا کیونکہ اس کے پاس نصابی کتب نہیں تھیں،بس کا کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے متعدد کلاسوں سے غیر حاضر رہا اور کچھ سیاست میں وقت گزاری نے اسے صحیح معنوں میں پڑھنے نہ دیا تھا۔ایک بار تو کمیونسٹ پارٹی (مارکسزم۔لینن ازم) کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس نے کالج کی تعلیم ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن جلد ہی ان کی کارروائیوں سے دل برداشتہ ہو کر پھر سے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔بایں ہمہ،اتنے برے نتیجہ کی توقع نہیں تھی۔وہ آنرز نہ کر سکا،صرف کامیاب ہی ہوا تھا۔اس کے سائنسدان بننے کی خواہشات کے آگے دیوار کھڑی ہو گئی۔اس ملک میں تحقیق کے لیے ماسٹر ڈگری کی ضرورت تھی اور ماسٹر ڈگری کے لیے کالج یا یونیورسٹی میں داخلے کا انحصار آنرز میں کامیابی سے مشروط تھا۔بی،ٹیک کے لیے بھی آنرز لازمی تھا،لہٰذا وہ راستہ بھی بند۔

اس کی زندگی بلا پتوار کشتی جیسی تھی جو بغیر کسی منزل کے،بغیر کسی سمت کے چلی جا رہی تھی۔وقت گزرتا جا رہا تھا۔ذہن

ماؤف تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کچھ عرصہ اس نے باپ کے ساتھ کھیتوں میں بھی کام کیا۔ پھر اس نے مقابلے کے امتحان میں شرکت کا فیصلہ کرلیا۔ مگر امتحان کی فیس، کتابوں اور رسائل کی خریداری اور امتحان کے لیے آنے جانے کے کرایہ وغیرہ کا بندوبست کیسے ہوگا؟ ماں باپ کی مالی حالت پہلے ہی بہت پتلی تھی۔ اتنے برس ان کی محنت مشقت پر گزارا کرنے کے بعد اب اخراجات کے لیے انہیں مزید زیر بار کرنے کو دل نہیں مانتا تھا۔ اس نے اسکول کے چند طلباء کو پڑھانا شروع کردیا مگر اس میں وقت کا ضیاع زیادہ اور معاوضہ کم تھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ مقابلے کے امتحان میں کامیابی کے لیے اسے کوئی ملازمت کرنا ہوگی، تنخواہ چاہے کم ہو مگر اپنی پڑھائی کے لیے وقت تو مل جائے گا۔ اس نے ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ اس کا ہائر سیکنڈری کا نتیجہ بہت اچھا تھا، علاوہ ازیں، مضمون نگاری اور ضلعی، صوبائی حتیٰ کہ آل انڈیا تقاریری مقابلوں میں متعدد انعامات حاصل کرنے کی وجہ سے کئی تعریفی سرٹیفکیٹ اس کے پاس تھے، اس لیے اس کی کوشش ایسی ملازمت کی تلاش تھی جہاں انتخاب کا معیار ہائر سیکنڈری ہو۔

اس کے گاؤں میں اخبار وغیرہ ملتا نہیں تھا لہٰذا وہ روزانہ شام کو براہی جا کر مختلف اخبارات میں اشتہارات برائے ملازمت دیکھنے کے بعد متعلقہ اداروں کو درخواستیں بھیجتا رہتا۔ درجنوں درخواستیں بھیجنے کے بعد بھی اسے کہیں سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ اس کے بہی خواہوں نے بہت سمجھایا کہ تعلقات اور سفارش کے بغیر نوکری کا ملنا ممکن نہیں۔ مقامی لوگوں کی نگاہ میں وہ ایک غیر معمولی طالب علم، اعلیٰ پایے کا مضمون نگار اور شاندار مقرر تھا اسی لیے اس نے اب اپنے ہی علاقے میں نوکری کی تلاش شروع کی۔

اس نے مقامی سب رجسٹرار کے دفتر میں کلرک کے لیے درخواست کی مگر پتہ چلا کہ اسامی شیڈولڈ کاسٹ کے لیے مخصوص ہے جو ان کے اپنے بنیے ہی کے بیٹے کو مل گئی۔ اس کی نظر میں یہ سراسر غیر انصافی تھی۔ پھر اس نے اپنے اسکول میں جونیئر کلرک کے لیے درخواست دی۔ ہیڈ ماسٹر اور سیکرٹری سے ملا، دونوں نے امید بھی دلائی، لیکن تعیناتی ہیڈ کلرک کے بیٹے کو غالباً جہیز سمجھ کر دے دی گئی، کیونکہ جلد ہی ہیڈ ماسٹر کی چھوٹی بیٹی کی شادی ہیڈ کلرک کے بیٹے سے ہوگئی جو تعلیمی لحاظ سے کمال کی نسبت بہت پیچھے تھا۔ اس نے ایک اور اسکول میں عارضی استاد کے لیے بھی درخواست دی۔ سیکرٹری نے اسے انصاف اور ایمانداری پر لمبا چوڑا لیکچر دیا لیکن اس سے کمتر تعلیمی معیار کے حامل لڑکے کا چناؤ ہوگیا۔ اب اس کا یقین مستحکم ہوگیا کہ معمولی سی بھی ملازمت کے لیے مقابلے کا امتحان دینا ہوگا۔ ادھر اس نے امتحان پر کمر باندھی، ادھر منڈل صاحب کا بلاوا ملا جنہوں نے اسناد وغیرہ دیکھنے کے بعد ملازمت کا یقین دلایا جو ہنوز دلی دور است والی بات تھی۔ وہ بار بار ان سے ملا، ہر دفعہ نئی تاریخ مل جاتی۔ کیا منڈل صاحب کی خواہش ہے کہ وہ دریوزہ گری کرتا رہے؟ مگر کیوں؟ بہتر یہی ہے کہ وہ مقابلے کے امتحان کی تیاری کرے۔

....

کمال چند ایک مقابلے کے امتحانات میں بیٹھا بھی، اور پہلے ہی نتیجہ میں اسٹیٹ سیکریٹریٹ میں کلرک منتخب ہوگیا۔ تنخواہ 430 روپے مہینہ مقرر ہوئی جو کم تھی مگر کچھ نہ ہونے سے تو بہتر تھا لہٰذا اس نے نوکری شروع کردی۔ اب رہائش کا مسئلہ سامنے آ گیا۔ اتنی کم تنخواہ میں دارالحکومت میں گھر کرایے پر لینا ناممکن تھا۔ کمال کو دو مزید دشواریوں کا سامنا تھا، ایک اس کا مسلمان ہونا جو نام سے بھی عیاں تھا، گویا سوائے مسلمان علاقے کے اسے کہیں اور گھر ملنے کا امکان نہیں، اور دوسرا یہ کہ وہ غیر شادی شدہ تھا اور ہندوستان میں بہت کم لوگ غیر شادی شدہ مردوں یا عورتوں کو مکان کرائے پر دیتے ہیں مبادا وہ زنا کاری یا کسی اور غیر اخلاقی کاموں کے مرتکب ہوں۔

کمال نے اپنے کالج کے دوست بارن کے پاس اس کے ہوسٹل میں بطور مہمان قیام کیا جو ایم، ایس، سی کا طالب علم تھا۔ اپنے دوست کو کالج میں دیکھ کر اسے دکھ ہوا کیونکہ وہ بارن سے زیادہ اچھا طالب علم تھا مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ فائنل

امتحان میں بہتر کارکردگی نہ دکھا سکا۔ اب بارن مزید تعلیم کے لیے کالج میں تھا جبکہ وہ خود اپنے خوابوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب یہ امر بھی قابلِ تشویش تھا کہ وہ بارن کے پاس زیادہ عرصہ قیام نہیں کر پائے گا، لہٰذا مکان کی تلاش زیادہ تن دہی سے جاری رہی۔

ایک روز دفتر آنے کے بعد وہ سیدھا سیکشن آفیسر امرناتھ چوہدری کے پاس حاضر ہوا جو اس کے اپنے ضلع سے تھا۔ وہ بھی کمال کی رہائش کے لیے کوشاں تھا۔ اس نے لگی لپٹی بغیر کہا، ''میرے بھائی، اگرچہ مستثنیات ہر جگہ ہوتی ہیں مگر صاف بات ہے کہ کسی ہندو علاقے میں تمہیں مکان کا ملنا انتہائی مشکل ہے''۔ پھر اس نے ٹائپ سیکشن سے کسی وحید صاحب کو بلایا۔ تھوڑی دیر بعد درمیانی عمر کا ایک شخص اندر داخل ہوا۔ چوہدری صاحب نے تعارف کرایا، ''وحید صاحب! یہ کمال ہے، اس نے حال ہی میں ملازمت شروع کی ہے''۔ وحید نے سر ہلایا۔ چوہدری صاحب پھر بولے، ''یہ میرے ہی ضلع سے ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ میں اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھ سکتا۔ مہربانی سے اپنے علاقے میں اس کے لیے کوئی رہائش تلاش کرو''۔

''جی میں پوری پوری کوشش کروں گا''، وحید نے جواب دیا۔ اسے اردو میں بات کرتے دیکھ کر کمال کو اندازہ ہوا کہ وہ چوہدری صاحب یا خود اس کی مانند بنگالی نہیں ہے۔ وحید نے مزید کہا، ''جیسے ہی مجھے کوئی مکان ملا، میں آپ کو بتادوں گا''۔

''ارے نہیں! اس کو اپنے ساتھ لے جاکر کسی رہائش کا بندوبست کرو''۔

وحید صاحب ''بہت اچھا'' کہہ کر چلے گئے۔

کمال آسودہ خاطر نہیں تھا۔ چوہدری صاحب کا تعلق اس کے ضلع سے تھا، بنگالی بولتے تھے، اس کے ساتھ برتاؤ بھی ہمدردانہ تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنے علاقے میں اس کے لیے کسی گھر کا بندوبست نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے برعکس وحید کسی اور جگہ کا رہنے اور مختلف زبان بولنے والا تھا مگر وہ اس کے لیے محض ہم مذہب ہونے کے ناتے اپنے علاقے میں مکان ڈھونڈنے کو تیار ہو گیا۔ کمال کو اندازہ ہوا کہ دوسرے ممالک سے آنے والوں نے اسی تقسیم اور تفریق کا فائدہ اٹھایا ہوگا۔ وہ عالمِ مایوسی میں اپنی کرسی پر بیٹھا رہا۔

وحید صاحب نے دوبارہ آتے ہوئے پوچھا، ''کیا تم غیر شادی شدہ ہو؟ اکیلے رہائش رکھو گے؟'' کمال نے ہاں میں جواب دیا تو وحید صاحب بولے، ''اس صورت میں تو مکان کا ملنا بہت مشکل ہے''۔

اپر ڈویژن کلرک ثمر چیٹر جی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تھیٹر کے شوقیہ اداکاروں کی ایک انجمن کا رکن تھا۔ اس کے نزدیک زندگی سراسر ڈرامہ تھی۔ اس نے مشورہ دیا، ''بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ یہ غیر شادی شدہ ہے، خود کو شادی شدہ ظاہر کرے''۔

''مگر اس کے لیے تو کسی عورت کی موجودگی ضروری ہے''۔

''اپنی بہن یا بھابھی کو لے آئے۔ مدن کو دیکھو۔ چند دن اس کی بھابھی نے ساتھ قیام کیا تھا۔ وہ واپس چلی گئی، مسئلہ ختم''۔

باتیں سن کر کمال نے فوراً جواب دیا، ''نہیں، نہیں، میں دھوکہ دے کر مکان نہیں لینا چاہتا''۔

چوہدری صاحب نے اس کی تائید کی، ''دھوکہ دہی کا انجام کبھی نہ کبھی تو سامنے آتا ہے۔ لوگ کنواروں کو اس ڈر سے کمرہ یا گھر نہیں دیتے کہ وہ اخلاق باختہ عورتوں کو لے آئیں گے یا شراب و کباب کی محفلیں سجاتے پھریں گے۔ یہ معصوم سا دیہاتی لڑکا ہے، شراب چھوڑ اس نے تو کبھی چائے تک نہیں پی۔ وحید صاحب! آپ صاف صاف بتادیا کریں، کوئی نہ کوئی تو مان جائے گا''۔

وحید رضامند ہو گیا کہ جھوٹ بولے بغیر ہی وہ کمال کے لیے رہائش کی کوشش کرے گا۔ دو دن بعد وہ کمال کو ایک مکان پر لے گیا۔ دو منزلہ گھر میں کرایہ کے لیے ایک خالی کمرہ زمینی منزل پر تھا۔ چھوٹا مگر گزارے لائق، لیکن اسے پسند نہ آیا۔ دروازے پر لگی نیم پلیٹ اردو میں تھی، اہلِ خانہ اردو میں باتیں کر رہے تھے، ایک جوان لڑکی کھانا پکا رہی تھی۔ ان سب کی زبان

کمال کی مادری زبان یعنی بنگالی سے مختلف تھی جس نے اس پر کوئی خوشگوار تاثر نہ چھوڑا۔ وحید نے اس سے رائے پوچھی مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکا، وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا اور وہیں پرورش پائی۔ ان سب کی زبان بنگالی تھی۔ اس گھر کے لوگ بھی مسلمان تھے مگر زبان مختلف تھی۔ چوہدری صاحب کی زبان بنگالی تھی مگر مذہب کے فرق کی بنا پر وہ کمال کو اپنے علاقے میں مکان دلانے سے گریزاں تھے۔ اب اسے معلوم ہوا کہ اس کی شناخت بنگالی مسلمان کی حیثیت سے ہے۔ وحید نے اس سے معلوم کرنا چاہا کہ آیا وہ مالک مکان سے بات کرے؟ کمال نے جواب دیا کہ کل دفتر میں بات ہوگی۔ وحید صاحب اپنی راہ لگے اور وہ ہوسٹل کی طرف چل دیا۔

اگلے روز اس کے دفتر کے ایک چپراسی نے امید کی کرن دکھائی، ''ہمارے اتر پاڑا میں مسز مہاتو نے آپ کے لیے ایک مکان دیکھا ہے''۔ کمال نے بڑے اشتیاق سے پوچھا، ''ماحول کیسا ہے؟''

''اچھا ہے، یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ مالک مکان ایک مقامی اسکول میں سائنس ٹیچر ہے۔ اس کی بیٹی میڈیسن کی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور بیٹا گاڑیوں کی ایک کمپنی میں انجینئر ہے۔ بہت اچھے لوگ ہیں''۔

''کیا وہ مجھے کرایے پر گھر دینے کو تیار ہیں؟''

''ہاں وہ رضامند ہیں''۔

''کیا مسز مہاتو نے انہیں میرے بارے صحیح صحیح بتا دیا ہے؟''

''جی ہاں، ان کی تفصیلاً بات ہو گئی ہے۔ وہ کسی کلرک کو اپنا گھر دینے کے زیادہ آرزومند نہیں تھے لیکن جب انہیں علم ہوا کہ آپ مقابلہ کے امتحان میں بیٹھنا چاہتے ہیں تو وہ راضی ہو گئے''۔

کمال خوش ہو گیا، ''میں گھر کب دیکھ سکتا ہوں؟''

''جب بھی آپ چاہیں۔ آج ہی چلتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے، مجھے ان کا پتہ دے دو''۔

اس نے نہ صرف پتہ دیا بلکہ گھر تک پہنچنے کی راہ بھی سمجھا دی۔

پتے کے مطابق کمال لوکل ٹرین پر گیا اور ایک جگہ اتر کر رکشہ لے کر راج موہن روڈ پہنچا۔ وہاں سے گنگولی صاحب کا پوچھتا پاچھتا ایک دومنزلہ عمارت کے سامنے رکا۔ مکان سادہ مگر صاف ستھرا اور خوبصورت تھا۔ اسے پسند آ گیا۔ دروازے پر ''شری ستیہ برت گنگولی، ایم، ایس، سی'' کی نیم پلیٹ لگی تھی۔ کمال نے گھنٹی دبائی۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ دور سے اذان کی مدھم سی آواز اور گھر کے اندر سے ناقوس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کمال انتظار کرتا رہا۔ جواب نہ ملنے پر اس نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ اندر سے کسی نے پوچھا، ''کون ہے؟'' مگر اس کے جواب دینے سے قبل ہی ایک درمیانی عمر کے شخص نے دروازہ کھولا۔ کمال نے دیکھ کر کہا، ''میں مسٹر ستیہ برت گنگولی سے ملنا چاہتا ہوں''۔

''میں ہی ستیہ برت ہوں۔ کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ مکان کا ایک حصہ مجھے کرایہ پر دینے کو راضی ہیں۔ مجھے رہائش کی اشد ضرورت ہے''۔

''ہاں، مجھے علم ہوا ہے کہ تم مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہے ہو۔ آج کل تو کسی کو ایک نوکری بھی نہیں ملتی اور تم ملازمت میں ہوتے ہوئے بہتر نوکری کی کوشش کر رہے ہو۔ ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اندر آ جاؤ''۔

کمال ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر کہنے لگا، ''مہربانی جناب۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک

استاد ہیں، بہت اچھے استاد''۔

''مسز مہاتو نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تم بنگال کے کس علاقے سے ہو''۔

''سر! میں مقصود آباد سے ہوں''۔

''اوہ! تو پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ تم گھٹی ہو، پروا مت کرو۔ ہم ماڈرن اور جدید خیالات کے حامل بنگالیوں سے ذرا فاصلے پر رہتے ہیں۔ وہ اتنے بُرے لوگ ہیں کہ مفادات کی خاطر اپنی بیٹیوں کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے''۔

کمال الجھن میں پڑ گیا کہ وہ کیا سن رہا ہے۔ رابطوں اور ابلاغ میں کہیں نہ کہیں جھول ہے۔ وہ ہندو جو بنگالی ہندوؤں سے کنی کتراتے ہیں، مسلمانوں سے کیسے میل جول رکھنا پسند کریں گے؟ اسے یقین ہو گیا کہ مسز ملہوترا نے اس کے بارے میں تفصیلاً بات نہیں کی تھی۔ جو شخص اگر بنگالیوں کے بارے میں ایسی رائے رکھتا ہو، وہ ایک مسلمان کو کیسے گھر کرایے پر دے سکتا ہے؟ اس نے سوچا کہ اسے اپنے بارے میں ہر بات صاف صاف بتا دینی چاہیے۔ اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا، ''لیکن سر۔۔۔۔۔'' ۔ ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ وہ شاید انجینئر بیٹا تھا۔ پھر ایک لڑکی نے بھی پوچھا، ''ڈیڈی، کون ہے؟''

گنگولی صاحب نے اس کو کہا، ''سشمیتا! چائے بھجوا دو''۔

کمال نے فوراً کہا، ''سر میں چائے، کافی حتیٰ کہ ٹھنڈا مشروب تک نہیں پیتا''۔

''سنت، پھر تھوڑی سے مٹھائی لے آؤ''، سنت شاید اس نوجوان کا نام تھا۔

''سر! رہنے دیجیے۔ میں اب اجازت چاہوں گا''۔

گفتگو ختم کر کے وہ واپس لوٹ آیا۔ وہاں بیٹھ کر اسے الجھن ہونے لگی تھی۔ ان کی باتوں سے ایسا لگا جیسے کہ وہ ان کی زندگی میں مخل ہوا ہو۔ اگلے دن اسی چپراسی نے خوشی خوشی اطلاع دی۔ ''مالک مکان آپ کے رویّے اور اخلاق سے بہت خوش ہے، وہ پوچھ رہا تھا کہ آپ کب تک آ جائیں گے''۔

کمال نے جواب دیا کہ وہ وہاں کبھی بھی نہیں جائے گا۔

''کیوں؟''

''وہ اپنا گھر مجھے نہیں دیں گے''۔

''وہ تو آج بھی کہہ رہے تھے کہ آپ کو گھر دیں گے، پھر آپ شک کیوں کر رہے ہیں؟''

کمال نے وضاحت نہیں کی مگر ایک کاغذ پر اپنا نام، پتہ اور دیگر کوائف لکھ کر چپراسی کو کہا کہ گنگولی صاحب کو دے دینا۔ اگلے روز جواب ملا کہ وہ اپنا گھر کسی کو بھی کرایے پر دینے کے خواہشمند نہیں۔ وجہ پوچھنے پر بتایا گیا کہ ان کی بیٹی وہاں اپنا دفتر کھولنا چاہتی ہے۔ کمال سمجھ گیا۔

بنگالی ہندو اور بنگالی مسلمان سوائے مذہب کے ہر معاملہ میں ایک جیسے ہیں۔ مذہب نے ان کے درمیان تفریق و تقسیم کی لکیر کھینچ دی ہے جو علاقائی اور لسانی اختلاف سے بھی زیادہ گہری اور مضبوط ہے۔ جس گھر میں وحید صاحب لے کر گئے تھے وہاں اہلِ خانہ کی زبان مختلف تھی مگر وہ مکان دینے کو تیار تھے۔ اترپاڑا کا مالک مکان بنگالی زبان بولتا تھا اور جب تک اسے کمال کے مذہب کو علم نہ ہوا تھا وہ اسے گھر کرایے پر دینے کو تیار تھا۔ لیکن جیسے ہی اس کو علم ہوا کہ کمال مسلمان ہے، اس نے انکار کر دیا۔ یہاں مذہب کا فرق زبان کے اختلاف سے زیادہ توانا تھا۔ ملک کو مختلف گروہوں میں بانٹنے کی وجہ یہی مذہبی اختلاف ہے۔

....

چھٹی کے روز کمال گھر گیا۔ اگر چہ اسے صرف جونیئر کلرک کی ملازمت ملی تھی پھر بھی گاؤں والوں کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کیونکہ اس گاؤں سے تعلق رکھنے والا وہ پہلا شخص تھا جسے سرکاری ملازمت ملی تھی۔ ان لوگوں کے تو کبھی سان گمان میں نہیں تھا کہ ان کے بچے سرکاری ملازمت کر سکتے ہیں، مگر اب وہ ایسا سوچ سکتے تھے، لہٰذا ان سب نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

رات کو اس کے پرانے ہم جماعت ابوالعلی نے آ کر خبر سنائی کہ شاہد خان صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے، شائد وہ زیادہ عرصہ حیات نہ رہیں، انہوں نے کمال کو بلایا ہے۔ صبح اٹھ کر وہ ان سے ملنے چلا گیا۔ ان کی صحت واقعی بہت بگڑ چکی تھی اور جسم بڑا لاغر تھا۔ کمال کو دیکھ کر انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکے۔ نحیف سی آواز میں انہوں نے حال پوچھا اور کہا،'' مجھے پتہ چلا تھا کہ تمہیں ملازمت مل گئی ہے''۔

'' جی ہاں! جونیئر کلرک کی ملازمت''۔

'' میں نے تمہارے ساتھ بہت سی توقعات وابستہ کی ہوئی تھیں مگر تم ہی رضامند نہیں ہوئے۔ اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ دوزخ میں نوکری کر لینا جنت کی شاہی سے بہتر ہے۔ اپنی محنت سے معمولی چیز کا حصول دوسروں کے دیے ہوئے تحائف سے لاکھ درجے بہتر ہے''۔

'' میرے لیے تو یہ ابھی ابتدا ہے۔ آپ کی نیک تمناؤں سے میں آگے ہی جاؤں گا''۔

'' بالکل، میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔ وہاں قیام کس جگہ ہے؟''

'' رہائش کا ملنا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ فی الحال تو میں ایک دوست کے پاس ہوسٹل میں رہتا ہوں۔ رہائش ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی ہے مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی''۔

'' ظاہر ہے، وہ دارالحکومت ہے۔ وہاں ملازمت تو مل سکتی ہے، مکان نہیں۔ ثریا کے سسرال والوں کے وہاں کئی گھر ہیں۔ وہ دوسرے مالک مکانوں کو بھی جانتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی ثریا۔ سے رابطہ کیا؟''

'' جی نہیں''۔

وہ تمہاری مدد کر سکتی ہے۔ تم اس سے ملو، میں لکھ بھی دیتا ہوں''۔

....

پیر کی شام کو کمال دفتر سے سیدھا ثریا کے گھر گیا۔ گھر کا پتہ شاہد خان صاحب نے دیا تھا۔ یہ بڑی شاندار عمارت تھی۔ نچلا سارا حصہ گیراج تھا جہاں چند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ گیراج کے ایک طرف اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں جس کے سامنے چوکیدار بیٹھا تھا۔ کمال کو دیکھ کر اس سے پوچھا کہ وہ کس سے ملنے آیا ہے۔ وہ پہلے تو قدرے گھبرایا کہ کیا جواب دے؟ بہر طور ہمت کر کے جواب دیا،'' مجھے ڈاکٹر مسز ثریا خان سے ملنا ہے''۔

'' کیا کہہ رہے ہو؟ اس نام کا تو یہاں کوئی نہیں رہتا''۔

'' کیا جمیل اختر صاحب یہیں رہتے ہیں؟''

'' اوہ! ڈاکٹر اختر یہیں رہتے ہیں''۔

'' مجھے ان کی بیگم سے ملنا ہے''۔

'' اوہ! بیگم اختر جونیئر''۔

کمال نے ہاں میں سر ہلایا۔ چوکیدار نے اسے انتظار کرنے کو کہا،'' میں انہیں مطلع کر دیتا ہوں''، یہ کہہ کر وہ اوپر چلا گیا۔ چند منٹ بعد واپس آ کر بتایا کہ وہ آ رہی ہیں۔ کمال بڑے اشتیاق سے انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک خوش پوش شخص نیچے اترا

اور تلخی سے پوچھا، ''کس سے ملنا ہے؟''۔ کمال نے اس بدتہذیب شخص سے بات کرنے میں گھبراہٹ محسوس کی۔ثریا کے ساتھ اس کے سابقہ تعلقات بھی باعثِ حجاب تھے،لہٰذا قدرے جھجکتے ہوئے اس نے کہا،''جی!میڈم ثریا اختر سے ملنا ہے''۔اس شخص نے پھر تلخ لہجے میں کہا،''وہ مریضوں کو گھر پر نہیں دیکھتیں''۔کمال نے گھبراہٹ میں جواب دیا،''میں کسی مریض کو نہیں لایا''۔

''پھر؟''

''مجھے ان سے ملاقات کرنی ہے''۔

''کیا تمھیں اختر صاحب کا پتہ ہے؟''

''جی نہیں''۔

''پھر مسز اختر کو کیسے جانتے ہو؟''

''ہم ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے''۔

''کیا وہ تمہاری ہم جماعت تھی؟''

''وہ مجھ سے ایک سال پیچھے تھی''۔

''کیا وہ بھی تمہیں جانتی ہے؟''

صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ ''ہاں'' نہیں کہہ سکتا تھا اس لیے اتنا کہا،''اگر انہوں نے مجھے نہیں پہچانا تو میں واپس چلا جاؤں گا''۔وہ شخص غصے میں اوپر چلا گیا۔کمال کا جی چاہا کہ ابھی واپس لوٹ جائے،مگر وہ منتظر رہا۔تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ثریا قیمتی لباس میں ملبوس نیچے آئی۔کمال سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔اسے دیکھ کر بولی،''اوہ تم!کس لیے آئے ہو؟''

''تمہاری مدد چاہیے''۔

''مدد!اور وہ بھی مجھ سے!''ثریا کے لہجے میں تمسخر تھا،''ہاں!بتاؤ،کس قسم کی مدد درکار ہے؟''

کمال نے اسے ساری بات بتائی اور کہا،''تمہیں کئی مالک مکانوں کا پتہ ہوگا،میرے لیے ایک گھر تلاش کرنے میں مدد دے سکتی ہو''۔

''گھر؟''،اس کا لہجہ تضحیک آمیز تھا،''تمہاری تنخواہ کیا ہے؟''

''چارسوتیس روپے''۔

''اتنے پیسوں میں گھر کیسے مل سکتا ہے؟''،ثریا نے مسکراتے ہوئے کہا،''یہاں کرایے پر گھر لینا تو ایسے ہی ہے جیسے کسی کی لاٹری نکل آئی ہو۔کرایے بہت زیادہ ہیں۔اس پارک کے پاس ایک گھر ہے۔ماہوار کرایہ دس ہزار اور چار لاکھ روپے ایڈوانس۔تمہاری تو عمر بھر کی کمائی بھی اتنے پیسوں کی ادائیگی کے لیے ناکافی ہوگی۔کرایہ کیسے دو گے؟''

''کم کرایے کے بھی تو گھر ہوں گے''۔

''ممکن ہے،مگر اس علاقے میں نہیں''۔

کمال کچھ بولنے ہی لگا تھا کہ ثریا نے ناخوشگواری سے کہا،''مجھے دیر ہو رہی ہے،میں چلتی ہوں''۔اور چوکیدار کو مخاطب کر کے بولی،''پیارو!ڈرائیور سے کہو گاڑی لگائے''۔چوکیدار ڈرائیور کو بلانے بھاگا۔ایک شاندار غیر ملکی گاڑی آگئی، ڈرائیور نے اتر کر دروازہ کھولا،ثریا اندر بیٹھی،ڈرائیور نے دروازہ بند کیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ایکسیلیٹر دبا دیا۔گاڑی چل پڑی اور کمال ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔

....

اس تضحیک اور محرومیوں نے کمال کے دل میں آگ بھڑکا دی۔ ایک بڑا سائنسدان بننے کی خواہش کا ملیامیٹ ہونا اور اوپر سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی تگ ودو! سائنسدان بننے سے کہیں زیادہ ملازمت کے حصول کی کوشش، اور ملازمت ملی تو اس نے کم تنخواہ کے باوجود بھی مقابلے کے امتحان کی تیاری کے لیے ضروری کتابیں خرید لیں۔

صبح سویرے اٹھ اور منہ ہاتھ دھو کر وہ کتابیں کھول کر بیٹھ جاتا۔ ساڑھے آٹھ بجے غسل لے کر دفتر کو روانگی ہوتی۔ پونے دس بجے پہنچ کر کینٹین سے کھانے کے لیے کچھ لے کر اپنی کرسی پر آبیٹھتا۔ میز کی دراز میں دو چار کتابیں پڑی رہتی تھیں۔ کھانے کے وقفے اور فالتو وقت میں وہ ان کا مطالعہ کرتا رہتا۔ دفتر کے بعد وہ سیدھا نیشنل لائبریری چلا جاتا، ضرورت ہوتی تو کتابیں جاری کراتا، بصورت دیگر وہیں بیٹھ کر مطالعہ کرتا۔ رات آٹھ بجے کے قریب گھر کی جانب چل دیتا۔ لائبریری میں گزرے وقت کا اسے بالکل پتہ نہ چلتا۔

رہائش کا مسئلہ عارضی طور پر حل ہو چکا تھا، وہ ایسے کہ اس کے رفیقِ کار کمل بھار نے ایک کمرہ دے دیا تھا مگر جب گاؤں سے اس کے اپنے مہمان آتے تو کمال کے لیے پھر مسئلہ بن جاتا۔ اس کے دوست مُنگل بینر جی نے اس کا حل یوں نکالا کہ اپنے بڑے بھائی کے فلیٹ میں، جو اکثر خالی رہتا تھا، اس عرصے کے لیے کمال کی رہائش کا بندوبست کر دیتا۔ آج کل وہ وہیں رہ رہا تھا۔

ایسی باتوں نے کمال کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ سارے ہندو مسلمانوں کے خلاف نہیں اور نہ ہی نفرت کرتے ہیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ کسی مذہب یا فرقے میں تمام لوگوں کی سوچ یکساں نہیں ہوتی۔ اچھے برے افراد مسلمانوں میں بھی ہیں اور ہندوؤں میں بھی۔ کمل اور مُنگل دونوں دین دار ہندو تھے۔ مُنگل اگرچہ کالی دیوی کا پوجا کرتا تھا مگر اس کے دل میں دوسرے فرقوں کے لیے بغض یا نفرت نہیں تھی۔ کمل نے کمال کو اپنی گھر اور اہلِ خانہ کے ساتھ رہائش دی تھی جبکہ مُنگل اس کا عارضی بندوبست اپنے بھائی کے فلیٹ میں کر دیتا تھا۔

کمال گذشتہ تین مہینوں سے وہاں رہائش پذیر تھا۔ اس دن وہ صبح جلدی آ کر بس کے لیے قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اسے ''اخبارِ روزگار'' کا نیا شمارہ مطلوب تھا۔ مقابلے کے امتحان کا نتیجہ متوقع تھا۔ کامیاب امیدواروں کو انٹرویو میں بلانے کی اطلاع بھی اسی کے ذریعے دی جاتی تھی۔ گذشتہ شب لائبریری سے واپسی پر اس نے اخبار فروش سے معلوم کیا مگر متعلقہ اخبار پہنچا نہیں تھا۔ آج وہ اسی لیے جلدی آ گیا تھا۔ ایک اخبار فرش کے پاس تازہ شمارہ موجود تھا۔ کمال نے خریدا ہی تھا کہ بس آ گئی اس لیے اسے نتیجہ دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ بس میں اندر داخل ہوتے ہی اسے بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ جب اس نے اخبار کھول کر دیکھنا چاہا تو پاس کھڑے ایک عمر رسیدہ شخص نے اعتراض کیا، ''لوگوں کو پاؤں ٹکانے کی جگہ نہیں مل رہی اور تم اخبار کھول کر بیٹھ گئے ہو۔ بند کرو اسے''۔ کمال نے چھوٹی سی تہہ کر کے دیکھنا شروع کیا۔ کامیاب امیدواروں کے رول نمبر سامنے نظر آئے۔۔ اس نے دھڑکتے دل سے دیکھا، اور اپنا رول نمبر پا کر خوشی اور جذبات سے اس کو پسینہ آ گیا۔ چند لمحے چپ چاپ بیٹھنے کے بعد اس نے اپنے یقین کے لیے پھر اخبار دیکھا، رول نمبر اسی کا تھا، لہٰذا وہ پُرسکون اور شانت ہو گیا۔

بس چلی جا رہی تھی۔ صاف شفاف آسمان، کھلا کھلا موسم، آتے جاتے لوگ، آج اسے ہر طرف خوشی پھوٹتی دکھائی دی اور اس نے پھر اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ کامیابی انسان کو بھلا چنگا کر دیتی ہے۔

دفتر پہنچ کر وہ جذبات سے مغلوب سیدھا اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ خلافِ معمول کھانے پینے کی کوئی چیز خریدنے کا خیال تک نہ رہا۔ رفقائے کار کو اپنی خوشی میں شامل کرنے کی بیتابی تھی مگر ابھی تک کوئی آیا ہی نہیں تھا۔ آتے بھی کیسے، ابھی تو دفتر کا وقت ہی نہیں ہوا، وہ خود بہت پہلے آ گیا تھا۔ اب اس نے سوچا کہ نیچے سے کھانے کے لیے کچھ لے آئے۔ سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے امرناتھ چوہدری سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اس نے پوچھا، ''کمال! خیر تو ہے، بڑے خوش نظر آ رہے ہو؟'' کمال

نے اسے اپنے نتیجہ کا بتایا تو وہ بھی خوش ہوا اور کمال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اشیر باد دی، ''ترقی کرو، اچھے انسان بنو''۔ کمال نے ہاں میں سر ہلایا اور نیچے اتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو چیٹر جی اس سے بغلگیر ہو کر بولا، ''کمال بھائی! تم نے تو کمال کر دکھایا ہے''۔ کمال کو یاد آیا کہ یہ الفاظ قاضی نذرالاسلام کی ایک نظم ''کمال پاشا'' میں سے ہیں۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ قاضی نذر پہلا شاعر تھا جس کی کہی ہوئی نظمیں فوجی دھنوں کے ساتھ بھی گائی جا سکتی تھیں۔ قاضی نذرالاسلام خود بھی کسی زمانے میں فوجی خدمات سر انجام دے چکا تھا۔ کمال پاشا ترکی کا انقلابی رہنما اور جدید ترکی کا بانی تھا۔ اس نے سنا تھا کہ ہر انٹرویو میں کمال پاشا کے بارے میں کوئی نہ کوئی سوال ضرور پوچھا جاتا ہے، گویا اب اسے اس قسم کے سوالات کی تیاری زیادہ محنت سے کرنا ہوگی۔

دفتر کے بعد وہ حسبِ معمول نیشنل لائبریری گیا تو کمال پاشا پر لکھی ہوئی کتابوں کو ڈھونڈتا رہا۔ سب سے پہلے اس نے انگریزی کتابوں کو دیکھا، چونکہ اس کا پورا نام مصطفیٰ کمال پاشا تھا اس لیے کمال نے مصطفے، پھر کمال اور پھر پاشا کے ناموں کے تحت کتابوں کی کیٹلاگ پر نظر ڈالی۔ پاشا اور اس کے مقلدین ''جوانانِ ترک'' (Young Turks) کے نام سے مشہور تھے لہٰذا وہ اس نام کے تحت بھی کتابیں ڈھونڈتا رہا مگر کوئی کتاب نہ ملی۔ اسے خیال آیا کہ کمال پاشا اور اس کے ساتھی برطانیہ اور دیگر اتحادی افواج کے شدید مخالف تھے، شاید یہی وجہ ہو کہ کسی انگریز مورخ کو اس موضوع پر انگریزی زبان میں لکھنے کا اشتیاق نہ رہا ہو۔ اس نے بنگالی زبان میں لکھی کتابوں کی فہرست دیکھی تو چند کتابیں مل گئیں۔ اس نے نکلوا کر دیکھیں مگر وہ مختصر کتابیں تھیں۔ اس نے وہیں بیٹھ کر ان کا مطالعہ کیا، کچھ نکات لکھے اور کتابیں واپس کر دیں۔

....

حکومت میں ایک جونیئر عہدے پر ہوتے ہوئے وہ اعلیٰ ملازمتوں کے لیے انٹرویو میں جانے والا تھا، لہٰذا اس کے ساتھیوں نے دہلی میں بنگہ بھون کے نام سے دو منزلہ عمارت میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیا۔ کمال ریلوے اسٹیشن سے آٹو رکشہ لے کر وہاں پہنچا۔ اسے پہلی منزل پر ایک کمرہ مل گیا۔ کمرے میں دو بستر بچھے تھے، چندن سین نامی دراز قد اور صاف رنگت کا شخص پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ اگرچہ اس کا ذاتی مکان سالٹ لیک علاقے میں تھا مگر اسٹیٹ بنک آف انڈیا میں پروبیشن آفیسر کی حیثیت سے تعیناتی کے سبب یہاں رہائش پذیر تھا۔ وہ حساب میں آنرز اور ایم، ایس، سی تھا۔ لمبے بال، فینسی لباس اور خوشبو کا استعمال اس کی شخصیت کا حصہ تھے۔ گفتگو کے دوران کمال نے اسے بتایا کہ وہ ملازمت کے سلسلہ میں کئی جگہ انٹرویو دے چکا ہے، بلکہ اسٹیٹ بنک میں بھی پروبیشن آفیسر کے لیے درخواست دی ہوئی تھی۔ چونکہ اس کا اکاؤنٹ اسٹیٹ بنک میں تھا اس لئے وہ برانچ کے افسروں سے بھی ملا تھا تاکہ انٹرویو کے لیے رہنمائی مل سکے مگر انہوں نے اسے سول سروس میں جانے کا مشورہ دیا۔ چندن خاموشی سے سنتا رہا لیکن اس کی بدن بولی اس حقیقت کی غماز تھی کہ وہ ایک جونیئر کلرک اور بنک آفیسر کے امیدوار کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھ رہا تھا۔ کمال سے کوئی بات کئے بغیر وہ کھانے کے لیے نیچے چلا گیا۔

اگلے دن دونوں کو انٹرویو کے لیے یونین پبلک سروس کمیشن کے دفتر جانا تھا۔ کمال کا خیال اکٹھے جانے کا تھا لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ آٹو رکشہ لے کر شاہجہان روڈ پر واقع دھولپور ہاؤس پہنچ گیا۔ ابھی سوا آٹھ بجے تھے جبکہ انٹرویو کا وقت نو بجے تھا۔

انٹرویو کے بلاوے کا خط دیکھ کر چپراسی اسے ایک کمرے میں لے گیا۔ کوئی اور امیدوار اس وقت تک نہیں پہنچا تھا، ۔کمال ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد ایک لڑکی اندر آئی اور کمال کو دیکھ کر سیدھی اس کے پاس آ کر باتیں کرنے لگی۔ اس کا نام نیتا مترا تھا اور دہلی میں تعینات ریلوے کے ایک اعلیٰ افسر کی بیٹی تھی۔ وہ معاشیات میں فرسٹ کلاس ایم، ایس، سی تھی۔ ان کی باتوں کے دوران تیسرا امیدوار بھی آ گیا۔ وہ دراز قد روی شیکھر تھا جس نے بی، ٹیک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ تینوں کی باتوں کے

دوران چوتھا امیدوار نودیپ سنگھ، سیاسیات میں پی، ایچ، ڈی بھی آ گیا۔ کمال واحد امیدوار تھا جس کے پاس صرف بی، ایس، سی کی ڈگری تھی، باقی سارے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔

اسی اثنا میں ایک شخص کمرے میں آ کر ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گیا، سامنے میز پر فائل رکھی اور سب کے نام بولنے لگا۔ سب سے پہلے روی شیکھر کا نام بولا گیا۔ وہ گیا، اپنے سرٹیفکیٹ وغیرہ دکھائے، اس شخص نے اس کے نام کو نشان زد کیا اور کہنے لگا،''انٹرویو بورڈ کے سامنے جانے والے تم پہلے امیدوار ہو گے''۔ روی نے سر ہلایا اور واپس کرسی پر بیٹھ کو خود کو ذہنی طور پر آنے والی کٹھن گھڑی کے لیے تیار کرنے لگا۔ اگلا نام نودیپ سنگھ اور اس کے بعد کمال منڈل کا پکارا گیا۔ اس نے جا کر اپنی اسناد اور بی، ایس، سی سرٹیفکیٹ کی نقل سامنے رکھی۔ اس شخص نے پوچھا،''اصل ڈگری کہاں ہے؟'' کمال نے تہذیب سے جواب دیا،''ابھی تک نہیں ملی''۔

''کس یونیورسٹی سے؟''

''کلکتہ یونیورسٹی''۔

''ٹھیک ہے''، اور کوئی سوال پوچھے بغیر اس نے اس کا نام نشان زد کر کے اگلے امیدوار چندن سین کو آواز دی۔ کمال سمجھ گیا کہ یہ اس کے ساتھ کمرے میں رہنے والا چندن سین ہے۔ وہ تا حال نہیں پہنچا تھا۔ تین بار اس کا نام پکارا گیا مگر کوئی نہ آیا۔ پھر نیتا مترا کو بلایا گیا۔ اس کے کاغذات بھی صحیح پائے گئے۔ متعلقہ اہلکار اپنی فائل اٹھائے باہر نکل گیا۔

چند منٹ بعد چپراسی نے آ کر روی شیکھر کو بلایا۔ کمال نے گھڑی دیکھی جو ٹھیک نو بجا رہی تھی۔ چپراسی نے روی کو ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا، گویا انٹرویو ساتھ والے کمرے میں ہونا تھا۔ کمال کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ کمرے کے اندر کا منظر نامہ تصور کرنے لگا۔ روی اس وقت تک دروازے کے پاس کھڑا رہا جب تک کہ چپراسی نے دروازہ کھول نہ دیا۔ بالفاظِ دیگر، خود دروازہ کھول کر اندر جانے کی اجازت نہیں۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا جب ''چندن سین'' کا نام سن کر چونک پڑا۔ اہلکار کمرے میں موجود چندن کو بڑی ملائمت سے کہہ رہا تھا،''سر! آپ کو نو بجے یہاں پہنچنے کو کہا گیا تھا''۔

''تاخیر کی معافی چاہتا ہوں''۔

''انٹرویو شروع ہو چکا ہے۔ اگر آپ کا پہلا نام ہوتا تو سوچیے کیا بنتا!''

''سوری''۔

''اپنے سرٹیفکیٹ وغیرہ دکھائیں''۔

چندن نے اپنے کاغذات نکال کر اس کے سامنے رکھے۔ ادھر نیتا کمال سے کہہ رہی تھی،'' آپ کے اختیاری مضامین تاریخ اور بنگالی ہیں نا؟''

''جی''۔

''کیا آپ کو یاد ہے بنگالی سن کب شروع ہوا تھا؟''

''اس کے متعلق مختلف آراء ہیں۔ زیادہ تر علماء اور محققین کا خیال ہے کہ شہنشاہ اکبر نے ہجری کیلنڈر میں ترمیم کر کے بنگالی سن کا آغاز کیا تھا۔ چند ایک کی رائے میں کرن سورن میں شہنشاہ شاشک کی تاجپوشی کے وقت سے اس کی ابتدا ہوتی ہے۔ نیتا کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دروازہ کھلا اور روی کمرے سے باہر آیا۔ اس کے چہرے پر رونق تھی، شاید اس لیے کہ انٹرویو کی پریشانی اور ذہنی دباؤ ختم ہو گیا تھا۔ باقیوں نے اس سے پوچھنا شروع کر دیا کہ اندر کیا ہوا تھا؟ اتنے میں چپراسی کی آواز سنائی دی،''مسٹر نودیپ سنگھ!''

کمال سوچنے لگا کہ اگلا نام اس کا ہوگا۔ اب اس نے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کیا۔ میں اندر داخل ہو کر کہوں گا، ''گڈ مارننگ سر!''۔ مگر وہاں تو ایک نہیں، کئی لوگ ہوں گے، انہیں کیا کہا جائے، ''سر یا سرز (Sirs) ؟ کمال نے دو ایک بار آہستگی سے دونوں الفاظ کہے۔ Sirs بولنا قدرے مشکل تھا، لہٰذا اس نے 'سر' کہنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا جب تک کہا نہ جائے، اور پھر بڑے مہذب انداز میں ''شکریہ، سر!'' کہہ کر بیٹھوں گا۔ اپنے ہاتھ میز پر نہیں رکھوں گا۔ کمال نے ایک بار ''گڈ مارننگ سر!'' کہنے کی مشق کی۔

نیتا واپس آئی تو کہنے لگی، ''پتہ ہے روی شیکھر سے کیا سوال پوچھے گئے تھے؟''

کمال اپنے خیالات میں خلل پڑنے سے قدرے گڑبڑا گیا۔ انٹرویو سے قبل وہ اپنے آپ کو پرسکون رکھنا چاہتا تھا اس لیے بڑے روکھے لہجے میں جواب دیا، ''کیسے علم ہو سکتا ہے؟''

''اب تمہاری باری ہے''۔

''ہاں''۔

''کیا تم گھبرائے ہوئے ہو؟ سچی بات ہے کہ میں تو گھبرا رہی ہوں''۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ بھلا میں کیوں گھبراؤں گا؟ وہ چند سوال پوچھیں گے، اگر جواب آتے ہوں گے تو دے دوں گا، بصورتِ دیگر صاف اعتراف کر لوں گا کہ مجھے جواب نہیں آتا''۔

''واہ! بڑے پر اعتماد ہو''۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ نیتا سے گفتگو کرنے کے بعد کمال کا اعتماد کافی بحال ہوا تھا۔ اب وہ اپنی ٹائی کو درست کرنے لگا۔ اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور نو دیپ باہر نکلا۔ چپراسی کے آواز دینے سے قبل ہی کمال اٹھ کھڑا ہوا۔ نیتا نے اس کے لیے خوش بختی کا اظہار کیا مگر اسے تو قسمت، بخت وغیرہ پر یقین ہی نہیں تھا اس کے باوجود بھی نیتا کے الفاظ نے اس کے دل پر خوشگوار اثر ڈالا۔ وہ مسرت اور طمانیت سے دروازے کے پاس گیا لیکن چپراسی نے رکنے کا اشارہ کیا۔ دروازے پر لگی گھنٹی کی آواز سن کر اس نے کمال کو اندر جانے کو کہا۔

کمرے میں داخل ہو کر کمال نے سات افراد کو ایک بیضوی میز کے دوسری طرف کرسیوں پر بیٹھے دیکھا۔ سامنے ایک خالی کرسی رکھی تھی۔ اس نے کرسی کے پاس جا کر سب کو ''گڈ مارننگ'' کہا۔ بالکل سامنے بیٹھے شخص نے بھی گڈ مارننگ کہتے ہوئے اسے خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ غالباً وہی اس بورڈ کا چیئرمین اور باقی اراکین تھے۔ کمال ''شکریہ، سر!' کہہ کر بیٹھ گیا۔

''شکریہ مسٹر منڈل'' کہنے کے بعد چیئرمین نے تعارفی سوالات کیے، مثلاً، آپ کی جائے پیدائش؟۔۔۔۔۔ والدین کیا کرتے ہیں؟۔۔۔۔ کہاں قیام ہے؟۔۔۔۔۔ آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟۔۔۔۔۔ دورانِ تعلیم آپ کے مضامین کیا تھے؟۔۔۔۔ اس امتحان کے لیے اختیاری مضامین؟۔۔۔۔۔ کیا دہلی پہلے کبھی آئے تھے؟۔۔۔۔۔ یہاں آ کر کیسا محسوس ہوتا ہے؟

کمال نے آسانی سے ان کے جواب دیئے۔ بعد میں اسے اندازہ ہوا کہ ایسے عام سوالات دراصل امیدواروں کے دل سے گھبراہٹ اور خوف دور کرنے کے لیے کئے جاتے تھے، اور یہ بھی کہ ان کے جوابات سے سب کو امیدوار کی ذاتی زندگی کی ایک جھلک نظر آ جاتی تھی۔ کمال اب بہت آسودہ خاطر تھا۔ چیئرمین نے پوچھا، ''کیا آپ کو یاد ہے کہ آپ کا ہم نام ایک بہت بڑا رہنما بھی تھا؟''

''جی سر! مگر بالکل یہی نام نہیں تھا۔ وہ رہنما مصطفیٰ کمال پاشا تھا، صرف 'کمال' مشترک ہے''۔

''اس کی وجہ شہرت کیا ہے؟''

''اس نے ترکی سلطان کے خلاف بغاوت کی تھی جب وہ اتحادی طاقتوں سے ملکی مفاد پر سودے بازی کر رہا تھا''۔

''اور اس کے علاوہ؟''

''کمال پاشا نے پہلے تو سلطان کو اقتدار سے محروم کیا اور پھر خلافت کو بھی ختم کر دیا''۔

''کیا ان اقدامات کا ہمارے ملک کی تاریخ سے کوئی تعلق ہے؟''

''یقیناً سر! جب مسلمانانِ ہند خلافت کے تحفظ کے لیے تحریک چلا رہے تھے اور کمال نے خود ہی اسے ختم کر دیا تو یہاں کے مسلمانوں نے اس فیصلے کے خلاف شدید احتجاج کیا تو اس نے لگی لپٹی بغیر ان کو ڈانٹ پلا دی''۔

''ٹھیک''، کہہ کر چیئر مین نے ساتھ بیٹھے رکن کو سوال کرنے کا اشارہ کیا۔ اس نے پوچھا، ''آپ نے بی، ایس، سی میں کیمسٹری پڑھی تھی مگر اس امتحان کے لیے تاریخ اور بنگالی ادب کو ترجیح دی''۔

''جی، سر''۔

''کیوں؟ آپ کیمسٹری اور فزکس یا پھر حساب کا مضمون بھی لے سکتے تھے''۔

''جی سر، ایسا ہو سکتا تھا بشرطیکہ کالج میں ان مضامین پر خاطر خواہ توجہ دی ہوتی، لیکن کچھ وجوہ کی بنا پر میں پوری توجہ نہ دے سکا تھا''۔

''وہ کیا وجوہ تھیں؟''

''سر! اہم ترین وجہ تو مالی مشکلات تھیں''۔

''کیسے؟''

''مالی پریشانیوں کی وجہ سے میں کتابیں خریدنے کے قابل نہیں تھا۔ نزدیک ترین کالج کا فاصلہ گھر سے بہت زیادہ تھا۔ غربت کی وجہ سے میں کالج کے آس پاس رہائش کا بندوبست نہیں کر سکا۔ بس اسٹینڈ تک جانے کے لیے مجھے بہت پیدل چلنا پڑتا، پھر بس کا سفر بھی طویل تھا۔ وہاں سے بھی مجھے تقریباً دو کلومیٹر مزید پیدل چل کر کالج پہنچنا پڑتا۔ اس کے علاوہ، اخراجات پورا کرنے کی خاطر لڑکوں کو پڑھاتا بھی رہا، اس لیے میں اپنی تعلیم پر مکمل توجہ نہ دے پایا۔ تیاری نہ ہونے کے باعث مجھے دوبارہ امتحان دینا پڑا''۔

''پھر بھی کچھ عرصہ تو تم نے یہ مضامین پڑھ رکھے تھے جبکہ بنگالی ادب اور تاریخ تو کالج میں کبھی بھی نہیں پڑھے تھے''۔

''جی سر۔ بنگالی ادب اور تاریخ کا مطالعہ کیمسٹری اور حساب کی نسبت میں آسانی سے کر سکتا تھا''۔

''کیسے؟''

''میرے استاد کہتے تھے کہ میں ایک اچھا طالب علم ہوں، لیکن میری مالی حالت کالج میں مزید پڑھنے کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ کیمسٹری یا حساب کی کتاب کھولتے ہی میری مالی زبوں حالی سامنے آ جاتی۔ میں پریشان اور کبیدہ خاطر ہو کر توجہ سے نہ پڑھ سکا''۔

''ان کے علاوہ اور بھی تو مضامین تھے؟''

''جی، بالکل تھے مگر میں ہمیشہ ہی سے ادب کے مطالعہ کا شوقین رہا ہوں۔ بنگالی ادب کے دوسرے پرچے کی تقریباً تمام کتابیں پڑھ چکا تھا۔ بنگالی ادب کی تاریخ مجھے بخوبی یاد تھی۔ مجھے صرف بنگالی زبان کی تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑا۔ لسانی تاریخ

کے سبب میرے دل میں ملک کی تاریخ پڑھنے کا شوق بھی پیدا ہوا، اور پھر تاریخِ ہند سلیبس کا تین چوتھائی ہے چنانچہ میں نے تاریخ اور بنگالی ادب کے مضامین کا انتخاب کیا''۔

پہلے رکن نے مزید کوئی سوال نہ کیا، اب دوسرے نے پوچھا،''منڈل صاحب! آپ نے بی، ایس، سی پاس کرلیا؟''

کمال نے اس کی طرف اپنا رخ کیا۔ سوال سن کر اسے تشویش ہوئی کیونکہ وہ اسکول میں بلاشبہ اچھی کارکردگی دکھاتا رہا تھا مگر کالج کی تعلیم میں خامی رہ گئی تھی جو اس کی تعلیم کا کمزور پہلو تھا۔

''جی سر!''، کمال نے جواب دیا۔

''ہمیں توقع ہے کہ ایک سائنس گریجوئٹ کو یقیناً کچھ نہ کچھ آتا ہوگا''۔

''جی سر!''۔

''درخت کے پتوں کا رنگ کیا ہے؟''

''عام طور پر سبز ہوتا ہے، سر!''۔

''عام طور پر کیوں؟''

زیادہ تو نہیں مگر چند درختوں کے پتے مختلف رنگوں کے بھی ہوتے ہیں''۔

''ٹھیک، پتے زیادہ تر سبز کیوں ہوتے ہیں؟''

''کلوروفل کی وجہ سے''۔

''کیا آپ ہمیں بتائیں گے کہ دن رات کی گردش کیا ہے؟''

''زمیں اپنے محور کے گرد گھومتی ہے اس لیے زمین کا ایک حصہ سورج کے سامنے اور دوسرا الٹی جانب ہوتا ہے۔ سامنے والے حصہ میں دن اور الٹی جانب رات ہوتی ہے''۔

''اس گردش کو کیا کہتے ہیں؟''

''اسے یومی یا یومیہ گردش کہتے ہیں (diurnal motion)''۔

''کیا زمین کی اس کے علاوہ اور بھی کوئی گردش ہے؟''

''جی ہاں، سر!''

''کون سی؟''

''سالانہ گردش''۔

''سالانہ گردش کیوں کہتے ہیں؟''

''کیونکہ زمین سورج کے گرد ایک سال میں گردش مکمل کرتی ہے''۔

''سورج کے گرد زمین کی گردش کا راستہ جیومیٹری کے حساب سے کیا کہلاتا ہے؟''

''سر! معاف کیجیے، میں سوال نہیں سمجھ سکا''۔

''کیا یہ گردش دائرے میں ہوتی ہے یا بیضوی؟''

کمال نے یاد کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی، لہٰذا اس نے صاف گوئی سے اعتراف کرلیا کہ وہ اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ آخر میں بیٹھے ہوئے رکن نے پوچھا،''مسٹر منڈل! آپ کے پتا کیا کرتے ہیں؟''۔

کمال کو یک گونہ اطمینان ہوا۔ اس نے جواب دیا،''سر! وہ ایک چھوٹے سے کسان ہیں۔ تقریباً ایک ایکڑ زمین ہے۔

وہ بٹائی پر دوسروں کی زمین بھی کاشت کرتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ دیہاڑی دار مزدور کی حیثیت سے زرعی کام بھی کرتے ہیں''۔

''کیا تم نے کبھی اپنے ہاتھوں سے زمین کاشت کی ہے؟''

''جی سر!''۔

''اپنے کھیتوں میں کون کون سی فصل اگاتے ہو؟''

''پہلے تو دو فصلیں ہوا کرتی تھیں مگر اب آبپاشی کی سہولت کے سبب تین فصلیں ہوتی ہیں''۔

''آبپاشی کا طریقہ کیا ہے؟''

''زمین میں ٹیوب ویل لگا دیئے گئے ہیں''۔

''اس کے فوائد یا مضرات کیا ہیں؟''

''سر! فی الحال تو فائدے ہی ہیں، نقصان کوئی نہیں''۔

''کس قسم کے فوائد؟''

''پہلے تو خریف اور ربیع کی فصلیں ہوتی تھیں لیکن ان کا انحصار بارشوں پر تھا۔اچھی فصل کے لیے وقت پر بارشوں کا ہونا لازمی تھا۔اب خریف اور ربیع کے علاوہ 'بورو' بھی ہوتی ہے۔آبپاشی اور کھادوں کے نتیجہ میں فصلیں اچھی ہوتی ہیں''۔

''آپ کون سی کھاد استعمال کرتے ہیں؟''

''سر! اس کا انحصار مٹی کی خاصیت پر ہے''۔

''زمین کے معائنے کا کوئی طریق کار ہے؟''

''جی سر! ہم زمین سے کچھ مٹی لے کر محکمۂ زراعت میں جمع کرا دیتے ہیں۔وہ اسے دیکھ کر ہمیں کھاد تجویز کرتے ہیں''۔

''بہت اچھا! آپ نے بتایا کہ ٹیوب ویل لگانے کے فی الحال فائدے ہی ہیں، نقصانات کوئی نہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ نقصانات بھی ہیں۔کیا ہو سکتے ہیں؟''

''کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ ٹیوب ویل کے ذریعہ حاصل کردہ پانی میں لوہے کے ذرات کی آمیزش ہونے سے زمین کی زرخیزی کم ہو جاتی ہے، اور چونکہ پانی زیادہ مقدار میں نکالا جاتا ہے اس لیے زیرِ زمین پانی کی سطح بھی نیچے ہوتی جائے گی۔اس کے نتیجہ میں زمین بالکل خشک اور بنجر ہو سکتی ہے''۔

''کیا آپ ان باتوں سے اتفاق کرتے ہیں؟''

''نہیں سر! ٹیوب ویل کے ذریعے زمین سے نکالے ہوئے پانی کی کچھ مقدار واپس زمین میں جذب ہو جاتی ہے یا گرمی کے سبب بخارات میں تبدیل ہو کر بادلوں کی صورت اختیار کرتا ہے جو بعد ازاں بارش بن کر پانی کو دوبارہ زمین میں لوٹا دیتے ہیں۔اس طرح زیرِ زمین پانی کی سطح کم و بیش یکساں رہتی ہے''۔

''گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں''۔

''جی سر!''۔

چیئرمین نے اب جس رکن کو اشارہ کیا، چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے سوال کیا،

''امریکہ سرمایہ داری پر یقین رکھتا ہے جبکہ سوویت یونین کمیونسٹ ملک ہے، لیکن معاشی لحاظ سے دونوں ممالک باقی ملکوں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ان کی ترقی کے پس پردہ محرکات کیا ہیں؟''

کمال کو اس کا جواب نہیں آتا تھا، لہٰذا وہ سوچنے لگا آیا اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لے۔اس رکن نے کمال کا تذبذب

دیکھ کر دوسرا سوال کر دیا، ''کیا آپ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت میں فرق سمجھتے ہیں؟''

اپنے طالبِ علمی کے زمانے میں کمال کا جھکاؤ اشتراکیت کی طرف تھا۔ اس موضوع پر بہت کچھ پڑھنے کی وجہ سے وہ اشتراکیت میں رائج اصطلاحات سے بخوبی آگاہ تھا، لہٰذا سوال سنتے ہیں اس نے فوراً جواب دیا، ''جی سر! فرق معلوم ہے''۔

''تب آپ کو یہ بھی علم ہوگا کہ امریکہ سرمایہ دار اور سوویت یونین اشتراکی ملک ہے؟''

کمال نے سوال کو کوئی اور رخ دینے کی ترکیب استعمال کی اور اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا۔ حربہ کامیاب ہوا کیونکہ سوال پوچھنے والے رکن کے چہرے سے حیرت عیاں تھی۔ اس نے غور سے کمال کو دیکھا کہ آیا وہ صحیح کہہ رہا ہے کہ اسے دونوں نظاموں میں فرق کا علم نہیں؟ اپنے گمان کی تصدیق کے لیے اس نے پوچھا، ''کیوں؟''

''سوویت یونین کمیونسٹ ملک نہیں ہے نہ ہی خود کبھی انہوں نے ایسا دعویٰ کیا ہے''۔

''پھر وہ کس قسم کا ملک ہے؟''

''سر! وہ سوشلسٹ ملک ہے، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے یعنی 'یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلکس'، گویا وہ کمیونسٹ نہیں بلکہ سوشلسٹ ملک ہے''۔

سوال پوچھنے والے کا منہ لٹک گیا۔ کمال کو بعد میں معلوم ہوا کہ یہی لمحہ اس کی زندگی میں تغیر آمیز تھا۔ اس سے پہلے اس کے جوابات واجبی سے تھے لیکن یہ جواب غیر معمولی ثابت ہوا۔ اگلے رکن نے سوال پوچھ کر گویا پہلے رکن کی تالیفِ قلب کرنے کی کوشش کی تھی، ''مسٹر منڈل! سوشل ازم اور کمیونزم میں کیا فرق ہے؟''

کمال کے لیے یہ سوال بہت آسان تھا۔ اس نے جواب دیا، ''جب مساوات قائم ہو جائے مگر ریاست کی حدود جہاں کی تہاں رہیں، اسے سوشل ازم کہتے ہیں۔ مساوات کے حصول کے بعد جب سرحدیں ختم ہو جائیں، اسے کمیونزم کہا جاتا ہے''۔

''یہ کس کا کہنا ہے؟''

''کارل مارکس کا، سر!''

''آپ کی رائے میں کیا ریاست کی حدود کبھی ختم ہو سکتی ہیں؟''

''سر! اس کا جواب تو آنے والا دور ہی دے گا، تاہم جب تک ریاست متعین حدود کے اندر ہے، ملک کو سوشلسٹ کہا جائے گا، کیمونسٹ نہیں''۔

''سوشل ازم کی کتنی اقسام ہیں؟''

''سر! اتنی ہی اقسام ہیں جتنی ان لوگوں کی تعداد جو اس بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ مثلاً گلڈ سوشل ازم، یوٹوپیائی سوشل ازم، فیبی سوشل ازم (Fabian Socialism)، وغیرہ وغیرہ''۔

کمال ابھی پورا جواب نہیں دے پایا تھا کہ اگلا سوال ہوا، ''کیا یہ سارے ازم ریاستی حدود کے اختتام کی بات کرتے ہیں؟''

''نہیں سر!''۔ کمال نے فوراً کارل مارکس کا نام لیا مگر دل میں شبہ تھا کہ آیا کارل مارکس و فریڈرک اینگلز دونوں نے کہا تھا یا کسی اور نے، لہٰذا گول مول سا جواب دیا، ''اس نظریہ کے مبلغین کا یہی کہنا تھا''۔

''تمہارا یہ کہنا کس حد تک درست ہے کہ ریاست کی حدود ختم ہو جائیں گی کیونکہ سوائے ایک گروپ کے اور کسی نے ایسا دعویٰ نہیں کیا تھا؟''

''سر! یہ میرا دعویٰ نہیں کہ ریاست کی حدود ختم ہو جائیں گی''۔

''پھر تمہارا دعویٰ کیا ہے؟ تمہارے بیان سے مغالطے پیدا ہو رہے ہیں؟''

''سر! میں نے جو عرض کیا ہے اس سے کوئی مغالطہ پیدا نہیں ہو رہا۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ان لوگوں کے مطابق اشتراکیت کا قیام اس وقت ہوگا جب ریاست کی حدود ختم ہو جائیں گی، لہٰذا جب تک سرحدیں موجود ہیں کوئی ملک اشتراکی نہیں کہلا سکتا''۔

''ٹھیک''، اور پھر اس نے آخری رکن کو اشارہ کیا۔ کمال نے دیکھا تھا کہ دوسرے اراکین کے ساتھ سوال جواب کے دوران یہ رکن بڑے غور سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ بعد میں اسے علم ہوا کہ انٹرویو بورڈ میں ایک ماہرِ نفسیات بھی بیٹھتا ہے جو ہر امیدوار کی حرکات وسکنات اور چہرے کے تاثرات پر نظر رکھتا ہے۔ کمال کو ان ماہرین کی قوتِ مشاہدہ پر کلّی اعتماد نہ تھا کیونکہ ذہنی لحاظ سے ناموزوں امیدوار بھی کامیاب قرار دیے جاتے تھے۔ اس ایکسپرٹ نے کمال سے بڑا مختصر سوال کیا، ''کیا خیال ہے کہ اس بورڈ کے سامنے ظاہر کردہ کارکردگی کی بنیاد پر آپ منتخب ہو سکتے ہیں؟''

کمال نے گول مول سا جواب دیا، ''سر! مجھے امید ہے''۔

ماہرِ نفسیات نے مسکراتے ہوئے کہا، ''پر امید رہنا ہمیشہ بہتر ہوتا ہے''، اور پھر چیئرمین کی طرف دیکھ کر سر ہلایا جس نے ''مسٹر منڈل، شکریہ'' کہہ کر انٹرویو ختم ہونے کا اشارہ کیا۔

''مجھے جانے کی اجازت ہے، سر!؟''

''ہاں، آپ جا سکتے ہیں''۔

وہ مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکلا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ انٹرویو نہیں بلکہ ہلکی پھلکی گپ شپ کر کے آیا ہو۔ یہ انٹرویو نیتا کے ساتھ اس کی گفتگو کا ہی حصہ لگتا تھا۔ اس نے وقت دیکھا، گویا پچاس منٹ ہوئے تھے۔ اس کے بعد چندن کو بلایا گیا۔ نیتا اس کے پاس آ کر کہنے لگی، ''انٹرویو ختم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تم اب چلے جاؤ''۔

''پھر کیا کرنا ہے؟''

''میرے انٹرویو ختم ہونے تک تمہیں میرا منتظر رہنا ہوگا''۔

''ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا''، یہ کہتے ہوئے کمال ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے بیٹھی نیتا انٹرویو کے لیے کچھ نکات دیکھ کر خود کو تیار کر رہی تھی۔ کمال ذہنی لحاظ سے مطمئن تھا۔ انٹرویو سے پہلے کی فکرمندی ختم ہو گئی تھی۔ نیتا کو بغور دیکھنے سے اسے محسوس ہوا کہ وہ قدرے گھبرائی ہوئی ہے۔ اتنے میں چندن باہر آیا جو بیس منٹ ہی میں فارغ ہو گیا تھا۔ دوسرے سیشن کے امیدوار پہنچ چکے تھے ان میں سے ایک نے چندن کے پاس جا کر کہا، ''آپ کو جلدی فارغ کر دیا گیا ہے''۔ ایک اور امیدوار نے تبصرہ کیا، ''ہمارے بھائی کے چند جملوں سے بورڈ اراکین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ تو ہیرا ہے اس لیے انہوں نے زیادہ وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا''۔ چندن نے معترض ہوتے ہوئے کہا، ''اس سے الٹ بھی تو ممکن ہے۔ شاید ابتدائی سوال جواب ہی سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ تو بس واجبی سا ہے لہٰذا مزید وقت کیوں لگایا جائے۔ اس لیے مجھے فارغ کر دیا گیا''۔

نیتا ابھی تک کتاب دیکھنے میں مصروف تھی۔ کمال نے اسے یاد دلایا کہ اب اس کی باری آیا ہی چاہتی ہے۔ ''اچھے انٹرویو کے لیے میری نیک تمنائیں''۔

''تمہارا انٹرویو بہت اچھا تھا''۔

''تمہارا اس سے بھی بہتر ہوگا''، کمال نے خلوصِ دل سے حوصلہ افزائی کی۔

نیتا کے کچھ بولنے سے پہلے ہی چپراسی نے دروازہ کھولا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔ تمام امیدوار ایک دوسرے کے

حریف تھے۔ایک کی کامیابی دوسروں سے برتری کا ثبوت تھا پھر بھی کمال خلوصِ دل سے نیتا کی کامیابی کا خواہاں تھا۔ جب وہ انٹرویو کے لیے کمرے میں جانے والا تھا تو نیتا نے بھی پرخلوص انداز میں اس کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔کمال اس سے قبل ایسے خوشگوار تجربے سے دوچار نہیں ہوا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ایسی خواہشات سے مثبت نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ بایں ہمہ، نیتا کی پرخلوص تمنا نے اس کے دل ودماغ میں مسرت آمیز لہر دوڑادی تھی جو ابھی تک ہلکورے لے رہی تھی اس لیے وہ بھی نیتا کی واپسی کا منتظر رہا۔تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ باہر آئی تو چہرے سے فکرمندی کے آثار نمایاں تھے۔کمال نے اس کے پاس جاکر انٹرویو کے بارے میں پوچھا۔

''انٹرویو تو ٹھیک ہی جارہا تھا لیکن جب مجھ سے دیگر مشغولیات کا پوچھا گیا تو بائیں جانب بیٹھے رکن نے مجھے کافی دق کیا۔

''کیسے؟''

''میں نے اپنا شوق باغبانی لکھا ہوا تھا، اس لیے اس موضوع پر لمبے چوڑے سوالات آنا شروع ہوگئے، مثلاً فلاں پودا کس وقت لگانا چاہیے، فلاں فلاں پودوں کے لیے کون سی کھاد مناسب ہے، کس کو زیادہ پانی کی ضرورت ہے، پودوں پر سیم کا کیا اثر ہوتا ہے، وغیرہ، وغیرہ۔ مجھے ان سب کا جواب نہیں آتا تھا۔ ہمارا مالی ہی پودوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ مجھے باغات پسند ہیں اور میں تو صرف سیر کے لیے جاتی ہوں۔میری غلطی تھی کہ میں نے باغبانی لکھ دیا تھا۔تم نے کیا لکھا تھا؟''

''مختصر کہانیاں لکھنا''۔

''تم سے مختصر کہانیوں پر کیا سوالات ہوئے؟''

''ایک بھی نہیں''۔

''اور مجھے اپنا شوق باغبانی لکھنا مہنگا پڑ گیا۔انہیں کیسے اندازہ ہوگیا کہ مجھے باغبانی کا کچھ علم نہیں؟''

''ہوسکتا ہے کہ وہ صاحب زراعت کے ماہر ہوں''۔

''تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''کیونکہ مجھ سے بھی زراعت پر متعدد سوال کئے گئے تھے''۔

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں ایک کسان کا بیٹا ہوں، خود اپنے ہاتھوں سے زمین جوتی ہے اس لیے ایسے سوال میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں''۔

''خیر! اب جو ہو، سو ہو۔آؤ، کینٹین چلیں، مجھے بھوک لگ رہی ہے''۔

اور وہ دونوں کینٹین کی طرف چل پڑے۔

....

کمال دفتر میں بیٹھا کام کررہا تھا کہ ثمر چیٹر جی نے میز پر اپنا بیگ رکھتے ہوئے اسے بتایا کہ سی، ایس، ایس امتحان کا حتمی نتیجہ آچکا ہے۔کمال نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور پوچھا، ''تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''گذشتہ رات ٹی، وی خبروں میں تھا''۔

آج صبح کمال نے ''اخبارِ روزگار'' دیکھا تھا مگر نتیجہ کی کوئی خبر نہیں تھی۔اب کیسے علم ہو کہ کامیاب امیدواروں میں اس کا نام ہے یا نہیں؟ اچانک اسے پریس انفارمیشن بیورو کا خیال آیا۔اگر ٹی، وی پر خبر چلی ہے تو یقیناً پریس نوٹ بھی جاری ہوا ہو گا۔وہ سیکشن افسر امرناتھ چوہدری سے تھوڑی دیر کی چھٹی لے کر تقریباً بھاگتا ہوا بیورو پہنچا اور سیدھا اس میز کی طرف گیا جہاں پریس نوٹ رکھے جاتے تھے۔ چند امیدوار پہلے ہی وہاں موجود تھے جو صفحات آگے پیچھے کرکے نتیجہ تلاش کررہے تھے۔کمال

بے چین تھا مگر انتظار کرتا رہا۔ جب پہلے سے موجود لوگ فارغ ہو گئے، اس نے اپنا نام تلاش کرنا شروع کیا۔ تیسرے صفحہ پر اس کا نام موجود تھا۔ اپنا نام دیکھ کر یوں لگا جیسے دل کی دھڑکن رک گئی ہو۔ 847 کامیاب امیدواروں میں اس کا نمبر 147 تھا۔ اب اس نے آسامیوں کی فہرست دیکھی تو معلوم ہوا کہ 130 آسامیاں انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس (IAS)، 20 فارن سروس اور 80 پولیس سروس کی ہیں۔ اسے کون سی سروس مل سکتی ہے؟

امتحان کے لیے فارم بھرتے ہوئے اس نے پہلی، دوسری اور تیسری ترجیح بالترتیب ایڈمنسٹریٹو، فارن اور پولیس سروس لکھی تھی۔ دور دراز علاقے میں رہنے کے سبب اسے دوسری سروسز یعنی اکاؤنٹس اور ریلوے وغیرہ کا علم نہیں تھا، مگر اتنا جانتا تھا کہ سڑکوں کی تعمیر اور ٹیوب ویل وغیرہ کی تنصیب کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بہت کردار ہوتا ہے۔ وہ اپنے علاقے کا سب سے اہم افسر کہلاتا ہے۔ آئی، اے، ایس (IAS) میں آنے والا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پولیس سروس میں آنے والا ایس، پی (SP) بنتا ہے جو ضلعی پولیس کا انچارج بن کر انہیں کنٹرول کرتا ہے۔ فارن سروس کا اسے معمولی سا پتہ تھا کہ یہ لوگ دفتر خارجہ میں، یا پھر سفیر وغیرہ بن کر دوسرے ممالک میں تعینات ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس سروس میں بہت کشش پائی جاتی ہے۔ شروع شروع میں تو اعلیٰ پوزیشن والوں کو اس سروس میں لیا جاتا تھا مگر جب سے اہم ممالک مثلاً برطانیہ اور امریکی وغیرہ میں سفیروں کی تعیناتی سیاسی بنیادوں پر ہونے لگی اور فارن سروس کے افسروں کو کم اہمیت کے حامل ممالک میں بھیجا جانے لگا، امیدواروں کی اس میں جاذبیت کم ہوتی گئی۔ اب ان کی ترجیح IAS ہے، اسی وجہ سے کمال نے بھی اپنی ترجیحات ایسے ہی دی تھیں۔

ان اسامیوں میں پندرہ فیصد اور ساڑھے سات فی صد آسامیاں بالترتیب شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ قبائل کے لیے مختص تھیں۔ گویا وہ اپنی ترجیح کی مناسبت سے پولیس سروس حاصل کر سکتا ہے، مگر کیا اس وقت اسے اپنی ترجیحات میں ردوبدل کی اجازت ہے؟ اس بارے میں اسے بالکل علم نہیں تھا۔

اس کے دفتری رفقائے کار نے مبارکبادیں دیں۔ کچھ نے پولیس میں جانے سے منع کیا۔ ثمر چیٹر جی کا کہنا تھا: ''پولیس میں جانے سے تم اپنے آپ کو ضائع کر دو گے۔ تم بے ایمان بننے کے علاوہ بدتمیز بھی ہو جاؤ گے۔ پولیس والے کوئی اچھے لوگ نہیں، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ 'پولیس والوں کی دوستی اچھی، نہ دشمنی اچھی'، پولیس سروس میں مت جانا''۔

''مجھے کس سروس کو ترجیح دینا چاہیے؟''

''اگر تمہیں IAS یا فارن سروس مل جائے تو بہت بہتر ہے، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے اچھے محکمے ہیں، مثلاً آڈٹ اور اکاؤنٹس۔ تمہاری تعیناتی بڑے شہروں میں ہوگی۔ پھر انکم ٹیکس کا محکمہ ہے جہاں تمہارا واسطہ معاشرے کے چنیدہ افراد سے پڑے گا۔ پولیس میں تو تمہیں ڈاکوؤں، چوروں اور دھوکے بازوں سے نبٹنا ہوگا۔ تمہارے مزاج اور خصلت کا رخ برائی کی طرف ہوتا جائے گا۔ اس کے علاوہ بھی متعدد اور محکمے ہیں، ان میں سے کسی کا بھی چناؤ کر لو''۔

اس کے دیگر رفقائے کار نے بھی چیٹر جی کی رائے سے اتفاق کیا۔ ادھر کمال کے ذہن میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس سے رہنمائی حاصل کر سکتا۔ ماں باپ کو ان معاملات کا کچھ پتہ نہیں تھا اور دوستوں کی رائے چیٹر جی کی سوچ سے مختلف نہیں تھی۔ پھر وہ کالج گیا۔ اس کے اساتذہ بھی پولیس سروس کے حامی نہیں تھے کیونکہ ان کے خیال میں کمال غلط راہ پر پڑ جائے گا، لیکن ایک استاد اشیش چیٹر جی نے یہ کہتے ہوئے حمایت کی: ''کیا آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ پولیس کو ٹھیک نہیں ہونا چاہیے؟ اگر نیک سیرت لوگ نہ جائیں تو اس محکمہ کو کیسے درست کیا جا سکتا ہے؟ پولیس میں جانے کے باوصف بھی ایماندار رہا جا سکتا ہے۔ تم پولیس کو ٹھیک کر سکتے ہو۔ یہ دیش اور ہم وطنوں کی ضرورت ہے۔ بیٹا! تم پولیس سروس میں ہی جاؤ۔ جب تک تم نہ چاہو گے، دنیا کی کوئی طاقت تمہیں بے ایمانی پر نہیں اکسا سکے گی''۔

چیٹر جی صاحب کی رائے اتنی مخلصانہ اور جاندار تھی کہ کمال نے بھی پولیس سروس ہی کے انتخاب کو اوّلیت دی۔ بالآخر وہ اس محکمہ میں آ ہی گیا۔ تعیناتی کا حکم نامہ ملنے کے بعد وہ اپنے استاد مسٹر امر پال سے ملاقات کے لیے گیا۔ انہوں نے بغلگیر ہو کر مبارک دی اور کہا، ''ارادے پختہ ہوں تو انسان کیا حاصل نہیں کر سکتا۔ چند برس پہلے تم کیا تھے، اب کمشنر بننے والے ہو''۔

کمال خاموش رہا، امر پال صاحب کہہ رہے تھے، ''ہمارے تمام دارالحکومتوں کے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر پولیس سروس سے ہیں، اور تم بھی اسی محکمہ میں آ گئے ہو۔ ایک روز تم بھی اسی مقام پر ہو گے، بلکہ اس سے بھی آگے جاؤ گے۔ برخوردار! ثابت قدمی سے آگے بڑھتے رہو''۔

کمال ان سے رخصت ہو کر گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں اسے امینہ پال ملی جو براہی ہائی اسکول میں اس کی ہم جماعت تھی۔ اب وہ لڑکیوں کے ایک کالج میں جونیئر کلرک تھی۔ اس نے سائیکل سے اتر کر کمال کو مبارکباد دیتے ہوئے بتایا کہ پروفیسر بینر جی اس سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

''میں ابھی گھر آیا ہوں اس لیے انہیں خبر نہیں دی''۔

''اگر ممکن ہو تو ان سے رابطہ کر لینا''۔

''یقیناً، مگر آج نہیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے اور گھر بھی جانا ہے۔ میں کسی روز ان سے ملاقات کروں گا''۔

یہاں سے کمال ڈاک کے چند لفافے خریدنے ڈاکخانہ گیا۔ پوسٹ ماسٹر اسے دیکھ کر باہر آ گیا۔ وہ اس کے ہائی اسکول کے سابقہ ہیڈ ماسٹر کا عزیز ہونے کی وجہ سے کمال کو جانتا تھا۔ اس نے بھی مبارکباد دی، ''تم آل انڈیا سروس میں شامل ہونے والے اس اسکول کے پہلے طالب علم ہو۔ ٹریننگ کے بعد تمہاری تعیناتی بحیثیت سب ڈویژنل پولیس آفیسر ہو گی''۔ باقی لوگ اسے بنظر تحسین دیکھ رہے تھے۔ اس نے لفافے خریدے اور گھر کی جانب روانہ ہوا۔ ماں نے اسے دیکھ کر پوچھا، ''سب لوگ کہہ رہے ہیں تم پولیس کے بڑے افسر بن گئے ہو، کیا یہ سچ ہے؟''

کمال نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ''ہاں! ایسا ہی ہے''۔

''کیا سارے داروغے تمہارے ماتحت ہوں گے؟''

''جی ہاں! اگر میری تعیناتی کسی ضلع میں ہوئی تو ان سب کے کاموں کی نگرانی میں ہی کروں گا''۔

مریم کے لیے یہ ناقابلِ یقین سی بات تھی کہ اس کا بیٹا اتنے سارے طاقتور پولیس افسروں کا بھی افسر ہو گا۔ گھر سے فارغ ہو کر وہ محکمے میں اپنی آمد کی رپورٹ کرنے گیا۔ راستے میں پروفیسر دیباشش بینر جی، عرف انیر بن، سے ملاقات کے لیے گرلز کالج گیا۔ اسے کسی دور میں پولیس نے گرفتار کیا تھا مگر طویل عرصہ قید میں رکھنے کے باوجود اس پر کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا، اس لیے اسے آزاد کرنا پڑا۔ کالج میں دوبارہ آنا مشکل کام تھا لیکن وہ کسی نہ کسی صورت پھر سے نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور تب سے یہیں پڑھا رہا تھا۔ کالج پہنچ کر وہ اساتذہ کے کمرے کی طرف گیا۔ پروفیسر بینر جی کمال کو دیکھ کر باہر آئے اور اسے ساتھ لے جا کر جھیل کے کنارے ایک بنچ پر جا بیٹھے۔ دورانِ گفتگو انہوں نے کہا، ''اب جبکہ تمہیں اچھی نوکری مل گئی ہے، یقیناً تم شادی کر کے گھر بسانا چاہو گے''۔

''ٹریننگ ختم ہونے کے بعد ہی میں اس پر سوچوں گا''۔

''میں نے کب کہا ہے کہ تم ابھی شادی کرو، کم از کم بات چیت تو بڑھائی جا سکتی ہے''۔

''پروفیسر صاحب! کیا آپ تھوڑی سی وضاحت کریں گے؟''

''یقیناً۔ ہماری موجودہ جنرل سیکرٹری فریدہ سلطانہ قبول صورت ہیں۔ ان کے والد ہیڈ ماسٹر ہیں، انہوں نے اپنی دختر

کے لیے تمہیں پسند کیا ہے۔اس مقصد کے لیے انہوں نے مجھ سے بات کی تھی''۔

''انہیں کیسے پتہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟''

''شاید ان کی بیٹی نے بتایا ہو''۔

''بیٹی کو ہمارے تعلقات کا کیسے علم ہوا؟''

''بہت سے لوگوں کو علم ہے''۔

''لوگوں کو علم ہوگا مگر اسے تو آپ نے ہی بتایا ہوگا؟''

''اگر میں نے ہی بتایا ہو تو اس میں برائی کیا ہے؟''

''بالکل نہیں، مگر میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا، اور ویسے بھی ابھی شادی کرنے کا میرا ارادہ نہیں''۔

''شادی نہ کرو، ملاقات تو کر لو''۔

''جب میرا شادی کا ارادہ ہی نہیں تو ملاقات کیوں کروں''۔

''ممکن ہے ملاقات کے بعد تمہارا ارادہ بدل جائے''۔

''کیا آپ کا واقعی یہ خیال ہے؟ اور اگر ایسی بات ہے تو پھر ملاقات بالکل مناسب نہیں''۔

اس کے باوجود پروفیسر بینرجی کا اصرار اپنی جگہ قائم رہا،''اگر تم شادی نہیں کرنا چاہتے تو کوئی شخص تمہیں اس پر مجبور نہیں کر سکتا، مگر میری خواہش ہے کہ تم ایک بار اس سے مل لو''۔

''مجھے فیصلہ کر لینے دیں، پھر ہی میں اس سے ملاقات کروں گا۔آپ کو بتادوں گا''۔

اس گفتگو کے بعد کمال اپنی منزل کی جانب روانہ ہوا جہاں اس نے محکمے کو اپنی آمد کی اطلاع دینا تھی۔

....

نومبر کی ایک صبح، کمال قدرے غنودگی میں تھا لیکن گھڑی کا الارم متواتر شور مچائے جا رہا تھا۔کمال نے اٹھ کر کمرے کی بتی جلائی اور منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔اسی دوران بگلچی نے سب کو بیدار کرنے کی دھن چھیڑ دی۔کمال نیچے اتر کر پولیس میس کے سامنے والی سڑک پر آ گیا۔وہ ایک ہفتہ کے لیے سب کا انچارج تھا۔سب لوگ پریڈ کے لیے صف باندھے کھڑے تھے۔اس نے گنتی کی تو راجیو کو غیر حاضر پایا۔اسے بتایا گیا کہ وہ بیمار ہونے کے سبب آ نہیں سکا۔کمال نے پریڈ کمانڈر کو مطلع کیا اور پھر تمام لوگ قطار میں پریڈ میدان کی طرف چل پڑے۔اس گروپ کا ٹرینر سریندر جھا ایک مخلص شخص تھا، کمال کے دل میں اس کے لیے بہت عزت تھی۔پدرانہ اوصاف کا حامل چیف انسٹرکٹر پی۔ایس۔نبر تمام زیرِ تربیت افسروں کو پیار سے سمجھاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ تمام لوگ اس کو بہت پسند کرتے تھے، ہاں البتہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر لپشپت سنگھ، جس کے نام کا مطلب تھا ''غیر متعصب''، مگر وہ اکیڈمی میں سب سے زیادہ متعصب شخص ثابت ہوا۔کمال کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب چھلانگ لگاتے وقت اس کا ایک چہیتا افسر دو تین بار کوشش کے باوجود سب سے زیادہ نمبر لینے میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے بڑے غصیلے انداز میں انسٹرکٹر کو ڈانٹتے ہوئے کہا تھا کہ پیمائش ٹھیک کرے۔آخر ''ٹھیک'' پیمائش میں وہ سرِ فہرست ٹھہرا۔صرف یہی نہیں، وہ بڑا بدتمیز اور غیر مہذب شخص ہونے کے ساتھ ساتھ غیر شریفانہ اندازِ تخاطب سے بھی باز نہیں آتا تھا جس سے دوسرے اعلیٰ افسروں کے لیے بھی مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ایک بار اس نے زیرِ تربیت افسروں کے متعلق انتہائی نازیبا لفظ استعمال کیا جس پر اس کے خلاف شدید احتجاج ہوا اور ڈائریکٹر کو معذرت کرنا پڑی۔

جسمانی تربیت کے پہلے پیریڈ کے اختتام پر سارے افسر جمنازیم کے طرف بھاگے۔میس کے ملازمین ان کے لیے

مخصوص لباس پہلے ہی سے لا چکے تھے۔ لباس کی تبدیلی کے لیے انہیں پانچ منٹ دیے گئے۔ کمال ایک طرف جا کر لباس بدلنے لگا کیونکہ کھلے میدان میں ایسا کرتے ہوئے اسے الجھن محسوس ہوتی تھی۔ تمام پروبیشنرز جمع ہو گئے۔ اس مرحلے کی تربیت کے بعد بگل نے اس دن کی تربیت کے خاتمے کا اعلان کیا۔ وہاں سے وہ سب ناشتے کے لیے میس جا پہنچے۔

ناشتہ کرنے کے بعد کمال نے اپنے کمرے میں جا کر غسل کیا اور کپڑے تبدیل کر کے کلاس روم چلا گیا۔ کلاس کا وقت ساڑھے نو تھا مگر ابھی نو ہی بجے تھے۔ پہلا پیریڈ انڈین پینل کوڈ کا تھا لہٰذا وہ کتاب کھول کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ ان کی کلاسوں کے اوقات ڈیڑھ بجے تک تھے۔ کھانا کھانے کے بعد ساڑھے چار تک انہیں فرصت تھی۔ آرام کرنا، لائبریری جانا یا کچھ لکھنا لکھانا ان کی مرضی پر منحصر تھا۔ ہندی زبان سے لاعلمی کے سبب کمال نے وقت ضائع کرنے کی بجائے ہندی کلاس میں بیٹھنا مناسب سمجھا تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی تو دور گولکنڈہ قلعہ پر نگاہ پڑی۔ تاریخ کا طالب علم ہونے کے سبب وہ اس دور میں جا پہنچا جب گولکنڈہ ریاست کی راجدھانی تھی۔ یہ قلعہ تمام حالات و واقعات کا شاہد تھا۔ وقت کیسے تیزی سے گزرتا ہے! گھڑی دیکھی تو سوا چار بجے تھے، اسے اب ہندی کلاس میں جانا چاہیے۔ بعد ازاں جسمانی تربیت اور کھیلوں کے پیریڈ تھے۔

فارغ ہوا تو اسے ثریا خان کی طرف سے لکھا ہوا ایک خط ملا۔ کھولا تو سٹیتھسکوپ گلے میں ڈالے ایک سندر لڑکی کی تصویر نیچے جا گری۔ کمال نے تصویر اٹھائی، دیکھا، مگر یہ ثریا تو نہیں۔ پھر یہ کون ہے؟ اس نے خط پڑھنا سروع کیا،

''کمال بھائی!

اب جبکہ تمہیں اچھی نوکری مل گئی ہے، اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے ہو، فطرتاً اب شادی کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ تمہارے لیے بہت اچھے رشتے آئیں گے لیکن میں اپنی نند، ریحانہ، کا نام تجویز کر رہی ہوں۔ میری طرح وہ بھی ڈاکٹر ہے اور تمہاری طرح موسیقی کی رسیا۔ میرے خیال میں دونوں کا ملاپ شاندار ثابت ہوگا۔ تمہاری رائے کیا ہے؟

جواب کی منتظر،

مخلص،

ثریا''۔

کمال ان دنوں کی یاد میں کھو گیا جب ثریا اسے پسند کرتی تھی اور جب وہ اس کے گھر گئی تھی، اسے ایک ایک پل یاد تھا۔ اس وقت تو اس نے ثریا کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا تھا لیکن دل سے شادی کا خواہشمند ضرور تھا بشرطیکہ وہ اس کے باروزگار ہونے تک انتظار کر لیتی مگر وہ اس پر تیار نہیں تھی، اب وہ اپنی نند کا رشتہ دینے پر کیسے تیار ہو گئی ہے؟ کمال نے تصویر واپس ثریا کو بھیج دی جو اس رشتہ سے واضح انکار کی علامت تھی۔

خط ملنے کے بعد کمال بوجھل دل سے کلاس میں بیٹھا رہا۔ ہندی کے استاد پربھاکر کشتریہ انہیں تذکیر و تانیث پڑھا رہے تھے۔ ہندی زبان میں مذکر مونث کی تخصیص مشکل ہے۔ ہر چیز یا تو مذکر ہے یا مونث، بے صنف کوئی نہیں۔ ایک مبتدی کے لیے غیر ذی روح کی صنف کا اندازہ کرنا انتہائی مشکل ہے۔ سمجھنے کے لیے کوئی اصول متعین نہیں، اس کا انحصار جملے یا لفظ کی ساخت پر ہے، مثلاً اگر کتاب کے لیے لفظ ''گرنتھ'' استعمال کیا جائے تو یہ مذکر ہے، لیکن کتاب کہیں تو مونث۔ بہت سے الفاظ اس کی مادری زبان، یعنی بنگالی میں بھی مستعمل ہونے کے سبب کمال کے لیے مانوس تھے۔ سابقے، لاحقے، تصریف اور گردان اگرچہ مختلف تھے مگر اتنے بھی نہیں کہ سمجھ میں نہ آ سکیں، لیکن مذکر مونث سمجھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ پربھاکر صاحب نے

بڑے وثوق سے کہا کہ اگر تم ہندی بولتے رہے تو خود بخود سمجھ جاؤ گے۔ کمال سیکھنے کی کوشش میں لگ گیا۔

کلاس سے وہ سید ھا میدان کو گیا۔ اب ان کی دوڑ کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ اتنی سخت تربیت نے سب کی قوت برداشت میں اضافہ کر دیا تھا۔ ایک بار تو وہ رائفل کندھے پر لٹکائے بیالیس کلومیٹر بھاگے چلے گئے تھے۔ اس سے کمال کو اپنے اوپر اتنا اعتماد تو ہوا کہ وہ اگر زیادہ نہیں تو بیالیس کلومیٹر بھاگ سکتا ہے۔ یہاں رہ کر اس نے وہ کام بھی سیکھے جو قبل ازیں نہیں جانتا تھا، مثلاً گاڑی چلانا، اسلحہ کا استعمال، کوہ نوردی وغیرہ۔ تیراکی تو وہ پہلے سے جانتا تھا مگر پینترے بدلنا یہاں سے سیکھا۔ ایک بار انہیں پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے لے جایا گیا، شب گزاری کیمپوں میں ہوئی، کھانا بھی خود ہی پکایا۔ اس وقت میدان کے مقررہ پندرہ چکر لگانے کے بعد وہ کھڑا نہیں ہوا بلکہ آہستہ آہستہ بھاگتا رہا۔ لمبی دوڑ کے بعد یک دم کھڑے ہونا بالکل مناسب نہیں ہوتا۔

اس کے بعد کھیلوں کی باری تھی۔ دورافتادہ اور پس ماندہ گاؤں میں کھیلوں کا میدان نہیں تھا، نہ ہی اس کے اسکول میں ایسا انتظام تھا، لہٰذا وہ اس معاملہ میں کورا نکلا، ہاں البتہ دوڑوں اور نیزہ بازی وغیرہ میں وہ اچھا رہا کیونکہ ان کے لیے خاص میدان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے علاقے میں فٹ بال بڑے شوق سے کھیلا جاتا تھا، اس لیے کمال کو بنیادی قوانین سے آگاہی تھی۔ اکیڈمی میں اس نے کرکٹ، ہاکی، بیڈمنٹن اور باسکٹ بال وغیرہ سیکھا۔ اگرچہ وہ ٹینس بھی کھیلنا چاہتا تھا مگر وقت کی کمی کے باعث زیادہ توجہ نہ دے پایا۔ بگل چی نے بگل بجا کر دن کی تربیت کے خاتمہ کا اعلان کیا۔

....

اکیڈمی میں جمعرات کو جسمانی ورزشیں نہ ہونے کی وجہ سے بدھ کی شام کو انگریزی فلم جبکہ اتوار کو تعطیل کے سبب ہندی فلم دکھائی جاتی تھی۔ یہاں کمال نے متعدد فلمیں دیکھیں۔ بچپن میں گاؤں یا قرب و جوار میں سینما نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی فلم نہیں دیکھ سکا تھا۔ کالج میں بھی بسوں کے تھکا دینے والے سفر کے سبب فلم دیکھنا محال تھا۔ بعدازاں مقابلہ کے امتحان کی تیاری نے اسے زیادہ فلمیں دیکھنے کی مہلت نہ دی۔ اب اکیڈمی میں اسے متعدد فلمیں دیکھنے کا موقع مل گیا۔

یہاں دیگر علاقوں کے لوگوں کے ساتھ رہنے سے اس پر کئی انکشافات ہوئے۔ اس نے دیکھا کہ شمالی ہندوستان کے لوگوں میں بنگالیوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے بارے میں بہت زیادہ عصبیت اور بغض پایا جاتا تھا جس کا اظہار ان کی گفتگو میں ہوتا رہتا۔ ایک دفعہ کمال نے تجویز دی کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں مثلاً بنگالی، پنجابی، تامل اور تیلگو وغیرہ کی فلمیں بھی دکھائی جانی چاہئیں مگر فلم کلب کے دوسرے اراکین نے اتفاق نہ کیا، بلکہ اتر پردیش کے راکیش ادھوپائے نے تو یہاں تک کہا: ''کمال بھائی! علاقائیت کی باتیں نہ کریں''۔ کمال کو یہ بات قابلِ اعتراض محسوس ہوئی جس پر وہ فوراً بولا: ''میں نے علاقائیت کی تو کوئی بات نہیں کی۔ میری تجویز کا مقصد صرف مختلف علاقوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا تھا۔ ہندوستان محض ہندی بول چال کے علاقوں کا نام نہیں۔ ہندی نہ بولنے والوں کی تعداد ہندی میں گفتگو کرنے والوں کی نسبت زیادہ ہے۔ کس منطق کے تحت سمجھا جاتا ہے کہ دوسری زبانوں میں فلمیں دکھانا علاقائیت ہے؟ اگر یہ علاقائیت ہے تو کیا ہندی زبان کی فلمیں دکھانا علاقائیت نہیں؟''

راکیش نے جواب دیا: ''ہندی تو می زبان ہے''۔

''بالکل غلط۔ آئین دیکھو۔ ہندی اور انگریزی یونین کی سرکاری زبانیں ہیں۔ آئین دیگر زبانوں مثلاً بنگالی، پنجابی، تامل اور تیلگو وغیرہ کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ سی۔ ایس۔ ایس کے امتحانات میں ہندی کے ساتھ ساتھ ان زبانوں میں بھی جوابات لکھنے کی اجازت ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یونین پبلک سروس کمیشن علاقائیت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے؟''

راکیش کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ باقی ساتھیوں کی مداخلت سے یہ بحث ختم ہوگئی۔ اس وقت چھ بجے

تھے۔فلم ساڑھے چھے بجے شروع ہوناتھی۔کمال آہستہ آہستہ آڈیٹوریم کی طرف چل پڑا۔گیٹ کے پاس کچھ ساتھی کھڑے تھے۔راکیش نے پوچھا،''کمال بھائی،کہاں جارہے ہو؟''

''آڈیٹوریم کی طرف''،کمال نے جواب دیا۔

''ہم اکٹھے چلیں گے،فلم ساڑھے چھے بجے شروع ہوگی۔یہاں سے بمشکل دومنٹ کا راستہ ہے۔آؤ!تب تک کچھ گپ شپ ہی ہوجائے''۔

کمال سنی ان سنی کرکے جانے لگا مگر یشونت سنگھ نے اسے روکا،''کمال بھائی!آؤ،کچھ باتیں کرتے ہیں''۔یہ کہتے ہوئے وہ اسے تقریباً کھینچتے ہوئے ساتھیوں کے پاس لے گیا۔کمال نیم دلی سے وہاں جاکھڑا ہوا۔ہوتے ہوتے باتوں کا رخ علاقائیت کی طرف مڑ گیا۔دہلی کے پبن شرما نے کہا،''لوگوں میں جو کچھ مرضی کہتے رہیں حقیقت یہ ہے کہ مسلمان پاکستان کے حمایتی ہیں''۔

کمال نے اعتراض کیا،''کس تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے؟''

''کمال بھائی!برا مت مانو،میرا اشارہ تمہاری طرف نہیں''۔

''جب تم یہ کہتے ہو کہ تمام مسلمان پاکستان کے حمایتی ہیں تو مجھے''تمام مسلمانوں''سے خارج کیوں کرتے ہو؟اگر تمہارا اشارہ میری جانب ہے تو شاید ثابت کرنا مشکل ہو لیکن تم جب یہ کہتے ہو کہ تمام مسلمان پاکستان کے ہمدرد ہیں تو تمہارے دعویٰ کو جھٹلانا بہت سہل ہوجاتا ہے''۔

''ثابت کرو''۔

''کیا مولانا ابوالکلام مسلمان تھے یا نہیں؟''

''مسلمان تھے''۔

''کیا وہ پاکستان کے حامی تھے؟''

''نہیں''۔

''پھر تمام مسلمان پاکستان کے حامی کیسے ہوگئے؟''

''میں نے یہ نہیں کہا کہ تمام مسلمان پاکستان کے حمایتی ہیں''۔

''پھر تمہارا مطلب کیا ہے؟تم کن مسلمانوں کی بات کررہے ہو؟میں بتا سکتا ہوں کہ کچھ ہندو بھی پاکستان کے حامی تھے''۔

''ثابت کرو''۔

''کیا تم نے کبھی لالہ لاجپت رائے کا نام سنا ہے؟''

پبن نے ہاں میں اپنا سر ہلایا۔کمال کہنے لگا،'' 1924 میں انہوں نے صوبہ سرحد،پنجاب،سندھ اور مشرقی بنگال کی چار ریاستوں کا مجوزہ منصوبہ دیا تھا۔کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ ہندو پاکستان کے حامی تھے؟''

''بالکل نہیں،لالہ لاجپت جیسا شخص ایسی بات کہہ ہی نہیں سکتا''۔

اس ملک کی کثیر آبادی کے ساتھ یہ مسئلہ ہے۔نصابی کتابیں پڑھ کر وہ اس حد تک متعصب ہوچکے ہیں کہ ٹھوس تاریخی حقائق کو بھی تسلیم کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔دہلی کا ایک تعلیم یافتہ اور پبلک سروس کمیشن کا منتخب شدہ شخص بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔کمال کبیدہ خاطر ہوا مگر کہنے لگا،''یہ حقیقت ہے۔تم تاریخ کی کسی معیاری کتاب کو دیکھ لینا''۔

پِن نے اپنی بات دہراتے ہوئے جواب دیا، ''نہیں، بالکل نہیں، ایسا ہو ہی نہیں سکتا''۔

کمال فیصلہ نہ کرسکا کہ وہ کیا کہے، کیا کرے؟ کیا اپنی بات ثابت کرنے کے لیے وہ لائبریری جاکر کوئی کتاب لے آئے، یا بالکل درگزر کردے؟ اس موقع پر سرویش نے معاملہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔ وہ دہلی کا رہائشی اور دہلی یونیورسٹی سے تاریخ میں پوسٹ گریجویٹ تھا۔ اس نے پِن کو مخاطب کیا، ''تم ایسے مضمون پر کیوں بات کررہے ہو جو تم نے پڑھا ہی نہیں۔ لاجپت رائے پاکستان کا حامی نہیں تھا مگر وہ مسلمانوں کی ریاستوں کی حمایت ضرور کرتا تھا''۔ وہ کمال سے بغلگیر ہوکر بولا، ''تم پِن سے تاریخ پر بات کرکے اپنا وقت کیوں ضائع کررہے ہو؟ اس کا مضمون انجینئرنگ تھا اور تمھیں تو علم ہی ہے کہ انجینئرنگ میں بہت نمبر ملتے ہیں۔ اس نے اچھے نمبر لیے، پولیس سروس میں آگیا، تاریخ کے بارے میں اسے کیا علم؟ چلو آؤ، فلم دیکھتے ہیں''۔

آڈیٹوریم کی طرف جاتے ہوئے کمال سوچ رہا تھا کیا ایک تعلیم یافتہ شخص بھی اتنا غیر ذمہ دار ہوسکتا ہے؟ نہ صرف غیر ذمہ دار بلکہ کروڑ ہا لوگوں کی فلاح و بہبود سے لاتعلق۔ چند دن پہلے کچھ دوست دیش کے مختلف علاقوں کی تہذیب اور کام کے ماحول پر گفتگو کررہے تھے۔ دہلی سے تعلق رکھنے والے راہول کے الفاظ سے کمال کو بڑا دکھ ہوا جب اس نے کہا، ''میں تو صرف ان تھوڑے سے لوگوں کے ساتھ واسطہ رکھوں گا جو عملاً یہاں کے کرتا دھرتا ہیں، باقی جائیں جہنم میں''۔

راہول ایک پولیس آفیسر کا اکلوتا بیٹا اور دہلی یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ تھا۔ کمال متمول گھرانوں سے تعلق رکھنے والے اور بھی چند ایسے لوگوں کو جانتا تھا جن کی سوچ راہول سے مختلف نہ تھی۔ یہ بات کمال کے دماغ میں گردش کررہی تھی لہٰذا سینما ہال جاتے ہوئے بے خیالی میں اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا، ''یہ ناقابلِ قبول ہے''۔ سرویش نے پوچھا، ''کمال! کیا ناقابلِ قبول ہے؟''

''یہ اندازِ فکر''۔

''اپنے ذہن سے ایسی باتیں نکال کر فلم دیکھو''۔ سرویش نے کمال کو ازراہِ ہمدردی کہا۔

دونوں اپنی اپنی نشست پر جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر بعد مسٹر بوتھرا اپنی بیوی اور بیٹی کے ہمراہ آڈیٹوریم میں داخل ہوئے۔ اوّل الذکر کو دیکھ کو کمال کے ذہن میں جانبداری کا ایک واقعہ تازہ ہوگیا۔ ہوا یہ کہ یومِ ثقافت پر ایک مباحثے کا اہتمام کیا گیا۔ عنوان تھا، ''عوام کی فلاح کا بڑا دارومدار پولیس پر ہے''۔ کمال نے اس کے مخالف تقریر کی۔ اس کے دوستوں میں سے کسی کو تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کا اتنا تجربہ نہیں تھا، لہٰذا اس کی کارکردگی نہایت عمدہ رہی جس پر اسے بہت داد ملی، لیکن جب نتیجہ کا اعلان ہوا تو وہ ششدر رہ گیا کہ اس کا نام کہیں بھی نہیں تھا۔ وہ وجہ جاننے کے لیے بے چین تھا اس لیے اپنے گروپ انچارج اور ڈپٹی ڈائریکٹر مسٹر واجپائی سے ملاقات کی۔ وہ بھی پریشان تھے، کہنے لگے، ''تم بھی مجھ سے یہی سوال پوچھ رہے ہو!''

''کیا مطلب سر؟ کیا کسی اور نے بھی پوچھا ہے؟''

''میری بیگم بھی مجھ کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھیں کہ ہمارا فیصلہ منصفانہ نہیں تھا''۔

''سر! میں بھی یہی جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ہوا کیا؟''

''لیکن میں تمھیں کیسے بتاؤں؟''

''سر! کیوں نہیں؟''

''تم کسی اور کو بھی بتادوگے، میری شکایت بھی کردوگے''۔

''سر! اگر آپ اس کو راز رکھنا چاہتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا''۔

''تینوں ججوں میں سے ایک عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر، دوسرے آندھرا پردیش میں تعینات سیکرٹری درجہ کے ایک

IAS افسر اور تیسرے ایک مشہور صحافی تھے جو اتفاق سے تشریف نہ لا سکے۔ ڈائریکٹر صاحب نے ان کی جگہ ڈپٹی ڈائریکٹر مسٹر بوتھرا کو نامزد کر دیا۔ ساری گڑبڑ ان کی وجہ سے ہوئی ہے''۔

''سر! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کس رکن نے مجھے کتنے نمبر دیئے تھے؟''

''ہاں بالکل۔ پروفیسر صاحب نے تمہیں سب سے زیادہ یعنی پچاس میں سے بیالیس نمبر دیئے، آندھرا پردیش کے افسر نے 40، لیکن بوتھرا صاحب نے سب سے کم یعنی صرف سولہ نمبر دیئے۔ سب سے زیادہ نمبر یعنی پینتالیس انہوں نے ایک اور مقرر کو دیئے۔ اس طرح تمہارے کُل نمبر بہت کم ہو گئے۔ خود میں بھی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ بوتھرا صاحب نے تمہیں اتنے کم نمبر کیوں دیئے؟''

مگر کمال اس کی وجہ سمجھ گیا۔ بوتھرا صاحب تقریری مہارت اور ہنرمندی سے نا آشنا نہیں تھے مگر اسے اتنے کم نمبر دینے کا مقصد کمال کو مقابلہ سے باہر کر دینا تھا۔ یہ سننے کے بعد وہ غصے کے عالم میں واجپائی صاحب کے دفتر سے باہر نکل آیا۔

اسی نوعیت کے چند اور واقعات بھی اس کے ذہن میں آتے گئے۔ اکیڈمی درحقیقت شادی بیاہ کا دفتر ہے جہاں افسرانِ بالا ذات پات، مسلک اور مالی حیثیت کو مدِ نظر رکھ کر اپنی بیٹیوں کے ممکنہ بر تلاش کرتے ہیں۔ کچھ زیرک پروبیشنر اچھی پوزیشن لینے کے لیے ان لوگوں کو سیڑھی کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور بعد ازاں چکر دے جاتے ہیں، مگر کچھ سادہ دل جال میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کمال کا ذہن انہی باتوں میں الجھا ہوا تھا کہ اسی اثنا ڈائریکٹر صاحب تشریف لائے اور ان کی اجازت سے فلم شروع ہوئی۔

....

نیشنل پولیس اکیڈمی، حیدرآباد، میں تربیت مکمل ہونے کے بعد پروبیشنرز کو چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ انہیں اپنے پیدائشی علاقے سے دور رکھا جائے۔ کمال کا تعلق مغربی بنگال سے تھا اس لیے اسے مغربی بنگال کیڈر میں رکھ کر کشمیر بارڈر پر بھیج دیا گیا۔ اس گروپ نے جموں تک بذریعہ ریلوے اور وہاں سے منزلِ مقصود تک جانے کے لیے منی بس استعمال کی۔ سڑک کی ایک جانب دسمبر کی برفباری سے ڈھکے پہاڑ اور دوسری طرف گہری کھائیاں تھیں۔ کمال نیچے دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔ اگر بس پھسل جاتی تو ان کا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ سڑک پہاڑوں میں بل کھاتی جا رہی تھی۔ سری نگر میں فوجی حکام کی طرف سے انہیں موسمِ سرما کی یونیفارم دی گئی جس میں برف پر چلنے کے لیے جوتے بھی موجود تھے۔ وہاں سے انہیں فوجی گاڑیوں میں آگے لے جایا گیا۔ برف آلود راستے پر گاڑیاں مدھم رفتار سے چل رہی تھیں۔ دونوں طرف برف پوش درخت تھے۔ برف باری متواتر جاری تھی، کئی جگہ تو راستہ بند ملا۔ برف ہٹانے والی گاڑیاں راستہ بنا رہی تھیں۔ بالآخر وہ بارہ مولا کے نزدیک 8 گورکھا رجمنٹ ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ انہیں دریائے جہلم کے کنارے ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا جس کے ارد گرد قدرت اپنے تمام نظاروں اور حسن کے ساتھ اپنی رعنائیاں دکھا رہی تھی۔ انہوں نے گرم پانی سے غسل کر کے کھانا کھایا اور پھر باہر پورٹیکو میں آ گئے۔ دریا گویا مدھم سروں میں گنگناتا بہہ رہا تھا۔ اس کی دوسری جانب پیدل چلنے کی تنگ راہ تھی۔ انہیں بتایا گیا کہ ہندوستان میں بابر کی آمد اسی راستے سے ہوئی تھی۔

اگلے روز انہیں دو گاڑیوں میں 'ریبنو' نام کے ایک مقام پر لے جایا گیا جو پاکستان کے زیرِ قبضہ حاجی پیر کے عین مقابل تھا۔ ریبنو میں 5 سکھ رجمنٹ تعینات تھی۔ یہاں انہیں ایک فوجی میس میں ٹھہرایا گیا جہاں کمال کی ملاقات دو ایسے افسروں سے ہوئی جو عادات واطوار اور طبیعت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے قطعاً متضاد تھے۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والا کیپٹن سخاوت ہر قسم کے نشے حتیٰ کہ چائے سے بھی مجتنب اور نرم گفتار تھا۔ اس سے کمال کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ دوسرا افسر میجر کمیشور سنگھ، جس

کا تعلق پنجاب ہی سے تھا، سکھ بندے خوار، فحش گو اور بدزبان تھا۔ اگلے روز سب کو فائرنگ کے بنیادی قوانین سکھائے گئے۔ بعد ازاں فوجی افسروں نے انہیں اپنے بارے میں بتایا کہ وہ کن سخت حالات میں فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ میجر سنگھ نے انتہائی عمدگی سے بتایا کہ جن فوجی افسروں کو اگلے مورچوں پر بھیجا جاتا ہے، انہیں بیوی بچے اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں، یہ ممانعت اعلیٰ افسروں پر بھی ہے، لہٰذا تمام افسر، شادی شدہ یا غیر شادی شدہ، اکیلے ہی رہتے ہیں۔ میجر سنگھ اس پر بڑا جز بز تھا جس کا غصہ اس نے لیکچر کے دوران نکالا، ''تم غیر فوجی، اپنی بیویوں سے روز ہی ملتے ہو مگر سہولیات وہ مانگتے ہو جو ہمیں ان کٹھن اور دشوار حالات میں خدمات بجالانے پر ملتی ہیں''۔ کمال سمجھ رہا تھا کہ اس کے لہجے کی تلخی کس حقیقت کی غماز ہے، اور یہ بھی کہ بلا نوشی انسان کی قوتِ مدافعت کم کر دیتی ہے، لیکن میجر کا لب ولہجہ پروبیشنرز کو پسند نہ آیا جس کی شکایت افسرانِ بالا تک جا پہنچی۔ بعد ازاں یہ بات سرگوشیوں میں پھیلتی گئی کہ اس پر میجر صاحب کی زبردست سرزنش ہوئی تھی۔

اگلے روز انہیں کیموفلاج یونیفارم میں سرحدی چیک پوسٹ پر بھیجا گیا۔ پہاڑی راستوں سے گزرنے کے لیے ایک مقامی کشمیری لڑکے کی خدمات لی گئیں۔ وہ لڑکا تو آسانی سے پہاڑ کے اوپر چڑھ گیا مگر کمال اور اس کے ہمراہیوں کے لیے بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ اگرچہ وہ اکیڈمی میں بھی ایسی مشقیں کرتے تھے لیکن برف پوش پہاڑ پر چڑھنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ کمال تو بلند و بالا پہاڑ کو دیکھ کر پریشان ہو گیا اور ایک جگہ پاؤں پھسلا تو فوراً جھاڑیوں کو پکڑ کر اپنے آپ کو نیچے گرنے سے بچایا۔

چوٹی پر پہنچتے پہنچتے انہیں شام ہو گئی۔ وہاں انہیں برف سے ڈھکے ایک کمرے میں لے جایا گیا جو اندر سے آرام دہ تھا۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد انہیں چیک پوسٹ دکھائی گئی جس میں زیادہ سے زیادہ تین افراد کے کھڑے ہونے کی گنجائش تھی۔ انہیں بتایا گیا کہ یہاں سے سرحد پر ہمہ وقت نظر رکھی جاتی ہے اور کسی بھی مشتبہ حرکت سے حکام بالا کو مطلع کیا جاتا ہے، اور اگر حالات کا تقاضا ہو تو فائرنگ بھی کر سکتے ہیں۔ کمال نے دوربین سے سرحد پار دیکھا۔ وہاں کی ساری نقل و حرکت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ شب باشی کے بعد اگلی صبح وہ واپس اپنے ہیڈکوارٹر کی طرف چل پڑے۔ شام کو انہیں وہیں پر ایک مذہبی پروگرام کے سلسلہ میں گوردوارے لے جایا گیا۔ کمال کے ساتھیوں نے چادر چڑھانے کے لیے چندہ جمع کیا جس پر وہ خوش نہیں تھا۔

....

اسکول کے زمانے ہی سے کمال نے مذہبی تقریبات میں شامل ہونا ترک کر دیا تھا۔ اس فہم کے بعد کہ تمام مذاہب کسی ہمہ گیر قوت، یعنی خدا کی نہیں بلکہ انسانوں کی تخلیق ہیں، اور یہ کہ فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی کا اہم سبب متخالف مذہبی رسوم ہیں، اس نے مذہبی تقریبات میں جانا اور چندہ وغیرہ دینا چھوڑ دیا ہوا تھا۔ کسی مذہب کے متعلق اس کے دل میں کبھی بھی گستاخانہ خیالات نہیں آئے تھے مبادا کسی کی دل آزاری ہو، تاہم اس کے نزدیک تمام مذہبی رسوم محض تضیعِ اوقات تھیں۔ ان خیالات کے سبب متعدد بار ناخوشگوار صورتِ حال بھی پیدا ہوئی۔ دورانِ تربیت ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے وہ اجمیر بھی گئے۔ ان کا رہنما ستھ کمار سابقہ نظام حکومت میں سرکاری ملازم تھا۔ حیدر آباد کے انضمام کے بعد اسے انڈین پولیس سروس میں لے لیا گیا اور اب وہ اکیڈمی میں تعینات تھا۔ وہ ایک کشادہ ذہن کا مالک اور نظام حکومت کا مدح خواں تھا۔ پروگرام کے مطابق صبح کو سب نے پشکار جھیل کے کنارے قائم مندر میں جانا تھا۔

سوائے کمال کے باقی سب پروبیشنرز مندر کے اندر گئے۔ ستھ کمار نے کچھ کہا تو نہیں مگر خاموش ردِ عمل سے محسوس ہوا کہ اسے کمال کی حرکت اچھی نہیں لگی۔ اگر وہ اس سے اندر نہ جانے کا سبب پوچھ لیتا تو کمال اسے وضاحت سے بتا دیتا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اسے ایک مسلمان کے کٹر پن پر محمول کرتے ہوئے آپس میں گفتگو کی۔ کمال نے سنی ان سنی کر دی۔ ادھر

سے بھی کسی نے کھل کر بات نہ کی، جس وجہ سے وہ انہیں اپنے خیالات سے آگاہ نہ کر سکا۔ ان سب نے اسے کمال کی تنگ نظری اور فرقہ پسندی سمجھا۔

دوپہر کو انہیں حضرت معین الدین چشتی کے مزار پر جانا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ مزار پر چادر چڑھانے کے علاوہ نقدی کی صورت میں کچھ نذرانہ بھی دیا جائے، لہٰذا انہوں نے چندہ جمع کیا مگر کمال نے انکار کر دیا۔ اس موقع پر سنتھ کمار نے انکار کی وجہ پوچھی۔ کمال کا جواب تھا، "سر! میں ان چیزوں کو فضول سمجھتا ہوں بلکہ میرے خیال میں تو ان کو ختم ہی کر دینا چاہیے۔ میں دوسروں کو تو منع نہیں کر سکتا مگر خود ان کا ساتھ دینے سے معذور ہوں"۔

"کیا تمہارے خیال میں خواجہ معین الدین چشتی قابلِ تعظیم شخصیت اور مافوق الفطرت قوتوں کے مالک نہیں تھے؟"

"سر! بلاشبہ وہ ایک قابلِ احترام شخصیت تھے لیکن میرے خیال میں ان کے پاس کوئی فوق طبعی قوت نہیں تھی"۔

"تم ایسا کیوں سمجھتے ہو؟"

"سر! مجھے تو ایسی قوتوں پر یقین ہی نہیں"۔

"کیا خدا پر تمہارا ایمان نہیں ہے؟"

"سر! معذرت کے ساتھ، خدا کا تصور انسان کا تخلیق کردہ ہے"۔

"کیا تم ملحد ہو؟"

"جن باتوں کو میں سمجھنے سے قاصر ہوں ان پر اپنا وقت کیوں ضائع کروں۔ اگر کوئی ایسی الوہی قوت ہے، تو ہو، مجھے اپنے کام سے مطلب رکھنا چاہیے۔ اور اگر اللہ موجود ہے تو فیصلہ کرنا اس کا کام ہے کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اگر خدا نہیں ہے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں خواہ مخواہ ایسی بحث میں پڑ کر اپنے وقت کا ضیاع کیوں کروں"۔

"اگر تم تعظیماً ہی چلے جاتے تو کیا نقصان تھا؟"

"ان کا مدتوں پہلے انتقال ہو چکا ہے، گوشت اور ہڈیاں تک مٹی بن گئی ہوں گی۔ یہ خیال ہی غلط ہے کہ ان کے مرقد پر قدم بوسی ہمارے لیے منفعت رساں ہے۔ یہ ہماری اعانت کے لیے نہیں آئیں گے، نہ ہی وہ آ سکتے ہیں، لیکن کچھ لوگ ایسی خام خیالیوں سے اپنا کاروبار چلا رہے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ وہ کوئی سود مند کام کریں"۔

"اگر تم اظہارِ عقیدت نہیں کرتے تو کیا یہ لوگ اپنا کام چھوڑ دیں گے؟"

"ایسے کاموں میں کم از کم میں تو ان کی مدد نہیں کروں گا"۔

"سوری! تم ایک منفرد شخص ہو۔ صبح تمہارے بارے میں مجھے غلط فہمی ہوئی تھی"۔

"آپ نے کیا سوچا تھا، سر!؟"

"میں سمجھا تھا کہ تم متعصب شخص ہو، حالانکہ ایسے نہیں ہو"۔

"بہت شکریہ سر! میں بالکل ایسا نہیں ہوں"۔

دونوں مقامات پر اس کی عدم موجودگی بڑی عیاں تھی، لہٰذا اس کے بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ مگر یہ صورت حال کمال کے لیے نئی نہیں تھی۔ اکیڈمی کے دوران جب اسے پہلی بار کھانے پینے کا بل ملا تو اس نے دیکھا کہ صحن کے اندر بنے ہوئے شیو دیوتا کے مندر کے نام سے چندہ بھی شامل ہے۔ اس نے میس کمیٹی کے صدر کی توجہ اس طرف دلائی کہ کسی بھی مذہبی کام اور ادارے کے نام پر چندہ لینا نامناسب ہے۔ نتیجتاً، آئندہ کے لیے اس کے بل میں یہ چندہ شامل نہیں کیا گیا مگر دوسروں کے لیے طریق کار جاری رہا۔

اگلے روز پتہ چلا کہ گذشتہ شب دیے گئے سوپ میں خنزیر کا گوشت شامل تھا۔ سب کو توقع تھی کہ کمال اس پر شدید احتجاج کرے گا کیونکہ مسلمانوں کے لیے خنزیر حرام قرار دیا جا چکا ہے۔ ایک ساتھی نے کمال سے اس معاملہ میں بات کی کہ جب انتظامیہ کو علم ہے کہ ایک مسلمان بھی کورس میں شامل ہے تو اسے احتیاط کرنا چاہیے تھی۔ کمال نے بڑے پُرسکون لہجے میں کہا، ''ہاں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ غالباً انہیں علم نہیں تھا کہ کوئی مسلمان بھی ہے، بس انہوں نے بے خیالی میں سوپ دے دیا''۔

''ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے؟ ان کے پاس تمام شرکا کی فہرست ہے''۔

''شاید انہوں نے فہرست کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا ہوگا''۔

یہ جاننے کے بعد کہ کمال پر اس کی باتوں کا اثر نہیں ہوا، اس نے صاف لفظوں میں پوچھ لیا، ''کیا تم اس کے خلاف احتجاج نہیں کرو گے؟''

''اگر ہمارا ٹیم لیڈر مناسب سمجھے گا تو احتجاج کرلے گا''۔

اس کے دوست کی سمجھ میں نہ آیا کہ کمال اس معاملہ میں کیوں نہیں بول رہا۔ کمال کے لیے تو بس اتنی بات قابلِ اعتراض تھی کہ شاید کوئی بھی مسلمان یا غیر مسلم خنزیز کھانا پسند نہ کرتا ہو، اس لیے پہلے بتا دینا مناسب ہوتا کہ اس میں کس جانور کا گوشت ڈالا گیا ہے۔ اس کے لیے تو یہ کوئی خاص بات نہیں تھی کیونکہ اگر خواہش ہو تو مذہبی ممانعت یا اجازت کو مدِ نظر رکھے بغیر بھی کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی وجہ سے اس نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا مگر ایک مسئلہ ضرور پیدا ہو گیا۔ وہ پکا سبزی خور تھا اور سوپ ہضم بھی ہو چکا تھا۔ اس کے بار بار قے اور غسل کرنے کی وجہ سے وہ بیمار ہو گیا۔ بہر حال یہ ہوا کہ رجمنٹ کے افسروں نے اس کوتاہی پر بہت معذرت کی۔

خیر! اس روز کمال کے ساتھیوں نے گردوارہ میں چادر چڑھانے کے لیے چندہ جمع کیا مگر کمال نے انکار کر دیا۔ باقی سب چادر چڑھانے چلے گئے مگر وہ نہ گیا۔

....

فوج کے ساتھ تربیت مکمل ہونے کے بعد انہیں مختلف علاقوں میں بھیجا گیا۔ کمال کو بنکا پور پولیس ٹریننگ کالج جانے کا حکم نامہ ملا۔ یہاں پہنچ کر اسے زمین آسمان کا فرق محسوس ہوا۔ اکیڈمی میں کلاس روم سے میس تک ہر جگہ اور چیز صاف ستھری تھی۔ ٹریننگ کا ایک ایک پل ٹائم ٹیبل کے مطابق اور سو فیصد دل جمعی کا حامل تھا۔ تربیت دینے والوں کا انتخاب اپنے اپنے شعبے میں بہترین کارکردگی کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ وہ بھی اپنے کام میں فخر محسوس کرتے تھے، مگر یہاں بنکا پور میں انہیں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کسی اچھی جگہ تعیناتی کے اہل نہ ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو یہاں بھیجا گیا تھا، بالکل جیسے کسی گیراج میں خستہ حال اور ناکارہ گاڑیوں کو پھینکا جاتا ہے۔ ایک طرف وہ اپنے آپ پر لعنت ملامت کرتے رہتے اور دوسری طرف پیٹھ پیچھے افسروں کو گالیاں دیتے۔

ایک عمر رسیدہ سپاہی کے ذمہ ان کی پریڈ اور جسمانی ٹریننگ تھی مگر وہ دو مہینے بعد ریٹائر ہونے والا تھا۔ ذمہ دار تو بہت تھا لیکن ڈھلتی عمر کے اثرات اس کے جسم سے ہویدا تھے۔ اسے یہ کام ملنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ حیدر آباد کے تربیت یافتہ پروبیشنرز اس ٹریننگ سے قطعاً متاثر نہیں ہوئے۔ کلاسوں کا حال ابتر تھا۔ اتالیق ایک تو دیر سے آتے اور اوپر سے گپ شپ میں وقت گزار دیتے۔ ان سب کا تقریباً ایک ہی جملہ ہوتا، ''میں کیا پڑھاؤں، آپ تو خود ہی سب کچھ جانتے ہیں۔ چند دنوں بعد آپ ہمارے افسر بن جائیں گے''۔ سب پروبیشنرز ایسی باتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ حیدر آباد میں پڑھائے گئے قوانین قومی سطح کے تھے جبکہ ریاستی قوانین اس کالج میں پڑھائے جانے تھے۔ کمال نے اس جانب توجہ دلائی تو جواب ملا، ''کام کے دوران

آپ خود بخود دیکھتے جائیں گے، ہمیں تعلیم دینے کی کیا ضرورت ہے"۔ شاید وہ بزبانِ خموشی یہ کہنا چاہتے تھے، "ہم نے تو خود نہیں پڑھا، آپ کو کیسے پڑھائیں۔ اب اس عمر میں ہمیں پڑھنا پڑا ہے"۔ باقی پروبیشنرز نے کمال کو ٹوکا، "بھائی! کیا کر رہے ہو؟ ہمیں مزہ لینے دو"۔ وہ چاروناچار حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور تھا۔ ایک حل اس کے ذہن میں آیا اور وہ ہارمونیم خرید کر بجانے کی مشق کرنے لگا۔

....

تربیت کا عرصہ دو ہفتے تھا مگر اس سے قبل ہی ان کی تعیناتی کا حکم نامہ موصول ہو گیا۔ کمال کو باکل پور میں سب ڈویژنل پولیس آفیسر مقرر کیا گیا۔ اگرچہ جگہ اچھی تھی مگر وہ فی الحال ہری پور سے جانے میں متامل تھا کیونکہ دل میں سنگیتا سے ملاقات کی خواہش تھی، لیکن اس سے کیسے ملاقات ہو، کیونکہ اس نے ملنے سے منع کر دیا تھا۔ اس سے پہلی ملاقات اچانک ہوئی تھی۔

پولیس ٹریننگ کالج میں تربیت ختم ہونے کے بعد انہیں مختلف علاقوں میں مزید تربیت کے لیے بھیجا گیا۔ کمال اسی سلسلہ میں ہری پور آیا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس پی کی شہرت ایماندار افسروں کی تھی۔ کمال کو خوشی ہوئی کہ ان کی زیرِ نگرانی اس کی تربیت کا یہ مرحلہ طے ہوگا۔ IAS اور ویسٹ بنگال سول سروس (WBCS) سے تعلق رکھنے والے دو پروبیشنر بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کی رہائش کے لیے ایک فلیٹ کا انتظام کیا گیا تھا۔

جس ہاؤسنگ سوسائٹی میں ان کا فلیٹ تھا، وہاں سالانہ ثقافتی تقریب ہوئی۔ افتتاحی گیت کے بعد طے شدہ پروگرام کی بجائے اعلان ہوا کہ مس سنگیتا بسواس ایک گیت سنائیں گی۔ پیلی ساڑھی میں ملبوس انیس بیس برس کی ایک دبلی پتلی لڑکی اسٹیج پر آئی اور ہارمونیم لے کر بیٹھ گئی۔ معلّن نے اعلان کیا کہ سرکار صاحب طبلے پر سنگت دیں گے۔ درمیانی عمر کے ایک شخص نے اٹھ کر کہا، "میں کافی عرصہ سے طبلہ نہیں بجا رہا۔ میں اپنے جیسے غیر پیشہ ور گائیک کے ساتھ تو سنگت کر سکتا ہوں مگر سنگیتا بہت اچھا گاتی ہے، آپ منڈل صاحب کو کہیں کیونکہ وہ تو روزانہ ہی طبلے کا شوق کرتے ہیں"۔ معلّن نے ساتھ بیٹھے شخص کو مخاطب کیا، "منڈل صاحب! کسی اور کا نام مت لیجیے۔ مہربانی سے آپ ہی سنگت دیں"۔ وہ شخص اٹھا اور طبلے کے پیچھے جا بیٹھا۔ اس نے طبلے کو درست کیا اور پھر سنگیتا نے رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک گیت چھیڑ دیا، "ایک میٹھا بول من کو چھو لیتا ہے، اور میں اسی بول سے اپنا سنسار تعمیر کرتا ہوں"۔

گیت کے بولوں میں جادو تھا، لڑکی بھی بہت عمدگی سے گا رہی تھی، کمال مبہوت ہو گیا۔ وہ موسیقی کا دلدادہ تھا۔ سیکھنے کی خواہش تھی مگر ماں کی مخالفت کے سبب اپنا شوق پورا نہ کر سکا تھا۔ اس کے پسِ پردہ بھی ایک داستان تھی۔

اس کا باپ خادم اپنے گاؤں کی ایک یاترا جماعت میں شوقیہ رقاص تھا۔ کھیل کی ابتدا اور وقفوں میں اسے زنانہ لباس پہن کر رقص کرنا ہوتا تھا۔ وہ اسی میں گم رہ کر کسی اور طرف دھیان نہ دیتا۔ مشترکہ خاندان اور مشفق سسر کی حیات میں مریم کو کسی مشکل کا احساس نہ ہوا لیکن اس کی وفات کے بعد حالات تبدیل ہو گئے۔ بھائیوں کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے اب مریم کو خادم کی کمائی پر انحصار کرنا پڑتا تھا مگر اس کی توجہ کمائی کی طرف کم اور رقص پر زیادہ تھی۔ مریم اس نتیجہ پر پہنچی کہ ان کی خستہ حالی کا سبب خادم کی سنگت منڈلی کے ساتھ وابستگی تھی، اور سنگیت و رقص سے اتنی کمائی نہیں ہو سکتی جس سے گھر کے اخراجات پورے ہو جائیں، اسی وجہ سے وہ کمال کے سنگیت سیکھنے کی مخالف تھی، مگر اس کا شوق ختم نہیں ہوا تھا۔ پولیس ٹریننگ کالج میں اس نے ہارمونیم خریدا اور اس پر مشق کرتا رہتا۔ کچھ عرصہ بعد وہ کسی حد تک موسیقی کے رموز سے واقف ہو گیا۔

اس وقت وہ سنگیتا کے گیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اب اس کی نظروں میں لڑکی زیادہ سے زیادہ پرکشش دکھائی دینے لگی۔ اس کے اسٹیج پر آتے وقت کمال کو اس میں جاذبیت محسوس نہیں ہوئی تھی مگر اب وہ اس کے دل میں بس گئی یہاں تک کہ

وہ اس سے جیون بتانے کی سوچنے لگا۔ اس کے دل کا جزیرہ دریاؤں کی لائی ہوئی ریت سے اٹا بھرا تھا۔ کون ہے جو اسے صاف کرے؟ کیا سنگیتا ایسا کر سکے گی؟

کمال برا شخص نہیں تھا۔ اسے زیادہ وجیہ نہیں تو بدصورت بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ آل انڈیا سروس سے تعلق تھا لیکن مذہب کا فرق بیچ میں آ گیا۔ اسی فرق کی وجہ سے وہ پہلے سپنا کو دل کی بات نہ بتا سکا تھا۔ اگر بتا دیتا تو اس کا جواب کیا ہوتا، کیا پتہ۔ اب جو ہو سو، سنگیتا کو حالِ دل سنا ہی دوں گا۔

وہ سوچتا رہا اور اسی دوران سنگیتا گیت ختم کر کے اسٹیج سے اتر آئی۔ جس کرسی پر وہ پہلے بیٹھی ہوئی تھی وہاں کوئی اور آ بیٹھا تھا۔ کمال کے ساتھ والی کرسی خالی دیکھ کر وہ ادھر آ بیٹھی۔ کمال نے ہمت کر کے بات کی، ''آپ بہت اچھا گاتی ہیں۔ مجھے بہت لطف آیا''۔ سنگیتا لجا گئی۔ کمال نے پوچھا، ''کیا آپ اسی سوسائٹی میں رہتی ہیں؟''

''نہیں''، بڑا مختصر جواب۔

''پھر کہاں رہائش ہے؟''

''شاید آپ نے اسٹیڈیم کے پاس زرد رنگ کی عمارت دیکھی ہو گی۔ آپ روزانہ وہاں دوڑ لگانے جاتے ہیں۔ ہم اس عمارت کی پہلی منزل میں رہتے ہیں''۔

''آپ کے پتا کیا کرتے ہیں؟''

''وہ جگ بندھو بسواس گورنمنٹ کالج میں تاریخ کے معلم ہیں''۔

''آپ نے موسیقی کہاں سے سیکھی؟''

''میں ہر اتوار کی صبح رابندر سادھن جا کر رابندر سنگیت کا درس لیتی ہوں اور بدھ کی شام بھٹاچریا پاڑا میں چیٹر جی کے ہاں جاتی ہوں''۔

''کیا آپ چیٹر جی سے میری ملاقات کرا دیں گی؟ میں موسیقی سیکھنا چاہتا ہوں''۔

''کیا موسیقی سے کچھ شد بد ہے؟ آپ یہاں کتنا عرصہ قیام کریں گے؟''

''تقریباً چھے مہینے''۔

''وہ نہیں مانیں گے۔ چھے مہینے میں کچھ بھی نہیں سیکھا جا سکتا''۔

''لیکن میری ملازمت میں تو تبادلے ہونا معمول کی بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں موسیقی سیکھ ہی نہیں سکتا''۔

''اچھا، پیر کو آ جائیں، میں ان سے بات کروں گی''۔

کمال سوچ میں پڑ گیا کہ اب اور کیا کہے۔ اسٹیج سے ایک اور گیت کا اعلان ہوا۔ اتنے میں سنگیتا نے کہا، ''میری بہن آ گئی ہے۔ میں جا رہی ہوں''۔ کمال کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ سنگیتا ایک لڑکی کے پاس گئی جو اس کی تقریباً ہم شکل مگر عمر میں چھوٹی تھی۔ دونوں نے ایک رکشہ لیا اور چلی گئیں۔ کمال کو مزید وہاں بیٹھنا بے سود لگا اس لیے اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اب وہ سنگیتا کے سپنے دیکھنے لگا۔

اگلے روز وہ رابندر سادھن جا پہنچا۔ آ تو گیا مگر قدرے تذبذب اور مشوش تھا۔ لڑکی سے ابھی کل شام ہی کو ملاقات ہوئی تھی، کس سے اس کے بارے میں پوچھے؟ پھر اس کا ڈرائیور اور گارڈ بھی وہاں موجود تھے، اس بات سے بھی وہ پریشان ہو رہا تھا اگر سنگیتا نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا تو یہ بھی بے عزتی کی بات ہے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ چیٹر جی کا پوچھے، مگر اس صورت میں سنگیتا سے نہیں مل سکے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ سنگیتا ہی کا معلوم کیا جائے، اس نے خود ہی تو آنے کو کہا تھا۔ وہ گیٹ

کی طرف بڑھا۔ وہیں ایک لڑکا کھڑا تھا۔ کمال نے اسے سنگیتا کو بلانے کے لیے کہا۔

''آپ کا نام؟'' لڑکے نے پوچھا۔

کمال سٹپٹا گیا کیونکہ ڈرائیور اور گارڈ بالکل نزدیک کھڑے تھے۔ ہمت کر کے اس نے کہا، ''کہنا، کمال منڈل''۔ مگر ساتھ ہی دل میں وسوسہ پیدا ہوا، اگر وہ نہ پہچان سکی تو؟ کیا میں نے کل شام اسے اپنا نام بتایا تھا؟ ''انہیں کہنا کہ اے، ایس، پی، کمال منڈل''۔ لڑکا پیغام دینے اندر چلا گیا مگر کمال سوچنے لگا اگر وہ پہچان نہ سکی تو! باہر نہ آئی تو! اپنے گارڈ اور ڈرائیور کی موجودگی میں کتنی خجالت کی بات ہے۔ تھوڑی دیر بعد لڑکا اکیلا ہی باہر آیا۔ اب تو کمال مزید پریشان ہوا، بلکہ ہلکا سا پسینہ بھی آ گیا لیکن پیغام حوصلہ افزا ملا، ''وہ آ رہی ہیں''، لڑکے نے بتایا۔ اور پھر اس نے سنگیتا کو سفید ساڑھی میں ملبوس آتے دیکھا۔ کمال کے روبرو کھڑے ہو کر اس نے کہا، ''وہ ابھی تک نہیں آئے۔ کسی کو بھی ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں۔ شاید آج آئیں بھی نا حالانکہ وہ بالعموم وقت پر ہی آ جاتے ہیں''۔

''کیا میں بدھ کو ان کی رہائش گاہ پر چلا جاؤں؟''

''ٹھیک ہے''۔

کمال نے سنگیتا سے پتہ پوچھا جو اس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھ کر دے دیا۔ اس نے جانے کی اجازت چاہی جس پر سنگیتا نے محض سر ہلا کر ہاں کا اشارہ کیا اور کمال وہاں سے آ گیا۔ سنگیتا کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی۔

پیر اور منگل زیادہ ہی طویل محسوس ہو رہے تھے۔ بدھ کی صبح وہ تیار ہو کر چیٹر جی کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ علاقے سے نا آشنائی کی وجہ سے اسے گھر کی تلاش میں قدرے دقت ہوئی، آخر وہ پہنچ ہی گیا۔ گیٹ پر سنگیتا اس کی منتظر تھی۔ کمال نے پوچھا، ''آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟''

''آپ کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ میں اسی لیے باہر آ کر کھڑی ہو گئی تھی کہ آپ کو کسی سے پوچھنا نہ پڑے''۔

سنگیتا اسے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی جہاں چیٹر جی نے خوش دلی سے اس کا سواگت کرتے ہوئے واضح کر دیا، ''میرے پاس آپ کے گھر آنے کا وقت نہیں ہوگا''۔

''کوئی مسئلہ نہیں، میں آ جایا کروں گا''۔

''آپ کے لیے کون سا دن مناسب رہے گا؟''

''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو بدھ کو، اسی وقت''۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں، شاید سنگیتا بھی معترض نہ ہو۔ بیٹی سنگیتا! ٹھیک ہے؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں''، سنگیتا نے جواب دیا۔

کمال نے رخصتی کی اجازت چاہی جس پر چیٹر جی نے سر ہلا دیا۔ وہ بیٹھک سے باہر نکلا تو سنگیتا بھی پیچھے پیچھے چلی آئی۔ کمال نے پیشکش کی، ''آیئے! میں آپ کو چھوڑ دوں''۔

''ہاں! آپ کی گاڑی میں جانے سے میں جلدی پہنچ تو جاؤں گی مگر اس چھوٹے سے علاقے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلنا شروع ہو جائیں گی۔ خوامخواہ مسائل پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں یہاں سے رکشہ لے لوں گی جیسا کہ پہلے آتی جاتی رہی ہوں''۔

کمال کو اس کی دور اندیشی پر خوشی ہوئی، ''ٹھیک ہے۔ میں آپ کے لیے رکشہ روکتا ہوں''۔ پھر دونوں اپنے اپنے گھروں

کو روانہ ہو گئے۔ اب ہر بدھ کو ان کی ملاقات بھی ہونے لگی۔ ایک روز جبکہ وہ چیٹر جی کے ڈرائنگ روم سے باہر آرہے تھے، کمال نے کہا، ''مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے''۔ سنگیتا نے ترت جواب دیا، ''مجھے علم ہے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں''۔

''آپ کو کیسے علم ہوا؟ میں نے تو کوئی بات کی ہی نہیں''۔

''جو کہنا چاہتے ہیں وہ آپ کے چہرے پر لکھا ہوا ہے''۔

''جو بات کہنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں، آپ نے میرے چہرے پر پڑھ لی ہے، اس کا جواب چاہیے''۔

''کیا آپ ابھی تک نہیں سمجھے؟''

''نہیں، بالکل نہیں''۔

''پھر آپ کے سر میں بھیجا نہیں کچھ اور بھرا ہوا ہے''۔

''ہوسکتا ہے، مگر جواب؟''

''میں ذہنی طور پر تو آپ کی ہو چکی ہوں مگر عملی لحاظ سے اپنے والدین کی منشا کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہماری خاندانی زندگی بڑی خوشگوار ہے میں اسے خراب نہیں کرنا چاہتی''۔

کمال کو یوں لگا جیسے چاندنی پتوں سے چھن چھن کر اسے شرابور کر رہی ہو۔ وہ اس سے سنگیتا سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا اس لیے اسے ایک ہی رکشہ میں جانے کی تجویز دی۔ اس کا جواب مختصر تھا، ''ابھی وقت نہیں آیا''۔

''کیا میں آپ کے پتا سے بات کروں؟''

''ضروری ہوا تو پہلے میں خود بات کروں گی۔ پہلے آپ کا تعارف تو کرا دوں''۔

''آپ تو کہہ رہی تھیں کہ وہ مجھے جانتے ہیں''۔

''وہ اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ ان کے بارے میں۔ ابھی تک آپ دونوں کی ملاقات اور بات چیت بھی نہیں ہوئی''۔

''ان سے میرا تعارف کب کراؤ گی؟''

''اتنی شتابی کیا ہے؟''

''میرے یہاں قیام کا عرصہ ختم ہونے والا ہے''۔

''تو پھر کیا ہوا؟''

کہتے ہیں نا کہ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل''۔

''کچھ لوگوں پر تو یہ صادق آتا ہے، مجھ پر نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ پر بھی اس کا اطلاق نہیں ہوتا''۔

اس کے بعد تو کچھ کہنا بڑا مشکل تھا مگر کمال چپ نہ رہا، ''آپ کو اپنی رہائش گاہ پر بلانا تو ممکن نہیں، آپ مجھے کیوں نہیں ایک بار اپنے گھر بلا لیتیں؟''

''اگلی اتوار میری چھوٹی بہن کا جنم دن ہے، اس روز آپ کو بلالوں گی''۔

اور پھر وہ رکشہ میں بیٹھ کر اپنے گھر روانہ ہو گئی۔ کمال پیدل ہی چل پڑا۔ وہ سوچتا رہا کہ سنگیتا کی بہن کے لیے کون سا تحفہ مناسب رہے گا۔ بہت سوچنے کے بعد بالآخر اس نے کتابیں دینے کا فیصلہ کیا۔ اس پر نام کیا لکھے؟ سنگیتا نے تو منجھلی بہن کا گھریلو نام 'رونا' اور سب سے چھوٹی کا 'منا' بتایا تھا مگر اصل نام کیا ہیں؟ اسے پوچھنا یاد نہیں رہا تھا۔ اب مسئلہ یہ کہ کون سی کتابیں خریدی جائیں؟ سنگیتا نے بتایا تھا کہ رونا اس برس ہائر سیکنڈری امتحان دینے والی ہے، لیکن سب سے چھوٹی کی عمر کیا ہے، کس

جماعت کی طالبہ ہے؟ اب تو یہی حل ہے کہ اتوار کو رابندر سادھن جا کر سنگیتا سے معلوم کرے۔ مگر اس میں تو تاخیر ہو جائے گی، لہٰذا اندازہ کرنا پڑے گا۔

کمال نے کتابیں خریدیں اور سادھن ہاؤس جانے کی بجائے ان کے گھر چلا گیا۔ سالگرہ میں سوائے کمال اور قریبی رشتہ داروں کے اور کسی کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ سنگیتا کی منجھلی بہن نے خوبصورت لباس زیبِ تن کر رکھا تھا۔ سنگیتا نے اسے کمال کی بغلی نشست پر لا بٹھایا اور پھر تھوڑی دیر بعد اپنے والدین اور سارے مہمانوں سے اس کا تعارف کرایا۔ تقریب ختم ہونے تک وہ زیادہ تر سر جھکائے ہی بیٹھا رہا، بعد ازاں رخصت لے کر وہاں سے چلا آیا۔

چند روز بعد اسے علم ہوا کہ سنگیتا نے کسی اور وجہ سے اسے سالگرہ میں مدعو کیا تھا۔ اس کے والدین اگلے اتوار اسے ماموں کے گھر لے جانا چاہتے تھے جہاں اس کی ملاقات ایک ڈاکٹر سے کرانا مقصود تھی جسے ماموں نے سنگیتا کے لیے پسند کیا تھا۔ وہ اس رشتہ پر تیار نہ تھی اور جب اسے مجبور کیا گیا تو اس نے صاف لفظوں میں بتا دیا کہ وہ صرف کمال سے شادی کرے گی۔ اہلِ خانہ کا ردِعمل شدید مخالفانہ تھا۔ اس کی ماں نے طیش میں یہاں تک کہہ دیا، ''کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ تم میری بیٹی ہو''۔ باپ کے الفاظ تھے، ''ہماری سوسائٹی میں کئی لڑکے تم سے شادی کے خواہشمند ہیں مگر تم ایک مسلمان سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ میں لوگوں کا سامنا کیسے کروں گا؟ تم نے اپنے آپ ہی فیصلہ کر لیا ہے۔ کیا اپنی بہنوں کا سوچا ہے؟ اگر تم ایک مسلمان سے شادی کر لو تو کیا بعد میں تمہاری بہنوں کے لیے اچھے رشتے مل جائیں گے؟'' سنگیتا اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی لیکن اس نے کمال کو نہ بتایا۔ بس فون کر کے اتنا کہہ دیا کہ جب تک وہ خود نہ کہے، وہ اسے مت ملے، اور یہ کہ اس ہفتہ وہ موسیقی کی کلاس میں نہیں جائے گی۔

کمال کی سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے۔ جب وہ سنگیتا کی چھوٹی بہن سے اسکول میں ملا تب ساری صورتِ حال کا علم ہوا۔ اسے بہت افسوس ہوا۔ ادھر ایس پی نے بلا کر اسے اس کی تعیناتی کی خبر سنائی، ''ٹریننگ ختم ہونے سے پہلے ہی تمہاری تعیناتی کا حکم آ گیا ہے۔ میرے خیال میں تمہیں اچھی جگہ ملی ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟''

''سر! مجھے اچھی یا بری جگہ کا علم نہیں۔ کم از کم یہ اچھی بات ہوئی ہے کہ ٹریننگ ختم ہونے سے پہلے ہی میری تعیناتی کا حکم آ گیا ہے، مجھے انتظار نہیں کرنا پڑا''۔

''تم کب رپورٹ کرنا چاہو گے؟''

''سر! جب آپ مجھے یہاں سے فارغ کریں گے''۔

''وہاں کا افسر جلد ہی سبک دوش ہونے کا خواہشمند ہے۔ اس کی بیوی دارالحکومت میں ملازمت کر رہی ہے اور اسے نزدیک ہی تعینات کیا گیا ہے، لہٰذا وہ جلد از جلد جانا چاہتا ہے۔ تم اس سے بات کر لو۔ جب جانا چاہو، میری طرف سے اجازت ہے''۔

''سر! میری اس سے بات ہو چکی ہے۔ وہ بلا تاخیر عہدہ چھوڑنے کا متمنی ہے۔ میں کل اپنا سامان باندھ کر پرسوں روانہ ہو جاؤں گا''۔

اگلا دن بدھ تھا۔ سامان باندھ کر وہ شام کے وقت چیٹر جی کے گھر گیا۔ موسیقی کی مشق کرنے کی بجائے اس نے رخصت ہونے کی اجازت مانگی اور پھر سنگیتا کا انتظار کرنے لگا۔ وقتِ مقررہ تک وہ نہ پہنچی تو کمال باہر چوک کی طرف چل پڑا۔ عین اسی وقت سنگیتا اپنی بہن کے ساتھ رکشے سے اتری۔ کمال اس کے پاس گیا مگر وہ کہنے لگی، ''تم اپنے گھر جاؤ۔ میرے والدین نے بہن کو اس لیے میرے ساتھ بھیجا ہے کہ میں تم سے کوئی بات نہ کروں''

''لیکن مجھے ایک ضروری بات کرنا ہے''۔

''بعد میں کریں گے''۔

''میری تعیناتی ہوگئی ہے اور میں کل روانہ ہو رہا ہوں''۔

''پھر بھی ہم مل لیں گے''۔ اتنا کہہ کر سنگیتا اپنے اتالیق کے گھر اور کمال اس شہر میں اپنی آخری شب گزاری کے لیے اپنے گھر کو چل دیا۔

....

ٹریننگ کے بعد باکل پور اس کی جائے تعیناتی تھی جسے حال ہی میں سب ڈویژن کا درجہ ملا تھا۔ اکیڈمی میں سیکھے ہوئے آداب واطوار ذہن میں ہنوز تازہ تھے اس لیے وہاں پہنچ کر پہلے تو وہ افسرانِ بالا سے ملا پھر دیگر افسروں سے ملاقات کی۔ سب ڈویژن اسپتال تا حال تعمیر نہیں ہوا تھا لہٰذا پرائمری ہیلتھ سنٹر کا میڈیکل آفیسر ڈاکٹر حسین ہی سب سے بڑا ڈاکٹر تھا۔ کمال اس سے بھی ملا۔ وہ اسے اسپتال کے اندر ایک چھوٹے سے گھر میں لے گیا اور اپنی بیوی، دونوں بیٹیوں، معصومہ بیگم عرف 'مینا' اور عاصمہ بیگم عرف رینا اور بیٹے شفیق علی، عرف ڈمبی ، اور اپنے چھوٹے بھائی حفظ الرحمٰن عرف پیرو سے ملاقات کرائی۔ فواکہات کے بعد کمال نے اٹھتے ہوئے انہیں اپنی رہائش گاہ پر مدعو کیا جو دفتر کی عمارت ہی میں تھی۔

چند روز بعد ڈاکٹر حسین اپنی بیٹیوں اور بیٹے کے ہمراہ کمال سے ملنے آئے۔ وہ اس وقت اپنے دفتر میں تھا جہاں بیٹھنے کا معقول انتظام تھا۔ کمال انہیں وہیں بٹھانا چاہتا تھا مگر ڈاکٹر کی چھوٹی بیٹی بضد تھی وہ کمال کے گھر جائیں گے، لہٰذا انہیں لانا ہی پڑا۔ اس کے گھر میں کوئی خاص فرنیچر نہیں تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں اس کی آہنی چارپائی پڑی تھی۔ دوسرے کونے میں ایک صندوق میں اس کے کپڑے رکھے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ہارمونیم اور طبلے کی جوڑی پڑی تھی۔ کمال نے دفتر سے اٹھتے ہوئے اپنے آدمیوں سے دو چار کرسیاں لانے کو کہا۔

ڈاکٹر حسین علی نے کمال سے اس کی جائے پیدائش، تعلیمی مراحل، والدین، اور سروس میں آنے کی بابت چند ایک سوالات کئے۔ رینا ہارمونیم دیکھ کر جذباتی ہو رہی تھی۔ کمال کی مانند وہ بھی موسیقی سیکھنے کے ابتدائی مرحلہ میں تھی۔ نوآموز بالعموم اپنی مہارت دکھانے میں پُرجوش ہوتے ہیں۔ رینا کی خواہش پر کمال نے ہارمونیم پر ٹیگور کا لکھا ہوا ایک گیت سنایا،''مجھے علم ہے کہ تم اس راہ پر بھولے سے آگئے ہو''۔

گیت ختم ہوا تو کمال نے رینا سے گانے کی فرمائش کی لیکن اس نے گانے کی بجائے جواب دیا،''ہم آپ کے گھر آئے ہیں، لہٰذا آج آپ گیت سنائیں گے۔ جب آپ ہمارے گھر آئیں گے میں تب گاؤں گی''۔

''مگر میں تو تمہارے گھر گیا تھا''۔

''لیکن آپ نے مجھے گیت سنانے کے لیے تو نہیں کہا تھا''۔

''میں کیسے کہتا کیونکہ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ تم گاتی بھی ہو''۔

''اب تو پتہ چل گیا ہے نا''۔

''ہاں''۔

''اگلی دفعہ آپ آئیں گے تو مجھے کہئے گا، اور ہاں! بڑی دیدی کو گٹار بجانے کا شوق ہے''۔

مینا نے بہن کو چپ کرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ رینا دوبارہ بولی،''یہ گٹار بجاتی ہے''۔

''پھر تو ہم اس سے گٹار بھی سنیں گے''۔

''اور اس کے لیے آپ کو ہمارے گھر آنا پڑے گا''۔

''کیوں؟ کیا تمہاری بہن یہاں نہیں بجاسکتی؟''

''کیا آپ کے پاس گٹار ہے؟''

''اوہو! نہیں''۔

''پھر آپ آئیے ہمارے گھر، میں گاؤں گی اور یہ گٹار بجائے گی۔ آپ جلدی آئیں گے نا؟''

''ہاں! میں آؤں گا''۔

....

گذشتہ روز کمال بنور گیا ہوا تھا جہاں مقامی رکن اسمبلی اور پارلیمنٹ میں کمیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ) کے ممبر کے بیٹے کی قیادت میں شرپسندوں نے لوٹ مار، آتش زنی اور قتل کی واردات کی تھی۔ وہ سارا دن تفتیش میں مصروف رہا۔ شواہد کی بنا پر رات گئے اس نے رکن اسمبلی اور چند دیگر افراد کو گرفتار کرلیا۔ صبح کے وقت رکن پارلیمنٹ کے بیٹے کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ تمام گرفتار شدگان کو عدالت بھیجنے کے بعد وہ واپس لوٹ آیا۔ دفتر میں بیٹھا کاغذات دیکھ رہا تھا جب اسے بتایا گیا کہ باکل پور کالج کی ایک لڑکی عاصمہ بیگم عرف رینا اس سے ملاقات کی خواہاں ہے۔ کمال پہچان گیا کہ وہ ڈاکٹر علی کی بیٹی ہے۔

حال ہی میں اطلاعات اور ثقافت کے محکمے نے کالجوں کے طلباء میں مضمون نگاری کا مقابلہ کرایا تھا۔ عنوان تھا، ''فرقہ وارانہ رویے کا شکار: آپ کا ذاتی تجربہ''۔ کمال کی یہاں آمد پر محکمے نے اسے مضامین کی جانچ پڑتال کی ذمہ داری سونپی تھی۔ مضامین پر نام پتہ لکھنے کی ممانعت تھی مگر کالج کے نام سے صنف کا تعین آسان تھا۔ نفسِ مضمون سے لکھنے والے کے فرقہ کی بھی نشاندہی ہوگئی۔ سب سے زیادہ نمبر مقامی کالج کی ایک مسلمان طالبہ نے حاصل کیے تھے۔ تقسیمِ انعامات کی تقریب میں کمال کو بھی مدعو کیا گیا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ پہلا انعام جیتنے والی عاصمہ بیگم عرف رینا ہے۔ وہی رینا اب اس سے ملاقات کے لیے باہر کھڑی تھی۔

کمال نے اسے اندر بلایا اور سامنے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

''ہاں بتاؤ، چائے یا کافی؟ کیا پسند کروگی؟''

''آپ کافی یا چائے نہیں پیتے، پھر میرے لیے کیوں؟''

''ٹھیک''، یہ کہتے ہوئے اس نے گھنٹی بجائی۔ اردلی کے اندر آنے پر اسے کچھ میٹھی چیز لانے کو کہا۔ رینا جلدی سے بولی، ''کوئی میٹھی چیز نہیں، صرف چائے مناسب رہے گی''۔

کمال نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''میں چائے وغیرہ نہیں پیتا اور تم اکیلی پینا نہیں چاہتی۔ کچھ میٹھا وغیرہ ہی ہو جائے''۔

اردلی کے جانے کے بعد کمال نے رینا سے پوچھا کہ اس کے مضمون میں کس واقعہ کا ذکر تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کندھے سے اپنا پرس اتار کر بغلی کرسی پر رکھا اور کہنے لگی، ''میں اس وقت چوتھی جماعت میں تھی۔ سالانہ امتحانات سے پہلے مسز سوما بسواس ہمیں پڑھا رہی تھیں کہ اچانک انہیں کھانسی شروع ہوگئی۔ میں نے گھر پر دیکھا تھا کہ ایسی حالت میں امی پانی پینے کو دیتی تھیں، لہٰذا میں نے اپنی پانی کی بوتل انہیں دی۔ وہ پینے ہی لگی تھیں کہ تنوشری نام کی ایک بیہودہ سی لڑکی نے شور مچا دیا، 'میڈم! آپ کا دھرم بھرشٹ ہوگیا ہے، رینا مسلمان ہے'، وہ یہی شور مچاتی رہی''۔

''تم نے اسے خاموش کیسے کرایا؟''

''میں تو بالکل کچھ نہیں بولی۔ جلد ہی میڈم کی کھانسی رک گئی مگر تنوشری متواتر چیخے چلائے جا رہی تھی۔ میڈم نے پانی

کی بوتل مجھے واپس کی اور اس سے پوچھا،' یہ احمقانہ بات تمہیں کس نے بتائی ہے؟ پانی پینے سے میرا دھرم کیسے بھرشٹ ہوگیا۔ اور اگر ہوگیا ہے تو ہو جائے۔ کیا مسلمان انسان نہیں'؟ یہ سن کر تنوشری خاموش ہوگئی۔ میڈم نے چند لمحے چپ رہنے کے بعد نرم لہجے میں اس سے پوچھا،' تمہیں ایسی باتیں کس نے بتائی ہیں؟' تنوشری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میڈم پھر بولیں،' ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ اگر تمہارے بارے میں کوئی ایسی بات کرے تو کیا تمہیں اچھا لگے گا؟ یقیناً تمہیں اچھا نہیں لگے گا، اسی طرح دوسروں کو بھی تمہاری بات اچھی نہیں لگتی۔ ٹھیک ہے یا نہیں؟' تنوشری نے ہاں میں سر ہلایا۔ میڈم نے مزید کہا،' تم اپنی سہیلی کو دکھ نہیں دینا چاہتی ہو، لہٰذا بہتر ہے کہ ایسی باتیں کرنے سے احتراز کرو۔ یہ اچھی باتیں نہیں ہیں'۔ تنوشری نے پھر ہاں میں سر ہلایا، میڈم کلاس سے باہر چلی گئیں''۔

''اس واقعہ کا تم پر کیا اثر ہوا تھا''، کمال نے رینا سے استفسار کیا۔

''یہ واقعہ دہراتے ہوئے مجھے ہنسی آ رہی ہے لیکن اس وقت مجھے واقعی بہت دکھ ہوا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ مجھ سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوئی، پھر میری سہیلی کا ایسا ردِ عمل کیوں ہوا۔ اگر میڈم میری بوتل میں سے پانی پی لیتیں تو ان کا دھرم کیسے بھرشٹ ہو جاتا؟''

''اور کچھ؟''

''اس وقت سے مجھے یہ یقین ہوا ہے کہ ہم چاہے کتنے ہی ان کے نزدیک آ جائیں، وہ ہمیں کبھی بھی اپنا نہیں کہیں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے اور ان کے مذہب میں فرق ہے۔ ہم ان جیسے نہیں ہیں۔ لفظوں میں اس احساس کو بیان کرنا بہت مشکل ہے''۔

''میں سمجھ سکتا ہوں''۔

''گھر لوٹ کر میں نے ساری بات امی کو بتائی۔ مجھے علم نہیں کہ اس وقت ان کے احساسات کیا تھے مگر وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگیں، ٹیچر نے بالکل صحیح بات کی تھی۔ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے گلے لگایا اور سر پر ہاتھ رکھا''۔

''انہیں بھی برا لگا ہوگا''۔

''اب سوچتی ہوں کہ ہاں! ایسا ہی ہوگا''۔

کمال سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کے پرائمری اسکول کے زمانے میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ شاید امر پال جیسے استاد تھے، شاید اچھے لوگ بھی ہوا کرتے تھے۔ اس نے رینا سے پوچھا،'' ہڈی کا کیا واقعہ تھا؟''

''میں چھٹی یا ساتویں کی طالبہ تھی۔ پہلے واقعہ کے بعد میں مذہب، ذات پات اور دیگر متعلقہ باتوں سے کسی حد تک آشنا ہو گئی تھی۔ اس روز ہمیں اسکول کے میدان میں ایک ہڈی پڑی ہوئی ملی۔ کسی نے کہا کہ یہ گائے کی ہڈی ہے، اور مجھے مخاطب کر کے کہا گیا،'' رینا! اسے میدان سے ہٹا دو''۔ میں نے اعتراض کیا،' میں ہی کیوں؟'' پیچھے سے آواز آئی،'' تم لوگ ہی گائے کا گوشت کھا کر ہڈی پھینک دیتے ہو'۔ مجھے برا تو لگا مگر کہا کچھ نہیں''۔

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''کچھ کہے بغیر میں کلاس میں چلی گئی لیکن دماغ میں ہلچل مچی رہی۔ ایک بار پھر مجھے احساس ہوا کہ میں جو چاہوں کر لوں، یہ مجھے کبھی بھی اپنا نہیں سمجھیں گے۔ اس دن کے بعد سے میں ان کے ساتھ زبانی کلامی ٹھیک ہوں مگر دل میں انہیں غیر ہی سمجھتی ہوں۔ کیا آپ کا تجربہ بھی ایسا ہی نہیں؟''

''بالکل ایسا تو نہیں مگر ملتا جلتا ہے''۔

''کیا آپ میری طرح نہیں سوچتے؟''

''نہیں''۔

''کیوں؟''

''اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو میں گمان کرتا ہوں کہ یہ نا سمجھ ہے، غلطی کر رہا ہے، یہ میرا ہم وطن ہے، میرے جیسا ہے۔ میرا فرض اس کی غلط فہمی دور کرنا ہے، قطع تعلق کرنا نہیں۔ مجھے اس سے محبت کرنی چاہیے۔ اگر محبت کروں گا تو کسی نہ کسی دن وہ میری بات سن اور سمجھ لے گا، نفرت کرنے سے وہ کبھی بھی میری طرف نہیں آئے گا''۔

''آپ تو حضرت عیسیٰ کی تعلیم دہرا رہے ہیں''۔

''عیسیٰ بھی تو ہماری طرح کے ایک انسان تھے''۔

''پھر عیسائی انہیں کیوں خدا کا بیٹا مانتے ہیں؟''

''یہ من گھڑت بات ہے۔ انہوں نے خود ایسا دعویٰ نہیں کیا تھا''۔

''کیا آپ اپنا تجربہ بتائیں گے؟''

''یہ پانچویں جماعت کی بات ہے۔ میرا ایک ہم جماعت شیلن گھوش دورانِ گفتگو کہنے لگا، 'مسلمان تو راجشاہی ریڈیو سنتے ہیں'۔ میں نے کہا، اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اور اس سے پوچھا، کیا تم راجشاہی یا ڈھاکہ ریڈیو کی نشریات نہیں سنتے؟ اس کا جواب تھا، میں صرف کلکتہ ریڈیو سنتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ ہمارے گاؤں کے زیادہ تر لوگ چاہے وہ ہندو ہیں یا مسلمان، راجشاہی یا ڈھاکہ ریڈیو سنتے ہیں، صرف ہمارے گاؤں والے ہی نہیں، دوسرے علاقوں کے لوگ بھی یہی سنتے ہیں۔ اب پردہ کہنے لگا، 'وہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ان ریڈیو اسٹیشنز سے نشر ہونے والی خبریں زیادہ تر اُسی ملک کے بارے میں ہوتی ہیں جبکہ کلکتہ ریڈیو کی خبروں کا تعلق ہم سے ہے'۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ان کا مقصد خبریں سننا نہیں ہوتا، وہ تو موسیقی، گیت اور دوسرے دلچسپ پروگرام سنتے ہیں۔ راجشاہی ریڈیو سے ایسے پروگرام کلکتہ ریڈیو کی نسبت زیادہ نشر ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ دینی پروگراموں میں مسلمان دلچسپی لیتے ہیں۔ کلکتہ ریڈیو سے اسلام کے بارے میں کم ہی پروگرام ہوتے ہیں۔ راجشاہی ریڈیو سے اذانوں کے علاوہ رمضان میں سحری اور افطاری کے وقت کا اعلان بھی کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو ان کی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے ہندوؤں کی نسبت مسلمان زیادہ تر راجشاہی ریڈیو ہی سنتے ہیں''۔

کمال کو یاد آیا کہ ایک بار وہ سپنا کے ساتھ ان کے گھر گیا۔ اس کا باپ ڈھاکہ ریڈیو سن رہا تھا۔ اس نے کمال سے پوچھا، ''کیا تمہیں نماز پڑھنی آتی ہے؟'' کمال نے ہاں میں سر ہلایا۔ اس پر سپنا کے پتا نے کہا، ''پھر انتظار کرو۔ ابھی نماز کا اعلان ہوگا''۔ تھوڑی ہی دیر بعد ریڈیو سے اذان نشر ہوئی۔ اس کے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔ اذان سنتے ہی اس کے اندر عجیب سا جوش پیدا ہوا تھا۔ رینا نے پوچھا، ''پھر کیا ہوا؟''

کچھ نہیں۔ تم بتاؤ تاریخ کیسے پڑھائی جا رہی ہے؟''

''یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ پٹھانوں یا مغلوں کے عہد میں مندروں کو مسمار کرنے کی باتیں بڑی تفصیل سے بیان ہوتی ہیں۔ جب کلاس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ علاؤ الدین خلجی یا اورنگ زیب نے مندروں کو زمین بوس کیا تھا تو تمام ہم جماعت میری جانب یوں دیکھتی ہیں جیسے کہ ان مندروں کی تباہی میں میرا ہاتھ ہو''۔

''تم نے سرسوتی پوجا کے واقعہ کا لکھا تھا، کیا وہ حقیقی ہے؟''

''ہاں، میں اس وقت دسویں جماعت میں تھی۔ دوسروں کی طرح میں نے بھی چندہ دیا تھا۔ بڑے چاؤ سے سفید ساڑھی باندھی۔ قربان گاہ پر رکھی ہوئی دیوی کی مورتی بائیں جانب جھکی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کرنا چاہا تو

رملہ نے مجھے کہا،تم گیٹ پر کھڑی ہو جاؤ، اسے میں خود ہی ٹھیک کرلوں گی۔ میں جا کر وہاں کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد میڈم نیلیما نے مجھے ڈانٹتے ہوئے پوچھا،'یہاں کیوں کھڑی ہو؟ جاؤ! دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرو۔ زمین پر رنگ لگاؤ اور چاولوں کے آٹے کا چھڑکاؤ کرو'۔ میں زمین پر رنگ لگانے ہی والی تھی کہ تو شری رملہ کے پاس گئی۔ رملہ سیدھی میڈم کے پاس جا کہنے لگی،'اگر رینا نے رنگ لگانا ہے تو پوجا کیسے ہوگی؟' میڈم نے پریشان ہو کر پوچھا،' کیوں، کیا ہوا؟' رملہ نے بڑے ناخوشگوار لہجے میں جواب دیا،' کیونکہ وہ مسلمان ہے'۔ میڈم تذبذب میں تھی، شاید وہ سوچ رہی ہو کہ رینا کو کیسے منع کیا جائے۔ میں نے سن کر خود ہی کام چھوڑا اور گھر کو لوٹ آئی''۔

کمال کو اپنا واقعہ یاد آ گیا جب اسکول کے زمانے میں سرسوتی پوجا کے موقع پر اس کے ایک ہم جماعت نے استاد کو کہا تھا،''اس لچی کو دیوی کی بھینٹ نہیں چڑھایا جا سکتا کیونکہ کمال کے ہاتھ لگ چکے ہیں''۔ ان الفاظ کی چبھن اسے آج بھی محسوس ہو رہی تھی اگر چہ نوعیت بدل گئی ہے۔ کل ناانصافی کی تکلیف تھی، اب اس بات کا دکھ ہے کہ مذہبی رسم ورواج نے اس کے ہم وطنوں کو کس طرح تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ گناہ کسی دوسرے کا نہیں، سب کا ہے جس میں خود وہ بھی شامل ہے۔ ادھر رینا بتا رہی تھی:

''تب سے میرے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اجتماعات اور جلسے جلوسوں میں وہ جو مرضی کہتے رہیں، حقیقت یہی ہے کہ ہندو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں''۔

''نہیں، سارے ہندو ایسے نہیں ہیں۔ تمہاری میڈم سوما، میڈم نیلیما ایسی نہیں۔ میرے اساتذہ امر صاحب، شکتی صاحب، دیپنکر صاحب، گوپال دادو، آنند کا کا، منگل وغیرہ کے علاوہ بے شمار اور ہندو بھی اس ذہنیت کے مالک نہیں۔ وہ لوگ جو ایسی باتیں کرتے ہیں، برے نہیں ہیں، بلکہ برے ماحول کا شکار ہیں۔ ہمیں ان کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے، وہ ہمارے ہی بھائی ہیں۔ ہمیں ان کی غلط فہمیاں دور کرنی چاہییں''۔

کمال بولتا چلا گیا گویا وہ کہیں لیکچر دے رہا ہو۔ رینا سمجھ نہیں رہی تھی، لہٰذا کمال اسے سمجھانے لگا،''ہمارے تعلیمی اداروں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ وہ اپنی مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں تو مسلمانوں کو اچھا نہیں لگتا۔ اگر مسلمان اپنی مذہبی رسمیں ادا کریں تو ایسی شکایات ہندوؤں کو بھی ہوتی ہیں''۔

''کیسے؟''

''میں تمہیں ایک حقیقی مثال دیتا ہوں۔ بچپن میں میں نماز کا پابند تھا۔ ایک بار میں اپنے ایک ہندو دوست کو مسجد لے گیا۔ لوگوں نے اسے مسجد میں داخل نہ ہونے دیا۔ اس کے برعکس ہندو اپنے مندروں کے کچھ حصوں میں غیر ہندوؤں کو جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ مسلمان تو کسی غیر مسلم کو مسجد میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ پھر سارے مسلمان بھی مسجد میں نہیں جا سکتے، صرف انہیں اجازت ہے جو نماز کی ادائیگی کے لیے جائیں۔ یہی نہیں، صرف مردوں کو اندر جانے دیا جاتا ہے''۔

''ہاں یہ حقیقت تو ہے۔ میرے بھائی ڈمی کی مثال ہی لے لیں،'' رینا کہنے لگی،''اسپتال کے چھوٹے بچوں کی ساتھ اس کی بڑی دوستی ہے۔ وہ سرسوتی پوجا کے لیے ان کے ساتھ چلا گیا۔ پھول چڑھاتے وقت اس نے بھی چند پھول دیوی کی نذر کرنا چاہے۔ ایک شخص نے اسے منع کیا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ رات گئے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو اس نے دیوی کی مورتی لی اور پیچھے جا کر اپنی نذر نیاز اس کے سامنے رکھ دی۔ صبح ہوئی تو سرسوتی دیوی کے وہاں نہ ہونے پر کہرام مچ گیا۔ اسپتال سے واپسی پر ڈیڈی نے ڈمی کو دیوی پر پھول وارتے دیکھا۔ وہ پریشان ہو گئے کہ اب کیا کیا جائے۔ انہوں نے ڈمی کو ڈانٹ پھٹکار کی۔ امی ساتھ والے کوارٹر سے ایک عورت کو بلا لائیں۔ اس نے مورتی کو لیا اور بچوں کے پاس جا کر بولی،'تم کیسے پجاری ہو۔ دیوی کو اکیلا چھوڑ کر تم سارے سونے کے لیے چلے گئے تھے۔ اگر میں اسے اپنے پاس نہ رکھتی تو کتے بلیاں اپنے بول

براز سے اسے ناپاک کر جاتے'۔ سب نے اپنی غلطی تسلیم کی اور دیوی کو مقررہ جگہ رکھ کر پوجا شروع کر دی۔ اس عورت کی حاضر دماغی نے صورتِ حال کو خراب ہونے سے بچالیا''۔

کمال نے اس عورت کی ستائش کے بعد کہا، ''اگر تم ان سارے پہلوؤں کو دیکھو تو واضح ہو جائے گا کہ رسموں اور کھانے پینے کے فرق نے ہمارے دیش کے لوگوں کو متعدد فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ہمیں یہ فرق مٹانا ہوگا''۔

''آپ کی باتوں نے میرے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اب مجھے ان سے ہمدردی محسوس ہو رہی ہے جن کے متعلق میرے دل میں بغض اور کینہ تھا''۔

''وہ کون لوگ ہیں؟''

''ایک تو سائنس کالج کے قریب میس کی مالکہ ہے''۔

''کیا ہوا تھا؟''

''مجھے اس کی وجہ سے پریذیڈنسی کالج چھوڑنا پڑا۔ گھر سے روزانہ آنے جانے میں بہت دشواری تھی، ہوسٹل میں داخلہ نہ مل سکا۔ سر برمن نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ہوسٹل میں ایک لڑکی کی گنجائش ہے۔ انہوں نے خود ہی مالکہ کو فون کر کے میری رہائش کی سفارش کی۔ ان کے کہنے پر میں ہوسٹل گئی، کمرہ دیکھا، ٹھیک تھا اس لیے میں نے اس عورت کو بتایا کہ میں کل آ جاؤں گی۔ اس نے کُل اخراجات ساڑھے چار ہزار روپے بتائے۔ میرے پاس پیسے تھے جو میں نے اسے ادا کر دیے۔ رسید لکھنے کے وقت اس نے میرا نام پوچھا، پھر سوال کیا، 'کیا تم پڑھتی ہو؟' میں نے جواب دیا کہ ہاں میں سر برمن کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ وہ خاتون کچھ سوچتی رہی، پھر اندر گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر کہنے لگی، 'سوری! مجھے پتہ نہیں تھا، کمرہ تو کسی اور نے لے لیا ہوا ہے۔ وہ لڑکی آج شام کو آ جائے گی'۔ میں سارا معاملہ سمجھ کر واپس آ گئی۔ کوئی اور رہائش بھی نہ مل سکی اس وجہ سے میں نے موجودہ کالج میں داخلہ لیا ہے''۔

''یہ تو بڑا افسوسناک واقعہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور؟''

''موجودہ کالج میں داخلہ لینے کے بعد میں نے دیکھا کہ اسی ذہنیت کے چند لوگ یہاں بھی ہیں۔ وہ آپس میں بنگالی زبان میں مگر میرے ساتھ ہندی یا انگریزی میں بات کرتے تھے۔ ایک دن میں کلاس میں بیٹھی تھی کہ ایک لڑکی نے مجھ سے پوچھا، ''کیا گھر میں تم لوگ عربی بولتے ہو؟'' مجھے غصہ تو بہت آیا مگر اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے جواب دیا، ''ہمیں عربی بالکل نہیں آتی، بولیں کیسے؟'' دوسری لڑکی بولی، ''میں نے کہا تھا نا کہ یہ مسلمان نہیں لگتی''۔ مجھے بتانا پڑا کہ میں مسلمان ہوں۔ وہ گڑبڑا گئی، ''لیکن تم مسلمان لگتی نہیں ہو'۔ میں نے پوچھا، 'مسلمان کی شناخت کیسے ہوتی ہے؟'' جواب دیئے بغیر ہی وہ بھاگ گئیں مگر میرا مزاج مکدر ہو گیا''۔

''اب مزاج ٹھیک ہے؟''

''اب سوچتی ہوں کہ اگر موقع ملا تو میں ان کو وضاحت سے سمجھاؤں گی''۔

اسی اثنا میں اردلی نے شیرینی کی دو رکابیاں اور پانی کے دو گلاس میز پر رکھ دیئے، ''آؤ! شروع ہو جائیں''۔ کمال نے رینا سے کہا۔

....

گیارہ بجے اسے بی، ڈی، او پہنچنا تھا۔ دعوت نامے میں اس جانب کوئی اشارہ نہیں تھا کہ لباس عام سادہ ہو یا یونیفارم میں آنا ہوگا۔ کمال بڑی دیر سے سوچ رہا تھا کہ اگر وہ عام لباس میں گیا اور اس کے افسران یونیفارم میں ہوں تو پریشانی

ہوگی۔ بہر حال اس نے یونیفارم میں جانے کا فیصلہ کیا۔ ساڑھے دس بجے وہ بی، ڈی، او چوک پہنچ گیا۔ اسے کیوں بلایا گیا ہے؟ وہ قطعاً لاعلم تھا۔ اسے شبہ تھا کہ شاید اس واقعہ کے سلسلہ میں بلایا گیا ہو جس میں مقامی رکن اسمبلی اور رکن پارلیمنٹ کے بیٹے کی قیادت میں لوگوں نے غنڈہ گردی کرتے ہوئے حزبِ اختلاف کے سیاستدان مسٹر پردھان کی رہائش گاہ پر حملے کے دوران ایک قتل، متعدد افراد کو زخمی اور چند عورتوں کی عصمت دری کی تھی۔ کمال نے ملوث سیاستدان اور دیگر چند افراد کو گرفتار کر لیا تھا۔ عدالت نے رکن اسمبلی کے سوا دیگر تمام ملزمان کی درخواست ضمانت مسترد کر دی، اور رکن کو پابند کیا گیا کہ وہ بونیر میں داخل نہیں ہوگا اور مقامی پولیس افسر کو روزانہ اپنی موجودگی کی اطلاع دیتا رہے گا۔ پارٹی کے لیے اسے ہضم کرنا ممکن نہ تھا اس لیے وہ متعلقہ افسروں کی گوشمالی اور کھچائی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس نے تمام کاغذات بمع کیمونسٹ پارٹی کے ترجمان The Grey Soil اخبار کے چند شمارے لیے جس میں واقعہ کی تفصیل تھی مگر پولیس کارروائی پر کوئی تنقید نہیں کی تھی۔ وہ کاغذات دیکھ ہی رہا تھا کہ ایس، ڈی، او بسواس داس آ گیا۔ کمال نے اس سے پوچھا، ''کیا یہ درست ہے کہ کل شام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب رکن اسمبلی کے گھر گئے اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی؟''

حکومت نے انٹیلیجنس بیورو کے سپیشل ایس، پی، ناپک سنیال کو موقع واردات پر جا کر تفتیش کا حکم دیا تھا۔ اس نے پہنچ کر ایس، پی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے گفتگو کی جس میں فیصلہ ہوا کہ وہ مل کر جائے وقوع پر پہنچیں گے مگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رکن اسمبلی کے ہاں پہلے ہی چلا گیا جہاں اس نے اس کی بیوی کو بتایا کہ چھاپے اور گرفتاریاں اس کی منظوری کے بغیر کی گئی ہیں اور یہ کہ اس معاملہ میں اس کی ذات کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہونی چاہیے۔ کمال کے سوال کا جواب دینے کی بجائے بسواس داس نے پوچھا، ''آپ کو کس بنا پر شک ہوا ہے؟''

''آخر کار وہ ضلع کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہے، اگر اس کا رویہ ایسا ہے تو اس کے ماتحت کیسے کام کر سکتے ہیں؟''

''یہ تو پھر بھی بہتر ہے۔ آپ کو اس کی حرکتوں کا علم ہی نہیں''۔

''کیوں، کیا ہوا؟''

''رکن اسمبلی بھیم ساہا نے گھاٹ بندر پر زیرِ تعمیر ڈیم کا معائنہ کرنا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے یاد آیا کہ اس کا مفلر تو کہیں دور کسی جگہ رہ گیا ہے۔ اس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو مفلر لانے کا حکم دیا۔ وہ صاحب تیزی سے واپس مڑے۔ کچھ فاصلے پر انہیں ایک اور اہلکار ملا۔ انہوں نے اسے مفلر لانے کا حکم دیا۔ وہ بیچارہ گیا، مفلر لایا اور ڈی، ایم صاحب کے حوالے کیا جو انتہائی مسرور تھے کہ رکن اسمبلی کی خوشنودی حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آیا ہے۔ وہی اہلکار میرے پاس آ کر کہنے لگا، ''اب عزت سے نوکری کرنا مشکل ہو گیا ہے، مہربانی فرما کر میری یہاں سے تبدیلی کرا دیں''۔

''لیکن وہ ایسا کرتا کیوں ہے؟''

''سادہ سی بات ہے۔ وہ اس اہم جگہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ چونکہ خود بھی ایماندار شخص نہیں ہے اس لیے ایسی حرکات نہ کرے تو کیا کرے''۔

''اس نے کیا بے ایمانی کی ہے؟''

''بیوی بچوں سمیت وہ کل باکل پور آیا، ریسٹ ہاؤس میں شب بسری کی، کھایا پیا، ایک پیسہ ادا نہیں کیا، نہ ہی وہ کبھی ادائیگی کرے گا''۔

''پھر؟''

''میں نے اہلکاروں کو جعلی بل بنانے کو کہا ہے تاکہ ڈی، ایم صاحب کے نام سے ادائیگی کی جائے۔ اب آپ ہی

بتایئے اگر میں خود ہی ماتحتوں کو غلط کام کرنے کا کہوں تو ان کے کاموں کی نگرانی کیسے ہو سکتی ہے؟"۔

"لیکن تم ایسا کام کرتے کیوں ہو؟"

"میں آپ کی مانند 'کوئی پروا نہیں' رویے والا شخص نہیں، اور میں کسی کمتر اہمیت کے علاقے میں جانا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ بھی ہے میں موجودہ حالات سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اپنا دامن داغدار کیے بغیر یہاں سے چلا جاؤں"۔

کمال کو لگا کہ بوس ایک اچھا شخص ہے لیکن اس سے مجبوراً غلط کام کروائے جاتے ہیں، اس پر کمال کو دکھ ہوا۔ اگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ معقول شخص ہوتا تو اس قسم کے لوگوں کی موجودگی نعمت سے کم نہیں۔ اتنے میں دو گاڑیاں ان کے پاس آ رکیں۔ ایک سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بارون اچاریہ اور دوسری سے ایس، پی ادھے اپادھیا اترے۔ اچاریہ صاحب نے پوچھا کہ وہ لوگ یہاں کب پہنچے؟ مسٹر بوس نے بتایا، "مجھے کوئی بیس منٹ ہوئے ہیں، منڈل صاحب مجھ سے پہلے پہنچ گئے تھے"۔ اچاریہ صاحب بولے، "ہمیں کچھ تاخیر ہو گئی ہے"، پھر اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا، "بارہ بجنے میں چند منٹ ہیں۔ ایس پی صاحب! اگر ان سے کوئی بات کرنی ہے تو جلدی سے کر لیں"۔

کمال سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے گیارہ بجے کیوں بلایا گیا ہے جبکہ وہ خود تقریباً بارہ بجے آئے ہیں۔ وہ یہاں ساڑھے دس بجے پہنچ گیا تھا اور سڑک کنارے ڈیڑھ گھنٹے سے ان کا منتظر تھا۔ ایس پی نے کمال کو مخاطب کر کے کہا، "مسٹر منڈل! ہمیں بالکل علم نہیں کہ ہم سب کو کیوں بلایا گیا ہے لیکن گمان ہے کہ رکن اسمبلی اور چند دیگر پارٹی اراکین کی نظربندی کے سلسلہ میں بلائے گئے ہیں۔ اگر یہی معاملہ ہے تو آپ بالکل خاموش رہیے گا، ہم خود ہی بات کریں گے"۔

"ٹھیک سر! آپ ہی انہیں سارا ماجرا بتا دیجیے گا، میں کچھ نہیں بولوں گا۔ اور اگر مجھ سے براہ راست کوئی سوال کیا گیا تو؟"

"اس صورت میں تو تمہیں ہی جواب دینا ہوگا، مگر آرام سے، نرم لہجے میں، جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں"۔

"بہتر سر! اگر مجھ سے براہِ راست نہ پوچھا جائے تو میں خاموش رہوں گا۔ اگر مجھ سے سوال کیا گیا تو میں معقول جواب ہی دوں گا"۔

"بالکل صحیح۔ چلو اب چلتے ہیں"۔

وہ اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار روانہ ہوئے۔ کچھ فاصلے پر ایک دفتر کے باہر لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ علاقے کے پولیس انچارج نے انہیں سیلوٹ کیا اور ہجوم میں سے راستہ بنانے لگا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے جب ایک آواز آئی، "کون ہیں یہ لوگ؟" ایک شخص نے گستاخی سے جو جواب دیا اس کا شائستہ زبان میں یہ ترجمہ ہو سکتا ہے کہ "تمہیں پتہ نہیں؟ یہ سب ڈویژنل پولیس آفیسر ہے، جس کی آج کھچائی ہونی ہے"۔ کمال نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا مگر ان کے انداز میں کوئی تغیر نہ آیا۔ اس کے جی میں آئی کہ ایسے لوگوں کے خلاف کارروائی ہونی چاہیے جو ذمہ دار افسروں پر بلا جواز ایسی آوازیں کستے ہیں۔ باقی پولیس افسروں میں سے کسی نے اس بدتمیزی پر اعتراض نہ کیا لیکن کمال اپنی توہین پر تلملا رہا تھا تاہم خاموشی سے دیگر افسروں کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب اپنی اپنی نشستوں پر جا بیٹھے۔ کمال نے محسوس کیا کہ سامنے بیٹھے چھ افراد لڑائی کی نیت سے موجود ہیں۔ کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے تھے جن میں سے باہر کھڑے لوگ اندر جھانک کر آج کی کارروائی دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ بہت خوش تھے کیونکہ پارٹی نے اپنے کارکنوں کے خلاف قانونی مگر گستاخانہ اقدام پر پولیس افسروں کو ذلیل کرنے کا پورا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنی نشستوں پر بیٹھے، سامنے سے ایک شخص نے سوال کیا، "کیا آپ کو گیارہ بجے پہنچنے کا نہیں کہا گیا تھا؟"

کمال کو ہوم سیکرٹری کا واضح پیغام یاد تھا جس میں اس نے انہیں بارہ بجے پہنچنے کو کہا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے

معذرت کی کہ انہیں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی ہے۔

''کام ہو تو تم ہمیشہ دیر سے آتے ہو اور اگر غلط کام کرنا ہو تو تم لوگ بڑی جلدی آجاتے ہو''۔

کمال کو بُرا لگا۔ وہ ساڑھے دس بجے سے ان کا منتظر تھا جبکہ اس کے افسر تقریباً بارہ بجے آئے تھے۔ ایک شخص بولا، ''چلیں مزید تاخیر کیے بغیر ہم کام شروع کریں''۔ ایک پستہ قد اور آبنوسی رنگت کے شخص نے سب کا تعارف کرایا اور اپنے جیسے فارغ البال شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''یہ ہیں مسٹر آننت رائے، عزت مآب وزیر برائے محکمۂ جنگلات، حکومتِ مغربی بنگال''۔ مسٹر رائے نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ ہلایا۔ تعارف کرانے والے نے پھر ایک دراز قد شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''یہ ہیں ہمارے مشہور اور قابلِ احترام رکن پارلیمنٹ سچند ندا چکرورتی، اور یہ ہیں قابلِ عزت رکن پارلیمنٹ مسٹر اجے مکرجی۔۔۔۔۔۔''۔ اور یوں سب کا تعارف مکمل ہوا۔ مسٹر مکرجی نے اسی شخص کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، ''اور یہ ہیں جانے پہچانے یہاں کے رکن اسمبلی مسٹر بھیم ساہا''۔

اب بھیم ساہا بولے، ''میں تو آپ سب کو جانتا ہوں مگر میرے مہمان آپ سے واقف نہیں۔ اپنا اپنا تعارف کر دیں''۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنا اور دیگر افسروں کا تعارف کرایا۔ رکن اسمبلی نے کمال کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا، ''کیا تم باکل پور کے سب ڈویژنل پولیس آفیسر ہو؟''

''جی سر!''، کمال نے جواب دیا۔

''کیا آپ کو تربیت کے دوران نظم وضبط اور ادب آداب نہیں سکھائے جاتے؟''

''جی! سکھائے جاتے ہیں''۔

''کیا تمہیں سلیوٹ کرنا نہیں سکھایا گیا تھا؟''

''جی سر!''

''وزیر صاحب سے تمہارا تعارف کرایا گیا تو تم نے سلیوٹ کیوں نہیں کیا؟''

''سر! ننگے سر سلیوٹ نہیں کیا جاتا''۔

''تم نے اپنی ٹوپی کیوں اتاری تھی؟''

''سر! کمرے میں بیٹھ کر ایسا کرنا قاعدہ اور دستور کے مطابق ہے''۔

''ایس پی صاحب! کیا آپ کا افسر صحیح کہہ رہا ہے؟''

''جی سر!''، ایس پی نے بڑی تہذیب اور شائستگی سے بتایا، ''کمرے میں بیٹھ کر ٹوپی اتار دینا قاعدہ اور روایت ہے''۔

کمال سمجھ گیا کہ یہ شخص کسی زمانے میں کالج میں استاد تھا اب اسمبلی کا رکن ہے لیکن اس نے کبھی فوج یا پولیس میں تربیت حاصل نہیں کی اس لیے اسے باوردی ملازمتوں کے قواعد وقوانین کا کچھ علم نہیں، لیکن کسی افسر میں خطائیں تلاش کرنے کا یہ طریقہ کتنا گھٹیا ہے۔ سوال پوچھنے میں اس کی جہالت، حماقت اور درشتگی ظاہر ہوگئی تھی، اس پر کمال نے اپنی سبکی محسوس کی۔ اسے ایس پی کی طرف سے دی گئی وضاحت بالکل پسند نہیں آئی۔ اس مرحلہ پر مکرجی صاحب بولے، ''پہلے باہر ہونے والے معاملہ پر گفتگو کر لیں''، اور یوں چکرورتی کو اس صورتِ حال سے نکالا۔ وزیر نے بھی تائید کی اور سارے باہر آگئے۔

ایس پی نے کمال کو ہولے سے کہا، ''دیکھا! سب تمہارے متعلق غیر مطمئن ہیں۔ تم بولنا کیوں شروع ہو گئے تھے؟''

''انہوں نے براہِ راست مجھ سے سوال کیا تھا''۔

''اگر اب کچھ پوچھیں تو جواب دینے سے گریز کرنا''۔

''بہتر سر!''

بھیم ساہانے باہر نکل کر مجمع کے سامنے اعلان کیا،'' ہمارے محبوب وزیر مسٹر آننت رائے آپ کے سامنے کچھ کہنا چاہیں گے''۔

وزیر نے ایک طویل تمہید باندھی،''میں یہاں پولیس کی جابرانہ کارروائی جاننے کے سلسلہ میں آیا ہوں۔ ہماری حکومت کی حکمتِ عملی کے مطابق پولیس کو جمہوری تحریک میں قطعاً دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے، اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو ہم اس کے خلاف سخت ترین کارروائی کریں گے۔ آپ کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے، ہم اس کے مداوا کے لیے آئے ہیں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ اس روز تحریک میں شامل افراد کو پولیس بالکل تنگ نہیں کرے گی (ہجوم نے تالیاں بجائیں)۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ پولیس زمینداروں کی کارندہ اور عامتہ الناس کی دشمن ہے۔ یہ لوگ کانگرس کی حمایت اور ہماری مخالفت کرتے ہیں۔ اگر آپ ان دشمنوں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو سب کو ایکتا کرنی پڑے گی۔ آئندہ سے پولیس آپ لوگوں پر ظلم کرنے کی ہمت نہیں کرے گی اور جو ظلم وستم انہوں نے آپ پر کیا ہے اس کے لیے انہیں جواب دہ ہونا پڑے گا۔ جس افسر کی یہ کارستانی ہے، ہم اسے معاف نہیں کریں گے، ہم اسے سبق سکھائیں گے''۔

ہجوم نے تالیوں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ ایس پی نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے جانب جھکتے ہوئے آہستگی سے کہا،''یہ ناقابلِ برداشت ہے، ایک قسم کی دھمکی ہے''۔ کمال ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا جواب نہ سن سکا۔ ادھر دھمکی آمیز بیان اور ہجوم کی بے پناہ واہ! واہ! جاری رہی۔ تقریر کے بعد وزیر اور دیگر ارکان ہجوم کو مشتعل کر کے اور ان کا ستائشی شور سن کر خود بھی جوش کے نشے میں مخمور کمرے میں واپس آکر فاتحانہ انداز میں اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ''ذمہ دار'' افسر کو دی جانے والی سزا دیکھنے ہجوم کھڑکیوں اور دروازوں میں سے جھانک رہا تھا۔ کمال کو محسوس ہوا کہ جیسے مجرموں کے ایک گروہ نے انہیں اغوا کر کے سخت نگرانی میں رکھا ہوا ہے اور انہیں عبرت ناک سزا دینے کا سوچ رہے ہیں۔ وہ منتظر تھے کہ انہیں کیا سزا سنائی جاتی ہے۔ آننت رائے کے اشارے پر چکرورتی نے کہنا شروع کیا،''ایس پی صاحب! اب تک معلوم ہو چکا ہوگا کہ آپ کو یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔ آپ کے سب ڈویژنل پولیس آفیسر نے مقامی رکن اسمبلی مسٹر رادھے شیام داس کے ساتھ انتہائی بدسلوکی کی ہے۔ اسے لباس تبدیل کیے بغیر ہی رات گئے گھر سے اٹھایا گیا اور ان کی بیٹیوں کے ساتھ ناروا برتاؤ کیا گیا۔ اس نے کئی گھروں پر چھاپے مارے اور لوگوں کو باہر نکال دیا۔ تمہارا جواب کیا ہے؟''

ایس پی نے دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا،''سر! اس قسم کے حالات میں چھاپے مارنے ہی پڑتے ہیں۔ میرے اس افسر نے کسی کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی''۔

'اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟''

''نہیں سر! میرا یہ مطلب نہیں۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ یہ نوجوان ہے، تعلیم یافتہ ہے، یونیورسٹی کے فوراً بعد اس نے پولیس سروس میں شمولیت کی ہے اور موجودہ تعیناتی اس کی ابتدا ہے۔ اس کی تعیناتی کو صرف ایک ہفتہ ہی ہوا ہے اس لیے یہاں اس کا کوئی دوست یا دشمن نہیں لہٰذا بدتمیزی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی''۔

''اب میں سمجھا، سب ڈویژنل افسر کو اتنی ہمت کیسے ہوئی۔ تمہیں تو اس کا اعلیٰ افسر ہونے کی بجائے اس کا ماتحت ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھو کہ تم یہاں اس افسر کے لیے نہیں آئے ہو بلکہ تمہاری ذمہ داری عام لوگوں کی فلاح اور دیکھ بھال ہے۔ تمہیں بنگلہ اور گاڑی اسی مقصد کے لیے دی ہوئی ہے۔ تمہیں اختیارات ملے ہوئے ہیں، جب تمہارا یہ افسر لوگوں پر ظلم کر رہا تھا، تم ایک بار بھی ادھر نہیں آئے۔ کیا تم آئے تھے؟''

ایس پی کے ساتھ اتنے غلط رویئے پر کمال کو بہت افسوس ہوا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس، ڈی، او بالکل لاپروا بیٹھے تھے۔ ایس پی نے بھی مارے دکھ کے اپنا سر نیچے کر لیا۔ رکن پارلیمنٹ مسٹر کنہیا لال دت بولے، ''ہمارے دورِ حکومت میں یہ ناقابلِ برداشت ہے کہ پولیس یوں جا کر لوگوں پر ظلم کرے''۔

ایس پی نے وضاحت کی کوشش کی، ''ہراساں کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دشمنی میں تو ہراساں کرنے کا جواز بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس نے تو ابھی چند روز پہلے یہاں ذمہ داری سنبھالی ہے۔ اس کی کسی کے ساتھ پرخاش نہیں تو کیوں کسی کو ہراساں کرے گا؟''

''صرف تمہارا یہ افسر ہی بتائے کہ لوگوں کو ہراساں کیوں کیا گیا تھا''۔ رکن پارلیمنٹ مسٹر مکر جی بولے، ''جمہوری احتجاج میں پولیس کی دراندازی ہماری حکومت کی پالیسی نہیں۔ تمہارے اس پولیس آفیسر کو ہماری پالیسی سے اتفاق نہیں۔ کیا یہ سمجھتا ہے کہ کسی کو بھی تنگ کر سکتا ہے؟ ہم آسانی سے معاف نہیں کریں گے''۔

کمال کے دل میں آئی کہ انہیں بتائے کسی کے گھر میں گھس کر ایک شخص کو باہر نکالنا، قتل کرنا اور قریب المرگ کے منہ میں پیشاب کرنا اور عورتوں کو برہنہ کر کے ان کی عزت پامال کرنا جمہوری احتجاج نہیں لیکن سامنے بیٹھے یا تو جمہوریت کے مفہوم سے ناآشنا تھے یا ایک قانون پسند افسر کو سزا دینے اور لاقانونیت کے مرتکب لوگوں کے جرم کی جان بوجھ کر پردہ پوشی کر رہے تھے۔ مگر وہ بول نہ سکا۔ ایس پی کی حالت دیکھ کر کنہیا لال دت کو مزید حوصلہ ہوا، کہنے لگا، ''تمہارے افسر نے فرقہ واریت حلقوں کے ساتھ ساز باز کر رکھی ہے''۔

کمال کو دھچکا لگا کیونکہ اسکول ہی کے زمانے سے وہ سیکولر خیالات کا حامل تھا۔ اس کے سخت ترین دشمن نے بھی اس پر فرقہ وارانہ سوچ کا الزام نہیں لگایا تھا۔ وہ کنہیا لال کے الزام پر اس سے ثبوت مانگنا چاہتا تھا مگر اس کے افسر چپ تھے۔ اتنے میں امر مکر جی نے ایس پی کو کہا، ''تمہارے افسر نے کانگرس سے ساز باز کر کے لوگوں کو ہراساں کیا ہے۔ اپنے دماغ سے یہ بات مت نکالو کہ یہ کانگرس کی حکومت نہیں۔ قاعدے قانون بدل چکے ہیں''۔ یہ الفاظ اس نے نعرہ مارنے کے انداز میں کہے۔ کمال کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا لیکن جیسے ہی اس نے بولنے کی کوشش کی، ایس پی نے اس کا ہاتھ دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کی خاموشی پر بھیم ساہا حوصلہ پا کر کہنے لگا، ''نہ صرف کانگرس بلکہ اس کے ایک سابقہ او، سی کے ساتھ بھی تعلقات ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق یہ اس سے ملتا جلتا رہتا ہے۔ ہم نے اسے نکال دیا تھا، اب اس کی باری ہے''۔

اب تو کمال بالکل ضبط نہ کر سکا۔ اس نے ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے ہولے سے کہا، ''سر! آپ بات کریں گے یا مجھے بولنے کی اجازت ہے؟'' ایس پی نے پھر اس کا ہاتھ دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وزیر نے کمال سے پوچھا، ''تم کس کیڈر سے ہو؟'' کمال نے طیش میں جواب دیا، ''مغربی بنگال کیڈر، ورنہ مجھے یہاں تعینات کیوں کیا جاتا؟'' ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پریشان ہو کر کمال سے کہنے لگا، ''کیڈر سے ان کا مطلب ہے جائے پیدائش۔ سر! یہ مغربی بنگال ہی سے ہے، ساتھ والے ضلع سے''۔

''مغربی بنگال؟ لیکن اس کا مزاج اس قدر تیز کیوں ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ شمالی ہندوستان کے لوگ تند مزاج کے ہیں''۔

یہ سن کر اودھے اپادھیائے کی حالت کیا ہوئی ہوگی، بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا تعلق یو پی سے تھا، لیکن وہ چپ رہا۔ باقی دونوں افسران بھی کچھ نہ بولے مگر کمال کہنے لگا، ''آپ نے مجھ میں کیا شدت پسندی دیکھی ہے؟''

امت مکر جی کو تو جیسے آگ لگ گئی، ''شدت پسندی تم نے چھوڑی ہی کیا ہے؟ تم نے حکومتی رکن اسمبلی کے ساتھ انتہائی توہین آمیز سلوک کیا ہے''۔

کمال نے مہذب انداز میں پوچھا، "کیا یہ الزام انہوں نے لگایا ہے کہ میں نے ان کے ساتھ بدتمیزی کی تھی؟"
چکرورتی صاحب بھی بول اٹھے، "یہ کیا کہہ سکتے ہیں۔تم نے عدالت پر اثر انداز ہو کر حکم حاصل کیا کہ یہ اپنے ہی علاقے میں داخل نہیں ہو سکتے"۔
بات ختم ہوتے ہی امر مکرجی نے کہا، "تم نے آدھی رات کو ان کی بیٹیوں کے ساتھ بھی بدتمیزی کی"۔
ایس پی نے کمال کو بولنے سے منع کیا مگر وہ کہنے لگا، "ایم پی صاحب کی بیوی اس وقت موجود تھی کیا انہوں نے کوئی ایسی شکایت کی؟"
"ہم یہاں تمہارے سوالوں کا جواب دینے نہیں آئے،تم سے پوچھ تاچھ کرنے آئے ہیں"، مکرجی اونچی آواز سے چلائے۔
"اس صورتِ حال میں میں آپ کے سوالوں کا جواب دینے کا پابند نہیں"۔
"چکرورتی نے گلا پھاڑتے ہوئے کہا، "تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے تم جیسے بڑے افسر دیکھے ہیں،تم تو بالکل معمولی سے آدمی ہو۔تمہیں یہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی کہ تم میرے سوالوں کا جواب دینے کے پابند نہیں ہو؟"
ایس پی ایک طرف کمال کو چپ کرانے کی اور دوسری جانب ان لوگوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔اس نے کہا، "بالکل سر!سب کو علم ہے کہ حفظِ مراتب (protocol) میں قانون ساز اسمبلیوں کے اراکین کا رتبہ سرکاری ملازمین سے برتر ہے۔سر!اس میں تو کوئی شک و شبہ نہیں"۔
"اپنے اس افسر کو بھی سمجھاؤ"، اور کمال کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، "قانون کا مطالعہ کرو۔سمجھ گئے؟"
"سر!میں نے قانون کا مطالعہ کیا ہے۔آپ اسمبلی کے رکن ہیں۔آپ اتنے بااختیار ہیں کہ پارلیمنٹ سے قانون سازی کر کے وزیر سے بھی جواب طلبی کر سکتے ہیں کہ وہ حکومت کیسے چلاتے ہیں۔قانون مجھ سے جواب طلبی کی آپ کو اجازت نہیں دیتا"۔
یہ جواب سن کر تو چکرورتی سٹپٹا کر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ آیا نہیں کوئی ایسا اختیار تفویض ہوا بھی ہے یا نہیں۔
صورتِ حال کو سنبھالا دینے کے لیے مکرجی نے کہا، "صرف اسمبلی کے اراکین ہی نہیں بلکہ حکومتِ بنگال کے قابلِ احترام وزیر صاحب بھی یہیں موجود ہیں"۔
"لیکن ان کے پاس بھی کوئی ایسا اختیار نہیں کیونکہ وہ جنگلات کے وزیر ہیں،وزیرِ داخلہ نہیں۔اُس صورت میں بھی جواب طلبی کا طریق کار واضح ہے"۔
اب تو انکوائری ٹیم کا پارہ اوپر چڑھ گیا۔چکرورتی تو بالکل ہی آپے سے باہر تھا۔کہنے لگا، "یہ اراکینِ اسمبلی شاید بیکار لوگ ہیں ورنہ پولیس آدھی رات کو ان کے گھروں پر چھاپے نہ مارتی۔اگر میرا گھر ہوتا تو میں انہیں سبق سکھا دیتا"، اور کمال کی طرف مڑتے ہوئے مزید کہا، "میرے پاس لائسنس والا ریوالور ہے۔اگر تم نصف شب کو میرے گھر داخل ہوئے اور میں تمہیں گولی مار دوں،تب کیا کر لو گے؟"
کمال نے بڑے سکون سے جواب دیا، "اگر میں پہلی ہی گولی پر مر جاؤں تو کیا کر سکتا ہوں،اور اگر بچ گیا تو آپ کو گرفتار کر کے ساری رات لاک اپ میں رکھ کر عدالت کے سامنے پیش کر دوں گا"۔
اس پر تو تمام لوگ مارے طیش کے اچھلنے لگے۔سب کا خیال تھا اب مزید گفتگو فضول ہے۔کون کیا کہہ رہا ہے؟اس کا تعین بے سود تھا۔وزیر متواتر کہے جا رہا تھا، "انہیں کہو یہاں سے چلے جائیں"، اس پر بھیم ساہا نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو

کہا،''مہربانی سے آپ لوگ جائیں''۔سوائے ڈی ایم کے باقی باہر نکل گئے،لیکن وہ بھی جلد ہی باہر آ گیا۔ایس پی بڑبڑایا،''یہ اذیت ناک ہے،انتہائی توہین آمیز''۔ڈی ایم خاموش رہا مگر کمال نے رائے کا اظہار کیا،''انہوں نے ہماری توہین کی ہی اس وجہ سے ہے کہ ہم نے شروع ہی میں احتجاج نہیں کیا تھا''۔

''ہماری بات سنی نہیں جاتی مگر ان کی باتوں کو غور سے سنا جاتا ہے۔کیا تم جانتے ہو بھیم ساہا نے وزیرِ داخلہ کو کیا کہا تھا؟اس نے کہا تھا،''کیا حکومت ہماری ہے یا ہم ابھی تک اپوزیشن میں ہیں؟''میں بحث وتکرار سے گریز کرنا چاہتا تھا۔اگر تم بحث نہ بھی کرتے تو شاید تمہیں پھر بھی یہاں سے تبدیل کر دیا جاتا۔اب وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔بھیم ساہا کہے گا،'وہ آپ جیسے لوگوں کے ساتھ بدتمیزی کرسکتا ہے تو عام لوگوں کے ساتھ کیا کرتا ہوگا'۔میں اس سے بچنا چاہتا تھا''۔کمال نے بھی ان باتوں سے اتفاق کیا۔کوئی کچھ نہ بولا اور وہ اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف چلے گئے۔

باہر ہجوم تذبذب میں تھا۔وہ سارے یہ سوچ کر آئے تھے کہ آج پولیس کی کھچائی ہوگی۔شروعات تو ان کی توقع کے مطابق ہوئی لیکن اختتام نیتاؤں کے دعووں جیسا نہیں ہوا۔کمال نے معذرت تک نہیں کی، الٹا دارالحکومت سے آئے بڑے بڑے لوگوں کو لتاڑ کر چلا گیا ہے۔پنچائت کے دفتر میں آج ہونے والے منظر نے کمال کو بہت زیادہ تکلیف پہنچائی تھی۔مقصد بڑا واضح تھا کہ اسے ڈرایا دھمکایا جائے،تاہم اسے میٹنگ کے اس طرح ناخوشگوار انداز میں ختم ہونے پر افسوس نہیں ہوا کیونکہ اس نے کم از کم اپنا نقطۂ نظر بیان کر دیا تھا،اور ایسا کرنا ضروری بھی تھا۔اس سے کوئی غیر قانونی کام نہیں ہوا لہٰذا زیادہ سے زیادہ اس کی تبدیلی ہی ہوسکتی ہے۔وہ نہ تو ان لوگوں کے غیر قانونی احکام بجالانے،نہ صحیح کام کرنے سے باز آنے پر تیار تھا۔اس کا عہد ملک اور اہلِ وطن کے ساتھ تھا،کسی سیاسی جماعت کے ساتھ نہیں۔

....

کمال شام گئے واپس دفتر پہنچا۔اخباری نمائندے اس کے منتظر تھے۔وہ باجماعت اس کے کمرے میں داخل ہوئے اور آج کی کارروائی پر اس کے خیالات جاننا چاہتے تھے۔کمال نے کہا کہ''یا تو اعلیٰ افسر خود ہی انہیں حالات سے آگاہ کریں گے یا پھر ان کی طرف سے اجازت ملنے پر وہ کچھ بتانے کا اہل ہے۔ایس پی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دونوں میٹنگ میں موجود تھے،اگر آپ کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو اس سے رابطہ کریں''۔اخباری نمائندوں نے اس کی جان نہ چھوڑی کہ میٹنگ کا وقت،شرکا کے نام اور اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہی بتادی جائیں۔بہر حال،اس نے بڑی مشکل سے اپنا پیچھا چھڑایا۔جب وہ دفتر سے نکلا،اندھیرا چھاچکا تھا۔آج کے توہین آمیز سلوک پر وہ اندر سے ریزہ ریزہ ہوگیا تھا لیکن صبح والی بے چین کیفیت سے نجات مل گئی تھی کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا اب کیا ہوگا۔چہل قدمی کے بعد وہ گھر چلا گیا۔

اگلی صبح اسے تبادلے کا حکم نامہ مل گیا جو سرکاری زبان میں''معمول کی کارروائی اور مفادِ عامہ میں'' بتایا گیا تھا۔وہ اخباری نمائندوں کے ان سوالات کا جواب نہ دے سکا کہ تعیناتی کے ایک مہینے بعد ہی تبادلہ ہوجانا''معمول کی کارروائی'' کیسے؟اور پھر جہاں اسے بھیجا جا رہا تھا،یعنی اسسٹنٹ کمانڈنٹ،ای،ایف،آر بٹالین،وہاں تو گذشتہ سات سال سے کسی کی تعیناتی نہیں ہوئی تھی،اگر یہ تبادلہ مفادِ عامہ میں ہے تو سات برسوں سے وہ عہدہ خالی کیوں رکھا گیا؟اور اگر اسے بھیجنا ضروری ہے تو ایک ماہ قبل ایسا فیصلہ کیوں نہ کیا گیا؟

کمال کے ماتحتوں نے اسے ہائی کورٹ جانے کا مشورہ دیا۔اسے خود بھی یقین تھا کہ ہائی کورٹ سے حکمِ امتناعی مل سکتا ہے،لیکن فائدہ کیا ہوگا؟کچھ عرصہ بعد اس کا تبادلہ کر دیا جائے گا،اور اگر یہاں رہے تو دو سال بعد ترقی ہونے پر اسے کہیں اور جانا ہی پڑتا،اس دوران زخم خوردہ سیاسی جماعتیں کوئی نہ کوئی مسئلہ بنائے رکھتیں۔اس نے کسی فریق کے مفاد یا مخالفت کو ذہن

میں رکھے بغیر واقعہ کی غیر جانبدارانہ تفتیش کی تھی، کیونکہ یہ اس کا فرض تھا۔ رکن اسمبلی اور دیگر لوگوں کی گرفتاری شواہد اور ثبوتوں کی بنا پر ہوئی تھی لیکن برسرِ اقتدار جماعت اور حزبِ اختلاف دونوں نے خوامخواہ شور مچا دیا۔ اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ یہاں عام لوگوں اور بااثر افراد کے لیے الگ الگ قوانین ہیں، نہ کبھی ایسا پڑھایا گیا تھا مگر راہول جیسے لوگوں کو اس حقیقت کا ادراک تھا۔ لہٰذا یہاں سے جلد از جلد رخصت ہو جانا بہتر ہے۔

اسی اثنا میں فون کی گھنٹی بجی۔ ایس پی نے اسے ڈی، آئی، جی کا پیغام دیا کہ کمال عدالت جانے سے گریز کرے، اور یہ کہ فوری طور پر چارج چھوڑ دے۔ انہوں نے یقین دہانی کرائی ہے کہ تین ماہ کے اندر اندر کمال کو کہیں اور سب ڈویژنل پولیس آفیسر تعینات کر دیا جائے گا۔ اسے اپنے کانوں سنی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایک تو اسے بے قصور یہاں سے نکال دیا گیا اور اب اس کو قانونی راستہ اختیار کرنے سے بھی منع کیا جا رہا ہے۔ اس نے ایس پی کو جواب دیا، ''سر! میں تو پہلے ہی سے چارج چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا ہوں، اگر اس طریقے سے حکم دیا جا رہا ہے تو پھر میں چارج نہیں چھوڑوں گا۔ ڈی، آئی، جی صاحب اگر میرا تبادلہ روک نہیں سکے تو کس برتے پر مجھے تین مہینوں کے اندر نئی جگہ تعیناتی کا یقین دلا رہے ہیں؟''

ایس پی نے کہا، ''مجھے خود بھی ان کی یقین دہانی کی سمجھ نہیں آئی۔ شاید وہ اپنے سیاسی آقا کو خوش کرنا چاہتے ہیں''۔

''سر! آپ کا کیا مشورہ ہے؟''

''مجھے مشورہ دینے کا کوئی اخلاقی حق نہیں۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا''۔

''بہتر سر! میں آپ کے لیے پریشانی پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ میں چارج چھوڑ رہا ہوں''۔ اور کمال چارج چھوڑ کر گھر چلا گیا۔

اسے لوگوں کے متعدد سوالوں کا سامنا کرنا پڑا مگر اس نے کسی کا جواب نہ دیا۔ اُتر پاڑا میں اس کی ملاقات علی ملا سے ہوئی۔ اس نے بھی تبادلے کا پس منظر جاننا چاہا۔ کمال نے اسے سب کچھ بتا دیا جس پر اس نے کہا، ''یہ وہی جماعت ہے نا جس کی خاطر تم ہم سے لڑتے تھے؟ پارٹی رہنماؤں کی فطرت کا اندازہ لگاؤ۔ میں نے تمہیں بہت پہلے آگاہ کر دیا تھا مگر تم سنتے ہی نہیں تھے''۔

ہائی اسکول میں اپنے استاد عبدالعلی کی تحریک پر اس نے کمیونسٹ پارٹی (مارکسزم) میں شمولیت اختیار کی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ یہ جماعت غریبوں کی بھلائی کی خواہاں ہے۔ اس کے والدین سمیت بہت سے لوگ جماعت میں شامل ہو گئے تھے مگر علی ملا اور چند دیگر افراد بدستور کانگرس کی حمایت کرتے رہے۔ کمال اور اس کے ساتھیوں نے انہیں بھی کمیونسٹ پارٹی میں لانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے، بلکہ وہ کمال کو سمجھاتے تھے کہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر صرف زبانی کلامی غریبوں کی بات کرتے ہیں، ان کا مطمعِ نظر اقتدار اور دولت کا حصول ہے۔ علی ملا نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

گھر میں بھی کمال کو انہی سوالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ماں کو اس کی سلامتی کی فکر تھی۔ اس نے کمال کو ایک لفافہ دیا جس میں سنگیتا کا خط تھا۔ اس کے الفاظ تھے:

''منڈل صاحب!

باکل پور پہنچنے پر آپ کا خط موصول ہوا لیکن مجھے علم نہیں کہ آج کل آپ کہاں ہیں اسی لئے گاؤں کے پتہ پر بھیج رہی ہوں۔ اخبار میں آئی خبروں کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ جس روز آپ کا خط ملا اسی دن اخبارات میں خبر شائع ہوئی تھی کہ پانچ چھے ہزار لوگوں کے ایک بے قابو ہجوم نے رکن اسمبلی کی قیادت میں کانگرس کے حمایتی لوگوں کے گاؤں پر حملہ کیا، گھروں میں توڑ پھوڑ کی، عورتوں کی بے حرمتی کی گئی، لوگوں کو قتل کیا اور شدید زخمی، حتیٰ کہ مقتولین کے منہ میں پیشاب بھی کیا۔ خبر پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں سوال اٹھا، ''ہم کہاں زندگی بسر کر رہے ہیں، وحشیانہ دور میں یا جدید مہذب دنیا میں؟'' دو دن بعد پڑھا کہ

شر پسندوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے، سوچا، چلو انہیں انصاف کے کٹہرے میں تولا یا گیا ہے۔ دو دن گزرے ہوں گے کہ رکن اسمبلی اور رکن پارلیمنٹ کے بیٹے کی گرفتاری کی وجہ سے آپ کے تبادلے کی خبر سن لی۔

آپ نے اپنے خط میں جو لکھا ہے وہ مغربی معاشروں میں ٹھیک ہے۔ وہاں شادی لڑکی لڑکے کے درمیان ذاتی معاملہ ہے لیکن ہمارے یہاں دو خاندانوں کے درمیان تعلقات کی بات ہے، اس لیے خاندان کا کردار اہم ہے۔ اگر آپ میرا انتظار کر سکتے ہیں تو میں گھر والوں کو قائل کرنے کی کوشش کروں گی، لیکن ان کی رضامندی کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ میرے پتا روشن خیال اور آپکے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری بات مان لیں گے مگر معاملہ الٹ ہو گیا ہے۔

آپ کی خوشی کی متمنی،

ہمیشہ آپ کی،

سنگیتا''

کمال کو مسرت ہوئی کہ سنگیتا اس کے بارے میں کتنی متفکر ہے لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ خط کے آخر میں وہ کہنا کیا چاہتی ہے۔ اتنے میں ناظم آ گیا جو اس سے چند برس بڑا تھا۔ وہ بھی علی صاحب کی تحریک پر کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو کر اب مقامی کمیٹی کا رکن بن گیا تھا۔ اس کے پوچھنے پر کمال نے ساری روداد سنائی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر کچھ توقف کے بعد کہنے لگا،''علی صاحب براہی آئے ہوئے ہیں، وہ تم سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں''۔

''کیا بات؟''

''یہ تو مجھے علم نہیں۔ انہوں نے مجھے پیغام پہنچانے کو کہا تھا۔ اگر تم انہیں پارٹی کے دفتر میں نہیں ملنا چاہتے تو ان کے گھر پر مل لینا''۔

کمال شام کو علی صاحب کے گھر گیا۔ انہوں نے ساری بات سننے کے بعد پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا،''ساری خطا میری ہے۔ مجھے چاہیے تھا کہ تمہارے بارے میں پارٹی کو پہلے ہی بتا دیتا۔ تم پارٹی سیکرٹری مسٹر براج مکرجی سے کیوں ملاقات نہیں کرتے؟''

''سر! میں ان سے ملاقات کیوں کروں؟ میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور جو کچھ بھی کیا، ایمانداری اور غیر جانبداری سے کیا تھا''۔

''تمہارے ایماندار رہنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن غیر جانبدار کیسے رہ سکتے ہو؟ کیا ہم غیر جانبدار ہیں؟ نہیں۔ پھر تم ہمارے ہی ماتحت کام کر کے غیر جانبداری کیسے قائم رکھ سکتے ہو؟ بالکل نہیں رکھ سکتے، اور اگر کوشش کرو گے تو تمہیں کسی کونے کھدرے میں پھینک دیا جائے گا''۔

کمال کو اپنے سابقہ استاد اور موجودہ وزیر کی صاف گوئی پر خوشی ہوئی لیکن برسرِ اقتدار لوگوں کی کھلم کھلا منافقت پر افسوس بھی ہوا۔ وہ پارٹی کے اصولوں کی عزت کر سکتا ہے مگر بدعنوان انتظامیہ کی نہیں، اس لیے وہ اپنی راہ میں حائل مشکلات کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔

....

کمال نے جیپ میں اپنا سامان رکھا۔ اب اسے نئی تعیناتی کی جگہ 'سلاجنا' پہنچنا تھا۔ سورج روز ایسے ہی طلوع ہو گا، پھول کھلتے رہیں گے، تتلیاں ایک پھول سے دوسرے پر اڑتی بیٹھتی رہیں گی، بادِ صبا یونہی چلے گی، لیکن کل سے وہ یہ سب کچھ نہیں

دیکھ پائے گا۔ اس کی جگہ کوئی اور لے لے گا۔ اسے دکھ سا ہوا۔ پتہ نہیں کسی جگہ، شخص یا چیز سے جدا ہوتے ہوئے وہ اتنی تکلیف کیوں محسوس کرتا تھا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف ڈاکٹر حسین تھا: ''آپ کب جا رہے ہیں؟''

''میں بس نکلنے ہی والا ہوں''۔

''آپ نے ہمارے ہاں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا آپ یہاں سے ہوتے ہوئے جا سکتے ہیں؟''

''ٹھیک ہے''۔

اس نے ڈرائیور کو اسپتال جانے کو کہا۔ ڈاکٹر حسین اسے اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ رینا اور ڈمی بھاگتے ہوئے آئے۔ مینا سفید ساڑھی میں ملبوس اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ مسز حسین نے شکایت آمیز لہجے میں کہا: ''ہماری بڑی بیٹی مینا، دیکھیں کتنی دبلی ہو گئی ہے۔ سوائے ساگو دانہ اور کچھ کھاتی بھی نہیں''۔ مینا نے بظاہر ناپسندیدگی کا اظہار کیا: ''ماں۔۔۔!''

ماں نے الٹا اس سے پوچھا: ''اگر میں انہیں بتا دوں تو کیا نقصان ہے؟ تم نے کھانا پینا کیوں چھوڑا ہوا ہے؟''

مینا اندر چلی گئی، اور ماں اس کی شکایتیں کرنے لگی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی باور کرانے کی کوشش کر رہی تھی کہ دبلا ہونا قابلِ اعتراض چیز نہیں: ''شادی کے وقت ڈاکٹر صاحب بھی بہت دبلے تھے، بعد میں ٹھیک ہو گئے۔ میں تو کہتی ہوں آج کل دبلے پن اور چھریرے بدن کی بہت قدر کی جاتی ہے''۔

کمال بھاری بھر کم عورتوں اور مردوں کو پسند نہیں کرتا تھا، وہ خود بھی دبلا پتلا ہونے کا خواہشمند تھا، لیکن اس وقت وہ خود کو مجبور محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سنگیتا سے شادی کی بات شروع کی ہوئی تھی۔ موضوعِ گفتگو کو کوئی اور رنگ دینے کے لیے اس نے رینا کو مخاطب کیا: ''میں تمہارے گھر آیا ہوں، اب کوئی گیت سناؤ''۔

''پہلے دیدی''، رینا نے کہا۔

''نہیں، پہلے تم''۔

اس نے مینا کی جانب دیکھا گویا کہ اس سے مدد مانگ رہی ہو، مگر وہ آگے نہ آئی۔ رینا نے ہارمونیم پکڑا اور ٹیگور کا گیت سنانے لگی: ''رین بیت گئی، نیند روٹھ گئی''۔ کئی بار وہ بے سُر ہوئی مگر کمال اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہا: ''تم اچھا گا لیتی ہو، گایا کرو''۔

اس نے گیت ختم کیا اور بولی: ''اب دیدی کی باری''۔ کمال نے تائید کی۔ مینا پہلے تو راضی نہ ہوئی لیکن ماں کے اصرار پر اس نے گٹار تھاما اور باغی شاعر قاضی نذرالاسلام کے گیت کی دھن چھیڑی: ''کون ہے وہ سانورا جس کی گھنٹیوں کی جھنکار اور بانسری کی تانوں نے مجھے جیون دیا ہے؟'' گٹار کی ٹوٹتی لے سے کمال کو اندازہ ہوا کہ مینا ہنوز نو آموز ہے۔ اس نے ختم کیا تو رینا نے کمال سے کچھ سنانے کی فرمائش کی مگر اس نے رینا ہی کے تیر کو اس کی طرف پھینک دیا: ''تم اپنے ہی اصول کے خلاف نہیں جا سکتی ہو''۔

''وہ کیا؟''

''میں تمہارے گھر آیا ہوں اس لیے تم گاؤ گی۔ جب تم میرے گھر آؤ گی پھر میں گاؤں گا''۔

''آپ تو بالکل پور چھوڑ کر جا رہے ہیں، میں کیسے آؤں گی؟''

''جہاں میں جا رہا ہوں وہاں آ جانا''۔

''مجھے جگہ کا پتہ نہیں''۔

''گاڑی یا بس والوں کو علم ہے، انہیں بتا دینا''۔

رینا ہنسنے لگی، ''اچھا جائیں، وہاں پہنچ کر ہمیں لکھیے گا ضرور''۔

....

فرسٹ بٹالین، ایسٹرن فرنٹیئر رائفل کا ہیڈ کوارٹر۔ طویل عرصہ سے وہاں کسی کی تعیناتی نہ ہونے سے اس کے لیے دفتر بھی نہیں تھا، لہٰذا اس کے بیٹھنے کی خاطر ایک میز اور دو چار کرسیاں وہیں کہیں رکھ دی گئیں۔ کام کاج تھا کوئی نہیں۔ صحن صاف ستھرا تھا۔ پریڈ گراؤنڈ نزدیک ہی تھی۔ اس کی رہائش گاہ بری حالت میں تھی۔ اصل میں جہاز کے ہینگر میں جونیئر افسروں کے رہنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

کمال بٹالین کی تاریخ اور اصولوں اور ضابطوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے فرنٹیئر رائفل کا سن کر اسے مرکزی حکومت کا ایک نیم فوجی محکمہ سمجھا جبکہ حقیقت میں یہ ریاست بنگال کی عملداری میں تھا۔ 1909 میں بنگال حکومت نے سودیشی تحریک اور بائیکاٹ کے احتجاج کو روکنے کے لیے اس بٹالین کی بنیاد رکھی تھی۔ چونکہ اس کے قیام کا مقصد بنگالیوں کے احتجاج کو روکنا تھا اس لیے کچھ گورکھوں اور آسامیوں کے علاوہ کوئی بنگالی اس میں ملازمت کا اہل نہیں تھا۔ اس پر ابھی تک عمل کیا جا رہا تھا۔ کمال کے خیال میں عوام اور خود حکومت بھی اس سے لاعلم تھی ورنہ اسے ختم کر دیا جاتا۔ کمال نے کمانڈنٹ نیک گھوش کو مشورہ دیا کہ حکومت کی توجہ اس جانب دلائی جائے مگر اس نے اعتراض کرتے ہوئے کہا، ''کیا تمہارے خیال میں حکومت کو علم نہیں؟ یہ تمہارا فرض نہیں، تم اپنا کام کرو''۔

انڈین پولیس سروس کے افسروں کو بالعموم کسی بٹالین میں تعینات نہیں کیا جاتا۔ کمال کی یہاں تعیناتی کا سبب حالیہ واقعہ کے بعد ضلعی انتظامیہ میں اسے ایک ناپسندیدہ افسر سمجھا گیا اور سرکار میں مستعمل غیر سرکاری زبان میں اسے کھڈے لائن لگانا مقصود تھا۔ چونکہ وہ برسرِ اقتدار جماعت کی نظروں سے گر چکا تھا اس لیے اسے اچھی جگہ تعینات کرنا اتنا اہم نہیں رہا۔ کمانڈنٹ کا رویہ بھی کمال کو ناگوار گزرتا۔ بہر حال اس نے سوچا کہ اہلِ اقتدار جہاں چاہیں تعینات کر دیں، اسے اپنے اصولوں کے مطابق چلنا چاہیے۔ یہاں تعینات کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کی نظروں میں ناکارہ اور نکما ہے، یہ بات اسے قبول نہیں تھی، اسی وجہ سے اس کے ماتحت اسے عدالت میں جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ اگر اسے ان حالات کا علم ہوتا تو اپنے فیصلے پر ضرور غور کرتا۔

اب چونکہ وہ یہاں آ گیا تھا اس لیے اپنا کام صحیح طریقے سے کرنا چاہیے۔ اسے معلوم ہوا کہ تقسیمِ ہند کے وقت بٹالین نے اپنی مرضی کے مطابق مغربی بنگال میں رہنے کا انتخاب کیا تھا اور اسے عارضی طور پر ہگلی جیل کے میدان میں جگہ ملی تھی، پھر اسے سلاجنا منتقل کر دیا گیا جو بنجر اور بے آباد علاقہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں یہاں امریکہ نے جاپان کا مقابلہ کرنے کے لیے جہازوں کا ایک ہینگر تعمیر کیا تھا۔ یہ بھی افواہ مشہور تھی کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم مارنے والے جہاز اسی ہوائی اڈے پر رک کر گئے تھے۔ اس میں کوئی حقیقت تھی یا نہیں مگر یہ سچ تھا کہ جاپان پر ہوائی حملوں میں اس اڈے کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ جنگ کے بعد ہوائی اڈے کو خالی کر دیا گیا اور تب سے ہینگر اور رن وے استعمال میں نہیں آئے۔ اب وہ بٹالین کی جائے قیام تھی۔

بٹالین کی تاریخ بڑی شاندار تھی۔ اس نے ملک کے اندر بدامنی روکنے کے علاوہ پہلی جنگِ عظیم میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک فوجی افسر یہاں کمانڈنٹ اور ڈپٹی کمانڈنٹ کی حیثیت سے تعینات ہوا کرتے تھے، بعد ازاں پولیس افسروں کو تعینات کیا جانے لگا۔ پہلے یہاں صرف ایک ہی بٹالین تھی مگر بعد میں ایک اور کا قیام وجود میں آیا۔ تیسری بٹالین کے لیے بھی کام ہو رہا تھا۔

تعیناتی کے پہلے ہی دن اس نے اخبار میں خبر دیکھی کہ ریاست کے وزیر داخلہ، جو وزیر اعلیٰ بھی تھے، نے اسمبلی میں کہا کہ ''سابق ایس، ڈی، پی، او، باکل پور، مسٹر کمال منڈل نے مقامی رکن اسمبلی کو غیر قانونی طور پر آدھی رات کے وقت گرفتار

کیا، انہیں کپڑے بدلنے کی اجازت نہیں دی، اس کے گھر میں داخل ہو کر اس کی بیٹیوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔۔۔۔۔"۔

کمال کے لیے یہ ناقابلِ برداشت تھا۔ رکن اسمبلی کی گرفتاری عدالت سے اجازت ملنے کے بعد ہوئی لہٰذا یہ غیر قانونی کارروائی نہیں تھی۔ پھر اس کے گھر پر چھاپہ بھی قانون کے مطابق تھا۔ جن چیزوں کو اپنی تحویل میں لیا گیا اس کی فہرست بنا کر رکن اسمبلی کی بیوی سے دستخط لیے گئے تھے، یہ سب کچھ غیر قانونی کیسے ہوا؟ وزیرِ اعلیٰ ان سب اقدامات کو غیر قانونی کیسے کہہ سکتا ہے؟ اسمبلی کے سامنے دروغ گوئی پر اسے سزا ہونی چاہیے۔ اس نے وزیرِ اعلیٰ کے نام ایک درخواست میں تمام حقائق تحریر کرنے کے بعد لکھا کہ مجھے اپنی پوزیشن واضح کرنے کی اجازت دی جائے۔ ایک نقل براہِ راست اور دوسری محکمہ کی وساطت سے سرکاری طور پر بھیج دی۔

بٹالین میں کمال کی تعیناتی کا آغاز اس کشیدہ ذہنی سے ہوا جو اسے بالکل اچھا نہ لگا تاہم اس نے خوامخواہ کی محاذ آرائی سے بچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا کیونکہ وہاں کے کچھ افسروں کا انداز اور رویہ اس کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ تعیناتی کے ایک ہفتہ بعد وہاں کا اکاؤنٹنٹ کمل کر اس سے چند بلوں پر دستخط کرانے آیا۔ کمال نے اس سے گاڑیوں کے استعمال اور ان کی مرمت کی تفصیل مانگی۔ کمل کرنے جواب دیا، "سر! ہم نے ہر چیز دیکھ لی ہوئی ہے"۔

"اگر میں بھی ایک نظر دیکھ لوں تو کیا حرج ہے؟"، کمال نے پوچھا۔

"سر! فرق تو کچھ نہیں پڑتا لیکن یہ یہاں کا دستور نہیں ہے۔ ہم سب کچھ دیکھ کر ہی افسروں سے دستخط کراتے ہیں، اور وہ کر بھی دیتے ہیں۔ ہمارا کام بالکل صحیح ہے"۔

"یقیناً۔ تم تجربہ کار لوگ ہو مگر گاڑیوں کی مرمت اور استعمال کا رجسٹر دکھاؤ"۔

"سر میں MTO کو کہہ دیتا ہوں"۔

اور جب MTO نے ریکارڈ دکھایا تو اس میں بہت سی غلطیاں پائی گئیں۔ مثلاً، ایک جیپ بارہ سے اکیس دسمبر کے دوران ڈی، آئی، جی کے زیرِ استعمال دکھائی گئی اور وہی جیپ کسی اور شہر میں پندرہ تاریخ کو بغرضِ مرمت درج تھی۔ کمال نے اس تضاد کی وضاحت مانگی تو اکاؤنٹنٹ نے جواب دیا کہ "MTO ہی بتا سکتا ہے، مرمت سے متعلق کاغذات موجود ہیں، مجھے نہیں علم کہ گاڑی اسی دن کسی اور شہر میں چل رہی تھی یا نہیں"۔

"اگر تمہیں اس تضاد کا علم نہیں تو کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہارا کام بالکل ٹھیک ہے؟"

اکاؤنٹنٹ تو خاموش ہو گیا مگر MTO نے وضاحت کی کوشش کی، "سر! ہو سکتا ہے کہ گاڑی اس تاریخ کو مرمت نہ ہوئی ہو، لیکن مرمت ضرور ہوئی تھی۔ بل جعلی نہیں ہیں"۔

"ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر میں اس پر کیسے دستخط کر دوں جبکہ گاڑی اس روز یہاں موجود ہی نہیں تھی؟"

وہ دونوں کمانڈنٹ کے پاس گئے جس نے کسی اور افسر کو دستخط کرنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ ایک ماہ بعد کمانڈنٹ چھٹی پر چلا گیا۔ سروس رولز کے مطابق کمانڈنٹ کے بعد کمال کو قائم مقام کمانڈنٹ ہونے کا حق تھا مگر اس کی بجائے اس کے ایک جونیئر افسر کو عارضی چارج دینے کا حکم نامہ جاری ہوا، گویا اسے اپنے سے جونیئر افسر کی ماتحتی میں کام کرنا ہوگا۔ یہ بات کمال کو تسلیم نہیں تھی۔ کمانڈنٹ کی واپسی پر اس نے اس حکم کے خلاف احتجاج کیا جس پر گھوش صاحب نے جواب دیا کہ تمہاری یہاں تعیناتی ابھی حال ہی میں ہوئی ہے جبکہ وہ افسر بٹالین میں کافی عرصہ سے کام کر رہا ہے۔

"سر! بہت سے ایسے سپاہی موجود ہیں جن کا یہاں عرصۂ ملازمت آپ سے زیادہ ہے، اس لحاظ سے تو ان میں سے کسی کو کمانڈنٹ ہونا چاہیے تھا"۔

کمانڈنٹ سمجھ گیا کہ ایک جونیئر افسر کو قائم مقام بنانے کی دلیل پھپھسی ہے اس لیے خاموش رہا۔ کمال نے بعد ازاں پولیس ڈائرکٹوریٹ کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تا کہ آئندہ اس کا اعادہ نہ ہو سکے۔ اگلی دفعہ جب کمانڈنٹ چھٹی پر جا رہا تھا تو ڈائرکٹوریٹ کی طرف سے موصولہ حکم کے مطابق اس کا اضافی چارج سیکنڈ بٹالین کے کمانڈنگ افسر کو دیا گیا۔ اس پر کمال کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ اسے ایک کیمپ کا دورہ کرنا تھا جس پر اس نے قائم مقام کمانڈنٹ سے اجازت طلب کی جو مل گئی، لیکن دورے کے لیے کوئی گاڑی موجود نہ تھی۔ استفسار پر علم ہوا کہ ایک گاڑی کمانڈنگ افسر اور دو گاڑیاں دیگر دو افسروں کے استعمال میں ہیں۔ ایک گاڑی میم صاحبہ کی ڈیوٹی پر ہے۔ کمال نے سوال کیا کہ میم صاحبہ تو کمانڈنٹ صاحب کے ساتھ گئی ہیں، پھر اس گاڑی کا استعمال کیا ہے؟

''لیکن سر! اسے ہم کسی اور کے استعمال میں نہیں دے سکتے''۔

''پھر میرے لیے کون سی گاڑی ہے؟''

''جی! کوئی نہیں''۔

کتنی عجیب بات تھی کہ میم صاحبہ کمانڈنٹ کے ساتھ جا چکی تھیں، ان کی گاڑی کوئی اور استعمال نہیں کر سکتا تھا حالانکہ وہ سرکاری طور پر مجاز نہیں تھیں، دو گاڑیاں جونیئر افسروں کو ملی تھیں اور خود اس کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ MTO کے اس جواب کے پیچھے یقیناً کمانڈنگ آفیسر کی آشیر باد ہی ہو سکتی تھی۔ کمال نے قائم مقام کمانڈنٹ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ خود بھی ششدر رہ گیا۔ اس نے اپنی بٹالین سے ایک گاڑی بھیجی جو کمال نے شکریے کے ساتھ واپس کر دی اور خود بس پر روانہ ہو گیا۔

....

واپسی پر اسے علم ہوا کہ ڈاکٹر حسین اہل و عیال سمیت وہاں آئے ہوئے ہیں۔ کمال کے اردلی نے مہمانوں کو اس کی رہائش گاہ پہنچا دیا ہوا تھا۔ کمال نے انہیں خوش آمدید کہا اور اردلی کو کھانے پینے کا انتظام کرنے کی ہدایات دیں۔

جب کمال اس سے قبل ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا تھا تو بینا پرے پرے رہ رہی تھی لیکن یہاں وہ کمال کے نہ صرف قریب رہی بلکہ بے تکلفی سے باتیں بھی کرتی رہی۔ کھانے کے بعد باقی تو قیلولہ کرنے چلے گئے مگر بینا وہیں بیٹھی رہی۔ اس نے کمال سے کہا، ''اگر چہ میں یہاں پہلی بار آئی ہوں لیکن اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی، جیسا کہ یہ میرا ہی گھر ہو''۔ اس پر وہ قدرے مضطرب سا ہوا اور سوچا کہ سنگیتا کے ساتھ اپنے تعلقات سے اسے آگاہ کر دے، مگر بات کیسے شروع کرے؟ آخر اس نے سیدھی بات کرنے کی بجائے بینا سے پوچھا، ''کیا تم میری شادی پر آؤ گی؟'' یہ سن کر اسے تو دھچکا سا لگا۔ اس کیفیت سے نکلنے میں اسے کچھ وقت درکار تھا لیکن اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا، ''یقیناً۔ آپ شادی کب کر رہے ہیں؟''۔

''میں خود تو شادی کی تاریخ بتا نہیں سکتا''۔

''کیوں؟''

''میں جس لڑکی سے شادی کا خواہش مند ہوں اس کا مذہب ہم سے مختلف ہے۔ اس کے والدین مجھ سے شادی کے مخالف ہیں، اور وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی''۔

''پھر تو واقعی مشکل ہے''۔ اور واقعی اس لمحے کمال کے سامنے یہی ایک مشکل تھی۔

....

اگلے روز اسے آئندہ پیر کے دن ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ کرنے کا حکم ملا۔ اس نے حکم کے مطابق مسٹر اہل دتہ، ڈی، آئی، جی، ہیڈ کوارٹر کو اپنی آمد کی رپورٹ کی۔ وہ اسے ڈی، جی، پی مسٹر رینان بھٹا چاریہ کے پاس لے گیا جس نے اس کی خوب

گوشمالی کی، ''تم وزیرِ اعلیٰ کو براہِ راست کیسے لکھ سکتے ہو۔ تم مجھے لکھتے، یا زیادہ سے زیادہ ہوم سیکرٹری یا چیف سیکرٹری کو لکھ دیتے، وزیرِ اعلیٰ کو کیوں لکھا؟''

''سر! آل انڈیا سروس رولز کی رو سے میں صدر مملکت کو بھی لکھ سکتا ہوں۔ ہندوستان میں ہر کوئی چاہے وزیرِ اعظم ہو یا نائب صدر، ان کے ماتحت ہے''۔

''اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''اگر میں صدر کو لکھ سکتا ہوں تو ان کے ماتحت کسی عہدے دار کو لکھنے میں کوئی ممانعت نہیں''۔

ڈی، جی، پی، چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد بولا ''لیکن لکھنے کے لیے ایک طریقہ کار بھی تو ہے''۔

''جی سر! میں نے مقررہ سرکاری راہ اختیار کرتے ہوئے اپنی درخواست بٹالین کے کمانڈنٹ کے واسطہ سے بھیجی تھی''۔

''لیکن تم نے تو وزیرِ اعلیٰ کو ایک نقل بھی ارسال کی تھی''۔

''سر! رولز کے مطابق میں ایسا کر سکتا تھا''۔

''آخر یہ سب کچھ کرنا کیا ضروری تھا؟ کیا ادھا پیائے نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں تین ماہ میں تمہاری تعیناتی کر دوں گا؟''

''سر! میں نے درخواست میں کہیں بھی اپنی تعیناتی کے بارے میں نہیں لکھا''۔

''پھر تم کیا چاہتے ہو؟''

''سر! میں تو محض یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اسمبلی میں غلط بات کیوں کی تھی''۔

''اسمبلی میں وہ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں''۔

''نہیں سر! جو بات ہوئی ہی نہیں، وہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''تم اپنی حد سے بڑھتے جا رہے ہو''۔

''ہو سکتا ہے، مگر میں اپنی اوقات پہچانتا ہوں''۔

ڈی، جی، پی کچھ دیر چپ رہنے کے بعد گویا ہوا، ''اہل! پلیز اسے اپنے کمرے میں لے جا کر سمجھاؤ کہ ایسی باتوں سے حاصل کچھ نہیں ہوتا''۔

مسٹر دتہ نے کمال کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے کمال سے کہا، ''وزیرِ اعلیٰ سے ملاقات پر زور نہ دو۔ کوئی ملنے نہیں دے گا''۔

''کیوں سر؟''

جب تم نے اسمبلی رکن کو گرفتار کیا تھا، وزیرِ اعلیٰ صاحب موجود نہیں تھے''۔

''جی بالکل''۔

''کسی نے انہیں رپورٹ دی جو انہوں نے اسمبلی میں پڑھ دی''۔

''جی! اس کا امکان ہے''۔

''کوئی افسر چاہے وہ تمہارا ڈی جی ہو یا کوئی اور، تمہیں وزیرِ اعلیٰ سے ملاقات کی اجازت کیسے دے سکتا ہے کہ وہاں جا کر تم یہ ثابت کرو کہ انہیں غلط رپورٹ دی گئی تھی؟''

''یہ تو ٹھیک ہے سر!''

''پھر تم ہمیں پریشان کیوں کر رہے ہو؟''

کمال کچھ نہ بولا۔ مسٹر دتہ نے کہا، ''اپنے ہیڈکوارٹر جاؤ۔ ہم اتنے بھی برے نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو''۔

اس کے بعد کمال واپس سلاجنا لوٹ گیا۔ لیکن معاملہ ختم نہ ہوا۔ ڈی، جی، پی کو اس کی صاف صاف باتیں پسند نہ آئی تھیں اس لیے وہ اسے مزید تنگ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے ایس پی مکرجی کو پیغام بھیجا کہ کمال کی اس نکتے پر گوشمالی کی جائے کہ وہ سادہ لباس میں ڈی، جی، پی سے کیوں ملا تھا۔ مکرجی کو تو بہانہ مل گیا۔ اس نے بٹالین جا کر کمال کو کمانڈنگ آفیسر کے کمرے میں بلایا اور پوچھا، ''تم عام لباس میں ڈی، جی، پی سے کیوں ملے تھے؟''

کمال تو پہلے ہی سے کمانڈنگ آفیسر اور ڈی، آئی، جی کے غیر اخلاقی رویّے اور بددیانتی سے بدظن تھا، اس نے اطمینان سے جواب دیا، ''سر! میں تو آپ جیسے بڑے افسروں کے عمل کی تقلید کر رہا تھا''۔ مکرجی اس وقت خود بھی سادہ لباس میں تھا اس لیے سمجھا کہ کمال نے اسے چوٹ کی ہے۔ پوچھنے لگا، ''تم کس عمل کی بات کر رہے ہو؟''

''سر! پولیس ہیڈکوارٹر میں تمام پولیس افسران سادہ لباس میں فرائض سرانجام دیتے ہیں، لہٰذا میرے ذہن میں آیا کہ وہاں کا دستور ہی یہ ہے''۔

''ڈی، جی، پی سادہ لباس میں آ سکتے ہیں، تم نہیں کیونکہ تم ڈی، جی نہیں ہو''۔

''سر! آل انڈیا سروس رولز تمام افسروں کے لیے ایک جیسے ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ اعلیٰ پولیس افسروں کے لیے کوئی الگ رولز بھی ہیں۔ سر! کیا آپ کو علم ہے؟''

''مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ اپنے ڈی، جی سے سوال کرو''۔

''اگر ڈی جی صاحب مجھ سے پوچھتے تو میں انہیں بھی یہی جواب دیتا۔ اب میں یونیفارم میں ہوں۔ میں ہی نہیں، سارے افسر یونیفارم میں ہیں سوائے آپ کے۔ اسی لباس میں آپ نے میگزین گارڈ کا معائنہ کیا، گارڈ آف آنر لیا، اور ادھر مجھ سے جواب طلبی ہو رہی ہے کہ میں سادہ لباس میں ڈی، جی سے کیوں ملا تھا۔ سر! آپ کو جواب چاہیے؟ اگر آپ سادہ لباس میں آ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں مل سکتا؟''

مارے طیش کے مکرجی کا رنگ سرخ ہو گیا، لیکن بولا کچھ نہیں۔ کمانڈنگ آفیسر نے کمال کو اپنے دفتر جانے کو کہا۔

....

1984 مارچ کی ایک صبح کا ذکر ہے، کمال نئی دہلی میں پرکاش پوری پولیس اسٹیشن کے ایک خیمے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ ہندی اور اردو کس طرح کھڑی بولی سے الگ الگ ہوئیں۔ یہ پولیس لائن تھی مگر کسی عمارت اور لائن کا وجود نہیں تھا۔ زمین کی حد بندی ہو چکی تھی، عمارت کی تعمیر ہنوز دور تھی۔ دہلی کی انتظامیہ نے ڈیپوٹیشن پر آنے والے پولیس افسروں کے لیے خیموں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ حال ہی میں اکالیوں کی جانب سے ہونے والے احتجاج میں انہوں نے بھارتی آئین کے آرٹیکل 25 کو نذرِ آتش کیا تھا، اس وجہ سے مرکزی حکومت نے مغربی بنگال سے امن وامان قائم رکھنے کے لیے ایک کمپنی بھیجنے کو کہا تھا۔ ریاستی حکومت نے FER کی ایک کمپنی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ کمانڈنگ آفیسر کے لیے اس مشکل بندے سے کچھ عرصہ نجات پانے کا سنہری موقع تھا چنانچہ اسے کمپنی کو کمانڈ کرنے کی غرض سے دہلی بھیج دیا گیا۔ کمال نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ دہلی انتظامیہ نے کمپنی کو پولیس لائن میں اور کمال کے لیے گورنمنٹ میس میں رہائش کا بندوبست کیا لیکن اس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ عام سپاہی اس پر بہت خوش ہوئے۔ تمام لوگ اطمینان سے گزر بسر کر رہے تھے مگر ایک روز شدید طوفان کے باعث خیمے زمین بوس ہو گئے جس سے متعدد سپاہی گھائل اور ایک سپاہی بہت زخمی ہوا تھا۔ زخمیوں کو اسپتال میں داخل کرایا گیا۔

خیموں کی دوبارہ تنصیب ہوئی مگر بیت الخلا کا مسئلہ بن گیا، سپاہیوں نے عارضی بندوبست کیا۔ کمال کے پاس وقت ہی وقت تھا اس لیے اس نے دہلی پولیس لائبریری کی رکنیت حاصل کی اور مطالعہ کے لیے کتابیں لانے لگا۔

وہ جاننا چاہتا تھا کہ اکالیوں نے آرٹیکل 25 ہی کو کیوں نذرِ آتش کیا تھا؟ سکھ اپنے آپ کو ہندو نہیں بلکہ ایک الگ مذہب کے پیروکار کہتے ہیں، لیکن خصوصی طور پر اس آرٹیکل کو جلانے کی وجہ کیا تھی؟ اس نے آئین کا مطالعہ کیا تو علم ہوا کہ آرٹیکل 25 میں سکھوں، بدھوں اور جینیوں کا شمار ہندوؤں میں کیا گیا تھا۔ اب کمال کی سمجھ میں آیا کہ اکالیوں کے احتجاج کی وجہ کیا تھی۔

اس نے ہندوستانی زبانوں کی تاریخ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اتنے میں اس کے اردلی نے خیمے میں آ کر اسے ہولی کی تیاری کے بارے میں بتایا، ''سر! سب لوگ رنگ لیے ہولی کے لیے تیار ہیں، آپ کی اجازت چاہیے''۔

''ہاں، ہاں! انہیں ہولی کھیلنے دو''۔

''سر! آپ شرکت نہیں کریں گے؟''

''نہیں''۔ وہ کسی مذہبی تقریب میں شرکت نہیں کرتا تھا لیکن یہ بات کسی کو بتا نہ سکا، بس اتنا کہا، ''انہیں شروع کرنے دو''۔

اردلی کے جانے کے بعد وہ کیمپ کے ارد گرد گھومنے چلا گیا۔ سورج چمک رہا تھا، بہار کی ہوائے دل فزا چل رہی تھی، پھولوں پر شباب تھا، تتلیاں محو پرواز اور لوگ قہقہے لگاتے، بھاگتے دوڑتے، باتیں کرتے ہولی کے رنگوں سے کھیل رہے تھے، نوجوان ڈھولک کی تھاپ پر رقص کناں تھے۔ سب ہی مسرور و مخمور تھے۔ کیمپ کے چند افراد کے ہاتھوں میں شراب کی بوتلیں تھیں مگر کمال پر نظر پڑتے ہی انہوں نے چھپا دیں۔ وہ اپنے خیمے میں چلا آیا۔ مطالعہ کو جی نہیں چاہا تو بستر پر لیٹا مگر جلد ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ نہ سوجھا کہ کیا کرے۔ اتنے میں باہر سے کسی شخص نے اس کا نام لے کر آواز دی۔ باہر نکل کر اس نے ایک شخص کو کھڑے دیکھا۔ اس نے کہا، ''میں کیپٹل کوریئر سے آیا ہوں، کلکتہ آفس سے آپ کے نام کا ایک خط آیا ہے۔ یہاں دستخط کر دیں''۔

اس نے دستخط کر کے خط حاصل کیا جس سے بھینی بھینی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ ارسال کنندہ کا نام نہیں تھا۔ خیمے کے اندر آ کر اس نے لفافہ کھولا۔ کاغذ پر رنگ بکھرے تھے شاید انہوں نے ہی خط کو معطر کیا تھا۔ اس نے دیکھا تو پتہ چلا کہ سنگیتا کی طرف سے ہے۔ لکھا تھا:

منڈل صاحب!

ہولی کے موقع پر ہم کلکتہ آئے ہوئے ہیں۔ بہت سے چاہنے والوں نے مجھے رنگ دیئے مگر میں نے قبول نہیں کیے۔

میں نے دل و دماغ کی دیواروں پر آپ کے سارے رنگ بکھیر دیئے ہیں۔ کوریئر کی وساطت سے چند رنگ آپ کو بھی بھیج رہی ہوں۔ ہمارے نزدیک ہی ایک لڑکا وہاں ملازم ہے۔ اس نے یقین دلایا ہے کہ اگلے روز ہی یہ لفافہ آپ کو مل جائے گا۔ مجھے علم ہوا ہے کہ اسی روز ہولی منائی جانے والی ہے، لہٰذا یہ ہولی کی تقریب کے دوران ہی آپ کو مل جائے گا۔ یہ مل جائے تو پل بھر کے لیے مجھے یاد کر لیجیے گا اور تھوڑا سا رنگ اپنی پیشانی پر بھی لگا لیں۔

محبت کے ساتھ،
صرف آپ کی،
سنگیتا

کمال نے تھوڑا سا رنگ اپنے ماتھے پر لگا کر آئینہ دیکھا تو سنگیتا کا بھیجا ہوا رنگ وہاں نظر آیا، اور پھر اچانک دل میں

ایک نامعلوم سی لہر اٹھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ایک احساس جاگا، ایک نامعلوم سی لہر نے انگڑائی لی۔

....

مئی 1984 کا ایک روشن دن، کمال بے تابی سے سنگیتا اور اس کی بہن رونا کا منتظر تھا۔ تین مہینے دہلی میں گزارنے کے بعد وہ واپس آیا تو اسے اوڑیسہ میں پنچائتی انتخابات کی نگرانی کرنے والی پولیس کی اعانت کے لیے FER کے ایک دستے کے ساتھ جانا پڑا۔ وہاں سے واپسی کے تین دن بعد ہی اسے بارک پور بھیج دیا گیا۔ کمال نے اس پر احتجاج کیا کہ جب دو افسر موجود ہیں تو ہر بار اسے ہی کیوں بھیجا جاتا ہے؟ کمانڈنگ آفیسر مسٹر گھوش نے درگا پور کے ڈی، آئی، جی مسٹر مکرجی کی موجودگی میں وضاحت کی کہ ان کے اہل وعیال ہیں جس کی وجہ سے انہیں نہیں بھیجا جاتا جبکہ تمہارا ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ کمال کے لیے یہ جواب بالکل بودا تھا لہٰذا کہنے لگا،

''بہت سے سپاہیوں کے گھر والے بھی ان کے ساتھ رہتے ہیں، پھر انہیں کیوں بھیجا جاتا ہے؟ میرے والدین بھی ہیں جن کی دیکھ بھال مجھے کرنا ہوتی ہے، کیا میری تنخواہ دوسرے دو افسروں سے زیادہ ہے یا وہ کم تنخواہ لے رہے ہیں؟''

''اگر تمہیں کوئی مسئلہ ہے تو۔۔۔۔۔'' مسٹر گھوش کہتے کہتے رک گئے۔

''جی نہیں، میرا کوئی مسئلہ نہیں، مسئلہ تو آپ لوگوں کے ساتھ ہے۔ ٹھیک ہے، میں جاؤں گا''۔

وہ بنکا پورا آ گیا لیکن سلاجنا روانگی سے قبل اس نے سنگیتا کو ایک خط لکھا تھا۔ اب اس کا جواب آیا:

مسٹر منڈل

گرمیوں کی تعطیلات میں ہم کلکتہ کے نواح میں اپنے نانا ابو کے گھر جا رہے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ رونا نے نارتھ بنگال میڈیکل کالج میں ایم، بی، بی، ایس میں داخلہ لے لیا ہے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہوگی، پھر ہم دونوں آپ کے پاس کمپنی میس آئیں گی۔ یاد رہے کہ گیارہ مئی کو آپ کہیں اور نہیں جائیں گے۔ ہم تقریباً دوپہر بارہ بجے پہنچ جائیں گی۔ باقی باتیں بوقتِ ملاقات۔

محبت بھری،

صرف آپ کی،

سنگیتا

میس مینیجر کو دو اضافی کھانوں کا کہہ کر خود گیارہ بجے سے مضطربانہ ان کا منتظر تھا۔ ان کی آمد میں تاخیر ہوتی گئی جسے کمال نے ٹرانسپورٹ کا مسئلہ سمجھا، یا شاید انہیں جگہ تلاش کرنے میں دشواری ہو رہی ہو، لیکن ایک بجنے پر کمال کو تشویش ہونے لگی۔ ڈیڑھ بجے میس مینیجر نے کہا، ''سر! آپ کے مہمان ابھی تک نہیں پہنچے، کیا آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟'' کمال کو جواب نہ سوجھا، دھیرے سے بولا، ''ممکن ہے وہ راستے میں ہوں''۔ دو بجے کے قریب گیٹ پر ایک ٹیکسی رکی تو کمال تقریباً بھاگتا ہوا آگے گیا۔ ڈاکٹر حسین اور ان کی اہلیہ ٹیکسی سے اتر رہے تھے۔ کمال کو وہاں دیکھ کر مسز حسین بولیں، ''ڈاکٹر صاحب تو ہچکچا رہے تھے کہ مبادا آپ کہیں گئے ہوں، لیکن میں نے کہا تھا چل کر دیکھ لیتے ہیں، زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ہم واپس آ جائیں گے''۔

ان کی آمد کمال کو اچھی نہ لگی۔ اگر سنگیتا آ گئی تو پھر؟ چلیں ٹھیک ہے یہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے، یہی بہتر ہے۔ مگر سنگیتا اور ان کی بہن نہ پہنچیں۔ میس مینیجر نے کھانا پیش کیا۔ بعد میں ڈاکٹر حسین اور ان کی اہلیہ قیلولہ کے لیے کمرے میں چلے گئے۔ ادھر کمال فکرمند تھا۔ سنگیتا کے بارے میں بہت سے خیالات، بہت سے واہمے ذہن میں آ رہے تھے، کیا کوئی حادثہ تو

نہیں ہو گیا، کہیں میس ڈھونڈنے میں مسئلہ درپیش تو نہیں؟ کیا ان کی آمد کی خبر گھر والوں کو تو نہیں ہو گئی؟ کیا سنگیتا نے مذاق کیا تھا؟ اسے کسی کا جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

شام کو ڈاکٹر حسین نے کمال سے کہا، ''ہم آپ سے اپنی بیٹی مینا کے رشتہ کے سلسلہ میں آئے ہیں''۔

''لیکن میری منگنی ایک لڑکی سنگیتا سے ہو چکی ہے''۔

''یہ تو عذر لگتا ہے''۔

''میں ایسا کیوں کروں گا؟ میں اس کی اطلاع مینا کو دے چکا ہوں''۔

''مینا کی بھی یہی خواہش ہے۔ تو کیا آپ اس سے شادی کرنا پسند نہیں کرتے؟''

''نہیں، نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر مجھے کسی اور سے شادی کرنا پڑی تو مینا ہی سے کروں گا''۔

''تو کیا ہم یہ سمجھیں کہ آپ اس پر غور کریں گے؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ میری منگنی ہو چکی ہے''۔

مسز حسین کو مایوسی ہوئی۔ اس نے اپنے خاوند سے چلنے کو کہا۔ قرب و جوار سے کوئی ٹیکسی نہ مل سکی تو کمال نے رکشہ منگوا لیا۔ ان کی روانگی کے بعد اس نے سنگیتا کے نام ایک خط لکھا۔ جواب جلد ہی مل گیا۔ اس نے لکھا تھا، ''سب کچھ تیار تھا مگر آخری لمحات میں رونا پیچھے ہٹ گئی، غالباً اس کی پتا جی سے کوئی بات ہوئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے آپ سے شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں نے آپ کے پاس آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ والدین کی موجودگی میں ایسا ہونا ممکن نہیں، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ 27 تاریخ، صبح نو بجے، میرے موسیقی کے استاد مسٹر چیٹر جی کے گھر کے پاس آ جائیں۔ میں آپ کے ہمراہ چلی آؤں گی''۔

کمال کو لڑکی بھگانے کا خیال بالکل اچھا نہ لگا لیکن اب اس سے رابطہ کرنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ اسے یہ بھی پسند نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ آنے کی خاطر سڑک پر انتظار کرتی رہے اور وہ خود وہاں نہ پہنچے۔ لہٰذا وہ چلا گیا مگر سنگیتا نہ آئی۔ وہ صبح سے شام تک ادھر ادھر گشت کرتا رہا لیکن اس کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔ کمال کو دکھ ہوا۔ وہ واپس آ گیا لیکن سنگیتا کو کچھ نہیں لکھا۔ ایک روز بعد اس کا خط ملا، ''آپ کو انتظار کرانے کا بہت افسوس ہے۔ ہمارا ارادہ 26 تاریخ کو ہری پور جانے کا تھا لیکن ماتا جی راضی نہ ہوئیں اس لیے میں آ نہیں سکی۔ اگلے مہینے 30 کو آ جائیں میں بالکل تیار ملوں گی''۔

کمال نے جواب دیا، ''میں اب نہیں آؤں گا۔ اگر تم آنا چاہو تو اگلے مہینے تک میرے گھر آ جانا۔ اس وقت تک تمہارا منتظر رہوں گا۔ اگر تم نہ آئیں تو سمجھوں گا کہ تم مجھ سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی ہو۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے''۔

اگلے ہفتہ اسے سنگیتا کے پتا کی طرف سے خط ملا، ''میرا گمان تھا کہ تم ایک شریف شخص ہو اسی لیے میں نے تمہیں اپنے گھر آنے کی اجازت دی تھی، لیکن موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تم میرے خاندان کی بربادی پر تل گئے۔ تم میری بیٹی کو گھر سے بھاگنے پر اکساتے رہے۔ ہمارا مذہب اور ثقافت مختلف ہیں۔ وہ تمہارے ساتھ کبھی بھی خوش نہیں رہ سکتی۔ میں نے اس کے لیے ایک مناسب لڑکے کا چناؤ کر لیا ہے لیکن وہ تمہاری ترغیب کی وجہ سے رضامند نہیں ہو رہی۔ اگر تم میں معمولی سی بھی شرافت ہے تو میری درخواست ہے کہ مہربانی کر کے اس سے تعلق ختم کر لو''۔

خط پڑھ کر کمال کو بہت دکھ ہوا۔ اس نے سنگیتا کو اس کی نقل بھیج دی، خود پریڈ گراؤنڈ چلا گیا۔ واپسی پر اسے ڈی، آئی، جی کی طرف سے اگلے روز حاضر ہونے کا پیغام ملا۔ وہ پہنچا تو دتہ صاحب اسے ڈی، جی کے پاس لے گئے۔ انہوں نے کمال کو سبق سکھانے کی خاطر اس سے سوال کیا، ''تم جاننا چاہتے ہو کہ میں عام لباس میں کس حکم کے تحت یہاں آتا ہوں؟''

''نہیں سر! میرے ڈی، آئی، جی صاحب نے کہا تھا کہ وہ اور آپ سادہ لباس میں آ سکتے ہیں مگر میں نہیں۔ چونکہ

میرے علم میں کوئی ایسا حکمنامہ، قاعدہ یا دستور نہیں اس لیے جاننا چاہتا تھا''۔

''تم جانتے کیا ہو؟''

''مجھے تو اتنا علم ہے کہ آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے تین ماہ کے اندر کسی سب ڈویژن میں تعینات کر دیا جائے گا۔ بارہ مہینے گزرنے کے بعد بھی آپ نے سوائے ڈی، آئی، جی صاحب کو پیغام بھیجنے کے علاوہ کہ وہ مجھ سے عام لباس میں آنے کی وجہ پوچھیں، میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ اگر آپ مجھے یونیفارم میں دیکھنا چاہتے تھے تو آج کی طرح اس روز بھی حکم دیا ہوتا''۔

ڈی، جی صاحب نے مزید کوئی بات نہ کی اور دتہ صاحب کو کہا کہ کمال کو عملی سوچ اختیار کرنے کی مشورہ دو۔ دتہ صاحب اسے لے کر واپس کمرے میں آئے اور دو لفظوں میں اسے جانے کا حکم دیا۔ کمال بنگا پور کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔

....

واپس پہنچنے پر کمال کو نیشنل پولیس اکیڈمی، حیدر آباد، میں ایک مہینے کے کورس میں شمولیت کا پیغام ملا، اور یہ کہ اپنی نگرانی میں کیے گئے تمام مقدمات کے کاغذات پولیس ڈائرکٹوریٹ بھیج دیئے جائیں۔ جس مقدمے کی وجہ سے اس کا تبادلہ ہوا تھا، اس کے کاغذات لینے کے لیے اسے باکل پور بھی جانا پڑا۔ اسٹیشن سے اس نے ایس، ڈی، پی، او کے دفتر تک رکشہ لیا۔ وہاں پہنچنے پر سب سے پہلے ڈرائیور مہادیو کی نظر پڑی تو وہ بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا، ''سر! آپ کیسے ہیں؟ لوگ ابھی تک آپ کو یاد کرتے ہیں۔ آپ کو تو عدالت جانے کا کہا تھا مگر آپ نے سنی ان سنی کر دی تھی''۔

''عدالت جانے کا فائدہ کیا ہوتا۔ میں ہمیشہ تو یہاں رہ نہیں سکتا تھا، ایک نہ ایک دن تو مجھے جانا ہی تھا، بہتر یہی تھا کہ میں عزت سے چلا جاتا''۔

نیا پولیس آفیسر بھی باہر آ گیا۔ کمال نے اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ اس نے فارسٹ بنگلہ میں اس کی شب بسری اور ایک گاڑی کا انتظام کر دیا۔ کمال نے سوچا کہ ڈاکٹر حسین اپنی اہلیہ کے ہمراہ اس کے پاس آئے تھے لہٰذا اخلاقاً اسے بھی ان سے ملاقات کے لیے جانا چاہیے۔ وہاں پہنچا تو مسز حسین نے شکایت کی کہ جب ہم آپ کے پاس آئے تھے تو آپ کی رہائش گاہ پر ٹھہرے تھے، اب آپ گیسٹ ہاؤس میں قیام پذیر ہیں۔ کیا آپ دوبارہ ہمارے پاس نہیں آنا چاہتے؟

''میں ایک سرکاری کام سے آیا ہوں اور دوسرے افسروں سے ملاقات بھی کرنی ہے''۔

باتیں ہوتی رہیں۔ مینا نے استفسار کیا، ''کیا آپ کل شام گیسٹ ہاؤس میں ہوں گے؟''

''شام کس وقت؟''

''ساڑھے تین بجے''۔

کمال نے حساب کیا کہ وہ کل اپنے کام سے کس وقت تک فارغ ہو جائے گا۔ ''ٹھیک ہے، میں اس وقت گیسٹ ہاؤس میں ہوں گا''۔

''بہت اچھا! تین بجے میری کلاس ختم ہو جاتی ہے اس لیے میں ساڑھے تین تک پہنچ جاؤں گی''۔

اگلے روز کلاس جلد ختم ہونے کی وجہ سے وہ وقت سے پہلے ہی پہنچ گئی۔ کمال نے اس سے ٹھہرانے کا پوچھا، ''میں بس تھوڑی دیر کے لیے آئی ہوں۔ کھانا گھر جا کر کھاؤں گی''۔

''جب جانا ہو، چلی جانا لیکن تھوڑا سا تو کچھ کھا لو''۔

کمال اندر سے کھانے کے لیے کچھ لے آیا۔ مینا نے بے دلی سے کھانے کے بعد پوچھا، ''کیا آپ کی شادی کی

تاریخ مقرر ہوگئی ہے؟''

''نہیں، ابھی نہیں''۔

''کیوں؟''

''اس نے کہا تو ہے کہ وہ اپنے پتا کو منانے میں کامیاب ہو جائے گی، لیکن ابھی تک ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس اس کے پتا نے مجھے مذہب کے حوالے سے بڑا قابلِ اعتراض خط لکھا تھا''۔

''پھر؟''

''میں نے اس سے دور رہنے کا فیصلہ کیا ہے''۔

''پھر مجھ سے شادی کرلو''۔

''اس وقت میں وعدہ نہیں کر سکتا، لیکن میں اس پر غور ضرور کروں گا''۔

''جہاں تک مجھے علم ہے اپنی دلہن کا چناؤ آپ خود ہی کریں گے''۔

''ہاں! میری اپنی پسند ہوگی''۔

''پھر مجھ سے شادی کرلو''۔

''ایسا ممکن ہے''۔

اس نے کمال کا ہاتھ تھام لیا۔ بائیں انگلیوں کے ناخن لمبے تھے، کمال نے اس کے لمبے ناخن رکھنے کی وجہ پوچھی تو وہ ترت بولی، ''اگر آپ کو پسند نہیں تو تراش دوں گی''۔ کمال نے بھی فوراً جواب دیا، ''نہیں، نہیں، اگر تمہیں پسند ہیں تو کاٹنے کی کوئی ضرورت نہیں''۔ اس نے جاتے جاتے کمال کا بوسہ لیا۔ وہ بھی واپس روانہ ہوگیا۔ دو روز بعد اسے مینا کا خط ملا، لکھا تھا:

کمانڈنٹ صاحب!

آپ چلے گئے مگر میں پژمردہ، اداس اور بے کل ہوں۔ دن آپ کی یاد میں گزرتے ہیں اور راتیں جاگنے میں۔ صرف خواب ہی میں آپ سے ملاقات ہوتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ آپ کے گھر کی جانب دوڑی چلی جارہی ہوں۔

اگر میرے پنکھ ہوتے تو اڑ کر آپ کی کھڑکی میں آبیٹھتی۔ آپ کو اپنے پروں میں چھپا کر ان دیکھی منزل کو اُڑ جاتی۔ سبز گھاس میں گم کسی ٹیلے پر بیٹھ کر میں آپ کے ان گنت بوسے لیتی، اس سے آپ کیا کرتے، میں نہیں جانتی، لیکن جو چاہتے کر لیتے، میں بالکل نہ روکتی۔ میرا پریم آپ کو دیوانہ کر دیتا۔

رات بیت جاتی تو میں آپ کو گھر چھوڑ کر اپنے کمرے میں واپس آجاتی۔ کسی کو پتہ نہ چلتا، مگر افسوس! میرے پنکھ نہیں ہیں اس لیے آپ تک آنا سوائے ریل یا بس کے ممکن نہیں، پھر بھی میں آؤں گی۔ آپ بھی جتنی جلدی ہو، آجائیں۔

ہمیشہ آپ کی،

مینا

....

اور اپنی بات کی پکی مینا چند دن کے بعد ہی بھائی اور بہن کے ہمراہ کمال کے پاس پہنچ گئی۔ شام کے وقت وہ دوڑ لگانے کے لیے اپنا سپورٹس ڈریس پہن رہا تھا، دوسرے کمرے میں مینا اور اس کا بھائی گپ شپ کر رہے تھے کہ ان کی بہن نے

آ کر مذاق میں مینا سے کہا،"جی! میڈم منڈل"۔اس نے جواب دیا،"پہلے مجھے میڈم منڈل بناؤ، پھر اس لفظ سے مخاطب کرنا"۔

"وہ تو تم پہلے ہی سے بن چکی ہو، میری مدد کی کیا ضرورت ہے"۔

کمال نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے اس نے کوئی بات نہیں سنی۔باہر جانے ہی لگا تھا کہ رینا کی تجویز پر مینا اور بھائی بھی اس کے ساتھ باہر نکل آئے۔رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور تقریباً دس بجے ساتھ والے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔کمال اپنے کمرے میں آ گیا۔وہ ایک کہانی لکھنے کا سوچ رہا تھا جو کچھ عرصہ سے ترک ہو گیا تھا۔اسکول کے زمانے ہی سے اس کی کہانیاں کلکتہ کے رسالوں میں شائع ہو رہی تھیں مگر اب کچھ عرصہ سے اس نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا۔ابھی لکھ ہی رہا تھا کہ مینا اس کے کمرے میں آ گئی،"آپ ابھی تک سوئے نہیں؟"

"بس سونے ہی لگا تھا"۔

"آپ کر کیا رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں"۔

"آپ کچھ چھپا رہے ہیں"۔

"نہیں، ایک کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا تھا"۔

"آپ لکھتے بھی ہیں؟ کیا میں آپ کی لکھی چیزیں پڑھ سکتی ہوں؟"

"میں کوئی اتنا مشہور لکھاری نہیں ہوں۔اسکول کے زمانے میں کچھ کہانیاں لکھی تھیں۔دسویں جماعت میں تھا تو مجھے اسکول میگزین کا اڈیٹر بنا دیا گیا۔ایک چھوٹی سی کہانی شائع ہوئی تھی۔کالج کے دور میں میری پہلی نظم کلکتہ کے ایک رسالے میں چھپی تھی"۔

"کیا آپ کے پاس اس کی نقل ہے؟"

"ہے تو سہی مگر ڈھونڈنا پڑے گا"۔

"مہربانی سے تلاش کیجئے، میں پڑھنا چاہتی ہوں"۔

وہ اپنے صندوق میں تلاش کرنے لگا۔آخر اسے اسکول کا میگزین مل گیا۔اس میں ایک گروپ فوٹو تھا۔دیکھ کر مینا بے تابی سے بولی،"اوہ! آپ اسکول کے زمانے میں دبلے پتلے تھے، یہی ہے نا آپ کی تصویر؟"

"ہاں، یہی ہے"۔

تھوڑی دیر تک تصویر دیکھنے کے بعد اس نے کہانی والا صفحہ پلٹا۔کمال نے اس سے پوچھا،"تمہاری امی نے کہا تھا کہ تم پینٹنگ سیکھ رہی ہو"۔

"ہاں، سیکھ رہی ہوں مگر زیادہ وقت نہیں مل رہا"۔

"اگر تمہیں اچھے نتائج کی خواہش ہے تو اپنی تعلیم پر زیادہ توجہ دو"۔

"اور پینٹنگ؟"

"امتحان کے بعد سیکھ لینا"۔

"میں سمجھ گئی، جیسا کہ آپ اب دوبارہ سے کہانیاں لکھ رہے ہیں"۔

"تمہاری اپنی مرضی ہے، لیکن اگر تمہارے خیال میں پینٹنگ زیادہ ضروری ہے تو اسی طرف توجہ دو"۔

"نہیں، میں پہلے اپنے امتحان سے فارغ ہو جاؤں، پھر پینٹنگ پر توجہ دوں گی"۔

باتوں میں کتنا وقت گزر گیا، انہیں اندازہ نہ ہوا۔ دیکھا تو ڈیڑھ بج چکا تھا۔ کمال نے اس سے کہا، ''اب ہمیں اپنے اپنے بستر پر جانا چاہیے''۔

''رات کے اس سمے مجھے بھائی اور بہن کے پاس کمرے میں جانا مناسب نہیں لگتا اور شرم بھی آتی ہے''۔

''ٹھیک ہے، تم یہاں سو جاؤ، میں ان کے پاس چلا جاتا ہوں''۔

وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ دونوں بہن بھائی گہری نیند سو رہے تھے، وہ بھی ان کے پاس ہی لیٹ گیا۔ دو دن بعد وہ تینوں واپس بالکل پور لوٹ گئے۔

....

FER فرسٹ بٹالین کی رائفل رینج کی سالانہ مشق جاری تھی کہ کمال نے شراب کی بو محسوس کی۔ کسی مے نوش کی فائرنگ رینج میں شمولیت اس کی اپنی ذات اور دوسروں کے لیے مہلک ہو سکتی تھی، اس لیے اس نے فائرنگ روکنے کا حکم دے کر سب کا معائنہ شروع کر دیا۔ اس کا شک درست نکلا۔ ایک سپاہی کے منہ سے سخت بو آ رہی تھی، لہٰذا اسے باہر نکل جانے کا حکم دے کر باقیوں کو اپنی مشق جاری رکھنے کو کہا۔ اس نے مے خوار کو ایک طرف لے جا کر اس کا نام پوچھا۔ ''کارکا بہادر ردھر، جناب''

''فائرنگ رینج میں آنے سے پہلے تم نے شراب کیوں پی؟''

سوال سن کر تو جیسے اس کو بہت دکھ ہوا، کہنے لگا، ''سر! آپ اس کا مزہ نہیں جانتے کیونکہ کبھی پی ہی نہیں''۔ کمال سمجھ گیا کہ اس وقت اس سے بات کرنا بے سود ہے، اس لیے اسے رائفل جمع کرا کر گھر جانے اور کل صبح اس کے دفتر میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ اپنے دفتر گیا جہاں اردلی نے اسے ایک لفافہ دیا۔ ارسال کنندہ کا نام نہیں تھا لیکن اسے اندازہ ہوا کہ خط مینا کی طرف سے ہے۔ اس نے لفافہ کھولا، پڑھا:

کمانڈنٹ صاحب!

آپ کے گھر میں گزارے دن فرحت بخش تھے۔ میرا تو واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا، لیکن واپس آ کر ایک مسئلہ سامنے آ گیا۔ رینا اور ڈمپی نے راز افشا کر دیا کہ میں رات گئے تک آپ کے بستر پر رہی ہوں۔ ماں باپ دونوں کوسنے دے رہے ہیں۔ میں نے بھی انہیں بتا دیا ہے کہ ہم شادی کرنے والے ہیں۔ انہوں نے پوچھا ہے، کب؟ مہربانی کر کے اب جلدی شادی کا بندوبست کیجیے۔

ہمیشہ آپ کی،

مینا

پڑھتے ہوئے کمال نے سوچا کاش وہ مینا کے ساتھ قدرے محتاط رہتا۔ اس نے جواب میں لکھا، ''خوامخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں نے جو وعدہ کیا ہے اس پر پورا اتروں گا۔ ماں باپ سے کہو خاطر جمع رکھیں۔ حیدر آباد سے واپس آ کر میں ان سے ملاقات کر کے شادی کی تاریخ مقرر کر لوں گا''۔ تین دن کے اندر کمال کو ایک اور خط ملا، اور پھر حیدر آباد میں تو اسے تقریباً ہر روز ہی خط ملنے لگا جس میں ایک ہی تکرار تھی، ''مجھ سے شادی کرو''۔

....

حیدر آباد میں ٹریننگ ختم ہونے کے بعد کمال واپسی پر سوچتا آیا کہ اس نے کیا سیکھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیالات سے درپیش مشکلات اور مسائل سے آگاہی ہوئی۔ وہ اس بات پر بہت حیران تھا کہ دیگر دو زیرِ تربیت آفیسر پون شرما اور راہول ٹھاکر کو کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی اور یہ کہ وہ ہر برسرِ اقتدار جماعت کے ساتھ اچھے تعلقات نبھا رہے تھے، انہیں عام

لوگوں کی قطعاً کوئی پروانہیں تھی۔ کمال جیسے چند افسروں کی نظروں میں علمتہ الناس کی بھلائی اہم تھی۔ کیا اکیڈمی میں افسروں کو حکمران ٹولے کے ساتھ وفاداری نبھانے کے گُر سکھانے چاہئیں؟ اسے پتہ چل گیا کہ اکیڈمی کی تعلیم و تربیت اور دفتر میں بیٹھ کر کام کرنے میں کس قدر فرق ہے۔ پھر اعلیٰ اقتدار کے افسر کیسے کام کریں؟ اس طرح تو عیار اور موقع پرست سیاستدان اس ملک پر حکمرانی کرتے رہیں گے۔

ادھر مینا کے خطوط نے اسے پریشان کر رکھا تھا اس لیے وہ سیدھا باکل پور چلا گیا۔ مینا اسے دیکھ کر رونے لگی۔ اس نے تسلی دیتے ہوئے جلد ہی شادی کرنے کی یقین دہانی کرائی مگر وہ روتے ہوئے کہنے لگی، ''چونکہ ہم شادی شدہ نہیں اس لیے گھر والے مجھے ہر وقت کوستے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے مجھے آپ کے گھر جانے کی اجازت نہیں۔ مجھ سے شادی کرلیں تاکہ میرے آنے جانے اور ملاقاتوں میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔'' کمال نے اسے پھر سے یقین دلایا کہ وہ جلد ہی شادی کرلے گا، اور یقینی امر ہے کہ شادی کے بعد اس کے والدین کی خواہش ہوگی کہ ان کی بڑی بہو کبھی کبھار ان کے پاس گاؤں بھی آیا کرے۔

''میں یقیناً جایا کروں گی۔ آپ کے ماں باپ اور رشتہ داروں کی ہر بات مانوں گی، بس مجھ سے شادی جلدی کرلیں''۔

''مجھے تین مہینے کا وقت چاہیے''۔

''وہ کس لیے؟''

''ہمارے گھر میں تاحال مناسب بیت الخلا نہیں ہے، بلکہ پورے گاؤں میں کسی گھر میں بھی نہیں۔ اس مقصد کے لیے لوگ کھیتوں میں جاتے ہیں۔ میں دو ایک کمرے اور بیت الخلا تعمیر کرالوں تاکہ تم جب بھی وہاں جاؤ، آرام سے رہ سکو''۔

''مجھ سے شادی کرلیں، کمرے بعد میں تعمیر ہوتے رہیں گے، میں بھی اس کے بعد ہی جاؤں گی''۔

''تم تو بعد میں چلی جاؤ گی لیکن کیا تمہارے ماں باپ میرے گھر والوں سے ملنے نہیں جائیں گے؟ وہ یہ تو دیکھنا چاہیں گے کہ میں کہیں شادی شدہ تو نہیں ہوں''۔

''اگر آپ شادی شدہ ہیں بھی تو پھر بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر چاہیں تو مجھ سے شادی کرنے کے بعد آپ کہیں اور بھی شادی کر سکتے ہیں''۔

کمال کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ پاگل ہو جائے گا۔ کوئی لڑکی ایسا کیوں کر کہہ سکتی ہے؟ وہ جلد از جلد شادی کرنے کے لیے بے تاب ہے شاید اس وجہ سے ایسی باتیں کر رہی ہے۔ اس سے مزید گفتگو بے سود تھی۔ وہ اس کے والدین سے بات کرنے کا خواہاں تھا، چنانچہ مینا سے اپنے باپ کو بلانے کے لیے کہا۔ وہ واپس جا کر اپنے ماں باپ کو ساتھ لے آئی۔ کمال نے ان سے پوچھا کہ وہ مینا کو برا بھلا کیوں کہہ رہے ہیں جبکہ میں اس سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔

''کب؟''، اس کے باپ نے پوچھا۔

''تین ماہ بعد''۔

''اس صورت میں اسے آپ کے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے؟''

کمال کو اس سوال میں پوشیدہ اشارہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ اس نے خود کو اپنی ہی نظروں میں حقیر سمجھا۔ اسے اچانک نادر بخش صاحب کی تنبیہ یاد آگئی۔ پولیس سروس میں منتخب ہونے کے بعد وہ ان سے ملنے گیا تو انہوں نے کہا تھا، ''تمہیں بہت اچھی نوکری مل گئی ہے، دولت مند لوگ تمہیں گھیرنے کے لیے اپنی بیٹیوں کو آگے کریں گے۔ محتاط رہنا اور چھان بین کے بعد ہی شادی کرنا''۔ کمال نے ہاں تو کردی تھی مگر اپنی بات پر قائم نہ رہ سکا۔ اس میں گاؤں کے ایک ان پڑھ شخص جیسی بھی سوجھ بوجھ نہیں تھی، اسی وجہ سے وہ موجودہ صورتِ حال میں گھرا ہوا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے شادی کی تاریخ مقرر کرنے میں آزاد نہیں تھا اور

اس کی ذمہ داری خود اس پر تھی، لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ اس سے اب پہلو تہی کر رہا ہو۔ اس نے بوجھل دل سے ڈاکٹر حسین کو جواب دیا،" جب میں نے زبان دے دی ہے، اسے ہر حال میں نبھاؤں گا۔ میرے وعدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اگر آپ شادی کی تاریخ مقرر کرنے پر بضد ہیں تو یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی، مجھے افسوس ہوا ہے۔ کیا آپ کی یہی خواہش ہے؟" وہاں خاموشی چھا گئی۔ کمال سمجھ گیا کہ بینا کے ماں باپ کو غالباً کوئی اعتراض نہیں۔ وہ کہنے لگا،" اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اس سے ابھی شادی کروں تو مجھے منظور ہے، لیکن مجھے آپ کی طرف سے کوئی تحفہ یا چیز قبول نہیں ہوگی۔ آپ میرے گھر اور بینا آپ کے ہاں آ جا سکتے ہیں، مگر میں نہیں آؤں گا۔ یہ جو چاہے آپ کو دے سکتی ہے اور آپ سے جو کچھ لینا چاہے اس معاملہ میں آزاد ہے۔ میں اپنے لیے کوئی چیز لینے کا روادار نہیں"۔

وہ سب خاموش ہو گئے جو کمال کی نگاہ میں رضامندی کا اشارہ تھا، لہٰذا اس نے انہیں شادی کے انتظامات کرنے کو کہہ دیا۔ اب بھی وہ ۔۔۔ نہ بولے اور وہاں سے چپ چاپ واپس لوٹ گئے۔ دو دن بعد اسے بینا کا خط ملا، لکھا تھا،" پتا جی نے مسلم میرج رجسٹرار سے بات کی ہے جو پچھلی تاریخ سے نوٹس جاری کرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔ آپ جب بھی آئیں گے، شادی کی رسمیں پوری ہو جائیں گی۔ اب بتائیں، کب آ رہے ہیں؟"

خط پڑھ کر کمال کے ذہن اور جذبات کو جھٹکا سا لگا۔ وہ کس کو اپنا جیون ساتھی بنا رہا ہے؟ ان لوگوں سے تو اتنا بھی نہیں ہوا کہ قانون کے تحت نوٹس جاری ہونے دیتے۔ آخر کس وجہ سے سابقہ تاریخوں میں نوٹس جاری کروانا چاہتے ہیں؟ وہ یہ جعل سازی کیوں کر رہے ہیں؟ بینا کو اتنی شتابی کیوں ہے؟ کیا اس کی نظروں میں زندگی کی بنیادی اقدار کی بھی کوئی وقعت نہیں؟

ایک اور بات بھی قابل غور تھی۔ کمال نے انہیں صاف الفاظ میں بتایا تھا کہ وہ مسلم قوانین کے مطابق شادی نہیں کرے گا۔ ان قوانین کے تحت خاوند اپنی بیوی کو کم از کم دس درہم حق مہر دینے کا پابند ہے جس کی ادائیگی شب زفاف پر بیوی کے مطالبہ پر لازمی ہے۔ کمال کی نظر میں پیسے یا طے کردہ چیز دے کر سہاگ رات منانا بیوی کی توہین ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ لوگ مسلم قوانین کے تحت شادی کرتے ہیں۔ اس نے بینا کو فوری طور پر جواب لکھا،" میں دھوکہ دہی سے شادی کے اندراج کا خواہش مند نہیں۔ قانون کے تحت ہی نوٹس جاری ہونا چاہیے۔ مزید یہ کہ جیسا پہلے سے طے ہو چکا ہے، ہماری شادی مسلم قوانین کے مطابق نہیں بلکہ اسپیشل میرج ایکٹ کے تحت رجسٹر ہوگی"۔ مگر بینا کے گھر والوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، بلکہ اس نے یہ لکھ بھیجا،" شادی تو شادی ہی ہے، اس بحث کی کیا ضرورت ہے کہ کس قانون کے تحت رجسٹر ہونی چاہیے، اور پاپا کہہ رہے تھے کہ مسلم قانون کے مطابق شادی کرنے کا یہ مطلب لازمی نہیں کہ آپ ٹوپی پہن کر آئیں"۔

کمال سوچ رہا تھا کہ اس کی باتوں کو ان لوگوں نے درخور اعتنا نہیں سمجھا یا وہ کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں۔ ہر وہ چیز جو انہیں اچھی لگے، وہی ٹھیک ہے۔ اس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ الٹ سمجھے۔ اس نے ڈسٹرکٹ رجسٹرار سے فارم لیا، پر کیا اور دستخط کر کے بینا کو بھیج دیا جو اس نے مکمل کر کے واپس کر دیا۔ کمال کو یہ بات بھی پسند نہ آئی کہ اس نے موجودہ عارضی پتہ ہی کو اپنا مستقل پتہ ظاہر کیا تھا۔ اس نے فارم متعلقہ دفتر میں جمع کرایا اور تیس روز کی مقررہ مدت کے اگلے دن ہی بینا اس کے پاس آ گئی۔ دونوں نے جا کر اپنی شادی رجسٹر کرالی۔

....

شادی کے بعد بینا کا باپ واپس باکل پور لوٹ گیا۔ کمال نے بینا کو بھی واپس جانے کا مشورہ دیا مبادا اس کی تعلیم میں کوئی رکاوٹ آئے، مگر اس نے چند دن اکٹھے رہنے کی خواہش کی۔ بینا کا خیال تھا کہ چونکہ کمال ملازمت کر رہا ہے اس لیے اسے مزید تعلیم حاصل کرنے اور ملازمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کمال نے اس سے معلوم کیا،" کیا تم ملازمت کے لیے

پڑھنا چاہتی تھیں؟ تعلیم سے تمہارے ذہن میں وسعت آتی۔ کیا تمہیں ملازمت کی ضرورت نہیں؟ فرض کرو کل کلاں میرا انتقال ہو جائے تو؟''

''یہ منحوس الفاظ منہ سے نہ نکالو''۔

''چلو مان لیا، لیکن ملازمت نہ کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ تم ساری زندگی میری دست نگر بن کر رہو گی''۔

''اس میں نقصان کیا ہے؟''

''نقصان تو ہے، وہ یہ کہ میری دست نگر بن کر تم مجھ سے بناوٹی محبت جتاتی رہو گی''۔

''یہ کیا بات ہوئی کہ میں تم سے محبت نہیں کروں گی؟''

''ٹھیک ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی رہو گی مگر مجھے کسی ایسے شخص کی محبت نہیں چاہیے جو اپنی ضروریات کے لیے میرا محتاج ہو۔ میری خواہش ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد تم مکمل طور پر خود مختار ہو جاؤ اور پھر مجھ سے محبت بھی کرو''۔

''میرا تعلیم حاصل کرنا تمہارے لیے باعثِ مسرت ہوگا؟''

''ہاں بالکل''۔

''پھر میں ضرور پڑھوں گی، اور فی الحال تو میں یہاں دو چار روز ٹھہروں گی''۔

....

شام کو اس نے کمال سے کہا کہ میں تمہارے لیے ایک چیز لائی ہوں جسے دیکھ کر تم خوش ہو جاؤ گے۔ اور پھر وہ اندر سے جا کر ایک پیکٹ لے آئی۔ کمال نے کھول کر دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اس میں کنڈوم تھے۔ ان کے علاقے میں سیکس ایجوکیشن کا کوئی تصور نہیں تھا۔ بچوں کو خیر کیا معلوم، نوجوان بھی اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ہچکچاتے، اور بڑوں سے چھپ چھپا کر صرف قریبی دوستوں کے ساتھ ایسی باتیں کرتے تھے۔ کنڈوم کے بارے میں تو ان کی معلومات زیرو تھیں، حتیٰ کہ خود اس نے سنا ہوا تھا مگر کبھی دیکھے نہیں تھے۔ اس لیے بینا سے پوچھنا پڑا کہ اس نے کہاں سے لیے ہیں۔

''ہمارے کلکتہ قیام کے دوران پتا جی نے خرید کر مجھے دیے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ رکھ لو، اگر تمہیں بچہ پیدا کرنے میں جلدی نہ ہو تو تمہارے کام آئیں گے''۔

''ان کی مہربانی مگر میں انہیں استعمال نہیں کروں گا''۔

''کیوں؟''

''کیا تم بھول گئی ہو کہ ہماری شادی چند شرائط کے تحت ہوئی تھی، ایک شرط یہ بھی تھی میں تمہارے گھر والوں سے کوئی چیز قبول نہیں کروں گا''۔

''مگر یہ تو معمولی سی چیز ہے''۔

''میں پھر بھی لینے کو تیار نہیں ہوں''۔

''یہ میری طرف سے تحفہ ہے''۔

''یہ تمہاری کمائی نہیں۔ پہلے کماؤ، پھر میں تمہارا تحفہ قبول کروں گا''۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد بینا نے واپس میکے جانے کا پوچھا۔ کمال نے اجازت دی تو وہ کہنے لگی کہ تم بھی ساتھ چلو، مگر اس نے یاد دلایا کہ شادی کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ کبھی ان کے گھر نہیں جائے گا جسے ان سب نے مان لیا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم ہمارے گھر مت جانا لیکن میرے ساتھ تو چلو''۔

''اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں باکل پورا سٹیشن تک جاؤں گا، پھر وہیں سے واپس آ جاؤں گا''۔
وہ کچھ نہ بولی۔ مقررہ دن پر کمال اس کے ساتھ باکل پورا سٹیشن تک گیا۔ باہر نکل کر انہوں نے ایک رکشہ لیا مگر وہ خود سوار نہ ہوا۔ مینا رکشہ میں بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ کمال نے کرایہ دیا اور رکشہ جانے کے بعد خود پلٹ کر اسٹیشن آ کر واپسی کا ٹکٹ خرید لیا۔

....

خزاں کی ایک شام، مینا اور کمال بنگلور میں لال باغ کے اندر چہل قدمی کر رہے تھے۔ یہ ان کے ہنی مون کی آخری منزل تھی جہاں وہ مدراس، مدھورائی، کنیا کم، تری وندرم، اوٹی اور میسور کی سیر کے بعد پہنچے تھے۔ ان تمام جگہوں میں انہوں نے خوب سیر کی، مگر مذہبی مقامات پر کچھ رکاوٹیں اور دشواریاں ضرور پیش آئیں، مثلاً کنیا کم میں کنیا کماری کے مندر میں جانے کے لیے عورتوں اور مردوں کو مخصوص لباس پہننا ہوتا تھا۔ کمال نے پینٹ قمیص اور مینا نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی جسے نامناسب سمجھتے ہوئے انہیں داخلہ کی اجازت نہ ملی۔ کچھ مندروں میں غیر ہندوؤں کو جانے کی ممانعت تھی۔ وہ مدھورائی میں مشہور میناکشی مندر دیکھنے گئے تو ایک مقام پر لکھا تھا کہ غیر ہندوؤں کو یہاں سے آگے جانے کی اجازت نہیں۔ مینا نے کہا، ''چلو اندر چلتے ہیں، کسی کو کیا پتہ چلے گا''۔ کمال نے اتفاق نہیں کیا، ''ہو سکتا ہے کہ ہمیں کوئی نہ روکے مگر ہم نے تو نوٹس بورڈ دیکھ لیا ہے''۔
مختلف شہروں کی سیر کے بعد وہ کل ہی بنگلور پہنچے تھے۔ یہاں انہوں نے انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس کا دورہ کیا۔ پھر سنگِ سیاہ سے تعمیر کردہ محلات دیکھنے گئے۔ آج صبح ہندوستان ایرونا ٹکس لمیٹڈ کا چکر لگایا، اور اس وقت لال باغ میں تھے۔
مینا نے اس سے پوچھا کیا وہ چند روز مزید چھٹی نہیں لے سکتا؟ کمال سوچ میں پڑ گیا۔
ڈی۔ جی۔ پی نے اس سے تین ماہ کے اندر کسی سب ڈویژن میں تعیناتی کا وعدہ کیا تھا مگر اس نے اکیس مہینے ایک جونیئر سکیل میں ہی گزار دیئے تھے۔ ڈی۔ جی۔ پی کے وعدے میں کیا پنہاں تھا، اسے علم نہیں تھا۔ کیا مقتدر جماعت کو خوش کرنے اور اپنی کرسی بچانے کے لیے وعدہ کیا گیا تھا یا پھر اس کی نظروں میں جونیئر افسروں کو اسی طرح ہی ٹال دیا جاتا ہے؟ اب اس کی ترقی کے لیے مطلوبہ معیاد پوری ہو چکی تھی۔ وہ اپنے بیچ (batch) میں سرِ فہرست اور ریکارڈ کے لحاظ سے بُرا نہیں تھا اس لیے اب اس کی ترقی ہونی چاہیے، مگر اسے دوبارہ ایک اور بٹالین میں ڈپٹی کمانڈنٹ کے عہدے پر تعینات کر دیا گیا۔ پٹنل کے واقعہ کے بعد ڈی۔ جی۔ پی نے حکومتی جماعت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسے ایک ایسی بٹالین میں تعینات کیا تھا جہاں کے افسر کمال کو زچ کرنے اور اس کے ساتھ توہین آمیز رویہ اپنانے پر ہمہ وقت تیار تھے، لیکن وہ خاموشی سے یہ سب کچھ برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ بلاشبہ وہاں اس کی زندگی جہنم بنی تھی لیکن موجودہ جگہ میں اگرچہ ڈپٹی کمانڈنٹ کا عہدہ گذشتہ سات برس سے خالی تھا، اسے ایسا مسئلہ درپیش نہیں آیا۔ بڑے افسروں کا اس کے ساتھ رویہ اچھا تھا۔ اسے رہائش کے لیے ایک کشادہ بنگلہ ملا۔ وہ خود کو مطمئن محسوس کرنے لگا۔ اس نے چھٹی کی درخواست دی تھی جو منظور ہو گئی اور اگر وہ مزید چھٹی کے لیے کہتا تو اسے بھی قبول کر لیا جاتا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آیا اسے چھٹی بڑھانے کی درخواست دینی چاہیے یا نہیں؟
مینا کے سوال پر، اور قدرے سوچنے کے بعد، کمال نے جواب دیا، ''میں چھٹی بڑھا تو سکتا ہوں لیکن اس صورت میں واپسی کی نشستیں دوبارہ مخصوص کرانا پڑیں گی، اور پھر تمہیں امتحان بھی تو دینا ہے''۔
مینا کو یہ وعظ اور درس اچھا نہ لگا لہٰذا وہ چڑ کر بولی، ''تم ایک استاد کی طرح کیوں بات کر رہے ہو؟ کیا تم ایک لاپروا طالب علم کی طرح نہیں ہو سکتے ہو جو اپنی تعلیم کے بارے میں فکر مند نہیں؟''
کمال ایسا طالب علم بن نہیں سکتا تھا، لہٰذا خاموش رہا۔ مینا بولی، ''بہتر، اپنی چھٹی نہ بڑھاؤ، ہم کل واپس چلے جائیں

گے۔ اچھا اب مجھے آئس کریم کھلاؤ''۔ وہ آئس کریم لایا مگر صرف ایک۔ مینا نے پوچھا کہ وہ اپنے لیے کیوں نہیں لایا؟ کمال نے جواب دیا کہ پتہ ہے کہ میں آئس کریم نہیں کھاتا، اور ویسے بھی ٹھنڈی چیز کھا کر میرا گلا خراب ہو جاتا ہے۔ مینا نے دلگیر ہو کر کچھ کہے بغیر آئس کریم پھینک دی۔ اس حرکت پر کمال کو دکھ تو ہوا مگر بولا کچھ نہیں، پھر وہ واپس قیام گاہ کو آ گئے۔ کمرے میں اس نے مینا کو سمجھانا چاہا مگر الٹا اس نے جلی کٹی باتیں شروع کر دیں۔ کمال نے کہا، ''تمہارے امتحان کے بعد ہم ایک اور تفریحی دورے پر جائیں گے۔ اس بار ہم راجھستان کے صحرا، جیسلمیر، جودھ پور، بیکانیر، اودھے پور اور جے پور کی سیر کریں گے''۔

مینا نے طیش میں اس کی بات رد کرتے ہوئے کہا، ''کون جائے گا تمہارے ساتھ؟ تم تو ایک کنجوس شخص ہو''۔

اس جواب سے کمال کے دل پر چوٹ لگی۔ وہ چپ بیٹھا رہ گیا مگر سوچتا رہا کہ کیا وہ واقعی کنجوس ہے؟ ہاں وہ فضول خرچ نہیں لیکن کنجوس تو بالکل نہیں تھا۔ وہ فالتو اور فضول چیزوں پر کچھ خرچ کرنے سے گریز کرتا مگر ضرورت کی اشیاء پر اپنی بساط سے بھی زیادہ خرچ کرتا تھا۔ اس کے ذہن میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی مینا نے خواہش کی ہو یا محض اشارہ ہی کیا ہو اور اس نے لے کر نہ دی ہو۔ ہاں یہ الگ سی بات ہے کہ اس نے ممنوعہ یا اپنی ہمت سے باہر کوئی چیز خرید کر دینے سے انکار کیا ہو۔ ابھی گذشتہ مہینے مینا نے اس سے ایک کتاب خریدنے کو کہا تھا جس کی قیمت دو ہزار نو سو روپے تھی، اور یہ رقم اس کی دو مہینوں کی تنخواہ سے بھی زیادہ تھی، مگر کمال نے اس کے لیے خریدی۔ تو کیا وہ کنجوس تھا؟ دکھی دل سے وہ بستر پر لیٹ گیا۔

....

کمال دفتر میں ڈاک فائل دیکھ رہا تھا کہ اس میں ایک ذاتی مکتوب نظر آیا مگر یہ مینا کی طرف سے نہیں تھا۔ کیا سنگیتا نے بھیجا ہے، یا ماں باپ کی جانب سے آیا ہے؟ ارسال کنندہ کا نام نہیں تھا۔ اس نے کھول کر دیکھا۔ کسی منیرہ بیگم کی طرف سے تھا، مگر یہ خاتون ہے کون؟ اس نے خط پڑھا:

جناب کمال منڈل صاحب!

آپ مجھ سے شناسا نہیں، اور آپ جان بھی کیسے سکتے ہیں؟ ڈاکٹر حسین نے اتنی عجلت میں شادی کا بندوبست کیا کہ کسی کو علم ہی نہ ہو سکا۔ مجھے ان کی مجبوری کا احساس ہے لیکن مجھے آپ کی بے کسی کا علم نہیں۔ کیا انہوں نے آپ کو جال میں پھنسایا ہے؟ میری کزن ریحانہ ان معاملات میں بہت ماہر ہے۔ آپ یقیناً بڑی معصومیت سے شکار بنے ہیں ورنہ مینا جیسی بدچلن لڑکی سے شادی کیوں کرتے؟ میں ایسا کس بنا پر کہہ رہی ہوں؟ میں سمجھتی ہوں کہ آپ کو حقائق سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ باقی آپ کی صوابدید ہے۔ میں پہلے ہی لکھ دیتی مگر میرے پاس آپ کا پتہ نہیں تھا، نہ ہی انہوں نے دینا پسند کیا۔ یہاں کا ایک شخص بنکا پور میں ملازمت کرتا ہے، اس نے مجھے پتہ دیا ہے۔

کیا آپ کے علم میں ہے کہ شادی سے قبل ہی مینا کے متعدد لوگوں کے ساتھ تعلقات تھے؟ اسکول کے زمانے میں ضیا نامی ایک لڑکا اس کا عاشق تھا، جو اسے عشقیہ خطوط بھی لکھتا رہتا تھا۔ دسویں جماعت میں چنچل نامی ایک لڑکے کے ساتھ اس کے تعلقات بنے۔ پھر، اس کی بہن اور بھائی کو پڑھانے کے لیے مناس نام کا شخص آیا کرتا تھا جس کے ساتھ مینا کا عشق شروع ہوا۔ یہ معاملہ اتنا بڑھا کہ اسے ملازمت سے جواب دے دیا گیا لیکن اس کے باوجود وہ اسے باہر باہر ملتی رہی۔ اسی طرح مینا کے اور بھی معاشقے چلتے رہے، مگر کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اپنے چچا حفظ الرحمن عرف پیرو کے ساتھ بھی اس کا ایسا ہی تعلق تھا؟

آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ساتھ والے گاؤں کے لوگوں نے پیرو کی پٹائی کر کے اسے ایک کھمبے کے ساتھ باندھ دیا تھا کیونکہ اس گاؤں کی ایک لڑکی کو شادی کا جھانسہ دے کر اس کی عزت کے ساتھ کھیلتا رہا تھا۔ اگر پیرو کے رشتہ دار اس کو چھڑانے کے لیے نہ پہنچتے تو وہ مارا ہی گیا تھا۔ متعلقہ لڑکی سے شادی کی شرط پر اس کی جان بچی۔ لڑکی کے خاندان والوں کو بعد میں علم ہوا کہ وہ پیشہ ور عورتوں کے پاس تواتر سے جاتا ہے اس لیے انہوں نے شادی پر زور نہیں دیا۔ مینا اور پیرو کے تعلقات بھی صرف بات چیت تک محدود نہیں تھے بلکہ وہ تو اس سے شادی کی خواہاں تھی۔ اس نے اپنی ماں ریحانہ کو بھی قائل کر لیا مگر ڈاکٹر حسین رضامند نہیں تھا اس لیے شادی نہ ہوسکی۔

دراصل پیرو کا مقصد مینا سے صرف لذت کوشی تھا، شادی کرنے کا نہیں، لیکن بعدازاں اس نے بھی شادی کا خیال ترک کر دیا۔ اگر وہ مان جاتا تو مینا باپ کی مخالفت کے باوجود شادی کر لیتی۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ پیرو شادی کے لیے پیشرفت کرے گا مگر ایسا نہ ہوا، تاہم ان کے تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اکثر و بیشتر ان کے گھر آتا اور ریحانہ کو تحائف وغیرہ دے کر خود مینا کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا۔ ان تحائف میں قیمتی چیزیں صرف مینا کے لیے ہوتیں۔ کیا وہ آپ کے گھر ایک چوبی لیمپ اسٹینڈ نہیں لائی؟ کیا اس سے پوچھا تھا یہ کہاں سے لیا؟ اب پوچھ لیں، کچھ نہ کچھ تو اشارہ مل جائے گا۔

مینا کی شادی ہوئی مگر رشتہ داروں میں کسی کو بھی علم نہ ہوا۔ سنا ہے کہ اس نے شادی کے فارم میں مخدوم پور کا اپنا مستقل پتہ نہیں دیا تھا۔ آپ جانتے ہیں، کیوں؟ اس کی ساکھ کی وجہ سے۔ وہ ڈرتی تھی کہ مبادا آپ وہاں آ کر اس کی عیاشیوں کی داستانیں سن لیں۔ یہی نہیں، اور بھی کئی کہانیاں ہیں۔ میں آپ سے ایک بار ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ مطلع کیجیے کہ میں آپ کے دفتر آؤں یا رہائش گاہ پر؟ میرا پتہ نیچے لکھا ہوا ہے۔

مسز منیرا بیگم

کمال کا ذہن ماؤف ہوگیا۔ کیا کرے؟ کیا الزامات درست ہیں؟ اور اگر صحیح ہیں تو میں نے کس کے ساتھ شادی کی ہے؟ کیا وہ واقعی اتنے بدخصلت لوگ ہیں؟ انہوں نے دھوکہ دے کر شادی کی ہے؟ بیتے دن اس کے دل و دماغ میں گردش کرنے لگے۔

....

پیرو کا بھائی کے گھر آنا جانا تھا۔ جب کمال پہلی بار ان کے گھر گیا، وہ اس وقت بھی وہاں موجود تھا۔ مینا اپنے ساتھ لیمپ اسٹینڈ نہیں لائی تھی البتہ اس نے لانے کی خواہش ضرور ظاہر کی تھی جس پر کمال نے سوال کیا تھا کہ وہ اسے اتنا پسند کیوں ہے؟ اس نے مانا کہ ''پیرو کا کانے دیا تھا۔ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں، میں بھی ان سے پیار کرتی ہوں، اسی وجہ سے دوسرے چچا ان سے بہت حسد کرتے ہیں''۔

''ان کا نام کیا ہے؟''

''پیرو، لیکن اصل نام حفظ الرحمان ہے''۔

''وہ کرتے کیا ہیں؟''

''فی الحال تو کچھ نہیں مگر اگلے مہینے ایک جگہ ملازمت شروع کرنے والے ہیں۔ اپنی پہلی تنخواہ میں سے وہ مجھے ایک ساڑھی خرید کر دیں گے''۔

''واقعی؟ان کی رہائش کہاں ہے؟تم نے تو بتایا تھا کہ ننھیال یا ددھیال میں تمہارا کسی سے بھی رابطہ نہیں''۔

''ہاں، دوسروں کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں مگر پیرو کی بات الگ ہے''۔

''وہ رہتا کہاں ہے؟''

''آج کل مخدوم پور میں ہے''۔

''اور اس سے پہلے؟''

''جے پور میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا''۔

''پھر تم سے ملاقات کیسے ہوتی تھی؟''

''تعطیلات میں وہ مخدوم پور آتا تو دو چار دن ہمارے ہاں بھی رک جاتا تھا۔ وہ ہمارے لیے بستر کی چادریں اور کانچ کی چیزیں لایا کرتا تھا۔ جے پور میں بستر کی چادریں اور کانچ کی چیزیں بہت اچھی ملتی ہیں''۔

''ہاں، پھر تو تمہارے انکل دوسروں سے مختلف ہیں۔ کیا انہیں سب بھتیجوں اور بھتیجیوں سے ایسا ہی لگاؤ ہے؟''

''نہیں نہیں، وہ دوسروں کے گھر نہیں جاتے، اسی وجہ سے باقی رشتہ دار ان سے خوش نہیں''۔

''انہیں ایک دفعہ بلاؤ، یا پھر ہم دونوں مخدوم پور کا ایک چکر لگاتے ہیں''۔

اور پھر بینا کا سارا جوش و خروش ہوا ہو گیا۔ کہنے لگی، ''ممی کو ان لوگوں نے کبھی قبول نہیں کیا، پپا اور ممی کو میرا وہاں جانا پسند نہیں''۔

کمال کو پس منظر معلوم تھا۔ ریحانہ کی شادی اس شرط پر ہوئی تھی کہ حسین کی میڈیکل تعلیم کا سارا خرچہ ریحانہ کے باپ کی ذمہ داری ہوگی۔ جب اس نے خرچہ دینے سے انکار کر دیا تو حسین کے باپ نے ریحانہ کو طلاق دینے کو کہا مگر وہ نہ مانا۔ اس بنا پر دونوں خاندانوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اس پس منظر میں کمال نے بینا کے ساتھ مخدوم پور جانے پر اصرار نہ کیا، بس یہ کہا، ''ٹھیک ہے۔ ہمیں مخدوم پور جانے کی ضرورت نہیں۔ جب وہ تمہارے گھر آئے تو مجھے بتانا، میں آ جاؤں گا''۔

پیرو متعدد بار ڈاکٹر حسین کے گھر آیا مگر بینا نے اسے کبھی بھی اطلاع نہیں دی۔ شاید وہ کمال کے ساتھ کسی حتمی معاملہ پر پہنچنے سے پہلے پیرو کی ملاقات کرانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ اس نے شادی کے فارم پر مخدوم پور کا پتہ نہیں لکھا تھا، کیا اس وجہ سے کہ وہ وہاں اپنے رشتہ داروں، اور پیرو کو بھی، بے خبر رکھنا چاہتی تھی؟ شادی کے لیے اس قدر عجلت اور دھوکہ دہی کی وجہ بھی شاید یہی تھی۔

ہاں! شادی کے بعد ایک مرتبہ پیرو ان کے گھر آیا تھا۔ بینا نے اسے یاد دلایا کہ اس نے پہلی تنخواہ میں سے ساڑھی لانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے جواب دیا، ''اب تمہیں ایک شخص مل گیا ہے جو تمہیں ساڑھیاں لا دیا کرے گا''۔ بلاشبہ یہ ایک چچا کی طرف سے بھتیجی کو نامناسب جواب بلکہ ایک حاسد عاشق کا ردِ عمل تھا۔ کمال کو اپنے آپ پر تعجب ہوا کہ اس وقت پیرو کے لہجے کی تلخی اور حاسدانہ انداز کو کیوں نہ سمجھ سکا۔

....

چند روز پہلے ہی پوجا تعطیلات پر بینا بنگلور آئی تھی۔ دفتری اوقات تبدیل ہونے سے کمال کو دیر تک کام کرنا پڑتا تھا۔ اس روز بھی اسے تاخیر ہو گئی۔ اس کا خیال چھٹی کرنے کا تھا مگر بینا نے ہنستے ہوئے پوچھا کہ دفتر والے کیا سوچیں گے؟ کمال نے اسے اپنی بانہوں میں جکڑتے ہوئے جواب دیا کہ جو چاہیں، سوچیں، پروا نہیں۔ اسی اثنا میں کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ بینا سے الگ ہو کر اس نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک وجیہہ نوجوان کو کھڑے دیکھا جو قدرے گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا،''

کیا آپ نے مجھے پہچانا؟'' دماغ پر زور دینے کے باوجود بھی کمال اسے نہ پہچان سکا۔اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا،''میں ڈاکٹر حسین کا چھوٹا بھائی ہوں''۔

''کیا تم حفظ الرحمان ہو؟''

''جی بالکل، آپ نے مجھے پہچان لیا ہے''۔

''کیوں نہیں، میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے''۔

کمال اسے دیکھ کر مسرور ہوا، اندر لاکر بیٹھک میں بٹھا کر مینا کو اس کی آمد کی اطلاع دی۔اس کا خیال تھا کہ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوگی، مگر نہیں۔کمال کے سامنے سرسری انداز میں اس کا حال پوچھا،''پیرو چچا! آپ یہاں کیسے آئے؟''اس نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا،''پتہ چلا تھا کہ تم یہاں آئی ہوئی ہو اس لئے تمہارے گھر چلا آیا''۔کمال کو مینا کا رویہ پسند نہ آیا کہ ایک قریبی رشتہ دار گھر آئے اور اسے مناسب عزت نہ دی جائے۔کمال نے تو اچھے لفظوں میں اس کا سواگت کیا لیکن مینا کا لہجہ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔اس نے کمال کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا،''کیا آج دفتر نہیں جانا''۔کمال کے گمان میں آیا کہ شاید وہ چاہتی ہے کہ یہاں بیٹھنے کی بجائے وہ اپنے دفتر جائے۔یہی سوچ کر وہ دفتر چلا گیا اور دوپہر کے کھانے پر بھی گھر نہ آیا۔

شام کو کمال نے مینا کے رویّے میں قدرے بہتری محسوس کی۔پورٹیکو میں کرسیاں پڑی تھیں، کمال نے ان دونوں کو یہاں بیٹھنے کو کہا اور خود لباس تبدیل کرنے اندر چلا گیا۔مینا تو وہاں نہ بیٹھی بلکہ پیرو سے کہنے لگی،''آپ نے تو کہا تھا کہ آپ کو جلدی واپس جانا ہے''۔کمال کو اچھا نہ لگا کہ پیرو پہلی مرتبہ ان کے گھر آیا ہے اور مینا اسے جانے کا کہہ رہی ہے۔اس نے اعتراض کیا،''نہیں، نہیں، آپ نہیں جائیں گے۔آج کی شب یہیں رک جائیں۔میری تو آپ سے کوئی بات چیت بھی نہیں ہوئی، گپ شپ ہی رہے گی''۔لیکن مینا میں کوئی لچک نظر نہ آئی، کہنے لگی،''انہیں کوئی ضروری کام ہے اس لیے جانے دو۔پیرو انکل! جب آپ کو جانا ہی ہے تو جلدی کیجیے''۔پیرو انہیں الوداع کہہ کر چلا گیا۔اس کے جانے کے بعد مینا شانت نظر آنے لگی۔کیا وہ نہیں چاہتی تھی کہ کمال کی پیرو سے کوئی گفتگو ہو؟

انہی باتوں کو ذہن میں دہراتے ہوئے کمال نے منیرا بیگم کا خط دوبارہ پڑھا۔اس نے لکھا تھا،''۔۔۔لڑکی کے خاندان والوں کو بعد میں علم ہوا کہ وہ پیشہ ور عورتوں کے پاس تواتر سے جاتا ہے۔۔۔۔جب مینا سیکنڈ ایئر میں تھی وہ پیرو کے ساتھ مخدوم پور گئی۔اس سے پوچھو یہ غلط ہے کہ وہ دونوں الگ کمرے میں ایک ہی بستر پر سوتے تھے؟ آپ خود اندازہ کیجیے کہ جب ایک اٹھارہ سالہ لڑکی بائیس سالہ لڑکے کے ساتھ ایک ہی بستر پر سوتی رہی ہو تو کیا نہیں ہوتا، اور پھر لڑکا بھی وہ جس سے وہ شادی کرنا چاہتی ہو''۔اس خط میں مضمر اشارہ کمال کے لیے فطری طور پر تکلیف دہ تھا۔پہلے کا ایک اور واقعہ بھی اس کی یادداشت میں ابھر آیا۔

....

شادی کے بعد مینا کی سلاجنا میں دوسری بار آمد جلد ہی ہوئی تھی۔کمال نے اس کے labia majora پر ایک پھنسی دیکھی جس سے اسے بخار ہو گیا لہٰذا اس نے جلدی واپس جانے کا ارادہ کرلیا۔کمال بھی اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا تاکہ وہ اپنے باپ کو دکھا کر علاج کرا سکے۔باکل پور اسٹیشن پر کمال واپس آنے لگا مگر مینا نے اس کا بازو پکڑ کر اس سے رکنے کی درخواست کی۔وہ ٹھہرنا تو نہیں چاہتا تھا مگر انکار بھی نہ کرسکا۔آخر وہ اس کی بیوی تھی، بیمار بھی تھی۔وہ اس کی محبت بھری گرفت سے اپنا بازو نہ چھڑا سکا اس لیے اس کے ہمراہ چل دیا۔

کمال نے اپنے سسر سے بیماری کی علامات بیان کیں۔اس نے بیٹی کا معائنہ کیا مگر بیماری کا سبب نہ جان سکا۔اس

کی بیوی نے ہلکی سے سرزنش بھی کی، ''تم کیسے ڈاکٹر ہو، سینکڑوں مریضوں کا علاج کر چکے ہو مگر اپنی بیٹی کے عارضے کا علم نہیں ہو رہا؟'' بہر حال، اس نے کچھ دوائیں دیں جس سے مینا کو افاقہ ہوا۔

حال ہی میں کمال نے اپنے حشفہ پر تقریباً ویسی ہی پھنسی دیکھی۔ کیا یہ کسی قسم کی جنسی بیماری تھی؟ کیا یہ مرض پیرو کی وجہ سے لگا ہے جو اسے کسی طوائف سے منتقل ہوا ہو کیونکہ وہ متعدد مردوں سے جنسی تعلقات رکھتی ہیں؟ ممکن ہے ان میں سے کسی کو یہ مرض منتقل ہوا ہو؟ اور کیا پیرو اور مینا کے جنسی تعلقات کی بات درست ہے اور کیا مینا کی تکلیف کا سبب پیرو ہے؟ کیا اسی وجہ سے مینا نے شادی کے پہلے ہی دن اسے کنڈوم دیئے تھے؟ کیا وہ اسے اس مرض سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی؟ خوف کے باعث یا محبت کی وجہ سے؟ اس نے چھپایا کیوں؟ شاید اس لیے کہ وہ بتا ہی نہیں سکتی تھی؟ یہ باتیں سوچ کر کمال بے چین ہو گیا اور اسی وجہ سے وہ دفتری امور پر کما حقہ توجہ نہ دے پایا۔ وہ مینا کے منہ سے سچ سننا چاہتا تھا۔ وہ بریگیڈ اسپتال جا کر ڈاکٹر سے ملا۔ اس نے مرض کی علامت بچشم خود دیکھنے کو کہا۔ کمال کو شرم محسوس ہوئی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا لہٰذا اس نے جھجکتے ہوئے پتلون اتاری۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے اسے جلدی امراض کے ماہر ڈاکٹر ہلدر سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ کمال اس کے کلینک چلا گیا۔

ڈاکٹر ہلدر نے بغور معائنہ کرنے کے علاوہ اس سے متعدد سوالات کے علاوہ یہ بھی پوچھا گیا، ''کیا آپ نے پہلی ہی کوشش میں آرام سے دخول کیا تھا؟'' کمال کو اپنے فورینسک مطالعہ کا خیال آ گیا۔ انہیں دورانِ تربیت اعضائے جنسی کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ کنواری عورت کے اندام نہانی کے منہ پر ایک جھلی سی ہوتی ہے جو پہلی بار دخول کے سبب پھٹ جاتی ہے جس سے خون نکل آتا ہے۔ اسے خود اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ مینا کے پردۂ بکارت کے پھٹنے کی وجہ کوئی اندورنی تکلیف ہو سکتی ہے یا انگلی اندر ڈالنے کے سبب سے یا پھر۔۔۔۔۔۔ وہ اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ آج کا دن اس کے لیے بُرا ثابت ہوا۔

وہ گھر واپس آیا مگر مضطرب رہا۔ مینا سے بات کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے اسپتال بلا کر اس کا چیک اپ کرایا جائے مگر گھر میں ٹیلیفون نہ ہونے کی وجہ سے بات نہ ہو سکی۔ وہ اضطراری حالت میں گھر کے لان پر ٹہلتا رہا۔ آخر اس نے باہر جا کر مینا سے فون پر بات کر کے گھر آنے کو کہا۔ اس نے پوچھا کہ کب؟ مگر کمال نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا، ''کوئی جلدی نہیں، دو چار دن میں آ جانا''۔ حالانکہ اس کی خواہش تھی کہ وہ فوراً پہنچ جائے۔

....

کمال دفتر میں مصروف تھا جب اردلی نے ایک ملاقاتی کے نام کی پرچی میز پر رکھی۔ نام پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھا، ''منیرا بیگم''۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا، ''کیا اسے منیرا بیگم سے ملنا چاہیے یا انکار کر دے؟'' بالآخر ملنے کا ارادہ کیا۔ اردلی کو کہا کہ اسے اندر بھیج دے۔ ساڑھی میں ملبوس درمیانی عمر کی عورت امیرانہ انداز لیے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ کمال نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ جب وہ بیٹھ گئی تو پوچھا، ''فرمایئے! میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''کچھ نہیں۔ کیا آپ نے میرا خط پڑھ لیا تھا؟''

''آپ اپنا تعارف تو کرایئے؟''

''میں مسز ریحانہ حسین کی دور پار کی رشتہ دار ہوں''۔

''آپ ہمارے درمیان بدمزگی کیوں پیدا کرنا چاہتی ہیں؟ میں نے تو آپ کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی''۔

''یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے آپ جیسے ایک شریف النفس شخص کے ساتھ دھوکہ کیا ہے''۔

''آپ کو اس سے کیا حاصل ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں، مگر ان لوگوں کی حقیقت کھل جائے گی''۔

کمال سمجھ گیا کہ یہ عورت ان لوگوں سے کوئی پرانی رنجش کا بدلہ لینا چاہتی ہے، بہر طور اس نے اسے بات کرنے کو کہا۔ وہ تفصیل بتانے لگی،'' جب مینا سیکنڈ ائیر میں تھی وہ ایک بار پیرو کے ساتھ مخدوم پور گئی۔ اس سے پوچھیں وہ گئی تھی یا نہیں؟ کیا اس کا وہاں قیام ڈیڑھ ماہ تھا یا نہیں؟ کیا وہ پیرو کے ساتھ ایک ہی بستر پر نہیں سوتی رہی؟''

کمال کے لیے یہ انکشاف تکلیف دہ تھا، مگر اس نے اعتراض کیا،'' پھر کیا ہوا؟ وہ اپنے چچا کے ساتھ آبائی گاؤں گئی ہو گی۔ وہ چچا کے ساتھ سوئی بھی ہو گی۔ اس میں برائی ہی کیا ہے؟''

یہ سن کر اس کے لبوں پر سنگدلانہ مسکراہٹ پھیل گئی،'' سات آٹھ برس کی بھتیجی چالیس پنتالیس چچا کے ساتھ سو سکتی ہے مگر آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اٹھارہ سال کی بھتیجی جب بائیس سالہ چچا کے ساتھ، اور چچا بھی وہ جس کے ساتھ وہ شادی کی خواہش مند ہو، سوتی ہو تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا''۔

کمال کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا،'' یہ ماں باپ کی پیٹھ پیچھے ہوا ہوگا، انہیں علم ہی نہیں ہو سکا''۔ خاتون نے ترت جواب دیا،'' بس کے مسافروں کو اس کا علم تھا، صرف ماں باپ کو نہیں پتہ، کیا عجیب بات ہے''۔

''مسافروں کو کیا علم تھا؟''

''واپس آتے ہوئے مینا اور پیرو ایک دوسرے کی بغل میں بیٹھے تھے۔ مینا کو نیند آ گئی تو پیرو کے شانے پر سر رکھ کر سو گئی۔ پیرو نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس انداز نشست پر مسافروں نے بھی اعتراض کیا تھا''۔

''کیا مسافروں نے مینا کے والدین کو بتایا؟ انہیں کیسے علم ہوا؟''

''مخدوم پور کے کچھ لوگ ان دونوں کے چال چلن پر اتنے برانگیختہ تھے کہ مینا کے ایک اور چچا نے ڈاکٹر حسین لکھا کہ مینا کو فوری طور پر واپس بلا لے۔ ان دونوں کو علم تھا بلکہ پیرو کے نام مینا کا تحریر کردہ ایک خط بھی ان کے ہاتھ لگا تھا''۔

''ان کے ہاتھ کیسے لگا؟''

''مینا نے ملازمہ کو خط پوسٹ کرنے کو دیا، اس کی ماں نے ملازمہ سے لے کر پڑھ لیا۔ ریحانہ تو ان دونوں کی شادی پر بھی رضامند تھی۔ یاد ہے میں نے آپ کو لکھا بھی تھا۔ کیا آپ نے پڑھا نہیں؟''

کمال خاموش رہا، اور منیرا بیگم ایک فاتح کی طرح وہاں سے چلی گئی۔ وہ رنجیدہ دل گھر گیا، دیکھا تو مینا لان میں بیٹھی اس کی منتظر تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر اندر جانے لگا تو وہ بھی ساتھ ہی کمرے میں آ گئی اور دروازہ بند کر کے اس سے بغل گیر ہو کر بے تحاشہ بوسے لینے لگی۔ کمال کے لیے یہ صورتِ حال ناخوشگوار تھی اس نے منع نہ کیا لیکن اس کی بوسہ بازی کو پسند بھی نہ کیا، بلکہ اس سے کراہت محسوس کی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے ایک اژدہے نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا ہو جو اس کی ہڈیاں چور چور کر کے اسے کھا جائے گا۔ وہ بے بسی کی تصویر بنا کھڑا رہا۔

لباس تبدیل کر کے وہ غسل خانہ چلا گیا۔ ہاتھ منہ دھو کر بوجھل پن سے باہر آ کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھا مگر وہاں کی بجائے بیٹھک میں جا بیٹھا۔ وہ بھی آ کر سامنے بیٹھ گئی۔ کمال مضطرب تھا، اس موضوع پر کیسے بات کرے۔ کیا وہ واقعی اتنی محبت کرنے والی ہے؟ کیا وہ اسے بتائے نہ بتائے کہ اس نے آج کیا باتیں سنی ہیں؟ پھر صحیح اور غلط کی کیسے تصدیق ہو؟ اگر الزامات غلط ہوئے تو وہ اس کشمکش اور کبیدہ خاطری سے آزاد ہو جائے گا، اور اگر باتیں درست ثابت ہوئیں تو؟ وہ فیصلہ نہ کر سکا۔

شام اسی بے چینی میں گزری۔ کھانا تناول کر کے وہ بستر پر دراز ہو گئے۔ وہ پھر بے چینی محسوس کرنے لگا۔ بالآخر اس نے ذہنی تناؤ سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور دھیرے سے بولا ''مینا! مجھے تمہارے ساتھ ایک سنجیدہ بات کرنا ہے''۔ اس نے آلکسی سے جمائی لیتے ہوئے کہا، ''کرو''۔

وہ ہچکچاہٹ سے بولا، ''میں نے ایک بڑی تکلیف دہ بات سنی ہے''۔

''وہ کیا؟''

''میں نے سنا ہے کہ تمہارے اپنے چچا کے ساتھ جسمانی تعلقات تھے''۔

وہ بستر پر بیٹھ گئی، سستی اور کاہلی ختم ہو چکی تھی، ''تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں نہیں کہہ رہا، لوگ کہتے ہیں۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں بات صحیح ہے یا غلط''۔

''تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟''

''تقریباً۔ مجھے بتاؤ کہ اس میں حقیقت ہے یا نہیں''۔

''کیا یہ بات درست ہو سکتی ہے؟ سوچا بھی جا سکتا ہے؟ وہ میرا چچا ہے، مجھ سے پیار کرتا ہے۔ دوسرے رشتہ داروں کو یہ پسند نہیں۔ کچھ لوگ بدنام کرنا چاہتے ہیں''۔

''ہاں! ہو سکتا ہے مگر ان کی معلومات اس قدر مفصل ہیں کہ رد کرنا مشکل ہے''۔

''کیا تفصیلات ہیں؟''

''ان کا کہنا ہے کہ جب تم سیکنڈ ائیر میں تھیں، تم اس کے ساتھ مخدوم پور گئی تھیں۔ تم وہاں گئی تھیں یا نہیں؟''

''ہاں، میں گئی تھی۔ اس نے سب کی موجودگی میں مجھے وہاں لے جانے کو کہا تھا۔ ماتا پتا دونوں میں سے کسی نے جانے سے منع نہیں کیا لیکن علیحدگی میں ماں نے مجھے اس کے ساتھ جانے سے روکا تھا۔ میں نے کہا کہ چچا کو کہہ دیں مگر انہوں نے چچا کو کہنے کی بجائے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کے ساتھ جانے سے انکار کروں۔ میں ایسا کیوں کرتی؟ میں نے جواب دیا کہ اگر آپ اسے نہیں کہہ سکتیں تو میں ضرور جاؤں گی۔ اور پھر میں چلی گئی''۔

اب کمال نے اس سے جسمانی تعلقات کے بارے میں کوئی براہِ راست سوال نہ کیا۔ ''لوگوں نے بتایا ہے کہ مخدوم پور سے واپسی پر تم اور پیرو اس طرح ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ مسافروں کو اس پر اعتراض کرنا پڑا تھا''۔

یہ سن کر مینا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ پھر قدرے خاموشی کے بعد گویا ہوئی، ''تمہیں علم ہی ہے کہ مجھ پر اکثر اوقات غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ بس میں میں اپنا سر اس کے کندھے پر لگا کر سو گئی تھی لیکن کسی مسافر نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ چچا بیرو بھی ہمارے ساتھ تھے، انہوں نے پیرو کو سیدھا بیٹھنے کو کہا تھا، اور یہ بات خود انہوں نے پتا جی کو بتائی تھی۔ بیرو چچا اسی قسم کا شخص ہے، وہ برداشت نہیں کر سکا تھا کہ میں پیرو چچا کو اس سے زیادہ پیار کرتی ہوں''۔

''کیا تم وہاں ڈیڑھ مہینہ رہی ہو؟''

''میں اتنا عرصہ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ پیرو چچا سے واپسی کو کہا بھی تھا مگر وہ نہیں مانا۔ میں نے دو چار خطوط پتا جی کو بھی لکھے۔ بعد میں علم ہوا کہ وہ خط جو میں نے چچا پیرو کو پوسٹ کرنے کو دیئے تھے، وہ انہوں نے نہیں بھیجے۔ میں اکیلی واپس نہیں جا سکتی تھی اس لیے وہاں رکنا پڑا''۔

''اور تم وہاں ایک الگ کمرے میں پیرو کے ساتھ ایک ہی بستر پر سویا کرتی تھیں؟''

''نہیں، بالکل نہیں، ہاں یہ درست ہے کہ ہم ایک الگ کمرے میں سوتے تھے مگر ایک بستر پر نہیں''۔

''اس وقت تم کوئی بچی نہیں تھیں اور پھر تمہارا اس کے ساتھ شادی کا ارادہ بھی تھا، اس صورت میں کیا یہ مناسب تھا کہ۔۔۔۔۔''

اس نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا، ''تمہیں کس نے کہا کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتی تھی؟''

''بہت سے لوگوں کو اس بات کا علم ہے۔ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ تمہاری ماں بھی اس شادی پر رضامند تھی''۔

یہ سنتے ہی اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اب اس کے لہجے میں التماس تھا، ''یقین کرو، ایسا کچھ نہیں تھا''۔

''پھر، کیا بات تھی؟''

'ایک شب میں واش روم جانے کے لیے اٹھی تو میرے کانوں میں امی اور پتا کی باتیں کرنے کی مدھم سی آوازیں آئیں۔ وہ اسی موضوع پر بات کر رہے تھے''۔

''کیا بات ہو رہی تھی؟''

''امی کہہ رہی تھیں، 'کیا ہوا اگر وہ اس کا چچا ہے۔ جب وہ چاہتے ہیں تو شادی کر دینی چاہیے'۔ پتا جی نے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا، کیا تم پاگل ہوگئی ہو۔ امی کا جواب تھا، 'میں نہیں، تمہاری بیٹی پاگل ہوئی ہے'۔ پتا جی نے جواب دیا، 'وہ پاگل ہوگئی ہو گی، مگر میں نہیں۔ یہ رشتہ محرمات میں سے ہے۔ وہ میرا بھائی ہے اور یہ بیٹی۔ شادی کے بعد وہ میرا داماد اور مینا میری بھابھی بن جائے گی۔ لوگ اس خاندان کے بارے میں کیا باتیں کریں گے؟''

''تمہارا خاندان ہے ہی ایسا''، امی نے ترت جواب دیا۔ اس پر ابو بولے، ''میرے خاندان کا نام مت لو، میں تمہارے خاندان کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں''۔ اب امی نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا، ''کیا تم نور جہاں سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے؟ کیا وہ تمہاری کزن نہیں تھی؟ تم اپنے چچا کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنے کے خواہشمند تھے۔ تمہارا بھائی بھی یہی چاہتا تھا۔ فرق کیا ہوا؟''

ابو نے ماں کو سمجھایا، 'ریحانہ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ محرم رشتہ نہیں تھا۔ ہمارے مذہب میں کزن کے ساتھ شادی کی اجازت ہے لیکن اپنے ماموں یا چچا کے ساتھ شادی ممنوع ہے۔ اور مہربانی فرما کر نور جہاں کا دوبارہ ذکر مت کرنا'۔

''کیوں نہ کروں؟ کیا تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے؟''

''ہاں، چاہتا تھا لیکن تم سے شادی کے بعد میں نے اس سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ یاد ہے پچھلے سال تمہارے عاشق منہاج کا ایک خط اس کتاب میں رکھا ہوا ملا تھا۔ یاد ہے؟''

''تم منہاج کا نام لے کر میرا منہ بند نہیں کر سکتے۔ مجھے بتاؤ تم اس شادی کا بندوبست کر سکتے ہو یا نہیں؟''

''بالکل نہیں''۔

''ٹھیک ہے، پھر اپنی بیٹی اور بھائی کو سنبھالو۔ مجھے نہیں پتہ''۔

''اچھا! میں دیکھ لوں گا، لیکن تم اپنے دیور کے معاملہ میں دخل اندازی مت کرو''۔

''وہ میرا کیا لگتا ہے، تمہارا بھائی ہے''۔

''لیکن اس معاملہ میں وہ تمہاری طرفداری چاہتا ہے۔ اب اس دوبارہ ذکر مت کرنا''۔

وہ دونوں آپس میں بحث کرتے رہے اور میں بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ کمال نے سوال کیا، ''کیا یہ تمہارے خط پکڑے جانے کے بعد کا واقعہ ہے یا اس سے پہلے کا؟''

یہ سن کر مینا سراسیمہ ہوگئی۔ دھیرے سے بولی، ''یہ بات بھی تمہیں بتا دی گئی ہے؟''

''صرف یہی نہیں، اور بھی بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ ان سب کو جھٹلانا مشکل ہے''۔

اور پھر مینا نے رونا شروع کر دیا اور کمال الٹا اسے تسلیاں دینے لگا، '' آرام سے۔ تم رو کیوں ہی ہو؟''

'' کیونکہ میرے پتی کو دوسروں کی باتوں پر یقین ہے، مجھ پر نہیں۔ میں نہیں تو اور کون روئے گا؟ دوسرے لوگ تمہاری نظروں میں قابلِ اعتبار ہیں، میں نہیں۔ مجھے بتاؤ نا، ایسا کیوں ہے؟''

کمال اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا، ''سنگیتا کے ساتھ میرے تعلقات جسمانی نہیں تھے۔ ہم دونوں شادی کرنے کے خواہشمند تھے، اور یہ بات میں تمہارے ماں باپ کو پہلے ہی بتا چکا تھا۔ لیکن تمہارے تعلقات تو کلیتاً جسمانی تھے، اور تم لوگوں نے مجھ سے چھپائے رکھا۔ کیا تمہارے خیال میں یہ میرے ساتھ دھوکہ دہی نہیں۔ تم لوگوں نے غلط بیانی کر کے مجھے فریب دیا ہے۔ اگر یہ ساری باتیں میرے علم میں ہوتیں تو ان کے باوجود بھی میں تم سے شادی کر لیتا، لیکن وہ میری مرضی پر منحصر ہوتا۔ جو کچھ تم نے کیا وہ سراسر فریب اور دھوکہ ہے''۔

وہ کچھ بولے بغیر روتی رہی۔ کمال نے پھر اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا، ''میں نے اپنے متعلق ہر بات بتا دی تھی، تم کیوں چھپائے بیٹھی رہی تھیں؟'' اس نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا، ''تمہارے تعلقات پر کوئی داغ دھبہ نہیں تھا، اسی لیے تم بتا بھی سکتے تھے مگر میرے تعلقات میں عزت کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ایک لعنت، باعثِ رسوائی اور ممنوعہ تعلق تھا۔ میں کس منہ سے ذکر کرتی؟ کوئی بھی مجھ سے شادی کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اگر کوئی رضامند ہو بھی جاتا تو اتنا جہیز طلب کرتے جسے دینے کی میرے باپ میں بساط نہیں تھی۔ تم نے جہیز نہیں مانگا اس لیے میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں تمہیں ساری باتیں اس لیے نہ بتا سکی کہ مبادا تم بھی شادی سے انکار کر دو۔ اوپر سے مجھے ماں باپ دونوں نے یہ باتیں تمہیں بتانے سے منع کر دیا تھا۔ پلیز، میری بے بسی سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہاری صورتِ حال میری طرح قابلِ رحم نہیں تھی''۔

اگرچہ کمال اس کی بیچارگی سمجھ رہا تھا مگر یہ سب کچھ اسے پسند نہ آیا۔ کہنے لگا، ''جب تمہیں علم تھا کہ اس تعلق کا نتیجہ رسوائی اور ذلت کے سوا کچھ نہیں تو کیوں اس حد تک چلی گئی تھیں؟'' مگر مینا نے اس پر سخت ردِعمل کا اظہار کیا، ''میں اب بھی ان تعلقات کو باعثِ شرم نہیں سمجھتی۔ تم چچا اور بھتیجی کے رشتہ کو ذہن میں کیوں رکھے بیٹھے ہو؟ یہ سوچو کہ ایک لڑکی ایک لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی، اس میں برائی ہی کیا ہے؟''

''میں چچا بھتیجی کے رشتہ کو سامنے رکھ کر نہیں سوچ رہا، اور اگر ایسا سوچوں بھی تو یہ قابلِ اعتراض بات نہیں۔ بھتیجی اور چچا کی شادیوں کی مثالیں موجود ہیں۔ رسول اللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ کی اپنے چچا علی سے شادی ہوئی تھی۔ میرا اعتراض صرف اتنا ہے کہ جب تمہارے تعلقات کسی اور سے تھے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی رکھی؟''۔

''تم نے بھی تو یہی کیا تھا۔ پریم کسی سے، شادی مجھ سے۔ اگر وہ رضامند ہو جاتی تو تم مجھ سے کبھی شادی نہ کرتے۔ کیا یہ قابلِ اعتراض نہیں؟ کیا جسم کی سپردگی پر ہی اعتراض کیا جاتا ہے؟''

اس کے بعد ان دونوں کے بیچ مزید کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ آنسو بہاتی رہی اور کمال دل کبیدگی کی حالت میں چپ چاپ لیٹا رہا۔ مینا اس کے ساتھ دراز تھی۔ جسمانی لحاظ سے اتنی قربت مگر ذہنی طور پر ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ رات گزرنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آخر کار وہ بولی، ''کیا سو گئے ہو؟''

''نہیں''۔

''مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔ کیا مجھ سے ناراض ہو؟''

''نہیں''۔

''پلیز، ناراض مت رہو۔ باتیں کرو''۔

''اب بات کرنے کو کیا رہ گیا ہے؟''

''بُرا مت مانو پلیز۔ میری صورتِ حال سمجھو۔ مجھ سے ایک خطا ہوئی، اس کی پردہ داری میں مزید خطائیں ہوتی رہیں۔ میں ان تعلقات کو ختم کرنا چاہتی اور تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی''۔

کمال اس بات سے قدرے متاثر ہو کر کہنے لگا، ''مینا! مجھے اور کیا بتاؤ گی؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس کے ساتھ ایسے ہی سوتی رہی ہو جیسے میرے ساتھ''۔

اس نے دل کی گہرائیوں سے اظہارِ ندامت کرتے ہوئے منت کی، ''مجھ پر یقین رکھو۔ بلاشبہ میں اس کے ساتھ ایک الگ کمرے میں سوتی رہی ہوں مگر ایک بستر پر نہیں، میرا بستر الگ تھا۔ وہاں ایک لالٹین بھی روشن رہتی تھی''۔

''پھر؟''

''ایک رات میری آنکھ کھلی تو دیکھا وہ دیوانوں کی طرح مجھ سے لپٹ کر بوسے لے رہا تھا۔ میری قمیص کے بٹن کھلے تھے اور وہ میری چھاتیاں مَسل رہا تھا''۔

کمال کے لیے یہ اعتراف اور بیان انتہائی تکلیف دہ تھا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو رکھنے کی بہت کوشش کی۔ اسے اچھا تو نہ لگا مگر مینا کی باتوں میں سچائی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کہتی رہی، ''یقین کرو، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا''۔ کمال کو یقین نہ آیا اور اس کا اس نے اظہار بھی کر دیا، ''میں کیسے اعتبار کروں؟''

''کیوں، اعتبار کیوں نہیں کر سکتے؟''

''مجھے یقین نہیں ہے کہ ایک مرد تمہاری قمیص کے بٹن کھولے اور۔۔۔۔''

''میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ پہلا موقع تھا۔ پہلی دفعہ اس نے شام کے دھندلکے میں چھت پر مجھے گلے لگا کر بوسے لیے تھے۔ میں بھی خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ تاہم بعد ازاں میں نے والد صاحب کو لکھا کہ مجھے یہاں سے لے جائیں۔ پیرو کے رویے میں کسی قسم کا پچھتاوا محسوس نہ ہوا۔ وہ پہلے کی طرح رہتا رہا۔ اس پر میں قدرے مطمئن ہو گئی، لیکن اس کے بعد بھی مجھے اکیلی پا کر وہ بغل گیر ہونے اور چومنے سے باز نہ آیا۔ قمیص کے بٹن کھولنے کا وہ پہلا واقعہ تھا''۔

کمال کو یہ سب کچھ ناممکن سا لگا۔ مینا نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا، ''مجھے عجیب سا تو لگا مگر یقین کرو میں خود ایسا بالکل نہیں چاہتی تھی۔ میں اس سے محبت کرتی رہی لیکن ایسے تعلقات کا سوچا بھی نہیں تھا، اسی وجہ سے اس رات میں نے اعتراض کرتے ہوئے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ وہ مجھ سے فوراً پرے ہٹ گیا''۔

''مان لیا کہ تم اس قسم کے تعلقات نہیں چاہتی تھیں اور تم سے زبردستی کی گئی، مگر ایک بار ایسا ہو جانے کے باوجود اس کے ساتھ ربط کیوں رکھا؟''

''اس خوف سے کہ وہ میرے والدین تک ہماری باتیں نہ پہنچا دے''۔

''اس سے زیادہ وہ اور کیا تمہارے والدین کو بتا سکتا تھا؟ لیکن انکل بیرو نے تو اپنے خط میں تفصیل لکھ دی تھی''۔

''ٹھیک ہے مگر اس وقت تک مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ انکل بیرو نے ایسا خط لکھا تھا۔ گھر واپس آئی تو ماں اور باپ دونوں نے مجھ سے بات نہ کی، بلکہ انہوں نے پیرو کو لکھے ہوئے میرے خطوط پکڑ لیے مگر اچھی بری بات نہ سمجھائی۔ ہاں البتہ ان کا رویہ ترش اور غیر مشفقانہ ہو گیا جس کے سبب میں غلطیوں پر غلطیاں کرتی رہی''۔

''اگر ایسا ہی تھا تو تم اپنے چچا سے شادی کیوں کرنا چاہتی تھیں؟''

''ماں سمجھایا کرتی تھی کہ مجھے کوئی مرد چھونے کی ہمت نہ کرے اور یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ میں اپنی عصمت پر حرف آئے بغیر خاوند کے پاس ایسے جاؤں جیسے میں نے جنم لیا تھا۔ پیرو چچا کے ہاتھ میرے بدن پر لگتے رہے اس لیے میرے ذہن میں آیا کہ اگر وہ میرا خاوند بن جائے تو اس صورت میں خطاؤں سے پاک صاف ہو جاؤں گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان سے شادی کرنا چاہتی تھی''۔

اعترافِ خطا نے کمال کے دل کو چھو لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ مینا بے قصور ہے۔ وہ اتنی مکار اور زیرک نہیں جتنا وہ گمان کر رہا تھا۔ اس پر بھروسہ نہ کرنے سے بہتر ہے کہ خود کو دھوکے میں رکھے۔ بااین ہمہ، مینا کے پرانے تعلقات کی چبھن کم نہ ہوئی۔ شادی کے وقت ان باتوں کو پوشیدہ رکھے جانے کا بھی اسے ملال تھا، پھر بھی اس نے مینا کو قبول کر لیا۔ اسے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے بولا، ''خبردار آئندہ ایسی غلطیوں کا ارتکاب مت کرنا، اور ایسے لوگوں سے محتاط رہنا''۔ اس نے سر ہلا کر کمال کی بات پر عمل کرنے کا اظہار کیا اور پھر دونوں دل کے بوجھ سے نجات پا کر آرام سے سو گئے۔

....

کبھی کبھی علم انسان کے دکھوں کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ جاہل اور کم علم لوگ ان باتوں کو بآسانی تسلیم کر لیتے ہیں جسے پڑھا لکھا شخص ماننے میں تامل کرتا ہے۔ کمال کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ نیشنل پولیس اکیڈمی میں تربیت کے دوران انہیں کئی چھپی اور ناقابلِ فہم تحریروں کی رمز کشائی بھی سکھائی جاتی تھی۔ مینا کو اس کا اتہ پتہ نہیں تھا۔ اپنی بے گناہی کا مزید یقین دلانے کی خاطر اس نے پیرو کو لکھے گئے اپنے خطوط کا ایک بنڈل کمال کو دیتے ہوئے کہا تھا، ''ان خطوط سے تمہیں اس وقت کی میری ذہنی حالت کا اندازہ ہو جائے گا''۔

''میں تمہاری گفتگو سے اندازہ لگا چکا ہوں۔ میں تمہارے چچا کے رویے کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ مجھے وہ خطوط دو جو اس نے تمہیں لکھے تھے''۔

''تم سے شادی کی بات چیت کے وقت ماما نے سارے خطوط ضائع کر دیے تھے''۔

''اس نے یہ خطوط ضائع کیوں نہیں کیے؟''

''یہ پیرو کے پاس تھے''۔

''تم نے کیسے لیے؟''

''جب وہ جے پور سے مخدوم پور جانے کے لیے راستے میں ہمارے ہاں آخری بار آیا تو میں نے اس کے سامان سے نکال لیے تھے''۔

کمال نے اس کی وجہ نہیں پوچھی کیونکہ بات واضح تھی۔ اس نے خطوط پڑھنا شروع کر دیے۔ جس مقصد کے لیے مینا نے اسے خط دیے تھے، کمال پر مطلوبہ اثر نہ ہوا، برعکس اس کے اس کے دکھ میں اضافہ ہی ہوا۔ ان خطوط میں بالکل انہی جذبات سے بھرپور اظہارِ محبت تھا جو اس نے کمال کے ساتھ ظاہر کیا تھا۔ لکھا تھا:

> پیرو چچا!
>
> تم چلے گئے مگر میری بُری حالت ہے۔ دن تمہاری یاد میں کٹتا ہے، رات آنکھ نہیں لگتی۔ صرف سپنوں میں تمہیں ملتی ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں تمہارے گھر کی جانب بھاگی چلی جا رہی ہوں۔ اگر میرے پنکھ ہوتے، میں اڑ کر تمہاری کھڑکی میں آ بیٹھتی۔ تمہیں اپنے پروں میں چھپا کر تمہاری پسندیدہ جگہ ہوا محل لے جاتی۔ ہم ایک پتھر پر جا بیٹھتے۔ تمہیں بے تحاشا چومتی، مجھے نہیں پتہ تم کیا کرتے۔ شاید تم مجھے نہ

چومتے۔خفا نہ ہونا، میں ساری رات تمہارے ساتھ رہتی۔

رات بیت جاتی۔ پھر میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کر واپس لوٹ آتی، کسی کو علم ہی نہ ہوتا، کوئی مشکل نہ ہوتی۔لیکن افسوس!میرے پنکھ نہیں ہیں۔تمہارے پاس آنے کے لیے ریل یا بس پر انحصار ہے۔ہاں، میں آؤں گی، بہت جلد آؤں گی۔

ہمیشہ تمہاری

مینا

کمال کو بھی تو اس نے اسی انداز، انہی لفظوں میں لکھا تھا۔اگر کوئی فرق تھا بھی تو انتہائی معمولی، گویا جذبات کے اظہار میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔وہی فرسودہ اور پرانی باتیں۔ پھر اس کے والدین کو مینا کے تعلقات کا علم تھا اس لیے ان کے شور مچانے کا کوئی جواز نہیں تھا جو وہ شادی کی بات چیت کے دوران کرتے رہے تھے۔دوبارہ دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ تمام خطوں پر کہیں کہیں سیاہی پھیری گئی ہے مگر اصل خطوط کی روشنائی اور چھپائے گئے فقروں کی روشنائی میں فرق تھا۔کمال کے لیے نتیجہ پر پہنچنا مشکل نہ ہوا کہ ان میں کچھ فقروں کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ بھی ایک وقت اور ایک نشست میں۔حذف شدہ فقرے یقیناً قابلِ اعتراض الفاظ اور مفہوم کے حامل ہوں گے اسی لیے تو ان کو کاٹنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔کمال کے چہرے پر بدلتے رنگ دیکھ کر مینا نے مضطرب ہو کر پوچھا، ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔اب مجھے دفتر جانا چاہیے کیونکہ کل میں جلدی گھر آ گیا تھا''۔

مینا نے کمال کی تیاری میں مدد کی جو اس کے نزدیک اظہارِ خلوص نہیں تھا، اور پھر وہ جلدی سے تیار ہو کر دفتر چلا گیا۔ وہاں سے وہ پولیس ٹریننگ کالج کی فورینسک سائنس تجربہ گاہ گیا اور الٹراوائلٹ شعاعوں کی مدد سے مخفی حصوں کو پڑھنے کی کوشش کی۔اس کے تمام شکوک درست ثابت ہو گئے۔دفتر واپس آکر وہ بہت مضطرب رہا اس لیے وقت سے پہلے ہی گھر چلا آیا۔لباس تبدیل کرنے اور کھانے کے بعد چپ چاپ بیٹھ گیا۔مینا نے اس سے خاموشی کا سبب پوچھا۔کمال نے جواب دیا، ''مینا! مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔تم اب بھی مجھ سے باتیں چھپا رہی ہو''۔

''کیسے؟''

میں ان خطوط کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔تم نے خود ہی مجھے دیئے، پھر ان میں کانٹ چھانٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''کیا کہہ رہے ہو؟''

اس نے خط نکال کر اسے دکھائے اور پوچھا، ''ان حصوں پر سیاہی کیوں لگائی گئی ہے؟'' مینا نے بات بنانے کی کوشش کی، ''لکھتے وقت ان کو کاٹا گیا تھا''۔

''مینا! میں کیسے یقین کروں؟ تم ابھی تک باتیں بنا کر سنا رہی ہو''۔

''کیا مطلب؟''

''پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ہر خط ایک ہی روشنائی میں تحریر کیا ہوا ہے مگر کاٹے گئے فقروں پر کوئی اور سیاہی ہے۔ان فقروں کو کاٹنے کے لیے دوسری روشنائی کیوں استعمال کی گئی؟''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''میں کیا کہوں۔میں نے وہ سارے فقرے پڑھ لیے ہیں جنہیں تم نے چھپانے کی کوشش کی تھی''۔

''کیسے؟''

''الٹرا وائلٹ شعاعوں کی مدد سے''۔

''تم میرے خطوط لیبارٹری میں لے گئے تھے؟ تم اتنے زیرک ہو کہ تمہیں قائل کرنا ممکن نہیں، اتنے چالاک ہو کہ تمہیں فریب نہیں دیا جا سکتا، اور اس قدر باخبر کہ خوش نہیں ہو سکتے۔ تم کبھی بھی خوش نہیں رہو گے''۔

''ہو سکتا ہے لیکن میں اتنا بے وقوف بھی نہیں کہ لوگ مجھے فریب دیتے رہیں اور میں سمجھ نہ سکوں''۔

''میں نے تمہیں دھوکہ دینے کے لیے کانٹ چھانٹ نہیں کی۔ تم تو خود ہی اذیت میں مبتلا رہتے ہو۔ میرا خیال تھا کہ تمہارے دکھوں کو کم کر دوں گی''۔

''جعل سازی اور فریب سے میرے دکھ کم نہیں ہو سکتے۔ اگر تم مخلص ہو تو سچ بات بتا دو، اس سے مجھے سکون ملے گا''۔

مینا خاموش رہی، کمال دفتر چلا گیا مگر بے چینی کی یہ کیفیت تھی کہ زیادہ دیر کام نہ کر سکا اور واپس گھر آ گیا۔ مینا بے تابی سے اس کی منتظر تھی۔ کمال کے گھر داخل ہوتے ہی وہ بھاگ کر اس کے پاس آئی اور پوچھا، ''کیا تم مجھ سے بہت خفا ہو؟''

''خفا تو نہیں مگر مطمئن بھی نہیں''۔

''کیوں؟''

''میں جعل سازی اور فریب قبول نہیں کر سکتا۔ مجھے کذب بیانی سے نفرت ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں کہ میری بیوی۔۔۔۔۔''

''بات پوری ہونے سے پہلے ہی مینا بول اٹھی، ''اتنے پریشان کیوں ہو؟ خطوں میں کوئی خاص قابلِ اعتراض الفاظ نہیں تھے''۔

''قابلِ اعتراض نہیں تھے؟ یہ دیکھو، کیا تمہارے خیال میں یہ الفاظ نازیبا نہیں ہیں؟'' وہ اٹھ کر اندر گیا اور خط نکالنے کے لیے میز کی دراز کھولی مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ مینا بھی پیچھے پیچھے تھی۔ کمال نے پوچھا، ''خط کدھر ہیں؟''

وہ اسے گھر کے پچھواڑے لے گئی اور ایک جگہ راکھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''میں نے جلا دیئے ہیں''۔

''کیوں؟''

''ممی نے کہا تھا کہ تم طلاق لینے کے لیے انہیں عدالت میں پیش کر سکتے ہو''۔

اسے جھٹکا سا لگا۔ یہ لوگ اتنے عیار اور پیش بین ہیں اور ان کا دماغ اس قدر الٹی سیدھی باتیں سوچتا ہے۔ ادھر مینا بولے جا رہی تھی، ''انہوں نے برے طریقے سے میری سرزنش کی کہ میں نے کیوں تمہیں خطوط دکھائے اور مخدوم پور کے بارے میں بتایا''۔

مینا کی ماں کے خدشات قابلِ فہم تھے مگر مینا کا اپنا رویہ؟ کیا وہ بہت معصوم ہے؟ کیا ایک بائیس سالہ لڑکی ایسی سیدھی سادی ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں، تو پھر یہ سب کیا ہے؟ اگر وہ اپنی ماں کی طرح سازشی ہوتی تو خطوط کیوں دکھاتی؟ معصوم تھی تو خطوں میں کانٹ چھانٹ کیوں کی؟ پھر پوچھنے پر چچا کے ساتھ اپنے تعلقات کا اقرار بھی کر لیا؟ اس کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ مینا کو سمجھنے سے قاصر لگ رہا تھا۔ یہ سب کچھ بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی، ''کیا تم مجھے گھر سے نکال دو گے؟ ممی یہی کہہ رہی تھیں''۔ کمال کوئی جواب نہ دے سکا۔

مینا نے التجا کی، ''پلیز، مجھے گھر سے مت نکالنا، میں اتنی بری نہیں ہوں''۔

''میں تمہیں گھر سے نہیں نکالوں گا لیکن مہربانی سے اپنے آپ کو بدلو ورنہ صورتِ حال میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے گی''۔

''مجھے بتاؤ کیا کروں؟''

''ہر بات سچ سچ بتادو، یا پھر ماں باپ کے مشوروں پر چلو۔ دونوں صورتیں اکٹھی نہیں ہوسکتیں''۔

''وہ میرے والدین ہیں''۔

''پھر مجھے اکیلا چھوڑ دو''۔

''تم میرے خاوند ہو''۔

''پھر میرے ساتھ رہو''۔

''میں تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہوں''۔

''پھر اپنے والدین کے مشوروں پر مت چلو۔ وہ تمہیں صحیح راہ نہیں دکھا رہے۔ وہ میری زندگی اذیت ناک بنا رہے ہیں''۔

مینا نے رونا شروع کر دیا۔ کمال نے سمجھایا، ''روؤ مت۔ میری صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہاری بے بسی کا اندازہ کرسکتا ہوں، لیکن پلیز، میرے جذبات کا بھی خیال کرو''۔

''میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتی ہوں کیونکہ تمہارا یہی خیال ہے''۔

''کیا تم خود ایسا نہیں چاہتی ہو؟''

''میں تو چاہتی ہوں''۔

''پھر مسئلہ کیا ہے؟''

''تم نے خود ہی یہاں بلایا تھا حالانکہ میری متعدد کلاسیں رہ گئی ہیں''۔

''ہاں، تمہیں کلاسیں، بالخصوص پریکٹیکل نہیں چھوڑنے چاہئیں۔ کب جانا چاہتی ہو؟''

''کل صبح پریکٹیکل کی کلاس ہے اس لیے آج ہی جانا مناسب ہے''۔

''ٹھیک ہے، چلی جاؤ''۔

''اگر تم ایسے ہی غمزدہ رہو گے تو میں کیسے جاسکتی ہوں''۔

''درست، میں ایسے نہیں رہوں گا۔ اب تو تم جاسکتی ہو''۔

''پھر تم بھی میرے ساتھ چلو''۔

''دفتر چھوڑنا پڑے گا''۔

''تو چھوڑ دو، دفتر میں کون سا کام ہے۔ تم جاؤ نہ جاؤ، کیا فرق پڑتا ہے۔ جب دفتر میں کوئی کام ہی نہیں تو اتنی باقاعدگی سے جانے کی ضرورت کیا ہے؟''

''مجھے وہاں سے تنخواہ ملتی ہے''۔

''ٹھیک ہے، تم میرے ساتھ اسٹیشن تک آؤ اور واپس آ کر دفتر چلے جاؤ''۔

اور پھر وہ سفر کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

....

نصف شب کا سمے، شاید چاند کی پہلی تاریخ تھی، روشنی کا نام و نشان نہیں تھا، اور ہوا بھی بوجھل تھی جس کے سبب سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ کمال شادی سے پہلے بھی تنہا تھا۔ گریجوئیشن کے بعد گھر چھوڑ کر ادھر ادھر کرائے کے مکانوں میں زندگی گزارتا رہا مگر اس نے خود کو کبھی اتنا تنہا محسوس نہیں کیا تھا لیکن اب شادی کے بعد اور بالخصوص مینا کے اپنے چچا کے ساتھ ناجائز تعلقات کا

انکشاف ہونے کے بعد وہ خود کو انتہائی تنہا محسوس کرنے لگا۔ قبل ازیں، وہ سمجھتا تھا کہ مستقبل خوشگوار گزرے گا تاہم شادی کے بعد تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس کی زندگی قابلِ رحم ہو گئی۔ بچپن سے وہ موسیقی کا دلدادہ تھا مگر اب عشقیہ شاعری اور موسیقی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ وشناب پدوالی (Vaishnab Padavali) کے گیت جو کبھی اس کا دامنِ دل کھینچتے تھے، اب کانوں میں زہر گھولنے لگے۔ اگر من پسند بیوی ملتی تو اس کی زندگی پرسکون ہو جاتی، لیکن ان لوگوں نے اسے اپنے جال میں پھنسا کر اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ وہ خود کو بھی ساری صورتِ حال کا ذمہ دار ٹھہراتا۔ اس کے سینے میں شدید تکلیف ہونے لگی۔

....

مینا کے بارے میں انکشافات ہونے کے بعد وہ اس کی غلطیوں کے بارے میں زود حس ہو گیا تھا۔ اب تو اس کی موجودگی بھی گوارا نہ تھی مگر اس کے جانے کے بعد کمال کی حالت مزید ابتر ہو گئی، اس کے چاروں طرف گھمبیر تنہائی پھیلی ہوئی تھی۔ اگر مینا کی ماں کو کچھ شعور ہوتا تو وہ اسے کبھی بھی اس موقع پر واپس آنے کو نہ کہتی۔ اور اگر مینا خود عقلمندی اور بلوغت کا مظاہرہ کرتی تو اسے اکیلا چھوڑ کر نہ چلی جاتی، مگر وہ ایسی ثابت نہیں ہوئی۔ پھر وہ خود بھی تو دکھی نہ ہوتی۔ شاید وہ اپنے والدین، جن پر وہ ضرورت سے زیادہ انحصار کرتی ہے، سے زندگی کے اس نازک موڑ پر مشورہ کرنا چاہتی ہو، حالانکہ اس کا ماضی ہی اس کے لیے باعثِ آزار ہے۔ دن گزرنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ راتیں طویل، ڈراؤنی اور وحشت انگیز تھیں، نیند کوسوں دور اور رتجگے تکلیف دہ تھے۔ اسی کیفیت میں شب و روز گزرے تو اس وجہ سے سینے کا درد اتنا شدید ہوا کہ اسے گمان ہونے لگا شاید یہ اس کے جیون کی آخری گھڑیاں ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور سوچ کا گزر نہیں تھا۔ کوئی آس پاس بھی نہیں تھا، بالآخر اس نے مسٹر سنہا کو فون کیا جس کے ساتھ اس نے ہری پور میں تربیت حاصل کی تھی۔ کمال نے اسے اپنی تکلیف سے آگاہ کیا۔ اس نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی، ''کیا تم اکیلے ہو؟ ہوا کیا؟ اچھا میں آ رہا ہوں''۔ جلد ہی وہ اپنی بیوی کے ہمراہ آ گیا اور کمال کو فوراً بریگیڈ اسپتال منتقل کر دیا۔

چیٹر جی صاحب موجود نہیں تھے۔ چند دوسرے فزیشنز ڈیوٹی پر تھے۔ انہوں نے متعدد سوالات کیے، ''کیا ہوا؟ کھانا کیا لیا تھا؟ اکیلے کیوں رہتے ہو؟ تکلیف کس جگہ ہو رہی ہے؟'' کمال نے سینے کے بائیں طرف ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ''میں کئی راتوں سے نہیں سویا، میں لمبی نیند سونا چاہتا ہوں۔ مجھے سلا دیں، پلیز''۔ اس ہذیان زدہ بات نے مسٹر سنہا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے ڈاکٹر کو ایک طرف لے جا کر کہا، ''حال ہی میں اس کی شادی ہوئی ہے۔ میرے علم کے مطابق ہری پور میں ایک لڑکی سے اس کا معاشقہ چل رہا تھا۔ ممکن ہے یہ اسی کا اثر ہو''۔

ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد کچھ دوائیں تجویز کیں۔ نرس اسے ٹیکہ لگانے کے لیے آگے آئی تو کمال گھبرا گیا کیونکہ آج تک نہ تو اس نے ٹیکہ لگوایا اور نہ کبھی اسپتال داخل ہوا تھا اس لیے کہنے لگا، ''مجھے ٹیکہ نہیں لگوانا''۔ نرس نے تسلی دیتے ہوئے کہا، ''ڈریئے مت، درد نہیں ہوگا، بلکہ آپ کو پتہ ہی نہیں چلے گا۔ پلیز! اپنی آنکھیں بند کر لیں''۔

کمال نے ایک تابعدار بچے کی طرح اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نرس نے ٹیکہ لگا کر پوچھا، ''درد تو نہیں ہوا؟''

''نہیں، لیکن سسٹر۔۔۔۔۔۔۔۔''۔

''پلیز، باتیں نہ کیجیے۔ آپ کو سو جانا چاہیے''، اس نے کمال کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ''اپنی آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کریں''۔

''سسٹر! میں سو نہیں سکتا''۔

''آپ سو جائیں گے۔ پلیز! اپنی آنکھیں بند کیجیے''۔

اس نے آنکھیں بند کیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی دو بہنیں تھیں، جن کی اوائل عمری ہی میں شادی ہو گئی

تھی اس لیے وہ تعلیم حاصل نہ کر سکیں۔ کمال کے ان کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے لیکن سوائے خاندانی امور کے، ان سے کسی اور موضوع پر بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ اسے خواہش ہوئی کہ کاش اس نرس جیسی کوئی بہن ہوتی۔ وہ بڑے مشفقانہ انداز سے اس کی پیشانی چھو رہی تھی۔ اسے بہت اچھا لگا۔ کئی دنوں کے بعد وہ دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں جا رہا تھا۔

جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا اگلے دن کی شام ہو رہی ہے۔ اس نے اپنی ماں اور بیوی کو بستر کے پاس بیٹھے دیکھا۔ مینا خاموش رہی مگر ماں بولی، ''تھانے سے ایک سپاہی نے آ کر تمہاری بیماری کا بتایا تھا۔ تمہارے باپ کو اندازہ نہیں ہوا مگر میں سمجھ گئی کہ معاملہ سنجیدہ ہے کیونکہ تم معمولی بیماری پر ہمیں کبھی اطلاع نہ دیتے۔ میں فوراً ہی مرزا کے ساتھ چلی آئی۔ یہاں پہنچ کر دیکھا کہ تمہارا گھر بند تھا۔ ہمسائے سے ایک عورت نے کسی کے ساتھ مجھے یہاں پہنچایا۔ دوپہر کا وقت تھا مگر تم سو رہے تھے حالانکہ تم دن کے وقت کبھی نہیں سوئے۔ یقیناً کوئی سنجیدہ معاملہ ہے۔ اس حالت میں تمہیں اکیلا نہیں رہنا چاہیے تھا اس لیے میں نے مرزا کو باکل پور بھیجا، مینا ابھی ابھی یہاں پہنچی ہے''۔

کمال کو رنج ہوا۔ مسٹر سنہا کو میرے گھر کسی کو مطلع کرنا نہیں چاہیے تھا اور پھر ماں کو نہیں چاہیے تھا کہ مینا کو اطلاع دے۔ اب وہ کیسے بتائے کہ اس کی بیماری کا کارن مینا ہی ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں اس نے ایک مضمون پڑھا تھا ''ہم نفس ہی ہم نفس کو تندرست کرتا ہے''، لیکن اس کا اطلاق یہاں نہیں ہوا۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ تھوڑی دیر بعد نرس نے آ کر کہا، ''سر! آپ گھر جا سکتے ہیں۔ اب آپ کی ماتا اور پتنی آ گئے ہیں۔ تمام ٹیسٹ ٹھیک ہیں۔ فزیشن نے آپ کو گھر جانے کی اجازت دے دی ہے''۔

کمال گھر جانا نہیں چاہتا تھا مگر جانا پڑا۔ گھر پہنچ کر اس نے ماں سے مینا کو واپس باکل پور بھیجنے کو کہا کیونکہ آج کل اس کی کلاسیں ہو رہی تھیں، یہاں رہنے سے اس کی تعلیم کا حرج ہوتا۔ ماں نے اعتراض کیا، ''کیا کلاس پتی کے جیون سے زیادہ ضروری ہے؟''

''لیکن ماں! میں خیریت سے ہوں۔ کیا آپ نے نرس کی بات نہیں سنی تھی؟''

''وہ جو چاہے کہے، تم ٹھیک نہیں ہو۔ یہ یہیں رکے گی، میں جا رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں اپنے گھر زیادہ لوگوں کا رہنا پسند نہیں''۔

''نہیں ماں! ایسی بات نہیں۔ تم یہیں رہو، اُسے جانے دو''۔

''میں ٹھہر نہیں سکتی۔ مجھے بڑی جلدی میں آنا پڑا تھا۔ میں واپس جا رہی ہوں، یہ یہیں ٹھہرے گی''۔ اگلے دن وہ چھوٹے بیٹے کے ساتھ واپس چلی گئی۔ شام کو ڈاکٹر حسین پہنچ گیا۔ کمال اس وقت پورٹیکو میں بیٹھا تھا جب اس کا سسر ہچکچاتے ہوئے مین گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ کمال نے رسمی سا استقبال کیا اور اپنے پاس دوسری کرسی پر بیٹھنے کو کہا مگر وہ کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگا، ''میں مادھو کو واپس بھیج دوں''۔

کمال باکل پور کے مادھو سدھن باسو کو بخوبی جانتا تھا۔ وہ مینا، اس کی بہن اور بھائی کا اتالیق اور خاندان سے قریبی تعلقات رکھتا تھا۔ اس نے پوچھا، ''کہاں ہے وہ؟''

''وہ باہر کھڑا ہے''۔

''آپ اسے اپنے ساتھ اندر کیوں نہیں لائے؟''

''مجھے علم نہیں تھا کہ تم ہمارے ساتھ کیسے بولو گے، اس لیے اسے اندر نہیں لایا''۔

''بہتر۔ میں اسے بلا لاتا ہوں''، یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ باسو کچھ دور کھڑا تھا۔ کمال کو دیکھ کر وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا۔

اس نے آواز دی، ''مادھو ماما''۔ چونکہ مینا اسے مادھو ماما کہہ کر بلاتی تھی اس لیے کمال نے بھی اسے اسی نام سے بلایا تھا۔ اس نے پھر آواز دی، ''مادھو ماما''۔ وہ واپس مڑتے مڑتے رکا۔ کمال اس کے پاس گیا۔ باسو نے مدافعانہ انداز میں کہا، ''یقین کریں، مجھے ان معاملات کا کوئی علم نہیں تھا''۔ کمال نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا، ''آپ باہر کیوں کھڑے ہیں؟''

''میں ذرا جلدی میں ہوں۔ ڈاکٹر حسین مجھے مجبور کر کے اپنے ساتھ لائے ہیں''۔

''کیوں؟''

''مسز حسین کو خدشہ تھا کہ آپ ڈاکٹر صاحب کی پٹائی کر دیں گے''۔

''تو کیا آپ ان کی حفاظت کے لیے آئے ہیں؟''

''میں کیا کرتا؟ انہوں نے اتنی عاجزی سے درخواست کی تھی کہ میں انکار نہ کر سکا''۔

''پھر آپ سڑک پر کیوں کھڑے ہیں؟''

''میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اندر کیا ہوتا ہے۔ اگر آپ ڈاکٹر صاحب کو مارتے، تب میں اندر آتا۔ چونکہ اب وہ خیریت سے ہیں اس لیے میں کام پر جا رہا ہوں''۔

''ٹھیک ہے، آپ اپنے دفتر جائیں مگر تھوڑی دیر ہمارے گھر رک جائیں''۔

باسو کو ابھی بھی کسی گڑبڑ کا اندیشہ تھا اس لیے محتاط ہو کر آگے آیا۔ چائے پیتے ہی وہ فوراً چل دیا۔ ڈاکٹر حسین نے معذرت کی، ''سوری! مجھے علم نہیں تھا۔ اگر مجھے سن گن ہو جاتی تو کبھی بھی آپ کے ساتھ مینا کی شادی نہ کرتا''۔

کمال سمجھ رہا تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہا ہے۔ وہ ان سب کو اب اچھی نظروں سے نہیں دیکھ رہا تھا، بلکہ اس کے دل میں ان کے لیے معمولی سی بھی عزت نہیں رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کی غلط بیانی پر کس قسم کا ردِعمل ہونا چاہیے۔ آخر اس نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا، اور کہنے لگا، ''مجھے یقین نہیں ہے کہ۔۔۔۔۔'' لیکن کمال کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ڈاکٹر حسین نے مینا کی طرف اشارہ کر کے کہا، ''اس سے پوچھ لیں کیا اس نے ہمیں کبھی اس سے آگاہ کیا تھا؟''

''وہ کیوں بتاتی؟''

''پھر ہمیں کیسے علم ہوتا؟''

''آپ کے بھائی بیرو نے مخدوم پور سے آپ کو لکھا تھا، پھر آپ نے بیرو کو لکھے مینا کے خطوط پکڑ بھی لیے۔ آپ کی بیوی نے آپ کو مینا اور بیرو کی شادی کی تجویز بھی دی تھی، ان سب کے باوجود یہ کیسا دعویٰ ہے کہ آپ کو ان باتوں کا علم نہیں تھا''۔

ڈاکٹر حسین کو ان انکشافات کی توقع نہیں تھی۔ وہ نہ صرف پریشان ہو گیا بلکہ اپنی بے عزتی بھی محسوس کی۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولا، ''اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے حقیقت کی پردہ پوشی کر کے فریب سے آپ کی شادی کی ہے تو بے شک مینا کو طلاق دے کر اپنی پسند کی لڑکی کے ساتھ شادی کر لیں''۔

''فیصلہ میں کروں گا، آپ کو مشورہ دینے کی ضرورت نہیں''۔

''میں مشورہ نہیں دے رہا۔ کل میری صبح کی ڈیوٹی ہے اس لیے اب مجھے چلنا چاہیے۔ کیا میں مینا کو ساتھ لے جاؤں؟''

''آپ کی مرضی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں''۔

ڈاکٹر حسین نے اندر جا کر بیٹی کو تیار ہونے کو کہا، مگر اس نے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر نے اس کی سرزنش کرتے ہوئے کہا، ''جب کمال ہم سے ناراض ہے تو تم کہاں رہو گی؟''

''وہ بیمار ہے اور اس کی ماں نے مجھے یہاں رہنے کو کہا ہے''، مینا نے جواب دیا۔

کیا تمہارے یہاں رہنے سے اس کا علاج ہو جائے گا؟''

''میں دیکھ لوں گی، آپ جائیں''۔

ڈاکٹر حسین روانہ ہو گیا، کمال نشست گاہ میں آیا تو مینا آ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''کیا ہے؟''، کمال نے پوچھا۔

مینا عاجزی سے بولی، ''پلیز! مجھے مت چھوڑنا۔ اگر کسی اور سے شادی کرنے کی خواہش ہے، میں منع نہیں کروں گی۔ تم بہت بڑے افسر ہو، تمہیں گھر میں کسی ملازم کی ضرورت ہے، میں یہاں نوکرانی بن کر کام کرلوں گی۔ مجھے میکے مت بھیجو''۔

اس عاجزانہ درخواست نے کمال کے دل کو چھو لیا مگر ساتھ ہی سوچنے لگا کہ جب خاوند کسی اور کے ساتھ شادی کر لے تو اس کی پہلی بیوی وہاں کیسے رہ سکتی ہے؟ لیکن اس کے باوجود وہ مینا کے جذبات کو رد نہ کر سکا اور اسے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے بولا، ''تم میری بیوی ہو، ہمارے تعلقات دائمی ہیں۔ میں تمہیں کبھی اور کسی حالت میں نہیں چھوڑوں گا۔ اگر تم خود ہی مجھ سے علیحدگی کا فیصلہ کرلو تو اور بات ہے، میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے میکے جانے سے انکار کیوں کیا؟''

''گھر میں میری کوئی عزت نہیں۔ میری پیدائش کے وقت پتا جی بے روزگار تھے لہٰذا میرے جنم پر کوئی خوش نہیں تھا۔ پھر میں رینا کی طرح سندر بھی نہیں، تعلیم میں بھی واجبی سی تھی، اور اسی قسم کی بدقسمتی ہر معاملہ میں رہی۔ تم سے شادی کے بعد سے سب میری عزت کر رہے ہیں، میرے والدین، رشتہ دار، ہمسائے وغیرہ عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر تم مجھے واپس بھیج دو گے تو میرا حال پہلے سے بھی بدتر ہو جائے گا''۔

''نہیں، میں تمہیں واپس نہیں بھیجوں گا۔ میری بیوی کی توہین میری توہین ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا''۔

اس نے بھی خود کو مکمل طور پر کمال کے حوالے کرتے ہوئے وچن دیا، ''میں تم سے کبھی بھی الگ نہیں رہوں گی۔ اگر تم پہلے انتقال کر گئے تو میں بھی اپنی جان دے دوں گی''۔

....

کمانڈنگ آفیسر مسٹر سہا نے کمال کو اپنے دفتر میں بلا کر ڈی، آئی، جی ہیڈ کوارٹر مسٹر سنیال کا پیغام دیا کہ وہ کل صبح ان کے دفتر میں حاضر ہو۔ وہ اگلے روز وہاں پہنچا۔ مسٹر سنیال نے کہا، ''باکل پور سے تمہاری ٹرانسفر کے بعد مقتدرہ جماعت نے ایک تفتیشی کمیٹی بنائی تھی۔ اس نے اپنی رپورٹ میں مقامی رہنما کو وہاں ہونے والی زیادتیوں کا مرتکب قرار دیا ہے۔ اس پر رکن اسمبلی کی جواب طلبی ہونے والی تھی کہ اس نے اپنی جماعت سے مستعفی ہو کر دوسری جماعت میں شمولیت کر لی۔ جماعت اب یہ جان گئی ہے کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اس لیے تمہیں ایڈیشنل ایس پی تعینات کرنا چاہتے ہیں۔ اگر تمہاری اپنی کوئی پسند ہے تو اس پر بھی غور کیا جا سکتا ہے''۔

کمال تحمل سے اس کی بات سنتا رہا۔ باکل پور سے ٹرانسفر ہونے کے بعد سارا کیس سی، آئی، ڈی کو دیا گیا تھا جس نے متعلقہ رکن اسمبلی اور دیگر ملزمان کو چارج شیٹ کیا۔ ادھر حکومت نے عدالت سے کیس واپس لے لیا۔ جماعتی سطح پر ہونے والی تفتیش میں بھی کمال بے گناہ قرار پایا۔ اس کے افسرانِ بالا نے اپنی اپنی کرسی بچانے کی خاطر برسرِ اقتدار جماعت کا ساتھ دیا تھا اور اب انہی افسروں میں سے ایک کمال کو یہ پیشکش کر رہا تھا۔ اسے یہ بات پسند نہ آئی۔ ڈی، آئی، جی کو جواب دیا، ''سر! ڈی جی صاحب نے خود مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میری ٹرانسفر کے تین ماہ کے اندر اندر مجھے کسی سب ڈویژن میں تعینات کر دیا جائے گا۔ میں سلاجنا میں اکیس مہینے تعینات رہا، ترقی ملنے کے بعد بھی مجھے ایک بٹالین میں تعینات کر دیا گیا۔ سر! اب آپ فرما رہے ہیں کہ

مجھے جلد ہی ایڈیشنل ایس پی لگا دیا جائے گا۔ اگر آپ مجھے واقعی کہیں تعینات کرنا چاہتے ہیں تو اپنی مرضی کی جگہ بھیج دیجیے۔ میری اپنی کوئی ترجیح نہیں''۔

''بہت اچھے۔ اگر تم اپنی اسی سوچ پر قائم رہے تو یہ محکمے کے لیے انتہائی خوش آئند ہوگا''۔

''سر! میں اب تک اپنی اسی سوچ پر قائم ہوں اور مستقبل میں بھی اسی پر عمل کروں گا چاہے حالات کچھ بھی ہوں''۔

....

پھر ایک ہفتے کے اندر اسے باہمن آباد میں بطور ASP تعیناتی کے احکام مل گئے۔ اس نے وہاں موجود ASP مسٹر سرکار سے رابطہ کیا جس کے نتیجہ میں دونوں افسروں نے 14 اپریل کا دن مقرر کیا۔ کمال اس سے ایک ہفتہ قبل چارج چھوڑ کر 12 تاریخ کو باہمن آباد پہنچ گیا۔ اگلے دن اسے وہاں کے ASP کا مختصر سا پیغام ملا کہ DIG ہیڈ کوارٹر نے اسے کمال کو چارج دینے سے منع کر دیا ہے۔ اسے بہت ناگوار گزرا کیونکہ اس نے اپنی تعیناتی کی درخواست نہیں کی تھی۔ اس نے بڑے سخت الفاظ میں DIG کو لکھا، ''آپ کی طرف سے موصول کردہ سرکاری حکم اور طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے آٹھ اپریل کو بطور ڈپٹی کمانڈنٹ سٹیٹ آرمڈ پولیس سکستھ بٹالین چارج چھوڑ دیا تھا اور بارہ اپریل کو باہمن آباد پہنچ کر موجودہ ASP کو مطلع کر دیا کہ میں چودہ اپریل کو عہدے کا چارج سنبھالوں گا مگر انہوں نے بتایا ہے کہ آپ نے اسے چارج نہ چھوڑنے کی ہدایت کی ہے۔ چودہ اپریل چارج لینے کی آخری تاریخ ہے۔ مہربانی سے مجھے بتایا جائے کہ میں کیا کروں''۔

جواب نہ ملنے پر کمال نے اگلے روز اس سے ٹیلی فون پر بات کی۔ DIG نے لاپروائی سے جواب دیا، ''فکر مند کیوں ہو رہے ہو۔ جب ہم نے کہا ہے کہ تمہیں چارج نہیں ملے گا تو یہ سوچنا ہمارا کام ہے کہ وقتِ مقررہ کے بعد کیا ہونا چاہیے۔ تم فکر نہیں کرو''۔ کمال نے اسی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے ایک اور خط لکھ دیا۔ چودہ تاریخ گزر گئی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اگلے پیغام کا انجام بھی یہی ہوا۔ بالآخر 24 اپریل کو اسے عہدے کا چارج ملا۔

چارج لینے کے بعد اسے SP کے ذریعے DIG کا پیغام ملا کہ کمال منڈل سے اس کی 15 تا 23 اپریل چھٹی کی درخواست لے کر مجھے ارسال کرو۔ کمال نے تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ SP نے انکار کی وجہ پوچھی تو اس نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا، ''چارج لینے میں تاخیر کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ میں یہاں وقتِ مقررہ سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ مسٹر سرکار نے خود ہی 14 تاریخ طے کی تھی اور میں نے یہاں آنے سے قبل مطلع بھی کر دیا تھا مگر انہوں نے DIG کے حکم کی تعمیل میں مجھے چارج نہیں دیا۔ اب اس مدت کو یا توسیع شدہ قرار دیا جائے یا مجھے ڈیوٹی پر حاضر سمجھا جائے۔ میں کسی صورت بھی چھٹی کی درخواست نہیں دوں گا''۔ SP نے کمال پر کوئی دباؤ نہ ڈالا بلکہ DIG کے نام ایک عریضہ میں کمال کے چارج لینے کی مدت میں توسیع کی درخواست لکھ دی۔

اس وقت تک بینا B.Sc مکمل کرنے کے بعد MSc میں داخلہ لے کر اپنے والدین کے پاس قیام پذیر تھی۔ موسمِ گرما کی تعطیلات میں وہ چند روز کے لیے باہمن آباد آ گئی۔ ایک دن کمال دفتر میں تھا کہ اسے بینا کی کال آئی جو اسے گھر جلد بلا رہی تھی۔ اس نے وجہ معلوم کرنا چاہی مگر جواب ملا کہ ٹیلیفون پر نہیں بتایا جا سکتا۔ کمال نے کہا کہ وہ آ رہا ہے مگر ہوا کیا ہے؟ بینا نے اپنی بات دہرائی کہ وہ جلد گھر آ کر خود ہی دیکھ لے۔

کمال نے کہا تو کچھ نہیں مگر تذبذب میں تھا کہ ہوا کیا ہے اور پھر دفتر سے باہر جانے کے لیے SP کی اجازت چاہیے تھی۔ وہ دفتری اوقات کے دوران گھر نہیں جایا کرتا تھا۔ اوپر سے یہ کہ وہ ابھی ابھی دفتر پہنچا تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ گھر جانے کا سبب کیا بتائے۔ بہر حال چلا گیا۔ جیسے ہی گھر پہنچا اسے بینا نے ایک خط دیا جو ڈاکیا ابھی دے کر گیا تھا۔ اس نے خط کھولا اور سب

سے پہلے ارسال کنندہ کا نام دیکھا، پھر مینا سے پوچھا، ''یہ رتنا کون ہے؟''

''مجھے کیا پتہ۔ مجھے میکے بھیج کر تم یہاں یہ کام کرتے رہے ہو۔ پڑھو، خود ہی سمجھ جاؤ گے''۔

کمال نے خط پڑھا:

مسٹر منڈل!

آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو جانتی ہوں۔ آپ نے ہمارے کالج میں ایک تقریری مقابلہ میں شرکت کی تھی۔ اگر چہ دیگر مقررین بھی تھے مگر آپ کا انداز سب سے منفرد تھا۔ شستہ اندازِ بیان اور ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ لیے آپ نے مخالفین کے چھکے چھڑا دیے، اور پھر مدلل انداز میں اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کیا۔ آخر میں آپ نے فریقِ مخالف کو ایسے سوالات کیے جن کے جواب آپ کی حمایت میں جاتے تھے۔ یہ شاندار تکنیک آپ نے کہاں سے سیکھی؟ میں بھی سیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ مجھے سکھائیں گے؟

میں اپنا تعارف کرا دوں۔ امسال میں نے ہائیر سیکنڈری میں کامیابی کے بعد میڈیکل کالج داخلہ لیا ہے۔ میرا قد پانچ فٹ چار انچ ہے۔ میری سہیلیاں کہتی ہیں کہ میرا رنگ گورا ہے۔ میں آپ کی مانند فصیح البیان نہیں ہوں۔ اسکول کے زمانے میں میں نے کچھ گائیکی سیکھی تھی۔ میرے پتا ایک کالج میں معالج ہیں اور والدہ کرسچین کالج میں انگریزی کی اتالیق ہیں۔

میں آپ سے ملنے کی خواہش مند ہوں۔ کیا میں آپ کو دوست سمجھ سکتی ہوں؟ میں ایک بار آپ کے دفتر آنا چاہتی ہوں مگر متذبذب ہوں کہ آپ کا رویہ کیا ہوگا، اس لیے لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ آپ کی جانب سے مثبت اشارہ ہو جائے تو پہنچ جاؤں گی۔ آپ مجھ سے فون پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔ اگر بوقتِ شب فون کریں تو میں خود اٹھاؤں گی۔ میرے والدین دس بجے تک سو جاتے ہیں، اس کے بعد فون میرے کمرے میں ہوتا ہے۔ فون نمبر ہے: 20305۔ آپ کے فون کی منتظر۔۔۔

آپ کی پرستار
رتنا

مینا نے استفسار کیا، ''یہ کیا ہے؟ کب سے چکر چل رہا ہے؟''

کمال نے وضاحت کی، ''خط ہی میں لکھا ہوا ہے کہ میں لڑکی کو نہیں جانتا۔ اس نے مجھے تقریری مقابلہ میں دیکھا تھا۔ اس کے خیال میں شاید میں غیر شادی شدہ ہوں اس لیے پینگیں بڑھانے کی کوشش میں ہے''۔

''میں اب اپنی تعلیم جاری نہیں رکھوں گی۔ تمہارے ساتھ ہی ہمیشہ رہوں گی''۔

''تعلیم کے بغیر تمہاری ترقی ممکن نہیں، نہ تم خود مختار ہو سکتی ہو۔ تم مجھ پر ہی انحصار کرتی رہو گی۔ تمہیں چاہیے کہ تعلیم حاصل کر کے مجھ پر انحصار ختم کرو''۔

''تاکہ تمہیں اس قسم کے خطوط ملتے رہیں۔ واہ! کیا خوب ہے!''

''جسے میں جانتا ہی نہیں، حاصل کیا ہوگا۔ میں اس کو جواب ہی نہیں دوں گا''۔

''بڑی شاندار بات کی ہے کہ تم اسے جواب نہیں دو گے۔ لیکن وہ لکھے ہی کیوں؟ یہ بے شرم لڑکی ہے کون؟ ذرا پتہ تو کرو۔ ان کا نمبر ملاؤ''۔

''پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟''

''کیوں، کیا ہوا؟''

''ایک دفعہ نمبر ملا لیا تو گویا وہ مجھے پریشان کرتی رہے گی''۔

''اور دوسری صورت میں وہ تمہارے دفتر آجائے گی''۔

''نہیں، وہ نہیں آئے گی۔ اگر اسے آنا ہوتا تو مجھے لکھے بغیر ہی آجاتی۔ جب لکھا ہے تو مطلب یہ کہ وہ نہیں آئے گی۔ وہ ڈرتے ڈرتے جواب کا انتظار کرے گی، اور اگر ایک بار اس سے بات کر لی، سارا خوف دور ہو جائے گا''۔

بینا نے اس موضوع پر کوئی اور بات نہ کی۔ کمال نے رتنا کو فون نہ کیا، اس نے بھی چپ سادھ لی۔

....

آج شام ایس پی کے دفتر میں پوجا میٹنگ ہونا تھی۔ کمال نے اسے بتایا کہ اسکول کے زمانے ہی سے اس نے کسی قسم کے مذہبی اجتماع میں شرکت نہیں کی اس لیے اگر ہو سکے تو میٹنگ میں اس کی حاضری معاف کر دی جائے۔ ایس پی نے جواب دیا، ''تقریب میں شامل نہ ہونا لیکن میٹنگ میں آنا بہتر ہوگا ورنہ لوگ اس کو کسی غلط مفہوم میں لیں گے۔ خوامخواہ افواہ پھیل جائے گی کہ ایس پی اور ایڈیشنل ایس پی کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی ہے''۔

کمال خاموش رہا لیکن وہ کسی سرکاری جگہ میں مذہبی تقریبات کے انعقاد کو پسند نہیں کرتا تھا۔ بھارت ایک سیکولر ریاست ہے۔ اگر کوئی سرکاری ادارہ ایک فرقے کی مذہبی تقریب کا اہتمام کرے تو دوسرے فرقوں میں اسے غلط رنگ دیا جا سکتا ہے۔ پھر پوجا کی رسموں میں کچھ نامناسب چیزیں بھی ہوتی ہیں، مثلاً صرف ایک برہمن ہی پروہت کے فرائض ادا کر سکتا ہے اور ڈھول بجانے کا فرض صرف ایک جفت ساز ہی پورا کرے گا لیکن وہ پوجا میں استعمال ہونے والی کسی دوسری چیز کو چھو بھی نہیں سکتا مبادا چیزیں ناپاک ہو جائیں۔ اسی امتیاز و تفریق کے سبب ان کے پرکھوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہبوں کو اختیار کیا تھا۔ پھر درگا پوجا میں کمال کی شناخت آشورہ کی مناسبت سے ہو سکتی تھی مگر اس کے خدوخال اور رنگ ڈھنگ اسے مقامیت کا روپ دے رہے تھے۔ شاید درگا پوجا اور آشورہ میں تقابل دو گروہوں کے مابین کشاکش اور اختلاف کا اظہار تھا۔ آشورہ مقامی لوگوں کا تہوار تھا جبکہ درگا حملہ آوروں کی نشانی۔ اس کے خیال میں لفظ ''آشورہ'' رائج معنوں میں قابلِ اعتراض تھا اور جیسا کہ اس نے پڑھا تھا آریاؤں کا ایک قبیلے الپائین ''آہورا'' کی پرستش کرتا تھا۔ وہ بنیادی طور پر زراعت پیشہ تھے۔ نارڈک (Nordic) آریاؤں کا دیوتا ''دائیوا'' کہلاتا تھا۔ یہ لوگ خانہ بدوش اور بھیڑ بکریاں پالتے تھے۔ ہندوستان میں ویدی (Vedic) آریا انہی میں سے تھے جبکہ مہاویر جین اور گوتم بدھ کا تعلق اوّل الذکر قبیلے سے تھا۔ ان دونوں نے شمالی نارڈک آریاؤں میں رائج قربانی کی رسموں کی مخالفت کی تھی۔ ہندوستان کے کچھ علاقوں میں آریاؤں کی اس نسل کے سماجی اور مذہبی اثرات بہت دیر بعد پھیلے۔ قبل ازیں وہ آہورا کی پرستش کیا کرتے تھے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب آہورا تبدیل ہو کر آشورہ اور دائیوا بدل کر ''دیو'' ہو گئے، نتیجتاً ''دیوی'' اور ''آشورہ'' میں مخاصمت کی ابتدا ہوئی۔ درگا پوجا میں نارڈک آریاؤں کی قربانی کی رسمیں تا حال جاری ہیں۔ کمال جب بھی درگا پوجا میں دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کو دیکھتا تو اسے یوں لگتا جیسے جری اور دلیر آشورہ تمام تر قوت کے ساتھ طاقتور حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہا ہے۔

....

کمال کی تعیناتی والے علاقے میں رہزنی پولیس کا بہت بڑا سر درد تھا کیونکہ یہاں وسیع جنگل تھا اور تقریباً تمام راستے اسی میں سے ہو کر جاتے تھے۔ مجرم گاڑیوں کی گھات میں رہتے۔ ایک شخص درخت پر چڑھ کر دیکھتا رہتا اور جیسے ہی گاڑی یا گاڑیاں آتی دکھائی دیتیں، وہ ساتھیوں کو اشارہ کر دیتا جو درخت وغیرہ گرا کر راستہ بند کر دیتے۔ جوں ہی گاڑی رکتی، رہزن قیمتی

چیزیں لوٹ لیتے۔ پولیس کی گشت بھی ان ڈاکوؤں اور لٹیروں کو نہ روک پاتی۔ مجرم اتنی تیزی سے واردات کر کے روپوش ہوتے کہ پولیس ان کا سراغ لگانے میں ناکام رہتی۔ اس وجہ سے ضلعی پولیس بڑی مصیبت میں تھی۔

کمال ساری صورتِ حال کا بغور جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ڈاکوؤں کا نشانہ زیادہ تر شادی والی بسیں یا قیمتی اشیا یا نقدی کی حمل و نقل والے ٹرک تھے۔ انہوں نے اکا دکا گاڑیوں کو کبھی نشانہ نہیں بنایا تھا۔ تجربے کی خاطر اس نے خود ایسی گاڑیوں میں سفر کر کے دیکھا اور پھر جو کارروائی کی اس کے نتائج بہت مثبت نکلے۔ رہزن گروہ کے چند افراد گرفتار بھی ہوئے، ایک مارا گیا۔ یہ بات جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی کہ پولیس بسوں، ٹرکوں اور عام گاڑیوں میں سفر کر کے ڈاکوؤں کو رنگے ہاتھوں پکڑ رہی ہے۔ نتیجتاً، ان وارداتوں میں یک لخت ٹھہراؤ آ گیا۔

اس کا اثر دیگر غیر قانونی کاموں پر بھی ہوا کہ ان کے ارتکاب میں کمی آ گئی۔ رات کے وقت پولیس کی متعدد گاڑیاں گشت پر رہتیں۔ اس کا مقصد بظاہر تو آمد و رفت کو محفوظ بنانا تھا مگر در حقیقت اس کی آڑ میں پولیس کی چاندی بھی ہو رہی تھی۔ رات کو چلنے والے زیادہ تر ٹرک ڈرائیوروں کے پاس یا تو نامکمل کاغذات ہوتے یا اوورلوڈنگ کرتے۔ پھر معمولی خلاف ورزیاں تو عام سی بات تھی جس کا پولیس فائدہ اٹھاتی۔ اگر کاغذات مکمل ہوتے یا کسی قسم کی خلاف ورزی نہ بھی ہوتی تب بھی پولیس کے پاس انہیں تنگ کرنے کے کئی حربے تھے۔ ان کو ٹرکوں کو تفتیش کے بہانے تھانے لے جا کر لین دین کے بعد چھوڑ دیا جاتا۔ کمال کا اچانک چھاپے مارنا بھی سفر کو محفوظ بنانے اور پولیس کی چیرہ دستیوں سے بچانے میں انتہائی کارگر ثابت ہوا۔ ایک بار کسی سپاہی نے ٹرک روک کر چائے پانی کے لیے کچھ لینا چاہا تو اچانک کمال اندھیرے سے نکل آیا جسے دیکھتے ہی وہ سپاہی مجرم کی طرح وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ باتیں پر لگا کر ہر جگہ پہنچ گئیں۔

باہمن آباد ضلع میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ مسلمان تین چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں رہائش پذیر تھے، ایک تو ضلعی صدر مقام میں کیتھد رڈ نگا نامی جگہ تھی، دوسرے راجپور گاؤں اور تیسری بڑی آبادی پونی سول تھی جہاں سب گھرانے مسلمانوں کے تھے۔ یہ لوگ انتہائی غریب اور ناخواندہ تھے جو یا تو محنت مزدوری کرتے یا چھوٹی چھوٹی دکانداری، لیکن انہی میں چوری چکاری اور ڈکیتیوں کے ماہر بھی تھے، اس وجہ سے گاؤں ضلع بھر میں بدنام تھا۔ یہاں کے شریف الطبع لوگ اس شہرتِ بد کے باعث بہت فکر مند رہتے۔ دوسری طرف پولیس کے لیے جرائم کا جاری رہنا سود مند تھا جس کے لیے وہ مجرموں کی پشت پناہی کرتے۔ کمال نے تھانے کے تمام اہلکاروں کو وہاں سے تبدیل کر دیا، اور جرائم پیشہ افراد کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کے لیے گاؤں والوں کی ایک نگران کمیٹی بنائی۔ یہ اقدام پولیس گشت سے بھی زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ کمال نے ضلع پریشاد سے رابطہ قائم کیا تا کہ گاؤں والوں کے لیے روزگار کے مزید مواقع فراہم کیے جائیں۔ چند مہینوں کے اندر اندر یہاں مثبت تبدیلی کے آثار دکھائی دینے لگے۔

کمال کی ان کارروائیوں کو شروع شروع میں تو ایس پی نے بنظر تحسین نہ دیکھا بلکہ اس نے تو بہت کوشش کی تھی کہ ایسا افسر جس نے نہ تو برسرِ اقتدار جماعت کی پروا کی تھی اور ڈی جی کے ساتھ بھی کھلم کھلا بحث پر اتر آیا تھا، اپنے ضلع میں تعینات نہ ہونے دے۔ اب کمال نے رہزنی کا جس طرح سدِ باب کیا اس پر ایس پی نہ صرف خوش بلکہ فخر بھی کرنے لگا تھا۔

....

ایس پی کی طرف سے بلائی گئی میٹنگ میں کمال بھی موجود تھا۔ وہاں افسروں کے اضافی مشاہرے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایس پی کی تجویز تھی کہ کسی اور جگہ تعیناتی پر سب انسپکٹر کو سو روپیہ ماہوار، تھانے میں تعیناتی پر دو سو روپے اور تھانے کا انچارج لگانے پر تین سو روپیہ ماہوار ادا کیا جائے۔ اس تجویز میں پوشیدہ رمز کو سمجھتے ہوئے کئی افسر زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ کمال نے اعتراض

کیا،''سر! یہ مناسب نہیں۔ ایک ہی منصب اور رینک کا اضافی مشاہرہ یکساں ہونا چاہیے کیونکہ ان کی تنخواہیں برابر ہیں''۔
''تنخواہ تو برابر ہے مگر کمائی ایک جیسی نہیں''، ایس پی کا جواب تھا۔
''لیکن سر! اگر ہم مختلف مشاہرے مقرر کریں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان لوگوں کی رشوت خوری کو قبول کر رہے ہیں''۔
''آپ قبول کریں یا نہ کریں، ان کو رد کا نہیں جا سکتا۔ باقی ایس پی بھی یہی کر رہے ہیں''۔
''ایک نامناسب نظیر کے مطابق نہیں چلنا چاہیے۔ ہمیں ایک مثبت نمونہ پیش کرنا چاہیے''۔
''پھر تم ہی بتاؤ کیا ہونا چاہیے''۔

میٹنگ میں موجود افسروں نے کانا پھوسی شروع کر دی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کمال کے اعتراض سے متفق نہیں۔ یہ دیکھ کر کمال نے کہا،''سوری سر! آپ اپنی تجویز کے مطابق چلیں، میں اس فیصلے کی تائید نہیں کر سکتا''۔ یہ سن کر ایس پی کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا اور میٹنگ برخواست کر دی۔ صورتِ حال کی یوں اچانک تبدیلی پر کمال ششدر رہ گیا۔

....

اس ناخوشگوار واقعہ کے تھوڑے عرصہ کے بعد کمال کو لیملنگ میں ASP تعینات کر دیا گیا جس کا ہیڈ کوارٹر بیکنتھ پور تھا۔ اس کے رشتہ دار اور بینا بھی قدرے فکر مند ہو گئے۔ ضلع لیملنگ میں چار سب ڈویژن تھے، لیملنگ ہیڈ کوارٹر، خورسیانگ، سبنگ اور بیکنتھ پور جو ضلع میں سب سے بڑا اور ریاست میں دوسرا بڑا شہر اور شمال مشرقی بھارت کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ بیکنتھ پور کا سارا علاقہ میدانی جبکہ باقی تینوں سب ڈویژن پہاڑی علاقے تھے جہاں مختلف قبائل کی رہائش تھی تاہم گورکھا اکثریت میں تھے جو گورکھا نیشنل لبریشن فرنٹ کے بدھن سبا کی زیرِ قیادت تینوں کوہستانی علاقوں پر مشتمل ایک الگ ریاست کے قیام پر احتجاج کرتے رہتے تھے۔ اگرچہ وہ عام لوگوں سے درگزر کرتے مگر سرکاری ملازمین اور بالخصوص پولیس ان کا خاص ہدف بنتے۔ وہ سرکاری عمارتوں کو نذرِ آتش اور عمال کو ہلاک کرتے رہتے۔ حکومت کی طاقت کا مظہر ہونے کے سبب پولیس فورس ان کا نشانہ تھی، نتیجتاً بہت سے پولیس والے ہلاک ہو چکے تھے۔ کمال کے رشتہ دار اس کی یہاں تعیناتی پر فکر مند ہوئے، ان کا مشورہ تھا کہ بیکنتھ پور جانے کی بجائے وہ حکومت سے اپنا حکمنامہ منسوخ کرنے کی درخواست کرے۔ مگر اس نے کسی کی بات نہ مانی اور آ کر اپنا چارج سنبھال لیا۔

یہاں کام کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ لبریشن فرنٹ آئے دن ہڑتالیں اور مظاہرے کرتی رہتی جس سے عام آدمی کی زندگی بہت متاثر ہو رہی تھی۔ اشیائے خوردنی کی زیادہ تر ترسیل ان علاقوں کے ذریعے ہونے کے باعث پولیس کا فرض تھا کہ اس میں رکاوٹ نہ ہونے پائے، جس کے لیے متواتر گشت اور اناج کی محفوظ بہم رسانی اہم ذمہ داریاں تھیں۔ پولیس کے تازہ دم دستے بیکنتھ پور کے قریبی علاقے شری کانتھ پور سے بذریعہ ریلوے لیملنگ روانہ ہوتے تھے۔ ان کے لیے عارضی رہائش گاہوں اور پہاڑی علاقوں میں بھیجنے کے لیے سامان کا انتظام کرنا ایڈیشنل ایس پی کے فرائض میں شامل تھا۔ مظاہروں کے دوران انتظامات کرنا بہت مشکل ہو جاتا کیونکہ ڈرائیور اپنی جان جانے کے خوف سے وہاں جاتے ہوئے ڈرتے تھے اور یہ خوف بلا جواز نہیں تھا، پھر یہ کہ سرکاری امور میں بار بار تعطل کی وجہ سے ٹرکوں اور گاڑیوں وغیرہ کا بروقت کرایہ ادا کرنا بھی مشکل ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ پولیس دستوں اور سامانِ خورونوش کو وہاں پہنچانا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ کمال نے گاڑیوں کے مالکان سے متعدد بار ملاقاتیں اور کام سرانجام دینے کی درخواستیں کیں۔ یہ امور کمال کو اضافی تفویض کیے گئے تھے حالانکہ اس کے اصل فرائض کچھ کم دشوار نہیں تھے۔

بیکنتھ پور بنگال کو آسام اور باقی شمال مشرقی علاقوں، مغرب میں نیپال اور جنوب میں بنگلہ دیش سے ملاتا تھا۔

تھوڑے فاصلے پر بھوٹان کی سرحد تھی، گویا یہ مقامات سمگلروں کے لیے جنت سے کم نہیں تھے۔ پھر بیکنتھ پور کے اردگرد جنگلات میں درندے بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے تھے۔ ترائی علاقے میں چائے کے باغات تھے۔ عوام کو ضروری اشیاء کی فراہمی راشن سسٹم کے ذریعے ہوتی۔ اشیائے خورد ونوش بیکنتھ پور میں جمع ہوتیں جہاں سے دوسرے علاقوں کو روانہ کی جاتیں، اور یوں اس علاقے کو سمگلنگ میں بھی مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ کالے دھن اور کاروباری افراد کی ناجائز منافع خوری کے نتیجہ میں متعدد جرائم پیشہ گروہ پیدا ہو گئے۔ پولیس، محکمہ کسٹم، جنگلات اور خوراک کے اہلکار بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے رہتے، اس لیے یہاں تعیناتی بہت سے لوگوں کے لیے منافع بخش تھی۔ کمال کو اطلاع ملی کہ بیکنتھ پور پولیس اسٹیشن میں تعیناتی کے لیے موجودہ افسر نے ڈی، آئی، جی مسٹر بھٹا چاریہ کو ڈھائی لاکھ روپے رشوت دی تھی جو ان معاملات میں بزعمِ خویش بڑے غیر جانبدار اور ایماندار تھے۔ وہ انسپکٹروں کو اپنی تعیناتی کے لیے بولیاں لگانے کو کہتے اور پھر سب سے زیادہ پیشکش کرنے والے کو تعینات کر دیا جاتا۔ موجودہ افسر اسی طرح یہاں تعینات ہوا تھا۔

اس طریقے سے عہدے حاصل کرنے والے اہلکار کسی طور بھی غیر جانبداری اور اخلاقی اصولوں کی پروا نہیں کرتے۔ ان کا مقصد ادا شدہ رقم کے ساتھ ساتھ منافع کا حصول ہوتا۔ کمال کو یہ ساری باتیں ایک اور افسر مسٹر چکر ورتی نے بتائی تھیں۔ یہاں کے بارسوخ لوگوں کی نظر میں پولیس یا کسی دوسرے محکمے کی قطعاً وقعت نہیں تھی، اور یہ محکمے خود بھی ان سے چشم پوشی کرتے تاکہ اپنی کمائی میں کوئی فرق نہ آئے۔ مقامی سیاستدان بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، اور سب کا ایک فلسفہ تھا کہ خود بھی کھاؤ اور ہمیں بھی کھانے دو، باقی جائیں جہنم میں۔ پیسہ جس طرح چاہو جمع کرو، وہی قانون ہے۔ ہر ماہ رشوت دیتے رہو، پھر بےفکری سے کماؤ۔ ان راہوں پر چلنے والے ہی عقلمند اور عملی لوگ کہلاتے، باقی تو فضول باتیں تھیں۔

کمال جانتا تھا کہ اگر قانون کی بالادستی قائم کرنی ہے تو کالے دھن کی قوت کو کم کرنا ہوگا۔ اسی کے مدِ نظر اس نے کارروائیوں کو منظم کیا اور سمگلنگ کی روک تھام کے لیے جگہ جگہ چھاپے مارے۔ مسلح سمگلروں کے ساتھ مقابلوں میں خود بھی حصہ لیا۔ ایسی ہی کارروائیوں کے دوران ایک سمگلر کی ہلاکت نے اس کے ساتھیوں کو چراغ پا تو ضرور کیا مگر کالا کاروبار کچھ کم ہو گیا۔ بعد ازاں اس نے جنگلوں میں چھپے جرائم پیشہ افراد کی سرکوبی کے لیے چھاپے مارے۔ غیر قانونی طور پر کاٹے ہوئے درختوں کے متعدد ٹرک پکڑے اور مجرموں کو گرفتار کیا، حتیٰ کہ ان کے کاروباری ٹھکانوں کو بھی نہ چھوڑا۔ پھر ذخیرہ اندوزوں کی باری آگئی۔ ان سب کارروائیوں کا انتظامیہ اور عوام پر خوشگوار اثر ہوا۔ اب وہ سوچنے لگے کہ قانون سے بالا کوئی نہیں اور اگر کسی غیر قانونی حرکت کی پولیس کو اطلاع دی جائے تو کوئی نہ کوئی اقدام ضرور اٹھایا جائے گا۔ انتظامیہ پر اعتماد کی بحالی کمال کا اہم کارنامہ تھا۔ اسے پورے علاقے کی ہر بات کا علم ہونے لگا۔

ان کارروائیوں سے تنگ آکر مجرموں کے تمام گروہوں نے گلگالیہ میں ایک خفیہ میٹنگ کی۔ یہ علاقہ نہ صرف کمال کی، بلکہ ریاست ہی کی حدود سے باہر تھا۔ انہوں نے تین باتوں پر اتفاق کیا: اولاً، کمال کو رشوت کی پیشکش، انکار کی صورت میں دوسرا قدم سیاسی قیادت کو اس کی تبدیلی پر زور دینا، اور اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہو تو انتہائی اقدام کے طور پر پیشہ ور قاتلوں کی مدد سے کمال کو قتل کرنا۔ رات کو میٹنگ ختم ہوئی اور اگلی صبح اسے خبر ہو گئی۔ دوسرے دن شام تک ان میں سے تین سازشی گرفتار کر لیے گئے۔ تمام گروہ ٹھنڈے ہو گئے، کچھ تو خوفزدہ ہو کر علاقے سے فرار ہو گئے۔ پھر ایک موقع پر جب چند شر پسند ایک گاڑی کو لوٹنے کا ارادہ کئے بیٹھے تھے، ایک مخبر نے کمال کو مطلع کر دیا۔ نتیجتاً تمام مجرموں کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر ان سے لاکھوں روپے برآمد کر لیے۔ کمال کی ایمانداری اور راست بازی کے سب ہی قائل ہو گئے اور پھر جب ایک شخص کو، جو مجرمانہ حرکات سے تائب ہو گیا تھا، پولیس نے ناجائز ہراساں کیا تو اس نے کمال سے مل کر اپنی غلط کاریوں کا مداوا کرنے کا عہد کیا۔

نہرو گولڈ کپ انٹرنیشنل فٹ بال ٹورنامنٹ کے انتظامات کرنا کمال کے لیے شاندار تجربہ تھا۔ بحیثیت ایماندار، راست گو اور محنتی افسر کے ہر کوئی اس کا مداح تھا۔

ٹورنامنٹ کا کامیابی سے انعقاد ایک چیلنج تھا کیونکہ ریاستی صدر مقام سے باہر اتنا بڑا ٹورنامنٹ پہلی بار ہو رہا تھا۔ تینوں پہاڑی سب ڈویژنوں میں مسلح مظاہروں اور احتجاجات کی وجہ سے ہر کوئی اس کی کامیابی کے بارے میں مشوش تھا۔ یہ خدشات اس وقت زیادہ ہوئے جب ٹورنامنٹ سے قبل بیکلتھ پور شہر کے اندر اور قرب و جوار میں چند بم دھماکے ہوئے جن میں کچھ افراد زخمی ہو گئے۔ کمال نے جانفشانی سے کام کر کے متعلقہ گروہ کا سراغ لگا کر انہیں گرفتار کیا۔ اخبارات اس کی ستائش سے بھر گئے۔ رسائل میں بھی اس کی تصاویر شائع ہوئیں۔ اس کامیابی نے جہاں اس کی ہردلعزیزی میں اضافہ کیا وہیں مخالفین اور حاسدین کی تعداد بھی زیادہ ہوگئی۔

عام آدمی اور بالخصوص نوجوان طبقہ اس کا پرستار تھا جس کا اظہار متعدد مواقع پر ہوتا رہتا۔ دو ٹیموں کے درمیان فٹ بال میچ میں مقامی ایم این اے کے علاوہ بہت سے نامور کھلاڑی بھی گیلری میں موجود تھے مگر بچے اور نوجوان ادھر جانے کی بجائے کمال سے آٹوگراف لیتے رہے۔ اگرچہ اس نے پہلے انکار کر دیا تھا مگر ساتھ بیٹھے ہوئے سنیل ساہا نے یہ کہتے ہوئے اس کو قائل کیا، ''چھوٹے بچے آئے ہیں، انہیں مایوس مت کرو، آٹوگراف دو''، پھر اس نے خود ہی ایک بچے سے آٹوگراف بک لے کر کمال کے آگے رکھی۔ سب بچوں نے قطار بنالی۔ بہرحال وہ وہاں سے فوراً اٹھ کر کنٹرول روم آ گیا مگر اس وقت تک فوٹوگرافر نے تصاویر لے لی تھیں جو اگلے روز اخبارات میں شائع ہوئیں۔

میچ کے اختتام پر وہ واپس دفتر آیا۔ متعدد ملاقاتی اس کے منتظر تھے۔ کمال نے سب کو باری باری بلانا شروع کیا۔ سب سے پہلے ایک عمر رسیدہ خاتون دس بارہ برس کی بچی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ کمال نے ان کی آمد کا سبب پوچھا تو عورت بولی، ''لوگ دیوتاؤں کے پاس کیوں آتے ہیں؟ مدد کے لیے''۔ کمال کو عورت کے منہ سے اپنے لیے لفظ دیوتا سننا اچھا نہ لگا، اس لیے بولا، ''میرا خدا یا بھگوان پر ایمان نہیں ہے، میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہو۔ کام کیا ہے؟''

عورت نے جواب دیا، ''بیٹے! انسان ہی دیوتا بنتے ہیں۔ تم بھی ایسے ہی انسان ہو۔ تم بھگوان کے اوتار ہو ورنہ اس طرح لوگوں کی مدد کیوں کرتے۔ تمہاری وجہ سے ایک ملازمہ متیکا تا کو اس کی جھونپڑی واپس ملی، تم نے بدمعاشوں سے روپمانجری کی حفاظت کی، تم ہی نے دبگ رام جیسے راکھشش کی طبیعت صاف کی، اسی وجہ سے میں نے تمہیں دیوتا کہا ہے''۔

کمال کے ذہن میں آیا کہ رام اور کرشن بھی شاید نیک کاموں ہی کی وجہ سے دیوتا کہلائے جانے لگے تھے۔ کوئی بھی شخص جو علمۃ الناس کی بھلائی کے لیے کچھ کرے تو لوگ نہ صرف اس کی عزت کرتے ہیں بلکہ دیوتا کے سنگھاسن پر بھی بٹھا دیتے ہیں۔ ادھر عورت کہہ رہی تھی، ''اور اسی کارن میں تمہاری مدد حاصل کرنے آئی ہوں''۔

''مجھے بتاؤ، میں کیا کر سکتا ہوں؟''

ور پھر ایسی ہی کارروائیوں اور دیگر سرکاری کاموں میں دن بیت گیا۔

....

بیدار ہونے کے باوجود بھی کمال بستر پر لیٹا رہا۔ گذشتہ شب وہ ایک چھاپے کے بعد دیر گئے واپس لوٹا تھا۔ نیند پوری نہ ہوئی اور کچھ طبیعت بھی ناساز تھی، اس لیے آنکھیں موندھے لیٹا رہا۔ موسم ابر آلود ہونے کے باعث وہ وقت کا صحیح اندازہ نہ کر سکا کیونکہ آسمان گہرے تاریک بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بارش کے قطرے کھڑکی کے شیشے پر گر کر جلترنگ بجا رہے تھے جس سے اسے سکون مل رہا تھا، غنودگی بھی طاری تھی۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف چیف سیکریٹری تھا جس نے بتایا کہ ہوم سیکرٹری

دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز بھاگوڑی آرہا ہے۔ بدھن سبا بھی اپیشل جہاز سے پہنچ رہا ہے، اس لیے فوراً ہوائی اڈے پہنچو۔
دہلی سے آنے والی فلائیٹ ساڑھے آٹھ بجے پہنچنا تھی۔ اس وقت آٹھ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے ڈرائیور کو تیاری کا کہہ کر جلدی سے لباس تبدیل کیا۔ ساڑھے آٹھ بجے تک ہوائی اڈے پر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ادھر ہوائی اڈے سے رابطہ نہ ہو پایا، مقامی پولیس اسٹیشن کو بھی کہنے کا فائدہ نہیں تھا کیونکہ جب تک وہ وہاں پہنچتے، وہ خود اس سے پہلے پہنچ جاتا۔ خیر، اسے پہنچتے پہنچتے آٹھ بج کر پچاس منٹ ہو گئے۔ جہاز آ چکا تھا۔ وہ جلدی سے اندر داخل ہوا۔ ہوم سیکرٹری کمل کرشنم اچاریا لاؤنج میں ایک طرف بیٹھا تھا۔ کمال نے اسے سیلوٹ کیا تو باقی لوگ بھی بھاگے بھاگے وہیں آ گئے۔
کمال نے ائیر پورٹ اتھارٹی سے رابطہ کر کے وی، آئی، پی لاؤنج کھولنے کو کہا۔ چند منٹ بعد ایس، ڈی، او بھجن رام بھی پہنچ گیا۔ ہوم سیکرٹری وی، آئی، پی لاؤنج میں بدھن سبا کے پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔
سب ڈویژنوں کے پہاڑی مقامات میں اٹھارہ دن مسلسل ہڑتال کے بعد حکومت نے لبریشن فرنٹ کے رہنماؤں کو بات چیت کے لیے مدعو کیا ہوا تھا۔ ہوم سیکرٹری ریاست کی نمائندگی کے لیے پہنچا تھا۔ مذاکرات کے بعد وہ مسٹر سبا سے کوئی خاص بات کرنے سیدھا بیکنتھ پور آ گیا۔ مسٹر سبا دہلی سے اپیشل فلائیٹ پر آ رہا تھا۔ کمال کو معلوم ہوا کہ جہاز تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ائیر فورس آفس کے سامنے کھڑا ہو گا۔ وہ اور ہوم سیکرٹری دونوں اس طرف چل دیے۔ متعلقہ انتظامیہ نے اپیشل لاؤنج کھول دیا۔ سب لوگ وہاں انتظار کرنے لگے۔
جہاز نے پونے بارہ بجے لینڈ کیا۔ مسٹر سبا اپنے تین معاونین کے ساتھ جہاز سے اترا، ہوم سیکرٹری سے ملاقات کی اور پھر چاروں نے لاؤنج میں جانے کے بعد دروازہ بند کر لیا۔ ایک گھنٹے کی میٹنگ کے بعد سبا صاحب تو کار کے ذریعے لیسلنگ روانہ ہوئے اور ہوم سیکرٹری سرکٹ ہاؤس چلا آیا۔ اسی اثنا میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس پی بھی پہنچ گئے تھے۔ اخباری نمائندوں کو ہوم سیکرٹری کی آمد کا علم ہوا تو سرکٹ ہاؤس کے فون کھڑکنا شروع ہو گئے۔ ان سے بچنے کے لیے ہوم سیکرٹری کو ایک ہوٹل میں منتقل کر دیا گیا اور سارے عملے کو تنبیہ کر دی گئی کہ اس کے قیام کی کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔
یہاں سے فارغ ہو کر کمال اپنے دفتر گیا جہاں بہت سے لوگ اس کے منتظر تھے۔ وجہ جاننے پر معلوم ہوا کہ تھانے والوں نے ان لوگوں کو اپنے کوارٹر خالی کرنے کا حکم دیا ہے، اسی لیے یہ اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ کمال سمجھ نہ پایا کہ معاملہ کیا ہے۔ ان سب کو اندر بلایا جو تعداد میں تقریباً تیس افراد تھے۔ ایک بوڑھے شخص نے ہاتھ جوڑتے ہوئے التجا کی کہ وہ سب بہت غریب ہیں، ان پر رحم فرمایا جائے۔

''مجھے بتاؤ کہ معاملہ ہے کیا؟''

''تھانے والوں نے ہمیں اپنے کمرے خالی کرنے کو کہا ہے۔ ہم کہاں جائیں؟''

''آخر کمرے خالی کرانے کی کوئی وجہ تو ہوگی؟''

''وہ کہتے ہیں کہ یہاں سپاہی رہیں گے''۔

''سپاہی رہیں گے؟ میں سمجھ نہیں پایا۔ سپاہی وہاں کیوں رہیں گے؟ سارے مت بولیں، تم میں سے کوئی ایک شخص بات بتائے تاکہ میں سمجھ سکوں''۔

ایک ادھیڑ عمر کا شخص آگے آیا اور کہنے لگا، ''سر! ہم بحیثیت کرایہ دار ایک گھر میں رہ رہے ہیں۔ گورچند اگروال نے وہ گھر خرید لیا ہے''۔

''گورچند اگروال کون؟ وہ جرمن موٹرز والا؟''

''جی سر!''

''اوہ! تم لوگ گور چند اگروال کے دھرم شالہ میں رہتے ہو؟''

''سر، یہ دھرم شالہ نہیں ہے''۔

''پھر کیا ہے؟''

''یہ ایک عام سا گھر ہے۔ سابقہ مالک نے ہمیں کرائے پر دیا ہوا تھا۔ ہم میں سے کچھ تو وہاں دس بارہ سالوں سے رہ رہے ہیں، گور چند اگروال کے خریدنے سے بھی بہت پہلے سے، جو وہاں اب اونچی سی عمارت بنانا چاہتا ہے۔ اس نے ہمیں گھر خالی کرنے کو کہا ہے۔ بہت کوشش کے بعد بھی ہمیں کوئی اور گھر نہیں مل سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنی قلیل کمائی میں کوئی اور گھر لے ہی نہیں سکتے۔ سر! یہ شخص سبزی والے کے پاس ملازم ہے، میں درزی کے ہاں کام کرتا ہوں، اور وہ سینما گھر میں۔۔۔۔۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا ہوں۔ اگلی بات بتاؤ''۔

''گور چند نے عدالت میں مقدمہ کر دیا کہ یہ عمارت دھرم شالہ ہے جس پر ہم لوگوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ ہم نے عدالت میں کرائے کی رسیدیں پیش کیں جس پر اس کا مقدمہ خارج ہو گیا۔ آج یہاں تھانے سے الوک پال نے آ کر ہمیں حکم دیا ہے کہ کل صبح تک گھر خالی کر دیا جائے ورنہ پولیس ہمارا سامان باہر پھینک دے گی۔ اس کا کہنا ہے کہ یہاں سپاہی رہا کریں گے''۔

یہ سن کر کمال کو بہت اچنبھا ہوا۔ قانونی طور پر رہائش پذیر کرایہ داروں کو بے دخل کرنے کے لیے پولیس وہاں کیوں گئی؟ اس نے اسی وقت تھانے میں پال سے بات کی جس نے بتایا کہ ایس، پی مسٹر چند نے خالی کرانے کو کہا تھا۔

''کیا کہا تھا اس نے؟''

''سر! پہاڑی علاقوں میں پولیس فورس کو اکثر بھیجا جاتا ہے۔ یہاں ایک دو روز قیام کے لیے انہیں رہائش کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مستقل رہائش گاہ ہماری مشکل حل کر سکتی ہے۔ گور چند نے ہمیں یہ گھر بلا معاوضہ دینے کی پیشکش کی ہے بشرطیکہ اسے خالی کرا لیا جائے''۔

''کیا ایس پی کو علم ہے کہ یہاں دس بارہ سال سے متعدد خاندان رہ رہے ہیں؟''

''سر! مجھے اس کا علم نہیں''۔

''کیا تم نے اس سے بات کی؟''

''نہیں سر!''۔

''کیا اس معاملہ کی چھان بین کی؟''

جواب میں پال کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ کمال کو دکھ ہوا کہ پولیس کے کچھ اہلکار محکمے کو کیسے بدنام کر رہے ہیں۔ پال کی سرزنش کرتے ہوئے اس نے کہا، ''تم نے کوئی چھان بین نہیں کی، کسی سے بات نہیں کی، ایس پی مسٹر چند نے تمہیں جگہ خالی کرانے کو کہا اور تم نے جا کر ان لوگوں کو کل صبح تک گھر خالی کرنے کو کہہ دیا، اور دھمکی دی ہے کہ گھر خالی نہ ہوا تو ان کا ساز و سامان باہر پھینک دیا جائے گا۔ ان بارشوں کے دنوں میں وہ بیچارے کہاں جائیں گے؟''

پال کو چپ لگ گئی۔ کمال کہنے لگا، ''چند صاحب سے میں خود بات کر لوں گا۔ میری اجازت کے بغیر تم گھر خالی کرانے دوبارہ نہیں جاؤ گے''۔

فون ختم کرنے کے بعد اس نے موجود سب لوگوں سے کہا، ''تم نے میری بات سن لی ہے۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا، میں خود دیکھ لوں گا''۔ اس کی یقین دہانی پر وہ لوگ چلے گئے۔

کمال نے سوچا کہ اسے مسٹر چند سے بات کرنا چاہیے۔ پال جیسے اہلکار خطرے کی علامت ہیں۔ وہ اسے کچھ اور کا اور بتائیں گے۔ گور چند ایک امیر آدمی تھا جو گھر خالی کرانے کے چکر میں ہے۔ اس میں ناکام ہو کر اس نے پولیس کی مدد حاصل کی ہے۔ اہلکاروں نے ایس پی کو کچھ اور کہانی بنا کر قائل کیا ہوگا۔ وہ فراخ دل شخص تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ بالعموم کسی معاملہ کی تہہ تک نہیں جاتا تھا جس کے سبب اسے غلط راہ پر لگانا قدرے آسان تھا۔ لیکن اس وقت تو وہ ہوم سیکرٹری کے ساتھ ہوگا یقیناً وہ اہم معاملات پر بات کر رہے ہوں گے لہٰذا اس وقت بات کرنا مناسب نہیں، شام کو بات کی جاسکتی ہے۔

کمال نے باقی ملاقاتیوں کو بھی باری باری اندر بلایا۔ ایک عمر رسیدہ عورت نوجوان لڑکے کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ سلام کرنے کے بعد اس نے بتایا کہ وہ بڑے غریب لوگ ہیں اور یہ کہ اس لڑکے کا باپ بڑھاپے کی وجہ سے کام کاج نہیں کرسکتا۔ ہم پانچ افراد ہیں، میرے بیٹے نے دسویں پاس کرلی ہے، اسے کہیں کام پر لگا دیں۔

کمال کو پریشانی ہوئی کیونکہ اس کے بارے میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ وہ دوسروں کی بہت مدد کرتا ہے، جس کے سبب لوگوں میں ایک غلط تاثر پایا جانے لگا تھا۔ جن لوگوں کو اس کے اختیارات کی حدود کا علم نہیں تھا وہ سمجھتے تھے کہ وہ روزگار اور ملازمت کا بھی انتظام کرسکتا ہے، اس لیے آئے دن لوگ اس کے پاس ملازمت کی درخواست لیے پہنچے ہوتے۔ وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا کہ اس کے لیے یہ بہت مشکل ہے، اس وقت بھی اس نے عورت کو سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اس نے لڑکے کو مخاطب ہو کر کہا، ''تمہاری ماں تو نہیں سمجھ رہی مگر تم جانتے ہو کہ ملازمت اس طریقے سے نہیں ملتی۔ اسامیاں مشتہر ہوتی ہیں اور دفترِ روزگار کے ذریعے امیدواروں کو کاغذی کارروائی پوری کرنا پڑتی ہے''۔ لڑکے نے جواب دیا کہ اس نے ماں کو بہت سمجھایا تھا، پھر بھی وہ اسے اپنے ساتھ زبردستی لے آئی ہے۔ کمال نے کہا، ''ٹھیک ہے، اگر تمہارا نام کہیں بھیجا جائے تو مجھے بتانا۔ میں متعلقہ مجاز افسر کو کہہ دوں گا کہ بغیر کسی جواز کے تمہارا نام خارج نہ کرے''۔ عورت اس یقین دہانی پر خوشی خوشی چلی گئی۔

کمال نے وقت دیکھا۔ ساڑھے چار بج رہے تھے۔ ہوم سیکرٹری کی بذریعہ ریل واپسی پونے سات بجے تھی۔ وہ ہوٹل کی جانب روانہ ہوگیا۔ کمرے میں مسٹر کرشنم اچاری اپنا سامان باندھ رہے تھے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر مشرا اور ایس پی مسٹر چند ہاتھ بٹا رہے تھے۔ بیرا سب کے لیے کافی اور بسکٹ لے آیا۔ سوائے کمال کے باقیوں نے کافی لی، اس نے صرف بسکٹ پر اکتفا کیا۔ مسٹر چند ہوم سیکرٹری کے پاس جا کر ہولے سے کہنے لگا، ''سر! باہر سے کچھ چیزیں منگوائی تھیں، آپ کے سامان کے ساتھ بھیج رہا ہوں''۔ کرشنم اچاری نے کچھ اس انداز سے انکار کیا جس میں انکار سے زیادہ رضامندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ مسٹر چند سمجھ گیا اور بیرے کو بلا کر کچھ کہا تو وہ غیر ملکی شراب کی تین بوتلیں لے آیا جو مسٹر چند نے سامان میں رکھ کر بیرے کو کہا کہ یہ سارا سامان اس کی گاڑی میں پہنچا دے۔

کمال کو یہ توقع نہیں تھی۔ وہ کرشنم اچاری کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ اب تک اس نے جتنے ہوم سیکرٹری دیکھے تھے، اس افسر کے بارے میں اس کے خیالات بہت اچھے تھے۔ وہ چھوٹے افسروں کے ساتھ بہت اچھے طریقے سے ملتا، ان کی مشکلات اور مسائل کو سمجھتا اور بے جا شان و شوکت کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا تھا۔ کیا ایسا شخص بھی یہ کام کرسکتا ہے؟ ٹھیک ہے وہ مے نوشی کرتا ہوگا مگر جونیئر افسروں کے پلے سے نہیں۔ جب وہ یہ کام کرے تو غیر جانبداری کہاں گئی؟ جس نے اس کے سامان میں شراب کی بوتلیں رکھوائی تھیں کیا یہ بغیر کسی غرض کے تھا؟ اس قسم کے کئی سوالات کمال کو پریشان کرنے لگے۔

چھ بج گئے، وہ سب نیچے آئے۔ کمال ان کے ساتھ اسٹیشن تک جانا تو نہیں چاہتا تھا مگر مسٹر چند سے گھر کے بارے میں بات کرنا بھی ضروری تھا۔ ٹرین وقت پر روانہ ہوگئی۔ کمال نے مسٹر چند کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے گھر کی بات چھیڑ دی، ''سر!

آپ نے مسٹر پال کو گھر خالی کرانے کو کہا، لیکن اس نے آپ کو نہیں بتایا کہ وہاں کئی خاندان کوئی بارہ برس سے قانونی طور پر رہ رہے ہیں اور گھر خریدے جانے سے پہلے کے رہائشی ہیں۔ عدالتی کارروائی کے بعد ان سے گھر خالی نہیں کرایا جاسکتا''۔

''کیا یہ ایسا ہی ہے؟''

''جی سر! یہ سارے کرایہ دار بہت غریب ہیں، ان کے پاس سر چھپانے کی کوئی اور متبادل جگہ بھی نہیں۔ اگر انہیں بے دخل کر دیا گیا تو وہ بڑی تکلیف میں پڑ جائیں گے''۔

''نہیں، نہیں، بے دخل کیوں کرنا ہے۔ ایسا نہیں کرنا۔ گور چند نے تو مجھے یہ بتایا تھا کہ گھر خالی ہونے کی وجہ سے چند غنڈوں نے اس پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے، اس پر میں نے گھر خالی کرانے کا کہا تھا''۔

''تو سر! کیا انہیں بے گھر نہیں کیا جائے گا؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ان سے گھر خالی کرانا مناسب نہیں، اس سے ہمارے محکمے کی بدنامی ہوگی''۔

''ٹھیک ہے، انہیں رہنے دو''۔

''بہت بہت شکریہ، سر!''

کمال کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اگرچہ اس نے کرایہ داروں کو یقین دلایا تھا مگر اندیشہ بھی تھا کہ اگر ایس پی صاحب اپنی بات پر قائم نہ رہے تو؟ اتنے میں وہ واپس ہوٹل پہنچ گئے۔ کمال نے کہا، ''سر! مجھے کل گاؤں جانا ہے اس لیے میں صبح صبح روانہ ہو جاؤں گا''۔

''ٹھیک ہے، چلے جانا۔ اور ویسے بھی اس وقت تم یہاں ٹھہر کر کیا کرو گے؟ پیتے تو تم ہو نہیں''۔

کمال سلیوٹ کر کے اپنی گاڑی میں آ گیا۔ سارے دن کی تھکن کے بعد وہ سیدھا بستر پر دراز ہونا چاہتا تھا۔ دفتر رکا تو اسے بتایا گیا کہ شام سے ایک شخص اس کا منتظر ہے۔ اس نے بلایا۔ ایک ادھیڑ عمر کا شخص کمرے میں داخل ہوا، بیٹھ کر ارد گرد دیکھا آیا کوئی اور تو نہیں، پھر کہنے لگا، ''سر! میرا ہمسایہ سیمنٹ کی بلیک مارکیٹنگ کر رہا ہے''۔

''تمہاری رہائش کہاں ہے؟''

''دیش بندھو پاڑا''۔

''کس طرف؟''

''دادا بھائی کلب کے نزدیک''۔

''کس قسم کی بلیک مارکیٹنگ؟''

''افسروں سے مل ملا کر آبپاشی پروجیکٹ سے سیمنٹ لایا جاتا ہے، جسے بیچ کر آپس میں رقم تقسیم کر لیتے ہیں۔ کل رات بھی ایک ٹرک لایا گیا تھا''۔

''تم کیسے جانتے ہو کہ سیمنٹ آبپاشی پروجیکٹ کا ہے؟''

''بوریوں پر حکومت کی مہریں لگی ہوئی ہیں، پھر یہ کہ ان لوگوں کے پاس کوئی لائسنس یا پرمٹ بھی نہیں۔ یہ لوگ کسی قسم کی تعمیر بھی نہیں کر رہے، پھر سیمنٹ کیوں لاتے ہیں؟''

''کیا سیمنٹ کی بوریاں اب بھی وہاں موجود ہیں؟''

''میرے گھر سے آنے تک بوریاں وہیں تھیں''۔

کمال نے باہر جا کر ایس پی سے چند افسروں کی ٹیم بھیجنے کی درخواست کی۔ نشاندہی والے گھر جا کر دیکھا تو بیرونی

کمرہ مقفل پایا۔ باہر سیمنٹ گرنے کے نشان موجود تھے، گویا اندر سیمنٹ کا ہونا ممکن تھا۔ گھر بھر میں کوئی مرد دکھائی نہ دیا۔ ایک بوڑھے شخص نے اندر سے چابی لا کر قفل کھولا۔ سیمنٹ کی اکتیس بوریاں موجود تھیں۔ حکومت کی مہروں کا تو کیا سوال، بوریوں پر کسی کمپنی یا کارخانے کا نام تک نہیں تھا۔ کمال نے اس شخص سے سوال کیا، ''کیا تم لوگ کوئی عمارت وغیرہ تعمیر کر رہے ہو؟''

''نہیں بیٹے! ہم کوئی تعمیر نہیں کر رہے ہیں''۔

''پھر یہاں سیمنٹ کی بوریاں پڑی ہیں؟''

''میرا چھوٹا بیٹا کہیں سے لا کر فروخت کرتا ہے''۔

''یہ کام کب سے ہو رہا ہے؟''

''تقریباً ایک سال سے۔ کیا اس نے کوئی گڑبڑ کی ہے؟''

''کیا اس کے پاس اس کا لائسنس ہے؟''، کمال نے الٹا اس سے سوال کیا۔

''یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔ کیا اس نے کوئی غلط کام کیا ہے؟ اگر نہیں تو آپ کیوں آئے ہیں؟ آج سے پہلے پولیس کبھی بھی میرے گھر نہیں آئی''۔

''کیا پولیس کا آنا بری بات ہے؟''

''جی بالکل۔ کیا پولیس کبھی کسی اچھی جگہ جاتی ہے؟''

کمال کو اس بوڑھے شخص سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ سیدھا سادہ آدمی تھا اور عام دیہاتیوں کی مانند یہ خیال کر رہا تھا کہ کسی گھر میں پولیس کا آنا گھر والوں کے لیے باعثِ شرم ہے۔ کمال کو اندازہ ہوا کہ سیمنٹ چوری کا ہے اس لیے اس نے پوچھا آیا ان کے پاس سیمنٹ کی خرید و فروخت کے کاغذات ہیں؟

''میرے بیٹے کے پاس ہوں گے''۔

''پھر میں یہ سارا سیمنٹ ضبط کر رہا ہوں مگر لے کر نہیں جاؤں گا۔ یہ تمہاری ہی تحویل میں رہے گا۔ پلیز! اپنے بیٹے سے کہنا کہ جلد از جلد آ کر مجھ سے ملے''۔ پھر وہ واپس گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

....

رات کا کھانا کھانے کے بعد اس نے بینا کو فون کرنے کا سوچا مگر گھر پر فون نہیں تھا۔ ایک بار پہلے اس نے ہیلتھ سنٹر سے فون کر کے متعلقہ عملے کو درخواست کر کے بینا کو بلوایا جو اسے بہت ناگوار گزرا تھا۔ اس نے کمال کو سمجھایا کہ یہاں کا عملہ کسی کو بلانا مناسب نہیں سمجھتا اس لیے آئندہ وہ خود ہی فون کر لیا کرے گی۔ بنگا پور یا باہمن آباد میں ملازمت کے دوران یا تو وہ خود بینا کے پاس چلا جایا کرتا یا وہ آ جاتی، لیکن بیکنتھ پور کا باکل پور سے فاصلہ طویل ہونے کے باعث بینا کا وہاں آنا مشکل تھا۔ پھر MSc میں اس کی مصروفیت کی وجہ سے اسے بلانا مناسب نہیں تھا، لہٰذا وہ کافی عرصہ سے ملاقات نہ کر سکے تھے۔

کمال نے فون کیا اور کئی دفعہ ملانے کے بعد ایک نسوانی آواز آئی، ''ہیلو! یہ پرائمری ہیلتھ سنٹر ہے''۔

''میں کمال بات کر رہا ہوں، ڈاکٹر حسین کا داماد۔ کیا آپ پلیز میری بیوی بینا کو اطلاع دے سکتی ہیں؟''

اس نے اتنی شائستگی سے بات کی کہ فون اٹھانے والی خاتون انکار نہ کر سکی۔ کہنے لگی، ''پلیز! توقف کیجیے، میں پیغام بھجوا دیتی ہوں''۔ چند منٹ انتظار کرنے کے بعد کمال نے بینا کی غصے سے بھری آواز سنی، ''مجھے دوبارہ کیوں فون کیا ہے؟ کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ مجھے فون مت کرنا؟ دوبارہ فون نہ کرنا، میں نہیں آؤں گی''۔

''ٹھیک ہے، میں فون نہیں کروں گا، مگر تم کیسی ہو؟''

''اچھی ہوں''۔

''امتحان کیسے ہوئے؟''

''Microbiology کا پرچہ اچھا ہوا تھا مگر Cell Biology کوئی خاص نہیں ہوا''۔

''فکر نہیں کرو، تمہارے نمبر سب سے زیادہ ہوں گے، بے شک دوسروں نے بھی بہت محنت کی ہوگی''۔

''کیا انہوں نے تمہیں خود بتایا تھا کہ ان کے پرچے اچھے ہوئے ہیں؟ مینا کے لہجے میں طنز اور غصہ تھا۔

''کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں، میں قیاس کر سکتا ہوں''۔

''قیاس آرائی کرتے رہو لیکن میرا نتیجہ تمہاری توقعات کے مطابق نہیں ہوگا''۔

''دیکھا جائے گا۔ امتحان کب ختم ہو رہے ہیں؟''

''چھ تاریخ کو''۔

''اور اسی رات ٹرین پر بیٹھ کر یہاں آ جاؤ''۔

''کیا مجھے اور کوئی کام نہیں؟''

''امتحانوں کے بعد کیا کام ہے؟''

''کیا لائبریری کی کتابیں واپس نہیں کرنی؟''

''یہاں سے جانے کے بعد واپس کر دینا''۔

''تم خود کیوں یہاں نہیں آ جاتے؟''

''یہاں آؤ گی تب ہی تمہیں میری حالت کا اندازہ ہوگا''، کمال نے جواب دیا۔

''پھر مجھے آنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ حکومت کو تم اکیلے ہی چلا رہے ہو، تمہارے چھٹی لینے سے وہ ختم ہو جائے گی''۔

''نہیں ایسا تو نہیں''۔

''پھر؟''

''آ جاؤ''۔

''میں نہیں آ سکتی''۔

''آخر تمہارا رویہ اتنا بُرا کیوں ہے؟''

''بُرا ہے؟ اور تم تو شاید میرے ساتھ بڑے مہربان ہو۔ میں تمہیں اپنے سفر کے بارے میں لکھ چکی ہوں، ملنے پر پڑھ لینا''۔

''اوہ! اتنی دیر سے بتایا کیوں نہیں؟ کیا پلان بنایا ہے؟''

''میں آٹھ تاریخ کی صبح پہنچ رہی ہوں''۔

''سات کو کیوں نہیں؟''

''میں نے ٹکٹ لے لیا ہوا ہے''۔

''بہتر! اب جلدی سے آ جاؤ''۔

جیسے ہی اس نے فون رکھا، اردلی نے بتایا کہ سیمنٹ والا لڑکا آیا ہوا ہے۔ اس کو دفتر میں بلایا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''شیامل،سر!''

''سیمنٹ کہاں سے خریدا تھا؟''

''نیشنلائیڈ ٹرانسپورٹ شیڈ سے''۔

کمال کے لیے یقین کرنا مشکل تھا کیونکہ وہ شیڈ ہمسایہ ریاست کی ملکیت تھی، اور اشیائے برائے درآمد و برآمد کی ساری نقل وحرکت یہیں سے ہوتی تھی۔ان کی اپنی کوئی سیمنٹ فیکٹری نہیں تھی اس لیے وہ اپنی ضروریات کے لیے دیگر ریاستوں سے درآمد کرتے تھے۔کارخانوں سے سیمنٹ اسی شیڈ میں آتا جہاں سے ہمسایہ ریاست کو ترسیل ہوتی، لہٰذا سیمنٹ بیچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔کمال نے پوچھا،''کیا تمہارے پاس سیمنٹ خریدنے کے کاغذات ہیں؟''

''نہیں سر!وہ کوئی کاغذ نہیں دیتے''۔

''تمہارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت سیمنٹ فروخت کرتی ہے مگر بغیر لکھت پڑھت کے؟''

''سر!وہ قانونی طور پر فروخت نہیں کرتے، چھپ چھپا کر بیچتے ہیں''۔

''کیسے؟''

''سر!فرض کریں کہ سیمنٹ کی دو سو بوریاں شیڈ میں پہنچی ہیں۔وہ اس سے تین سو بوریاں بنا لیتے ہیں۔سو بوریاں ہمیں بیچ کر دو سو آگے بھیج دی جاتی ہیں، اس طرح کاغذات میں دو سو بوریاں پوری ہوتی ہیں''۔

''گویا بوریوں کی تعداد پوری، مگر وزن میں کمی سے تو معلوم ہو جاتا ہوگا''۔

''سر!وزن کون کرتا ہے؟ وزیرِ اعلیٰ تک سب اس میں ملوث ہیں۔کسی کو کوئی پروا نہیں''۔

کمال کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وزیرِ اعلیٰ بھی اس میں حصہ دار ہے۔وہ اس کی تصدیق چاہتا تھا۔بہر حال،لڑکے سے پوچھا،''بوریوں میں ردوبدل کس وقت ہوتا ہے؟''

''رات گیارہ بجے کے بعد''۔

''کیا آج رات بھی؟''

''جی سر!آج سیمنٹ پہنچ گیا ہے اس لیے یقینی طور پر رات کو وہ گڑبڑ کریں گے۔مجھے بھی رات کو سیمنٹ لینا ہے''۔

''کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو؟''

''چلیں۔میں آپ کو شیڈ کے اندر پہنچا کر خود واپس آ جاؤں گا''۔

''ٹھیک ہے''۔

رات گیارہ بجے کے بعد کمال اپنے چند بااعتماد اہلکاروں اور شیامل کے ساتھ شیڈ میں داخل ہو گیا۔چوکیدار شیامل کا شناسا تھا جو اس سے گپ شپ کرنے لگا۔اس نے صحیح بتایا تھا۔تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے مقفل تھیں۔کام جاری تھا۔کمال نے چھپ کر دیکھا، تقریباً پچیس افراد بھری بوریوں سے سیمنٹ نکال کر خالی بوریوں کو بھر کر ایک طرف رکھتے جا رہے تھے۔پانچ افراد اس کام کے نگران تھے۔کمال نے گشت پر معمور پولیس گاڑی کو طلب کیا۔شیامل وہاں سے جا چکا تھا۔کمال نے چوکیدار پر اپنی شناخت ظاہر کر کے اندر کے دروازے کھلوانے کا حکم دیا۔اس کے پاس کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا لہٰذا اندر والوں کو بتانا پڑا کہ پولیس آ گئی ہے، دروزہ کھولو۔

اندر ہونے والا کام یک لخت رک گیا، دروزہ کھلنے پر وہاں صرف دو افراد پائے گئے۔کمال نے اپنے آدمیوں کو تلاشی لینے کے لیے کہا۔پچیس مزدور چھپے ہوئے تھے۔تفتیش پر علم ہوا کہ وہ دن کے وقت یہاں کام نہیں کرتے، انہیں بوریوں

میں ردوبدل کے لیے خاص طور پر رکھا گیا تھا، اور ان کی مزدوری ایک روپیہ فی بوری تھی۔ چوکیدار سے مینیجر تک سبھی کارکن یہاں موجود تھے۔ کمال نے مینیجر سے پوچھا کہ رات گئے بوریوں میں ردوبدل کیوں کیا جا رہا تھا؟ وہ خاموش کھڑا رہا۔ کمال نے بغیر فیکٹری نام اور نشان کی آٹھ بوریاں ضبط کر کے انہیں مینیجر کی تحویل میں دیا اور سوائے چوکیدار کے دیگر آٹھ ملازمین کو حراست میں لے لیا۔ بعد ازاں، ساری حقیقت ڈی جی، ٹرانسپورٹ سیکرٹری اور چیف سیکرٹری کو لکھ بھیجی۔ ایس پی مسٹر چند کو ساری بات ٹیلیفون پر بتائی جس نے مذاق میں کہا، "تم کسی کو بھی چین سے نہیں رہنے دو گے۔ بہر حال، بہت اچھے، کارروائی جاری رکھو"۔

اگلے دن ہر طرف ہنگامہ مچا تھا۔ ہمسایہ ریاست کے جوائنٹ سیکرٹری نے وہاں پہنچ کر کمال کی بے انتہا تعریف کی، "تم نے شاندار کام کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ یہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ اگر تم ان لوگوں کو گرفتار نہ کرتے تو پتہ نہیں کب تک یہ کام ہوتا رہتا"۔

"جب ہر بوری سے ایک تہائی سیمنٹ نکل رہا تھا تو آپ کے ہاں وزن کی کمی پر توجہ ہونی چاہیے تھی"۔

"ہاں، یہ ایک عجیب سا معاملہ ہے۔ ہو سکتا ہے ہمارے لوگ بھی ملے ہوئے ہوں۔ ہمیں کبھی بھی وزن میں کمی کی شکایت موصول نہیں ہوئی"۔

"اس بار وہ سب لوگ بے نقاب ہو جائیں گے۔ بہتر ہوگا اگر آپ ہمارے ہاں بھی FIR درج کرا دیں"۔

"نہیں نہیں، آپ نے پہلے ہی ہمارے لیے بہت کام کر ڈالا ہے، ہم آپ کو زیادہ زحمت نہیں دیں گے۔ ہم خود ہی اس معاملہ کی چھان بین کریں گے۔ جہاں بھی ضرورت محسوس ہوئی، آپ کی مدد بھی لیں گے"۔

کمال کو محسوس ہوا کہ شیامل غالباً ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ وزیر اعلیٰ تک سب لوگ اس دھندے میں شامل ہیں۔ وہ یہاں کی پولیس کو تفتیش نہیں کرنے دے رہے۔ جوائنٹ سیکرٹری نے لکھ کر دے دیا کہ کسی اور کو مزید تحقیقات کی ضرورت نہیں۔

عدالت نے مینیجر سمیت سب کی ضمانت منظور کر لی۔ محکمہ نے اسے معطل کر دیا گیا، شاید اس وجہ سے کہ اس نے اپنے کام میں احتیاط نہیں برتی۔

....

آٹھ اگست، 1987۔ کمال نے صبح کی کوئی مصروفیت نہ رکھی، لہٰذا کپڑے بدل کر اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ گاڑی ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر سے ہے۔ وہ گاڑی کا انتظار کر رہا تھا کہ اس اثنا میں بہت سے لوگ وہاں جمع ہو کر تجسس سے اسے دیکھنے لگے۔ ایک شخص نے پوچھ ہی لیا، "سر! کہیں چھاپہ مارنے کا ارادہ ہے؟" اس نے مسکرا کر جواب دیا، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ گاڑی دھیرے دھیرے پلیٹ فارم کی طرف آ رہی تھی۔ چونکہ مینا نے اسے ڈبے کا نمبر نہیں دیا تھا اس لیے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اتنے میں کمال نے اسے پلیٹ فارم پر کھڑے دیکھا۔ وہ اس کے پاس گیا تو مینا خوشی سے پوچھنے لگی، "تو تم آ گئے۔ کیسے ہو؟

کمال نے اس کے ہاتھ سے کتابوں کا تھیلا پکڑ لیا اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باہر گاڑی تک آئے۔ گھر پہنچ کر منہ ہاتھ دھویا اور کھانا کھاتے ہوئے کمال نے مینا سے امتحان اور آئندہ کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے الٹا کمال سے پوچھا، "تم کیا چاہتے ہو؟"

"پی ایچ ڈی کے لیے بالکل پوریا پر تسنتھن پور اپنی رجسٹریشن کراؤ"۔

"پر تسنتھن پور ہو سکتا ہے مگر اس کے لیے مجھے NET میں اپنی اہلیت ثابت کرنا ہوگی"۔

"کوئی مسئلہ نہیں۔ NET میں بیٹھو، مجھے یقین ہے تم کامیاب ہو جاؤ گی"۔

''یہ اتنا آسان نہیں۔ ابھی تک ہماری یونیورسٹی سے کسی نے NET میں کامیابی حاصل نہیں کی''۔

''کیوں؟''

''شاید اس لیے کہ ہماری یونیورسٹی کے شعبۂ سائنس کا معیار زیادہ اچھا نہیں''۔

''فکر نہیں کرو، ہم سلیبس اور پچھلے برسوں کے اہم سوالات دیکھ لیں گے کہ مزید کن موضوعات پر پڑھنے کی ضرورت ہے''۔

''لیکن ہمارے اساتذہ اس بارے زیادہ نہیں جانتے''۔

''ہم کسی دوسری یونیورسٹی کے پروفیسروں سے رابطہ کریں گے''۔

''وہ کیسے؟''

''میں نے یہاں کی یونیورسٹی کے علم الحیوانیات (Zoology) کے پروفیسر سمیر چکرورتی سے بات کرلی ہوئی ہے''۔

''یااللہ! تم مجھے یہاں یونیورسٹی میں لے جانا چاہتے ہو۔ میں جلد واپس جا کر تعطیلات کے مزے لینا چاہتی ہوں۔ ابھی ابھی تو میرا MScا کا امتحان ختم ہوا ہے۔ میں پروفیسر چکرورتی سے ملنے نہیں جاؤں گی''۔

''میری جان! تمہاری مرضی۔ تم نے خود ہی بتایا ہے کہ تمہاری یونیورسٹی میں سے کوئی آج تک NET میں کامیاب نہیں ہوا۔ کیا تمہیں پہلی کامیاب امیدوار بننے کا شوق نہیں؟''

''ہاں! چاہتی تو ہوں''۔

''پروفیسر صاحب سے ملاقات اسی مقصد کے لیے ہے''۔

''بڑے چالاک ہو۔ تم مجھے زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کر رہے ہو۔ میں نہیں جاؤں گی''، وہ اٹھلاتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں تمہیں آج جانے کو نہیں کہہ رہا''۔

''پھر ٹھیک ہے''۔

کمال نے اپنا یونیفارم پہننا شروع کیا تو مینا پوچھے بغیر نہ رہ سکی، ''کیا تم آج بھی دفتر جاؤ گے؟''

''کیا ہو سکتا ہے؟ تمہاری یونیورسٹی کی طرح یہاں کوئی چھٹیاں نہیں''۔

''اگر چھٹیاں ہوتیں تو کیا تم ان سے لطف اندوز ہوتے؟''

''جو چیز موجود ہی نہیں اس کے بارے میں سوچنا لاحاصل ہے''۔

''دفتر سے واپسی کب ہوگی؟''

''جتنی جلدی ممکن ہوا، آجاؤں گا''۔

''یاد رکھو گے نا؟''

''میں کیسے بھول سکتا ہوں''، اور پھر وہ دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔

....

اتوار کی صبح، کمال کا موسیقی کے سبق کا وقت۔ اس نے بنکا پور میں اس کی ابتدا کی تھی اور ہری پور میں اسے جاری رکھا۔ باکل پور میں اس نے ایک اتالیق کا بندوبست کیا تھا لیکن سیکھنے سے قبل ہی اس کی تبدیلی ہوگئی۔ بعد میں وہ مختلف اساتذہ سے سبق حاصل کرتا رہا۔ یہاں بیکنٹھ پور میں اسے ایک خاتون معلمہ، روپا منجری مجمدر، مل گئی۔ اس کے ذوق کی خبر پا کر نہرو کپ کے منتظمین نے تقریب کے اختتام پر کمال سے گیت گانے پر اصرار کیا۔ کسی تقریب میں نغمہ سرائی اس کے لیے پہلا موقع تھا۔ روپا

بیک وقت خوش بھی تھی اور ناخوش بھی، خوش اس لیے کہ کمال کو تقریب میں گانے کا موقع ملا، اور ناخوش اس لیے کہ اس کی توقع کے مطابق نہیں تھا۔ وہ سخت مزاج خاتون تھی اور پروا کیے بغیر کہ اس کے شاگرد کون ہیں، ان سے مکمل تیاری کی امید رکھتی تھی۔ آج کل وہ کمال کو راگ کیدار پر توجہ دینے پر زور دے رہی تھی مگر وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے زیادہ وقت نہ دے پاسکتا تھا۔ اوپر سے بینا بھی آگئی تھی اور یوں اس پر ذہنی دباؤ بھی زیادہ ہو گیا۔

آج کے سبق کے لیے وہ بینا کو ساتھ لے کر روپا کے ہاں پہنچا۔ کمال نے دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ گٹار بجالیتی ہے۔ بینا نے فوراً جواب دیا، ''نہیں، نہیں، میں نے تھوڑا عرصہ ہی گٹار بجایا تھا پھر کافی دیر سے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا''۔ روپا نے ستائش کرتے ہوئے کہا، ''ظاہر ہے تعلیم کی وجہ سے وقت نہیں ملا ہوگا۔ کوئی بات نہیں۔ تم باہمت خاتون ہو''۔

پھر روپا طبلے پر بیٹھ گئی اور کمال کو شروع کرنے کا اشارہ کیا مگر وہ تیار نہیں تھا۔ بینا مسکرانے لگی۔ کمال نے الاپ اٹھایا اور گیت شروع کر دیا۔ اگرچہ وہ ابھی خام تھا تاہم روپا نے سرزنش نہ کی، بس اتنا کہا، ''ایسے نہیں، تمہیں لے کو ذرا بڑھانا ہوگا''۔ کمال نے یقین دلایا کہ اگلے سبق تک وہ بہتر کرلے گا۔ اس نے چند باتیں بتانے کے بعد انہیں اذنِ رخصت دے دیا۔

....

کمال اپنے دفتر چلا گیا جہاں Intelligence Bureau کا انسپکٹر سلیل سین اس کا منتظر تھا۔ اس نے بتایا کہ اطلاعات کے مطابق لبریشن فرنٹ نے بدھیا میں میٹنگ کرنی ہے، اور پھر کمال کو چند اشتہارات دیئے جن کے مطابق لبریشن فرنٹ کی مقامی کمیٹی نے تین بجے بدھیا پرائمری اسکول میں میٹنگ بلائی ہے۔

اگرچہ بدھیا بیکنتھ پور سب ڈویژن میں تھا مگر وہاں کی اکثریت گورکھا لوگوں پر مشتمل تھی۔ پہاڑی علاقوں میں اپنی کارروائیوں سے حوصلہ پاکر انہوں نے فرنٹ کی یہاں بھی ایک شاخ کھول رکھی تھی۔ ان کی اب تک کی کارروائیاں خفیہ تھیں مگر کھلم کھلا میٹنگ کرنے کا آج پہلا موقع تھا۔ غالباً وہ اس لیے بھی پراعتماد ہو گئے تھے کہ وزیرِ داخلہ نے بدھن سوبا کے ساتھ نہ صرف ملاقات کی تھی بلکہ سرکاری طور پر اسے بھاگوڑی بھی لے جایا گیا تھا۔ کمال سوچنے لگا کہ اس کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ کیا صرف سادہ کپڑوں میں پولیس کو وہاں تعینات کر کے میٹنگ کی کارروائی حاصل کی جائے؟ تاہم اس نے ایس پی کے ساتھ مشورت کرنا بھی مناسب سمجھا۔ اس نے کمال کو CRPF (Central Reserve Police Force) کی پلاٹون لے کر وہاں پہنچنے، تمام شرکا کو گرفتار کرنے اور اسلحہ وغیرہ کی ضبطی کا حکم دیا۔

وہ فوراً گھر واپس آیا اور بینا کو بتایا کہ اسے بلا تاخیر ایک اہم کام کے لیے جانا ہے۔

''کیا میرے آنے سے تمہارا کام بڑھ جاتا ہے؟''

''نہیں ایسا تو نہیں''۔

''پھر اتوار کے روز کیوں جا رہے ہو؟''

''لبریشن فرنٹ کی بدھیا میں ایک میٹنگ ہو رہی ہے، انہیں گرفتار کرنا ہے''۔

''تمہارے علاوہ اور بھی تو کئی افسر ہیں''۔

''نہیں بینا! مجھے خود جانا چاہیے کیونکہ معاملہ انتہائی اہم ہے۔ میں جلدی واپس آجاؤں گا''۔

''ہاں، آ تو جاؤ گے مگر رات ہونے پر''۔

''میں کوشش کروں گا''، اور وہ فوراً روانہ ہو گیا۔

اتیلل باڑی پہنچ کر اس نے ابتدائی کاموں کا جائزہ لینے کے لیے سادہ لباس میں ایک ٹیم آگے بھیجی، جس نے واپس آ کر تفصیلی رپورٹ دی۔ اس نے انچارج افسر مسٹر اچر جی کو کہا کہ دو تین ایسے لوگ بلائے جنہیں علاقے کا خوب پتہ ہو لیکن اس نے یہ بتا کر مسئلہ حل کر دیا کہ اسے علاقے کے چپے چپے کا علم ہے۔ اتنے میں CRPF کا دستہ بھی پہنچ گیا۔ اسے تین ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے مختلف جگہوں سے آگے بڑھنے کی ہدایات دیں۔ اسکول تک پہنچتے پہنچتے میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ اس وقت ایک مقرر پر جوش انداز میں تقریر کر رہا تھا، ''ہمیں ہل کونسل کی ضرورت نہیں، مقامی حکومت کی ضرورت نہیں، ہمارا مطالبہ گورکھالینڈ ہے، ہم۔۔۔۔'' اور اچانک دھاوے سے پولیس نے تمام شرکا کو گرفتار کر لیا۔ کچھ اسلحہ بھی ہاتھ آیا۔ کاغذی کارروائی کے بعد ان سب کو تھانے روانہ کر دیا گیا۔ راستے میں مقرر نے اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام جی۔ ٹی۔ لاما اور مقامی پرائمری اسکول میں استاد تھا۔ اس نے بڑی شائستگی سے پوچھا، ''سر! آپ نے ہمیں گرفتار کیوں کیا ہے؟ ہماری میٹنگ پُر امن تھی، اور یہ حق ہمیں آئین نے دیا ہے''۔

کمال نے قدرے سٹپٹاتے ہوئے جواب دیا، ''آئین آپ لوگوں کو پُر امن اجلاس کی اجازت تو دیتا ہے لیکن یہاں تو آپ کے پاس اسلحہ وغیرہ بھی تھا''۔

''سر! اسلحہ لے کر لوگ کلکتہ میں بھی اجلاس کرتے ہیں۔ آپ نے ان کو تو کبھی گرفتار نہیں کیا''۔

اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور جب کسی بات کا جواب نہ ہو تو بہرہ پن کا اظہار ہی مناسب ہوتا ہے۔ اس شخص نے پھر کہا، ''ابھی چند روز پہلے کیمونسٹ پارٹی (مارکسزم) نے بیکنٹھ پور میں میٹنگ کی تھی، اسلحہ ان کے پاس بھی تھا، انہیں تو گرفتار نہیں کیا گیا''۔ کمال کے ذہن میں فوراً ایک نکتہ آیا، ''انہوں نے اجازت لی تھی، کیا تم لوگوں نے اجازت لی؟ تم ایک اسکول ٹیچر ہو، اسکول سرکاری ہے، سرکاری عمارت میں بلا اجازت تم لوگوں نے میٹنگ کیسے کی؟'' اس شخص کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، لہٰذا چپ رہا۔

گھر پہنچ کر کمال نے مسٹر چند کو ساری کارروائی کی تفصیل بتائی۔ اس نے پوچھا کہ ان لوگوں سے کس قسم کا اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ جب اس کو بتایا گیا تو ایس پی نے کہا کہ اسلحہ کی تعداد میں اضافہ کر دو اور یہ بھی لکھو کہ ان سے تیس بم اور سات بندوقیں بھی ملی ہیں۔

''لیکن سر! ایسی کوئی چیز نہیں تھی''۔

''مجھے بھی علم ہے مگر جب رپورٹ لکھو تو ان چیزوں کا ذکر ہونا چاہیے''۔

''جب رپورٹ میں ان چیزوں کا ذکر ہوگا تو یہ چیزیں ہمیں عدالت میں پیش کرنی ہوں گی''۔

''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آفیسر انچارج کو سمجھا دوں گا۔ تم صرف اخباری نمائندوں کو صورتِ حال سے آگاہ کرو۔ ٹھیک ہے؟''

''سر! میں۔۔۔۔''

''اچھا، تم رہنے دو۔ اخباری نمائندوں سے میں خود بات کرلوں گا لیکن تمہیں ان کی موجودگی میں محتاط رہنا ہوگا''۔

مسٹر چند نے فون منقطع کر دیا۔ کمال سوچنے لگا کہ اس غلط بیانی کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ صورت حال سنگین تھی؟ حکام بالا تک حقیقتِ حال کی بجائے خود ساختہ کہانی بھیجی جائے گی؟ کیا حکام کی منشا بھی یہی ہے؟ اور اگر ان کے اشارے پر یہ رپورٹ بنائی ہے تو وہ کیوں ایسی غیر اخلاقی ہدایات پر عمل کرے؟

کمال اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اخباری نمائندے آ گئے۔ نارتھ بنگال کرانیکل کے نمائندے نے کہا، ''سنا ہے کہ

بدھیا میں چھاپہ مارا گیا ہے۔ کتنے لوگ گرفتار ہوئے؟'' فوراً ہی ایک اور نمائندہ بول اٹھا، ''ہمیں اسلحہ کی تفصیل بھی بتائیں جوان لوگوں سے برآمد ہوا ہے''۔ کمال نے انہیں بتایا کہ ایس پی صاحب خود ہی آپ لوگوں کو تفصیل سے آگاہ کریں گے۔ ایک نمائندے نے کہا کہ انہوں نے بتادیا ہے، ہم آپ سے سننا چاہتے ہیں۔ کمال نے جواب دیا کہ پولیس سروس میں سینئر افسر کو اپنے جونیئر افسروں کے بیان پر رائے زنی کا حق حاصل ہے مگر جونیئر افسر کسی سینئر افسر کے بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کرتا۔ اگلا سوال کیا گیا، ''مگر چھاپہ تو آپ کی نگرانی میں تھا''۔ کمال نے جواب دیا کہ ایس پی صاحب کے پاس اس کی رپورٹ ہے اس لیے وہ بذاتِ خود اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

ایک نمائندے نے کہا، ''چلیں، آف دی ریکارڈ بتادیں''۔

کمال نے درخواست کی، ''جب ایس پی صاحب آپ کو تفصیل بتا چکے ہیں تو میرے پاس کہنے کو اور کچھ نہیں۔ پلیز! مجھ سے اور کوئی سوال نہ کریں''۔

تمام نمائندے مایوس اور قدرے برہم ہو کر اٹھ گئے۔ آل انڈیا ریڈیو کے مناب رائے بیٹھے رہے۔ سب کے باہر جانے کے بعد اس نے شائستگی سے پوچھا، ''کیا ہوا ہے؟ آپ نے اخباری نمائندوں کے ساتھ ایسے روکھے پھیکے انداز میں کبھی بات نہیں کی تھی''۔

''میں کیا کرتا، اور کوئی چارہ کار نہیں تھا''۔

''خبر نہ سہی لیکن مجھے بتادیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کسی کو علم تک نہ ہوگا''۔

''یہ درست ہے کہ وہ لوگ میٹنگ کر رہے تھے۔ اور بلاشبہ وہ گورکھالینڈ کے مطالبے کی بات بھی کر رہے تھے مگر انہوں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس کی بنا پر انہیں گرفتار کیا جاتا، پھر بھی وہ حراست میں لے لیے گئے''۔

''کتنے لوگ پکڑے گئے؟''

''پچیس۔ اسلحہ میں صرف چار نیزے، پندرہ تیر اور بیس بھالے برآمد ہوئے۔ مسٹر چند نے مجھے ہدایات دیں کہ اسلحہ کی تعداد میں اضافے کے علاوہ بموں اور بندوقوں کو بھی شامل کیا جائے''۔

مسٹر رائے کچھ دیر تو خاموش رہے پھر بولے، ''بہت سی خبریں اسی طرح بنتی ہوں گی''۔

''پتہ نہیں''۔

''آپ کیا کریں گے؟ آپ نے ان کے ساتھ کام کرنا ہے، اس لیے کسی نہ کسی حد تک تو ان کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ہی ہوگا''، یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''، کمال نے پوچھا۔

''کیا کروں؟ میں تو آپ کی دلجوئی بھی نہیں کرسکتا۔ بہتر ہے کہ اپنے اصولوں پر قائم رہیں''، اور رائے صاحب باہر چلے گئے۔ کمال بھی گھر کو روانہ ہوگیا۔

....

شام ہو چکی تھی۔ دور افق پر چودھویں کا چاند نظر آرہا تھا۔ ہولے ہولے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یاسمین اور مہندی کی بھینی بھینی خوشبو سے ہوا معطر تھی۔ بینا چھت پر چہل قدمی کرتے ہوئے گنگناتی نظر آئی، ''میرے محبوب! آؤ ہم میٹھی چاندنی میں بھیگتے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کریں''۔ کمال نے گنگناہٹ سنی تو بغیر یونیفارم تبدیل کیے اس کے پہلو میں جا کر بولا، ''ذرا اونچی آواز میں، پلیز''۔

لیکن گیت سنانے کی بجائے اس نے طنزیہ انداز میں کہا،'' آخر کار اخباری نمائندوں نے تمہیں گھر آنے کی اجازت دے ہی دی۔اب بتاؤ میری واپسی ٹکٹ کا کیا ہوا؟ ڈاکٹر چکرورتی نے بتایا ہے کہ وہ پہلے ہی اشتہار دے چکے ہیں،اس لیے مجھے اب جانا چاہیے''۔

''بتاؤ، کب جانا چاہتی ہو۔ میں ہوائی جہاز پر بکنگ کرا دیتا ہوں۔اگر چہ ہوائی ٹکٹ میری بساط سے باہر ہے لیکن بحیثیت سرکاری ملازم میں نے کئی بار ہوائی جہاز کا سفر کیا ہے۔میری خواہش ہے کہ تم بھی تجربہ کرلو''۔

''کیا میں اکیلی جاؤں گی؟''۔

''نہیں، چاہو تو میں تمہارے ساتھ چلا جاؤں گا۔ڈی۔جی نے مجھے جلد بلایا ہے،شاید وہ لبریشن فرنٹ کے معاملہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہے۔اگر تم چاہو تو میں دو دن کی چھٹی لے کر تمہارے ساتھ چلا جاؤں گا''۔

''یہ تو بہت اچھا ہے۔مگر پیسے کہاں سے آئیں گے؟''

''میں بندوبست کرلوں گا۔تم نے ایم۔ایس سی کیا ہے اس لیے میری طرف سے چھوٹا سا انعام ہی سہی''۔

''شاندار۔مگر تم بجھے بجھے سے کیوں ہو؟''

اس نے اپنے ذہن میں برپا کشمکش کا مختصراً ساذکر کیا۔ مینا نے معترض ہوتے ہوئے کہا،'' مجھے تمہارے دفتری کاموں کی سمجھ نہیں، نہ ہی سمجھنا چاہتی ہوں''۔

کمال نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔یہ اس کی مشکل تھی کہ مینا کے ساتھ اپنے جذبات اور خیالات بانٹ نہیں سکتا تھا۔اس کے تمام تفکرات اور مسائل کو وہ ہمیشہ غور سے سنتا،اس کا ذہنی بوجھ ہلکا کرتا مگر اس نے کبھی بھی کمال کے مسائل اور سوچوں میں دلچسپی نہیں لی تھی۔وہ دلبرداشتہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

....

شادی کے بعد کمال کی خواہش تھی کہ مینا اس کے گاؤں جائے۔ تین برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے دونوں کا اکٹھے جانا نہ ہوسکا تھا۔اپنی تعلیم مکمل کرنے کی خاطر مینا والدین کے پاس مقیم تھی،اور جب کبھی اسے وقت ملتا وہ کمال کے پاس آجاتی۔اس کے خاندان کے تقریباً سارے افراد آکر نئی نویلی دلہن سے مل چکے تھے لیکن باقی رشتہ دار اور گاؤں کے لوگ کمال سے ہمیشہ بیوی کو نہ لانے کا گلہ کرتے رہتے۔گھر والوں کی بھی خواہش تھی کہ مینا چند روز ان کے پاس قیام کرے۔ یہ ان کی عزت کا سوال تھا۔وہ بڑی بہو ہونے کے علاوہ علاقے بھر کے لیے قابلِ احترام ہستی تھی۔کمال ان باتوں کو سمجھتا تھا۔ اس نے مینا سے کئی بار اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن مجبور نہیں کیا۔اس بار بھی اگر چہ اس نے مینا کو زور نہیں دیا تاہم وہ سسرال جانے کو تیار ہوگئی۔

کمال نے دو دن کی چھٹی لی۔ دو سرکاری چھٹیاں ملانے سے اسے چار دن مل گئے۔ 186 کلومیٹر کا فاصلہ گاڑی کے ذریعہ تقریباً سات گھنٹوں میں طے ہوتا تھا۔ادھر گاؤں کے لوگ بے تابی سے ان کی آمد کے منتظر تھے۔ایک سیدھے سادے دیہاتی نے اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا کہ ساڑھے چھ دس بجے والی گاڑی کس وقت پہنچے گی۔اس نے برا منایا کہ شاید اس شخص نے اس کا مذاق اڑایا ہے لیکن فوراً احساس ہوا کہ یہ مذاق نہیں، سادگی ہے، لہٰذا اسے بتایا کہ گاڑی ساڑھے نو بجے پہنچے گی۔کمال کو ایسے چند ایک مزید واقعات یاد آئے تو وہ مسکرانے لگا۔ مینا نے مسکرانے کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ ریل گاڑی سے متعلق کچھ واقعات یاد آگئے تھے۔ایک واقعہ کچھ ایسا ہی تھا۔ایک دیہاتی عورت ریلوے لائن پر چل رہی تھی۔دور سے آتی گاڑی کے گارڈ نے اسے دیکھ کر گاڑی روک لی اور عورت کو کہا،''میں نے گاڑی روک دی ہے، آکر بیٹھ جاؤ''۔اس نے سادگی سے

جواب نہیں، ''بیٹا! آج نہیں، میں بڑی جلدی میں ہوں، پھر کسی روز بیٹھوں گی''۔

گاڑی وقتِ مقررہ سے قدرے تاخیر سے پہنچی۔ وہاں سے وہ بس میں سوار ہوئے مگر بھیڑ کی وجہ سے مینا پریشان ہونے لگی۔ آگے جا کر انہوں نے رکشہ لیا لیکن وہ بھی ایک مقام پر پہنچ کر رک گیا کیونکہ اب دلدلی علاقہ شروع ہو گیا تھا، جہاں سے سوائے بیل گاڑی سفر کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اگرچہ اس کے بھائیوں نے کہا بھی تھا کہ وہ چھکڑے کا بندوبست کر دیں گے مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ وہ اس گمان میں تھا کہ چونکہ اس نے متعدد بار پیدل ہی یہ راستہ طے کیا تھا اس لیے اب مینا کے ساتھ چلتے، باتیں کرتے گاؤں پہنچ جائیں گے، مگر بے سود۔

شاید کل ہی بارش ہوئی تھی۔ سارا راستہ دلدلی اور پھسلوان تھا۔ بیل گاڑیوں کی وجہ سے اور زیادہ خراب ہونے سے چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے جوتے اتار دیئے۔ مینا اتنی بدتمیزی سے بات کر رہی تھی کہ کمال کو گاؤں آنے کے فیصلہ پر پشیمانی ہونے لگی۔ گھر پہنچ کر تو اس کا لہجہ مزید گستاخانہ ہو گیا۔ باتھ روم کمرے سے قدرے دور اور اس کے معیار کا نہ تھا۔ اسے کمرے میں بھی نمی محسوس ہوتی تھی۔ بستر کی چادریں سلوٹوں سے بھری تھیں۔ گھر بار کی ہر چیز سے اسے کراہت آنے لگی۔ ہمسایہ عورتیں اسے دیکھنے آئیں تو وہ جز بز ہو کر بولی، ''کیا میں کوئی جنگلی جانور ہوں جسے دیکھنے یہ عورتیں آ رہی ہیں؟ کتنا بُرا لگتا ہے!''۔

کمال اس کے جذبات سمجھ سکتا تھا، ساتھ ہی وہ ہمسایوں کے خیالات بھی سمجھتا تھا۔ وہ سب لوگ اس سے محبت کرتے تھے، اس لیے عورتیں اس کی بیوی کو دیکھنے آتی تھیں۔ اگر مینا اس بات کو اچھی طرح جان جاتی تو بہت بہتر رہتا۔ ادھر آنے والی عورتیں بھی مینا کے خیالات سے ناواقف تھیں، اس لیے وہ اس کی بیزاری اور پریشانی سے محظوظ ہونے لگیں، جس پر وہ اور زیادہ جھنجھلانے لگی۔ کمال ان عورتوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ مینا چونکہ سفر سے تھک گئی ہے اس لیے وہ کل آ جائیں۔ یہ سن کر کچھ اپنے گھروں کو چلی گئیں، چند ایک نے آپس میں کانا پھوسی شروع کر دی۔ مینا نے گھر میں عورتوں اور مردوں کی آمد کو بالکل پسند نہ کیا۔

رات کو ساس نے کھانے کے لیے بلایا۔ مینا ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کی عادی تھی، اسے ان کا گندا باورچی خانہ اچھا نہ لگا، چنانچہ اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ کمال کو بڑا ناگوار گزرا۔ ماں نے اسے سمجھانا چاہا، ''دیکھو! وہ ایک ڈاکٹر کی بیٹی ہے، آہستہ آہستہ اپنے آپ کو اس ماحول میں ڈھال لے گی''، مگر کمال سوچنے لگا، کاش مینا تھوڑی سی دانشمند اور بامروت ہوتی۔ بوجھل دل سے بستر پر جا لیٹا، مینا تو سو گئی لیکن کمال کو نیند نہ آئی۔

اگلی صبح کمال نے جا کر واش روم دیکھا، صفائی کی، مینا کے سلیپر اپنی جگہ پر رکھے، پانی ٹیوب ویل سے لانا پڑتا تھا اس لیے کسی کو کہے بغیر خود ہی بالٹیاں بھر کر رکھ دیں۔ پھر ہاتھ منہ دھو کر کمرے میں آ گیا۔ مینا کے اٹھنے کے بعد کمال اس کے لیے پانی لایا، دانت صاف کرنے اور ہاتھ منہ دھونے کے بعد اس کی خوشدامن چائے لائی مگر اس نے پینے سے انکار کر دیا۔ شادی سے پہلے وہ چائے یا کافی پیتی تھی مگر اب کمال کی عادت یا اس کے احترام میں اس نے بھی چھوڑ دیا تھا۔ کمال نے ایک بار پھر غسل خانے جا کر چیزوں کو دیکھا اور مینا کو بتایا کہ وہ ذرا باہر جا رہا ہے، وہ جا کر غسل وغیرہ سے فارغ ہو جائے۔

کمال باہر جا کر دلدلی حصے کی کنارے کنارے ٹہلنے لگا۔ پرندے اور بطخیں پانی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کونجیں، بگلے اور دیگر پرندے پانی میں اپنا اپنا شکار ڈھونڈ رہے تھے۔ اوپر فضا میں چیل محوِ پرواز تھی، ماہی خور طیور اڑتے اڑتے پانی میں غوطہ لگا کر مچھلیاں پکڑ رہے تھے، ایک فاختہ آم کے درخت پر بیٹھی گوگو کر رہی تھی اور ایک طرف کبوتر تار پر بیٹھے تھے۔ ہر چیز پہلے جیسی تھی، صرف اس کی اپنی سوچ اور جذبات ویسے نہیں رہے۔ وہ گھر واپس آیا تو مینا بھی غسل سے فارغ ہو چکی تھی۔

ماں نے بریڈ، مکھن اور شیرینی تیار رکھی تھی۔ یہ چیزیں بلاشبہ مینا کے لیے تھیں کیونکہ گاؤں میں یہ چیزیں کھانے کا رواج نہیں تھا۔ کمال کو یقین تھا کہ رات کے دل شکن تجربے کے بعد ماں نے یہ سب کچھ تیار کیا ہوگا۔ ناشتہ کے بعد اس کا دوست

ثنا آ گیا۔ یہ ان تین دوستوں میں سے ایک تھا جس نے شادی کے رجسٹریشن فارم پر دستخط کیے تھے۔ مریم نے اسے بھی ناشتہ دیا۔ ثنا نے انہیں اپنے گھر مدعو کیا۔ مینا تو بہت خوش ہوئی مگر کمال جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بہانہ بنایا، ''مجھے 'اخبارِ روزگار' خریدنے براہی جانا ہے کیونکہ اس میں شاید مینا کے NET میں داخلے کا نتیجہ چھپا ہو''۔

''تم واپسی پر بھی لے سکتے ہو،'' ثنا نے مشورہ دیا۔

''نہیں، واپسی پر ممکن نہیں ہوگا''۔

ثنا نے مریم سے بات کی۔ اس نے کہا اگر مینا جانا چاہتی ہے تو لے جاؤ۔ اجازت ملنے کے بعد مینا ثنا کے ساتھ چلی گئی۔ کمال کو اچھا نہیں لگا لیکن وہ مینا کو منع بھی نہ کر سکا۔ اسے اس کا چلے جانا بالکل نہ بھایا۔ اس کا چھوٹا بھائی براہی گیا ہوا تھا۔ واپس آ کر اس نے کمال سے پوچھا کہ مینا کو ثنا کے ساتھ کیوں جانے دیا ہے کیونکہ وہ موٹر سائیکل پر ثنا کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی۔ کمال خاموش رہا لیکن مزاج میں برہمی آ گئی۔

گاؤں اور دور سے آنے والے رشتہ دار مینا کو ملنے آئے مگر وہ گھر پر تھی ہی نہیں۔ کمال پچھتا رہا تھا کہ اسے گاؤں آنے کو کیوں تیار کیا۔ وہ براہی چلا گیا مگر 'اخبارِ روزگار' نہ ملا جس پر مزید کبیدہ خاطری ہوئی۔ وہاں سے وہ مینا کو واپس گھر لانے سیدھا ثنا کے ہاں گیا تو اسے بڑے خوشگوار مزاج میں ثنا سے باتیں کرتے دیکھا۔ اس کا گھر کمال کے گھر سے بہتر بھی تھا اور اوپر سے ہمسائے وغیرہ بھی موجود نہیں تھے۔ کمال کو دیکھ کر ثنا خوش ہو گیا۔ اس نے انہیں شب گزاری کی دعوت دی لیکن کمال نے اس عذر پر انکار کر دیا کہ بہت سے رشتہ دار انہیں ملنے کی غرض سے آ رہے ہیں اس لیے ان کا رات گزارنا مناسب نہیں۔ اس میں غلط بیانی نہیں تھی مگر یہاں رکنے کی یہ واحد وجہ بھی نہیں تھی۔ مینا واپس جانے میں پس و پیش کرنے لگی لہٰذا کمال دل برداشتگی میں اکیلا ہی واپس چلا گیا۔

گھر میں سب نے مینا کے بارے میں پوچھا۔ ماں کو اس نے جواب دیا کہ تمہاری اجازت سے وہ گئی تھی۔ مریم نے کہا، ''بیٹے! وہ خود ہی جانا چاہتی تھی، میں اسے کیسے روکتی''۔

اگلے دن بھی مینا واپس نہ لوٹی۔ شام کو کمال اپنے ایک دوست رام کرشن کے ہاں گیا۔ انہوں نے بنگلہ دیش چھوڑ کر ہندوستان میں آ کر ٹائلوں کی فیکٹری لگائی تھی۔ رام کرشن بڑا محنتی اور مخلص لڑکا تھا۔ جلد ہی وہ دونوں دوست بن گئے۔ ملازمت اختیار کرنے سے پہلے بھی کمال اکثر اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ بعد میں وہ جب بھی اپنے گاؤں آتا، رام سے ملاقات ضرور کرتا، اور بعض اوقات وہیں شب بسری بھی کر لیتا۔ کمال کو اپنے گھر دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا، ''پرانتی تمہاری بیوی سے ملنے جانا چاہتی تھی۔ اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔ ہم اکٹھے ہی تمہارے گھر چلیں گے''۔

کمال نے جواب دینے کی بجائے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ ان کی چھوٹی بیٹی مدھو ماتا بھاگتی ہوئی آئی۔ یہ نام کمال ہی کا تجویز کردہ تھا۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ رام کرشن اور پرانتی کمال کے ساتھ اس کے گھر جانا چاہتے تھے مگر اس نے کوئی خاص خوش دلی کا اظہار نہ کیا۔ مینا کے ذکر پر بھی وہ آئیں بائیں کرتا رہا۔ رام کو غالباً کچھ اندازہ ہو گیا، اسی لیے اس نے پرانتی کو کہا کہ وہ کمال سے باتیں کرے، اور جلدی واپس آنے کا کہہ کر باہر چلا گیا۔ کوئی ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد کمال نے پرانتی سے استفسار کیا، ''کیا ہوا تمہارے پریمی کا؟ جلدی آنے کا کہہ کر وہ ابھی تک واپس نہیں لوٹا''۔

''تمہارا دوست ہے، تمہیں بہتر علم ہوگا''۔

''ٹھیک ہے وہ میرا دوست ہے مگر تمہارا تو پتی ہے۔ کس کو زیادہ پتہ ہونا چاہیے؟''

''مجھے کیا علم؟۔۔۔۔۔''

لیکن پرانتی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رام کرشن مینا کے ساتھ گھر آ گیا۔ کمال کو دھچکا سا لگا۔ کرشن نے کہا، ''تم یہاں آ گئے ہو، یہ اکیلی اکتا رہی تھی۔ تمہیں لینے آئی ہے''۔

واپسی پر مینا نے کمال سے پوچھا، ''کیا مجھ سے ناراض ہو؟''

''مجھے کیا پڑی ہے ناراض ہونے کی؟''

''واپس آتے ہوئے تمہارا دوست مجھے فوٹو گرافر کی دکان پر لے گیا اور میرے ساتھ ایک تصویر بنوائی ہے۔ میں انکار نہ کر سکی''۔

کمال کو بات بُری لگی۔ مینا بتا رہی تھی، ''ہم دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص، غالباً جمشید نام کا، تمہارے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے علم ہوا کہ تم میرے ساتھ جھوٹ بولتے رہے ہو''۔

''کیا مطلب؟''

''تم نے کہا تھا کہ سگریٹ نوشی نہیں کرتے''۔

اس بات پر وہ سخت برافروختہ ہو گیا۔ 'کس نے کہا ہے کہ میں سگریٹ نوشی کرتا ہوں؟''

''اس نے تمہیں دیکھا ہوا ہے''۔

''ناممکن''۔

''کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تمہیں بڑی اچھی طرح جانتا ہے۔ کیا تم اسے جانتے نہیں؟''

''میں اسے جانتا تو ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا اس نے کیوں ایسی باتیں بنائی ہیں؟''

''وہ بتا رہا تھا کہ کالج کے دنوں میں ایک بار ایک لڑکی تمہارے ساتھ ہی بس سے اتری تھی، تمہارے ہاتھ میں سگریٹ تھا جو تم نے جمشید کو دیکھ کر پھینک دیا۔ کون تھی وہ لڑکی؟''

''اس نے بات بنائی ہے''۔

''لڑکی کی بات بنانے کی اسے کیا ضرورت تھی؟''

''رنگ بھرنے کے لیے''، پھر کمال نے مینا سے پوچھا، ''کیا تمہیں میری سگریٹ نوشی کی بات پر یقین ہے؟''

''پھر اس نے تم پر ایسا الزام کیوں لگایا ہے''۔

''بس ٹھیک ہے، اس کی بات پر یقین کرو''۔

''وہ لڑکی کون تھی؟''

''اسی سے پوچھو''۔

ایسی ہی باتیں کرتے وہ گھر پہنچ گئے۔ ماں نے رات کے کھانے پر بلایا۔ اس نے مزیدار کیک بنایا تھا مگر مینا نے کھانے سے انکار کر دیا۔ ''تمہارے لیے بنایا ہے اور تم انکار کر رہی ہو''، کمال نے شکایتاً کہا۔

''اس کے اوپر مرغیاں پھرتی رہی ہیں اور تم مجھے کھانے کو کہہ رہے ہو''۔

کمال چپ کر گیا۔ ماں بھی خاموشی سے چلی گئی۔ ان پر رات بڑی بھاری گزری۔ صبح کمال اسے لے کر واپس آ گیا۔ راستے میں اس نے ''اخبارِ روزگار' خریدنا چاہا مگر مینا نے کہا کہ ہمارے گھر کے پاس مل جاتا ہے، میں وہیں سے لے لوں گی۔

دوپہر کے وقت وہ بالکل پور پہنچ گئے۔ کئی جگہوں سے اخبار کی ناکام تلاش کے بعد بالآخر ایک شخص کے پاس مل گیا۔ کمال نے اس کی نقل کروائی اور گھر واپس آ گئے۔ یہاں مینا کو فارم دیتے ہوئے اس نے مشورہ دیا کہ پہلے سادہ کاغذ پر لکھو،

پھر فارم میں صاف صاف لکھنا۔ بہر حال، کچھ ردوقد کے بعد مینا نے منہ بسورتے ہوئے سادہ کاغذ پر تمام کوائف رقم کیے۔ کمال نے درستگی کے بعد اسے اصل فارم پُر کرنے کو کہا اور خود ڈاک ٹکٹ خریدنے باہر چلا گیا۔

شام کو اس کی خوشدامن نے پوچھا کہ مینا کسی لڑکی کا ذکر کر رہی تھی، کون ہے وہ؟ کمال طیش میں آ کر بولا، ''مینا ہی سے پوچھیں''، اور پھر وہ پروگرام سے ایک روز پہلے ہی باکل پور سے چلا آیا۔

....

دو دن کے بعد کمال کو ایس پی مسٹر چند کا فون آیا، ''میں نے تمہیں سابنگ بھیجا تھا، وہاں سے تم مجھے بتائے بغیر چلے آئے''۔

کمال کو اپنا وہاں بھیجے جانا پہلے ہی پسند نہیں تھا کیونکہ وہاں کسی کو بھی اس کی آمد کی اطلاع نہیں تھی، لہٰذا وہ پھٹ پڑا، ''سر! جب وہاں کوئی کام ہی نہیں تھا تو میرا وقت کیوں ضائع کیا گیا؟ میں نے بار بار آپ سے رابطہ کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔ آپ نے میرے وہاں جانے کا کسی کو نہیں بتایا تھا۔ وہ سب مجھے مہمان سمجھ رہے تھے۔ اس صورتِ حال میں وہاں رہ کر میں کیا کرتا؟''

''میں تمہیں بتادوں گا وہاں کیا کرنا ہے۔ دوبارہ جاؤ''۔

''کس حیثیت میں؟''

''ایڈیشنل ایس پی کی حیثیت سے''۔

''سر! اس صورت میں آپ ایک آرڈر جاری کر دیں''۔

''الگ آرڈر جاری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا میری زبانی ہدایات کافی نہیں؟''

''لیکن سر! سابنگ کے افسروں کو تو علم ہونا چاہیے''۔

''ان کو مطلع کر دیا جائے گا''۔

''سر! اگر انہیں ایک پیغام بھیج دیا جائے تو مناسب ہوگا''۔

''کسی پیغام کی ضرورت نہیں۔ تم جاؤ''۔

اور پھر ایس پی نے لائن منقطع کر دی۔ کمال کو اچھا نہ لگا کہ ایک طرف اسے سابنگ جانے کو کہا گیا ہے اور دوسری طرف وہاں کے افسروں کو بتایا ہی نہیں جا رہا۔ اپنی سرکاری حدود سے باہر جا کر کام کرنے کے لیے کمال کو تحریری حکم نامے کی ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ چند اور اہلکار بھی ہوں گے اور اگر کوئی گڑ بڑ ہو گئی تو اس سے وہاں جانے پر جواب طلبی کی جائے گی۔ جواب سے مطمئن نہ ہونے پر کوئی سینیئر افسر ذمہ داری قبول نہیں کرے گا، سارا الزام اسی پر آئے گا۔ سب کچھ سوچ کر اس نے مسٹر چند کو ایک پیغام لکھا اور اس کی نقول دیگر متعلقہ افراد کو بھیج دیں، ''آپ کے حکم کے مطابق میں بحیثیت ایڈیشنل ایس پی سابنگ روانہ ہو رہا ہوں، اور تا حکمِ ثانی وہیں رہوں گا''۔

....

اگلے دن اس نے اپنے چند اہلکاروں کو تیاری کا کہا اور خود مقامی میڈیکل کالج اسپتال چلا گیا۔ ماں کو سینے میں تکلیف کی وجہ سے دو دن قبل اس کا بھائی یہاں لایا تھا۔ ڈاکٹروں نے چیک اپ کے بعد اسے اسپتال داخل کر لیا۔ اسے بتایا گیا کہ یہاں رہنے کی فیس ادا کرنا ہوگی اور یہ کہ کھانے وغیرہ کا بندوبست خود انہیں ہی کرنا پڑے گا۔ کمال وہاں پہنچا تو وارڈن مسز بانک نے بتایا گیا کہ تین ڈاکٹر اس سے ملاقات کے منتظر ہیں، لیکن اس نے معذرت کی کہ چونکہ اسے فوری طور پر سابنگ روانہ ہونا ہے

اس لیے فی الحال ملاقات مشکل ہے۔ وارڈن نے اتنے میں آواز دی، ''سیوالی، شیلا، شکنتلا، جلدی سے آؤ، مسٹر منڈل آئے ہیں''۔ آواز سن کر تیکس چوبیس برس کی تین لڑکیاں اندر آئیں اور اس طرح کمال کو دیکھنے لگیں جیسے چڑیا گھر میں کسی شیر یا چیتے کو دیکھا جا رہا ہو۔ ان میں سے ایک نے مسز بانک کو ایک طرف لے جا کر کچھ کہا جسے سن کر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ کمال کے پاس آ کر بولی، ''کیا آپ کو پتہ ہے وہ کیا کہہ رہی تھیں؟''

''کیا؟''

''وہ کہہ رہی ہیں کہ دیکھنے میں تو عام سا شخص لگتا ہے''۔

کمال کے ساتھ یہ ایک مسئلہ تھا کہ اخبارات پڑھ کر لوگ اسے بہت ہی عجیب و غریب شخص سمجھنے لگے تھے مگر دیکھنے پر وہ عام سا آدمی نظر آتا۔ لڑکیوں کی بات سن کر وہ ہنس کر کہنے لگا، ''کیا آپ سمجھتی تھیں کہ میرے سر پر دو سینگ اور پشت پر ایک آنکھ ہوگی''۔ پاس کھڑی ایک لیڈی ڈاکٹر نے جواب، ''نہیں ایسا نہیں، ہمارا خیال تھا کوئی لمبا تڑنگا اور درشت رو قسم کا آدمی ہو گا''۔ اس پر سب ہنسنے لگے۔ ایک اور لیڈی ڈاکٹر نے کہا، ''میں نے ایک رسالے میں آپ کی تحریر کردہ کہانی پڑھی ہے۔ آپ لکھتے کس وقت ہیں؟'' کمال کے جواب دینے سے پہلے ہی مسز بانک بول اٹھیں، ''آپ لکھتے بھی ہیں؟ آپ انڈین پولیس سروس میں عہدہ دار ہیں، لکھتے ہیں، گاتے بھی ہیں، یقین نہیں آتا کہ ان سارے کاموں کے لیے آپ کیسے وقت نکال لیتے ہیں''۔ پاس کھڑی ایک اور ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا، ''کیا آپ گاتے بھی ہیں؟ پلیز! ایک گیت سنا دیجیے''۔

''میڈم! میں بے سُرا گائیک ہوں، اور ویسے بھی میں آج جلدی میں ہوں''۔

مسز بانک نے تائید کی، ''ہاں انہیں سابنگ کے لیے روانہ ہونا ہے''۔ باقیوں کے منہ سے 'اوہ' نکلا اور پھر کمال نے روانہ ہونے کی اجازت چاہی۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنے بھائی سے کہا کہ جب ماں اسپتال سے فارغ ہو تو انہیں واپس لے جائے۔ ملازمین کو ان کے لیے کھانا تیار کرنے کا کہہ کر خود دیگر اہلکاروں سمیت سابنگ روانہ ہو گیا۔ بارون اور پسوان کے علاوہ تین کانسٹبل اور ایک ہیڈ کانسٹبل گاڑی میں بیٹھے اور دوسری گاڑی میں ضروری سامان رکھا۔ چونکہ وہ وہاں کے حالات دیکھ چکا تھا اس لیے دونوں ڈرائیوروں کو ساتھ ساتھ رہنے کی ہدایت کی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پہاڑی راستے پر جا پہنچے۔ سڑک کے ایک طرف بلند و بالا پہاڑ اور دوسری طرف بہت گہرائی میں دریا بہہ رہا تھا۔ سڑک کی تنگنائی کی وجہ سے بس یا ٹرک دکھائی نہ دیا، ہاں البتہ فوجی ٹرک چل رہے تھے۔ کبھی کبھار دو چار آدمی بھی نظر آ جاتے۔ کمال بڑے غور سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں کہاں سے ان پر حملہ ہو جائے، کوئی بارودی سرنگ ان کی گاڑی اڑا دے، پہاڑ کے اوپر سے کوئی بھاری پتھر لڑھکتا ہوا ان کی گاڑیوں پر آ گرے، یا پھر قریبی جھاڑیوں سے گولیوں کی بوچھاڑ ان کا استقبال کرے۔ شرپسندوں کا بنیادی ہدف پولیس تھی۔ جنگل کا حسن، دریا کا چاندی جیسا چمکیلا پانی، جنگلی پھول، پھلوں سے لدے درخت، خوش رنگ پرندے اور دیگر جانور کوئی بھی اس کی توجہ میں مخل نہ ہوا۔

ایک موڑ مڑتے ہوئے ڈرائیور نے کمال کی توجہ پہاڑ کے اوپر کھڑے چند افراد کی طرف دلائی۔ سب لوگ گاڑیوں سے باہر آ گئے۔ کمال نے اہلکاروں کو کھڑا رہنے سے منع کیا مبادا اوپر سے چلائی گئی گولی کسی کو لگ جائے۔ وہ خود ان کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لینے لگا۔ مگر وہ حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں لگتے تھے۔ ایک فوجی ٹرک نزدیک سے گزرا۔ وہ لوگ پہاڑ سے کہیں اور غائب ہو گئے۔ کمال نے ڈرائیور کی مستعدی اور توجہ کا شکریہ ادا کیا۔ دوپہر تک وہ سابنگ پہنچ گئے اور سیدھا پولیس اسٹیشن جا کر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ یہاں کا انچارج بدل چکر ورتی قبل ازیں بھاگوڑی میں تعینات تھا اس لئے کمال کو اچھی طرح

جانتا تھا۔اس نے بڑی حیرت سے پوچھا،''سر! آپ یہاں؟''

''ہم چند دن یہاں رہیں گے۔مسٹر چند نے یہاں آنے کو کہا ہے''۔

''سر! مجھے تو اس کی کوئی اطلاع نہیں۔SDPO کو علم ہوگا''۔اس نے سب ڈویژنل پولیس آفیسر کے گھر فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ SDO کے ہاں گیا ہے۔کمال وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ وہ گولف کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔کلب کا پتہ لے کر وہاں پہنچا تو دیکھا کہ CRPF کے جوان سٹین گن اور رائفلیں لیے کھڑے ہیں جبکہ SDPO مسٹر کمت اور SDO مسٹر امیت گولف کھیل رہے ہیں۔کمال کو بالکل اچھا نہ لگا کہ جب پورے سب ڈویژن میں آگ لگی ہو تو دونوں ذمہ دار افسر اُن جوانوں کی حفاظت میں گولف کھیل رہے ہیں جنہیں اس علاقے کی نگرانی اور امن وامان کے لیے بھیجا گیا ہے۔اپنے جذبات دبائے وہ کمت کے پاس گیا مگر اس نے جواب دیا کہ مسٹر چند نے اُس کے دورے کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔مسٹر امیت نے بھی اس کی تصدیق کی۔وہ واپس پولیس اسٹیشن پہنچا۔چکرورتی نے ادھر ادھر کئی جگہ رابطہ کیا، بالآخر مہمانوں کو پی،ڈبلیو،ڈی کے ایک خراب حال ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا جس کے نیچے ایک سینما ہال تھا۔انہوں نے کرسیاں ادھر ادھر کر کے اپنے بستروں کے لیے جگہ بنائی۔چکرورتی کے بات چیت کرنے پر CRPF نے یک مشت ادائیگی کے عوض کھانا دینے پر رضامندی ظاہر کی۔

شام ڈھلتے ہی بموں کے پھٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔پہلا بم سینما ہال کے نزدیک پھٹا۔جتسی مارکیٹ میں ایک کے بعد ایک بم پھٹے تو کمال کو کلکتہ کی دیوالی یاد آگئی۔گارڈ کو ہشیار رہنے کی ہدایت دینے کے بعد خود پولیس اسٹیشن کی راہ لی۔چکرورتی نے بتایا کہ یہ تو ابھی ابتدا ہے، بموں کی آوازیں ساری رات آتی رہتی ہیں، یہاں کوئی انتظامیہ نہیں ہے اور یہ کہ وہ خود بھی انہی خطروں کا سامنا کرتا رہتا ہے۔اس نے مزید انکشاف کیا کہ ان علیحدگی پسندوں کے پولیس والوں سے بھی مراسم ہیں جن سے وہ معلومات حاصل کر کے اپنی کارروائیاں کرتے ہیں۔

''بموں کی تلاش کے لیے آپ لوگ گھر گھر تلاشی کیوں نہیں لیتے ،اس سے بم دھماکوں میں خاتمہ نہیں تو کمی آسکتی ہے''۔

''سر! تلاشی کون لے گا؟ سب کو تو اپنی حفاظت کی پڑی ہے۔جس فورس کو یہاں امن وامان قائم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا وہ اعلیٰ افسروں کی حفاظت پر مامور ہے''۔

''یہاں موجود گارڈ بھی تو چھاپے مار سکتے ہیں''،

''سر! میں تو نہیں کر سکا۔اب آپ آگئے ہیں،کوشش کیجیے''۔

کمال واپس ریسٹ ہاؤس آیا تو گارڈ کو مستعدی سے نگرانی کرتے دیکھا۔دراصل انہیں سمجھ آگئی تھی کہ اب انہیں حقیقی خطرے کا سامنا ہے۔کاہلی اور سستی کا مطلب ہے اپنی جان جانے کا خطرہ۔دوسری جگہوں پر اس کا ادراک نہیں تھا۔کمال نے گارڈ سے دو چار باتیں کیں اور سونے چلا گیا مگر نیند کہاں؟ اس کی اپنی جان بھی خطرے میں تھی۔ایک اچانک حملہ سب کچھ تباہ کر دیتا۔اس کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔لیملنگ میں ایک گولی اس کے قریب سے گزر گئی تھی مگر یہاں ایسا لگتا تھا کہ وہ سرحد پر کھڑا ہے یا کسی مقبوضہ اور دشمن علاقے میں موجود ہے۔کمال کو یہ بھی احساس تھا کہ ان علیحدگی پسندوں کو اس کی ذات یا کسی اور سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں،ان کا نشانہ وردی والے ہیں۔

اگلے روز اسے دو خواتین کے اغوا کی خبر ملی۔ایک کسی گھر میں حفاظت کے لیے تعینات تھی جبکہ دوسری اسکول میں استانی تھی جس نے ہڑتال کے اعلان کے باوجود حاضری دینا افضل سمجھا تھا۔کمال نے سوچا کہ ان کی بازیابی سے لوگوں میں اعتماد کا اضافہ ہوگا،اس لیے کمت کو چھاپے مارنے کا کہا تا کہ لوگوں کو کم از کم پولیس کارروائیوں کا اندازہ تو ہو جائے۔شام کو اسے مطلع کیا گیا کہ SDPO تلاشی کے لیے چند گھروں میں گیا تھا، واپسی پر اس کی گاڑی بری حالت میں نیچے کاٹھ کباڑ پر پڑی ہوئی

ملی۔ گاڑی کو وہاں سے اٹھانے کی کوشش ناکام رہی۔ رات کو اسے نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اگلے دن اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ انتہا پسندوں نے SDPO کی جان لینے کی کوشش کی تھی اور ناکامی پر گاڑی کو آگ لگادی۔

اس سے اگلے روز چند افراد کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ قاتل گرفتار نہ ہو سکے۔ پولیس گشت کا بندوبست کیا گیا مگر اس پر بھی کسی چھت سے گولیاں برسائی گئیں۔ نتیجتاً دو پولیس والے ہلاک ہو گئے۔ جوابی کارروائی میں حملہ آور اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہو گئے۔ دونوں ہلاک شدگان کا تعلق ہریانہ سے تھا۔ پسماندگان کو ان کی ارتھی کے لیے آنے جانے میں وقت درکار تھا، اتنے دنوں لاشوں کو رکھنا بھی مشکل، لہٰذا فیصلہ ہوا کہ یہیں پر ان کا کریا کرم کر دیا جائے۔ سابنگ میں ایک مرگھٹ پر دونوں ارتھیوں کو لے جا کر گارڈ آف آنر دے کر چِتا جلائی گئی اور راکھ کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا گیا۔ دونوں خاندانوں کا کوئی فرد شرکت نہ کر سکا۔ کمال کے جذبات میں ہلچل مچی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسی دنیا ہے؟ کسی دن وہ بھی انہیں حالات میں بیوی، والدین اور رشتہ داروں سے دور دفن ہو جائے گا۔ اسے رہ رہ کر بینا کی بات یاد آ رہی تھی، ''ہم کسی روز ایک دوسرے سے دور ہی مر جائیں گے''۔

بوجھل دل سے وہ کیمپ واپس آ گیا۔

....

اپنے دو ساتھیوں کی ہلاکت پر CRPF کے باقی جوان چراغ پا تھے۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر انہیں مشتبہ گھروں کی تلاشی اور ممنوعہ اشیا قبضہ میں لینے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ کیمپ سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اس پر افسروں کے آپس میں صلاح مشورے شروع ہو گئے۔ کمال کی رائے بھی CRPF کے جوانوں کے ساتھ تھی۔ بالآخر فیصلہ ہوا کہ مناسب منصوبہ بندی کے بعد چھاپے اور تلاشی کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ یہ بات جوانوں کو بھی بتا دی گئی۔ اگلے روز ہی ایک کلرک کے اغوا کی واردات ہوئی کیونکہ اس نے لبریشن فرنٹ میں شمولیت سے انکار کیا تھا۔ خفیہ اطلاع ملی کہ اسی رات ایس، ڈی، او کے دفتر پر حملہ کی تیاری ہو رہی ہے، جس پر فوری کارروائی کرتے ہوئے ایک پلاٹون اترائی کو روانہ ہوئی، دوسری پلاٹون چاک بازار سے اور خود کمال روزی بازار کی سمت سے آگے بڑھا تاکہ پورے علاقے کو گھیرے میں لیا جائے۔ گھروں کی تلاشی لی جانے لگی۔ ہر مشتبہ شخص کو روک کر چھان بین ہوتی۔ اگرچہ گھروں میں بالعموم کوئی مرد موجود نہیں تھا پھر بھی تلاشی کا کام جاری رہا۔

BSF کیمپ کے پاس انہیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلح افراد نے چٹانوں کے عقب میں مورچہ بنایا تھا۔ جیسے ہی چھاپہ مار دستے ایک جگہ رکے، نزدیک ہی بم کا زوردار دھماکہ ہوا۔ اسسٹنٹ کمانڈنٹ نے وائرلیس پر کمال سے رابطہ کر کے بتایا کہ چونکہ شرپسند مسلح ہیں، وہ جوانوں پر حملہ کرنے سے گریز نہیں کریں گے اس لیے ان کے پاس بھی جوابی فائرنگ اور پیچھے ہٹنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں۔ کمال نے سوچا کہ پسپائی بھی محفوظ نہیں کیونکہ وہ لوگ پشت سے بھی حملہ کر سکتے ہیں، اور پھر اس سے ان کے حوصلے مزید بڑھ جائیں گے، یہ سوچ کر اس نے اسسٹنٹ کمانڈنٹ کو آگے بڑھنے اور حالات دیکھ کر فائرنگ کرنے کا حکم دیا۔

پہلی گولی لبریشن فرنٹ کی جانب سے آئی، پھر دونوں جانب سے فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ مسلح افراد کے فرار کی اطلاع بھی ملی۔ دستوں نے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ قریبی ایک مقفل کمرے سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ دروازہ توڑ کر دیکھا تو دونوں مغوی خواتین، کلرک اور چند دیگر افراد بھی رسیوں سے بندھے پائے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ اغوا کنندگان کا سلوک اچھا اور انہیں دونوں وقت کا کھانا ملتا تھا۔ ان کو بحفاظت تھانے تک پہنچانے کے بعد کمال اور باقی لوگ آگے بڑھنے لگے۔ فاصلے پر انہوں نے حملہ آوروں کو ایک جنگل میں غائب ہوتے دیکھا۔ کمال کا خیال تھا کہ وہاں بھی چھاپہ مارنا

چاہیے۔ اچانک اس کی نظر اوپر اٹھی تو ایک چٹان کی اوٹ سے بندوق کی نالی نکلتے دیکھی۔ خوف کی ایک لہر پورے بدن میں دوڑ گئی۔ اس نے سب کو حفاظتی اقدامات کرنے کی ہدایت کی۔

سڑک کے بائیں جانب ایک خشک نالہ تھا۔ وہ اس کے اندر سے رینگ کر چٹان کی دوسری جانب جا پہنچا۔ اس کے پیچھے پیچھے دو جوان بھی آ رہے تھے۔ یہاں سے اس نے بائیس تیئس برس کے ایک لڑکے کو بندوق لیے کھڑے دیکھا۔ کمال اپنی سوچوں اور ارد گرد کا جائزہ لینے میں مستغرق تھا، اب جو پلٹ کر دیکھا تو دونوں جوان غائب۔ وہ خود بندوق کے نشانہ پر تھا۔ اس کی اپنی بندوق اگر چہ جدید تھی لیکن شست باندھنے کے لیے رائفل نالے کی سیدھی اور افقی دیوار سے باہر نکالنی پڑتی اور یوں دیکھے جانے کا بہت امکان تھا۔ اس نے پستول سے فائر کرنے کا فیصلہ کیا، اور پھر نشانہ باندھ کر گولی چلائی۔ لڑکے کے ہاتھ سے بندوق نیچے گر گئی۔ کمال نے نالے سے باہر آ کر دیکھا۔ لڑکا لنگڑا رہا تھا۔ کمال اور اس کے ساتھیوں کی بیک وقت فائرنگ سے وہ نیچے گر گیا۔ انہوں نے پاس جا کر دیکھا تو وہ ہلاک ہو چکا تھا۔ لاش کی تلاشی لینے سے گورکھی (یا نیپالی) زبان میں تحریر کردہ ایک خط کے سوا اور کچھ نہ ملا۔

....

سلاجنا میں قیام کے دوران کمال نے نیپالی زبان میں تھوڑی سی شد بد حاصل کر لی تھی۔ شمالی ہند کے باسیوں کے لیے نیپالی زبان سیکھنا قدرے آسان ہے۔ اس کا رسم الخط ہندی کی طرح دیونگری ہے۔ دونوں زبانوں کی گرائمر میں کافی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ کمال کی مادری زبان بنگالی تھی مگر حیدر آباد میں اس نے کچھ ہندی بھی سیکھ لی تھی، لہٰذا اس کے لیے نیپالی زبان سیکھنا مشکل نہ تھا۔ بیکنتھ پور آنے کے بعد اسے نیپالی اور گورکھی زبانوں میں فرق کا علم ہوا۔ بظاہر دونوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ بھارت اور نیپال کے درمیان ایک معاہدے کی رو سے نیپالیوں کو ہندوستان میں سوائے چند، ہر جگہ ملازمت کرنے کی اجازت ہے۔ عام لوگ بھارتی نیپالی اور نیپالی شہریوں کے درمیان فرق نہیں کر سکتے۔ اس فرق کو واضح کرنے کے لیے گورکھا علیحدگی پسند لیڈر بدھن سوہانے اپنے ساتھیوں کو بتایا تھا کہ وہ نیپالی نہیں بلکہ گورکھے ہیں، اور یہ کہ ان کی زبان گورکھی ہے۔

کمال نے لڑکے کی جیب سے نکلا ہوا خط پڑھنے کی کوشش کی:

ڈیئر پوَن!

تمہارا خط ملا۔ میں سمجھ نہیں پائی مگر چنتا بہت ہے۔ تمہاری مناسب تربیت نہیں ہوئی۔ ذہنی قوت سے دیگر کوتاہیوں کی تلافی نہیں ہوتی۔ کیا تم ایک اچھے تربیت یافتہ شخص کو مات دے سکتے ہو؟ میں تمہاری حوصلہ شکنی نہیں کر رہی لیکن تمہیں ان سب باتوں پر از سرِ نو غور کرنا چاہیے۔

تم سے ملاقات کی تمنا ہے۔ ایک روز ہی کے لیے آ جاؤ۔ تمہاری آمد کی منتظر۔

صرف تمہاری

پورنما

کمال کو دکھ ہوا۔ غالباً اس لڑکے کا نام پوَن تھا۔ پورنما نامی ایک لڑکی اس سے پریم کرتی ہے، اب وہ اس کا انتظار کرتی رہے گی لیکن پون کبھی بھی لوٹ کر نہیں جا سکے گا۔ لفافے پر پورنما کا پتہ نہیں تھا اور ڈاک خانے کی مہر پر ایک دن پہلے کی تاریخ تھی۔

کمال نے دیکھا کہ دریا کی دوسری جانب سے لبریشن فرنٹ کے مسلح آدمی جنگل میں داخل ہو رہے تھے۔ وہاں کھڑے رہنا خطرناک تھا لہٰذا انہوں نے لڑکے کی لاش اٹھائی اور چل دیئے۔ تھوڑی دیر بعد اسسٹنٹ کمانڈنٹ بھی ایک لاش اٹھائے مل گیا۔ سب لوگ واپس پولیس اسٹیشن پہنچے تو علم ہوا کہ فرنٹ کے چار کارکن ہلاک اور دو زخمی ہوئے تھے۔ گھائل افراد کو

اسپتال داخل کرادیا گیا۔ کمال نے سارے واقعہ کی رپورٹ مسٹر چند کو بھیج دی۔

اس رات سکون رہا۔ اگلے دن پھر چھاپے مارے گئے، اب کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوئی۔ رات پھر آرام سے کٹی۔ اگلے دن بازار سے کچھ لوگوں نے ایس، ڈی، او سے مل کر پولیس پر زیادتیوں کا الزام لگایا۔ ان کے جانے کے بعد کچھ اور لوگ آئے جنھوں نے پولیس پر لگے الزام کو بے بنیاد قرار دیا۔ شام کو اسے بیکنتھ پور سے ایک جونیئر افسر کا فون آیا جس سے انکشاف ہوا کہ سابنگ میں پولیس کارروائیوں کا سہرا مسٹر گمت کے سار باندھا جارہا ہے، اور ایس پی مسٹر چند نے بذاتِ خود اخبار نویسوں کو بتایا ہے۔

کمال سوچ میں ڈوب گیا۔ مسٹر چند نے ایسا کیوں کیا ہے؟ کیا وہ کمال کی کارروائیوں کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا؟ یا شاید وہ اسے بغیر تحریری حکم سابنگ بھیجنے کے معاملہ کو اخفا میں رکھنے کا خواہاں تھا؟ پس منظر کچھ بھی ہو، مسٹر چند کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب اسے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ تاہم اگلے روز اسے مسٹر چند کی طرف سے فوری واپسی کا حکم ملا۔

اپنا سامان باندھنے کے بعد اس نے سابنگ سے کوچ کیا اور شام کو بیکنتھ پور پہنچ گیا۔ اس کی یہاں واپسی بہت دنوں بعد ہوئی تھی۔ شہر اجنبی دکھائی دیتا تھا۔ پتہ چلا کہ اس کی ماں آج صبح ہی گاؤں واپس گئی ہے۔ اسے یہ بھی علم ہوا کہ بیکنتھ پور میں اس کی تعیناتی کا مقصد نہرو کپ کا انتظام کرنا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی اس کو نیند نے آلیا۔

....

غیر جانبداری اور ایمانداری سے فرائض کی ادائیگی پھر سے کمال کے لیے باعثِ تکلیف ہوگئی۔ برسرِ اقتدار جماعت کے پنچایت پردھان مسٹر نیرن نندنی نے ہسکو ابلاک ڈیویلپمنٹ آفس سے گورنمنٹ سیمنٹ کی ایک سو پچاس بوریاں حاصل کیں اور ایک مارواڑی کاروباری شخص کھیم راج کو بلیک مارکیٹنگ میں بیچ دیں۔ خبر باہر نکلی تو نندنی نے بہانہ بنایا کہ ٹرک خراب ہوگیا تھا جس وجہ سے اسے کھیم راج کے پاس سیمنٹ رکھوانا پڑا۔ تاہم لوگ اس سے مطمئن نہ ہوئے اور تھانے جاکر تحریری شکایت دی لیکن آفیسر انچارج نے کوئی کارروائی نہ کی۔ لوگ سرکل انسپکٹر سے ملے لیکن وہاں بھی کوئی شنوائی نہ ہوئی، اس پر چند لوگ کمال کے پاس آئے۔ اس نے موقع پر جاکر تمام کاغذات دیکھنے کے بعد ٹرک تھانے لے جانے کی ہدایت کی۔ ساتھ ہی مزدوروں کو بلایا جو ٹرک سے بوریاں اتار کر کھیم راج کے گودام میں رکھ رہے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ انہیں آج دوپہر کو مزدوری کے لیے رکھا گیا تھا۔ بات واضح تھی کہ بوریوں کو وہاں منتقل کرنے کا پروگرام دوپہر ہی کو بنا تھا اور نہ یہ کیا منطق تھی کہ ٹرک کی خرابی کا وقت شام چار بجے لیکن مزدوروں کو پہلے ہی بلالیا گیا؟ کمال کو یقین ہوگیا کہ یہ بدعنوانی کا معاملہ ہے۔ اس نے تفتیش شروع کرا دی جو حکومتی جماعت کے لیے ناقابلِ برداشت بات تھی۔

اگلی صبح مقامی رکنِ اسمبلی مسٹر کندو نے کمال کو فون کیا، ''کیا تم نے ہمارے پردھان کے خلاف تفتیش کرانے کا حکم دیا ہے؟ تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟ جو کرنا ہے، کرلو۔ ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں رہے گا''۔ کمال کو جواب دینے کا موقع دیئے بغیر ہی اس نے فون منقطع کردیا۔ شاید اس کی نظر میں جواب سننا غیر اہم بات تھی۔ پہلے تو کمال نے اسے فون کرنے کا سوچا لیکن پھر ارادہ بدل دیا کہ جس شخص میں معمولی سی بھی خوش اخلاقی اور تہذیب نہیں، اسے فون کرنے کا کیا فائدہ؟

مسٹر کندو کے دکھ اور طیش کو سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ کمال نے ان کی جماعت کے ایک نیتا کے خلاف مقدمہ درج کیا، اور وہ بھی، بقول کندو، ''ان کی اپنی حکومت میں''۔ پھر علاقے کے ایک بدنام غنڈے بابو اسنگھ کی گرفتاری پر بھی وہ شدید تلملا رہا تھا حالانکہ ہر قسم کے شدید جرم میں اس کا نام لیا جاتا تھا۔ طیش کی وجہ یہ تھی کہ بابو اکی پشت پناہی یہی رکنِ اسمبلی کررہا تھا۔ چلیں، بات سمجھ میں آتی ہے، مگر سیلز ٹیکس کی وصولی؟ ٹرانس ہمالین ٹرانسپورٹ کمپنی کا غذات میں جعل سازی سے کروڑوں روپے سیلز ٹیکس

کی مد میں بچا رہی تھی۔ خفیہ اطلاع پر کمال نے ان کے دفتر پر چھاپہ مار کر جعلی کاغذات قبضے میں کر لیے۔ اگلے روز انہیں دو لاکھ بیس ہزار روپیہ جمع کرانا پڑا۔ اس پر اخبارات میں کندو کا بیان شائع ہوا،'' سیلز ٹیکس آفیسرز کی موجودگی میں کیا ایڈیشنل ایس پی ٹیکس چوری کا سراغ لگائے گا؟''

وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ آل انڈیا ریڈیو کے مناب رائے کا فون آ گیا،'' کیا آپ نے پردھان نیرن نندنی کے خلاف کوئی مقدمہ شروع کیا ہے؟''

'' کیا میں آپ سے درخواست کر سکتا ہوں کہ فی الحال یہ خبر نشر نہ کی جائے؟''، کمال نے اس سے درخواست کی۔

'' آپ کیسے روک سکتے ہیں؟ میں نے خبر سن لی ہے۔ آپ کا نقطہ نظر معلوم کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ کیا آپ کچھ بتانا چاہیں گے؟''

'' میری درخواست ہے کہ فی الحال یہ خبر نشر نہ کریں''۔

مسٹر رائے کو یہ خبر دوسرے ذرائع سے ملی تھی۔ اسے نشر نہ کرنے کی اس پر کوئی اخلاقی پابندی نہیں تھی۔ یہی ہوا۔ جلد ہی یہ خبر نشر ہو گئی، اور پھر اخباری نمائندے اس کے دفتر میں آ موجود ہوئے۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر نے سوال کیا،'' مسٹر کندو کا کہنا ہے کہ آپ نے پردھان کے خلاف ناجائز مقدمہ بنایا ہے، اس کے لیے وہ آپ پر جلد ہی مجرمانہ مقدمہ دائر کریں گے''۔ اگرچہ کمال کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ جانتا تھا کہ طیش میں آنے کا مطلب ہے منطق سے تہی دستی، لہٰذا اس نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ ایڈیٹر نے کندو کا دستخط شدہ بیان کمال کو دکھاتے ہوئے اس پر تبصرہ کرنے کو کہا۔ کمال نے چند لمحے سوچ کر جواب دیا،'' مسٹر کندو جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ ان کی اپنی مرضی ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ انہوں نے غلط مقدمہ درج کرنے کا مجھ پر جو الزام عائد کیا ہے اس میں قطعاً کوئی حقیقت نہیں۔ مسٹر پردھان پر مقدمے کا اندراج حقائق کی چھان بین کے بعد ہوا ہے۔ آپ لوگ چاہیں تو خود ساری صورتِ حال کی چھان بین کر سکتے ہیں''۔

'' اگر آپ کے خلاف مقدمہ درج کرایا گیا تو اس صورت میں آپ کیا کریں گے؟''

'' سرکاری حیثیت سے کی گئی جائز کارروائی کی وجہ سے میرے خلاف استغاثہ کی کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے حکومت کی اجازت ضروری ہے۔ کیا کندو صاحب نے اجازت لے لی ہے؟''

اخباری نمائندوں نے آپس میں سرگوشیوں کے بعد کہا،'' ہاں! یہ ہم ان سے پوچھیں گے''، اور پھر وہ چلے گئے۔

اس کے خلاف کوئی مقدمہ نہ بنایا گیا، بس اتنا ہوا کہ اگلے ہفتہ اسے بیکنٹھ پور سے بنکا پور بحیثیت ڈپٹی کمانڈنٹ، فرسٹ بٹالین، تبدیل کر دیا گیا۔ ڈی۔ جی نے اس پر کوئی رائے زنی نہ کی، جبکہ ہوم سیکرٹری نے اس کو'' معمول کا تبادلہ'' اور '' عوامی مفاد'' قرار دیا، حالانکہ ڈپٹی کمانڈنٹ کا عہدہ گذشتہ چھ سال سے خالی پڑا تھا۔ شام کو جب اخباری نمائندوں نے کمال کا ردِعمل جاننا چاہا تو اس نے کہا،'' حکومت نے میرا تبادلہ کر دیا ہے، بس اتنا ہی کہنا ہے''۔

ایک اخباری نمائندے نے سوال کیا،'' کیا تبادلے کا سبب یہ تو نہیں کہ آپ نے برسرِ اقتدار جماعت کے ایک لیڈر پر مقدمہ درج کیا ہے؟''

'' میرا تبادلہ کرنے والے بہتر جواب دے سکتے ہیں''۔

'' کیا آپ کچھ نہیں کہیں گے؟''

'' میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ مجھے اپنے تبادلے کی وجہ کا علم نہیں۔ بس اتنا کہا گیا ہے کہ یہ عوامی مفاد میں ہے''۔ سب نے ہنسنا شروع کر دیا۔ ایک نمائندے نے کہا،'' آپ بیکنٹھ پور کے ہیرو بن چکے ہیں۔ اگر آپ کسی بھی چناؤ میں حصہ لیں تو کامیابی

یقیناً قدم چومے گی''۔

کمال سوچ رہا تھا کہ یہاں کے لوگ اس سے حقیقتاً محبت کرتے ہیں لیکن انتخابات کے طریقۂ کار کے مدِ نظر وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ موجودہ صورتِ حال میں انتخابات میں کامیابی کے لیے کئی اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے۔

....

ٹرانسفر آرڈر ملنے کے فوراً بعد کمال نے مسٹر چند کو فون کر کے پوچھا کہ چارج کس کے حوالے کیا جائے لیکن اس نے جواب دیا کہ اس کی واضح ہدایات ملنے تک کسی کو چارج نہیں دینا۔ کمال نے کہا، ''سر! ایک دو روز تک تو ٹھیک ہے لیکن کسی دن تو مجھے یہاں سے رخصت ہونا ہی ہے''۔

''کیا تمہیں جانے کی بہت جلدی ہے؟''

''سر! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مجھے یہاں آنے کا بھی کوئی شوق نہیں تھا، لیکن حکم ملنے کے بعد میں آ گیا''۔

''اب کیا چاہتے ہو؟''

''تبادلے کا حکم ملنے کے بعد میں مزید یہاں کام کرنا نہیں چاہتا''۔

''مجھے ان لوگوں سے بات کر لینے دو، میں تمہیں بتا دوں گا۔ کیا ابھی بھی موسیقی سیکھ رہے ہو؟''

''جی سر!''

''پھر استاد کہاں سے ڈھونڈو گے؟''

''سر! میں تلاش کر ہی لوں گا''۔

''اچھا، ٹھیک ہے''۔

....

دو دن انتظار کرنے کے بعد بھی ایس پی کی جانب سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے پھر استفسار کیا کہ چارج کس کے حوالے کیا جائے۔ جواب ملا کہ ڈی، ایس، پی کے حوالے کر دو۔ کمال نے چارج اس کے حوالے کرنے کے بعد بنگا پور کو رختِ سفر باندھا۔ وہاں اسٹیشن پر پہنچا تو گاڑی سے اترتے ہی ایک سپاہی نے اسے ڈی، جی کا پیغام دیا کہ وہ چارج لینے سے قبل اس سے ملاقات کرے۔ اپنا سامان سپاہیوں کے پاس چھوڑ کر وہ ڈی، جی سے ملنے چلا گیا۔ اس نے کمال کی مدد نہ کر سکنے پر اس سے معذرت کی، ''میں نے اپنی رپورٹ میں تمہاری کارروائی کی تائید کی، پھر وزیرِ اعلیٰ سے ملاقات کر کے تفصیل بتائی، لیکن جب جماعت کے اپنے لوگ ہی مخالفت پر تلے ہوں تو کسی قسم کی منطق اور دلیل کام نہیں آتی''۔

''سر! کوئی بات نہیں۔ پہلے بھی میں نے ایک سال گزارا تھا، یہ وقت بھی بیت جائے گا۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ آپ نے صحیح صورتِ حال سے انہیں آگاہ کر دیا تھا۔ اپنے تبادلے کا کوئی رنج نہیں''۔

''تمہیں ابھی چارج لینے کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں کہہ چکا ہوں کہ اگر تمہارا تبادلہ کرنا ہی ہے تو کوئی ذمہ دار عہدہ دیا جائے۔ وہ رضامند ہو گئے ہیں۔ اب جا کر گم گم ہوائی اڈے بطور ایڈیشنل ایس پی چارج لو''۔

''سر! اس نوعیت کے احکام نہیں ملے''۔

''میں حکم جاری کر رہا ہوں''۔ پھر اپنے پی اے کو بلا کر کمال کی نئی تعیناتی کا حکم نامہ ٹائپ کرنے کو کہا۔ اس کے بعد اس نے گم گم ایئر پورٹ کے اے، ایس، پی کو چارج کمال کے حوالے کرنے کی ہدایت کی، اور کمال سے کہا کہ وہ کل جا کر چارج سنبھال لے۔ اتنے میں پی اے تعیناتی کا حکم نامہ لے آیا جس پر ڈی، جی نے دستخط کر کے کمال کو دے دیا۔ اسے احساس ہوا کہ

آدمی اور کام کرنے میں فرق کیا ہوتا ہے۔ کجا وہ وقت جب اسے یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ تین ماہ کے اندر اندر اس کی تعیناتی کسی سب ڈویژن میں کر دی جائے گی مگر اکیس مہینے گزرنے کے بعد بھی وعدے کی لاج نہ رکھی گئی۔ اب یہ شخص ہے جس نے کوئی وعدہ نہیں کیا بلکہ تعیناتی کا حکم جاری کر دیا ہے۔ کمال خوش ہو گیا۔

اگلے روز اس نے اپنا چارج لیا۔ سابقہ اے، ایس، پی سرکاری رہائش گاہ استعمال نہیں کر رہا تھا اس لیے وہ خالی تھی لہٰذا کمال نے وہاں رہائش رکھی۔

....

کہتے ہیں کسی کی شہرت یا بدنامی پنکھ لگا کر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ جاتی ہے، کمال کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ لوگوں نے اس سے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ نئی تعیناتی پر آتے ہی وہ جلد بدانتظامی، بے قاعدگی اور مسائل سے آگاہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں، اس کا بھاگوڑی ہوائی اڈے پر سابقہ تجربہ بھی کارآمد ثابت ہوا۔

ہوائی اڈے پر اس کے اہم فرائض میں مسافروں کی جان و مال کا تحفظ تھا۔ کسی مسافر کو اسلحہ یا دھماکہ خیز مواد جہاز پر لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اندرونِ ملک سفر کرنے والے مسافروں کو سخت تلاشی اور جانچ پڑتال کے مرحلہ سے نہیں گزرنا پڑتا تھا البتہ دوسرے ممالک سے آنے والے مسافروں کو بعض اوقات جسمانی اور سامان کی تلاشی دینا پڑتی۔ ہوائی اڈہ ہمہ وقت متعلقہ اداروں کی نگرانی میں رہتا۔

اے، ایس، پی سے بالا افسر کسم پور کا ایس پی تھا جو اوّل الذکر کو امن و امان کی صورتِ حال کے مدِ نظر کوئی بھی کام تفویض کر سکتا تھا۔ چند دنوں کے بعد کمال کو لیک سٹی میں فٹ بال میچ کی ڈیوٹی دی گئی۔ اعتراض کرنے پر جواب ملا کہ یہ یہاں کی روایت ہے، تمہیں کبھی کبھار یہ فرض ادا کرنا پڑے گا۔

یہاں کا اہم ترین مسئلہ سپاہیوں اور افسروں کی رہائش کے لیے گھروں کی کمی کا تھا۔ ایڈیشنل ایس، پی کے لیے حکومت نے لیک سٹی میں دو کمروں کا گھر کرایے پر لیا ہوا تھا جبکہ دوسروں کے لیے کوئی جائے سکونت نہیں تھی۔ ہوائی اڈے پر سپاہیوں کو کینٹین کی سہولت بھی مہیا نہیں تھی۔ ان سہولیات کی عدم موجودگی کے سبب وہاں تعینات اہلکاروں کی کارکردگی پر منفی اثر پڑتا تھا۔ بدعنوانی اور رشوت ستانی عام تھی۔ کمال کو معلوم ہوا کہ دوسرے ممالک سے آنے والے متعدد مسافر ہوائی اڈے پر تعینات مختلف محکموں کے اہلکاروں کی ملی بھگت سے اسمگلنگ میں ملوث تھے۔ دیگر حکام سے بات چیت کے بعد کمال نے اچانک چھاپے مارنے شروع کیے جس سے یہ غیر قانونی کاروبار قدرے کم ہو گیا مگر اس کا مکمل سدِ باب متعلقہ عملے اور کسٹم ملازمین کی اعانت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

بین الاقوامی ٹرمینل پر ڈیوٹی فری شاپ تھی جہاں سے بیرونِ ملک آنے والے مسافر اپنا پاسپورٹ دکھا کر بغیر ڈیوٹی سامان خریدنے کے مجاز تھے، لیکن باہر جا کر یہی اشیاء مہنگے داموں بیچ دیتے، جس سے حکومت کو خاصا نقصان ہو رہا تھا۔ لوگ زیادہ تر مقبولِ عام سگریٹ اور شراب کی سمگلنگ کرتے۔ کمال نے ایک سپاہی سے شراب کی بوتلیں پکڑیں جس سے معلوم ہوا کہ خود پولیس والے بھی اس کام میں ملوث تھے۔

ہوائی اڈے کی حدود کے اندر ٹیکسی اسٹینڈ تھا مگر قطار بندی پر نہ وہ عمل کرتے نہ وہاں تعینات سپاہی توجہ دیتے۔ پانچ سات روپے رشوت لے کر کسی بھی ٹیکسی کو قطار توڑ کر آگے آنے کی اجازت مل جاتی، بلکہ یہاں تک تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور اندر آ کر بھی مسافروں سے بھاؤ تاؤ کرتے۔ کمال نے اچانک چھاپے مار کر چند ڈرائیوروں اور سپاہیوں کر حراست میں لیا جس کے باعث ایسے واقعات میں کمی ہو گئی۔

سیکورٹی چیک اور امیگریشن کاؤنٹرز پر رشوت خوری کمال کے لیے موجب تشویش تھی۔ مسافروں کے تحفظ کی خاطر حکومت نے قانون اور ضابطے بنا رکھے تھے، مثلاً، اپنے ساتھ اسلحہ لے جانے کی پابندی، کیمرہ لے جانے کی اجازت مگر اس کے اندر بیٹری سیل نکالنے پڑتے، مٹھائی وغیرہ مہر بند ڈبوں میں رکھنے کی ممانعت، تاہم پولیس والے رشوت لے کر قانون شکنی پر آنکھیں بند کر لیتے۔ کمال کی کوشش کے باوجود تعینات عملہ یہ بات نہ سمجھ سکا کہ کوئی دھماکہ خیز مواد اگر جہاز کے اندر چلا گیا تو اس سے کتنا بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔ ایک سب انسپکٹر کو اسی بنا پر گرفتار بھی کیا گیا۔

مطلوبہ مجرموں کی تصاویر امیگریشن کاؤنٹر کو دی جاتی تھیں تاکہ کوئی ایسا شخص ملک میں داخل یا یہاں سے فرار نہ ہو سکے لیکن معلوم ہوا کہ عملہ نذرانے کے عوض چشم پوشی کر لیتا جس کی وجہ سے کئی مجرم باہر فرار یا داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتے۔ ایسے مسافر زیادہ تر بنکاک اور ڈھاکہ سے آتے۔ اہلکاروں کو اندازہ نہ ہو پاتا کہ ان مسافروں میں کوئی جاسوس بھی ہو سکتا ہے۔

ایک بار کمال نے دور کھڑے دیکھا کہ کچھ مسافر کاؤنٹر پر اپنے پاسپورٹ کے ساتھ سگریٹوں کا ڈبہ یا شراب کی بوتل رکھ دیتے اور متعلقہ اہلکار جلدی سے مہر لگا کر انہیں فارغ کر دیتے۔ وہ سمجھ گیا کہ یا تو ان کے پاس ممنوعہ اشیاء ہیں یا کاغذات نامکمل ہیں۔ ایک مشکوک لڑکے کو روکا تو اس کے پاس سے شراب کی متعدد بوتلیں ملیں جبکہ پاسپورٹ بھی جعلی نکلا۔ متعلقہ اہلکاروں کے درازوں کی تلاشی لی تو ہر ایک کے پاس سے اسی قسم کی ممنوعہ چیزیں برآمد ہوئیں۔ یہ سارے اہلکار دو پولیس انجمنوں کے عہدیدار تھے۔ کمال نے مکمل رپورٹ ایس پی کو بھیج دی۔

دونوں انجمنوں نے شور شرابا کیا، بعد میں ایک وفد کی صورت ایس پی سے ملے اور باوردی اہلکاروں کے خلاف توہین آمیز رویے پر سخت احتجاج کیا۔ کمال نے بھی ترش لہجے میں جواب دیا کہ اگر انہیں وردی پہن کر اتنے لوگوں کی موجودگی میں رشوت لیتے ہوئے شرم نہیں آتی تو پکڑے جانے پر انہیں توہین کا احساس کیوں ہوتا ہے۔ اس نے واضح کر دیا کہ وردی اور رشوت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔

ہندوستان میں زیادہ تر امیر اور کاروباری لوگ ہی ہوائی سفر کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ ٹیکس چوری اور بلیک مارکیٹنگ میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ اپنی غیر قانونی دولت بالعموم دستی سامان میں رکھنے کی بجائے دوسرے سامان میں بھیج دی جاتی ہے۔ کچھ عرصہ سے باہر بھیجے جانے یا منگوائے گئے سامان سے قیمتی اشیاء غائب ہونے کی شکایات بھی موصول ہو رہی تھیں۔ عجیب بات تھی کہ متعلقہ ہوائی کمپنی پولیس کو رپورٹ کرنے کی بجائے خود اپنی کمپنی کے لوگوں سے تفتیش کراتی، گویا پولیس سے ان معاملات کو اخفا میں رکھا جاتا۔ مسافروں کے نقصان کا ازالہ بھی نہ ہوتا۔ سامان کو جہاز سے اتارنے یا چڑھانے میں پولیس کا کوئی کردار نہیں تھا۔ ایک دو مواقع پر جب اشیاء کی گمشدگی کا معاملہ پولیس کے پاس آیا تو کمال نے ہوائی کمپنیوں سے گفتگو کی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

....

یہاں پہنچنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ بمبئی اور دہلی کے ہوائی اڈوں کی پولیس کا سربراہ ڈپٹی کمشنر پولیس کہلاتا ہے، پھر مرکزی حکومت گم گم ہوائی اڈے کی سربراہی کے لیے ایس پی کو تعینات کرنے کی خواہاں تھی، اور ایس پی سمیت ڈیڑھ سو اسامیاں پیدا کرنے کی تجویز زیر غور تھی۔ مختلف حکام سے ملاقاتوں اور گفتگو کے بعد کمال انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ ایک تو ڈیڑھ سو افراد کو ملازمتیں ملیں گی اور دوسرے یہ کہ ائیر پورٹ پولیس کا محکمہ مضبوط ہو جائے گا، اور اہم ترین یہ کہ اس میں کوئی اضافی مالی بوجھ نہیں کیونکہ مرکزی حکومت سارے اخراجات واپس کرے گی۔ سیکرٹری خزانہ کا کہنا تھا کہ مرکزی حکومت کی

اخراجات واپس کرنے کی یقین دہانی سات برس پرانی ہے، ممکن ہے اب ان کا خیال تبدیل ہو گیا ہو اس لیے اس کی تجدید ہونی چاہیے، اگر ایسا ہو جائے تو تجویز فی الفور منظور کر لی جائے گی۔ مطمئن اور شاداں کمال نے واپس دفتر آ کر دہلی میں ڈی، جی سول ایوی ایشن کو اپنی ملاقات کے حوالے سے خط لکھا۔ خوش خبری جلد ہی مل گئی۔ اس پس منظر میں وہ اب ایک خط سیکرٹری خزانہ کو لکھوا رہا تھا کہ مرکزی حکومت نے اسامیوں کی بھرتی پر ہونے والے اخراجات واپس کرنے کا یقین دلا دیا ہے۔ ابھی اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اسے ڈی، جی، کرائم کا فون ملا۔

....

آج صبح ایک فلم سٹار سیتا دیوی بذریعہ ہوائی جہاز دہلی گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سامان میں سے سارے زیورات غائب ہیں۔ اس نے حکام بالا کو فون کیا تو اوپر سے نیچے تک سب لوگ بوکھلا گئے۔ بات کمال تک آ گئی۔ سی، آئی، ڈی اور انٹیلی جنس بیورو کی ٹیمیں بھی پہنچ رہی تھیں۔ زیورات کی چوری میں ایک مثبت پہلو چیزوں کی شناخت ہے۔ کمال نے بیورو کے ایس، ایس، پی کو دہلی سے زیورات کی فہرست منگوانے کی درخواست کی، ساتھ ہی ڈی، ایس، پی دہلی ایئر پورٹ کو بھی ایسی ہی درخواست بھیج دی۔ بعد ازاں وہ انڈین ایئر لائن کے ہوائی اڈے دفتر پہنچا اور مینیجر سے ان مزدوروں کے نام، پتہ، ملازمت کا عرصہ وغیرہ حاصل کیا جنھوں نے صبح دہلی جانے والی پرواز میں جہاز کے اندر جا کر سامان رکھوایا تھا۔ مینیجر نے کمال سے یہ بات اخفا میں رکھنے کی درخواست کی کہ معلومات اس کی وساطت سے پولیس کو ملی ہیں ورنہ مزدور اور ان کی یونین اس کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔ کمال اسے یقین دلانے کے بعد وہاں سے واپس اپنے دفتر آ گیا۔

جہاز تک سامان پہنچانے والے مزدوروں کی فہرست تو مل گئی مگر یہ پتہ نہ چل سکا کہ جہاز کے اندر کون گیا تھا۔ کمال نے انسپکٹر سنت بسواس کو متعلقہ مزدوروں میں سے ایک مزدور شیبو پال کے گھر جانے کی ہدایت کی۔ ساتھ ہی اسے سمجھا دیا کہ اپنی شناخت ظاہر کیے بغیر پال کو پیغام دے کہ اسے ایئر پورٹ مینیجر نے بلایا ہے۔ گھر سے باہر آنے پر اس سے معلوم کیا جائے کہ جہاز کے اندر کون گیا تھا۔ معلومات ملنے پر کمال کو فوری طور پر اس سے آگاہ کرنا ہوگا۔ ساری کارروائی ذہانت کی متقاضی تھی۔ پھر ایک اور احتیاط بھی لازمی تھی کہ چوری کے مرتکب شخص کی نشاندہی ہونے تک پال کو کسی نہ کسی بہانے اپنے ساتھ ہی مصروف رکھنا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے چوری شدہ زیورات کی فہرست بھی مل گئی، ساتھ ہی سنت بسواس نے اطلاع دی کہ پال نے جہاز کے اندر جانے والے مزدور کا نام ملینا تھ بتایا ہے۔ کمال نے ایک اور انسپکٹر سے کسی ایسے شخص کو بلانے کا کہا جو ملینا تھ کو پہچانتا ہو۔ وہ باہر گیا اور جلد ہی پتن نامی ایک سپاہی کو ساتھ لیے واپس آ گیا جو ملینا تھ کو جانتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ جس ملینا تھ کو جانتا ہے وہ مزدوروں کی یونین میں بڑا سرگرم ہے، اب پتہ نہیں یہ وہی شخص ہے یا کوئی اور۔ سپاہی کو اس کے گھر کا علم نہیں تھا اس لیے کمال نے اسے چند سپاہیوں کے ہمراہ باہر بھیجا کہ ملینا تھ نظر آئے تو سپاہیوں کو اس کی نشاندہی کرے۔ بصورت دیگر، کہیں نہ کہیں سے اس کے گھر کا پتہ معلوم کر کے وہاں جائیں اور یونین کے کسی رہنما کا پیغام پہنچانے کے بہانے اسے یہاں تک لایا جائے۔ لیکن محتاط رہا جائے کہ ایسے لیڈر کا نام نہ ہو جو اس وقت ملینا تھ کے گھر موجود ہو۔ یہ بھی نگرانی کی جائے کہ کوئی شخص اس کے گھر سے زیورات لے کر نکل نہ جائے، اور کوئی مشتبہ شخص نظر آئے تو حراست میں لے لیں۔ اس نے کچھ ہدایات اپنے اسٹینو کو بھی دیں کہ ملینا تھ کی حراست پر اسے کیا کہنا اور کرنا ہوگا۔

تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد کمال کو اے، ایس، آئی سے اطلاع ملی کہ ملینا تھ بازار گیا ہوا ہے۔ کمال نے اسے ہدایت کی کہ کسی شخص کو گھر کی نگرانی پر مامور کر کے خود پتن کے ساتھ بازار جا کر اسے تلاش کرے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد پتہ چلا کہ ملینا تھ یونین کی میٹنگ میں ہے۔ کمال سوچ میں پڑ گیا کہ اگر اسے یونین کے اجلاس میں گرفتار کیا گیا تو مزدوروں میں

اشتعال پھیل جائے گا، اور انتظار کرنے کی صورت میں ان کارروائیوں کی خبر خفیہ نہ رہ پائے گی۔ بہت سوچ کر کمال نے ہدایت کی کہ ملینا تھ کو میٹنگ کے دوران ہی کوئی پیغام دینے کے بہانے باہر بلا کر یہاں لایا جائے۔

چند منٹ گزرے ہوں گے کہ اے، ایس، آئی ایک آدمی کو ساتھ لیے کمال کے دفتر میں آ گیا، ''سر! یہ ملینا تھ ہے''۔ وہ بڑے طیش میں تھا، ''میں یونین کا ایک لیڈر ہوں۔ مجھے دھوکے سے یہاں لایا گیا ہے۔ کیوں؟ میں نے کیا جرم کیا ہے؟''

''تمہیں جلد ہی علم ہو جائے گا۔ کیا تم آج صبح دہلی جانے والی فلائٹ کے لیے ٹرمینل پر ڈیوٹی دے رہے تھے؟''

''نہیں، میری رات کی ڈیوٹی تھی اس لیے آج آرام کا دن ہے''۔

''رات کی شفٹ کس وقت ختم ہوئی تھی؟''

''رات آٹھ بجے''۔

''تم نے صبح دہلی فلائٹ پر سامان جہاز پر چڑھایا تھا؟''

''جی سر! یہ ہماری ڈیوٹی ہے''۔

''کیا مسافروں کے سامان کی قفل شکنی اور قیمتی چیزوں کی چوری بھی تمہاری ڈیوٹی ہے؟''

''نہیں سر! ہم تو سامان جہاز کے اندر رکھتے ہیں، ایسا کام نہیں کرتے''۔

''ٹھیک ہے، تم لوگ جہاز پر سامان چڑھاتے ہو لیکن سامان چڑھاتے ہوئے تم نے زیورات کیوں چوری کیے؟''

اس انکشاف پر ملینا تھ پریشان ہو گیا لیکن اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا، ''سر! میں نے کوئی چوری نہیں کی، مگر آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟''

''جو کچھ تمہیں بتایا جا رہا ہے، سچ ہے۔ آج صبح کی دہلی فلائٹ میں تم، ٹمن جھا، سواپن داس اور شیبو پال سامان چڑھانے پر مامور تھے''۔

ملینا تھ گڑبڑا گیا لیکن اپنی حالت چھپاتے ہوئے کہنے لگا، ''لیکن سر! میں اندر نہیں گیا تھا، شیبو گیا تھا''۔

''کیا خوب! شیبو نے تو صرف تین مہینے پہلے ملازمت کی ہے، ابھی تک تو اس کا تربیتی عرصہ جاری ہے، وہ جہاز کے اندر کیسے چلا گیا؟''

''سر! ایسا کوئی قاعدہ قانون نہیں ہے''۔

''تم سب کچھ جانتے ہو۔ تمہیں بغیر تحقیقات کے گرفتار نہیں کیا گیا۔ ہم معاملہ کی تہ تک پہنچ چکے ہیں۔ چالاک بننے کی کوشش کی تو نقصان میں رہو گے''۔

لیکن ملینا تھ اپنی بات پر اڑا رہا۔ اسی اثنا میں فون کی گھنٹی بجی۔ کمال نے رسیور اٹھایا اور کہنے لگا، ''اوہ! تم وہیں پر ہو؟ چوری شدہ چیزیں مل گئیں؟ شاندار! میں وہیں آ رہا ہوں۔ شیبو مدد کر رہا ہے تو اسے چھوڑ دو، نہیں، نہیں، اسے اس واردات میں ملوث کرنے کی ضرورت نہیں''۔ فون بند کرتے ہوئے ملینا تھ کو مخاطب کر کے بولا، ''تم بہانہ سازی کر رہے ہو، ادھر شیبو نے تمہاری چوری کا راز فاش کر دیا ہے۔ چلو اٹھو، ہمارے ساتھ چلو، اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ اور پھر تم نے مسروقہ سامان کی برآمدگی کے کاغذ پر دستخط بھی تو کرنے ہیں''۔

کمال نے اردلی کو کہہ کر گاڑی منگوائی۔ اب ملینا تھ بالکل ٹوٹ گیا، ''سر! آپ جو چاہیں کریں لیکن میری بات سن لیجیے۔ آپ نے ٹمن کو چھوڑنے کا کہا ہے، اصل مجرم تو وہی ہے۔ اس کو مت چھوڑیں۔ پلیز! میری بات سن لیجیے''۔

''میں تو سننا چاہتا ہوں مگر تم کچھ بول ہی نہیں رہے''، کمال نے کہا۔

''سر! ثمن دو سال سے وارداتیں کر رہا ہے، میں نے حال ہی میں اس گروہ میں شمولیت کی ہے''۔
''ثمن جہاز میں رکھے سامان کے قفل کیسے کھولتا تھا؟''
''سر! اس کے پاس تقریباً پینتیس کمپنیوں کے بنے تالوں کی چابیاں ہیں''۔
''چابیاں کہاں رکھی جاتی ہیں؟''
''ٹرمینل کے اس لاکر میں جہاں ہم اپنی چیزیں رکھتے ہیں''۔
''کیا اس وقت بھی وہیں ہوں گی؟''
''سر! آیئے، میں آپ کو دکھاتا ہوں''۔
''میں ضرور جاؤں گا، مگر اس وقت یہ بتاؤ تم لوگوں نے زیورات کہاں بیٹھ کر تقسیم کیے تھے؟''
''گیرن پترا کے گھر میں''۔
''وہ کون ہے؟''
''ہماری یونین کا خزانچی''۔
''وہ کہاں رہتا ہے؟''
''گیٹ نمبر دو کے پاس''۔
''اس کے گھر میں کیوں؟ وہ تو تم لوگوں کے ساتھ ڈیوٹی پر نہیں تھا''۔
''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یونین کا عہدیدار ہونے کے سبب وہ کسی وقت اور کہیں بھی جا سکتا ہے۔ کوئی افسر بھی اس سے پوچھنے کی ہمت نہیں کرتا۔ کل وہ ثمن کے پاس گیا اور اس کے کان میں کوئی بات کی، وہ بات سن کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ صبح گیرن تمہارے ساتھ جہاز کے اندر جائے گا۔ فکر مت کرنا، تمہیں تمہارا حصہ مل جائے گا۔ اس طرح وہ جہاز کے اندر جا کر زیورات چوری کر لایا۔ پھر شفٹ ختم ہونے کے بعد ہم اس کے گھر گئے۔ اس نے ہمیں کچھ نقدی اور سونے کے زیورات دیئے، موتیوں والے زیور اپنے پاس رکھ کر کہا، 'میں ان کی جانچ پرکھ کرا لوں، پھر تقسیم کریں گے'۔
''تو کیا سارے زیورات اسی کے پاس ہیں؟''
''نہیں سر! میرے گھر رکھوا کر وہ خود صراف کے پاس چلا گیا''۔
''تم نے زیور کہاں رکھے ہیں؟''
''گھڑے میں''۔
''اور نقدی؟''
''صرف پانچ ہزار تھے، میری یونیفارم کی جیب میں ہیں''۔
ملیناتھ کو ایک پولیس انسپکٹر کی تحویل میں دینے کے بعد کمال نے چار چھاپہ مار ٹیمیں بنا کر انہیں شریک مجرموں کے ٹھکانوں پر روانہ کیا اور خود آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔ کیا اسے ملیناتھ کے گھر خود جانا چاہیے، اگر چلا جاتا ہے تو ساری ٹیموں میں رابطہ کار کون ہوگا؟ یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ اے، ایس، آئی کا فون آیا، ''سر! ابھی ابھی ایک نامعلوم شخص ملیناتھ کے گھر داخل ہوا ہے، اس کے ساتھ ایک مزدور بھی ہے''۔
''وہ شخص کون ہے؟''
''سر! وہ اپنا نام نہیں بتا رہا، بس یہی کہے جا رہا ہے کہ میں یونین کا ایک لیڈر ہوں''۔

''فوراً گرفتار کرلو۔ ملیناتھ نے اقرارِ جرم کرلیا ہے۔ چوری شدہ سارا مال اس کے گھر میں ہے۔ سی، آئی، ڈی کے افسر اسے لے کر بس پہنچ ہی رہے ہوں گے۔ مکمل تلاشی ہونی چاہیے''۔

پھر کمال نے سنت کو فون کر کے شیبو کی گرفتاری اوراس کے گھر کی تلاشی کا حکم دیا۔ گیرن کے بارے میں اطلاع ملی کہ وہ یونین کی میٹنگ میں گیا ہوا ہے، اور یہ کہ اس کے گھر سے کوئی زیور برآمد نہیں ہوا۔ اسی طرح باقیوں کے متعلق بھی اطلاعات موصول ہو گئیں۔ ثمن سے صرف دو چوڑیاں اور سوا پن سے پانچ ہزار روپے ملے۔ آخری اطلاع کے مطابق ملیناتھ کے گھر میں جانے والا شخص گیرن تھا جسے ایک اور شخص سمیت حراست میں لے لیا گیا، وہ صراف تھا جو زیورات کی مالیت کا جائزہ لینے گیرن کے ساتھ تھا۔

کمال نے کارروائی کی مکمل رپورٹ بیورو اور سی، آئی ڈی حکام کو دے دی۔ سی، آئی، ڈی سے ایس ایس پی کی سربراہی میں ایک ٹیم پہنچ گئی جس نے گرفتار شدگان سے تفتیش شروع کر دی۔ اتنے میں ایئر پورٹ مینیجر کا فون آیا کہ یونین خزانچی کی گرفتاری پر ان لوگوں نے ہڑتال کرنے اور تمام پروازوں کو روک دینے کی دھمکی دی ہے۔ کمال باہر نکلا تو سیڑھیوں کے قریب ایئر لائن کے لوگ کھڑے تھے۔ انہوں نے کمال کو دیکھتے ہی نعرہ بازی شروع کر دی، ''کوئی پرواز نہیں جائے گی، پہیہ جام ہڑتال ہوگی''۔ وہ کچھ سوچ کر مینیجر کے پاس گیا اور اسے یونین لیڈروں کو بلانے کا کہا، ''دیکھنا ان کے غبارے سے کیسے ہوا نکلتی ہے''۔ مینیجر انہیں بلانے چلا گیا اور جلد ہی یونین کے صدر اور سیکرٹری کو اپنے ساتھ لے آیا۔ کمال نے بڑی شائستگی سے انہیں بیٹھنے کو کہا لیکن انہوں نے درشتگی سے جواب دیا، ''ہم بیٹھنے کے لیے نہیں آئے۔ ہمیں بتایا جائے کہ آپ نے ہماری یونین کے ایک لیڈر کو گرفتار کیوں کیا ہے؟'' یونین سیکرٹری بھی بول اٹھا، ''بغیر تحقیقات کے ہمارے لیڈر کو گرفتار کیا گیا ہے۔ آپ کو اس کا جواب دینا ہوگا''۔

کمال ان کے لہجے اور اندازِ گفتگو سے محظوظ ہو کر کہنے لگا، ''بالکل صحیح، لیکن پہلے اپنے لوگوں کے منہ سے کچھ سن تو لو۔ پھر فیصلہ کرنا مجھ سے کس قسم کی وضاحت چاہتے ہو''۔ اس نے گھنٹی بجا کر اردلی کو حکم دیا کہ گیرن کو اندر لایا جائے۔ یہ سنتے ہی صدر بولا، ''صرف گیرن کو نہیں، ملیناتھ کو بھی لایا جائے۔ آپ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟''

''صرف گیرن اور ملیناتھ ہی نہیں، ہم نے تین اور بھی افراد گرفتار کئے ہیں۔ ان کی بھی بات سنو''۔

ملیناتھ اندر آیا تو کمال نے اسے کہا، ''انہیں بتاؤ تمہیں گرفتار کیوں کیا گیا ہے''۔

وہ کہنے لگا، ''سر! میں بے گناہ ہوں، گیرن اور ثمن نے مجھے ملوث کیا ہے''۔

''کس جرم میں؟ تمہارے لیڈر آئے بیٹھے ہیں۔ وہ خود ہی ساری بات سننا چاہتے ہیں۔ انہیں بتاؤ''۔

ملیناتھ نے سوائے اپنی شمولیت کے، ساری بات کھول کر سنا دی۔ یہ سن کر یونین لیڈر باہر جانے لگے تو کمال نے انہیں کہا، ''پلیز! ہمارے ساتھ لاکرز تک چلئے اور اپنی آنکھوں سے ان کا کارنامہ دیکھیں''۔

کمال تقریباً زبردستی انہیں اپنے ساتھ لاکرز تک لایا۔ ہر لاکر سے مشہور کمپنیوں کے تالوں کی بیس سے پچیس تک چابیاں برآمد ہوئیں۔ سنت نے چابیاں اپنی تحویل میں لے لیں۔ یونین لیڈروں کے نام گواہان کی فہرست میں شامل کر لیے گئے۔ کاربولک ایسڈ کی بو سونگھنے پر جو حال کوبرا کا ہوتا ہے، اسی طرح یونین لیڈر مارے شرم کے سر جھکائے چلے گئے۔ کمال اپنے دفتر آ گیا۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ کمال لوگوں کی نظروں میں ایک ایسا طلسماتی کردار بن گیا جس کا لمس ہر چیز کو سونے میں بدل دیتا ہے۔ لیکن وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس کارروائی کا سہرہ اس کے اپنے سر پر نہیں بندھے گا کیونکہ اس میں متعدد اعلیٰ افسران کا بھی کچھ نہ کچھ کردار تھا، لیکن اخبارات نے دل کھول کر کمال کی ستائش کی اور یوں کامیابی نہ صرف اس کے نام سے

وابستہ ہوئی بلکہ راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر جا پہنچا۔ شہرت کے ساتھ ہی حاسدین اور مخالفین کی تعداد بھی زیادہ ہوگئی۔ انہیں یہ احساس نہ ہوا کہ ایک پولیس آفیسر نے محکمے کا نام روشن کیا ہے بلکہ وہ سمجھے کہ کمال کی کامیابی دراصل ان کی اپنی کارکردگی پر دھبہ ہے کہ ایک نئے ایڈیشنل ایس پی نے کیا نمایاں کام سرانجام دیا ہے۔

....

23 جولائی، 1988، ایک ابر آلود دن، پھر موسلا دھار بارش، کمال زیادہ دیر کرسی پر نہ بیٹھ سکا۔ وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں کھڑا سوچ رہا تھا کیا اسے مینا کو سرپرائز دینا چاہیے؟

اس نے کوئی چار پانچ ماہ قبل ڈاکٹریٹ میں داخلہ لیا تھا۔ کمال کی تعیناتی بیکنٹھ پور میں تھی اس لیے مینا نے ایک گرلز ہوسٹل میں رہائش اختیار کرلی۔ موجودہ مقام پر تعیناتی سے دونوں ایک ہی شہر میں تھے مگر پھر بھی دوری تھی کیونکہ مینا خاوند کے گھر رہنے سے گریزاں تھی اور کمال عورتوں کے ہوسٹل میں نہیں رہ سکتا تھا۔ چونکہ ہوسٹل انسٹیٹیوٹ کے نزدیک تھا اس لیے کمال بھی اس پر معترض نہ ہوا۔ شادی کے بعد سے اب تک زیادہ عرصہ ایک دوسرے سے مفارقت اب شاید دونوں کو گوارا تھی۔ اگرچہ مینا کبھی کبھار کمال کے پاس آیا کرتی مگر اسے اس کا انسٹیٹیوٹ آنا پسند نہیں تھا۔ لیکن آج، یعنی 23 جولائی مینا کی سالگرہ تھی۔ کمال کو یقین تھا کہ وہ اسے فون کرے گی، مگر ادھر سے خاموشی رہی۔ ایک توقع یہ بھی تھی کہ شاید وہ شام کو خود ہی آجائے۔ کیا وہ آپ جا کر اسے بلا لائے؟ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہچکچاہٹ کیوں پیدا ہورہی ہے؟ آخر وہ اس کی بیوی ہے۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ دفتر بند ہو چکا تھا اور سب لوگ چلے گئے تھے۔ اس نے ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہا اور پھر انسٹیٹیوٹ کی جانب روانہ ہوگیا۔

وہاں کا چوکیدار اسے پہچانتا تھا اس لیے کمال اندر چلا گیا۔ لیبارٹری میں گیا تو مینا اور اس کا ایک رفیق کار راجے، دونوں ایک دوسرے سے تقریباً جڑے بیٹھے تھے۔ کمال کو دیکھتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا اور ایک دو چیزیں ادھر ادھر کر کے یوں ظاہر کیا گویا کسی اہم کام میں مصروف ہو۔ مینا کمال کے پاس آئی۔ اس نے دو چار رسمی سے سوال پوچھے، مثلاً کیسی ہو؟ تحقیق کیسے جارہی ہے؟ آج کا کام ہوگیا یا تمہیں دیر ہوجائے گی؟ وغیرہ۔ اس نے جلدی سے اپنا بیگ اٹھایا، کمال کا بازو تھاما اور لیبارٹری سے نکل کر اس کے ہمراہ گھر چلی آئی۔

گھر پہنچ کر وہ کہنے لگی، ''میں اور راجے دونوں دوست ہیں اور اکٹھے بیٹھ کر کام کر رہے تھے۔ تم نے اس قدر بُرا کیوں منایا ہے؟''

''قابلِ اعتراض بات نہیں تھی تو تمہارا دوست کیوں اچھل کر وہاں سے اٹھا اور یہ ظاہر کیا جیسا کہ وہ بہت مصروف ہے؟''

''اس کا رویہ مجھے بھی بُرا لگا تھا''۔

''اور اگر میں نے بُرا منایا ہے تو تم اس پر معترض کیوں ہو؟''

مینا نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد گویا ہوئی ''میں نے تمہیں وہاں آنے سے منع کیا تھا، مگر تم چلے آئے اور اپنا مزاج برہم کرلیا''۔

''جانتی ہو میں کیوں آیا تھا؟''

''کیوں؟''

''آج 23 جولائی ہے، تمہاری سالگرہ''۔

''کیا تم نے میرے سرٹیفکیٹ نہیں دیکھے؟ وہاں تاریخ پیدائش اٹھارہ جولائی 1965 درج ہے''۔

''لیکن اصل تاریخ پیدائش تو 23 جولائی 1964 ہے نا؟''

''پھر کیا؟''

''یہ کہ آج کوئی تقریب ہونی چاہیے''۔

''مما نے صبح ہی فون کر دیا تھا، اور دوپہر کو ساتھیوں نے منہ میٹھا کرا دیا''۔

یہ سن کر کمال کو تاسف ہوا کاش وہ مینا کے پاس نہ گیا ہوتا۔ وہ تو اس کے بغیر بھی خوش باش ہے۔ کہنے لگا،''پھر میرے کرنے کو تو کچھ نہیں۔ میں تمہارے لیے مٹھائی اور پھول لایا تھا، لے لو۔ چلو! رات کا کھانا باہر کھاتے ہیں''۔

''نہیں، ہمارے باورچی نے مزیدار کھانا تیار کر رکھا ہے''۔

اور باہر شدید بارش ہو رہی تھی۔

....

نومبر میں یہاں موسم تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ چند دنوں سے کمال کو حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ قدرے ٹھنڈک تھی مگر ابھی تک اس نے گرم کپڑے استعمال نہیں کیے تھے۔ دفتر سے گھر آیا تو تنہائیوں کا بسیرا دیکھا۔ عام دنوں کی نسبت علالت میں خلوت اور اکیلا پن کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ مینا دو روز قبل باکل پور چلی گئی تھی۔ کمال کو علم نہ تھا کہ وہ واپس اس کے پاس آئے گی یا ہوسٹل چلی جائے گی۔ وہ بستر پر لیٹ گیا۔

دروازے کی گھنٹی بجی تو اس نے بادلِ نخواستہ دروازہ کھولا۔ باہر مینا، اس کی بہن اور بھائی کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے تقویت محسوس ہوئی اور ان سب کی خیریت معلوم کی۔ رینا نے اس سے پوچھا''دادا! آپ مینا کے ساتھ کیوں نہیں گئے تھے؟''

''سالی صاحبہ! دفتری مصروفیات کی وجہ سے''۔

''پھر وہی سسرالی رشتہ؟ میں نے کہا نہیں تھا یہ لفظ نہ بولا کریں؟''

''ٹھیک ہے میری بہن، اب اندر آ جاؤ''۔

شام ڈھل چکی تھی۔ سب نے ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا۔ کمال بستر پر دراز ہو گیا۔ مینا کی تجویز تھی کہ اکٹھے ہی سویا جائے۔ کمال نے اس سے اتفاق نہ کیا،''تم تینوں یہاں سو جاؤ، میں دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں''۔

مینا نے اعتراض کیا،''کیوں؟ اکٹھے سونے میں کیا حرج ہے؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں''۔

''علالت میں الگ سونا کوئی علاج نہیں ہے''۔

رینا بول اٹھی،''پھر میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں''، مگر مینا متفق نہیں تھی، بہرحال، اس کے مجبور کرنے پر سب اکٹھے ہی سو گئے۔ نصف شب کے وقت مینا نے کمال کو اٹھا کر پوچھا،''تم رینا کو ہاتھ کیوں پھیر رہے تھے؟''

کمال کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے رینا کو مخاطب کیا،''کیا ایسا ہوا تھا؟'' رینا چپ رہی۔ مینا نے کمال کو ڈانٹنا شروع کر دیا،''تم پیرو انکل کو برا بھلا کہتے ہو، اپنے متعلق کیا خیال ہے؟'' کمال بالکل لاچار تھا۔ صبح سویرے مینا اپنی بہن اور بھائی کو لے کر ہوسٹل چلی گئی۔

....

صبح نو بجے تھے، مینا اور کمال دونوں اپنے اپنے کاموں پر جانے کی تیاری میں تھے۔ مینا نے ہوسٹل چھوڑ کر کمال کے ساتھ ہی رہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بھی اس نے اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کے زور دینے پر کیا کیونکہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ

میاں بیوی دونوں ایک ہی شہر میں ہیں، سرکاری گھر بھی ملا ہوا ہے، اس کے باوجود اکٹھے نہیں رہتے، کتنی عجیب بات ہے۔روز روز ایسی باتیں سن کر وہ تنگ آ گئی تھی اس لیے ہوسٹل چھوڑ کر کمال کے پاس آ گئی۔ایک روز بہت برہمی میں کہنے لگی، ''میں اس مصیبت کا کیا کروں؟ تم بھی ادھر توجہ نہیں دیتے ہو''۔کمال کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ بس اسٹینڈ پر ایک شخص کھڑا رہتا ہے، میں جیسے ہی بس میں بیٹھتی ہوں وہ بھی آ کر ارد گرد کسی نشست پر بیٹھ جاتا ہے۔وہ اتنی تیز خوشبو لگاتا ہے کہ میرے لیے وہاں بیٹھے رہنا مشکل ہو جاتا ہے''۔

''اپنی نشست بدل لیا کرو''۔

''نشست بدلتی ہوں تو وہ بھی ایسا ہی کرتا ہے۔اگر نزدیک کوئی نشست خالی نہ ہو تو پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔اوپر سے پوچھتا ہے، 'کیا مجھ سے ناراض ہو؟ یہ اچھی بات نہیں''۔

''وہ صرف تمہارے پاس ہی کیوں بیٹھتا ہے، کسی اور خاتون کے پاس کیوں نہیں جاتا؟ تم نے یہ مصیبت کیوں مول لی؟''

''وہ بس اسٹینڈ پر کھڑا تھا۔مجھ سے پوچھا، تم کون ہو؟ کہاں جا رہی ہو؟ میں بس پر سوار ہوئی تو وہ بھی اندر آ کر میری بغلی نشست پر بیٹھ گیا۔کنڈکٹر ٹکٹ دینے آیا تو اس شخص نے زبردستی میرا کرایہ بھی ادا کر دیا۔اگلے روز میں نے قرض اتارنے کے لیے اس کا کرایہ دے دیا۔پھر اس نے فضول باتیں شروع کر دیں''۔

''وہ شخص ہے کون؟''

''مجھے علم نہیں مگر اس نے بتایا تھا کہ کسی کمپنی میں اچھے عہدے پر ملازم ہے''۔

''کیا تم نے اسے اپنے شادی شدہ ہونے کا بتایا ہے؟''

''نہیں، نہ میں بتانا چاہتی ہوں۔پلیز، اسے کسی طرح وہاں سے بھگا دو''۔

''اس کا کرایہ دیتے وقت کیا تم نے مجھ سے پوچھا تھا؟ اب کیوں کہہ رہی ہو؟''

''مذاق نہیں کرو۔میرے ساتھ چلو، ورنہ میں نہیں جاؤں گی''۔

کمال اسکے ساتھ بس اسٹینڈ گیا۔ینا نے ایک پچاس سالہ شخص کی جانب اشارہ کیا۔وہ بھی انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ طے شدہ بات کے مطابق دونوں نے تین بسیں چھوڑ دیں، وہ بھی کسی پر سوار نہ ہوا۔چوتھی بس آئی تو وہ سوار ہو گئے۔وہ آدمی ان کے پیچھے تھا اور اندر آ کر ینا کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ینا وہاں سے اٹھ کر کمال کی بغلی نشست پر آ بیٹھی۔وہ آدمی اٹھ کر ان کے پاس آ کھڑا ہوا۔ایک جگہ پہنچ کر وہ بس سے اتر گیا، کمال بھی اتر کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔وہ شخص سڑک کے ساتھ تنگ گلی کے ایک چھوٹے سے مکان میں داخل ہو گیا۔کمال نے ارد گرد سے اس کے کوائف معلوم کر لیے۔اس کا نام اندر جیت داس تھا اور ایک چھوٹے سے چھاپہ خانہ میں بطور مینیجر ملازم تھا۔ساتھ والے کمرے میں اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ رہائش پذیر تھا۔اس کی بڑی بیٹی میٹرک کی طالبہ تھی۔

کمال اس کے پاس ملازمت کا امیدوار بن کر گیا مگر ایک گھنٹہ انتظار کرانے کے بعد اس شخص نے یہ کہتے ہوئے جواب دے دیا، ''ملازمت کہاں؟ یہاں باقاعدگی سے کام کرنے والوں کو روزگار نہیں ملتا، تم تو بالکل نئے ہو۔ایک مہینے کے بعد آنا، پھر میں دیکھوں گا''۔

کمال واپس آ کر اپنے دفتر چلا گیا۔شام کو اس نے ینا سے بات کی مگر وہ ماننے کو تیار نہ تھی۔اگلے روز وہ اسے ساتھ لے گیا۔بس اسٹینڈ پر وہی شخص پہلے سے موجود تھا۔کمال نے ینا کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود اس آدمی کے پاس جا کر بولا، ''مسٹر اندر جیت داس! کیا آپ پریس جا رہے ہیں؟''

''آپ؟''

''میرا نام کمال منڈل ہے اور میں یہاں ایڈیشنل ایس، پی ہوں''۔ مینا بھی اتنے میں ان کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ کمال نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''تم نے میری بیوی کو بتایا تھا کہ تم ایک کمپنی میں افسرِ اعلیٰ ہو۔ میں وہ کمپنی دیکھنے گیا تھا۔ اوہ! کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے؟''

اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ کمال بولا، ''امید ہے دوبارہ ملاقات کی نوبت نہیں آئے گی''۔

....

انٹرنیشنل سول ایوی ایشن آرگنائیزیشن 21 نومبر سے دو دسمبر، 1988 تک بنکاک میں سیمینار کا انعقاد کر رہی تھی۔ اپنے فرائضِ منصبی کے سبب کمال کا نام بھی وہاں بھیجا گیا تھا۔ اس نے دہلی میں متعلقہ افسر سے معلوم کرنا چاہا کہ اس کے چُنے جانے کا کتنا امکان ہے۔ اسے بتایا گیا کہ چار نام بھیجے گئے ہیں اور امید ہے کہ سب ہی منتخب ہو جائیں گے۔ اس نے سیمینار کے اخراجات کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ آنے جانے کے کرایے کے سوا باقی تمام اخراجات آرگنائیزیشن کی ذمہ داری ہے۔ پھر کمال نے ریاست کے متعلقہ ڈی، جی سے بات کی جس نے بڑے وثوق سے کہا کہ اگر مرکزی حکومت لکھے تو ریاستی حکومت بخوشی کرایہ ادا کرے گی۔ اب کمال کو اپنے بنکاک جانے کا یقین ہو گیا لہٰذا اس نے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔

ملک سے باہر جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ مینا بھی کبھی بیرونِ ملک نہیں گئی تھی چنانچہ اسے بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا۔ عام فضائی کمپنیوں کے کرائے زیادہ مگر تھائی ائیرویز کا کم تھا۔ کمال کو شتابی تھی کہ جلد از جلد مینا کو انتظامات کے بارے میں بتایا جائے۔ گھر جا کر اس نے اپنے اور مینا کے لیے رات کا کھانا تیار کیا اور پھر پنجاب نیشنل بنک کے پاس اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ کئی بسیں آئیں مگر مینا نہ پہنچی۔ بالآخر رات ساڑھے نو بجے وہ بس سے اتری اور مصروفیات کی کہانی سنائی جو متعدد بار کہے جانے کے سبب اب اسے متاثر نہ کرتی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگا۔ کجا مینا کو بنکاک سفر کا انکشاف کرنے کی بے تابی اور اب یہ کہ دل گرفتگی کے سبب اسے کوئی دلچسپی ہی نہ رہی۔ گھر پہنچ کر کھانا کھایا اور پھر خاموشی سے دونوں بستر پر لیٹ گئے۔

اگلی صبح جب مینا جانے کو تیار ہو رہی تھی، کمال نے سرسری طور پر بات کی، ''حکومت مجھے ایک تربیتی کورس کے لیے بنکاک بھیجنا چاہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں۔ کیا جانے کا ارادہ ہے؟''

اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا، ''کتنے دنوں کے لیے؟''

''دو ہفتوں کے لیے''۔

''اور اخراجات؟''

''سوائے کرائے کے، اور کوئی اخراجات نہیں''۔

''میں چھٹی لے لوں گی''۔

....

بورڈنگ کارڈ لینے اور دیگر کارروائیوں کو مکمل کرنے میں وقت نہ لگا کیونکہ امیگریشن اور کسٹم کے اہلکار اسے بخوبی جانتے تھے۔ وقتِ مقررہ پر جہاز نے اڑان بھری اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بلند ہو گیا کہ شہر چھوٹا نظر آنے لگا اور پھر جہاز بادلوں کی گود میں جا چھپا۔ کمال اس سے قبل انڈین ائیر لائنز پر سفر کر چکا تھا مگر تھائی جہاز ان سے بہتر تھا۔ اب اس کی نگاہ کھڑکی کے پار آسمانوں کی طرف تھی۔ سورج کی روشنی میں دمکتے ہوئے بادل روئی کی مانند ادھر ادھر تیر رہے تھے۔ مینا نے اس کا بازو چھوتے ہوئے پوچھا، ''ہم وہاں کب پہنچیں گے؟''

''شام تک''۔

''ٹھہرنا کہاں ہے؟''

''دیکھتے ہیں کہاں ٹھہرنا ہے''۔

پرواز جاری تھی۔ نیچے بکراں پانی، کمال سوچنے لگا یہ کون سا سمندر ہو سکتا ہے؟ خلیجِ بنگال ہے یا بحرِ ہند؟ لیکن نقشے سے دونوں کی حد بندی کا علم نہیں ہوتا۔ اسے حتمی طور پر علم نہیں تھا کہ خلیجِ بنگال بحرِ ہند کا حصہ ہے یا نہیں۔ ''خیر! میں معلوم کر ہی لوں گا''، اس نے سوچا۔

تھوڑی دیر کے بعد جہاز کے بنکاک ہوائی اڈے پر اترنے کا اعلان ہوا۔ نیچے اترنے پر ایک ایئر ہوسٹس کو دیکھا جو اس کے نام پلے کارڈ اٹھائے کھڑی تھی۔ اس نے پاس جا کر اپنا تعارف کرایا تو اس نے سفارت خانے سے رابطہ کرنے کو کہا۔ وہاں بات کرنے پر معلوم ہوا کہ آرگنائزیشن نے اس کے تاخیر سے پہنچنے کی بنا پر ہوٹل میں ٹھہرانے سے معذرت کی ہے لہٰذا اسے اپنے اخراجات پر کہیں ٹھہرنا ہوگا۔ کمال کے سر سے گویا بوجھ اتر گیا، کہنے لگا، ''بہت شکریہ! میں نے اپنے قیام کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو اپنا نام بتا دیجیے تاکہ کسی وقت ضرورت ہو تو میں آپ سے رابطہ کر سکوں''۔

''میرا نام سی، چیٹر جی ہے اور میں بھارتی سفیر کا پی، اے ہوں''۔

شکریہ ادا کرنے کے بعد ہوائی اڈے سے باہر نکلا تو مسٹر سیٹھ کو اپنا منتظر پایا۔ بکنگ کے وقت کمال کا تعارف تھائی ایئر لائنز کے مسٹر مہتا سے ہوا تھا جنہوں نے مسٹر سیٹھ سے تعارف کرایا تھا۔ انہوں نے کمال سے پوچھا، ''کوئی مسئلہ وغیرہ تو نہیں ہوا؟'' اسے اپنی اور سفارت خانے کی گفتگو کا بتانا پڑا۔

''فکر کی کوئی بات نہیں۔ آیئے! ہم چلتے ہیں''۔

کمال سن چکا تھا کہ بنکاک ایئر پورٹ بہت وسیع ہے مگر دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ اس کی وسعت سوچ سے بھی زیادہ تھی۔ تھائی لینڈ کی نسبت بھارت بہت بڑا اور وسیع و عریض ملک ہونے کے باوجود وہاں کا کوئی ہوائی اڈا بھی بنکاک ہوائی اڈے کے مقابل نہیں تھا۔ کار میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو صاف ستھری سڑکیں نظر آئیں، گرد کا نام و نشان نہ تھا، سڑک کے دونوں طرف فلک بوس عمارات تھیں۔ کمال نے سنا تھا کہ امریکہ کے مضافاتی علاقے، سنگاپور اور ہانگ کانگ بہت خوبصورت اور صاف ہیں۔ بنکاک بھی مقابلتاً بہتر اور روشنیوں سے منور تھا۔ ہندوستان میں نئی دہلی اور بنگلور باقی شہروں کی نسبت اچھے تھے، کلکتہ غالباً دنیا کا سب سے گندا شہر تھا۔

گاڑی کی رفتار ایک مقام پر کم ہوگئی۔ مسٹر سیٹھ نے تیس منزلہ ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اشوک ٹاور ہے جہاں انٹرنیشنل ایوی ایشن آرگنائزیشن کا دفتر ہے اور یہیں پر افسروں کی تربیت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کار آگے روانہ ہوئی اور تقریباً دس منٹ کے بعد ایک کثیر المنزلہ عمارت کے سامنے رک گئی۔ مسٹر سیٹھ نے بتایا کہ یہ ان کا دفتر ہے جس کی چوتھی منزل پر مہمان خانہ ہے۔ پھر وہ لفٹ کے ذریعے اوپر گئے۔ دو خواتین نے ان کا استقبال کیا۔ ایک کی عمر پینتیس چھتیس سال اور دوسری کوئی سترہ برس کی تھی۔ مسٹر سیٹھ نے انہیں بتایا کہ یہ میرے مہمان ہیں اور یہیں قیام کریں گے، اور کمال کو مخاطب کر کے کہا، ''پلیز! آپ آرام کیجیے، جس چیز کی ضرورت ہو، انہیں بتا دیں۔ کھانا وغیرہ بھی یہی پکایا کریں گی''۔

مہمان خانہ اگرچہ بہت نفیس نہیں تھا مگر گزارے لائق ضرور تھا۔ بینا واش روم چلی گئی۔ کم عمر ملازمہ نے اندر آکر ہندی آمیز نیپالی زبان میں کمال سے رات کے کھانے کا پوچھا۔ اسے چونکہ تھوڑی بہت نیپالی آتی تھی اس لیے ٹوٹی پھوٹی زبان میں اس سے بات چیت شروع کر دی جس سے معلوم ہوا کہ اس کا تعلق برما سے ہے۔ دوسری عورت اس کی خالہ تھی۔ برما میں ملکی

حالات اور امن و امان کی بگڑتی صورتِ حال کی وجہ سے وہ بغیر ویزہ اور پاسپورٹ سرحد عبور کر کے تھائی لینڈ میں داخل ہوئی تھیں۔ پہلے انہوں نے کسی ہوٹل میں ملازمت کی بعد ازاں مسٹر سیٹھ انہیں اپنے گیسٹ ہاؤس لے آئے۔ برما کے حالات زیادہ خراب ہوئے تو کئی اور لوگ بھی یہاں آ گئے جو ساتھ والے کمرے میں مقیم تھے۔ اس لڑکی کا نام پاروتی اور خالہ کا نام سواتی تھا۔

مینا کے واش روم سے آنے کے بعد کمال نے اس سے رات کے کھانے کا پوچھ کر پاروتی کو چاول اور سبزی پکانے کو کہا۔ لاؤنج میں آ کر بیٹھے تو وہاں میز پر اخبار رکھا ہوا تھا۔ کمال نے قیمت دیکھی، دس بھات، یعنی بھارتی سکہ میں چھ سات روپے جبکہ وہاں ڈیڑھ روپے کا ملتا ہے، مگر یہ اخبار ضخامت میں زیادہ اور رنگین صفحات پر مشتمل تھا۔ پہلے صفحہ پر تھائی لینڈ کے بادشاہ کا بیان تھا۔ یہاں اگرچہ انتخابات ہوتے اور پارلیمنٹ کے لیے اراکین کا چناؤ بھی ہوتا، باایں ہمہ بادشاہت بھی موجود تھی۔ اشتہارات پر نظر پڑی تو جا بجا مالش (massage) مراکز کے اشتہار تھے مگر کمال کے لیے ان میں دلبستگی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد کمرے میں واپس آ کر کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گئے۔

اگلی صبح کمال اشوک ٹاور جانے کی تیاری میں لگ گیا اور پھر ناشتہ کرنے کے بعد مینا سے کہا کہ وہ جلد ہی واپس آنے کی کوشش کرے گا۔ مہمان خانہ سے باہر آ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا، ٹیکسی اسٹینڈ نظر نہ آیا۔ بس اسٹینڈ پر بسیں آ جا رہی تھیں لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اشوک ٹاور کس نمبر کی بس جائے گی۔ دو چار سے پوچھا مگر کوئی جواب نہ دے سکا۔ مسئلہ زبان نافہمی۔ ایک پولیس والے سے پوچھا جو اسے ٹیکسی اسٹینڈ لے آیا۔ ٹیکسی ڈرائیور سے ایوی ایشن آرگنائزیشن کا کہا تو وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ دیکھنے لگا لیکن جب کمال نے اشوک ٹاور کا نام لیا تو وہ مسکرا اٹھا، گویا آرگنائزیشن کی بجائے ٹاور جانا پہچانا نام تھا۔ کرایہ پوچھا تو ڈرائیور نے ہاتھ کی انگلیوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور پھر منگولین لہجے میں بتایا؛ ''ساٹھ بھات''۔ کمال سوار ہو گیا۔ دس منٹ بعد وہ منزل پر پہنچ گیا۔ یہاں اس نے بس نمبر سات اور 125 دیکھیں جنہیں وہ مہمان خانے کے سامنے صبح دیکھ چکا تھا۔

آرگنائزیشن کے دفتر میں آنے کے بعد وہ سیمینار ہال داخل ہوا۔ دس بجنے میں بیس منٹ تھے اس لیے ابھی تک باقی شرکا نہیں پہنچے تھے۔ میزوں پر سب کے ناموں کی چھوٹی چھوٹی تختیاں رکھی تھیں، وہ اپنا نام دیکھ کر مقررہ جگہ پر بیٹھ گیا۔

ایک ایک کر کے لوگ آنا شروع ہوئے۔ سیمینار میں جنوب مشرقی ایشیا کے نمائندگی ہو رہی تھی۔ ٹھیک دس بجے سیمینار کا افتتاح ہوا۔ اپنے موضوع پر ماہر سمجھا جانے والا ایک امریکی حفاظتی اقدامات کے بارے میں بتانے لگا۔ کوئی نئی بات نہیں تھی، وہی گھسی پٹی باتیں جو پہلے ہی سب کے علم میں تھیں۔ اس کے بعد شرکا کی رجسٹریشن کا عمل شروع ہوا۔ کمال کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ کوئی بھارتی منتظم وہاں موجود نہ تھا حالانکہ آرگنائزیشن کا اس وقت سربراہ ایک بھارتی تھا۔ بنکاک دفتر کا انچارج پاکستانی سلمان صدیق تھا۔

تصاویر لینے کے بعد تقاریر دوبارہ شروع ہوئیں۔ کمال کو سردی محسوس ہونے لگی۔ بنکاک میں موسم معتدل ہونے کے باعث وہ گرم کپڑے وغیرہ نہیں لایا تھا لیکن کمرے کا درجۂ حرارت یقیناً امریکی اور برطانوی ماہرین کی سہولت کے مدِ نظر کم رکھا گیا تھا۔ دیگر شرکا نے سوٹ پہن رکھے تھے اس لیے انہیں ٹھنڈک کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ وقفے کے دوران اس نے چند ایک شرکا سے ان کے ممالک میں رائج حفاظتی انتظامات پر بات کی۔ پاکستان کے مندوب نے بتایا کہ ان کے ہاں حفاظتی امور پر مشتمل پورا عملہ ائیر پورٹ سیکورٹی فورس کے ماتحت ہے جس کی ذمہ داری صرف ہوائی اڈوں کا تحفظ ہے، پولیس فرائض ان کی ذمہ داری نہیں۔ چند ریٹائرڈ فوجیوں کو بھی ملازمت میں رکھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس بھارت میں یہ سارے فرائض پولیس کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔

دن کے اختتام پر کمال بس اسٹینڈ پر آیا اور بس نمبر سات پر سوار ہو گیا۔ کنڈکٹر کو علاقے کا بتا کر کرایہ دینے کے لیے

اپنی ہتھیلی پر چند سکے رکھے۔اس نے مسکرا کر پانچ بھات اٹھا لیے۔ چند منٹ کے بعد کمال اپنی منزل پر اتر گیا لیکن مہمان خانے کی بجائے دوسرے راستے پر چل پڑا۔ جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو جانے پر واپس پلٹا اور اس بار ریسٹ ہاؤس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ مینا اس کی منتظر تھی۔اس نے بتایا کہ آج وہ سارا دن آرام کرتی رہی ہے۔کمال نے اپنا تجربہ بیان کیا کہ یہاں لوگ انگریزی، بنگالی یا ہندی زبانوں سے کم کم آشنا ہیں، اور یہ کہ اس نے سفر کے لیے بسوں کے نمبر دیکھ لیے تھے۔اس نے مزید بتایا کہ یہاں ایک ہندوستانی مارکیٹ کے بارے میں سنا ہے،''ہم کل وہاں جائیں گے۔آج ویسے ہی ارد گرد کا چھوٹا موٹا چکر لگا لیتے ہیں،'' لیکن مینا نے آج مکمل آرام کرنے کی تجویز دی۔

....

دوسرے روز تمام شرکا کو بتایا گیا کہ ہفتہ کو تعطیل کے سبب انتظامیہ نے سیر کا ایک پروگرام ترتیب دیا ہے۔وہ یہ کہ اس روز یہاں سے بذریعہ بس پٹایا (Pattaya) کی بندرگاہ تک اور وہاں سے کشتی پر جزیرہ جائیں گے۔اگر آپ لوگ چاہیں تو شیشے کے فرش والی کشتی بھی لی جا سکتی ہے جہاں سے زیرِ آب جانوروں کو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔اس سیر کے لیے خواہشمند حضرات کو دو دو سو بھات جمع کرانے ہوں گے۔اتوار کا دن وہ اپنی مرضی سے گزارنے کے لیے آزاد ہیں۔

کمال نے اسی وقت جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مینا کو ساتھ لیے وہ ساڑھے آٹھ بجے اشوک ٹاور پہنچ گئے۔ چند ایک شرکا پہلے سے موجود تھے۔جلد ہی سبھی لوگ پہنچ گئے۔کمال اور مینا بس کی اگلی نشستوں پر جا بیٹھے۔شہر سے گزرنے کے بعد بس ایک نواحی علاقے میں داخل ہو گئی۔ ہر طرف ہریالی اور درخت دکھائی دے رہے تھے۔تقریباً دو بجے وہ پٹایا جا پہنچے۔انتظامیہ کے رکن نے اعلان کیا کہ شام چھ بجے تک وہ جہاں چاہیں، گھوم پھر سکتے ہیں کیونکہ چھ بجے بس واپس روانہ ہو گی، تاہم اس نے مقامی لڑکیوں سے اختلاط پر تنبیہ کی مبادا AIDS ہو جائے۔

کمال لفظ AIDS کا مطلب نہ سمجھ سکا۔جب اس نے وضاحت کے لیے کہا تو تمام لوگ ہنسنے لگے۔مینا نے سرگوشی میں اس کا مطلب بتایا۔بس سے اترنے کے بعد وہ دونوں اور تین دوسرے بھارتی اکٹھے کھڑے ہو گئے، باقی لوگ ادھر ادھر چلے گئے۔یہ پانچوں ساحلِ سمندر پر آئے جہاں کرسیاں وغیرہ رکھی تھیں۔سیاحوں میں زیادہ تعداد نیکر پہنے غیر ملکی یا تو ساحلی ریت پر دراز تھے یا موٹر بوٹ سے محظوظ ہو رہے تھے۔کم و بیش ہر ایک کے ساتھ مقامی لڑکی بھی تھی جو اپنے ہمراہی کے ساتھ بوس و کنار یا اسے مساج کرنے میں مصروف تھی۔کمال اور مینا کرسیوں پر بیٹھ گئے، وہ کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے آیا۔مینا نے استفسار کیا کہ کانچ کے فرش کی کشتی پر سفر کب ہو گا کیونکہ وہ آبی جانوروں کو دیکھنے کی بہت شائق تھی۔کمال خود بھی یہ منظر دیکھنے کا متمنی تھا اس لیے اس نے دوسرے شرکا سے بات کی۔سبھی تیار ہو گئے۔لیکن اس کے لیے انہیں پہلے اسٹیمر کے ذریعے جزیرے پر جانا پڑا۔یہ سفر سب کے لیے لطف اندوز تھا۔اتر کر کچھ کھایا پیا، چند ایک دکانیں دیکھیں اور پھر سیمینار میں شریک ایک ہندوستانی الوک شرما کشتی کا بندوبست کرنے چلا گیا۔سودے بازی کے بعد اس نے ڈیڑھ سو بھات پر ایک کشتی کرایے پر حاصل کر لی۔سفر واقعی شاندار تھا۔بل کھاتے ہوئے سمندری سانپ، مونگے کی چٹانیں اور رنگ برنگی مچھلیاں ان کے قدموں تلے تیرتی پھر رہی تھیں، لیکن کچھوے یا شارک مچھلیاں دکھائی نہ دیں۔

کمال سوچنے لگا کہ ہندوستان میں بھی متعدد ایسے مقامات ہیں جنہیں سیاحوں کے لیے پرکشش بنایا جا سکتا ہے لیکن جیسے ہی اس کے ذہن میں ساحلِ سمندر کے مناظر تازہ ہوئے، اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ بھارت آنے والے سیاح کس چیز میں زیادہ دلچسپی لیں گے، ساحلوں اور کشتیوں کی سیر میں یا نسوانی جسموں میں؟ پٹایا کی سیر سے لطف اٹھانے کے بعد وہ واپس مذکورہ ساحل پر پہنچے۔واپسی میں ابھی تقریباً تین گھنٹے باقی تھے اس لیے وہ ایک قریبی جنگل میں قدرت کی نیرنگیاں اور حسن

دیکھنے چلے گئے۔ ساڑھے پانچ بجے واپس لوٹے اور چند منٹ بعد بس میں سوار ہو گئے۔ بس کے پاس کمال نے ایک یورپین کو دیکھا جو کم سن مقامی لڑکی سے بوس و کنار میں مشغول تھا۔ غالباً اس میں لڑکی کی رضا نہیں تھی کیونکہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ یورپین نے پھر اسے چند بھات دیئے اور خود ٹیکسی میں سوار وہاں سے چلا گیا۔ لڑکی وہیں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

بس سے اترتے ہوئے شرکا نے کنڈکٹر سے اگلے روز بنکاک کی سیر کے لیے پیسے طے کر کے دو سو بھات فی کس کے حساب سے رقم اس کے حوالے کی۔ مہمان خانے واپس آئے تو بینا نے کمال کو یاد دلایا کہ کل رات تو ہندوستانی سفیر نے انہیں کھانے پر مدعو کیا ہوا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ عشائیہ کے لیے وہ بس سے اتر کر وہیں سے چلے جائیں گے۔ ہاتھ منہ دھو کر وہ بستر پر لیٹ گئے۔

....

اگلے دن وہ اشوک ٹاور سے صبح بس پر سوار ہوئے۔ ان کی پہلی منزل بدھوں کی عبادت گاہ سن وات (Sun Wat) مندر تھی۔ کمال کو بدھ مت تاریخ کا علم تھا۔ مہاتما بدھ نے بنگال کے نزدیک جنم لیا تھا۔ بدھ مت کا آغاز ہندوستان میں ہوا جہاں سے یہ برما، تھائی لینڈ، چین اور جاپان تک پھیل گیا۔ بعد ازاں برہمن ازم نے اسے ہندوستان سے بے دخل کر کے اس کی باقیات کو اپنے اندر ضم کر لیا۔ نتیجتاً، اب یہ دھرم اپنی ہی جنم بھومی میں انتہائی اقلیت میں جبکہ جنوب مشرقی ممالک میں روز افزوں پھیل رہا ہے۔

گائیڈ نے انہیں سونے سے بنے گنبد دکھائے۔ اندر دیواروں پر پُورانوں کی تصویر کشی کے علاوہ رامائن اور مہابھارت داستانوں کو بھی تصاویر میں اجاگر کیا گیا ہے۔ کمال نے بہت سی تصویریں اتاریں۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے دیگر مقامات دیکھے۔ ایک جگہ ثقافتی منظر نگاری کے لیے شادی کی تقریب اور رسموں کو دکھایا جا رہا تھا۔ کمال سوچنے لگا کہ ایسے مناظر ہندوستان میں بھی دکھائے جا سکتے ہیں تاکہ سیاحوں کو مقامی ثقافت سے آگاہی ہو۔

سیر سے فارغ ہو کر دونوں سیدھا سفیر کی رہائش گاہ پہنچے جہاں دیگر افراد بھی جمع تھے۔ رات گیارہ بجے کھانے سے فارغ ہو کر وہ تھکے ماندے واپس کمرے میں آ کر سو گئے۔

....

سیکرٹری خزانہ نے کمال کی طرف سے دی گئی ایک سو پچاس اسامیوں کی درخواست قبول کر لی تھی جس کا خط اسے آج موصول ہوا۔ اتنے میں اس کے اردلی نے آ کر بتایا کہ گاؤں سے ایک مرد اور دو عورتیں اسے ملنے آئے ہیں۔ انہیں اندر بلایا گیا۔ مرد تو ان کا ہمسایہ نور محمد تھا اور عورتیں اس کے بڑے بھائی کی بیوی بھادو بو، اور دوسری عورت، فتی، اس کے بڑے بھائی ریاض کی بیوہ تھی۔ بیوگی کے وقت اس کی عمر اٹھارہ بیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اگرچہ مسلمانوں میں بیوہ کی شادی پر کوئی قدغن نہیں اور اس کے لیے چند ایک رشتے بھی آئے مگر نیک بخت نے اپنے مرحوم شوہر کے گھر زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ اپنی اولاد نہ ہونے کے سبب وہ دوسروں کے بچوں کو بہت پیار کرتی جن میں کمال بھی شامل تھا۔

گاؤں میں ہر شخص کی دوسروں سے قرابت داری اور رشتہ داری تھی جس کا سبھی احترام کرتے۔ فتی عزت سے خادم کو ماموں کہہ کر بلاتی تھی، اس لحاظ سے کمال اس کا ماموں زاد ٹھہرا۔ وہ کمال کو اس کے نام سے پکارتی جبکہ وہ ''بوبو'' کہہ کر بلاتا، جس کا مطلب ہے، بڑی بہن۔ مسلم گھرانوں میں بڑی بہن کو بوبو کہتے تھے، بالکل اسی طرح جیسے ہندو اپنی بڑی بہن کو 'دیدی' کہتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر کمال نے کھڑے ہو کر پوچھا، 'فتی بوبو! خیریت تو ہے؟''

''تمہاری بھادو بوبو بہت بیمار ہے۔ اسے سینے میں شدید تکلیف ہے۔ اسے براہی اور بھوبن پور اسپتالوں میں لے

گئے تھے، وہ کہتے ہیں کہ اسے یہاں کے اسپتال میں دکھایا جائے۔ہم یہاں کسی کونہیں جانتے۔میں نے مامی سے پوچھا تھالیکن اسے تمہارے گھر کا پتہ نہیں تھا، للہٰذا ہم دفتر چلے آئے۔مہربانی سے اس کے علاج دارو کا کچھ کرو نہیں تو یہ مرجائے گی''۔

کمال کے لیے فکرمندی کا لمحہ تھا۔ایک طرف تو ان کے ساتھ قریبی تعلقات اور اگر انہیں گھر لے جاتا تو بینا کو گوارا نہ ہوتا۔شادی سے پہلے اگر چہ اس نے سارے رشتہ داروں اور تعلقداروں کے ساتھ حسنِ سلوک کا وعدہ کیا تھا،لیکن تا حال وہ اسے ثابت نہ کر سکی تھی، بلکہ الٹ ہی ہوا تھا۔اس نے تو کمال کے گھر والوں سے بھی منہ موٹا کیا تھا۔سسرالی رشتہ داروں کو اس نے کبھی خوش دلی سے قبول نہیں کیا،اس صورتِ حال میں اگر کوئی رہنے کے لیے آجائے تو بینا کا سیخ پا ہونا یقینی تھا۔

کمال نے گھنٹی بجا کر اردلی کو بلایا اور اسے کھانے پینے کے لیے کچھ لانے کو کہا۔کھا پی کر فارغ ہوئے تو انہیں لے کر اسپتال چلا گیا۔ڈاکٹر سے ملاقات کی جس نے ڈاکٹر پکراشی سے ملنے کو کہا۔اس نے ساری بات سننے کے بعد انہیں اگلے روز بلایا۔کمال نے پوچھا،''کیا آج ممکن نہیں؟ یہ لوگ بڑی دور سے آئے ہیں''۔

''مسٹر منڈل!اسپتال میں داخلہ کے لیے OPD یا ایمرجنسی وارڈ کی طرف سے مریض کو بھیجا جاتا ہے۔اس کی حالت ایمرجنسی وارڈ میں لے جانے کی نہیں ہے،رہ گئی OPD، تو وہ صبح کے وقت کھلتی ہے۔اب بتائیں میں کس طرح آپ کی سیوا کر سکتا ہوں؟''

''ٹھیک ہے، میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔ہم کل صبح آجائیں گے''۔

کمال گویا تلوار کی دھار پر تھا۔بینا کی اس کے رشتہ داروں سے نفرت کے مدِ نظر مہمانوں کو گھر لے جانے کے تصور سے وہ ازحد پریشان تھا،لیکن وہ اتنے قریبی مہمان تھے کہ انہیں کسی ہوٹل میں بھیجنا بھی بعید از قیاس تھا۔بہر حال وہ انہیں اس طرح اپنے گھر لایا جیسے کوئی مجرم ارتکاب جرم کر بیٹھا ہو۔گھر آکر کمال نے انہیں کمرہ اور غسل خانہ دکھایا۔باورچی چھٹی کر گیا تھا، لہٰذا کمال کو خود ہی ان کے لیے کھانا پکانا پڑا۔کھانا کھانے کے بعد اس نے انہیں آرام کرنے کو کہا۔فتی نے بینا کا پوچھا تو کمال نے کہا کہ دیر ہوگئی ہے،اس وقت جا کر آرام کریں۔فتی کا اصرار تھا کہ ہم بینا کے گھر آئے ہیں،تھوڑی دیر گپ شپ کریں گے۔تاہم وہ انہیں آرام کا مشورہ دیتا رہا کہ اتنا لمبا سفر کرنے سے تھکن ہوگئی ہوگی، باتیں تو صبح بھی ہو سکتی ہیں۔لیکن وہ نہ مانے،للہٰذا اسے مجبوراً بینا کو لانے کے لیے انسٹیٹیوٹ جانا پڑا۔

بس اسٹاپ پر پہنچ کر وہ بوجھل دل سے بینا کا انتظار کرنے لگا۔اس نے بیوی کے ساتھ کبھی کوئی بدسلوکی نہیں کی تھی بلکہ ایک اچھے خاوند کی مانند اس کا خیال ہی رکھا تھا، بایں ہمہ، وہ پریشان رہتا۔اس نے شادی سے پہلے ہی اپنے خاندان اور ہمسایوں کے بارے میں بتا دیا ہوا تھا اور یہ بھی کہ وہ ان سے اپنے تعلقات منقطع نہیں کرے گا۔اتنے میں بس رکی، بینا نیچے اتری اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔اس نے اپنے مہمانوں کی آمد کا بتانا چاہا مگر ایک ساتھی کے ساتھ جھگڑے کی وجہ سے بینا کی توجہ ادھر نہیں تھی۔

گھر پہنچے تو بینا کی نظر دروازے کے باہر پڑے جوتوں پر گئی تو طیش سے بولی،''کون آیا ہے ہمارے گھر؟'' کمال نے اس سے دھیرے بولنے کی درخواست کی مبادا وہ لوگ سن لیں۔

''سنتے ہیں تو سن لیں ورنہ یہ لوگ تو مجھے چھوڑیں گے نہیں''۔

اسی اثنا میں دوسرے کمرے سے فتی باہر آگئی،''بھابھی آئی ہیں''۔

بینا نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اپنے انداز سے اسے جتا دیا کہ اس کے پاس باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔جب وہ اپنے کمرے میں گئی تو کمال نے اس سے پھر درخواست کی کہ ان کی خیریت پوچھ لو، وہ خوش ہو جائیں گی۔

''انہیں خوش کرنا میرا کام نہیں''۔

''میرا ان سے بڑا قریبی تعلق ہے''۔

''مجھے کوئی پروا نہیں''۔

کمال مہمانوں کے پاس آیا اور عذر کیا کہ بینا سارے دن کی تھکی ماندی آئی ہے اس لیے صبح گپ شپ ہوگی۔ انہوں نے صورتِ حال کا اندازہ لگایا یا نہیں لیکن کمرے میں چلی گئیں۔ پھر کمال بینا کے پاس آ کر بولا کہ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں، آکے کھانا کھالو۔

''میں نے کینٹین سے کھالیا تھا، اب بھوک نہیں ہے۔ تم جا کر کھالو''۔

''کیا میں نے گھر میں تمہارے بغیر کبھی کھانا کھایا ہے؟''

''اپنے جذبات کا اظہار مت کرو۔ میں جانتی ہوں میرے متعلق تمہارے جذبات کیا ہیں''۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

''اگر تمہیں میرا خیال ہوتا تو ان بدتہذیبوں کو میرے گھر نہ لے کر آتے۔ میں نے سارا گھر صاف کیا ہے، یہ لوگ الٹ پلٹ کر کے رکھ دیں گے۔ میں کسی اصطبل میں نہیں رہ سکتی۔ ہاں! تم رہ سکتے ہو''۔

کمال چپ رہا۔ یہ درست تھا کہ وہ لوگ مہذب، صاف ستھرے اور رکھ رکھاؤ والے نہیں تھے، لیکن اس میں ان کی اپنی خطا کیا تھی۔ ان کی پرورش اور تربیت بینا کی مانند نہیں ہوئی تھی، لیکن رشتہ داری کی وجہ سے ان کی مدد کرنا اس کا فرض تھا۔ کھانا کھائے بغیر وہ دل گرفتگی کے عالم میں بستر پر جالیٹا۔ وہاں بھی اس نے بینا کو سمجھانے کی کوشش کی، ''وہ صاف ستھری زندگی کے عادی نہیں''۔

''تم ان کا خیال کرو، میرا نہیں''۔

''بینا! میں بھی انہی میں سے ایک ہوں۔ انہوں نے میری پرورش کی ہے۔ آج اگر میرے ماں باپ کو کچھ ہو جائے تو یہی لوگ مجھے سنبھالا دیں گے۔ مجھے بھی ان کا خیال رکھنا ہوگا۔ میں انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا''۔

''ان کا خیال رکھو۔ میرے پاس مت آنا''۔

''ٹھیک ہے، اگر تم ان لوگوں کو دھتکارتی رہوگی تو ہمارے تعلقات میں گرمجوشی اور مضبوطی نہیں ہوسکتی''۔

بینا خاموش ہوگئی۔ شب بھر ان میں کوئی بات نہ ہوئی۔ صبح اٹھ کر وہ تیار ہوئی اور انسٹیٹیوٹ چلی گئی۔ کمال نے مہمانوں کے لیے ناشتہ تیار کیا اور بعد ازاں انہیں لے کر اسپتال کا رخ کیا۔ ڈاکٹر پرکاشی نے معائنہ کے بعد چند دوائیں تجویز کیں اور انہیں دو ہفتے بعد پھر آنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے وہیں سے واپس جانے کو ترجیح دی۔ کمال نے انہیں اسٹیشن پر اتارا اور خود دفتر چلا گیا۔

....

کمال بنگالی زبان کی تاریخ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے کلکتہ یونیورسٹی میں ایم اے امتحان کے لیے درخواست دی ہوئی تھی۔ بی، ایس سی (آنرز) میں اس کا مضمون کیمیا تھا۔ بعد ازاں مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے پولیس سروس میں ملازم ہوگیا۔ اس امتحان میں اس کے مضامین تاریخ اور بنگالی ادب تھے۔ ان دونوں مضامین کے مطالعہ سے وہ اپنی ذات، اپنے لوگوں اور دھرتی کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہوگیا۔ ملازمت ملنے کے بعد بھی اس نے ان کا مطالعہ جاری رکھا جس نے اس کے دل میں اپنے وطن، ہم وطنوں اور بنگالی زبان پر تحقیق کرنے کی تحریک اور جذبہ پیدا کیا، اس مقصد کے لیے وہ ایم اے کرنے

کا خواہاں تھا۔ بیکلنتھ پور میں تعیناتی کے دوران اس نے اسپیشل بی، اے کر لیا تھا اور اب ایم اے کرنے کی خواہش تھی۔ لسانیات کے پرچے کے لیے بنگالی زبان کی تاریخ کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ وہ زبان کی ترقی اور نشوونما کے مختلف مراحل سمجھنا چاہتا تھا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے رسیور اٹھایا، دوسری طرف سے بولنے والے نے کہا،

''گڈ مارننگ سر! میں اینٹی ہائی جیکنگ کنٹرول (Anti-hijacking control) سے بات کر رہا ہوں''۔

''کیا ہوا؟''

''ہوائی اڈے پر گڑبڑ ہو گئی ہے''۔

''کیسی گڑبڑ؟''

''مزدوروں اور خاکروبوں نے اڈے کا گھیراؤ کیا ہوا ہے''۔

''کیوں؟''

''وہ کہتے ہیں کہ آپ کے محافظ نے ان کے لوگوں پر حملہ کیا ہے، اس لیے وہ معافی کا مطالبہ کر رہے ہیں''۔

''یہ کب کی بات ہے؟''

''سر! ان کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ آپ کی موجودگی میں ہوا تھا''۔

کمال یاد کرنے لگا کہ واقعہ کیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ انٹیلیجنس کی اطلاع کے مطابق انتہا پسند ہوائی اڈے پر حملہ اور مسافروں کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر مرکزی حکومت نے تمام ہوائی اڈوں پر ریڈ الرٹ کا اعلان کر دیا جس کے تحت مختلف احتیاطی اور حفاظتی انتظامات کئے گئے۔ تمام متعلقہ محکموں کو ہدایات بھی جاری ہو گئیں مگر ایئر پورٹ اتھارٹی اور انڈین ایئر لائنز کے لوگ حیل و حجت کرنے لگے۔ وہ لوگ شناختی کارڈ دکھائے بغیر ہوائی اڈے کے اندر داخل ہونا چاہتے تھے لیکن ہدایات کے مطابق انہیں اجازت نہ دی گئی۔ یہ اطلاع ملنے کے بعد کمال خود ہوائی اڈے پر پہنچا تھا۔ مقامی مسافروں کی آمد کے خروج گیٹ (exit gate) کے باہر اس نے ایک شخص کو دیکھا جس نے ایئر پورٹ اتھارٹی کے سٹاف کی سی یونیفارم پہنی ہوئی تھی اور وہ اس گیٹ سے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہی کو شناختی کارڈ دکھانے کی بجائے وہ بحث میں الجھا ہوا تھا۔ کمال نے گیٹ پر جا کر پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ سپاہی نے ساری بات بتائی۔ کمال نے اس شخص سے پوچھا کہ وہ کس جگہ کام کرتا ہے؟ اس نے ایئر پورٹ اتھارٹی کا بتایا۔ کمال نے بھی اس سے اپنا شناختی کارڈ دکھانے کو کہا مگر اس نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا،

''میں کئی برسوں سے یہاں کام کر رہا ہوں، کبھی کسی نے شناختی کارڈ نہیں مانگا۔ آج میں اپنا کارڈ دکھاؤں؟ یہ ہمارا اپنا ہوائی اڈا ہے، میں ایسے ہی اندر جاؤں گا، کیا آپ مجھے روک سکتے ہیں؟''

جب اس نے زبردستی اندر جانے کی کوشش کی تو سپاہیوں نے اسے باہر دھکیل دیا۔ کیا اب اس کو حملہ کہا جا رہا ہے؟

کمال ہوائی اڈے پہنچا۔ ایئر پورٹ ڈائریکٹر نے اسے بتایا کہ متعلقہ شخص کے بیان کے مطابق اس نے اپنا کارڈ دکھایا تھا مگر گیٹ پر کھڑے سپاہی نے چھین لیا اور اسے اندر جانے کی اجازت بھی نہ دی، اس پر سب لوگ احتجاج کر رہے ہیں۔ ڈائریکٹر نے کمال سے صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے خود موقع پر پہنچنے کی درخواست کی۔ وہ جانے کے لیے اٹھا مگر ایک انسپکٹر نے اس سے نہ جانے کی درخواست کی مبادا وہاں اس کے ساتھ بدتمیزی کی جائے۔ وجہ پوچھنے پر اس نے کہا،'' آپ نے ایئر لائنز کے لوگوں کو چوری کرتے ہوئے پکڑا، ڈیوٹی فری شاپ سے بلیک مارکیٹنگ ختم کی اور رشوت خوری کو کم کیا، ان اقدامات کی وجہ سے سب لوگ پاگل کتوں کی مانند ہو چکے ہیں''۔

''لیکن ہمارا ایک سپاہی بھی تو شراب کی بوتلوں کے ساتھ پکڑا گیا تھا''۔

''سر! ہمارے سپاہی بے وقوف ہیں، پکڑے وہ جاتے ہیں حالانکہ اصل لوگ کوئی اور ہیں۔ وہی لوگ اک معمولی سی بات پر ہنگامہ آرائی کروا رہے ہیں''۔

انسپکٹر کی باتوں میں معقولیت تھی لیکن چونکہ کمال ڈائریکٹر سے خود پہنچنے کا وعدہ کر چکا تھا اس لیے سمجھتا تھا کہ اسے لازمی جانا چاہیے۔ انسپکٹر نے اس کا ارادہ دیکھ کر مشورہ دیا کہ اکیلا جانے کی بجائے کچھ سپاہیوں کو ساتھ لے جانا مناسب ہوگا۔ کمال نے مان لیا۔ دس سپاہیوں کے ہمراہ وہ اندرون ملک پروازوں کے ٹرمینل کی طرف بڑھا۔ شورش پسند اسے دیکھ کر نعرہ زن ہو گئے، ''بندے ماترم! بندے ماترم! ظلم بند کرو! پولیس کے ہاتھ توڑ دو، کچل دو! اتھارٹی کے لوگوں کو کیوں مارا گیا؟ پولیس جواب دے! منڈل واپس جاؤ''۔ چند لمحے خاموشی کے بعد پھر آوازیں بلند ہوئیں، ''پہیہ جام ہڑتال، کوئی پرواز نہیں جائے گی، ہمارے ہوائی اڈے پر نوکری اور ہمیں پر افسری! یہ بیکنٹھ پور نہیں ہے۔ اس افسر کو تو وہاں سے بھی نکالا گیا تھا۔ اسے ہم سے معافی مانگنا ہوگی، اپنی بادشاہت سمجھنے والے کو خمیازہ بھگتنا پڑے گا''۔

کمال نے خود پر قابو پاتے ہوئے ہڑتالیوں سے کہا، ''تمہارے ائیر پورٹ ڈائریکٹر کے بلانے پر میں یہاں آیا ہوں، مجھے رستہ دو''۔

ان کے انکار کرنے پر کمال نے واپس جانا چاہا مگر انہوں نے واپسی کا راستہ بھی بند کر دیا گیا۔ وجہ پوچھنے پر کہا کہ جب تک وہ معافی نہیں مانگے گا، واپس نہیں جا سکے گا۔

''معافی کس سے؟''

''ہم سے''۔ اور ساتھ ہی نعرہ بازی شروع کر دی۔ کمال چند لمحے چپ رہا، پھر ان سے راستہ صاف کرنے کو کہا۔

''اگر ہم راستہ نہ دیں تو کیا کر لو گے؟''

''راستہ تو صاف ہو ہی جائے گا''۔

''کر سکتے ہو تو کر لو، یہ بیکنٹھ پور نہیں ہے''۔

''میں تم لوگوں کو صرف دو منٹ دیتا ہوں۔ اگر راستہ صاف نہ ہوا تو طاقت استعمال کرنا پڑے گی''۔

ہڑتالیوں پر اس تنبیہ کا چنداں اثر نہ ہوا بلکہ الٹا نعروں کا شور بلند ہونے لگا اور ساتھ ہی انہوں نے راستے پر مزید رکاوٹیں لگا دیں۔ کمال نے اپنے سپاہیوں کو رکاوٹیں ہٹانے کا اشارہ کیا مگر مظاہرین تشدد پر اتر آئے۔ اس پر پولیس کو طاقت استعمال کرنا پڑی جس سے لوگ تتر بتر ہو گئے لیکن بھاگتے بھاگتے انہوں نے ساری روشنیاں گل کر دیں۔ کمال اور اس کے آدمی ایپرون سے باہر آ گئے۔ اتنے میں ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور نعرے لگانے لگا، ''پہیہ جام ہڑتال، کوئی پرواز نہیں جائے گی''۔ ایک سپاہی نے کمال سے اجازت چاہی کہ ذرا اس شخص کی ٹھکائی کر دی جائے، مگر وہ نہ مانا کہ جب تک ان لوگوں کی طرف سے پہل نہ ہو، ہمیں کوئی کارروائی نہیں کرنی چاہیے۔ کمال اپنے سپاہیوں کے ساتھ وہیں کھڑا رہا مگر کچھ دیر گزرنے کے بعد بھی جب مظاہرین دکھائی نہ دیئے تو وہ واپس اپنے دفتر آ گیا۔

انسپکٹر نے کمال سے کہا، ''سر! آپ نے ان لوگوں کا رویہ دیکھا ہے؟ اگر آپ اکیلے ہوتے تو وہ یقیناً بہت تنگ کرتے۔ پچھلے ایڈیشنل ایس پی کو بھی انہوں نے معافی مانگنے پر مجبور کر دیا تھا''۔

کمال نے اسے کوئی جواب نہ دیا لیکن سوچنے لگا کہ جب صورتِ حال ایسی خراب تھی، ائیر پورٹ ڈائریکٹر نے اسے بلایا کیوں؟ اس سے بات کرنے کے لیے فون ملایا مگر مصروف ملا۔ ریسیور رکھ کر وہ واقعات کے تانے بانے بُننے لگا۔ اتنے میں

ایس، پی ایان بینر جی اندر داخل ہوا، ''کمال، کیا معاملہ تھا؟'' اس نے پوری تفصیل بتائی۔ چند لمحوں بعد ڈی، آئی، جی حلیم سرنی بھی آ گیا اور کمال سے یہی سوال کیا۔ اسے از سر نو تفصیل بتانا پڑی۔ اتنے میں آئی، جی ہیڈ کوارٹر مسٹر سبھاش گوش کا فون بھی آ گیا جو اس وقت ڈائریکٹر کے دفتر میں موجود تھا۔ اس نے ان سب افسروں کو وہیں بلایا تھا۔

جب وہ ڈائریکٹر چیمبر کے دروازے پر پہنچے تو مظاہرین نے پھر سے نعرے بازی شروع کر دی، ''ہمارا کھاتا ہے اور ہمیں ہی مارتا ہے! بدمعاش! سور! اس کی طبیعت صاف کرنی پڑے گی''۔

سرنی نے اپنے ساتھیوں کو کہا، ''اگر یہ لوگ ایڈیشنل ایس، پی کو گالیاں دے رہے ہیں تو کسی قسم کی بات چیت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو ہوتا ہے، ہو جائے''۔ شور سن کر ڈائریکٹر باہر آیا اور مظاہرین کو مخاطب کر کے کہنے لگا، ''بھائیو! ڈی، آئی، جی اور آئی، جی صاحبان خود تشریف لائے ہیں۔ وہ صورتِ حال کا جائزہ لے کر کوئی فیصلہ کریں گے۔ مہربانی سے آپ لوگ خاموشی سے انتظار کریں''۔

مظاہرین خاموش ہو گئے، پولیس افسر ڈائریکٹر کے دفتر چلے گئے۔ سارا واقعہ پھر سے دہرایا گیا۔ کمال کو وہیں منتظر رہنے کا کہتے ہوئے باقی افسر دفتر سے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے اور کمال کے ساتھ اس کے دفتر آ پہنچے۔ آئی، جی نے وہاں سے ڈائریکٹر جنرل پولیس اور ہوم سیکرٹری کو فون کر کے بتایا کہ حالات قابو میں ہیں، معاملہ طے ہو گیا ہے۔

ڈی، آئی، جی سرنی نے کمال کو باہر بلا کر بتایا، ''کچھ لوگوں نے اسپتال سے میڈیکل سرٹیفیکیٹ لیے ہیں۔ ہمیں بھی ایسا ہی کرنا ہوگا۔ تم بھی کسی نرسنگ ہوم میں داخل ہو جاؤ''۔

''مگر سر! میں تو بالکل ٹھیک ہوں''۔

''صحیح ہے لیکن تمہارے داخل ہونے سے ہم کہہ سکیں گے کہ مظاہرین کے پولیس پر حملے کے بعد لاٹھی چارج کی نوبت آئی تھی۔ اس حکمتِ عملی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم پہلے بھی کئی بار ایسا کر چکے ہیں، اور ہاں مہربانی سے آئی جی کو مت بتانا کہ میرے کہنے پر ایسا ہوا ہے''۔

''کیوں سر!''

''ایسی باتیں حکام بالا کو بتانے والی نہیں ہوتیں''۔

ڈی، آئی، جی نے کمال کو نرسنگ ہوم داخل کرانے کی ذمہ داری متعلقہ پولیس اسٹیشن کے انچارج کو سونپی جس نے بخوبی اپنا کام سرانجام دیا اور کمال کو ایک نرسنگ ہوم میں داخل کرا دیا۔ اگلے روز کے اخبارات دونوں فریقین کی جانب سے الزامات اور جوابی الزامات سے بھرے ہوئے تھے۔ ادھر بینا نے ان خبروں سے پریشان ہو کر نرسنگ ہوم میں کمال کو فون کیا جس نے سمجھانے کی کوشش کی کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے، فکر کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن وہ مطمئن نہیں تھی۔ کمال کو صاف الفاظ میں بتانا پڑا کہ لاٹھی چارج کے جواز کے لیے یہ سارا ڈرامہ کرنا پڑا ہے، مگر اسے یقین نہ آیا۔

''اگر یقین نہیں ہے تو خود آ کر دیکھ لو''، کمال نے اسے کہا۔

''ہاں! یقیناً، میں لیبارٹری سے ہو کے آؤں گی''۔ فارغ ہو کر بینا آئی تو کمال کو تندرست دیکھ کر بولی، ''تمہارے افسر کتنا خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں۔ تمہارے ڈی، جی نے بیان دیا ہے کہ ان لوگوں نے تمہیں جھاڑوؤں سے پیٹا ہے۔ میرے تمام ساتھی مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہ ڈرامے بازی ختم کرو''۔

بینا نے اخبارات اس کے سامنے کیے جنہیں دیکھ کر کمال کو بھی اچھا نہ لگا۔ بہر حال، اس نے نرسنگ ہوم سے رخصت لی اور گھر چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ڈی، آئی، جی کا فون موصول ہوا جس نے پوچھا کہ وہ کیا واقعی گھر چلا آیا ہے؟ کمال نے

جواب دیا کہ تندرست ہونے کے سبب اسے نرسنگ ہوم رہنا پسند نہیں تھا۔ ڈی، آئی، جی نے اسے اگلے روز اپنے دفتر بلایا۔ ملاقات پر اس نے پوچھا، ''اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''سر! میں اپنے دفتر جاؤں گا''۔

''وہاں جا کر کیا کرو گے؟ بہتر ہے کہ چند روز آرام کرو''۔

''سر! بغیر وجہ آرام کیوں کروں؟ قبل ازیں کبھی ایسا کیا، نہ آئندہ کروں گا''۔

''چند دنوں کے لیے اپنے گاؤں چلے جاؤ''۔

سر! اس موقع پر میں گاؤں جانا نہیں چاہتا''۔

''کیا کام کے بغیر تم اپنے گاؤں نہیں جا سکتے؟ اپنے اہلِ خانہ سے ملاقات کر لینا''۔

''سر! میں گذشتہ ہفتہ ہی گیا تھا، اب نہیں جاؤں گا''۔

''پھر سیر سپاٹے پر چلے جاؤ۔ کیا تم نے اس سال چھٹی برائے سیر (recreation leave) لی ہے؟''

''نہیں سر! لیکن ہمارا خیال ہے کہ کرسمس کی چھٹیوں پر کہیں جایا جائے۔ اس وقت تو میری بیوی کو بھی چھٹی نہیں ملے گی''۔

''تو کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''اپنے دفتر جاؤں گا''۔

''جانے سے پہلے آئی، جی صاحب سے مل لینا''۔

وہاں سے اٹھ کر کمال ڈی، جی کے دفتر کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں اس کے ڈرائیور پردیپ نے کہا، ''سر! یہ لوگ اب آپ کو ہوائی اڈے نہیں جانے دیں گے۔ آرام کرنے کے عرصہ میں آپ کو تبدیل کر دیا جائے گا''۔

ڈی، آئی، جی سے ملاقات میں کوئی ابہام نہ رہا۔ غالباً ایئر پورٹ اتھارٹی کے سٹاف کو مطمئن کرنے کے لیے یہ سوچا گیا ہوگا کہ کمال کو ہوائی اڈے جانے کی بجائے کچھ دن نرسنگ ہوم میں رکھا جائے، اس طرح وہ اپنی موقع شناسی اور ہوشیاری کا ثبوت دینا چاہتے تھے۔ انہی امکانات اور خیالات کے ساتھ وہ آئی، جی مسٹر گوسائی کے دفتر پہنچ گیا۔

آئی، جی نے کہا، ''سرنی نے بتایا ہے کہ تم سیدھے اپنے دفتر جانا چاہتے ہو؟''

''جی سر!''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیوں سر؟''

''اتنی ہنگامہ آرائی کے بعد جب تم پھر دفتر جاؤ گے تو کشیدگی میں اضافہ ہوگا''۔

''سر! اگر خاکروب اپنے کاموں پر چلے جائیں تو اس صورت میں کوئی کشیدگی نہیں ہوگی، صرف میرے دفتر جانے سے گڑبڑ کا اندیشہ ہے؟ اگر آپ کے خیال میں ساری ہنگامہ آرائی میری وجہ سے ہوئی تھی تو پھر تحقیقات کس لیے؟ آپ میرا تبادلہ کر دیجیے''۔

''اس انداز سے کیوں سوچ رہے ہو؟ چند دنوں بعد دفتر چلے جانا۔ آرام کرو، رسالے وغیرہ پڑھو''۔

''سر! ایک ہی بات بار بار کیوں دہرائی جا رہی ہے؟ میرے دفتر نہ جانے میں کیا حکمت ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے ایئر پورٹ اتھارٹی کو یقین دہانی کرائی ہو کہ مجھے اپنے دفتر جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی؟ کیا اسی وجہ سے مجھے آپ لوگوں نے میٹنگ سے دور رکھا تھا؟''

یہ باتیں سن کر آئی۔ جی طیش میں آ گیا، ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''سر! میں جاننا چاہتا ہوں کیا آپ نے اتھارٹی کو ایسی یقین دہانی کرائی ہے کہ کمال منڈل اپنے دفتر نہیں جائے گا؟''

''ہمیں یقین دہانی کرانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں سر! میں سیدھا اپنے دفتر جا رہا ہوں''۔

آئی۔ جی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا لیکن کچھ سوچ کر چپ رہا۔ کمال اپنے دفتر گیا اور محافظ کو ساتھ لے ہوائی اڈے کے تمام دفاتر کا دورہ کیا۔ کل کے مظاہرین اسے دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ کچھ لوگوں کا انداز تو ایسا تھا جیسے کوئی بھوت سامنے آ گیا ہو۔ چند ایک یونین کے دفتر کی طرف بھاگے۔ کمال اپنے دفتر آ گیا۔ اسے انسپکٹر نے بتایا کہ لوگ آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ آئی۔ جی نے انہیں دھوکہ دیا ہے۔ وہ خاموش رہا لیکن یہ یقین ہو گیا کہ اب اس کا تبادلہ زیادہ دور کی بات نہیں۔

موجودہ ڈی۔ جی، جاشو، کمال سے ناخوش تھا۔ اوپر سے مرکزی وزیر مملکت اور داخلہ امور کا انچارج مسٹر شوبان دیو بھی ڈی۔ جی سے پہلے ہی ناراض تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کسی کوتاہی اور غلطی پر اسے تبدیل نہ کر دیا جائے، لہٰذا وہ وزیر کو خوش رکھنے کے چکر میں رہتا۔ ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ جب جاشو کلکتہ میں پولیس کمشنر تھا، ایک بار مسٹر دیو کو اچانک کلکتہ جانا پڑا۔ جاشو کو مطلع کیا گیا کہ اس کے لیے رہائش وغیرہ کا بندوبست کیا جائے۔ دفاتر میں چھٹی ہو چکی تھی، تقریباً تمام عملہ گھروں کو جا چکا تھا۔ پانی نشیب کو بہتا ہے، اس کے مصداق یہ ذمہ داری کمال کو سونپی گئی۔ بہر طور کسی نہ کسی طرح اس کے قیام کا بندوبست کیا گیا جو وزیر کو پسند نہ آیا اور وہ ہوٹل منتقل ہو گیا۔ اس پر ڈی۔ جی بہت چراغ پا ہوا اور اس نے تمام افسروں کو بلا کر غیر شریفانہ زبان استعمال کی۔ دیگر افسر تو خاموش رہے لیکن کمال سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے کہا، ''سر! وزیر کے لیے رہائش کا بندوبست کرنا میری یا آپ کی ذمہ داری نہیں۔ آپ کرنا چاہتے ہیں تو کریں۔ ہماری جواب طلبی کیسی؟ کیا آپ نے بتایا تھا کہ کس جگہ اور کس ہوٹل میں انتظام کرنا ہے؟ کس قسم کا کمرہ چاہیے؟ بل کون ادا کرے گا؟ جب کچھ بھی نہیں بتایا گیا تو میری جواب دہی کس لیے؟ اگر آپ کے خیال میں میں اس تعیناتی کے قابل نہیں تو میرا تبادلہ کر دیں''۔

ان واقعات کے مدِ نظر وہ اپنے اعلیٰ افسروں کے بچھائے گئے موجودہ جال میں پھنسنے کو تیار نہ تھا۔

....

اگلے روز کمال کو آئی۔ جی کی جانب سے خط ملا کہ، ''ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اگر ایڈیشنل ایس۔ پی ذرا حکمتِ عملی سے کام لیتا تو کل ہونے والے واقعہ سے بآسانی نپٹا جا سکتا تھا''۔

بہت خوب! کوئی غلطی، کوئی قصور نہیں، صرف یہ کہ ''اگر حکمتِ عملی سے کام لیتا۔۔۔'' ''حکمتِ عملی کی وضاحت تو کی ہوتی! اس نے بلا توقف آئی۔ جی کو لکھا، ''مہربانی فرما کر مجھے رپورٹ کی مکمل نقل فراہم کی جائے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ مذکورہ الفاظ کس بنیاد پر استعمال کئے گئے ہیں؟ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ آیا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایسی حکمتِ عملی کا اشارہ کیا ہے جو مجھے استعمال کرنی چاہیے تھی؟''

خط لے کر وہ آئی۔ جی کے پاس گیا مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا کیونکہ کمال کو بھیجا گیا خط ڈی۔ جی کے حکم سے جاری ہوا تھا۔ وہ ڈی۔ جی کے پاس گیا۔ اس نے جواب دیا کہ اسے کچھ علم نہیں، گوسائی سے ملاقات کرو۔

''میں وہیں سے آ رہا ہوں، اور ان کے کہنے پر یہاں آیا ہوں''۔

''تو پھر دتہ صاحب سے ملو''۔

کمال ڈی۔ آئی۔ جی ہیڈ کوارٹر مسٹر دتہ کے پاس گیا۔ اس کا کہنا تھا، ''مسٹر کمال! میری بات سنو۔ یہ لوگ تمہیں

رپورٹ کی نقل نہیں دیں گے، اور سرکاری طور پر تمہیں بتائیں گے بھی نہیں، بس ادھر ادھر چکر لگوا کر وقت ضائع کریں گے"۔

"سر! میں سمجھتا ہوں۔ میں آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔ بس آپ اتنا کیجیے کسی کو کہیں کہ میرا خط سرکاری طور پر وصول کر لے۔ مجھے صرف یہ ثبوت رکھنا ہے کہ میں نے رپورٹ کی نقل مانگی تھی"۔

مسٹر دتہ نے کسی کو خط وصول کرنے کا حکم دیا۔ کمال نے پوچھا "سر! آپ بتا رہے تھے کہ ایس پی، ائیر پورٹ اور چند دیگر افسروں کے عہدوں کے لیے حکم نامہ جلد ہی جاری ہونے والا ہے"۔

دتہ صاحب نے جواب دیا "میں جانتا ہوں کہ تم سب سے سینئر ASP ہو اور ایس پی کے عہدے پر ترقی پانے کے حقدار ہو۔ میں نے تمہیں یہ بھی کہا تھا کہ اگر ایس پی کو یہاں سے کہیں اور تبدیل کر دیا جائے تو شاید تمہیں اس کا چارج مل جائے، لیکن اب مجبوراً بتا رہا ہوں کہ یہ لوگ تمہیں یہاں نہیں رکھیں گے۔ عہدے کی اتنی پرواہ مت کرو"۔

"سر! مقررہ معیاد سے قبل تبدیلی کا حکم جاری نہیں ہو سکتا۔ میں نے یہاں بہت محنت کی ہے"۔

"تمہاری کوششیں ثمر آور ہوں گی۔ اور سنو! تمہاری تبدیلی کا نوٹیفکیشن جاری ہو چکا ہے"۔ یہ بتا کر مسٹر دتہ نے کمال کو حکم نامہ دیا جس کی رُو سے اس کا بحیثیت کمانڈنٹ، SAP سیونتھ بٹالین، ست گاؤں، تبادلہ کر دیا گیا تھا۔ اس کو ایک اور نوٹیفکیشن بھی دکھایا گیا جس کے مطابق ایک ایس پی اور تین ڈپٹی ایس پی کے علاوہ ڈیڑھ سو اسامیاں تخلیق ہوئی ہیں۔ کمال روانہ ہونے لگا تو دتہ صاحب نے کہا "ڈی۔ جی صاحب کا مشورہ ہے کہ تمہیں اپنے تبادلے کے سلسلہ میں چیف سیکرٹری یا ہوم سیکرٹری سے ملنے کی ضرورت نہیں"۔

"اگر مجھے جانا بھی پڑا تو میں اجازت لے کر جاؤں گا، سر!"

کمال واپس اپنے دفتر آیا جہاں اسے اسامیوں کی اطلاع سے متعلق تین خطوط ملے۔ ایک خط مسٹر دتہ کی طرف سے بھی ملا جس میں لکھا تھا کہ ڈی۔ جی صاحب نے ناراضی کا اظہار کیا ہے کہ کمال نے سرکاری طریقہ کار کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سیکرٹری خزانہ کو براہِ راست مکتوب کیوں بھیجا تھا۔ کمال ہنس پڑا۔ یہ تجویز گزشتہ بارہ برس سے التوا میں تھی، اب اس کی کوششوں سے نئی اسامیاں پیدا ہوئی ہیں تو اسے مبارکباد دینے کی بجائے اعتراض کیا جا رہا ہے۔ اس کی مساعی کے باعث نہ صرف ہوائی اڈے پر پولیس کی نفری میں اضافہ ہوگا بلکہ نئی ملازمتیں بھی پیدا ہوں گی، لوگوں کو روزگار ملے گا، لیکن صلے میں اس کا تبادلہ کر دیا گیا ہے۔ گویا یہ خط الوداعی تحفہ ہے۔

گھر آ کر کمال نے مینا کو مطلع کیا۔ وہ دلگیر ہو گئی۔ کمال نے تسلی دی "ست گاؤں نزدیک ہی ہے، میں ہر ہفتہ آ جایا کروں گا"۔

"لیکن گھر کا کیا ہوگا؟ میں نے تو ہوسٹل بھی چھوڑ دیا ہے"۔

"فکر مت کرو، اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا"

....

ست گاؤں جانے سے پہلے ہی کمال کے تبادلے کا نوٹیفکیشن تبدیل ہو گیا جس کے تحت اب اسے انٹیلیجنس بیورو میں بطور ایس پی تعینات کر دیا گیا۔ دارالحکومت میں تعیناتی ہونے کی وجہ سے اسے خوشی ہوئی، لہٰذا اس نے فوراً چارج سنبھال لیا۔ اب وہ اور مینا اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ لیک سٹی والا گھر چونکہ ائیر پورٹ کے لیے مخصوص تھا اس لیے کمال نے سیکرٹری خزانہ کو درخواست کی کہ یہ گھر اسی کے پاس رہنے دیا جائے۔ مختلف دفاتر سے ہوتی ہوئی درخواست آخر کار ڈی، آئی، جی نیک سنیال کے پاس جا پہنچی۔ وہ کمال کو اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ ہاکل پور والے واقعہ میں، جہاں کمال نے رکن اسمبلی کو گرفتار کیا تھا، سنیال نے

تحقیقات کی تھیں۔کمال اس سے ملنے دفتر چلا گیا۔خیریت پوچھنے کے بعد اس نے استفسار کیا،''باکل پور میں میں نے تمہیں چند باتیں بتائی تھیں۔یاد ہیں کیا؟'' کمال بھولا نہیں تھا۔اسے وہ دن یاد آ گئے جب پنچائت کے دفتر سے لوٹا ہی تھا کہ اسے سنیال نے اسے اپنے پاس بلایا۔اس نے جا کر پوچھا،''سر! آپ تو کل شام جانے والے تھے؟''

''ہاں! ہوا یہ کہ میری رپورٹ تیار تھی چنانچہ اُسے بھیج کر میں یہاں رک گیا تا کہ دیکھوں کہ ہو کیا رہا ہے۔اپادھیائے نے مجھے فون کیا تھا۔اب میں تم سے ساری باتیں سننا چاہتا ہوں''۔

کمال نے اسے تفصیل بتائی،سنیال خاموشی سے سنتا رہا۔پھر کہنے لگا،''اگر تم بُرا نہ مانو،میں چند سوال پوچھنا چاہتا ہوں''۔

''سر! پوچھئے''۔

''جو تم نے کیا آیا وہ اضطراری اقدام تھا یا اختیاری؟''

''کیا مطلب سر!؟''

''یہی جو آج کیا ہے،بلکہ اس سے پہلے رکنِ اسمبلی اور اس کے بیٹے کی گرفتاری کا معاملہ''۔

''نہیں سر! یہ اضطراری ردِعمل نہیں تھا''۔

''کیا تمہارے خیال میں ایس پی کی تمہیں حمایت حاصل ہے؟''

''انہوں نے کہا تھا کہ وہ میرے ہر قانونی اقدام کی حمایت کریں گے''۔

''صرف کہا ہی تھا یا عملی طور پر حمایت بھی کی تھی؟''

''سر! میری حمایت کرنے پر ان کی سرزنش بھی ہوئی تھی''۔

''یہ بہت اچھی بات ہے کہ ایس پی نے تمہاری کارروائی کی تائید کی تھی۔کیا تم نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی حرکت دیکھی؟''

''سر! ان ناجائز حرکات کے مرتکب افراد سے میں کسی صورت معذرت نہیں کروں گا،نہ ہی میں کسی ایم،پی،اے کے گلے میں گلوبند ڈالنے کا قائل ہوں''۔

''گلوبند ڈالنے سے کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''سر! میں وضاحت نہیں کر سکتا''۔

''یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری حوصلہ شکنی کر رہا ہوں۔میرے خیال میں پولیس سروس کی نیک نامی کے لیے تم جیسے افسروں کا ہونا انتہائی لازمی ہے۔تم نے ملازمت چند آدرشوں کے مدِنظر کی ہے،اور یقیناً تمہاری تعیناتی کسی اچھی جگہ ہونی چاہیے ورنہ تو انکم ٹیکس،اکاؤنٹس یا کسی بنک میں چلے جاتے۔تم اس سروس میں آئے ہو تو اچھی جگہ تعیناتی،عزت،معاشرے میں اپنی پہچان،دوستوں اور رشتہ داروں میں اہمیت وغیرہ کو ذہن میں رکھا ہوگا۔اگر تیز قدم چلو گے تو کبھی بھی یہ حاصل نہیں کر پاؤ گے''۔

''سر! ہوگا کیا؟''

''اگر تم اپنی موجودہ سوچ اور قوتِ نفس برقرار رکھو تو کچھ نہیں ہوگا،لیکن شاید تم زیادہ عرصہ اس کٹھن راہ پر نہیں چل سکو گے؟''

''کیوں،سر!؟''

''تم ان لوگوں کو زیادہ نہیں جانتے۔چونکہ تم اپنے فرائض کی ادائیگی اور کام کے معاملہ میں بہت زیادہ محتاط اور [illegible] ہو اس لیے یہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے سوائے اس کے کہ تمہیں فضول سی جگہوں پر تعینات کرتے رہیں۔کچھ

پوسٹیں ضرورت کے لیے تخلیق نہیں کی جاتیں بلکہ مقصد کسی نہ کسی کو سزا دینا ہوتا ہے۔ یہ پوسٹیں بالعموم کافی عرصہ تک خالی رہتی ہیں اور کسی کو سبق سکھانے یا سزا دینے کے خاطر یہاں تعیناتی کی جاتی ہے۔ تمہاری تعیناتی ایسی ہی جگہوں پر کی جاتی رہے گی۔ کچھ عرصہ بعد تمہارے دوست اور رشتہ دار تمہیں پوچھنا چھوڑ دیں گے۔ تمہیں یہ دیکھ کر قلق اور دکھ ہوگا کہ ادنیٰ قابلیت اور معیار کے لوگ بہتر جگہوں پر لگے ہوئے ہیں۔ جب وہ تم پر ترس کھائیں گے تو تمہیں مزید دکھ ہوگا۔ یہ مت سمجھنا کہ حکمرانوں کے تبدیل ہونے سے تمہاری حالت میں بھی تبدیلی ہوگی۔ اس معاملہ میں تمام جماعتیں ایک جیسی ہیں۔ سیاسی جماعتوں کو جی حضوروں کی ضرورت ہوتی ہے، ایماندار اور راستباز لوگوں کی نہیں''۔

''سر! میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں لیکن میں مجبور ہوں۔ میری ذمہ داری جرائم کی روک تھام اور ان کی تفتیش ہے۔ اگر کسی نے جرم کا ارتکاب کیا ہے تو میں اس وجہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ اس کا تعلق حکمران جماعت سے ہے۔ اگر کوئی میری ذات کے بارے میں قابلِ اعتراض بات کرتا ہے تو میں اس لیے برداشت نہیں کروں گا کہ وہ برسرِ اقتدار جماعت کا کوئی بڑا لیڈر ہے۔ یہ میری مجبوری ہے''۔

''بہت خوب۔ یہ جذبہ قائم رہنا چاہیے''۔

کمال اسے سیلوٹ کر کے واپس آ گیا۔

وہ ماضی سے نکل کر واپس حال میں آیا تو مسٹر سنیال کی آج والی بات سن کر جواب دیا، ''سر! مجھے آپ کی باتیں یاد ہیں''۔

''کیا میری باتیں سچ نہیں نکلیں؟ کیا تمہیں اپنے قول و فعل پر افسوس تو نہیں؟''

''سر! اپنے کیے پر تو افسوس نہیں لیکن جو دوسروں نے میرے ساتھ کیا ہے، اس پر ضرور دکھ ہے''۔

''کیا اس پر پشیمانی ہو رہی ہے؟''

''بالکل نہیں سر۔ کس بات کی پشیمانی؟ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا''۔

''لیکن تمہاری تعیناتی فضول جگہوں پر ہوتی رہی ہے۔ کافی عرصہ تمہیں ایک بٹالین میں رکھا گیا، یہاں تک کہ ترقی ہونے کے بعد بھی تم بٹالین ہی میں رہے۔ جب ایڈیشنل ایس، پی مقرر ہوئے تو حکمران پردھان پر ہاتھ ڈالنے کی خطا میں پھر سے بٹالین بھیج دیے گئے، حالانکہ اس وقت تمہیں کہیں ایس، پی ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے برعکس تم پھر سے بٹالین میں پہنچ گئے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں کبھی بھی کسی ضلع یا ڈویژن میں نہ لگایا جائے''۔

''جی سر! اس کا امکان تو ہے، لیکن میں کر کیا سکتا ہوں''۔

''ان کی ہر بات مان جاؤ۔ انہیں کہو کہ تم ان کی خواہش کے مطابق کام کرنے کو تیار ہو، پھر دیکھو، کیسے تمہیں سر پر بٹھاتے ہیں۔ تم دیانتدار افسر ہو۔ سب لوگ تمہیں پسند کریں گے''۔

''سر! میں نے کبھی قانونی حکم ماننے سے انکار نہیں کیا۔ جمہوریت میں برسرِ اقتدار جماعت کی ہدایات وزیروں کے ذریعے انتظامیہ تک پہنچتی ہیں جن پر عمل کرنا ہوتا ہے لیکن میں کسی طور بھی غیر قانونی حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا''۔

''تم کون ہوتے ہو غلط اور صحیح کا فیصلہ کرنے والے؟ یہ استحقاق تو صرف ان لوگوں کا ہے''۔

''نہیں سر!''۔

''نہیں؟ تو ٹھیک ہے یہ سب کچھ، بلکہ اس سے بھی زیادہ بھگتتے رہو۔ اب بتاؤ، میرے پاس کیوں آئے ہو؟ تم تو کسی کے پاس جاتے نہیں ہو، اور میرے پاس تو یقیناً نہیں آتے۔ کیا تمہارے خیال میں میری رپورٹ کی وجہ سے بالکل پورے تمہاری تبدیلی ہوئی تھی؟''

''سر! معاف کیجیے گا، میری رائے میں آپ اتنے بااختیار نہیں''۔

''تو پھر آئے کیوں ہو؟''

''سر! میں لیک سٹی والا گھر خالی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ اے، ایس، پی ایئر پورٹ کے لیے مخصوص ہے، اس لیے مجھے ایک رہائش گاہ کی ضرورت ہے۔ میری درخواست آپ تک پہنچنے والی ہے۔ پلیز! مجھے ایک گھر چاہیے''۔

''تمہارے خیال میں کیا میں تمہیں گھر دے سکتا ہوں؟''

''جی سر! میرا یہی خیال ہے''۔

''کوئی گھر خالی ہوگا تو پھر مل جائے گا''۔

''سر! پرتشتھن پور علاقے میں پولیس والوں کے لیے کئی گھر خالی ہیں''۔

''تمہیں کیسے پتہ ہے؟''

''ہاؤسنگ سوسائٹی سے علم ہوا تھا''۔

''پھر ایک منٹ ٹھہرو''۔ یہ کہہ کر سنیال نے متعلقہ اسسٹنٹ کو بلا کر معلوم کیا تو علم ہوا کہ دو مکانات خالی ہیں۔ سنیال نے مشورہ دیا کہ اگر وہ کچھ عرصہ انتظار کر لے تو پارک اسٹریٹ میں ایک گھر خالی ہونے والا ہے جو پرتشتھن پور سے بہتر ہے''۔

''لیکن سر! میری ترجیح پرتشتھن پور ہے''۔

''وہ کیوں؟''

''کیونکہ وہاں میری بیوی ریسرچ سکالر ہے''۔

''اوہ! سمجھ گیا۔ گھر مل جائے گا''۔

....

گھر تو مل گیا لیکن کمال جو چاہتا تھا، وہ نہ ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ گھر انسٹیٹیوٹ سے نزدیک ہے اس لیے مینا کو آنے جانے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا مگر اس کے برعکس ہوا۔ وہ حسبِ معمول گھر سے جلدی نکلتی لیکن واپسی مزید تاخیر سے ہونے لگی۔ ایک بار کمال نے شکایتاً کہا بھی، اور جب طیش میں بات کی تو اس کا جواب تھا، ''ریسرچ کا کام گھڑی دیکھ کر نہیں کیا جاتا۔ اگر تمہیں بُرا لگتا ہے تو میں لیبارٹری نہیں جایا کروں گی، بلکہ میں اچھے اچھے کپڑے پہن کر ادھر ادھر پھرتی رہوں گی تاکہ تم جب چاہو، مجھے دیکھ لو۔ ٹھیک ہے؟'' اور پھر کمال ہی کو مفاہمت کرنا پڑی۔ وہ اپنی مرضی سے آتی جاتی رہی۔

پرتشتھن پور قیام کے بعد انہوں نے کھانا پکانے کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی تھی لیکن اس کی غیر حاضری کے دوران کمال کو ہی کھانا تیار کرنا پڑتا۔ مینا شاید ہی کبھی رسوئی میں گئی ہو۔ ملازمہ صبح آتی، دوپہر کے لیے وہ شوربہ وغیرہ تیار کرتی اور چاول رکھ کر چھٹی کر جاتی۔ دفتر سے واپس آ کر کمال چاول بناتا اور پھر مینا کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ وہ دیر سے گھر آتی اور الٹا کمال پر چڑھ دوڑتی، ''کتنی دفعہ تمہیں کہوں کہ کھانا کھا لیا کرو لیکن تم ہو کہ بیٹھے رہتے ہو۔ اگر مجھے معلوم ہو کہ کوئی میرا منتظر ہے تو سکون سے کیسے کام کر سکوں گی؟ اور جب زیادہ دیر ہو تو تم طیش میں آ جاتے ہو۔ بہتر ہے کہ کھانا کھا لیا کرو''۔

تاہم وہ اپنی راہ پر چلتی رہی۔ اگر کسی وجہ سے کمال کو گھر آنے میں تاخیر ہوتی تو مینا اس کا انتظار کیے بغیر کھانا کھا لیتی۔ ان معاملات میں وہ اپنی مرضی کی مالک تھی لیکن کمال ایسا نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں رہتا کہ سارا دن وہ دونوں ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں، رات سو کر گزر جاتی ہے تو ایسے میں سوائے مل بیٹھ کر کھانا کھانے کے اور کوئی وقت نہ ملتا۔ وہ اکٹھا کھانے کے طریقے اور عادت کو ختم کرنے کا خواہشمند نہیں تھا۔

مینا کمال کا انسٹیٹیوٹ آنا پسند نہیں کرتی تھی لیکن ایک بار اسے پھر جانا پڑا۔ ہوا یہ کہ اسے اپنی زیرِ طبع کتاب پر ایک نظر ڈالنا تھی اس لیے وہ مینا کو دکھانے میں بے چین تھا، اس کی واپسی کا انتظار کرنا بھی مشکل محسوس ہو رہا تھا، لہٰذا وہ انسٹیٹیوٹ چلا گیا۔ دیکھا تو دروزہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دستک دی تو چند منٹوں کے بعد دروازہ کھلا۔ صرف مینا اور اس کا اتالیق، اے، جی، دتہ کمرے میں تھے۔ کمال کو دیکھتے ہی اس نے عذر تراشا کہ اگر دروازہ بند نہ کیا جائے تو کوے کمرے میں داخل ہو کر پریشان کرتے ہیں۔ اس وقت رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے لہٰذا کمال سمجھ نہ سکا کہ کوے کس طرح اس وقت اڑتے پھر رہے ہیں۔ اسے بالکل یقین نہیں تھا کہ دتہ واقعی مینا کی تعلیم میں اتنی دلچسپی لے رہا ہے۔ ادھر مینا نے اسے دیکھا تو پوچھا، ''کیا ہوا؟ لیبارٹری میں اس وقت آنے کی کوئی خاص وجہ؟'' کمال نے جواب دیئے بغیر اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ مینا سمجھ کر کہنے لگی، ''ہاں دیر ہو گئی ہے۔ تم چلو، میں آتی ہوں''۔ وہ کرب کے عالم میں لیبارٹری سے نیچے اتر آیا۔ مینا بھی تھوڑی دیر بعد آ گئی۔

دونوں کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گئے۔ مینا اس کے ساتھ چونچلے کرنے لگی مگر کمال اس سے کھنچا کھنچا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ کہنے لگی، ''ہم کافی عرصہ سے کہیں سیر کے لیے نہیں گئے، کیوں نہ کہیں سیر کے لیے جایا جائے؟''

کمال فوراً تیار ہو گیا۔ ''ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ تمہارا کہاں کا ارادہ ہے؟''

''جہاں تم چاہو، لیکن کوئی طوفانی دورہ نہ ہو۔ ہم کہیں جا کر آرام اور سکون سے چند دن گزاریں گے''۔

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد شیلانگ جانے کا فیصلہ کیا جو شمال مشرقی ہندوستان میں جنت سے کم نہیں۔ اس کے بعد چراپونجی کی سیر بھی ہوگی جو بارش کے لحاظ سے دنیا بھر میں پہلے نمبر پر ہے۔ اگلے روز اس نے چھٹی کی درخواست جمع کرا دی۔

....

شیلانگ پہنچنے پر انہوں نے ادھر ادھر پھرنے کی بجائے کمرے ہی میں کچھ دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دیر بعد مینا کمال کو لے کر گیسٹ ہاؤس کی چھت پر آ گئی اور پوچھنے لگی، ''جانتے ہو میں تمہیں شیلانگ کیوں لائی ہوں؟''

''نہیں، کیوں لائی ہو؟''

''کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ برا تو نہیں مانو گے؟''

''جانے بِنا کیسے کہہ سکتا ہوں''۔

''چلو، وعدہ تو کر سکتے ہو کہ میری بات کا برا نہیں مانو گے''۔

''ٹھیک ہے''۔

وہ سر جھکا کر شرمگیں لہجے میں بولی، ''میں مسٹر علو کے لیے دل میں کشش سی محسوس کرتی ہوں''۔

''کیسی کشش؟''

''میں اسے پسند کرنے لگی ہوں، اس کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی ہوں''۔

''یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر تشویش کی جائے۔ ہم سب ہی اس کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ کسی پُرکشش لڑکی کو دیکھ کر میں بھی دل میں کوئی لہر سی محسوس کرتا ہوں، اس کی سنگت میں رہنا چاہتا ہوں لیکن جذباتی نہیں ہوتا، دماغ سے سوچتا ہوں، پھر معاملہ ختم''۔

''مگر میرا تعلق اتنا معمولی نہیں جتنا تم خیال کرتے ہو''۔

''اگر غیر معمولی تعلق ہے تو اپنی مرضی کرو، لیکن کیا یہی بتانے کے لیے مجھے یہاں لانا ضروری سمجھا تھا؟''

''میں وہاں بھی تمہیں بتانا چاہ رہی تھی مگر ہچکچاہٹ مانع آ گئی''۔

''اب تم نے بتادیا ہے تو آؤ، باہر سیر کے لیے نکلتے ہیں''۔

''نہیں، اس وقت نہیں، میں اب پر سکون ہوگئی ہوں۔ اب سونے کی خواہش ہے''۔ اتنا کہہ کر وہ سونے چلی گئی۔

....

کمال گیسٹ ہاؤس میں بے چینی محسوس کرنے لگا۔ یہ کس قسم کی سیر ہے؟ اگرچہ بعد میں دونوں تفریح کے لیے جاتے رہے، شیلانگ پہاڑی پر، صنوبر کے درختوں کی چھاؤں میں، اجاڑ جھیل، یخ بستہ گلیوں اور بازاروں کی سیر، لیکن بینا کی ہمراہی میں بھی وہ اداس اور بے کل تھا۔ تفریحی دورہ اب اس کے لیے دلچسپی اور کشش کا حامل نہ رہا۔ اس کا دل ایک ویران مندر، اجڑی مسجد کا دیا تھا جو بلا سبب سلگ رہا ہو۔ دل میں لگے زخم بینا کو دکھائی نہیں دے رہے تھے اور وہ اس گمان میں تھی کہ کمال اس کے عشق پر معترض نہیں۔ چند روز یونہی گزر گئے۔

واپس آنے کے بعد بھی بینا کا معمول یہی رہا، صبح جلدی جانا اور رات گئے واپس ہونا۔ اور جب کمال نے شب و روز کا شمار کیا تو اسے شدید کرب کا احساس ہوا۔ چوبیس گھنٹوں میں وہ آدھا وقت لیبارٹری میں گزارتی، باقی بارہ گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے سونے، دو گھنٹے لباس تبدیل کرنے اور آنے جانے میں گزر جاتے۔ لے دے کے صرف دو گھنٹے بچتے جو کمال کے ساتھ گزرتے۔ اس صورتِ حال میں بینا کا مسٹر علو کے ساتھ اتنا گہرا تعلق پیدا ہونا مقامِ تعجب نہیں۔ اگر وہ تھوڑا دیر سے جا کر قدرے جلدی لوٹ آتی تو پھر بھی تعلقات میں کوئی خاص فرق نہ پڑتا مگر بینا کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔ ایک روز اس نے لیبارٹری سے واپس آ کر بتایا کہ ''ہمارے انسٹیٹیوٹ میں ایک نیا لڑکا آیا ہے۔ میری اس سے کینٹین میں ملاقات ہوئی ہے۔ اتنا سیدھا سادہ ہے کہ کوئی بھی اسے آسانی سے دھوکہ دے سکتا ہے۔ میں اپنے دل میں اس کے لیے پریم محسوس کر رہی ہوں''۔

درحقیقت بینا کو یقین تھا کہ کمال اصل میں بہت کایاں اور چالاک شخص ہے جسے دھوکہ دینا ناممکن سی بات ہے۔ بینا کے خیال میں کمال اپنی سوچوں، سپنوں اور تصوراتی دنیا میں گم، عملی زندگی سے دور اور اپنے جذبات کے اظہار میں بے نیاز رہنے والا بندہ ہے۔ اسی خود ساختہ اور بے بنیاد گمان کی وجہ سے اس کے دل میں اپنے پتی کے لیے کبھی پریم کی جوت نہیں جاگی تھی۔ کمال کو بینا کا کسی اور سے اظہارِ محبت بالکل پسند نہ آیا۔ بڑے دکھ سے بولا، ''پھر عشق کر و اس سے''۔

''اگر سچ مچ ہوگیا تو؟''

''ہونے دو۔ شاید تمہیں بعد میں علم ہو جائے کہ ان میں ایسی خصوصیات نہیں جو اس وقت تمہارے من کو موہ رہی ہیں''۔

یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی، ''یہی سبب ہے کہ میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں، تم نے مجھ پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ پابندیوں کا مطلب ہے کسی کمرے میں نظر بند ہو جانا۔ تمہارا بہت شکریہ''۔

....

کمال ملاقاتیوں سے مل رہا تھا۔ ایک کارڈ پر نظر پڑی، ''ریتا مترا''۔ گویا اس کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا، یعنی لڑکوں کی طبیعت صاف ہونے والی ہے۔ ہوا یہ تھا کہ چند لڑکے ایک لڑکی کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ وہ چوک میں کھڑے ہو جاتے اور جیسے ہی اس کی کار وہاں سے گزرتی، ناشائستہ کلمات کہتے۔ لڑکی کے لیے ناقابلِ برداشت ہوا تو اس نے مقامی تھانے میں شکایت درج کرا دی۔ اگرچہ افسر انچارج نے ان کی سرزنش کی لیکن وہ باز نہ آئے۔ چند روز بعد وہ کمال سے اس کے دفتر میں ملی اور تلخی سے بولی، ''کس قسم کے افسروں کو آپ نے تھانے میں تعینات کیا ہوا ہے؟''

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''بدمعاش لڑکے مجھے روز تنگ کرتے ہیں۔ میری شکایت پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی، بلکہ الٹا مجھے نصیحت کی گئی ہے

کہ میں مناسب لباس پہنا کروں۔ مجھے بتایا جائے کیا میرا لباس غیر شائستہ ہے؟ کیا تھانے والوں کا کام میرے لیے لباس تجویز کرنا ہے یا میری شکایت کا ازالہ کرنا؟"

وہ اس وقت سکرٹ اور بلا آستین ایک چھوٹی قمیص پہنے ہوئے تھی۔ لباس خوبصورت اور دیدہ زیب تھا لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ اسے مناسب کہا جائے یا نہیں، مشکل تھا۔ ایک لباس کسی کو اچھا لگتا ہے تو کسی کے لیے نامناسب۔ وہ بولے جا رہی تھی، "کیا یہ فیصلہ میں کروں گی یا تھانے والے کہ مجھے کون سا لباس پہننا چاہیے؟ کیا میں آپ کو یہ مشورہ دے سکتی ہوں کہ آپ خاکی وردی کی بجائے سبز وردی پہنا کریں، اور قمیص پر دو جیبوں کی بجائے صرف ایک جیب لگایا کریں؟

کمال نے مختصر سا جواب دیا، "تم مجھے ان لڑکوں کا حلیہ بتاؤ، باقی میں خود دیکھ لوں گا"۔

حلیہ سننے کے بعد وہ خود موقع پر گیا اور لڑکوں کو شریفانہ برتاؤ اختیار کرنے کی نصیحت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ لڑکی ہمیشہ ہیجان انگیز لباس پہنتی ہے۔ لیکن لگتا تھا کہ وہ اپنی حرکات سے باز نہیں آئے، اسی لیے لڑکی کو دوبارہ آنا پڑا ہے۔ کمال نے اسے بلایا۔ اب اس کے لباس میں نمایاں فرق نظر آیا۔ اس وقت وہ شلوار قمیص میں ملبوس اور گلے میں دوپٹہ ڈالے ہوئے تھی۔ اس سے پوچھا کہ آیا وہ لڑکے اب بھی اسے تنگ کرتے ہیں؟

"نہیں اب تو نہیں۔ کیا کیا تھا آپ نے ان کے ساتھ؟"

"کچھ نہیں، میں نے انہیں صرف اپنے دفتر بلایا تھا"۔

"کیا آپ کے کہنے پر آ گئے تھے؟"

"نہیں، وہ بحث پر اتر آئے تھے"۔

"پھر؟"

"میں نے انہیں بس یہ کہا تھا کہ مرضی ان کی ہے، اپنی خوشی سے آئیں گے یا انہیں بلانا پڑے گا۔ بہر طور وہ آ گئے، انہوں نے وعدہ کیا کہ آئندہ سے تمہیں تنگ نہیں کریں گے"۔

"بس یہی؟"

"نہیں، اتنا تو نہیں، لیکن انہوں نے وعدہ کیا کہ تمہیں ستائیں گے نہیں"۔

"وہ کیسے؟"

"یہ راز کی بات ہے۔ تمہارا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں!"۔

"پھر سکون سے رہو۔ کچھ اور ملاقاتی بھی ملنے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں"، گویا یہ لڑکی کو اب چلے جانے کا پیغام تھا۔

"شکریہ" کہہ کر وہ چلی گئی۔

....

اتوار کا روز تھا، مینا نے اپنی ملازمہ کو ایک دن کی چھٹی دے دی۔ کمال اپنی کتاب کے مسودے کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔ مینا نے قریب آ کر پوچھا، کیا وہ اس کے تھیسس کی نوک پلک درست کر دے گا؟ "تم سے تصدیق کروائے بغیر مجھے بھیجنے میں تامل ہے"۔

"مجھے تو اس موضوع کا خاص علم نہیں، کیسے ٹھیک کر دوں؟"

"تم انگریزی زبان کی تصحیح کر دو۔ تھیوری دیکھنے کے لیے میں تمہارے پاس موجود ہوں"۔

''پھر بلا تاخیر کام شروع کر دیتے ہیں''۔

''نہیں، اس وقت نہیں۔ رات کو بیٹھ جائیں گے۔ تم نے بتایا تھا کہ نیشنل لائبریری جانا ہے، واپسی پر کر لیں گے''۔

اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ کمال نے دیکھا کہ باہر مسٹر ہمانش سور کھڑے ہیں، ان کو اندر بلا کر خود مینا کے پاس آ یا جسے اس وقت کسی کی مداخلت انتہائی ناگوار گزری، ''یہ کس قسم کا شخص ہے؟ جب منہ اٹھایا، چل پڑا۔ کیا سارے ایسے ہی بیکار لوگ ہیں؟''

کسی کا بغیر وقت لیے آ جانا مینا کو بہت برا لگتا تھا لہٰذا کمال کو اس کے رویے پر حیرت نہ ہوئی۔ مینا کو آہستگی سے سمجھایا، ''دھیرے سے بات کرو، اسے برا لگے گا۔ وہ ایک اچھا شخص ہے''۔

''برا لگتا ہے تو میری بلا سے۔ اگر کسی کو عقل نہیں ہے تو عقل سکھانا ضروری ہے''۔

کمال نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور مسٹر ہمانش کے پاس چلا آیا۔ تھوڑی سی گپ شپ اور چائے پینے کے بعد اس نے رخصت لی۔ کمال رسوئی میں آیا، تھوڑے سے چاول بنائے، کھانا وغیرہ کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف اس کا دوست منیش تھا۔ دو چار منٹ باتیں کرنے کے بعد اب وہ قدرے تذبذب میں تھا کہ آیا لائبریری جائے یا موخر کر دے۔ ابھی مینا کا تھیسس بھی دیکھنا تھا۔ اسی حیص بیص میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ باہر گوتم کھڑا تھا۔ کمال کو دیکھ کر وہ کچھ سٹپٹا گیا اور گھبراہٹ میں سوال کیا، ''آپ ابھی تک گھر پر ہیں؟''

اس بے تکے سوال کو کمال نے اپنی توہین سمجھا۔ وہ اس وقت اپنے گھر پر ہے، گوتم پوچھنے والا کون ہے۔ جواب دیئے بغیر اس نے کہا، میں مینا کو بلاتا ہوں۔ اندر آ کر اس نے اپنی شدید برہمی کا اظہار کیا، ''کیا حرکت ہے یہ؟ میرے گھر میں آ کر پوچھ رہا ہے کہ میں اس وقت یہاں کیوں ہوں۔ کیا میں نے اسے بتایا تھا کہ میں گھر پر نہیں ہوں گا؟''

مینا نے انتہائی محتاط انداز میں جواب دیا، ''مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ اسی سے پوچھو''۔

''تم سے اس لیے پوچھا ہے کہ وہ تمہارا مہمان ہے۔ وہ تم سے ملنے آیا ہے''۔

وہ کچھ کہے بغیر ڈرائنگ روم چلی گئی، اور کمال عالمِ طیش میں لائبریری روانہ ہو گیا۔ واپسی پر علم ہوا کہ مسٹر دتہ آئے تھے اور مینا کے ساتھ تھیسس پر گفتگو کرتے رہے ہیں۔

....

سولہ جنوری، 1990، موسمِ سرما کا ایک روشن دن جب سورج پوری آب و تاب سے فروزاں تھا، کمال ڈھاکہ یونیورسٹی کمپلکس میں انور پاشا کی بیوہ مومنہ پاشا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یہاں پی، ایچ، ڈی کے سلسلہ میں کچھ تحقیقی مواد کے سلسلہ میں آیا تھا۔ ویزے کے لیے اسے اچھی خاصی کوشش کرنا پڑی تھی۔ ہر پیشے کے فوائد اور نقصانات ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ پولیس سروس میں ایک اعلیٰ عہدے پر ہونے کے سبب دوسرے ملک میں اسے شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کہ شاید وہ جاسوسی کی غرض سے آ رہا ہے۔ بنگلہ دیش بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ اس کی درخواست ڈھاکہ میں وزارتِ داخلہ کو بھیجی گئی جہاں کافی چھان بین کے بعد اسے ویزہ تو ملا مگر صرف دو ہفتوں کے لیے۔ وہ دس تاریخ کو یہاں پہنچا اور اس حساب سے 24 جنوری سے پہلے پہلے بھارت واپس جانا تھا۔ ویزے میں توسیع کے امکانات تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ جہاں بھی گیا، خفیہ محکمے کے اہلکار اس کی نگرانی کرتے رہے، جس سے بھی ملاقات کی، وہ بھی شاملِ تفتیش ہو گیا۔ معینہ مدت میں اپنا کام مکمل کرنے کے لیے اسے دن رات محنت کرنا پڑی۔

کمال کو دو تین کتابوں کا علم ہوا جو اس کے خیال میں تھیسس کے لیے کارآمد ہو سکتی تھیں۔ دو کتابیں ڈھاکہ یونیورسٹی

کی مسز رضیہ خان اور ایک مرحوم انور پاشا کی تحریر کردہ تھیں۔ کمال نے ساری رات جاگ کر ان کا مطالعہ کیا، پھر دوسرے دن انور پاشا کی بیوہ مومنہ پاشا سے ملاقات کے لیے ان کے گھر گیا۔ اب وہ ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا گفتگو کر رہا تھا۔ دورانِ گفتگو کمال نے انہیں کہا، ''اگر چہ یہ آپ کے لیے تکلیف دہ ہے لیکن میں پھر بھی اس حادثے کے بارے میں جاننا چاہوں گا''۔

''نہیں، آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں، پوچھیں''۔

''میں نے سنا تھا کہ حکام نے آپ کے خاوند کو گھر سے اٹھایا تھا جس کے بعد ان کی واپسی نہ ہوئی''۔

مومنہ پاشا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، گلوگیر لہجے میں بولی، ''ہاں! یہی کمرہ تھا جہاں آپ تشریف فرما ہیں۔ 14 دسمبر، 1971 کو وہ اور ان کے دوست رشید الحسن یہاں بیٹھے تھے کہ حکام انہیں اپنے ساتھ لے گئے، پھر چند روز بعد ان کی لاشیں ملی تھیں''، اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کر کے بتایا، ''اس نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس دن سے اس کے ذہنی توازن میں خلل آیا ہے''۔ کمال نے لڑکے سے بات چیت شروع کی لیکن اس کی گفتگو میں کوئی ربط نہیں تھا، پھر بھی اس نے اپنے باپ کی زبانی سنی باتیں دہرانے کی کوشش کی۔ وہ لوگ مقصود آباد کی نواحی بستی برکائی کے رہائشی تھے۔

اس واقعہ سے اگلے روز کمال اپنے ناول نگار دوست ہمایوں آزاد سے ملاقات اور بعد ازاں چٹا گانگ جانے کا ارادہ کئے ہوئے تھا، لیکن اس سے پہلے مینا کو لینے ہوائی اڈے بھی جانا تھا۔ اپنی مصروفیات کی بنا پر اس نے مینا کو بنگلہ دیش لے جانے کی پیشکش نہیں کی تھی مگر وہ از خود تیار ہو گئی۔ طے یہ پایا تھا کہ وہ چند دن بعد کمال سے آ ملے گی تا کہ اس وقت تک وہ زیادہ سے زیادہ اپنا کام ختم کر لے۔ اب وہ یہاں آ رہی تھی۔

....

کمال وزیرِ خزانہ کے دفتر گیا اور اس کے پرائیوٹ سیکرٹری سے کہا کہ وزیر صاحب نے اسے طلب کیا ہے۔ پی، ایس نے انٹر کام پر بات کی اور پھر اسے انتظار کرنے کو کہا۔ دورانِ گفتگو پی، ایس نے ذکر کیا، ''میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ کی کوئی کتاب زیرِ طبع بھی ہے''۔

''جی، میری دو کتابیں کلکتہ کتاب میلے کے موقع پر شائع ہو رہی ہیں''۔

''کس قسم کی کتابیں ہیں؟''

''ایک کتاب میری کہانیوں کا مجموعہ ہے جبکہ دوسری میرا ڈاکٹریٹ کا تھیسس ہے''۔

''تو آپ نے ڈاکٹریٹ بھی کی ہے!''۔

''جی ہاں۔ یہاں کام کا دباؤ زیادہ نہیں، لہٰذا فالتو وقت میں اس پر کام کرتا رہا''۔

''پی، ایچ، ڈی مکمل کرنے میں کتنا عرصہ لگا تھا؟''

''ڈیڑھ سال''۔

''میں نے تو سنا ہے کہ دو سال سے قبل تھیسس جمع نہیں کرایا جا سکتا''۔

''ہاں، یہ صحیح ہے۔ میرا تبادلہ بہت جلد جلد ہوتا رہا ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ شاید میں اپنا کام مکمل نہ کر سکوں گا، لہٰذا تیزی سے اس پر کام کیا۔ پھر میں نے وائس چانسلر سے تھیسس جمع کرانے کی اجازت طلب کی''۔

''کیا ایسا ممکن ہے؟''

''جی ہاں، کلکتہ یونیورسٹی میں اجازت ہے کہ کسی گائیڈ کی عدم موجودگی میں بھی تحقیقی کام ہو سکتا ہے''۔

''ویسے آپ کس سے رہنمائی لیتے تھے؟''

''پروفیسر یو، کے، مجمدار''۔

اتنے میں انٹر کام کی گھنٹی بجی، پی، ایس نے رسیور اٹھایا اور چند سیکنڈ بعد ''جی، بہتر سر!'' کہتے ہوئے رسیور کریڈل پر رکھ دیا، ''سر! تھوڑی دیر مزید انتظار کرنا پڑے گا۔ کیا آپ کوئی اور کتاب بھی لکھ رہے ہیں؟''

''گزشتہ چند برسوں سے میں بنگال میں ہندو مسلم تعلقات پر لکھ رہا ہوں''۔

''اسے مکمل ہونے میں کتنا عرصہ لگے گا؟''

''اگر میں موجودہ جگہ پر چھ مہینے رہ گیا تو کام مکمل ہو جائے گا''۔

انٹر کام کی گھنٹی بجنے سے سلسلۂ کلام ٹوٹا۔ اب کمال کو اندر آنے کی اجازت ملی۔ اس نے وزیر کو سیلوٹ کیا اور ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اسے بیٹھنے کی اجازت دینے کے بعد اس نے کہا، ''تم نے کمرشل ٹیکس کے ایڈیشنل کمشنر، دو اسسٹنٹ کمشنروں اور چار دیگر افسروں سے جواب طلبی کی اجازت مانگی ہے''۔

''جی سر! شاید آپ کو سارے مقدمے کا علم ہی ہے''۔

''کچھ تھوڑا بہت سنا ہے۔ مجھے تفصیل بتاؤ''۔

''سر! ٹی کنگ کے ڈائریکٹر اور بالخصوص رامن اگروال کمرشل ٹیکس کے دفتر میں سیلز ٹیکس جمع کرانے کی جعلی رسیدیں دیتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ گزشتہ دس برسوں سے جاری ہے جس کی وجہ سے حکومت کو کروڑوں روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔ متعلقہ افسروں کی ملی بھگت کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں، اس لیے ان کے خلاف کارروائی تجویز کی گئی ہے''۔

''ان کا تو کہنا ہے کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے بھول چوک ہو گئی تھی''۔

''میرے سامنے بھی انہوں نے یہی بیان دیا تھا جو میرے لیے قابلِ قبول نہیں''۔

''کیوں؟''

''سر! گذشتہ دس برسوں میں ڈیلر نے جب بھی مختلف فارمز کی درخواست کی، اسے فوری طور پر مہیا کر دیے گئے۔ کوئی ایسا موقع سامنے نہیں آیا جب ڈیلر کی درخواست ایک روز کے لیے بھی موخر کی گئی ہو۔ اس سے تو کہیں اشارہ تک نہیں ملتا کہ ان لوگوں پر کام کا بوجھ معمول سے زیادہ تھا''۔

''پھر انہوں نے خود ہی کارروائی کا آغاز کیوں کیا؟''

''سر! اپنے اپنے حصے پر جھگڑا ہوا تھا''۔

''وہ کیسے؟''

''شروع میں ساٹھ اور چالیس کے بات طے ہوئی تھی، یعنی ڈیلر کا منافع ساٹھ فیصد اور چالیس فیصد محکمے کا۔ چند برسوں بعد افسروں نے نصف حصہ مانگنا شروع کر دیا۔ اس پر بھی اتفاق ہو گیا لیکن جب افسروں نے ساٹھ فیصد کا مطالبہ کیا، اس پر نزاع پیدا ہوا''۔

''انہوں نے مجھے یہ بات نہیں بتائی۔ میں سارے معاملے کو خود دیکھوں گا۔ اس مقدمے میں اثباتِ جرم اور سزا یابی کے امکانات کتنے ہیں؟''

''سر! سزا تو ہو کے رہے گی''۔

''اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''سر! رامن بہت تیز شخص ہے۔ باتیں کھل جانے کے بعد اس نے اپنے کارندوں کو ایسی جگہ بھیج دیا ہے جہاں ان کا

سراغ لگانا بہت مشکل ہے۔ پھر یہ کہ کسی کی تحریر بھی ریکارڈ میں نہیں۔ گویا یہ ثابت کرنا محال ہے کہ جعل سازی کا مرتکب ڈیلر ہے''۔

''پھر کیسے کہہ رہے ہو کہ سزا ملنا یقینی ہے؟''

''سر! میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ محکمے کے کسی اہلکار نے کاغذات خود نہیں لکھے، یہ سارا کام رامن نے اپنے قلم سے کیا ہے۔ میں نے ان کے اندازِ تحریر کا نمونہ لے کر تحریر کے ماہر سے تصدیق کرالی ہے''۔

''اوہ! میں اب سمجھا وہ ہماری شرائط پر کیوں مصالحت کرنا چاہتا ہے''۔

''کیسی شرائط سر؟''

''وہ گیارہ کروڑ دس لاکھ روپیہ دینے کو تیار ہے۔ تمہاری رائے کیا ہے؟''

''سر! میرے رائے میں تو انہیں جیل جانا چاہیے''۔

''کیوں؟''

''وہ کافی عرصہ سے ٹیکس چوری کر رہے ہیں۔ اگر انہیں پیسے لے کر چھوڑ دیا گیا تو دوسروں کو بھی شہہ ملے گی کہ بے ایمانی کرو اور پیسے دے کر چھوٹ جاؤ۔ جیل جانے سے باقی سب کو سبق ملے گا کہ صرف پیسے دے کر جان نہیں چھوٹ سکتی۔ اس مقدمے میں کامیابی محکمے کو مضبوط کرنے کا باعث ہوگی''۔

دو چار مزید باتیں کرنے کے بعد کمال کو جانے کی اجازت مل گئی لیکن وہ حالات سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ پہلے دن سے بیورو کو مضبوط کرنے میں کوشاں تھا اور دن رات کی محنت سے تجاویز تیار کی تھیں لیکن ہر بار وعدے ہی سننے میں آئے۔ ان پر عمل درآمد کبھی نہ ہوا۔ اس کے مدِ نظر اس نے پولیس کمشنر سے ملاقات کا ارادہ کیا۔

مسٹر سرنی اور مسٹر چند دونوں کیپیٹل پولیس کے جوائنٹ کمشنر تھے۔ چند روز پہلے بھی ان کا بلاوہ آیا تھا لیکن وہ ٹال گیا تھا کیونکہ اس کے خیال میں بیورو میں تعیناتی بہتر تھی، لیکن اب معاملہ مختلف تھا۔ اب وہ پہلے جا کر مسٹر چند اور بعد میں مسٹر سرنی سے ملا۔ موخر الذکر نے اسے کہا، ''اس وقت دارالحکومت میں کوئی مسلمان ڈپٹی کمشنر پولیس نہیں ہے۔ میں بنگالی نہیں ہوں اس لیے ایک بنگالی کو یہاں لانا مناسب ہوگا۔ اگر تم پسند کرو تو کمشنر سے ملاقات کرلو''۔

کمال کو تجویز مناسب نہ لگی کیونکہ وہ لوگ قابلیت کی بنا پر نہیں بلکہ صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے اسے تعینات کرنا چاہتے تھے۔ ٹھیک ہے وہ پیدائشی لحاظ سے مسلمان تھا اور نام سے بھی یہی ظاہر تھا مگر مدتیں ہوئیں اس نے اسلامی شعائر اور تعلیمات پر عمل کرنا ترک کر دیا تھا، لہٰذا وہ اپنی شناخت مسلمان کی حیثیت سے نہیں کرانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے مذہب کے حوالے سے نہیں بلکہ ایک بھارتی ہونے کی حیثیت سے جانا جائے، مگر اس کے ہم وطن اس پر تیار نہیں تھے۔ اسی لیے وہ کمشنر سے ملے بغیر واپس آ گیا۔

....

سنیچر کی صبح، کمال اپنے سسر، خوشدامن اور بینا کے ساتھ کلینک میں موجود تھا۔ ڈاکٹر داس گپتا نے معائنہ کرنے کے بعد پہلے ڈاکٹر حسین اور پھر اس کی مسز سے الگ الگ بات کی۔ شادی سے پہلے مسز حسین معدے کی تکلیف میں مبتلا تھی۔ باپ نے کسی عطائی سے دوا لی، فرق نہ پڑا تو نیم حکیم نے مارفین کا ٹیکہ لگا دیا۔ ریحانہ حسین کو سکون ملا تو مارفین انجکشن لگنے شروع ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچاری اس کی عادی ہو گئی۔ شادی کے بعد عطائی والا کام ڈاکٹر حسین نے خود سنبھال لیا۔ مارفین پر پابندی کے بعد اس نے پیتھیڈین پر لگا دیا، اور جب اس پر بھی پابندی لگی تو اسے بلیک مارکیٹ سے خریدنا شروع کر دیا۔ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے وہ دوا فروشوں کی وساطت سے خریدنے لگا۔ اس سے جہاں ایک جانب اس پر مالی بوجھ کا اضافہ ہوا، دوسری

طرف شہرت کے داغدار ہونے کا خدشہ بھی تھا۔ کمال کو معلوم ہوا تو اس نے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ غیر قانونی کام ہے، اور یہ کہ اس کا علاج ممکن ہے۔ بار بار کوشش کے بعد بالآخر ڈاکٹر حسین بیوی کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی سلسلہ میں وہ سب کلینک میں موجود تھے۔

جب کمال واپس آنے لگا، مسز حسین نے رونا شروع کر دیا، ''مجھے اکیلی مت چھوڑو، میں تم لوگوں کے ساتھ جاؤں گی، اپنا علاج میں خود کر لوں گی''۔ وہ کبھی حسین کو پکڑتی، کبھی کمال کی منت زاری کرتی۔ مینا نے پاس آ کر کہا، ''جب ماما اتنا رونا دھونا کر رہی ہیں تو کیا بہتر نہیں کہ انہیں ساتھ لے جائیں؟'' ڈاکٹر حسین نے بھی مینا کی ہاں میں ہاں ملائی لیکن کمال نے صاف جواب دیا، ''خوانخواہ کی ہمدردی مت جتاؤ۔ یہ ٹھیک ہو جائے گی۔ اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے''۔ ڈاکٹر حسین ساکت کھڑا رہا جسے کمال تقریباً زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ مسز حسین چیختی چلاتی رہی۔ کمال انہیں لے کر اپنے گھر آ گیا۔

ڈاکٹر حسین گم سم تھا لیکن مینا چراغ پا ہو رہی تھی۔ کمال نے اسے سمجھایا کہ اُس کی ماں کو علاج کے لیے مجبوراً وہاں چھوڑا گیا ہے، خوشی سے نہیں، لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی، ''اگر وہ تمہاری ماں ہوتی تو اس طرح چھوڑ کے نہ آتے، وہ میری ماں ہے، میں اس کے ساتھ جبر نہیں کر سکتی۔ تمہاری ماں ہوتی تو تم اس کا دکھ محسوس کرتے''۔ کمال چپ رہا مگر ذہن میں تھا کہ مقررہ تاریخ سے پہلے اسے ملنے نہیں جائے گا۔

معینہ روز وہاں پہنچے تو مسز حسین نے عملے کے درشت رویّے کی شکایت کی اور لجاجت سے کہنے لگی کہ اسے یہاں سے لے جایا جائے ورنہ وہ زندہ نہ رہ سکے گی۔ مینا نے بھی باپ سے یہی درخواست کی۔ ڈاکٹر حسین نے کمال کی طرف دیکھا، اس نے جواب دینے کی بجائے اسے باہر آنے کو کہا۔ باہر آ کر ڈاکٹر حسین نے پوچھا، ''ہاں، کہو، اب کیا کرنا چاہیے؟''

''کچھ نہیں، گھر چلتے ہیں''، کمال کا بڑا مختصر جواب تھا۔

''لیکن وہ کہہ رہی ہے کہ یہاں کے لوگ نہ صرف بدتمیزی کرتے ہیں بلکہ اس کی عزت بھی اچھالی جاتی ہے''۔

''نشہ کے عادی افراد اس قسم کی الزام تراشی کرتے ہی رہتے ہیں۔ آپ خود ایک معالج ہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کے اور میرے تعلقات جانتے ہوئے بھی یہاں کا عملہ ایسی حرکت کرے؟''

ڈاکٹر حسین چپ رہا، لیکن مینا کہنے لگی، ''کیا میری ماں جھوٹ بول رہی ہے؟''

''وہ صرف کلینک سے نکلنا چاہتی ہے''۔

''تو یہاں سے لے جاؤ''۔

''ہاں، میں لے جاؤں گا لیکن علاج ہونے کے بعد''۔

''تم پتھر دل انسان ہو، کسی کو بھی جان سے مار سکتے ہو''۔

''چلو مان لیا، میں پتھر دل ہوں۔ آیئے اب گھر چلتے ہیں''، اور پھر کمال آگے آگے چل پڑا۔

وہ سب بڑبڑ کرتے گھر لوٹ آئے۔ یہاں پہنچ کر وہ پھر سے کمال کے سر ہو گئی، ''اگر وہ وہاں نہیں رہنا چاہتی، تم کیوں مجبور کر رہے ہو؟''

''اس کی اپنی بہتری کے لیے''۔

''اس کی بہتری کے لیے یا اپنی عزت کی خاطر؟''

''اگر میں اپنی خوش دامن کو صحت مند دیکھنا چاہوں تو اس میں غلطی کیا ہے؟''

''کیا خیال ہے اکیلے تم ہی اس کے علاج کرنا چاہتے ہو؟''

''یقیناً آپ سب لوگ چاہتے ہیں لیکن تم میں اس کی حالت دیکھنے کی ہمت نہیں''۔

مینا نے جواب تو نہ دیا لیکن اس کے رویّے سے صاف علم ہورہا تھا کہ کمال کے بارے میں اس کی سوچ دوستانہ نہیں رہی۔ کمال نے گفتگو میں تو اسے زیر کرلیا مگر دونوں کے تعلقات میں سرد مہری غالب آگئی۔

....

6 دسمبر 1992 کی بات ہے، کمال اپنے دفتر کام میں مصروف تھا جب ڈی، آئی، جی ستیابن چیٹر جی نے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ اس کے کمرے میں گیا۔ چیٹر جی نے بابری مسجد کی شہادت کا اسے بتایا۔ کمال اس خبر سے لاعلم تھا۔ چیٹر جی نے پوچھا،''کیا تم جانتے ہو یہ واقعہ کیسے ہوا؟ انتظامیہ کیا کر رہی تھی؟ کیا متعلقہ حکام نے روکا نہیں یا روک نہیں سکتے تھے؟''

کمال کو واقعہ کا سن کر دکھ ہوا مگر حیرت نہیں کیونکہ حالات جس سمت جارہے تھے، ایسے واقعات کا رونما ہونا ناگزیر تھا۔ چیٹر جی نے سوال کیا،''تمہارا علم وسیع ہے، کیا تم اس واقعہ کے محرکات پر روشنی ڈال سکتے ہو؟''

''سر! آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟''

''یہ جھگڑا پیدا کیسے ہوا؟''

''یہ سارا فساد انگریزوں کا کھڑا کیا ہوا ہے''۔

''انہیں کیا ضرورت تھی؟''

''سر! انگریزی حکومت ریاست اودھ کو اپنی قلمرو میں ضم کرنے کی متمنی تھی اور وہ 13 فروری 1856 کو اپنی کاوش میں کامیاب ہوگئی۔ اس سے بہت پہلے 1765 یعنی بکسر کی لڑائی کے بعد انہوں نے اودھ کے نواب کو ایک معاہدہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔ 1801 میں ایک اور معاہدے کی رو سے اودھ کو کمپنی کی حکومت کے زیر تحفظ ایک باجگزار ریاست بنادیا گیا اور 1816 میں بالآخر نواب کو ایودھیا محل سے دستبرداری اختیار کرنا پڑی۔ تین سال بعد انگریزوں نے نواب کو''راجہ'' کا لقب قبول کرنے پر قائل کیا اور جھانسہ یہ دیا کہ اس طرح ریاست مغل شہنشاہیت کے اثر و نفوذ سے محفوظ رہے گی''۔

''لیکن تنازعہ کیا تھا؟''

''ہندوؤں کے ایک طبقے کا خیال تھا کہ بابر بادشاہ نے رام کی جنم بھومی کو مسمار کر کے وہاں ایک مسجد تعمیر کی تھی، اس کے برعکس مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ حقیقت میں ہنومان گڑھی کی تعمیر مسجد کی جگہ پر ہوئی تھی''۔

''اختلاف کی ابتدا کب ہوئی؟''

''سر! کام تو 1813 کے اوائل میں شروع ہوا تھا لیکن انیسویں صدی کے قریباً نصف میں تنازعہ نے شدت اختیار کی''۔

''بابر بادشاہ نے مسجد کو کب تعمیر کیا تھا؟''

''شاید بابر نے اسے تعمیر نہیں کیا تھا''۔

''پھر کس کا کام تھا؟''

''مسجد کا طرزِ تعمیر جون پور کی شرقی مملکت کی عطا اللہ مسجد (یہ اٹالہ مسجد بھی مشہور ہے) کے مماثل ہے''۔

''رام کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟''

''رام کی داستان صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی بہت مشہور اور مقبول ہے۔ والمیکیؔ کی مرتب کردہ رامائن میں یہ کہانی پائی جاتی ہے۔ اس وقت بھی رام کی شہرت ایک بہادر کشتری کی تھی''۔

''پھر وہ دیوتا کیسے مشہور ہوا؟''

''رام نندی فرقے کی وجہ سے رام کو وشنو اور رامائن کا اوتار مانا جانے لگا اور اس کی ابتدا تلسی داس کے مذہبی نوشتہ'' رام چرت مناس'' سے ہوتی ہے''۔

''کیا رام کا جنم ایودھیا میں ہوا تھا؟''

''رامائن کے مطابق وہ ایودھیا میں پیدا ہوا تھا لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا یہ موجودہ ایودھیا ہے یا نہیں؟ اس کا تعلق تاریخ سے ہے اور تا حال اس کا فیصلہ نہیں ہو سکا''۔

''پھر یہ کیسے طے ہوا کہ جہاں مسجد تعمیر ہوئی تھی، اسی جگہ پر رام نے جنم لیا تھا؟''

''سر! برطانوی وقائع نویسوں نے جو تحریر کیا وہ مقامی لوگوں سے سنی ہوئی باتیں تھیں کہ 1528 میں بابر نے رام کی جنم بھومی پر تعمیر کردہ مندر کو مسمار کر کے وہاں ایک مسجد کی بنیاد ڈالی تھی''۔

''مسجد کی تعمیر کے وقت کیا وہاں کوئی مندر موجود تھا؟''

''سر! ممکن ہے کسی تباہ شدہ مندر سے چند ایک ستون اٹھا کر مسجد میں لگا دیئے گئے ہوں۔ اس سے یہ قطعاً تصدیق نہیں ہوتی کہ اسی مقام پر کبھی کوئی مندر تھا''۔

''یہ تنازع کیسے حل ہو سکتا ہے؟''

''سر! آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''کیونکہ تم مسئلہ کو سمجھتے ہو، ملک کو سامنے رکھ کر سوچتے ہو اور مسئلہ کا غیر جانبداری سے تجزیہ کرتے ہو''۔

''سر! اس کا حل ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ تمام فریقین ملک کے سیکولر قوانین کا احترام کریں''۔

''کیا تمہارے خیال میں ہمارا قانون سیکولر ہے؟''

''سر! ہمارا آئین سیکولر تھا لیکن مذہبی جماعتوں نے کئی مواقع پر ریاست کو سیکولر اصولوں سے ہٹنے پر مجبور کیا ہے''۔

''تمہاری رائے میں موجودہ صورتِ حال تک پہنچنے میں کن محرکات کا عمل دخل ہے؟''

''سر! یہ ایک طویل تاریخ ہے جس میں متعدد عوامل اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں''۔

''چند ایک اہم عوامل کیا ہیں؟''

''سر! 1855 میں اختلافات پر دونوں فریقین کے ذی فہم اور مخلص لوگوں نے مفاہمانہ جذبے سے کام لیا، وہ یہ کہ مسلمانوں نے مسجد اور ہندوؤں نے اس کے سامنے قطعہِ زمین پر عبادت کرنے پر اتفاق کر لیا۔ 1949 میں کچھ لوگوں نے مسجد کے اندر رام اور سیتا کی مورتیاں رکھ کر شور مچا دیا کہ یہاں اپنی جنم بھومی میں رام خود ظاہر ہوئے تھے۔ 1986 میں انتظامیہ نے ہندوؤں کو مسجد کے اندر پوجا پاٹ کی اجازت دے دی، اس پر مسلمانوں نے عدالت سے رجوع کیا۔ عدالت کا حتمی فیصلہ ابھی تک نہیں آیا۔ (نوٹ: عدالتِ عظمیٰ کا فیصلہ آ چکا ہے۔ دیکھئے 'حواشی، بابری مسجد') یہ ذکر غیر ضروری نہیں کہ 1934 میں ہنومان گڑھی کے بیراگیوں نے مسجد کے چند ستون مسمار کر دیئے تھے جس پر انتظامیہ نے انہیں سوا لاکھ روپیہ جرمانہ کیا اور پھر مسجد کی مرمت کر دی''۔

''جب ہندو اتنے ہی جنونی ہو رہے تھے تو مسلمانوں نے جذبہ خیر سگالی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں مندر کیوں نہ تعمیر کرنے دیا؟''

''سر! میں نے یہی سوال ایس، پی فیض آباد سے کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ مسلمان معززین سے اس معاملہ میں بات چیت ہو گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہندو اس امر کی ضمانت دیں کہ کسی اور مسجد کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، ہم یہ مسجد ان کے

حوالے کردیں گے۔تاہم ہندوؤں نے ایسی ضمانت نہ دی''۔

''کیوں؟''

''1984 میں وشوا ہندو پرشاد کے ایک کٹر گروہ نے ایودھیا میں رام جنم بھومی، متھرا میں کرشن جنم استھان اور ورانسی (بنارس) میں وشواناتھ مندر کے ساتھ بھی یہی کچھ کرنے کا اعلان کر دیا۔اگر اس سلسلہ میں ان کی بات مان لی جائے تو یہ لہر بتدریج دوسرے شہروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی''۔

''وہ کیسے؟''

''مذہبی جذبات بھڑکا کر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش''۔

''شکریہ کمال! مجھے بہت سی باتوں سے آگاہی ہوئی ہے''۔

کمال اسے سیلوٹ کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔اس سانحہ سے وہ انتہائی مضطرب اور پریشان تھا۔شام ڈھل چکی تھی، دفاتر بند ہو گئے تھے، وہ گھر کی جانب روانہ ہوا۔سڑکوں بازاروں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔پولیس کی گاڑیاں گشت پر تھیں۔ گھر پہنچ کر اس نے ٹی وی لگایا۔سارے چینلز مسجد کے گنبد کی مسماری دکھا رہے تھے۔ہندی زبان میں ہونے والے براہ راست تبصروں میں بتایا جا رہا تھا کہ ہندو انتہا پسند رہنما ایل۔کے۔ایڈوانی، ایم۔ایم۔جوشی اور اوما بھارتی نعرہ زن تھے''ایک دھکا اور دو، بابری مسجد توڑ دو''۔

اس رات کمال صحیح طور کھانا بھی نہ کھا سکا۔اس کے بہت سے دوست اور آشنا فون کر رہے تھے۔صدیق الزمان نے کہا''ہماری رہائش ایک مخلوط آبادی میں ہے، لوگ جتھے بنا کر آ رہے ہیں۔ہمیں بہت خطرہ ہے۔کیا آپ پولیس کے کچھ لوگ یہاں بھیج سکتے ہیں؟''

کمال نے کیپیٹل پولیس کے کنٹرول روم فون کیا۔اسے بتایا گیا کہ کئی علاقوں سے گڑبڑ کی اطلاعات ملنے پر پولیس گشت میں اضافہ کر دیا گیا ہے، پولیس کمشنر یہاں موجود ہیں اور تمام ممکنہ حفاظتی اقدامات کئے جا رہے ہیں۔اسی اثنا میں جودھ پور پارک سے سریش باسک نے کالی مندر میں توڑ پھوڑ کی اطلاع دی۔کمال نے تردید کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی کنٹرول روم بات ہوئی ہے، مندر محفوظ ہے۔''لیکن لوگ کہہ رہے ہیں کہ بی،بی،سی کی خبر ہے''، باسک نے بتایا۔

''ان سے پوچھو کیا انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں۔بہتر ہے ان پر اعتبار مت کرو''۔

کمال کو اندازہ ہو گیا کہ ان فسادات میں بہت سے زندگیاں ختم ہو جائیں گی۔سابقہ تجربات بھی ایسے ہی تھے۔ 1989 میں رام پتھر کی پوجا کے موقع پر کوٹا، اندور اور بھاگل پور میں ہنگامے پھوٹ پڑے تھے۔ایڈوانی اور کارسیوک کی رتھ یاترا کے نتیجہ میں ایک سو سولہ فسادات اور 567 ہلاکتیں ہوئی تھیں۔کمال کو دکھ اس بات کا تھا کہ قاتل اور مقتول دونوں اس کے ہم وطن تھے، انہیں تو بہتر اور خوشحال مستقبل کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہیے تھی لیکن بدقسمتی سے وہ آپس میں ہی گلے کاٹنے لگ گئے۔یہ سوچ کر اسے اپنی ذات کے ساتھ ساتھ دوسروں کے عدم تحفظ کے بارے میں خوف محسوس ہونے لگا۔اس نے حالات معلوم کرنے کے لیے براہی فون کیا۔وہاں حالات پرسکون تھے۔

....

موسم سرما کی صبح، کمال کے ذہن پر دھند چھائی ہوئی تھی۔خوشگوار دھوپ بھی اس دھند لکے کو کم نہ کر سکی۔گذشتہ شام کے واقعہ نے اسے بہت تکلیف دی تھی۔ہوا یہ تھا کہ گذشتہ روز وہ جلد گھر آ گیا۔کھانا پکانے کے بعد تیسری منزل کی بالکونی میں

کھڑا تھا کہ گوتم موٹر سائیکل پر سوار گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ مینا اس سے چمٹی بیٹھی تھی۔ بریک لگی تو مینا جھٹ کے سے گوتم کے اوپر آ گری جس پر دونوں کھل کھلا کر ہنسے۔ موٹر سائیکل سے اتر کر وہ چند منٹ اس سے باتیں کرتی رہی، پھر سیڑھیوں کی جانب چل پڑی۔ کمال کو یہ حرکت بہت بری لگی کیونکہ انسٹیٹیوٹ اتنا نزدیک تھا کہ وہ پیدل بھی آ سکتی تھی یا چاہتی تو رکشہ بھی لیا جا سکتا تھا جو انسٹیٹیوٹ کے دروازے پر ہمہ وقت دستیاب تھے، اور پھر یہ کہ گوتم کسی اور لیبارٹری میں کام کرتا تھا۔ ایک ہی موٹر سائیکل پر اکٹھے سواری کرنا نہ تو محفوظ تھا، نہ مناسب۔

چند روز قبل مینا کی بہن اور بھائی آئے تھے۔ وہ انہیں گوتم سے ملانے انسٹیٹیوٹ لے گئی۔ واپسی پر دونوں گوتم کی تعریفیں کرتے تھکتے نہیں تھے۔ کمال بے بسی کی تصویر بنا بیٹھا سنتا رہا۔ وہ کیا کر سکتا تھا، کیا ہونا چاہیے؟ ہر چیز کی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ مینا کو کیسے سمجھائے؟ مضطرب اور بے بس کمال کچھ نہ سوچ سکا۔

صبح مینا نے باتھ روم سے باہر نکلتے ہی کہہ دیا کہ وہ رات دیر سے گھر آئے گی۔ کمال نے سوچا کہ اب مینا کی طنابیں کھینچنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس کے سوال کیوں؟ کا جواب بڑا واضح تھا، ''مجھے گوتم کے ساتھ ہیلر جانا ہے''۔

''گوتم کے ساتھ کیوں؟ میں لے جاؤں گا''۔

''تمہارے ساتھ جانے میں یہی تو مشکل ہے کہ ہر جگہ تمہارے چاہنے والے مل جاتے ہیں۔ میرا اپنی مرضی سے کہیں جانا مشکل ہو جاتا ہے، اور پھر یہ کہ گوتم میرا دوست ہے، اس کے ساتھ جانے میں کیا برائی ہے؟''

''کوئی برائی نہیں۔ ہیلر جانے کی بات نہیں، اصل معاملہ گوتم کے ساتھ جانے کا ہے۔ ٹھیک ہے، جاؤ''۔

مینا نے جواب نہ دیا اور اپنا کھانا اٹھا کر لیبارٹری روانہ ہو گئی، کمال دفتر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ جھنجلاہٹ کا شکار رہا، گھر واپس آنے کو بھی جی نہ چاہا۔ رائے گنج میں ایک سرکاری مصروفیت تھی جہاں اس کا جانا ضروری نہیں تھا، کوئی جونیئر افسر جا سکتا تھا، لیکن وقت گزاری کے لیے اس نے خود جانے کا فیصلہ کیا۔

....

شام کی گاڑی سے روانہ ہو کر کمال دو دن کے بعد دفتر آیا۔ ڈی، ایس، پی کا نجی لال نے مطلع کیا کہ وہ میڈم کو بتانے کے لیے گھر گیا تھا، وہاں انتظار کرنے کے بعد کوئی ساڑھے گیارہ بجے میڈم گھر آئیں تو انہیں آپ کے رائے گنج جانے کی اطلاع دے دی۔ کمال شام کو گھر پہنچا تو مینا کو پہلے سے موجود پا کر بہت حیران ہوا۔ اس کا رویہ دوستانہ اور معذرت خواہانہ تھا۔ کمال نے گمان کیا کہ مینا کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے، لیکن نہیں۔ چند دن بعد اس نے لیبارٹری سے واپس آ کر شکایت آمیز لہجے میں کہا، ''جانتے ہو آج گوتم نے شیلا سے کیا کہا ہے؟''

''کیا کہا ہے اس نے؟''

''اس نے شیلا سے میرے بارے میں کہا ہے کہ میں بے شرم اور عیب جو ہوں''۔

اپنی بیوی کے متعلق ایسے الفاظ کوئی شخص بھی برداشت نہیں کر سکتا، کمال کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی۔ اس نے پوچھا، ''اس نے ایسا کیوں کہا؟''

''اس کا تو مجھے علم نہیں لیکن اگر اب اس نے مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش کی تو میں اسے سبق چکھا دوں گی۔ اس نے مجھ سے کئی ہزار روپے ادھار لیے ہیں جو ابھی تک واپس نہیں کیے، اب میں واپسی کا تقاضا کروں گی''۔

بڑبڑ کرتی وہ باتھ روم چلی گئی۔ کمال سمجھ گیا کہ گوتم اب تک مینا کو چکر دیتا رہا ہے۔ وہ شیلا سے شادی کرنے کا خواہاں ہے اور اسی لیے اس کی موجودگی میں مینا کی توہین کی ہے۔ ادھار کا سن کر بھی کمال کو افسوس ہوا۔ اس نے ایک بار گھر کی زمین

خریدنے کی خاطر مینا سے ادھار مانگا تو اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا، ''یہ تمہاری ذمہ داری ہے، مجھ سے کاہے کا ادھار؟''
اور اب وہ بتا رہی ہے کہ اس نے گوتم کو کئی ہزار روپے دیئے ہوئے ہیں۔

....

16 مارچ 1993 کیپٹل پولیس کے لیے بڑا کٹھن دن تھا۔ ایک مارکیٹ میں دھماکے سے 69 افراد کی ہلاکت ہوئی تھی۔ وہاں ایک گھر میں جواریوں کے سرغنہ کا ڈیرہ تھا جہاں اس نے باقی قانون شکن گروہوں پر اپنی برتری جتانے کے لیے اسلحہ اور بارود جمع کر رکھا تھا۔ کسی نامعلوم وجہ سے بارود میں دھماکہ ہوا اور 69 لوگ ہلاک ہو گئے۔ مالک مکان اور دیگر چند افراد دہشت گردی اور تخریب کاری کے جرم میں گرفتار کر لیے گئے۔ یہ مذموم دھندا کیمونسٹ پارٹی (مارکسسٹ) کے ایک مقامی نیتا اور چند پولیس والوں کی سرپرستی میں ہو رہا تھا جس کے باعث وہ پولیس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ بیکنٹھ پور کے تجربے کو حکومت نے دہلی میں آزماتے ہوئے کمال کو ڈپٹی کمشنر پولیس مقرر کرنے کے علاوہ چند ایک اہم سیکشنز بھی اس کے تحت کر دیئے۔

اس نے خفیہ اطلاعات کی بنا پر چھاپے مارنے شروع کیے۔ سرغنوں کی جائدادوں کو سربمہر کیا۔ اس پر اگرچہ ان کی کارروائیاں کم ہو گئیں لیکن اطلاعات ہنوز موصول ہو رہی تھیں کہ گروہ اب بھی کہیں کہیں سرگرم ہیں، چنانچہ کمال نے ان کی سرکوبی کا منصوبہ بنایا۔ لیکن جہاں کہیں بھی یہ لوگ مصروف تھے، سیاسی سرپرستی کے بغیر ان کا کام کرنا مشکل تھا۔ ایک مشکل بہرحال رہتی کہ اگر قانون شکنوں کے مقابلہ میں پولیس کی افرادی قوت کم ہوتی تو اول الذکر گروہوں کا پلہ بھاری رہتا اور دوسری صورت، یعنی زیادہ پولیس فورس کی موجودگی میں ان میں سے کوئی نہ کوئی ان کارروائیوں کی اطلاع دوسرے فریق تک پہنچا دیتا۔ ایک کارروائی کے دوران ڈپٹی کمشنر پولیس کو نہ صرف ہلاک بلکہ اسے جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے کمال اہلکاروں کے انتخاب میں بہت محتاط تھا۔ اس وقت بھی وہ یہی کام کر رہا تھا جب اردلی نے اسے براہی سے آنے والے ایک ملاقاتی کی اطلاع دی۔ کمال نے بلایا، وہ عکاس علی تھا جو اسکول میں کمال سے چار برس جونیئر تھا اور پولیس کی ملازمت حاصل کرنے کے بعد آج کل علی نگر میں تعینات تھا۔ اس نے کمال سے اپنے تبادلہ کی درخواست کی۔ وجہ معلوم کرنے پر اس نے بتایا کہ برہمن باورچی اس کے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگاتا جو اسے خود دھونے پڑتے ہیں۔

''لیکن اپنے برتن دھونا تو کوئی بری بات نہیں''، کمال نے کہا۔

''سر! برتن دھونے تک کی بات تو ٹھیک ہے لیکن مجھے بار بار یہ احساس دلانا کہ مسلمان ہونے کے سبب میں ہندوؤں سے مختلف ہوں، میرے لیے ذلت آمیز اور اذیت ناک ہے''۔

کمال سمجھ گیا کیونکہ اقلیتی فرقے کو ایسی باتوں کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اس نے کہا، ''تم نے اپنے ایس پی سے بات کی؟''
''میں نے کوشش کی تھی لیکن اپنی بات سمجھا نہیں پایا۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ باورچی سرکاری ملازم نہیں اس لیے وہ اسے کچھ نہیں کہہ سکتے''۔

قانونی لحاظ سے ایس پی کا جواب درست تھا لیکن عکاس کا مسئلہ بھی سنجیدہ تھا۔ کمال نے کہا، ''میں ایس پی سے تمہارے تبادلے کی بات کر لوں گا لیکن اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ دوسری جگہ پر یہ مسئلہ نہیں ہوگا؟''
''جی سر! اس بات کی تو کوئی ضمانت نہیں''۔ ایک دو ایسی ہی باتیں کرنے کے بعد عکاس علی اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کمال بھی چھاپہ مارنے کے لیے باہر آ گیا۔

....

اسے اطلاع ملی تھی کہ ایک بدنام سٹے باز کالا سونا جے پوریا کچی آبادی میں خلاف قانون سرگرمیوں میں مصروف

ہے۔ پہلے یہ کام کھلم کھلا ہوتے تھے لیکن پے در پے چھاپوں کے باعث اب خفیہ طور پر ہونے لگے۔ سائیکل سواروں کے ذریعے سٹے بازی کے نمبر اور نتائج ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائے جاتے تھے۔ چونکہ سائیکل سوار ہر روز اپنا مقام تبدیل کرتے، اس لیے ان کا کھوج لگانا بہت مشکل تھا۔ کمال کو اطلاع ملی تھی کہ آج گاندھی روڈ اور نیتا جی روڈ کے سنگم پر سائیکل سواروں کے ذریعے یہ کاغذات اکٹھے کیے جائیں گے۔ وہ خود سادہ لباس میں وہاں پہنچا، چند سپاہیوں کو بھی سادہ کپڑوں میں ادھر ادھر کھڑا کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک ایک سائیکل سوار آتا، وہاں کھڑے دوسرے شخص کو کاغذات کا لفافہ دیتا اور تیزی سے نکل جاتا۔ اسی طرح کئی سائیکلوں والے آئے، وہاں کھڑے شخص لفافے دیتے اور موقع سے بھاگ جاتے۔ جب متعدد لفافے جمع ہو گئے تو کمال کے اشارے پر سادہ لباس میں پولیس نے گھیرا ڈال کر ایک سائیکل سوار اور متعلقہ شخص کو گرفتار کر لیا، ساتھ ہی وائرلیس پر دیگر اہلکاروں کو موقع پر پہنچنے کا حکم دیا۔ گرفتار شدگان کی نشاندہی پر جے پوریا کی بارکوں پر چھاپہ مار کر کچھ اور لوگوں کو بھی حراست میں لیا گیا۔ اتنے میں مقامی رہائشیوں نے کمیونسٹ پارٹی (ایم) کے ایک لیڈر جے، این، رائے کی قیادت میں پولیس کا گھیراؤ کر لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پولیس نے بے گناہوں کو حراست میں لیا ہے۔ ابتدائی تحقیق سے کمال کو معلوم ہو چکا تھا کہ ساری مجرمانہ کارروائیاں اسی لیڈر کی سرپرستی میں ہو رہی ہیں، لہٰذا اس کا بے چین ہونا فطری امر تھا۔

جے، این، رائے کا مطالبہ تھا کہ پولیس وہیں بیٹھ کر بات چیت کرے بصورتِ دیگر مقامی لوگ خود ہی حالات سے نبٹ لیں گے۔ کمال اس پر رضامند نہیں تھا، ہاں البتہ اسے اپنے یا ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں بیٹھ کر گفتگو کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہیں رہ کر فوری تفتیش میں رکاوٹ آئے یا پھر ایک حالیہ واقعہ کی طرح کوئی دھوکہ دینے کی کوشش کرے۔

....

ہوا یہ تھا کہ دو دن قبل ایک جوئے خانہ پر چھاپے میں کچھ لوگ پکڑے گئے۔ ایک شخص نے فون پر اپنا نام جے، این، رائے، پرنسپل جے پوریا کالج بتایا۔ کمال اساتذہ کی بہت عزت کرتا تھا اس لیے اسے بھی بڑی تکریم سے پوچھا کہ وہ ان کی کیا خدمت کر سکتا ہے۔ اس نے بتایا کہ جن لوگوں کو حراست میں لیا گیا ہے ان میں نارائن نام کا ایک لڑکا، جو اس کا طالب علم تھا، ایسے کاموں میں بالکل ملوث نہیں۔ کمال نے یقین دلایا کہ وہ اس معاملہ کی خود چھان بین کرے گا۔ معلوم کرنے پر پتہ یہ چلا کہ نارائن کو موقعِ واردات سے گرفتار کیا گیا ہے۔ ممکن ہے وہ قمار بازی کی نیت سے وہاں موجود نہ ہو لیکن از روئے قانون موقع پر موجود ہر شخص کو ملزم گمان کر کے کارروائی کی جاتی ہے۔ کمال نے مزید تفتیش کی خاطر اس کالج کے پروفیسر شمن سنیال کو فون کر کے نارائن کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ لڑکے کو ذاتی طور پر جانتا ہے، جو اس قسم کے کاموں میں ملوث نہیں لگتا۔

کمال نے جواب دیا، ''مجھے آپ کے پرنسپل رائے صاحب نے بھی یہی بتایا ہے''۔

''کیا؟''

''آپ کے پرنسپل رائے صاحب۔۔۔۔۔۔''۔

''کیا یہی نام بتایا تھا؟''

''جی ہاں''۔

''لیکن ہمارے پرنسپل تو پروفیسر زرل باسک ہیں''۔

''کیا رائے صاحب کبھی آپ کے پرنسپل رہے ہیں؟

''نہیں، وہ سینئر لیکچرار کی حیثیت سے ریٹائر ہو گیا تھا۔ دراصل وہ برسرِ اقتدار جماعت کا ایک لیڈر ہونے کی وجہ سے خود کو پرنسپل سے بھی بڑا سمجھتا ہے۔ شاید یہی بات ذہن میں رکھ کر اس نے اپنا تعارف اس طور کرایا ہوگا۔ یہ بھی سنا ہے کہ اگلے

انتخابات میں اسمبلی کی رکنیت کا امیدوار ہے''۔

''ہوسکتا ہے، لیکن جانتے بوجھتے ہوئے غلط بیانی کرنا بالکل غیر مناسب ہے''۔

''میں آپ کو پروفیسر باسک اور رائے صاحب کے ٹیلیفون نمبر دے رہا ہوں۔خود ہی تصدیق کرلیں''۔

کمال نے پہلے پروفیسر باسک کو فون کیا،''کیا میں پرنسپل پروفیسر باسک سے بات کرسکتا ہوں؟''

''میں پروفیسر باسک ہی بات کررہا ہوں''۔

''میرا نام کمال منڈل ہے، ڈپٹی کمشنر پولیس''۔

''اوہ مسٹر منڈل! آپ کی وجہ سے پولیس کا نام روشن ہو رہا ہے۔ میں بھی آپ کا بہت گرویدہ ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت؟''

کمال نے پروفیسر کو تفصیل بتائی۔ گفتگو سے علم ہوا کہ رائے کا کالج سے اب صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ انتظامی کمیٹی کا چیرمین ہے۔ بعد میں کمال نے رائے کے نمبر پر فون کیا اور کہا،''میں پرنسپل جیپوریا کالج سے بات کرنا چاہتا ہوں''۔

''میں بول رہا ہوں''۔

''کیا پرنسپل جے، این رائے صاحب بات کررہے ہیں؟''

''بالکل۔آپ کون ہیں؟''

کوئی اور بات کیے بغیر کمال نے فون بند کردیا۔اب مزید کسی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسے لوگوں کو تو جیل میں ہونا چاہیے چہ جائیکہ وہ اسمبلی کے رکن بنیں اور اسی معیار کی قانون سازی کریں۔ خیر! جب اس نے بات چیت کرنے اور اپنے آدمیوں کو چھوڑنے کی بات کی تو کمال رہ نہ سکا اور پوچھ لیا،'' آپ وہی رائے صاحب ہیں جنہوں نے مجھے فون کرکے اپنا تعارف بطور پرنسپل جے پوریا کالج کرایا تھا؟''

''ہاں بالکل، اور آپ نے اس لڑکے کو رہا کردیا تھا''، رائے نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا۔

کمال کے ذہن میں آیا تعارف کرانے پر اس نے رائے کو بڑے احترام سے''جی سر!'' کہہ کے مخاطب کیا تھا جس کے سبب وہ اتنے تکبر سے بات کررہا ہے۔ فی الحال اس نے اتنا کہا،''ہم اس وقت اپنا فرض ادا کررہے ہیں۔ پلیز! اس میں رکاوٹ مت ڈالیں''۔

''ہم بھی اپنا فرض ادا کررہے ہیں۔ہم آپ کو ان لوگوں پر زیادتی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ انہیں فوری طور پر رہا کرو''۔ اور اس کی شہ پر کئی لوگ پولیس سے ہاتھا پائی پر اتر آئے۔ سٹہ بازی اور قمار بازی جیسے جرائم میں ملوث لوگ پہلے ہی سے کمال کی کارروائیوں پر پیچ پاتے تھے کیونکہ ان کے غیر قانونی کام تقریباً ختم ہوکررہ گئے تھے، لہٰذا انہوں نے برسرِ اقتدار جماعت کی طرف سے اشیرباد ملنے کے بعد پولیس پر تشدد بھی شروع کردیا۔ کمال نے کنٹرول روم فون کرکے مزید نفری طلب کیا لیکن ان کی آمد سے پہلے ہی ہجوم نے اپنے لوگوں کو چھڑا لیا تھا۔ بپھرے ہوئے ہجوم کو قابو کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ گولی چلا دی جائے مگر کمال ایسا نہیں چاہتا تھا مبادا کچھ لوگ ہلاک یا گھائل ہوجائیں۔

بصد مشکل وہ اپنے اہلکاروں کو وہاں سے نکال کر دو گرفتار افراد کو ساتھ لیے پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ وہاں اسے کمشنر پولیس مسٹر ننڈولکر کا بلاوہ آیا جن کا مشورہ تھا کہ فی الوقت رائے یا کسی اور کو گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ لوگ مشتعل ہیں، جیسے ہی حالات قابو میں آئیں، سب کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے گا۔ کمال نے رائے کی غلط بیانی کا بھی ذکر کیا کہ کیسے اس نے خود کو پرنسپل ظاہر کیا تھا، اس لیے اس کی گرفتاری ضروری ہے۔ کمشنر نے اصولی طور پر اتفاق کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا

کہ گرفتاری سے وہ ہیرو بن جائے گا اور یوں اس کا مقصد پورا ہوگا، بہتر یہی ہے کہ اسے آزاد رکھ کر اس کی غلط بیانی اور دھوکہ دہی کا بھانڈا پھوڑا جائے جس سے وہ اپنے آپ ہی لوگوں کی نظروں سے گر جائے گا۔

''لیکن سر! اس نے ملزموں کو زبردستی چھڑایا ہے''۔

''میں نے مقدمہ دائر کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ تمہیں علم ہی ہے کہ اس کی رسائی وزیرِ داخلہ اور وزیرِ اعلیٰ تک ہے۔ اس وقت اس کی گرفتاری ہمارے مقدمے کو کمزور کردے گی لیکن جب ہم ساری صورتِ حال ان کے گوش گزار کریں گے تو یہ بات ہماری موافقت میں جائے گی۔ مجھ پر بھروسہ رکھو، میں ان سے پولیس کے شاندار کردار پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کروں گا۔ بس مجھے تھوڑا سا وقت چاہیے''۔

اس پر کمال خاموشی سے اپنے دفتر چلا آیا۔ فارغ ہو کر وہ گھر گیا، لباس تبدیل کرنے کے بعد چولہے پر چاول چڑھا دیے اور خود باہر اُگے ناریل کے درخت میں نیم پوشیدہ چاند کو دیکھنے لگا لیکن دل میں آگ بھڑک رہی تھی۔ گھنٹی کی آواز پر اس نے دروازہ کھولا تو مینا آتے ہی بولی، ''تمہیں علم ہے کہ ہمارے انسٹیٹیوٹ میں سدپتا نامی ایک لڑکی کام کرتی ہے؟''

''ہاں! تو کیا ہوا؟''

''اس کا پتی شیلانگ میں ملازم ہے۔ اس نے سدپتا سے ملازمت چھوڑنے کو کہا تا کہ دونوں اکٹھے رہ سکیں لیکن وہ نہیں مانی جس پر خاوند نے اسے طلاق کا نوٹس بھیج دیا ہے۔ کتنا ظلم ہے!''۔

''ہاں، ظلم تو ہے''۔

''مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ تم مجھے کبھی بھی طلاق نہیں دو گے''۔

''وعدہ کیا''۔

''اگر مجھ سے کوئی غلط کام ہو جائے تو؟''

''تمہیں سمجھا دوں گا کہ اپنے آپ کو ٹھیک کرو''۔

''پھر بھی اگر تمہارے من میں طلاق کا خیال آئے تو مجھے بتا دینا، میں خود ہی تمہیں طلاق دے دوں گی''۔

''مان لیا۔ لیکن تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میری موت کی صورت میں بھی تم میرے ساتھ رہو گی، پھر مجھے طلاق کیسے دے سکتی ہو؟''

''وہ تو میں اب بھی یہی کہتی ہوں''۔

''پھر میں بھی وچن دیتا ہوں کہ تمہیں طلاق نہیں دوں گا''۔

''تم کتنے نفیس ہو! یہی سبب ہے کہ میں تم سے بہت پریم کرتی ہوں''۔ اور پھر مینا اس کے گلے لگ گئی۔ ادھر ککر سے شوں شوں کی آوازیں آنے لگیں۔

....

13 جون 1993، ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل پولیس مسٹر بی۔ پی سنگھ اپنے دفتر بیٹھے تھے کہ مسٹر رو پک مجمدار، ڈپٹی انسپکٹر جنرل، پلاننگ اینڈ ویلفیئر، عالمِ طیش میں اندر داخل ہوا اور ''فرینڈز آف انڈیا'' کا ایک شمارہ میز پر رکھتے ہوئے بولا، ''کیا آپ نے ہماری ایسوسی ایشن میٹنگ کی رپورٹ دیکھی ہے؟''

''کیا لکھا ہے؟''

''لکھا ہے، IPS انتخابات میں اخلاقیات کے معاملہ پر گرما گرم بحث۔ ڈپٹی کمشنر کمال منڈل نے جذباتی تقریر

کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ چند افسروں نے ناجائز طور پر پچاس لاکھ روپیہ لیا ہے، اور یہ کہ ان کے نام افشا کرنے کی دھمکی بھی دی ہے۔ مسٹر منڈل کا کہنا تھا کہ فی الوقت ہمارا اہم مسئلہ اخلاقیات کا ہے۔ اس تقریر پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ایک گروہ ناموں کو افشا کرنے پر زور دینے لگا جبکہ کچھ افسر معاملہ ختم کرنے کے حق میں تھے۔ مسٹر منڈل نے واضح الفاظ میں کہا کہ انہیں بخوبی علم ہے یہ راشی افسر کہاں ملاقاتیں کرتے اور کیا کھاتے پیتے رہے ہیں"۔

مجمدار نے حیرت سے کہا: "کیا منڈل نے واقعی ایسی باتیں کی ہیں؟"

ایک اور افسر مسٹر موہری بولے: "کیا بات کر رہے ہو؟ منڈل نے بھری میٹنگ میں سب کچھ کہا ہے۔ کیا تم موجود نہیں تھے؟"

"نہیں، میں چسکی لگانے دوسرے کمرے میں تھا"۔

مسٹر سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا: "پھر تم نے اس کی شعلہ بیانی نہیں سنی"۔

مجمدار نے سوال کیا: "کیا وہ پاگل ہو گیا ہے؟"

موہری نے جواب دیا: "اسی سے پوچھو۔ کسی اور میں تو یہ بات پوچھنے کی ہمت نہیں"۔

مجمدار کہنے لگا: "ہم اس سروس میں کیوں آئے؟ کسی بنک یا انشورنس کمپنی میں ہم اس سے زیادہ تنخواہ لے لیتے۔ ہم نے تو صرف عزت اور مراعات کی خاطر یہ ملازمت کی ہے، اور وہ کہتا ہے کہ تم گاڑیاں استعمال نہیں کر سکتے، اپنے گھروں میں سرکاری ملازم نہیں رکھ سکتے، کوئی تحفہ وغیرہ قبول نہیں کر سکتے۔ سر! کیا آپ کے علم میں ہے کہ وہ خود کوئی ڈائری، کیلنڈر، چائے، کافی وغیرہ کچھ نہیں لیتا، پھر وہ اس سروس میں کیوں آیا ہے؟"

مسٹر سنگھ بولے: "اس کا کہنا ہے کہ وہ ملک اور لوگوں کی خدمت کے لیے آیا ہے"۔

مجمدار نے ترت جواب دیا: "خدمت کرنے کے لیے اور بھی کئی میدان ہیں۔ وہ پولیس سروس میں کیوں آیا ہے؟ وہ تو اس سروس کو رسوا کر رہا ہے"۔

"وہ کیسے؟"

"وہ بسوں اور ٹراموں میں سفر کرتا اور سواریوں سے منہ ماری کرتا رہتا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں کہ وہ میری طرح انڈین پولیس سروس کا کوئی افسر ہے۔ یہاں رہتے ہوئے وہ ایسی حرکات نہیں کر سکتا۔ وہ گلی محلوں کے سڑک چھاپ لڑکوں کی مانند ہے"۔

"اس کا خیال ہے کہ ہمیں نوآبادیاتی نظام کو گلے لگائے رکھنے کی بجائے لوگوں کی خدمت کرنا چاہیے"۔

"سر! پلیز اس کو نکالیں یہاں سے، ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے"۔

موہری نے استفسار کیا: "اس کو کیسے نکالو گے؟"

"پھر دوسری صورت میں وہ ہمیں نکال باہر کرے گا"۔

مسٹر سنگھ نے سوال کیا: "آخر آپ لوگ اس سے تنگ کیوں ہیں؟"

"سر! وہ حد سے بڑھ چکا ہے"۔

"وہ کیسے؟"

"سر! میں پہلے اس کے ساتھ ہی ایک ہاؤسنگ کمپلکس میں رہتا تھا۔ ایک دفعہ سب نے تفریح کا پروگرام بنایا۔ ہم تو گاڑیوں میں گئے مگر وہ بیوی کو ساتھ لے کر پہلے بس اور پھر وہاں سے رکشہ میں آیا۔ ہمارے پوچھنے پر اس کا جواب تھا کہ سرکاری گاڑیاں سیر تفریح کے لیے نہیں۔ سر! کیا اس بات کا ہمیں علم نہیں؟ کیا یہ جتانا ضروری ہے کہ ہم بے ایمان ہیں؟ کیا وہ اکیلا ہی

دیانت دار ہے؟"

مسٹر سنگھ نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی، "اس کا اپنا نقطہ نظر ہے۔ سرکاری گاڑیاں سرکاری فرائض کی ادائیگی کے لیے ہیں لیکن ہم کس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں؟ ان پر ہم کلب جاتے ہیں، بچوں کو اسکول کالج چھوڑنے اور لانے کے لیے استعمال کرتے ہیں، اپنے گھروں میں بھی تین تین چار چار گاڑیاں چل رہی ہیں،۔ ہمارے ایک افسر کی روزانہ اوسطاً پانچ سو کلومیٹر گاڑی چلتی ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ سرکاری کاموں کے لیے گاڑی دستیاب نہیں ہوتی۔ حکومت نے ہر افسر کے لیے ڈیڑھ سو روپیہ فی کس اردلی الاؤنس مقرر کیا ہے، یہ حکم بھی ہے کہ کسی سپاہی کو اردلی نہیں رکھا جائے گا، لیکن ہم کسی نہ کسی عذر کا سہارا لے کے آٹھ دس سپاہی اپنے گھروں میں رکھ لیتے ہیں جبکہ اپنے کاموں کے لیے کوئی سپاہی نہیں ملتا"۔

موہری نے کہا، "اگر یہ مراعات حاصل نہیں ہوتی تو اس سروس میں آنے کا کیا مقصد رہ جاتا ہے؟ ان سہولیات ہی کی وجہ سے ہم یہاں ہیں"۔

مجمدار کا سوال تھا، "وہ ان مراعات کے خلاف کیوں ہے؟"

مسٹر سنگھ نے بتایا کہ انہوں نے کمال سے بات کی ہے، وہ مراعات کے خلاف نہیں، صرف یہ چاہتا ہے کہ ان کی قانونی طور پر اجازت ہونی چاہیے۔ ایک افسر نے اعتراض کیا، "اگر یہ مراعات منظور شدہ نہیں ہیں تو پھر کیا ہوا؟ جب حکومت معترض نہیں تو یہ اجازت ہی سمجھی جا سکتی ہے"۔

مسٹر سنگھ نے وضاحت کی، "کمال کا یہ کہنا ہے کہ قانونی طور پر منظوری نہ ہونے سے حکومت کسی وقت بھی کسی افسر کے خلاف تادیبی کارروائی کر سکتی ہے، اس لیے سب کے سروں پر تلوار لٹکتی رہے گی، فیصلہ کرنے کی اخلاقی قوت میں ضعف ہوگا، اپنے وقار اور عزت کی قربانی دے کر ہمیشہ برسر اقتدار جماعت کو خوش کرنے کا رجحان غالب رہے گا۔ جب ایسی کمزوریاں جڑ پکڑ لیتی ہیں تو افسر ہر غیر قانونی حکم ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے اور سیاستدان دیانتدار افسروں کو نظر انداز کر کے انہی بے ایمان افسروں کو استعمال کرتے ہیں"۔

ایک افسر نے کہا، "کیا اس کی خواہش ہے کہ سیاسی نیتا اس کو ترجیح دیں؟ کیا کوئی عقلمند رہنما ایسا چاہے گا؟"

"اس کا کہنا ہے کہ اگر نیتا راستباز اور دیانتدار ہو تو کیوں اسے نظر انداز کیا جائے گا؟"، مسٹر سنگھ نے جواب دیا۔

موہری نے پوچھا، "سر! آپ کو یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟"

"جانتے ہو کہ اس نے اپنے ایک ناول میں سیکرٹری داخلہ مسٹر کرشنم اچاری کے بارے میں لکھا ہے کہ بیکنتھ پور میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس پی نے انہیں شراب کی بوتلیں رشوت میں دی تھیں۔ یہ افواہ تھی کہ حکومت کمال کے خلاف کارروائی کا ارادہ رکھتی ہے۔ میں نے ایک بار مسٹر کرشنم اچاری سے اس کا تذکرہ کیا تو سن کر شدید حیرت ہوئی کہ انہوں نے انتہائی شاندار الفاظ میں اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ناتراشیدہ ہیرا ہے جسے چمکانے کی ضرورت ہے، پھر وہ ایک بہترین افسر ثابت ہوگا"۔

"سر! آپ نے کرشنم اچاری صاحب سے شراب لینے کا کوئی ذکر کیا تھا؟"

"ہاں! ذکر کیا تھا لیکن جواب سن کر حیرت ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ کمال نے غلط بیانی نہیں کی، حقیقت میں اس نے مجھے راہ راست پر ڈالنے میں مدد کی تھی جس کے لیے میں اس کا شکر گزار ہوں۔ بعد میں میری کمال سے بات ہوئی۔ اس کا فلسفہ اور لوگوں کے بارے میں جذبات قابل قدر ہیں"۔

موہری نے بظاہر اعتراض کرتے ہوئے کہا، "لیکن کل ہونے والی ڈی۔جی صاحب کی شادی کی تقریب میں اس نے شرکت نہیں کی، ایڈیشنل ڈی۔جی کے ہاں ہونے والی تقریب میں بھی وہ شامل نہیں تھا"۔

''وہ اس وقت مسٹر کندو کے انتم سنسکار کے لیے شمشان گھاٹ گیا ہوا تھا''، مسٹر سنگھ نے جواب دیا۔
مجمدار بڑبڑایا، ''اس بدمعاش کی خواہش ہے کہ ہم سب نرک میں جائیں، خود تو وہ شمشان گھاٹوں اور قبرستانوں میں اکیلا ہی چلا جاتا ہے''۔
مسٹر سنگھ بولے، ''ممکن ہے اس کی کوئی اور وجہ ہو۔ تقریبات میں بہت لوگ ہوتے ہیں، ایک شخص کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن تدفین کے موقع پر پُرسا دینے کے لیے کسی نہ کسی کی موجودگی ضروری ہوتی ہے''۔
مجمدار بولنے سے باز نہ رہ سکا، ''لیکن ایسی قابلِ نفرت باتیں چل نہیں سکتیں''۔
''حالات بدلتے رہتے ہیں۔ جہاں ہم بیٹھے ہیں اس عمارت کا نام اینڈرسن بلڈنگ تھا جسے اس وقت کے گورنر اینڈرسن کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ پھر اپنے دور کے مشہور شعلہ بیان انقلابی اور مادرِ وطن کی آزادی کے متوالے بھوانی دتہ، جنہوں نے گورنر کو جان سے مارنے کی کوشش کی تھی، کے نام پر اسے بھوانی بھون میں تبدیل کر دیا گیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں بھی تبدیلی کے لیے تیار رہنا ہوگا''۔

....

23 مارچ، 1993، موسمِ بہار کی ایک شام، کمال گم گم ہوائی اڈے پر بینا کو الوداع کہنے موجود تھا۔ پی، ایچ، ڈی کے بعد وہ باہر جانے کی آرزومند تھی۔ کسی ترقی یافتہ ملک یعنی برطانیہ اور امریکہ سے حاصل کردہ تعلیم اور تجربہ کا سرٹیفکیٹ بھارت جیسے ترقی پذیر ممالک کے تحقیقی اداروں اور جامعات میں پاسپورٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ عام سی اہلیت کا شخص اگر کسی بیرونی ملک سے ڈگری لے کر آئے تو بڑے بڑے قابل اور شاندار تعلیمی پس منظر کے مقامی محققین اس کے سامنے ہیچ سمجھے جاتے ہیں۔ یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ مالی وسائل اور جدید تحقیقاتی ذرائع کے سبب ان ممالک کی تجربہ گاہوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہاں سے حاصل شدہ تجربہ یقیناً وسعتِ فکر و نظر کا باعث ہوتا ہے۔ کمال کو بینا کے باہر جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن باقی تمام رشتہ دار معترض تھے۔ ایک بار اس کے والد خادم نے بھی بینا کو باہر بھیجنے کی مخالفت کی تھی۔ کمال کے وجہ پوچھنے پر اس نے جواب دیا کہ لوگوں کے کہنے کے مطابق جوان لڑکی کا وہاں جانا مناسب نہیں کیونکہ لڑکیاں لڑکے ایک دوسرے سے آزادانہ ملتے ہیں، ایک کی بیوی دوسرے کے ساتھ شب بسری کرتی ہے، ان لوگوں کی اخلاقی زندگی ختم ہو چکی ہے۔
کمال نے سمجھایا کہ یہ ساری سنی سنائی باتیں ہیں، ہاں البتہ یہ درست ہے کہ ہمارے اور ان کے طرزِ زندگی میں فرق ہے۔ ہمارے دیہاتی معاشرے میں کیا ہوتا ہے؟ یہی نا کہ دلہا دلہن شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ یا مل نہیں سکتے۔ شادیوں کا فیصلہ ان کے بڑے بزرگ کرتے ہیں جبکہ شہروں میں لڑکیاں اور لڑکے اکٹھے اسکولوں میں پڑھتے ہیں، آپس میں بات چیت کرتے ہیں اور بعض اوقات خود ہی شریکِ حیات کا چناؤ کر لیتے ہیں، یوں وہ شادی سے پہلے ہی ایک دوسرے سے شناسا ہوتے ہیں۔ امریکہ میں نہ صرف یہ کہ وہ گفتگو اور ملاقاتوں میں حجاب محسوس نہیں کرتے بلکہ جسمانی تعلقات کی استواری میں بھی آزاد ہیں، لیکن یہ درست نہیں کہ ایک کی بیوی کسی اور مرد کے ساتھ گلچھرے اڑاتی ہے۔ شادی کے بعد ان کی زندگی ہماری ہی طرح گزرتی ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو شادی سے پہلے کسی قسم کی جنسی قربتوں کو پسند نہیں کرتے۔ ہمارے اپنے ملک میں جہاں ایسے تعلقات کی ممانعت ہے، کچھ لوگ اسے معیوب نہیں سمجھتے۔ اگر امریکی معاشرے میں کوئی پاک دامن رہنا چاہے تو رہ سکتا ہے۔
کمال کا باپ مزید کچھ نہ بولا لیکن ماں نے کھلے ڈلے الفاظ میں اعتراض کیا، ''وہ ابھی اچھے برے میں تمیز کے قابل نہیں ہوئی اس لیے اسے ورغلانا بہت آسان ہے۔ تھوڑا سا بول بچن ہو تو وہ پھسل جائے گی۔ غیر ملک میں اس کا اکیلے رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ بعد میں ہم پر کوئی اعتراض نہ کرنا، بہتر یہی ہے کہ اسے باہر مت بھیجو۔ اسے یہیں پر اپنا کام کرنے دو، کم

از کم تمہارے ساتھ تو ہو گی''۔

کمال نے سوچا کہ وہ تو پہلے بھی مینا کو اپنی خواہش کے مطابق رکھنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا، اب تو وہ باہر جانے کی خواہشمند ہے، اسے کیسے روکے؟ اور پھر اس نے مینا کو اجازت دے دی۔

چند ماہ کی خط و کتابت کے بعد مینا کو بالآخر یونیورسٹی آف میساچوسیٹس میڈیکل سنٹر کے ڈاکٹر گراہم برنارڈ کی طرف سے رضامندی کا بلاوا مل گیا تھا۔ خط ملنے کے بعد مینا نے کمال سے اظہارِ محبت کرتے ہوئے کہا،''میں تم سے اتنا عرصہ دور نہیں رہ سکتی۔ مجھے پتہ ہے کہ میں اپنی تعلیم پر پوری توجہ نہیں دے پاؤں گی، مجھ سے کوئی غلط قدم بھی اٹھایا جا سکتا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں نہ ہی جاؤں''۔

کمال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا،''اس قسم کا موقع شاید تمہیں دوبارہ نہ ملے، موقع ملا ہے تو ضرور جانا چاہیے۔ ہم ایک دوسرے سے فون اور خط و کتابت کے ذریعے رابطے میں رہیں گے۔ دو سال گزرنے کا پتہ ہی نہ چلے گا پھر ہم ساری زندگی اکٹھے رہیں گے''۔

مینا شکایتاً بولی،''تم تو مجھے بھیجنے پر تلے بیٹھے ہو''۔

''تمہیں بھی علم ہے کہ تمہارا رک جانا مناسب نہیں''۔

مینا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب تیاریوں کا مرحلہ سامنے تھا۔ سب سے پہلے تو روپے پیسوں کا انتظام کرنا تھا۔ اگرچہ مینا کے پاس وظیفے اور مشاہرے کی مد میں کچھ جمع شدہ پونجی موجود تھی مگر کمال نے اسے خرچ کرنے سے منع کر دیا۔ اس نے خود ہی کرایے اور گرم کپڑوں وغیرہ کا بندوبست کیا۔ بوسٹن کی پرواز بمبئی یا ڈھاکہ سے جاتی تھی، اور مینا چونکہ پہلے ڈھاکہ جا چکی تھی اس لیے یہاں سے ڈھاکہ اور وہاں سے بوسٹن جانا سہل تھا۔ تمام انتظامات اور تیاریوں سے فارغ ہو کر اس وقت وہ امیگریشن اور کسٹم سے بآسانی گزر کر انتظار گاہ میں بیٹھے تھے۔ کمال کے دل پر اداسی چھا گئی، وہ پھر سے اکیلا ہو جائے گا! لیکن مینا زیادہ ہی مضطرب تھی، بالکل نئی سرزمین کا سفر اور پھر قیام! کمال اسے سمجھا رہا تھا،''ہر معاملہ میں، ہر قدم پر احتیاط کرنا۔ وہاں تقریباً ہر کوئی انگریزی جانتا ہے لہٰذا تمہیں زبان کا مسئلہ نہیں ہوگا''۔

''مجھے امریکی لہجہ سمجھنے میں مشکل ہو گی، اور پھر یہ کہ میں انگریزی روانی سے نہیں بول سکتی''۔

''لہجہ سمجھنے میں کوئی زیادہ دقت نہیں ہو گی، اور رہا انگریزی بولنے کا معاملہ، جب تمہیں کوئی مادری زبان میں بات کرنے والا ملے گا ہی نہیں تو تم انگریزی ہی بولتی رہو گی''۔

پرواز کا اعلان ہوا، کمال جہاز کی سیڑھیوں تک مینا کے ساتھ گیا، وہ بوجھل قدموں سے اوپر چڑھی اور مڑ مڑ کر کمال کو دیکھنے کے بعد کھڑکی والی نشست پر جا بیٹھی۔ وہ باہر کھڑا اس کی نشست کا اندازہ کرتا رہا لیکن ناکام ہونے کے بعد ہولے ہولے واپس لوٹ آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں جہاز مینا کو اپنی آغوش میں لیے بلند ہوا، اور کمال تنہا کھڑا اسے فضا میں دور جاتے دیکھتا رہا۔

....

کمال اپنے دفتر میں بیٹھا کہیں چھاپہ مارنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ اتنے میں ڈی، سی، پی، ہیڈ کوارٹر مسٹر شانتی مکر جی کا فون آیا جو اسے بتا رہے تھے کہ ایسٹ بنگال گراؤنڈ میں ہونے والے میچ کی نگرانی ڈپٹی کمشنر نارتھ اور ڈپٹی کمشنر ففتھ کے ذمہ تھی مگر ثانی الذکر بیمار ہونے کے سبب وہاں جانے سے قاصر ہے، اس لیے اگر کمال کو اعتراض نہ ہو تو کیا وہ میدان میں جا سکتا ہے؟ اس نے رضامندی ظاہر کی اور یونیفارم پہن کر روانہ ہو گیا۔ وہاں پولیس کی نفری پہلے ہی سے موجود تھی۔ کمال نے پہنچ کر ڈپٹی کمشنر نارتھ مسٹر سمینا تھ سرکار سے مصافحہ کیا اور پھر دونوں میدان کی جانب چل پڑے جہاں وہ اپنی اپنی نشست گاہوں پر جا بیٹھے۔

میدان تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ شدید تناؤ کا عالم دیکھنے میں آیا کہ امسال ٹرافی تولی گنج یا ایسٹ بنگال دونوں میں سے کس کے پاس جائے گی۔ دونوں ٹیموں کے حمایتی دل کھول کر شور مچا رہے تھے، سب سے پہلے شمال مغربی جانب سے تولی گنج کے کھلاڑی میدان میں داخل ہوئے۔ چونکہ ان کے حمایتی تعداد میں کم تھے اس لیے زیادہ شور نہ ہوا لیکن جب لوگوں نے تالیوں سے آسمان سر اٹھایا تب معلوم ہوا کہ ایسٹ بنگال کے کھلاڑی میدان میں آ رہے ہیں۔ چند منٹ بعد میچ ریفری بھی پہنچ گیا۔ ٹاس ہوا اور پھر سیٹی کی آواز نے کھیل کے آغاز کا اعلان کیا۔

کھیل تیز رفتاری سے شروع ہوا۔ دونوں ٹیموں کے کھلاڑی اپنے اپنے داؤ پیچ آزمانے لگے، اور پھر تولی گنج کے ایک پھرتیلے کھلاڑی نے آنکھ جھپکتے ہی حریف ٹیم پر ایک گول کر دیا۔ چند سیکنڈ کے لیے میدان میں سناٹا چھا گیا۔ تولی گنج کے کھلاڑی مارے خوشی کے اچھل رہے تھے۔ انہوں نے گول کرنے والے ساتھی کو کندھوں پر اٹھالیا۔ اتنے میں چند تماشائی جنگلا پھلانگ کر میدان کے اندر آ گئے۔ مخالف ٹیم کے حامیوں نے ان پر کیلے اور مالٹے کے چھلکے، بوتلیں، پتھر اور ہر وہ چیز جو ان کے ہاتھ آئی، میدان میں پھینکنا شروع کر دی۔ گالیوں کا نا تھم طوفان امنڈ پڑا۔ افراتفری اتنی تھی کہ ریفری کو میچ روکنا پڑا۔

پولیس نے صورتِ حال کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ دونوں ڈپٹی کمشنر لوگوں کو سمجھانے اور ٹھنڈا کرنے کی بھاگ دوڑ کرنے لگے لیکن کوئی سننے کو تیار نہ تھا، بلکہ پولیس کی موجودگی میں بھی دشنام طرازی اور چیزیں پھینکنے سے باز نہ آئے۔ یہ ایک قابلِ فہم اصول ہے کہ ایسے مواقع پر تماشائیوں پر طاقت کا استعمال نہیں کیا جاتا لیکن اس سے گریز کے سبب صورتِ حال مزید کشیدہ ہو گئی۔ تماشائیوں نے پولیس کو مکمل نظر انداز کر دیا، غالباً وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ پولیس ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی لہٰذا وہ جو چاہیں، کر سکتے ہیں۔ ہجوم کی نفسیات کہ اتنی بھیڑ میں شوریدہ سروں کی شناخت مشکل ہوتی ہے، اس وقت اپنے عروج پر تھی۔ انہوں نے وہ حرکات کیں جو عام حالات میں سوچی بھی نہیں جا سکتیں۔ اب تماشائیوں نے کھلاڑیوں کو بھی ہدفِ دشنام بنالیا۔ کمال نے میدان کے مشرقی حصہ میں پولیس کو تماشائیوں کے پاس سمجھانے کو بھیجا کہ سکون سے بیٹھیں یا گیلری خالی کر دیں۔ زیادہ ہنگامہ کرنے اور اینٹیں وغیرہ پھینکنے والے چند افراد کو حراست میں لے لیا گیا۔ جب شور شرابا ختم ہوا تو وہ ڈپٹی کمشنر سرکار کے پاس مغربی جانب آ گیا جہاں مہمانوں کی گیلری میں موجود لوگ ابھی تک اپنی اشتعال انگیزیوں سے باز نہ آئے تھے۔ سرکار نے کلب انتظامیہ کے ایک رکن کو بلا کر کہا کہ اپنے مہمانوں کو خاموش رہنے کی تلقین کرے لیکن اس نے حیران کن جواب دیا کہ ان میں کوئی بھی کلب کا مہمان نہیں، بلکہ یہ وہ جرائم پیشہ ہیں جنہوں نے پیسے دے کر مہمانوں کے کارڈ خریدے ہیں۔ سرکار سمجھ گیا کہ یہ شخص مخالف دھڑے سے ہے اور یہ کہ یہی دھڑے بندی پولیس کی مشکلات میں اضافے کا سبب ہے۔ لہٰذا اس نے پولیس کو مہمانوں کی گیلری میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ پولیس کی نفری زیادہ ہوئی تو سنگ باری میں کمی ہو گئی۔ ہنگامہ تھما تو میچ ازسرِ نو شروع ہوا مگر تماشائیوں کی گالیوں اور چھوٹی موٹی چیزیں پھینکنے کا سلسلہ جاری رہا۔ کمال کو یہ سب کچھ دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔

....

کلکتہ کی تین کلبوں کے حامی اس قدر غیر منظم اور پرجوش رہتے تھے کہ ان کی وجہ سے فٹ بال کا کھیل بدنام ہونے لگا تھا۔ وہ آتے میچ دیکھنے کے لیے مگر اس سے محظوظ ہونا نہیں جانتے تھے۔ شاید ان کے ذہن میں یہ بات نقش ہو چکی تھی کہ ان کی اپنی ٹیم کے سوا کوئی اور اچھا کھیل کھیلنے کے لائق نہیں اور یہ کہ شاید کوئی اور ٹیم جیت کی اہل نہیں۔ جب تک ان کی اپنی ٹیم بہتر کھیلتی رہتی، ان کا رویہ مناسب رہتا۔ اپنی ٹیم گول کرے تو خوب، ان کے خلاف ہو جائے تو پھر غنڈہ گردی پر اتر آتے۔

چند روز قبل وہ محمڈن میدان میں ڈیوٹی پر مامور تھا۔ مخالف ٹیم کا ایک کھلاڑی گیند لیے پنلٹی کارنر تک پہنچ گیا۔ یہ ایک ناقابلِ معافی گناہ تھا کیونکہ ان کی رائے میں آف سائیڈ ہونے کے سبب اس کو سبق سکھانا ضروری تھا۔ شاید گالم گلوچ اور اینٹیں

وغیرہ پھینکنے کو کافی نہیں سمجھا گیا اس لیے دولڑ کے جنگلہ پھاند کر اندر کود ے اور گول کرنے والے کھلاڑی کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ کمال سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے دونوں کو پکڑا اور پولیس وین میں بٹھا کر تھانے بھیج دیا۔ اس پر کشیدگی بڑھ گئی۔ ان کے حمایتیوں نے کمال پر بھی چیزیں پھینکنا شروع کر دیں۔ یہ دیکھ کر سپاہیوں نے ان لوگوں پر اسلحہ تان لیا۔ سارے فسادی موقع واردات سے فرار ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر ایان بینرجی وہاں موجود تھا، اس نے کمال کو ایک جانب لے جا کر سمجھایا کہ ایسے مواقع پر تحمل اور بردباری کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن کمال کی رائے میں کیا یہ مناسب تھا کہ کچھ تماشائی میدان میں جا کر کھلاڑیوں کو زدوکوب کریں اور پولیس کھڑی دیکھتی رہ جائے؟

بینرجی کا جواب تھا، ''آج اس کھلاڑی پر تشدد ہو رہا ہے، ممکن ہے کل کلاں یہی لڑکا ان کی ٹیم میں شمولیت اختیار کر لے، لہٰذا ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرنا بہتر ہے۔ بس یہ کوشش کرو کہ میچ آرام سے ختم ہو جائے۔ اگلے میچ کے لیے کوئی اور افسر انتظام کرے گا''۔

گویا یہ افسروں کی عام سوچ تھی۔ تماشائیوں کی سوچ یہ تھی کہ حریف ٹیم کی ہر حرکت کو خلافِ ضابطہ قرار دینا ریفری کا فرض ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو نتیجہ کا ذمہ دار خود ہی ہے۔ بالکل غیر جانبدار ریفری بھی اس سے مفر نہیں تھے۔ آج کا میچ بھی ایسا ہی تھا۔ کمال نے سرکار کی توجہ اس جانب دلائی لیکن اس کا کہنا تھا کہ اگر ہنگامہ آرائی کے مرتکب افراد کے خلاف کوئی کارروائی ہوئی تو حالات مزید خراب ہو جائیں گے۔

''اگر ہم خاموش رہیں تو کیا صورتِ حال میں بہتری آسکتی ہے؟''

''لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اگر میچ مکمل ہوئے بغیر ختم ہو جائے تو ساری ذمہ داری تمہارے سر آجائے گی کہ تم نے ہنگامہ آرائی فرو کرنے میں حکمت سے کام نہیں لیا''۔

''تو کیا ہمیں بھی تماشائی بن جانا ہوگا؟''

''ٹھیک ہے، کوشش کر کے دیکھ لو''۔

کمال گیلری کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک بائیس تیئس سالہ نوجوان کو پتھر پھینکتے دیکھا جو ریفری کی پشت پر لگا۔ اس نے مڑ کر گیلری کی طرف دیکھا تو اسی لڑکے نے آواز لگائی، ''اپنی بیٹی کو میرے پاس بھیجو۔۔۔۔۔''۔ کمال سے برداشت نہ ہوا تو اپنے چند سپاہیوں کے ہمراہ گیلری میں جا کر اس لڑکے کو پکڑ کر سرکار کے پاس لے گیا اور پوچھا، ''تم نے ریفری کو پتھر کیوں مارا؟ کیوں اسے اتنے گھٹیا الفاظ سے پکارا؟'' لڑکا خاموش رہا۔ کمال نے اس کے منہ پر چانٹا مار کر اسے پولیس کی تحویل میں دے دیا۔

مہمانوں کی گیلری میں شور مچ گیا، سنگباری شدید ہو گئی، توہین آمیز اور زہر آلود فقرے کسے جانے لگے، ایک شخص نے کمال کو مخاطب کر کے کہا، ''اگر تم میں اتنی ہمت ہے تو محمڈن میدان جا کر اپنے ہم مذہبوں پر ہاتھ اٹھاؤ''۔

دوسرا آدمی چلایا، ''یہ مسلمان ہے، کسی مسلمان بچے کو میدان میں مت آنے دو''۔

ایک اور بولا، ''یہاں اتنے پولیس افسر موجود ہیں، کسی اور کو تو تکلیف نہیں ہوئی۔ یہ اس قدر تاؤلا کیوں ہو رہا ہے؟''

ایک اور جانب سے آواز آئی، ''یہ محمڈن ٹیم کا حمایتی ہے، ایسٹ بنگال ٹیم کی جیت اس سے برداشت نہیں ہوتی''۔

ایک اور نے گرہ لگائی، ''سارے مسلمان محمڈن ٹیم اور پاکستان کے حمایتی ہیں۔ انہیں ملک سے نکال دینا چاہیے''۔

کمال کو بہت دکھ ہوا۔ یہ اس کا اپنا ملک ہے، سب اس کے ہم وطن ہیں، اسے ہر شخص سے محبت ہے، دل میں سب کا احساس ہے، اور یہ لوگ اسے اپنے ہی ملک سے نکال باہر کرنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا قصور ہے اس کا؟ یہ کہ اس کا نام

مسلمانوں سا ہے اس لیے اسے محمدن ٹیم اور پاکستان کا حمایتی قرار دیا جا رہا ہے! اگر اکثریتی فرقے کی یہی ذہنیت ہے تو اقلیتی شہری کس طرح اس ملک اور شہریوں کو اپنا کہہ سکتے ہیں؟

ایک اور افسر کمال کے پاس آیا اور اس کی دلجوئی کرتے ہوئے بولا ''یہ سر سے پاؤں تک شیطان ہیں، تم نے جو کیا، درست ہے، لیکن تھپڑ مارنا مناسب نہیں تھا کیونکہ اسی پر باقی لوگوں میں اشتعال پھیلا ہے''۔

''خاموش رہنے کا مطلب تھا کہ دوسروں کو غنڈہ گردی اور ہنگامہ آرائی کی حوصلہ افزائی ہوتی''۔

''میں اتفاق کرتا ہوں۔ ایسے بدمعاشوں کے ساتھ سختی ہونی چاہیے''۔

کمال کو احساس تھا کہ لڑکے کو تھپڑ مارنا مناسب نہیں تھا لیکن کسی کے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھ کر چپ رہنا اس کے بس میں نہیں تھا، ان معاملات میں وہ قاعدے قانون کی بجائے اخلاقی اصولوں کو ترجیح دیتا۔ دل برداشتہ کمال سرکار کے پاس گیا۔ اس نے کہا، ''دیکھو! اگر تم نے کوئی سخت قدم اٹھایا تو حالات مزید بگڑ جائیں گے، اس صورت میں سارا الزام تم پر آجائے گا''۔

''سر! تو پھر کیا؟ زیادہ سے زیادہ میرا تبادلہ ہو جائے گا یا پھر ملازمت سے برطرفی ہوگی''۔

سرکار نے جواب نہ دیا۔ وہاں کھڑے پولیس والے لوگوں کی گالم گلوچ سے خود بھی مضطرب تھے، کسی نے دبے الفاظ میں تبصرہ کیا، ''کارروائی کا مطلب تخت سے دستبرداری ہے''۔ واضح اشارہ سرکار کی طرف تھا۔ کمال کو اچھا نہ لگا کیونکہ اس کی نگاہ میں سرکار معدودے چند ایماندار اور قابل افسروں میں سے تھا۔ وہ بھی کمال کو پسند کرتا تھا، لہٰذا سرکار کے بارے میں دریدہ دہنی اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی۔ وہ انھی خیالات میں گم تھا کہ کہیں سے کوئی چیز سرکار کے سر پر آ لگی۔ خون بہنے لگا، جس پر چند سپاہی اس شخص کو پکڑنے آگے بڑھے تو متعدد لوگوں نے انہیں گھیر لیا۔ باقی سپاہیوں نے گھیراؤ کرنے والوں پر لاٹھی چارج شروع کر دیا جس کا حکم سرکار نے نہیں دیا تھا لیکن اب انہیں روکنا بھی مشکل تھا۔ تاہم اتنا ہوا کہ گیلری میں موجود تقریباً آدھے لوگ وہاں سے بھاگ گئے۔ کلب کی انتظامیہ نے سرکار کے پاس آ کر کہا، ''سارے شر پسند بھاگ گئے ہیں، اب کوئی گڑ بڑ نہیں ہوگی''۔ ان کی بات درست نکلی۔ بعد میں صورتِ حال پر امن رہی اور یوں میچ دوبارہ شروع ہوا۔

کمال کو اب میچ میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔ ایسٹ بنگال ٹیم کے حمایتیوں کی بدزبانی اور ہرزہ سرائی نے اس کا ذہنی سکون تلپٹ کر دیا۔ اسے ایسے متعدد واقعات یاد آنے لگے، اسکول کے زمانے میں اس کے مانیٹر بننے کی تجویز پر باقی طلبا کا رویہ، کالج کے چناؤ کے موقع پر اس کی نامزدگی پر ردِ عمل وغیرہ۔

....

کمال اپنے ہم منصب صدیق الزمان کے گھر سے واپس آیا ہی تھا کہ مینا کا فون آ گیا۔

''مانی! کیسی ہو؟''

''اچھی ہوں''۔

''اچھی ہوں؟ کیا تمہیں میری جدائی محسوس نہیں ہوتی؟''

''وہ تو ہے، لیکن ابھی ہمیں مزید چند مہینے ایسے ہی رہنا ہوگا''۔

''اپنی جان کھپا رہی ہو۔ وہاں سے کتنا مشاہرہ مل رہا ہے؟ میری تنخواہ تم سے زیادہ ہے۔ واپس آنے کے بعد تم اپنی صلاحیتوں کے سبب مجھ سے زیادہ کما سکو گی''۔

''بالکل! زندگی میں دولت کی بہت اہمیت ہے، لیکن صرف یہی زندگی نہیں''۔

''اس کے علاوہ اور کیا ہے؟''

''کامرانی، تکمیلِ ذات، اپنے وطن سے متعلق جذبات واحساسات۔۔۔۔۔''۔

''ایک منٹ پلیز! میں تمہاری بات سمجھ نہیں پا رہا۔ یہ بتاؤ کہ واپس آنے پر تمہارا نقصان کیا ہوگا؟''

''یہ میری جنم بھومی نہیں ہے۔ چاہے کتنی ہی شاندار ہو، بہر حال میری اپنی دھرتی تو نہیں۔ اپنے وطن میں مجھے جو حقوق حاصل ہو سکتے ہیں وہ یہاں تو نہیں مل سکتے''۔

''مثلاً کون سے حقوق ہیں جو تمہیں وہاں نہیں مل سکتے؟''

''امریکی آئین کی رو سے صرف یہاں جنم لینے والا ہی امریکی صدر کا انتخاب لڑ سکتا ہے''۔

''کیا تم صدارت کی امیدوار بننے جا رہی ہو؟''

''کیوں نہیں؟ میں جس ملک میں رہتی ہوں وہاں اعلیٰ ترین عہدے پر پہنچنا میرا استحقاق ہے، بصورتِ دیگر یہ مساوات نہیں۔ امریکہ میں رہتے ہوئے میں کسی طور بھی پیدائشی امریکی کے برابر نہیں ہو سکتی، پھر میں امریکہ کو اپنا وطن کیوں بناؤں؟ علاوہ ازیں، اپنی قابلیت کے مطابق ہم وطنوں کی بہتری کے لیے کام کرنا میرا فرض ہے۔ کسی اور ملک کو اپنا کیسے بناؤں؟ کچھ عرصہ رہنا تو ٹھیک ہے، ہمیشہ کے لیے نہیں''۔

''او کے۔ تھوڑے دنوں کے لیے آسکتی ہو؟''

''میں کوشش کروں گی۔ اکیلے رہنا میرے لیے بھی مشکل ہے۔ تم کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں، تم اپنی سناؤ؟''

''میری طبیعت قدرے ناساز ہے، اکتاہٹ ہونے لگی تھی لہٰذا مکان کی مالکن کے ساتھ نائٹ کلب چلی گئی''۔

''نائٹ کلب؟ مے نوشی کے لیے؟''

''نہیں، میں نے شراب نہیں پی، بس سوڈا لیا اور تھوڑا سا رقص کیا''۔

''تمہارے ساتھیوں نے تو یقیناً شراب پی ہوگی؟''

''ہاں! انہوں نے پی تھی۔ حرج ہی کیا ہے؟''

''نہیں، نہیں، تم بھی اگر پیئو تو کوئی حرج نہیں''، کمال نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کیا تم واقعی ایسا سمجھتے ہو؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے مے نوشی بالکل پسند نہیں۔ اور پھر اجنبیوں کے ساتھ پینا، اور وہ بھی اس وقت جب تم تنہا ہو، انتہائی نامناسب ہے۔ نشے کی حالت میں کوئی حرکت تمہاری رضا کے خلاف بھی ہو سکتی ہے''۔

''اگر کوئی ایسی حرکت ہو جائے تو تمہارا ردِعمل کیا ہوگا؟''

''کیسی بات پوچھ رہی ہو؟ کیا تمہیں جواب کا علم نہیں؟''

مزید بات کیے بغیر بینا نے رونا شروع کر دیا۔ کمال خود بھی بے کل ہو گیا اور اسے تسلیاں دینے لگا، ''کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟ کلب ہی تو گئی تھی تم، کوئی ایسی ویسی حرکت تو نہیں ہوئی۔ آسودہ خاطر رہو۔ اگر تم ایسے ہی روتی رہی تو مجھے اطمینان کیسے آئے گا؟'' اتنی بات سن کر بینا کی ہچکیاں تیز ہو گئیں۔ کمال پریشان ہو کر اس کی دلجوئی کرنے لگا، ''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یہ ذہن میں رکھو کہ تم ریسرچ کے لیے گئی ہو، بس اسی طرف توجہ دو۔ ادھر ادھر کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ پلیز! چپ ہو جاؤ۔ میں تمہیں بعد میں پھر فون کروں گا''۔

فون بند کر کے کمال سوچ میں پڑ گیا۔ بینا وہاں مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گئی ہے، اس مقصد کے لیے اسے

دوسروں سے ادھار لینا پڑا جس کی ادائیگی تاحال نہیں ہوسکی، اوراس نے مے خانوں میں جانا شروع کر دیا ہے۔ اتنی مایوسی! اتنی خواب شکنی!

....

حسب معمول اخباری نمائندے کمال کے دفتر میں گپ شپ کے لیے جمع تھے۔ نیشلسٹ کے نمائندے جیتندر گھوش نے بتایا کہ نیشنل پولیس اسٹیشن نے آئی، ایس، آئی کے ایک ایجنٹ کو گرفتار کیا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کے پاس آپ کا کارڈ تھا۔ اس سلسلہ میں آپ کچھ کہنا پسند کریں گے؟

کمال نے پہلے تو اسے مذاق سمجھا کیونکہ وہ کبھی کبھار ایسی باتیں کر جاتا تھا تاہم وہ لکھتے وقت سمجھداری سے کام لیتا اس لیے کمال اس سے قدرے آزادانہ انداز میں بات کر لیتا تھا۔ اس نے کہا، ''اتنے سنجیدہ الزام پر ایسا مذاق کیوں؟'' لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ یہ مذاق نہیں بلکہ جیتندر سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ کمال متحیّر اور مضطرب ہوگیا۔ وہ آئی، ایس، آئی کے کسی ایجنٹ کو جانتا تک نہیں تھا پھر اس کا کارڈ اس کے پاس کیسے آیا؟ آئی، ایس، آئی، جو پاکستان کی مشہور سراغرسانی ایجنسی ہے، اس کا کمال جیسے انتہائی محب وطن شخص کے ساتھ کیا تعلق ہوسکتا ہے؟ کیا کوئی شناسا آدمی اس ایجنسی کے لیے کام کر رہا ہے؟

اس نے تھانے فون کیا لیکن خبر جھوٹی نکلی کہ آئی، ایس، آئی کا کوئی ایجنٹ ان کی تحویل میں ہے۔ کمال نے مزید تصدیق کے لیے پوچھا، ''کیا کوئی ایسا شخص زیرِ حراست ہے جس کے پاس سے میرا کارڈ ملا ہو؟''

''جی سر! سوری پاڑا کے چند لڑکے ایک نوجوان کر پکڑ کر لائے ہیں، لیکن تھانے آتے ہی وہ پاگل بن گیا ہے''۔

''کیا اس کے پاس میرا کارڈ تھا؟''

''جی سر!''

''اس کا نام اور پتہ؟''

''نام راحیل امین ہے اور اس کے کہنے کے مطابق وہ براہی کلیتل پاڑا کا رہائشی ہے''۔

کمال پُرسکون ہوگیا۔ براہی سے تعلق رکھنے والے کسی لڑکے سے اس کا کارڈ ملنا ناممکن نہیں تھا، پھر بھی اس نے پوچھا، ''کیا کہہ رہا تھا وہ؟''

''اس نے بتایا ہے کہ وہ آزاد ہند سیوک باہنی (یعنی سبھاش چندر بوس کی تشکیل کردہ آزاد ہند فوج)، براہی برانچ کا کنوینر ہے۔ اس کے پاس مسٹر مہاراج کا اس سلسلہ میں دستخط شدہ کارڈ بھی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ براہی تھانے کا انچارج ارون منڈل اور دوسرے اہلکار اسے جانتے ہیں''۔

''پھر آئی، ایس، آئی کی بات کیسے نکل آئی؟ کیا تم نے براہی تھانے سے تصدیق کی ہے؟''

''سر! میں سمجھ نہیں پارہا کہ آپ آئی، ایس، آئی کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟ اس نے کوئی ایسی بات کی نہ ہی ہم نے کوئی تذکرہ کیا ہے، پھر آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟''

''میں نہیں کہہ رہا، لیکن تم اس سلسلہ میں تصدیق ضرور کرو۔ اور وہ لڑکے اس کو کیوں پکڑ لائے تھے؟''

''سر! وہ لڑکا سرسوتی دیوی کی مورتی کے آگے بار بار سر جھکا رہا تھا جس کے باعث ان کے دل میں شبہ پیدا ہوا۔ چونکہ اس کا نام ہندوانہ نہیں تھا اور یہ کہ غیر ہندو بالعموم دیوی دیوتا کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتے، اس لیے وہ لڑکے اسے مشکوک سمجھ کر پکڑ لائے تھے''۔

کمال سمجھ گیا کہ اس الزام میں شمہ بھر بھی حقیقت نہیں۔ ممکن ہے کسی نے اسے پھنسانے کی کوشش کی ہو۔ اس نے براہی

فون کر کے انچارج کو کہا کہ فوری طور پر کوئی سپاہی کالی تل پاڑا جائے، اور اس امر کی تصدیق کرے کہ راحیل امین ولد اسد اللہ واقعی وہاں کا رہائشی ہے، اور یہ کہ وہ ہوشمند ہے یا دیوانہ۔ جیسے ہی اس نے فون رکھا، اخباری نمائندے نے سوال کیا، ''کیا علم ہوا؟''

''مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ آئی، ایس، آئی کا کوئی نام ونشان نہیں۔ یہ تمہیں ہی علم ہوگا کہ اس کا تعلق کیسے نکل آیا ہے؟ ایک خبطی لڑکا جو سرسوتی دیوی کی مورتی کو سجدہ کر رہا تھا، نام سے مسلمان نکلا اور اسے آئی، ایس، آئی کا ایجنٹ بنا دیا گیا، گویا میں بھی آئی، ایس، آئی کا ایجنٹ ہوا کیونکہ میرا نام بھی اسلامی ہے۔ اگر لڑکے کا نام ہندوانہ ہوتا تو کیا پھر بھی تم اسے ایجنسی کا ایجنٹ کہتے؟''

جیتندر نے بظاہر ایک چبھتا ہوا سوال کیا، ''پھر لڑکے اسے پکڑ کر تھانے کیوں لے گئے؟ انہوں نے تو اسے آئی، ایس، آئی کا ایجنٹ سمجھ کر پکڑا تھا''۔

''نہیں، اسے آئی، ایس، آئی کا ایجنٹ سمجھ کر نہیں پکڑا تھا، اس کی مشکوک حرکات وسکنات کی بنا پر اسے تھانے لے گئے تھے''۔

فرینڈز آف انڈیا کے نمائندے نے سوال کیا، ''کیا اس کے پاس آپ کا کارڈ تھا؟''

کمال نے ترت جواب دیا، ''میرے اپنے علاقے کے کسی بھی شخص کے پاس میرا کارڈ ہو سکتا ہے''۔

''گویا وہ مجرم نہیں؟''

''اس کا جواب براہی سے تصدیق ہونے کے بعد ہی دیا جائے گا''۔

''پھر ہم یہ خبر شائع کر دیتے ہیں کہ آپ اس پر تبصرہ کرنے سے گریز کر رہے ہیں''۔

''جو مجھے معلوم تھا، میں نے بتا دیا ہے، اب آپ جو چاہیں، لکھیں''۔

سارے نمائندے باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد فریش نیوز ٹی وی چینل کا نمائندہ سوشانت گھوش اندر آیا اور کمال سے ایک فون کرنے کی اجازت طلب کی۔ اجازت ملنے پر اس نے ایک اہم خبر کے لیے کسی کو ایک کیمرہ مین بھیجنے کے لیے کہا۔ فون رکھنے کے بعد اس نے کمال سے کہا، ''پلیز! کیمرے کے سامنے اپنا ردِ عمل بیان کیجیے''۔ اس پر کمال غصے پر قابو نہ پا سکا، ''کیسا ردِ عمل؟''

''یہی کہ آپ کا کارڈ ایک پاکستانی جاسوس کے پاس کیوں تھا؟''

اب تو کمال طیش میں آ گیا، ''اگر کوئی کارروائی کرنی ہے تو کمشنر صاحب کے پاس جاؤ۔ وہ تمہیں میرے پاس بھیجیں تو پھر آ کے سوال کرنا۔ میں اس وقت جواب دوں گا''۔ اس کے لہجے کی تلخی اور ترشی دیکھ کر گھوش چپکے سے باہر نکل گیا اور پھر پلٹ کر نہ آیا۔ شام کے اخبار میں خبر شائع ہوئی:

> ''پاکستانی جاسوس گرفتار آج شام نارتھ پولیس اسٹیشن نے آئی، ایس، آئی کے ایک پاکستانی جاسوس کو حراست میں لیا ہے۔ وہ براہی کا رہائشی ہے اس کے پاس سے پولیس ہیڈ کوارٹر کے ایک سینئر پولیس آفیسر کا کارڈ برآمد ہوا ہے۔''

خبر میں کسی کا نام نہیں تھا لیکن اشارہ واضح تھا۔ کبیدہ خاطر کمال سوچنے لگا کہ ایسے ملک دشمن سازشیوں کو ختم ہو جانا چاہیے۔ فون کی تیز گھنٹی سے وہ چونک پڑا۔ براہی تھانے سے انچارج کا فون تھا، ''سر! نام پتہ درست ہے۔ آنند بھارتی مہاراج کے زیر اثر رہ کر یہ لڑکا یقین کیے بیٹھا ہے کہ نیتا جی (سبھاش چندر بوس) لوٹ کر ضرور آئیں گے، ان کی واپسی نہ ہونے سے وہ پریشان رہنے لگا ہے۔ چند روز پہلے اس کے باپ کا انتقال ہوا ہے۔ اس کے ایک لڑکی سے مراسم تھے جس کی کسی اور جگہ شادی ہو گئی۔ ان سارے حادثات نے اس کے ذہن کو مختل کر دیا ہے۔ وہ ڈاکٹر حسن کے زیر علاج ہے اور قدرے بہتری کے آثار پائے

جاتے ہیں، تاہم جب 23 جنوری تک نیتا جی کی واپسی نہ ہوئی تو اس کا ذہنی توازن مزید بگڑ گیا اور اسی حالت میں گھر بار چھوڑ کر کہیں نکل گیا تھا۔ تھانے والوں سے کہیں کہ اسے چھوڑنے کی بجائے کچھ دیر اپنے پاس رکھیں، اس کے رشتہ دار جلد پہنچ رہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ فوری رہائی کی صورت میں وہ کہیں اور نکل بھاگے جہاں سے اس کی تلاش مشکل ہو جائے"۔

کمال کو ٹھیس سی لگی۔ ایک خبطی لڑکے کو آئی، ایس، آئی کا ایجنٹ بنایا اور اس کا نام بھی اس کے ساتھ نتھی کر دیا۔ اور پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک پرانا واقعہ ابھر آیا۔ پاک بھارت جنگ جاری تھی کہ اس نے ایک معالج مبین الدین احمد کی گرفتاری کا سنا۔ وہ براہی میں واحد سند یافتہ ڈاکٹر تھا اور کسی شخص کے دین دھرم کی پروا کیے بغیر ہی علاج کرتا رہتا لیکن اسے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت بلا جواز گرفتار کر لیا گیا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ) نے اس کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کیا جس میں کمال نے بھی نعرہ بازی کی تھی حالانکہ وہ جانتا ہی نہ تھا کہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ ہے کیا۔ اس ایکٹ کے تحت کسی بھی شہری کو مقدمہ چلائے بغیر گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ مبین الدین کی گرفتاری کا سبب نامعلوم تھا، غالباً اسے خود بھی علم نہیں تھا۔ شاید اس کا واحد جرم مسلمان ہونا اور برسرِ اقتدار جماعت کے ساتھ اختلافات تھے، لہٰذا اسے پاکستان کا جاسوس قرار دے کر گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت میں ثابت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

کمال جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتا، ڈاکٹر کی گرفتاری معمہ ہی بنی رہتی لیکن اب اسے بخوبی علم ہو گیا۔ وہ خود اسی دھرتی کا سپوت تھا، اپنے ہم وطنوں اور وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں رہتا، اس کے باوجود اسے کتنی آسانی سے پاکستان کا جاسوس بنا دیا گیا۔ کسی ہندو کو اتنے آرام سے پاکستانی جاسوس قرار نہیں دیا جا سکتا۔ فی الحقیقت اکثریتی فرقہ میں جنم لینے والا ہر شخص محب وطن ہے، حتیٰ کہ اس کی تمام تر فرقہ وارانہ کارروائیوں کے باوجود اسے قوم پرست ہی کہا اور سمجھا جاتا لیکن جس نے اقلیتی فرقہ میں آنکھ کھولی اسے ہر دم ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہ سیکولر ہے۔ ہر معمولی بات پر اس کے سیکولر ہونے کو بنظرِ اشتباہ دیکھا جاتا۔ اگر اس ملک میں سبھی ہندو یا مسلمان ہوتے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مخلوط آبادی اور بے اعتمادی کی فضا میں ایسے ہی مسائل جنم لیتے ہیں۔

....

کمال اپنے دفتر میں مصروف تھا جب اردلی نے بتایا کہ ایک سادھو بابا اس سے ملاقات کا خواہشمند ہے۔ اس نے اندر بلایا۔ ایک فقیر آدمی کیسری کپڑوں میں ملبوس، ماتھے پر چندن لگائے، گلے میں ردھرکھشا مالا پہنے اور کندھے پر تھیلا لٹکائے داخل ہوا۔ اس نے کمال کو شمالی بھارتی لہجے میں پرنام کیا، "رام رام بابو! تم پر بھگوان کی دیا ہو"۔ کمال نے بھی ماتھے تک ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیا اور اسے بٹھاتے ہوئے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ بولا، "میں گنگا ساگر سے آیا ہوں۔ من میں آیا کہ تم سے ملوں، بس یہی اِچھا تھی"۔ کمال سمجھ نہ سکا۔ سادھو کہنے لگا، "تم اونچے عہدے تک جاؤ گے"۔

کمال کو یقین تو نہ آیا مگر کہا کچھ نہیں۔ سادھو پھر بولا، "تمہارا ذہن بہت اجلا ہے، ہمیشہ دوسروں کی بھلائی کا دھیان کرتے ہو، کسی کو دکھ دینے کا کبھی نہیں سوچا، کوئی شخص بھی یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاتا، تم من کے راجہ ہو، ہمیشہ لوگوں کی سیوا کرتے ہو، بھگوان کی تم پر بہت دیا ہے"۔

کمال نے پوچھا، "آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"فقیر کا کوئی گھر نہیں ہوتا، وہ جہاں چلا جائے، وہی اس کا ٹھکانا ہے۔ اس سمے تو میں ہردوار سے آ رہا ہوں"۔

"میرے لائق کوئی کام؟"

"سادھو کا کیا کام ہو سکتا ہے؟ بس تمہارے درشن کرنے تھے"۔

"سادھو بابا! آپ کا بہت شکریہ۔ اب مجھے کام کرنے کی اجازت دیں"۔

سادھو نے اپنے تھیلے سے ایک کاغذ نکال کر کمال کو دیا۔ایک برس پہلے کا تحریر کردہ ڈپٹی کمشنر پولیس ٹریفک مسٹر ایان بینر جی کی جانب سے ایک سرٹیفکیٹ تھا:

''تصدیق کی جاتی ہے کہ شری مہاراج گری راج تپسیا جو اطلاع کے مطابق ہر دوار سے گنگا ساگر پدھارے ہیں، کسی شخص کے ماتھے پر نظر ڈالنے سے اس کے پچھلے، موجودہ اور آنے والے دور کی ساری باتیں بتا دیتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے ملاقات کی اور ہر بات ٹھیک بتادی ہے۔ان کی مناسب عزت افزائی کی جائے''۔

کمال کو حیرت ہوئی کہ ایک پولیس آفیسر کیونکر کسی اجنبی شخص کو ایسا سرٹیفکیٹ دے سکتا ہے؟ یہ تو کہیں بھی غلط کام کے لیے استعمال کیا سکتا ہے۔سادھو نے یہاں آ کر ایسے جملے بولے جو سب کے کانوں کو بھلے لگتے ہیں، اس سے زیادہ تو کچھ نہیں۔ اس کو اس قسم کا سرٹیفکیٹ کیسے دیا جا سکتا ہے؟ مسٹر بینر جی کو تو کوئی فائدہ نہیں ہوا، نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔کیا اس نے ایسا سرٹیفکیٹ کسی مسلمان فقیر درویش کو بھی دیا ہے؟ اس ہندو فقیر کی طرح کوئی مسلمان بھی تو اس کے اسلامی نام کو سن کر آ سکتا ہے۔اگر وہ اس نوعیت کا سرٹیفکیٹ کسی مسلمان درویش کو دے تو فوراً اسے آئی، ایس، آئی کا جاسوس اور پاکستان کا حمایتی قرار دے دیا جائے گا۔اس کے علاقے کا ایک مخبوط الحواس شخص سرسوتی دیوی کی مورتی کے آگے سر جھکائے اور اس کی جیب سے اس کا وزیٹنگ کارڈ نکلے تو اخبار میں اسے پاکستانی جاسوس کہہ دیا جاتا ہے۔میڈیا والے کیمرے اٹھائے پہنچ جاتے ہیں۔کیا کوئی شخص مسٹر بینر جی سے سوال کرنے گیا ہے؟ کیا کسی اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی ہے؟ وجہ کیا ہے؟ مذہب کا فرق!

کسی ملک میں اکثریتی فرقہ سے پیدائشی وابستگی پر حب الوطنی اور اس کی وفاداری ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر سمجھی جاتی ہے۔یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے اس کا تعلق سانسوں کی ڈوری سے جڑا ہوا ہو۔اس کے برعکس اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کی وفاداری اور اپنی دھرتی سے محبت کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اگر وہ سیکولر بھی ہے تب بھی یہ سوالیہ نشان بنا رہتا ہے، اسے خود بھی اپنی حب الوطنی اور سیکولر سوچ کا بار بار ثبوت دینا پڑتا ہے۔

کمال نے سادھو کو سرٹیفکیٹ واپس کیا اور اردلی کو بلا کر کہا،''یہ مسٹر بینر جی کے پاس جانے کی بجائے غلطی سے یہاں آ گیا ہے''۔

وہ اردلی کے ساتھ باہر جانے کو نکلا تو پوچھنے لگا،''میرے لیے کوئی سیوا؟''

اردلی نے جواب دیا،''یہ صاحب کسی سادھو بابا سے کوئی خدمت نہیں لیتے''۔

اور وہ پھر رخصت ہو گیا۔

....

پت جڑ کے دن تھے۔فون کی گھنٹی بجی تو کمال کو خیال آیا شاید مینا کا فون ہو۔تیزی سے فون اٹھایا، اسی کا فون تھا۔حال چال پوچھنے کے بعد مینا کہنے لگی،''سنا ہے تم رینا کو اپنے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دے رہے؟'' کمال اس کا کیا جواب دیتا؟

رینا نے اسی سال بی، ایس سی آنرز میں کامیابی حاصل کی تھی۔کمال اسے پسند کرتا تھا کیونکہ وہ مینا کی نسبت زیادہ بالغ نظر، سلجھی ہوئی اور بڑی بہن سے زیادہ حوصلہ مند تھی۔اس کا شوق میڈیسن یا انجینرنگ کرنے کا تھا۔بانکل پور میں اسے داخلہ نہ مل سکا لیکن پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری۔کمال نے اسے سمجھایا کہ بی، ایس سی آنرز کرنے کے باوجود وہ انجینرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کی اہل ہے۔راجہ بازار کالج میں بی، ٹیک میں تین سالہ کورس کے داخلہ کی گنجائش تھی۔بعد ازاں کامیاب طلباء و طالبات کو ایم، ٹیک میں داخلہ مل جاتا، اور رینا کے ذہن میں بھی یہی تھا۔وہ کیمیکل انجینئرنگ کرنا چاہتی تھی لیکن اس میں ایک

مسئلہ تھا کہ صرف پانچ فیصد نشستیں عام طلبا کے لیے اور باقی سب کلکتہ یونیورسٹی کے طلبا کے لیے مخصوص تھیں۔ان پانچ فیصد کے لیے امیدواروں کی تعداد بہت زیادہ ہونے کے سبب داخلہ ملنے کا امکان کم تھا لیکن کمال کی کوشش سے رینا کو داخلہ مل گیا۔اب اس کے لیے کالج کے ہوسٹل یا قرب وجوار ہی میں رہائش درکار تھی، لہٰذا اس نے اپنی ماں کے ذریعے کمال کے گھر رہنے کی خواہش ظاہر کی مگر اس نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ ''اگر مینا یہاں موجود ہوتی تب تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔اب جبکہ میں اکیلا ہوں رینا کا یہاں رہنا مناسب نہیں''۔

''کیوں مناسب نہیں؟ کیا بہن اپنے بھائی کے گھر نہیں رہ سکتی؟''، ماں کا کہنا تھا۔

کمال نے صاف گوئی سے کام لیا، ''لیکن وہ میری بہن نہیں، سالی ہے''۔

''مگر وہ اپنے بھائی سے زیادہ تمہاری عزت کرتی ہے''۔

''ہاں مجھے پتہ ہے۔میرے پاس اس کا ثبوت بھی ہے''۔

''کیا تم اسے اپنے آپ پر لگائے گئے الزام کی سزا دے رہے ہو؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات ہوتی تو میں اس کے داخلہ کے لیے دوڑ دھوپ نہ کرتا۔اسے بھی اس کا علم ہے''۔

''ہاں، اسے علم ہے، لیکن رہائش کے مسئلہ کی وجہ سے مجبوری ہے بصورتِ دیگر اسے کالج چھوڑنا پڑے گا''۔

''نہیں، ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔وہ یہاں تھوڑا عرصہ رہ سکتی ہے لیکن آپ لوگوں میں سے کسی نہ کسی کو یہاں رہنا ہوگا۔ہوسٹل میں رہائش ملنے کے بعد وہ وہاں چلی جائے''۔

''کیا تم ابھی تک اس سے ناراض ہو؟''

''یہ ناراضی کا معاملہ نہیں''۔

کمال کا ایسا رویہ بلاشبہ کافی حد تک اسی کا ردِعمل تھا جب ایک بار رینا نے اس پر الزام لگایا تھا کہ اس نے سوتے ہوئے رینا کے بدن پر ہاتھ پھیرا تھا اور رینا نے خاموش رہ کر گویا تصدیق کر دی تھی۔کمال کو اس پر بہت دکھ ہوا تھا۔اب اس امر کی کیا ضمانت تھی کہ رینا اس کے گھر میں قیام کرے تو ایسا الزام دوبارہ نہیں لگے گا؟ اس بنا وہ رینا کے یہاں مستقل رہنے پر رضامند نہیں ہوا۔جب مینا نے ذکر کیا تو کمال کو وضاحت کرنا پڑی کہ رینا کو اس شرط پر گھر رہنے کی اجازت ہے کہ اس کے اہلِ خانہ میں سے کوئی یہاں قیام کرے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ پتا جی کی وہاں ملازمت ہے، ماما زیادہ عرصہ ان سے دور نہیں رہ سکتیں''۔

''میں نے طویل عرصہ رہنے کو نہیں کہا۔جلد ہی اس کے لیے کسی ہوسٹل کا بندوبست کر دوں گا''۔

''تم اسے ہوسٹل کیوں بھیجنا چاہتے ہو؟ تمہارا اپنا گھر بہت بڑا اور کشادہ ہے''۔

کمال پرانے واقعہ کا ذکر کرنا نہیں چاہتا تھا، بس اتنا کہا، ''میں یہاں اکیلا رہتا ہوں''۔

''تو کیا ہوا؟ کیا وہ تمہیں کھا جائے گی؟''

''ہو سکتا ہے میں اسے کھا جاؤں''۔

''اسے تر نوالہ بنا سکتے ہو تو بنا لو۔اسے یہاں رہنے کی اجازت دو''۔

''لیکن۔۔۔۔۔''

''کوئی اگر مگر نہیں۔وہ یہیں رہے گی''۔

''جب ہوسٹل موجود ہے وہاں رہنے میں کیا قباحت ہے؟''

''وہ الگ بات ہے لیکن بتاؤ تمہیں اس کا یہاں رہنا کیوں پسند نہیں؟ وہ تمہیں بڑا بھائی کہہ کر بلاتی ہے''۔

''ٹھیک ہے، اگر تم چاہتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اپنی سناؤ، کیسے گزر رہی ہے''۔

''میں ایک دوست کے ساتھ رہتی ہوں''۔

''کون ہے وہ؟''

وہ میکیاؤ میاموتو نام کا ایک سائنسدان ہے۔ مختصر مدت کے لیے آیا ہے اور سارے اخراجات اس کی کمپنی کے ذمہ ہیں۔ اس کی آمد سے یہاں کے لوگ بہت خوش ہیں''۔

کمال نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا ''میرے خیال میں کوئی اور بھی بہت خوش ہے''۔

''ہاں بالکل! میں بہت خوش ہوں۔ ہم میں بہت ہم آہنگی ہے۔ مسز دلیدو کا کہنا ہے کہ اس کی انگریزی مجھ سے بھی بُری ہے''۔

''کیا اس کی رہائش بھی اسی عمارت میں ہے؟''

''ہاں! میرے ساتھ والے کمرے میں۔ بڑا نفیس شخص ہے۔ وہ مجھے کل بوسٹن یونیورسٹی کے عجائب گھر لے جائے گا''۔

''کیا تم نے اب سیر سپاٹا شروع کر دیا ہے؟''

''نہیں، ہم صرف تھیٹر گئے تھے''۔

کمال کو یہ باتیں ہضم نہ ہوئیں تو رینا سے پوچھا، ''کیا تمہیں اپنا وطن بھی یاد آتا ہے؟''

''بہت زیادہ۔ میں تمہیں بھی بہت یاد کرتی ہوں۔ میں چند روز کے لیے تمہارے پاس آؤں گی۔ جیسے ہی ٹکٹ ملا، تمہیں آگاہ کر دوں گی''۔

''بڑی عمدہ بات ہے''۔

''کیا تم خوش باش ہو؟''

''بلاشبہ''۔

اگلے ہفتے رینا وہاں پہنچ گئی، لہٰذا کمال کے گھر میں رہتے ہوئے وہ کالج جانے لگی۔ اسی دوران اس کی درخواست پر رینا کو ایک لیڈیز ہوسٹل میں کمرہ مل گیا۔ کمال نے اس کی فیس جمع کرائی، اسے ہوسٹل چھوڑا اور خود دفتر آ گیا۔ کچھ دیر بعد اسے رینا کے ڈیپارٹمنٹ سے پیغام ملا کہ وہ تجربہ گاہ میں بے ہوش ہو گئی ہے۔ وہ فی الفور کالج پہنچا۔ رینا کو تب تک ابتدائی طبی امداد دی جا رہی تھی۔ کمال اسے لے کر گھر آیا اور اپنے سسر کو مطلع کر دیا کیونکہ ایک معالج ہونے کی حیثیت سے وہ بہتر طور پر تشخیص کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر حسین مع اہلیہ آ گئے۔ رینا کو اسپتال لے جایا گیا۔ معلوم ہوا کہ اس کے دونوں گردے تقریباً ناکارہ ہو گئے ہیں، لہٰذا اس کی زندگی بچانے کے لیے کسی کے کم از کم ایک تندرست گردے کی پیوند کاری لازمی ہے۔ اپنی عمر کے تناسب سے وہ علیل اور کمزور رہتی تھی لیکن علاج معالجہ کے باوجود صحت یاب نہ ہوئی۔ خود اس کا باپ بھی مرض کی صحیح تشخیص کرنے میں ناکام تھا لیکن اب صحیح صورتِ حال سامنے آنے پر کسی تندرست گردے کی پیوند کاری ہی اس کی جان بچا سکتی تھی۔

....

کمال کو کہیں جلدی پہنچنا تھا اس لئے وہ وردی پہن رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اسے بڑا غصہ آیا کہ لوگ وقت بے وقت فون کر دیتے ہیں۔ بہر طور، اس نے رسیور اٹھایا اور کھردرے لہجے میں پوچھا، ''کون ہے؟''

جواب میں بڑی شیریں نسوانی آواز آئی، ''میں فریدہ رحمان بات کر رہی ہوں۔ میرا تعلق آپ ہی کے ضلع سے ہے''۔

''کہاں سے؟''

''سالار کے نزدیک لکشمن پور سے۔ میرے والد علی حسین چوہدری مقامی ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے''۔

''کیا آپ وہاں سے بات کر رہی ہیں؟''

''جی نہیں! کلکتہ سے بول رہی ہوں''۔

''وہاں آپ کیا کرتی ہیں؟''

''میری شادی یہاں ہوئی ہے''۔

''آپ کے خاوند کیا کرتے ہیں؟''

''وہ ایک بنک آفیسر ہیں''۔

''بتایئے میرے لائق خدمت؟''

''میں نے ایک اخبار میں آپ کے بارے میں مضمون پڑھا تھا، اسی سلسلہ میں ملاقات کی خواہشمند تھی لیکن میرے پاس آپ کا نمبر نہیں تھا۔ انکل سین گپتا نے نمبر ڈھونڈ کے دیا ہے۔ میں نے متعدد بار آپ سے بات کرنا چاہی لیکن ناکام رہی۔ کیا میں آپ سے ایک بار ملاقات کر سکتی ہوں؟''

''بالکل۔ میں اپنے تمام ملاقاتیوں سے ملتا ہوں''۔

''میں کہاں مل سکتی ہوں؟''

''میرے دفتر میں''۔

''کب آنے کی اجازت ہے؟''

''دس اور ایک بجے کے دوران کسی وقت بھی، لیکن صبح کو مجھے قدرے فرصت ہوتی ہے''۔

''کیا کل شام آپ گھر پر ہوں گے؟''

''کیوں؟''

''میں اپنے شوہر کے ساتھ آؤں گی''۔

''لیکن میری واپسی رات نو بجے کے بعد ہوتی ہے''۔

''اوہ ہاں! آپ کلاسز اٹینڈ کرنے جاتے ہیں۔ اتوار کو مل سکتے ہیں؟''

''اگر کوئی سرکاری مصروفیت نہ ہو تو میں گھر پر ہی ہوتا ہوں لیکن اتوار کو میں ملاقاتوں سے گریز کرتا ہوں۔ وہ میرا لکھنے پڑھنے کا دن ہوتا ہے''۔

''کیا آپ ہمیں کل صبح ملاقات کے لیے چند منٹ دے سکتے ہیں؟''

''آپ صبح دس بجے میرے دفتر آسکتے ہیں، اس سے پہلے نہیں''۔

''لیکن میں آپ کے گھر آنا چاہتی ہوں''۔

''کس لیے؟''

''یہ ہمارے گھر سے نزدیک ہی ہے''۔

''آپ کو کیسے پتہ ہے؟''

''انکوائری سے پتہ لیا تھا۔ ہمیں صرف پانچ منٹ چاہییں''۔

''میں اپنے گھر میں اجنبیوں سے نہیں ملتا''۔

''ہمیں آپ سے کوئی کام نہیں ہے، اور پھر یہ کہ میں آپ ہی کے ضلع سے ہوں۔ پلیز، صرف پانچ منٹ دے دیجیے۔ ہم ملاقات کر کے واپس آ جائیں گے۔ اگر ہمیں دو منٹ مل جائیں تو غالباً آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ ہم دونوں آپ کے بہی خواہ ہیں''۔

''چلیں ٹھیک ہے۔ میں ساڑھے نو بجے دفتر جاتا ہوں، آپ سوا نو بجے آ جائیں''۔

''بہت شکریہ۔ کل ملاقات ہوگی''۔

کمال کمرے سے باہر نکلنے ہی کو تھا کہ ربنا داخل ہوئی، ''دادا! بڑے خوش نظر آ رہے ہیں۔ ملاقات کس وقت طے ہوئی ہے؟''

''تمہیں اپنے آپ پتہ چل جائے گا''۔

''بے شک نہ بتائیں۔ ملاقات کی جگہ بدل بھی تو سکتی ہے، یہاں نہ سہی، دفتر میں سہی۔ دیدی بدیش میں ہے اور آپ کو خواتین کے فون آتے رہتے ہیں۔ معاملہ کیا ہے؟''

''تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ فون کسی خاتون کی طرف سے تھا؟''

''یہ جاننے کے لیے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں۔ آپ کی آواز ہی سے ظاہر تھا۔ خواتین آپ کو اتنے فون کیوں کرتی ہیں؟''

''شاید وہ ذہنی طور پر یہ بات تسلیم نہیں کرتیں کہ بینا کی غیر موجودگی میں میری توجہ کا مرکز اس کی بہن ہو''۔

''آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ دیدی کو آنے دیں۔ اگر میں ان عورتوں کے بارے میں۔۔۔۔۔۔''۔

''یہ تو دور کی بات ہے، بہتر یہ ہے کہ اپنی دیدی کو مرچ مسالہ لگا کر لکھ دو تا کہ وہ اپنے شیڈول سے پہلے ہی بھاگی چلی آئے''۔

''اوہو! دن گنے جا رہے ہیں! اگر یہی بات ہے تو اسے جانے کیوں دیا تھا۔ وہ خود تو جانے کی اتنی خواہش مند نہیں تھی''۔

''کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ اگر میں نے اس کے بدیش جانے پر اعتراض کیا تو تم مردانہ شاونیت کے نعرے لگانا شروع کر دو گی؟''

''بالکل، میں نے کہا تھا''۔

''تو پھر میری پیاری سالی صاحبہ؟''

کمال کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ربنا معترض ہوئی، ''پھر وہی سسرالی رشتہ۔ کیا آپ بھول گئے ہیں؟''

وہ کیسے بھول سکتا تھا کہ ربنا کو 'سالی' لفظ پسند نہیں تھا۔ وہ اسے دادا کہہ کر مخاطب کرتی اور چاہتی کہ اسے دیدی کہہ کر بلایا جائے۔ کمال نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، ''مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک مشکل ہے۔ لوگ باتیں بنائیں گے کہ میں گھومتا پھرتا سالی کے ساتھ ہوں اور تعارف بہن کی حیثیت سے کراتا ہوں''۔

''تو کیا آپ مجھے بہن نہیں سمجھتے؟''

''میں تو سمجھتا ہوں مگر لوگ ایسا نہیں سمجھتے''۔

کمال بالعموم اس کا تعارف سالی کی حیثیت سے نہیں کراتا تھا لیکن جب وہ خوامخواہ ایسی ویسی باتیں کرتی تو وہ بھی اسے تنگ کرنے کے لیے یہی حربہ استعمال کرتا جواب کر رہا تھا، ''ہاں! میری پیاری سالی صاحبہ''۔

رینا نے ماتھے پر تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا، ''پھر وہی؟''

کمال نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ ڈر گیا ہو۔ سیلوٹ مارتے ہوئے بولا، ''نہیں، اب نہیں کہوں گا، میری پیاری بہن۔ میں اب دفتر جا رہا ہوں''۔

....

کمال ایک نظم کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس کی تخلیقی مصروفیت کے دوران فون کا بجنا خلل اندازی تھی لیکن سرکاری کام ہی ایسے تھے کہ فون سننا پڑتا تھا۔ اس نے رسیور اٹھایا اور بولا، ''کمال منڈل''۔

دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی، ''ریتا میترا بول رہی ہوں''۔

''کوئی مسئلہ؟''

''نہیں۔ میں ابھی اخبار میں آپ کو آنند ایوارڈ ملنے کی خبر پڑھ رہی تھی۔ اس میں آپ کی دھوتی پاجامہ میں تصویر بھی چھپی ہے۔ کیا آپ یہی لباس پہنتے ہیں؟''

''بالکل۔ یہ لباس تو میں بچپن ہی سے پہنتا چلا آ رہا ہوں''۔

''اس لباس میں تو آپ بالکل دلہا لگ رہے ہیں''۔

''یہ غلط تصور ہے۔ کچھ لوگ تو عام تقریبات میں بھی دھوتی پہنتے ہیں، اور کچھ تو پہنتے ہی یہی ہیں''۔

''ہاں، یہ تو ہے۔ کیا مجھے آپ سے گھر میں ملنے کی اجازت ہے؟''

''کیوں؟''

''میں کسی کی دخل اندازی کے بغیر بات کرنا چاہتی ہوں''۔

''میرے دفتر آ جائیں''۔

''نہیں، بار بار فون بجنے کی وجہ سے وہاں آپ بات نہیں کر سکتے۔ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ دفتر میں تو آپ صرف اس وقت بات کرتے ہیں جب کوئی بہت مجبوری ہو''۔

''اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو کوئی شخص ہم سے گفتگو نہیں کرتا''۔

''ایسا دوسرے افسروں کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے لیکن آپ کے متعلق نہیں۔ آپ کے چاہنے والے بھی بہت ہیں۔ میں نے حال ہی میں آپ کا ناول ''مساوات کے شعور کی تلاش'' پڑھا ہے۔ آپ شاندار لکھاری ہیں۔ اس کتاب سے مجھ پر متعدد پہلوؤں کا انکشاف ہوا ہے۔ بے مثال تحریر۔ اتنی زیادہ مصروفیات کے باوجود آپ لکھنے کا وقت کیسے نکال لیتے ہیں؟''

''یہ میرے جذباتِ دروں کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ عام لوگوں سے میں ایسی باتیں نہیں کر سکتا لہٰذا تحریر کی صورت میں انکشافِ ذات کرتا ہوں''۔

''کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ جیسے کسی سے گپ شپ ہو رہی ہے؟ اگر گراں نہ گزرے تو میری ایک رائے ہے''۔

''کیا؟''

''میں آپ کی دوست بننا چاہتی ہوں''۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''آپ کو اعتراض کیا ہے؟''

''کیا آپ کو علم نہیں کہ میں شادی شدہ ہوں؟''

"جی، مجھے پتہ ہے، اور یہ بھی کہ آپ کی پتنی باہر ہے۔ میں آپ سے شادی کے لیے تو نہیں کہہ رہی، بس اپنا دوست سمجھ لیجیے"۔

"جوں جوں دوستی پروان چڑھتی ہے، اس کی کوئی انت نہیں رہتی سوائے اس کے کہ دوست اپنی اپنی حدود سے باخبر ہوں۔ اگر آپ میرے ساتھ جیون بندھن باندھیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنی حدود سے آگاہ نہیں۔ اگر میں غیر شادی شدہ ہوتا تو کوئی حرج نہیں، لیکن عائلی زندگی گزارتے ہوئے میں کسی کو بحیثیت منگیتر قبول نہیں کر سکتا"۔

"آپ کیا رشتہ بنا سکتے ہیں؟"

"ماں، بہن، بیٹی"۔

"میں آپ کی ماں یا بیٹی تو نہیں بن سکتی، مجھے اپنی بہن سمجھ لیں"۔

"جو کسی زمانے میں میری منگیتر بننے کی خواہاں تھی اسے بہن نہیں بنایا جا سکتا"۔

"آپ بہت ضدی شخص ہیں۔ بیوی آپ کی دوسرے ملک میں ہے، پھر خوف کس بات کا؟"

"اپنے آپ سے ڈرتا ہوں"۔

"کیا اپنے آپ پر اعتماد نہیں؟"

"بالکل ہے"۔

"پھر؟"

"احتیاط بہتر ہے"۔

"کیا میں آپ کو بعد میں فون کر سکتی ہوں؟"

"ہاں اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو"۔

"آپ کی مدد مطلوب ہے۔ میں کل آپ کے دفتر آ رہی ہوں"، یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

....

ان کی سوا نو بجے آمد کے باعث کمال نے جلد ناشتہ کرنے اور لباس بدلنے کے بعد فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ کملا باہر گئی اور فریدہ کے آنے کی اطلاع دی۔ کمال نے گھڑی دیکھی، ابھی تو پونے نو بجے تھے۔ حیران ہوا کہ لوگ کیوں اپنے مقررہ وقت کا خیال نہیں رکھتے۔ اس نے کملا کو انہیں بٹھانے کا کہا اور خود ہاتھ دھونے واش روم چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں واپس آیا تو ایک تقریباً پینتیس سالہ خاتون اور کوئی تیرہ سال کے لڑکے کو بیٹھے دیکھا۔ کمال کو دیکھتے ہی دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ عورت کے بدن سے بھینی بھینی خوشبو پھیل رہی تھی۔ اس نے نمسکار کے انداز میں اپنا ہاتھ پیشانی تک اونچا کرتے ہوئے کہا، "میرا نام فریدہ ہے"۔

"تشریف رکھیے۔ کیا یہ آپ کا بیٹا ہے؟"

بیٹھتے ہوئے وہ بولی، "جی۔ ران! بیٹا انکل کو سلام کرو"۔

اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، "گڈ مارننگ، انکل"۔

کمال نے فریدہ سے سوال کیا، "آپ نے بتایا تھا کہ آپ کے شوہر ساتھ ہوں گے"۔

"وہ آنا چاہتے تھے لیکن ان کا باس حاضری کے معاملہ میں بہت سخت ہے، اس لیے وہ نہیں آ سکے"۔

"بتائیں، آپ کس مقصد کے لیے ملنا چاہتی تھیں؟"

''میری شدید خواہش تھی کہ آپ سے معلوم کروں اتنے مشکل کام بڑی آسانی سے کیسے پورا کر لیتے ہیں۔ ہوائی اڈے پر چوری چکاری کا سلسلہ بہت عرصے سے جاری تھا، اس پر قابو پانا سب کے لیے مشکل امر تھا، آپ نے کیسے کرلیا؟ یہ شبہ کیسے ہوا کہ ہوائی اڈے کے اہلکار ہی اس میں ملوث ہیں؟''

دنیا میں ہر شخص اپنی تعریف سن کر مسرور ہوتا ہے، کمال کو اس سے استثنٰی نہیں تھا۔ کہنے لگا،''بڑا آسان ہے۔ جہاں چوری ہو رہی تھی وہاں کوئی اور جانے کا مجاز نہیں تھا''۔

''کیا ان کو رنگے ہاتھوں پکڑنا بھی اتنا ہی سہل تھا؟''

''پکڑنا آسان نہ ہوتا تو میں کیسے کامیاب ہو سکتا تھا؟''

''یہی تو میں جاننا چاہتی ہوں''۔

''تھوڑی سی عقل اور منصوبہ بندی چاہیے ہوتی ہے۔ میں نے اس پر عمل کیا اور انہیں پکڑ لیا''۔

''اور آپ کی تصاویر بھی نامور اداکارہ کے ساتھ شائع ہوئی تھیں''۔

''نہیں، نہیں، میری تصویر تو اس کے ساتھ نہیں تھی''۔

''میرا مطلب ہے اخبار میں دونوں کی تصاویر شائع ہوئی تھیں۔ جب کام اتنا آسان تھا تو آپ سے پہلے والے کیوں نہ کر سکے؟ وہ ان لوگوں کو پکڑ نہیں سکے تھے یا پکڑنا نہیں چاہتے تھے؟''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا''۔

''میں سمجھ گئی۔ آپ اس پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ آپ کے۔این کالج کے طالب علم تھے؟''

''جی ہاں''۔

''آپ نے 1974 میں کامیابی حاصل کی، میرا مطلب یہ کہ 1974 میں آپ کو کامیاب ہونا چاہیے تھا''۔

''میں نے 1981 میں انڈین پولیس سروس میں شمولیت کی تھی''۔

''طالب علمی کے زمانہ میں آپ مقرر (debater) بھی رہ چکے ہیں''۔

''بالکل۔ لیکن ان ساری باتوں کا آپ کو کیسے علم ہے؟''

''مجھے سپراندی نے بتایا تھا۔ اس کا پتی شکتی ناتھ جاہ آپ کے کالج میں تھا۔ آپ اس کے گھر بھی جایا کرتے تھے۔ آپ کو DB صاحب بھی بخوبی جانتے ہیں۔ بھوبن پور میں قیام کے دوران آپ ان کے پاس رہا کرتے تھے''۔

''ان ساری باتوں کا آپ کو کیسے علم ہوا؟''

''میں ان دنوں گرلز کالج میں تھی۔ میرے پتاجی سیاست میں تھے اس لیے کالج یونین کے چناؤ میں میں نے بھی حصہ لیا اور کامیاب ہو گئی تھی۔ DB صاحب اور میڈم SJ دونوں اساتذہ کے نمائندے تھے۔ یونین کے اجلاسوں میں ہماری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ میڈم SJ ہمارے کالج کے تمام ہوسٹلوں کی انچارج بھی تھیں۔ میرے پتاجی میری رہائش کے لیے ان سے ملے اور رہائش ملنے کے بعد وہ میرے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کی میڈم سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی اور اسی میں انہوں نے میڈم سے میرے لیے کوئی اچھا سالڑکا دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ایک بار جب میں میڈم اور سر DB کے پاس بیٹھی تھی، انہوں نے یہ موضوع چھیڑ دیا اور آپ کا نام تجویز کیا۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ آپ حیدرآباد جا چکے ہیں۔ اسی دوران میں کالج سے فارغ ہو گئی اور پھر DB صاحب بھی کہیں اور چلے گئے تھے اس لیے میری ان سے کوئی ملاقات نہ ہو سکی، نتیجتاً آپ سے بھی نہ مل سکی۔ اب آپ کے بارے میں پڑھا تو جی میں ملاقات کا خیال آیا''۔

کمال کو یاد آ گیا کہ پروفیسر بینر جی نے اس کے متعلق بات کی تھی لیکن اس نے خود ہی ملاقات سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اب بھی جاذبِ نظر اور حسین تھی، جوانی میں تو یقیناً قیامت ہوگی۔ مسٹر بینر جی نے کمال کو اس کے حسن و جمال کی باتیں کر کے مائل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ چونکہ کارزارِ حیات میں اپنا مقام بنانے میں کوشاں تھا، اس لیے فریدہ سے ملاقات کے لیے گریز کرتا رہا۔ اب یہ سب کچھ بے محل تھا۔ دونوں کی شادی ہوگئی، فریدہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی لہٰذا اب کوئی بات سوچنا لاحاصل تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب ہلائے ہی تھے کہ گھنٹی سنائی دی۔ کملا نے باہر جا کر دیکھا اور واپس آ کر ڈرائیور کی آمد سے مطلع کیا۔ کمال کھڑا ہو گیا۔ مہمان بھی اپنی نشستوں سے اٹھ گئے۔ فریدہ کہنے لگی، ''صبح ساڑھے نو بجے سے رات ساڑھے نو تک مصروفیت!''

''کیا ہو سکتا ہے! ایم، بی، اے کلاس رات نو بجے تک ہوتی ہے''۔

''آپ واقعی بہت مصروف رہتے ہیں لیکن کیا آپ کسی دن چند منٹ نکال کر ہمارے ہاں تشریف لا سکتے ہیں؟ میرے شوہر خود آ کر دعوت دیں گے''۔

''وہ آ جائیں، پھر میں دیکھوں گا''۔

ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر اپنے اپنے راستے پر چل دیے۔

....

مینا نصف شب کے قریب ہوائی اڈے پر اتری۔ کمال اور رینا دونوں وہاں موجود تھے۔ چونکہ صرف دستی سامان تھا اس لیے کسٹم وغیرہ کے مراحل سے جلد ہی فارغ ہو گئے۔ مینا نے بتایا کہ واپسی فلائٹ میں مسئلہ ہو سکتا ہے کیونکہ نیو یارک تک KLM کا ٹکٹ ہے جبکہ وہاں سے بوسٹن کا سفر یونائیٹڈ ایئر لائنز سے، مگر مسئلہ یہ ہے کہ اگلی فلائٹ نیو یارک پہنچنے سے پہلے ہی جا چکی ہوگی۔ کمال کے استفسار پر اس نے بتایا کہ چونکہ ٹکٹ رعایتی کرایے پر لیا گیا تھا اس لیے کمپنی والے اس میں تبدیلی نہیں کر رہے۔ اس مشکل سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ زیادہ پیسے دے کر نیا ٹکٹ خریدا جائے۔ کمال نے اسے تسلی دی کہ وہ خود KLM کے دفتر جا کر اس کا حل دیکھے گا۔ اگلے روز وہ ٹکٹ میں مطلوبہ تبدیلی کرا لایا۔ مینا کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ چونکہ یہاں کمپنیوں کو کسی نہ کسی معاملہ میں پولیس کی مدد درکار رہتی ہے اس لیے KLM نے بلاحیل و حجت کام کر دیا ہے۔

بہت شدت سے مینا کی جدائی محسوس کرنے اور اب اس کی واپسی کے سبب کمال زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ بتانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک ہفتہ کی رخصت لی اور ایک پُرفضا مقام پر کمرہ مخصوص کرا لیا۔ اگلے روز مینا کو اپنی بہن کی بیماری کا علم ہوا تو اس نے سیر پر جانے کی بجائے رینا کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کو ترجیح دی۔ کمال نے بکنگ منسوخ کرا دی۔

مینا اور اس کے اہلِ خانہ رینا کے لیے گردے کا بندوبست کرنے میں مصروف ہو گئے۔ کمال اور ڈاکٹر حسین کے علاوہ باقی تینوں، یعنی مینا، اس کے بھائی ڈمی اور مسز حسین کا بلڈ گروپ ایک جیسا تھا۔ ڈمی اکلوتا بیٹا ہونے کے سبب سب کی آنکھ کا تارا تھا اس لیے اس کے گردے کا عطیہ بعید از قیاس سمجھا گیا، باقی رہ گئیں مینا اور مسز حسین۔ دونوں میاں بیوی کی گفتگو میں کمال نے مینا کی اپنا گردہ دینے کی پیشکش کو منظور نہ کیا اور اس کی بجائے اپنا گردہ دینے پر تیار ہو گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک تو مینا کی عمر اتنی زیادہ نہیں اور دوسرے یہ کہ تاحال ان کا کوئی بچہ نہیں، ایسا نہ ہو کہ بعد از اں کسی قسم کی پیچیدگی پیدا ہو جائے۔ مینا نے سوال کیا، ''اگر یہی وجہ ہے تو آپ اپنا گردہ کیوں دینے پر تیار ہیں؟''

''کیونکہ بچہ جنم دینا میرا نہیں، تمہارا کام ہے''۔

لیکن مینا قائل نہ ہوئی۔ اس نے کمال سے اپنا ٹکٹ ایک ہفتہ کے لیے مؤخر کرنے کو کہا۔ KLM رابطہ کرنے پر معلوم ہوا

کر نشست نہ ہونے کے باعث مینا کا نام ویٹنگ لسٹ میں ڈالا جاسکتا ہے۔اسے یقین نہ آیا کہ کمال کی کوشش کے باوجود ایک ہفتہ بعد کی کوئی نشست نہیں مل سکتی لہٰذا شکوہ کرتے ہوئے بولی،''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔جو مسئلہ امریکہ میں حل نہیں ہوسکا وہ تم نے یہاں بیٹھے بیٹھے حل کر دیا اور اب کہہ رہے ہو کہ نشست کا حصول مشکل ہے۔اگر تم چاہتے تو کام ہوسکتا تھا،شاید تمہارا ارادہ ہی نہیں''۔

''مینا!تمہیں حالات کا ادراک ہونا چاہیے۔اگر گنجائش ہی نہیں تو تمہیں نشست کیونکر مل سکتی ہے؟ہاں البتہ دو ہفتے بعد کی بکنگ مل رہی ہے۔دو ہفتوں بعد چلی جانا''۔

''مجھے اتنی چھٹی نہیں مل سکتی''۔

''اس صورت میں یا تو شیڈول کے مطابق جاؤ یا ویٹنگ لسٹ میں نام لکھوا کر انتظار کرو''۔

''اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ اس وقت نشست مل جائے گی؟''

''یہ ضمانت تو کوئی نہیں دے سکتا''۔

پھر وہ کمال کو دل شکستگی کے عالم میں چھوڑ کر اپنے شیڈول کے مطابق پرواز کر گئی۔

....

واپس امریکہ جا کر مینا نے اپنے ٹشو رزلٹ بھیجے جو 25 فیصد رینا سے مماثل تھے جبکہ مسز حسین کی ٹشو مماثلت 98 فیصد پائی گئی،لہٰذا ڈاکٹروں کی رائے میں مسز حسین کا گردہ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ڈاکٹر حسین تامل ناڈو کے ایک چھوٹے سے قصبہ ویلور کے اسپتال سے بھی رائے لینا چاہتے تھے جو اگرچہ مہنگا تھا لیکن والدین کی نظر میں اخراجات اہم نہیں تھے۔کمال رینا اور ڈاکٹر حسین کے ساتھ وہاں پہنچا۔مکمل تشخیص کے بعد انہوں نے بھی پیوند کاری ہی واحد حل بتایا۔ڈاکٹر حسین کا خیال تھا کہ کلکتہ سے پیوند کاری کرائی جائے کیونکہ ویلور میں ایک ماہ قیام کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔فیصلہ یہ ہوا کہ واپس جا کر Belle Vue Clinic سے علاج کرایا جائے۔

آپریشن والے دن ڈاکٹر حسین بجا طور پر انتہائی پریشان اور غمگین تھے کیونکہ دونوں ماں بیٹی زندگی اور موت کے درمیان معلق تھیں۔مینا امریکہ میں تھی اور ڈمپی اپنی منگیتر کے پاس،لہٰذا کمال کو خون اور دواؤں کے علاوہ رینا اور مسز حسین کے لیے تجویز کردہ خوراک کا بھی بندوبست کرنا پڑا۔خود بھی وہ کسی غیر متوقع صورت حال سے نبٹنے کے لیے ساری رات اسپتال میں موجود رہا۔

کامیاب آپریشن پر وہ سب مسرور اور مطمئن ہوگئے۔مسز حسین ایک ہفتہ بعد کمال کی رہائش گاہ پر اشتھن پور منتقل ہوگئی۔خود ڈاکٹر حسین دو ہفتے رہنے کے بعد واپس باکل پور چلے گئے لیکن ہر چھٹی پر اسپتال آجاتے۔پانچ ہفتوں کے بعد رینا کو بھی گھر جانے کی اجازت مل گئی لیکن ابھی اسے آرام اور توجہ کی ضرورت تھی۔دوائیں مہنگی اور سوئٹزر لینڈ سے درآمد کرنا پڑتی تھیں،اور ان کا استعمال تا حیات جاری رہنا تھا۔

....

شام ہونے کو تھی،ٹیلیفون کی گھنٹی ہوئی تو کمال نے رسیور اٹھایا۔دوسری طرف سے اپنا تعارف کرایا گیا،''میں نریندر ناتھ چکرورتی بول رہا ہوں''۔کمال نے نمسکار کرتے ہوئے تصدیق چاہی کہ وہ شاعر نریندر ناتھ ہیں؟اثبات میں جواب ملنے پر کمال نے نیازمندی کا اظہار کیا،''میری خوش بختی ہے کہ آپ جیسی عالی مرتبت ہستی نے مجھے یاد کیا ہے۔بتائیے!میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''ایک مشکل کام کے لیے فون کیا ہے''۔

''جی پلیز، فرمائیے، کیا کام ہے؟''

'' 29 اپریل کی شام آپ کو گرینڈ ہوٹل کے بال روم میں آنے کی زحمت کرنا ہوگی۔ آپ کو آنند پُریشکار ایوارڈ پیش کیا جائے گا''۔

کمال کو اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ اس کا خیال تھا کہ چکرورتی صاحب اسے کوئی کام بتائیں گے لیکن اس کی بجائے اسے ایوارڈ کی خوشخبری سنائی جارہی تھی۔ کیا اس نے صحیح سنا ہے؟ تصدیق کے لیے اس نے پوچھا، ''آپ کیا فرمارہے ہیں؟''

''یہ درست ہے۔ آپ کو ایک دو دن میں خط بھی مل جائے گا۔ آپ کی کتاب ''بنگالی زبان کی تاریخ ایک خاکہ'' (An Outline of the History of the Bengali) کو انعام کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ آپ کے محسوسات کیا ہیں؟''

''میں کیا کہوں؟ جذبات کی فراوانی اور حوصلہ افزائی ہورہی ہے''۔

''خوب۔ آپ کے قلم میں قوت ہے۔ لکھنا مت چھوڑیئے۔ جلد ہی آپ سے ملاقات ہوگی''۔

سلسلۂ کلام منقطع ہونے کے بعد کمال چند منٹ گم سم بیٹھا رہا کہ اسے ایک ادبی انعام ملنے کو ہے۔ وہ بہت عرصہ سے ایسے انعامات کے بارے میں پڑھتا آیا تھا، اس مرتبہ وہ خود اس کا حقدار قرار پایا۔ کتنی طمانیتِ قلب تھی! اب اخبارات میں بطور قلمکار اس پر تبصرے شائع ہوں گے، شاید مینا بھی یہ سن کر شاداں ہو۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بجے تھے، گویا امریکہ میں صبح کے آٹھ ہوں گے۔ اس نے باہر جا کر بین الاقوامی ٹیلیفون بوتھ سے کال کر کے مینا کو بتانا چاہا لیکن دوسری طرف سے ٹیپ چل رہی تھی، ''معصومہ گھر پر نہیں، آپ اپنا پیغام ریکارڈ کرا دیں''۔

کمال نے پیغام میں اپنے ایوارڈ ملنے کی خبر سنائی اور مینا کو 29 اپریل کو تقریب میں شرکت کے لیے کہا۔ اس کے بعد اس نے لیبارٹری کا نمبر ملایا، گھنٹی بجتی رہی مگر جواب ندارد۔ تقریباً ساڑھے نو بجے پھر کوشش کی۔ اس بار ایک مردانہ آواز سنائی دی، ''برنارڈ''۔ وہ مینا کا پروفیسر تھا۔ کمال نے اسے مینا سے ملانے کو کہا لیکن بتایا گیا کہ وہ ابھی تک نہیں پہنچی۔

گھر آ کر اس نے سین گپتا کا نمبر ملا کر اس سے پوچھا کہ ایوارڈ ملنے کی خبر کہاں سے نکلی ہے۔ جب اسے نریندر ناتھ چکرورتی کا نام بتایا گیا تب اسے خبر کی صداقت کا پختہ یقین ہوا۔ اگلے روز فون کالز کا تانتا بندھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد چکرورتی کا فون آیا جس نے معلوم کرنا چاہا آیا کمال نے ایوارڈ کی اطلاع سب کو دی ہے؟ جب اس نے سین گپتا کا نام لیا تو چکرورتی نے بتایا کہ اس نے خبر شائع کر کے ایک مشکل کھڑی کر دی ہے۔ کمال جان نہ سکا کہ مشکل کیا پیدا ہوئی تھی۔ دوپہر کو بسواروپ باسک کا فون آیا جس نے کہا کہ کمیٹی ایوارڈ کے حقدار کا نام خود ذرائع ابلاغ کو دینا چاہتی تھی۔ کمال نے وضاحت کی، ''لیکن مجھے تو کسی نے منع نہیں کیا تھا''۔

''کمیٹی کا خیال تھا کہ آپ خود سمجھ جائیں گے''۔

لیکن اب کیا ہوسکتا تھا؟

ادھر کمال کو توقع تھی کہ مینا اسے فون کرے گی۔ بہت دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے بوجھل دل سے پھر فون کیا۔ مینا سے بات ہوئی تو اس نے ایوارڈ ملنے پر کمال کو مبارکباد دی اور ساتھ ہی پوچھا کہ اسے کتنی رقم ملے گی؟

''مجھے صحیح علم نہیں، شاید ایک لاکھ روپیہ ہو''۔

''شاندار! اس کا یہ مطلب ہوا کہ اب تم اپنی لکھت سے بھی کمائی کرو گے''۔

''تمھیں اس تقریب میں آنا ہوگا،'' کمال نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر کہا۔

''ایوارڈ تمھیں مل رہا ہے، مجھے نہیں۔ میں کیوں آؤں؟''

"کیا میں اس روز اکیلا ہی جاؤں گا؟"

"ایوارڈ تمہارے ہاتھوں میں دیا جائے گا"۔

"اور میں تمہارے حوالے کر دوں گا"۔

"رینا کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ پھر تمہارے بے شمار پرستار ہیں، انہیں اپنے ہمراہ لے جانا"۔

"فضول باتیں مت کرو۔ تمہیں آنا ہوگا"۔

"کیا میں ساتھ والے گھر میں رہتی ہوں کہ تم بلاؤ اور میں بھاگی چلی آؤں گی"۔

"تمہارے آنے جانے کے اخراجات میرے ذمہ"

"میری چھٹی کا کیا ہوگا؟"

"ڈاکٹر برنارڈ سے بات کرو، مسئلہ حل ہو جائے گا"۔

"اچھا، میں دیکھوں گی"

"دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہیں آنا پڑے گا"۔

"گویا تم مجبور کر رہے ہو کہ جب بھی بلاؤ، مجھے آنا ہوگا"۔

"میرے علاوہ اور کون تمہیں مجبور کر سکتا ہے؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہی۔ مجھے اپنا تحقیقی مقالہ بھی تو لکھنا ہے"۔

"اگر تحقیقی مقالہ لکھنے کی بات ہے تو بے شک نہ آنا"

اس کے ساتھ ہی ان کی گفتگو ختم ہو گئی۔

....

آل انڈیا سروسز (کنڈکٹ) رولز 1968 کے تحت مجاز حاکم کی منظوری کے بغیر کسی کتاب، مضمون یا اخبارات میں ایڈیٹر کے نام اپنے، کسی دوسرے کے نام یا گمنام خط کی اشاعت، یا ریڈیو پروگرامز میں شرکت ممنوع اور خلافِ ضابطہ ہے، ہاں البتہ ادبی، سائنسی یا فنونِ لطیفہ سے متعلق کتاب یا مضمون کی اشاعت اس سے مستثنیٰ ہے۔ کمال آل انڈیا سروس میں تھا لیکن کتاب کی اشاعت سے قبل اس نے اجازت حاصل نہیں کی تھی۔ اس کے خیال میں ادبی نوعیت کا موضوع ہونے کے سبب اس کی اجازت لازمی نہیں، لیکن ایوارڈ کا ملنا ایک الگ بات تھی کیونکہ اس میں نقد انعام بھی شامل تھا۔ اس نے اپنے کمشنر مسٹر نہار تعلقدار سے بات کی جن کا مشورہ تھا کہ کمال کو اب اجازت طلبی کی درخواست دے دینی چاہیے۔ ان کی رائے میں یہ ایک رسمی کارروائی ہے جس میں انکار کی گنجائش نہیں۔

مشورے پر عمل کرتے ہوئے کمال نے متعلقہ حکام کے ذریعے درخواست بھیج دی جو اسی دن ہوم سیکرٹری کو وصول بھی ہو گئی۔ وقت گزرتا رہا لیکن جواب ندارد۔ آخر تین ہفتوں کے بعد اسے اجازت نہ ملنے کا خط ملا۔ اس نے اسی وقت کمشنر کو خط دکھایا جسے پڑھ کر وہ ششدر رہ گیا، "یہ کیا نامعقول بات ہے۔ وہ یقیناً تم سے حسد کرتے ہیں ورنہ اجازت دینے سے انکار کیوں کرتے؟" اس نے وزیر اعلیٰ کے دفتر میں متعلقہ افسر سے بات کی، "یہ کیا؟ مسٹر منڈل کو آنند پریشکار ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ آل انڈیا سروس کے کسی افسر کو پہلی بار اس ذی وقار انعام کا حقدار سمجھا گیا ہے۔ اس نے اجازت طلبی کی درخواست دی لیکن انکار کر دیا گیا حالانکہ یہ خالصتاً ادبی موضوع ہے"۔

دوسری طرف سے کیا کہا گیا؟ کمال لاعلم تھا، تاہم کمشنر نے فون ختم ہونے کے بعد کمال کو مشورہ دیا کہ وزیر اعلیٰ اسمبلی

میں ہیں، کتاب کی ایک جلد فوراً ان کے کانفیڈنشل اسسٹنٹ کو پہنچادو، اور کسی طریقے سے معلوم کرو کہ انکار کا سبب کیا لکھا گیا ہے۔ کمشنر نے یہ صائب مشورہ بھی دیا کہ فی الحال اس ساری گفتگو کا کسی سے ذکر نہ ہو، مبادا یہ بات اخبارات تک پہنچ جائے ورنہ مشکل ہو جائے گی۔

کمال کتاب کا ایک نسخہ لے کر متعلقہ جوائنٹ سکیرٹری مسٹر پربھورام سے ملا جس نے بتایا کہ کتاب میں قابلِ اعتراض باتیں ہیں۔

''کہاں ایسی باتیں لکھی ہیں؟''، کمال نے پوچھا۔

پربھورام نے کتاب کھولی اور ایک صفحہ اس کے سامنے پڑھا، ''28 ستمبر، 1990 کو مسٹر ایڈوانی نے سومنات سے رام رتھ جلوس نکالا، نعرہ بازی ہوتی رہی، 'مندر وہیں بنے گا'۔ رتھ پرولیا کے پاس پہنچا تو فسادات شروع ہو گئے مگر جلوس کو نہ روکا گیا''۔

کمال نے سوال کیا، ''اس میں قابلِ اعتراض بات کیا ہے؟''

''آپ نے بالواسطہ حکومت کی نااہلی پر تنقید کی ہے''۔

''کیسی تنقید؟ یہ حقیقت ہے۔ واقعات کا بیان کسی پر تنقید نہیں ہوتا''۔

''لکھنے کا مطلب یہی ہے کہ آپ بھی اس پر یقین رکھتے ہیں''۔

''گویا حقیقت مختلف ہے؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا''۔

''پھر آپ کیونکر اسے حکومت پر نکتہ چینی کہتے ہیں؟''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہتر ہے آپ ہوم سیکرٹری سے بات کریں''۔

کمال باہر آ گیا۔ اس چاپلوس کے بارے میں وہ کیا کہہ سکتا تھا۔ اسے ٹیگور کی 'دو بیگھہ زمین' کے فقرے ذہن میں آ گئے، 'خوشامدی اپنے آقا کی کہی بات کو بار بار دہراتا رہتا ہے'۔ لہٰذا اس کاسہ لیس کے آقا سے بات کرنا بہتر ہے، یہ کچھ نہیں سمجھے گا۔ کمال یہاں سے اسمبلی گیا، وزیرِ اعلیٰ کے سٹاف کو کتاب دے کر واپس آیا اور کمشنر کو ساری روداد بیان کی۔ اِدھر کمال جواب کا منتظر تھا، اُدھر ایوارڈ کمیٹی اس سے رسمی رضامندی کی متقاضی تھی، لیکن وہ ہاں ناں نہیں کر سکتا تھا۔ کمیٹی اس ٹال مٹول کا سبب نہ جان سکی۔

ایوارڈ دینے کی تقریب بروز ہفتہ، 29 اپریل تھی۔ ایک روز پہلے اسے وزیرِ اعلیٰ کے دفتر بلایا گیا۔ ملاقات پر اس نے کمال کو مطلع کیا کہ ایڈوانی کی رتھ یاترا کو وزیرِ اعظم کے فیصلے کی رو سے پرولیا سے گزر جانے اور بہار میں روکے جانا تھا۔ کمال نے کہا کہ اس فیصلے کا میڈیا میں کوئی ذکر نہیں تھا۔ وزیرِ اعلیٰ نے بتایا کہ فیصلے کو ارادۃً ذرائع ابلاغ سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ کمال کہنے لگا، ''پھر مجھے کیسے علم ہوتا؟''

''تمہیں علم ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس بات کا انکشاف میں اب کر رہا ہوں۔ کتاب میں مندرج تمہارے الفاظ سے غلط معنی لیے جانے کا احتمال ہے''۔

''کیا میں کتاب کے اگلے ایڈیشن میں آپ کے حوالے سے یہ بات لکھ سکتا ہوں؟''

''ہاں، اگر تم چاہو تو لکھ سکتے ہو۔ ویسے تمہیں ایوارڈ حاصل کرنے کا اجازت نامہ مل جائے گا''۔

شام کو، یعنی تقریب سے ایک روز پہلے، کمال کو اجازت نامہ موصول ہو گیا۔ وہ کمشنر کے پاس گیا اور اسے تقریب میں شامل ہونے کی درخواست کی جو اس نے بخوشی قبول کر لی۔

....

دھوتی کُرتے میں ملبوس کمال تقریب کے لیے پہنچا تو اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ پورا ہال سفید پھولوں سے سجا ہوا تھا حتیٰ کہ ایوارڈ کا نام بھی پھولوں ہی سے لکھا گیا تھا۔ کمال کو پہلی قطار میں بٹھایا گیا۔ کمشنر نہال تعلقدار کی آمد وقتِ معینہ پر ہوئی۔ سارا پروگرام ایک کارڈ پر چھپے ہونے کی وجہ سے رسمی اعلان کے بغیر کارروائی کا آغاز ہوا۔ کونسل آف سائنٹیفکس اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے ڈی، جی، مشہور سائنسدان ڈاکٹر سروج مسرانے کرسیٔ صدارت سنبھالی۔ کمال کو خوبصورتی سے سجے ڈائس پر لایا گیا۔ شاعر نریندر ناتھ چکرورتی نے سپاس نامہ پڑھا۔ ایک خوش پوش خاتون انعامی طشتری اٹھائے ڈائس کے پاس آئی جو صدر نے کمال کو پیش کی۔ صدارتی خطبے اور کلاسیکی موسیقی کے بعد تقریب کا اختتام ہوا۔ تمام مہمانوں کی شیرینی سے تواضع کی گئی۔

....

کمال نے ہوٹل ہی سے مینا کو فون کیا۔ اس کا استفسار تھا، ''تم اس رقم کا کیا کرو گے؟''

''میرے گاؤں میں پرائمری اسکول تک نہیں ہے۔ میں نے تقریب میں تقریر کرتے ہوئے یہ ساری رقم اسکول کی تعمیر کے لیے وقف کرنے کا اعلان کیا ہے''۔

''تم نے میرے مشورے کے بغیر ہی یہ اعلان کر دیا ہے۔ ہم اس رقم کو اپنے کام میں بھی لا سکتے تھے۔ ہم نے تو ابھی تک اپنا گھر بھی تعمیر نہیں کیا''۔

''اس رقم پر میرا حق نہیں۔ اگر مجھے انعام نہ ملتا تب بھی تو ہم گزارا کرتے''۔

''لیکن اب تو یہ رقم تمہاری ہے۔ جس تصنیف پر تمہیں انعام ملا ہے اسے مکمل کرنے کی خاطر تم نے بہت سی کتابیں خریدیں جن کی قیمت تم نے اپنی تنخواہ سے ادا کی تھی، پھر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس پر تمہارا حق نہیں؟''

''اپنی تنخواہ میں سے بچت کر کے ہم اپنا گھر بنائیں گے''۔

''ہاں! بسنت پور کے تمہارے گھر کی طرح کا''، مینا کے جواب میں طنز تھا۔

کمال کو اس کی بات اچھی نہ لگی، ''میرے لیے وہی کافی ہوگا۔ او کے؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے فون منقطع کر دیا۔ سوچتا رہا کاش میں نے فون نہ کیا ہوتا۔ کیا مینا کو ایوارڈ پر خوشی نہیں ہوئی؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

....

26 جون، 1995 کی شام کو کمال براہی بس اسٹینڈ پہنچا۔ کئی روز کی موسلا دھار بارش کی وجہ سے سارا راستہ دلدل سے اٹا بھرا تھا۔ اس نے اپنا چھاتہ کھولا اور چل پڑا۔ جلد ہی وہ براہی ویلفیئر سوسائٹی پہنچا جو اس کی طالبِ علمی کے زمانہ میں واحد کلب تھا۔ طویل عرصہ تک وہ اسی گمان میں رہا کہ نزدیکی میدان اسکول کا حصہ ہے لیکن بعد میں علم ہوا کہ سوسائٹی کی ملکیت ہے جبکہ اسکول کا ملکیتی میدان پیالی دریا کے دوسرے کنارے پر ہے جہاں کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے۔ کمال کو ایوارڈ ملنے کے اعزاز میں سوسائٹی گراؤنڈ میں پُروقار تقریب منعقد ہوئی جو اس کے لیے عزت افزائی سے زیادہ حوصلہ افزائی تھی۔ یہ سب لوگ اس کے اپنے تھے، وہ انہی لوگوں میں جوان ہوا تھا۔ اس کے اپنے اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور دیگر معززین وہاں موجود تھے۔

تقریب بہت شاندار تھی۔ اسکول کی ایک طالبہ نے خوش آمدیدی گیت گا کر آغاز کیا، پھر سوسائٹی کے سیکرٹری نے تقریب کا مقصد بیان کیا۔ ہیڈ ماسٹر نے شاندار تقریر کی اور BDO نے کمال کو گلدستہ اور اعزازی طشتری پیش کرنے کے بعد اسے چند الفاظ کہنے کی درخواست کی۔ کمال نے اپنی مختصر تقریر میں کہا، ''مجھے اپنے ہم وطنوں کی تعلیمی اور طبی ترقی کی خواہش ہے تاکہ وہ بھی ترقی یافتہ ممالک کی ہمسری کر سکیں''۔

تقریب کے اختتام پر وہ فوراً اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں اس نے اسکول کی تعمیر کا اعلان کرنے کے لیے

اہلِ دیہہ کی میٹنگ بلائی ہوئی تھی۔ گبتالہ کے نزدیک پہنچ کر اس نے جوتے اتارے کیونکہ دلدل کی وجہ سے جوتے پہن کر چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ چند منٹوں میں وہ نجیب کے گھر پہنچ گیا جو اسکول میں اس سے ایک سال آگے تھا۔ بی، کام حصہ اوّل کے بعد اس نے تعلیم ترک کر کے ایک پرائمری اسکول میں بطور استاد ملازمت کر لی تھی۔ اس کی ایمانداری، صاف گوئی اور بے تکلفی کی وجہ سے پارٹی رہنما اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ برآمدے میں کھڑا کمال کا منتظر تھا۔ اسے دیکھ کر کمال پوچھنے لگا، ''کیا تم میٹنگ میں نہیں جاؤ گے؟ کیا تمہیں نہیں بلایا گیا؟''

''بلایا تو تھا مگر اس بارش میں کون آئے گا؟''

''تم میرے ساتھ چلو، میں باقیوں کو بھی بلاتا ہوں''۔

پھر کمال اپنے دوستوں صادق، نجیب اور سیف کے بعد دیگر لوگوں سے فرداً فرداً ملا، پھر اپنے گھر جا کر چھوٹے بھائی سے سوال کیا کہ آیا سب لوگوں کو بلایا ہے؟

کسی زمانے میں جب چوکیدار انظام رائج تھا، گاؤں کا چوکیدار پیغام رسانی کی ذمہ داری نبھاتا تھا لیکن موجودہ حکومت نے نظام ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو پھر کسی چوکیدار کی تعیناتی نہ ہوئی۔ گاؤں کا آخری چوکیدار حال ہی میں ریٹائر ہونے والا ضمیر الدین تھا۔ اسی پس منظر میں کمال نے اپنے بھائی سے پوچھا کہ لوگوں کو کس طریقے سے بلایا گیا ہے۔ اس نے بتایا کہ باپو جی نے انصار کو کچھ معاوضہ دینے کے عوض لوگوں تک پیغام پہنچایا ہے۔ کمال نے سمجھایا، ''اتنی بارش میں کون آئے گا کیونکہ وہاں روشنی ہے نہ چھت۔ اب ایک کام کرو، لالٹین اور دو دریاں لے کر عبدل کے گھر جاؤ، اسے کہو کہ اپنے گھر کے برآمدے میں رکھے تاکہ لوگ آرام سے بیٹھ سکیں''۔

خود کپڑے بدل اور کھانا کھا کر وہاں پہنچا تو دیکھا کہ صرف دس لوگ موجود تھے۔ اس نے بھائی کو بھیج کر باقی لوگوں کو بھی پہنچنے کا پیغام دیا۔ چودہ پندرہ لوگ پہنچ گئے لیکن ان میں کوئی پختہ عمر کا مرد، لڑکی یا عورت موجود نہیں تھے۔ ایک دوست نے بارش اور کم حاضری کی وجہ سے کمال کو میٹنگ کسی اور دن کے لیے موخر کرنے کا مشورہ دیا، لیکن اس کی رائے تھی کہ اس وقت گفتگو کا آغاز کر دیا جائے، جب موسم کھل جائے، ہم دوبارہ اکٹھے ہو جائیں گے۔ کمال نے موجود لوگوں کو بتایا کہ اس کا ارادہ گاؤں میں ایک پرائمری اسکول قائم کرنے کا ہے۔ ایک شخص نے کمال سے سوال کیا کہ جب وہ اسکول کا طالبِ علم تھا، اس وقت بھی اسی قسم کی تجویز سامنے آئی تھی، ایک کمیٹی بھی بنائی گئی، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا، اب پھر میٹنگ بلانے کا کیا جواز ہے؟ کمال نے تسلیم کیا کہ اُس وقت واقعی کوئی پیشرفت نہیں ہوئی تھی لیکن اب کی بار ہم کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ ایک اور شخص کا استفسار تھا کہ اتنی امید کا کارن کیا ہے؟ کمال نے جواب دیا۔

''اُس وقت مجھے خود بھی صحیح علم نہیں تھا کہ کام کیسے ہوگا، اب ایسا مسئلہ نہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان دنوں میرے پاس زمین یا سرمایہ نہیں تھا لیکن اب میرے پاس دو لاکھ سے کچھ زیادہ ہی روپے ہیں''۔

نجیب نے سوال کیا، ''ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ انعام کی رقم ایک لاکھ روپیہ ہے، باقی پیسے کہاں سے آئے؟''

''باقی رقم مجھے اپنی کتابوں کی رائلٹی سے ملی ہے۔ اگر مزید پیسوں کی ضرورت ہوئی تو میں اپنی تنخواہ میں سے پوری کروں گا''۔

سیف اللہ بولا، ''ہاں، تب ٹھیک ہے۔ اب بتاؤ کرنا کیا اور کیسے ہے؟''

''پہلا کام ایک کمیٹی تشکیل کرنا ہے جو مجھ سے ساری رقم لے کر اسکول کی تعمیر شروع کرے''۔

سوسائٹی کا نام گاؤں کے نام کی مناسبت سے بسنت پورہ ایجوکیشن سوسائٹی تجویز ہوا نجیب نے کمیٹی کی سربراہی کے

لیے کمال کا نام تجویز کیا، سب حاضرین کو رکن بنایا گیا۔ کمال کی مجوزہ سوسائٹی کے اغراض و مقاصد اور میمورنڈم پر سب نے صاد کیا۔ اس نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اسکول کی تعمیر کا مقصد تعلیم اور متعلقہ سرگرمیوں کے دائرۂ کار کو وسعت دینا ہے۔

....

کسی پسماندہ ملک میں جنم لینا سود مند نہیں ہوتا کیونکہ ترقی یافتہ ممالک کی نسبت یہاں معیارِ زندگی اور تعلیم بہت کمتر اور ملازمتوں کے مواقع اور تنخواہیں ناکافی ہونے کے باعث ان ملکوں کے ذہین اور محنتی افراد ترکِ وطن پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ افراد اپنے غریب ممالک کے وسائل پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد دوسرے دیشوں کی ترقی میں حصہ دار بنتے ہیں۔ ایسے بھی نوجوان ہیں جو تعلیم اپنے ملک میں حاصل کرنے کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم یا تحقیق وغیرہ کے لیے باہر گئے تو وہاں انہیں بہتر تنخواہ اور سہولتوں پر ملازمت مل گئی۔ معاوضے زیادہ ہونے کے باعث ان کی زندگی آرام دہ گزرتی ہے اور ساتھ ہی وہ بچت بھی کرتے رہتے ہیں۔ جب تک انہیں کسی وجہ سے نکلنا نہیں پڑتا، وہ واپس آنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ اپنے قیام کو طول دینے کی غرض سے وہ کسی مقامی کو رشوت دینا یا کاغذی شادی کرنا معیوب نہیں سمجھتے۔ نتیجتاً، ذہین، تعلیم یافتہ اور ہنرمند افراد اپنے ملکوں کو چھوڑ کر امیر اور ترقی یافتہ ممالک میں جا بستے ہیں۔

بھارت میں ریسرچ سکالر کو اب تنخواہ کے علاوہ پانچ ہزار روپے زیادہ ملتے ہیں۔ اگر وہ کسی نہ کسی طریقے سے امریکی اداروں میں منتخب ہو جائیں تو تقریباً دو ہزار ڈالر (یعنی ایک لاکھ بھارتی روپے) حاصل کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ایک امریکی شہری کو اس سے زیادہ معاوضہ ملتا ہے تاہم باہر سے آئے لوگ اس پر بھی خوش ہوتے ہیں۔ زندگی کی کم و بیش تمام آسائش میسر ہو جانے کے ساتھ بچت بھی ہوتی رہتی ہے۔ امریکہ سے ٹیلیفون کرنے پر تقریباً ایک ڈالر فی منٹ خرچ ہے، اتوار اور دیگر تعطیلات میں یہ نرخ اور بھی کم ہو جاتے ہیں۔ اگر پانچ منٹ بات کی جائے تو پونے تین ڈالر خرچ آتا ہے جو اس کی ماہوار کمائی کا صرف 0.1375 بنتا ہے جبکہ بھارت سے اتنے ہی وقت کے لیے 550 روپے دینے پڑتے ہیں، یعنی کمائی کا گیارہ فیصد۔ بھارت سے امریکہ جانے پر ہوائی جہاز کا کرایہ 65,000 روپے، یعنی ایک عام آدمی کی سال بھر کمائی سے بھی زیادہ ہے، جبکہ وہاں سے یہاں آنے کا کرایہ ایک ہزار ڈالر ہے، گویا دو ہفتوں کی آمدن۔ اسی قسم کا فرق ذہن میں آتے ہی لوگ اپنے ملک اور عزیز و اقارب کو نظرانداز کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کمال ان تمام باتوں سے بخوبی آگاہ تھا اور چونکہ مینا کی روانگی کے بعد ایک تو اس کی اپنی زندگی متاثر ہوئی اور پھر ایسی باتوں کو سوچ سوچ کر مزید پریشان ہوتا رہا۔

گذشتہ روز مینا کا شکایت آمیز فون آیا ''میرا دوست میکو جاپان واپس چلا گیا ہے جہاں سے وہ روز دو تین بار فون کرتا ہے مگر تم ایک دفعہ بھی نہیں کرتے''۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا لیکن دکھ ضرور ہوا۔ کیا وہ اس ملک کو، اپنے ماضی کو بھول گئی ہے؟ ایک وقت آئے گا جب یہاں سے امریکہ فون کرنا بہت ارزاں ہوگا مگر وہ خود اس دن تک زندہ نہیں ہوگا۔

کمال کسی دوسرے ملک میں مستقل قیام کا خواہاں نہیں تھا لیکن دنیا کو دیکھنے اور جاننے کی خواہش یقیناً تھی۔ اس کا فائدہ ملک کے علاوہ اپنی عائلی زندگی میں بھی تھا۔ گذشتہ کچھ عرصہ سے کمال ایک دو برس کے لیے فیلوشپ پر امریکہ جانے کی کوشش میں تھا۔ اس نے حسبِ ضابطہ اپنی درخواست بھیجی جو مختلف محکموں سے ہوتی ہوئی انکار پر منتج ہوئی کہ ریاست میں ملازم انڈین پولیس سروس کا کوئی رکن فیلوشپ کا مجاز نہیں۔

بہت کوششوں کے بعد کمال متعلقہ سیکرٹری مسٹر کرشنا مورتی سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہوا اور اسے انکار کا جواب دکھایا تو وہ بہت متعجب ہو کر کہنے لگا، ''ہم چاہتے تھے کہ اس بار کوئی مسلمان افسر فیلوشپ پر جائے لیکن کسی کا نام ہی موصول نہیں ہوا''۔

کمال نے بڑی شائستگی سے جواب دیا،''سر! میں مسلمان امیدوار کی حیثیت سے نہیں حاضر ہوا ہوں''۔

''کیا تم مسلمان نہیں ہو؟''

''جی ہوں''۔

''پھر؟''

''سر! میں نے بطور مسلمان کوئی رعایت نہیں مانگی''۔

''پھر؟''

''سر! میں نے مرکزی حکومت کے ایک سرکلر کے جواب میں درخواست دی تھی جو ریاستی محکموں سے ہوتی ہوئی آپ تک پہنچی ہے۔ سب نے سفارش کی لیکن اب آپ فرماتے ہیں کہ میں اس کا اہل نہیں۔ اگر میں اہل نہیں تھا تو یہ مراسلہ کیوں جاری کیا گیا؟ میں کسی اور فیلوشپ کے لیے درخواست دے دیتا''۔ یہ کہتے ہوئے کمال نے مراسلہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ کرشنا مورتی نے پڑھنے کے بعد کہا،''اسے بھول جاؤ۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ تم کسی یونیورسٹی میں مزید تعلیم کے لیے درخواست دو۔ منظور ہونے پر ہم بھی تمہیں چھٹی دے دیں گے''۔

کمال سمجھ گیا کہ کرشنا مورتی کی طرف سے منظوری نہیں ہوگی اس لیے وہ متعلقہ وزیر سے ملا جس نے ساری بات سن کر اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو بلا کر کہا کہ کمال کے لیے کچھ کیا جائے۔ وہاں سے نکل کر دونوں PS کے دفتر آئے۔ اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ سیکرٹری کی طرف سے تمہیں اجازت کا ملنا محال دکھائی دیتا ہے۔ وزیر کا انداز بھی گول مول سا ہے کیونکہ وہ سیکرٹری کی مرضی کے خلاف فیصلہ نہیں دے گا، اگر وہ اجازت دینا چاہتا تو سیکرٹری کو بلا کر واضح ہدایت دیتا۔ آپ کو اجازت ملنے کا امکان نہیں ہے۔ وزیر محض وزیر مملکت ہے، اگر اس کی طرف سے اجازت مل جائے اور سیکرٹری نہ چاہے تو وہ سارا معاملہ کیبنٹ منسٹر کے سامنے لا کر اپنی بات منوا سکتا ہے۔

کمال جان گیا کہ پرائیویٹ سیکرٹری بھی اس معاملہ میں کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، بلکہ ڈھکے چھپے انداز میں ڈرا رہا ہے کہ اگر اس نے ادھر ادھر سے کہلوانے کی کوشش کی تو سارا معاملہ ختم سمجھے۔ کمال کے خیال میں PS بھی باقی افسروں کے مقابلہ میں اسے آگے بڑھتا دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے کمرے سے باہر نکلا تو کمال کی نظر ایک نیم پلیٹ پر پڑی، لکھا تھا''سنیل سین''۔ اسے بنگالی سمجھ کر، اور یہ گمان کرتے ہوئے کہ وہ کوئی مشورہ دے سکے گا، وہ اسے ملا، لیکن وہ بنگالی نہیں راجستھانی نکلا، لہٰذا کام کی بات کئے بغیر صرف حال احوال پوچھ کر آ گیا۔

اور کوئی ایسا شخص بھی نہ ملا جس سے اس معاملہ میں کوئی مدد یا مشورہ کیا جاتا۔ اسے بنگہ بھون (دہلی میں مغربی بنگال کا سرکاری گیسٹ ہاؤس) کے نگران کی بات یاد آ گئی کہ''ہمارے بابو لوگ اچھی ملازمتوں پر آنے کی کوشش نہیں کرتے، اور اگر کوئی سوئے اتفاق آ بھی جائے تو کلکتہ سے دہلی آنے کو تیار نہیں ہوتا، اسی وجہ سے ریاست اور اس کے باسیوں کے مفادات کا تحفظ نہیں ہو پاتا''۔ کمال سوچنے لگا کہ اگر اس وزارت میں اس کے صوبے کا کوئی افسر ہوتا تو وہ شاید کچھ مدد کر سکتا تھا۔

کمال کا احساسِ محرومی قابلِ فہم تھا۔ سیکرٹری اس کو مسلمان سمجھ رہا تھا، وہاں اور کوئی مسلمان نہیں تھا۔ وہ یہاں انڈین پولیس سروس کا واحد رکن اور اکیلا بنگالی تھا، لہٰذا وہ دل شکستہ ہو کر سیکرٹریٹ سے باہر نکل آیا۔ اسے یقین تھا کہ اہلیت کے باوجود اس کا نام ہارورڈ یونیورسٹی کی فیلوشپ کمیٹی کو نہیں بھیجا جائے گا۔

اعلیٰ افسران کے لیے بیرون ملک متعدد تربیتی کورس ہوتے رہتے تھے۔ بھارتی حکومت کے ان ملکوں سے معاہدات بھی تھے لیکن ایک مشکل یہ تھی کہ تقریباً تمام اعلیٰ ترین عہدوں پر انڈین ایڈمنسٹریٹو افسر قابض تھے جو اپنے بھائی بندوں کو یورپ

اور امریکہ بھیجنے کی راہ ہموار کرتے رہتے۔ ان کی متعلقہ وزارت MPAR تھی جہاں تقریباً سارے اہم تربیتی پروگراموں کے لیے افسروں کا انتخاب کیا جاتا تھا، مثلاً ہارورڈ یونیورسٹی کے میسن فیلوشپ (Mason Fellowship) میں ہر سال سات افسروں کوایک سالہ کورس کے لیے چنا جاتا جن کے تمام اخراجات ورلڈ بنک یا فورڈ فاؤنڈیشن برداشت کرتی تھی۔ ان افسروں کا انتخاب MPAR کی ذمہ داری تھی لہٰذا انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس ہی کے افسروں کو منتخب کیا جاتا۔ پولیس سروس کے افسر اس وزارت کے ماتحت صرف اس وقت آتے جب وہ عارضی مدت کے لیے CBI میں ملازمت کرتے لیکن اس قسم کے کورس میں ان کے انتخاب کی شرائط اس قدر کڑی تھیں کہ کسی کا کامیاب ہونا کارے دارد تھا۔ ان کے لیے آسٹریلیا میں ایک سالہ تربیتی پروگرام تھا لیکن صرف ایک افسر ہی منتخب ہوتا۔

واپس آ کر کمال ہوم سیکرٹری اور چیف سیکرٹری سے ملا۔ ان دونوں کا بھی مشورہ رخصت برائے تعلیم کا تھا۔ چیف سیکرٹری کرشنم اچاریہ نے بتایا کہ قواعد میں تبدیلی کے باعث اب تعلیم کے لیے بیرونِ ملک کسی یونیورسٹی سے براہِ راست رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے، ساتھ ہی اس نے ترمیم شدہ قواعد کی ایک نقل بھی کمال کو دی۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ یونیورسٹیوں کی فہرست لینے امریکن سنٹر پہنچا۔ امریکہ کے کسی تعلیمی ادارے میں داخلہ کے لیے مطلوبہ مضمون کی مناسبت سے TOEFL, GRE,GMAT میں سے ایک امتحان میں کامیاب ہونا لازمی ہے۔ تعلیمی رخصت کے لیے ایک شرط یہ بھی تھی کہ کورس افسر کے سرکاری فرائض سے مطابقت رکھتا ہو۔ مینا Worcester میں تھی لہٰذا اس نے وہیں کے تعلیمی اداروں میں مینجمنٹ کورس میں داخلہ لینے کے لیے مراسلت شروع کر دی۔ ایک کالج نے اسے دو سالہ ہیومن ریسورس مینجمنٹ میں داخلہ دینے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ پہلے ہی سے پی، ایچ، ڈی ڈگری یافتہ ہونے کے باعث اسے GMAT وغیرہ سے استثنٰی مل گیا لیکن تعلیمی رخصت کی درخواست رد ہونے پر کمال کو انتہائی حیرت ہوئی۔ وہ چیف سیکرٹری سے ملا جس نے ایک سفارشی خط لکھا مگر اس پر بھی انکار کر دیا گیا۔ اب یہ بات ہر قسم کے اشتباہ سے بالا تھی کہ اس کا اعلیٰ افسروں سے بحث کرنا کسی کو نہ بھایا تھا۔ اس نے ایک ہفتہ کی چھٹی لی اور دہلی روانہ ہو گیا۔ محکمہ کسٹم کا ایک ایماندار، صاف گو اور کمال سے محبت کرنے والا شخص رابندر ناتھ بھٹا چاریہ اس کا سابقہ ہمعصر حال ہی میں بمبئی سے دہلی تبدیل ہوا تھا۔ کمال اس سے ملا۔ سوئے اتفاق اس کا ایک بیچ میٹ فضل فدا اس کی اپنی وزارت کے وزیر کا بطور پرائیویٹ سیکرٹری کام کر رہا تھا۔ بھٹا چاریہ نے اسے فون کیا۔ کمال کے ذہن میں آیا کہ اگر یہ دو افسروں پہلے موجود ہوتے تو اس کی فیلوشپ کا معاملہ نہ اٹکتا۔

کمال فدا سے جا کر ملا جس نے انکشاف کیا کہ بھٹا چاریہ نے قبل ازیں کسی کی بھی سفارش نہیں کی تھی، لیکن مجبوری یہ آن پڑی کہ وزیر کے ساتھ اس معاملہ پر بات نہیں ہو سکتی۔ وجہ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ محکمۂ خفیہ نے اس کے خلاف رپورٹ دی ہوئی ہے۔

''محکمۂ خفیہ کی رپورٹ؟ میرے خلاف؟'' کمال کو حیرت کا دھچکا لگا۔

''جی، ہاں۔ آپ کے خلاف''۔

''کیا مجھے رپورٹ کا پتہ چل سکتا ہے؟''

''میں کسی کو رپورٹ دکھانے کا مجاز تو نہیں لیکن آپ کو پڑھا دوں گا تا کہ آپ بھٹا چاریہ صاحب کو میری مجبوری سے آگاہ کر سکیں''۔

فدا نے رپورٹ دکھائی جس میں کمال کے امریکی سفارت خانے کے لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا گیا تھا۔ حیرت زدہ کمال پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ ''دوستانہ تعلقات'' رکھنا نااہلیت اور برائی کے معنوں میں آتا ہے؟

''ممکن ہے غیر واضح انداز میں یہ اشارہ کیا گیا ہو کہ آپ ان لوگوں کے لیے کام کرتے ہیں''۔

کمال کو علم تھا کہ خفیہ محکمے کے اہلکار اعلیٰ سرکاری افسروں کی سفارت خانوں میں آمدورفت پر نظر رکھتے ہیں، لیکن وہ ہوم سیکرٹری اور چیف سیکرٹری کے مشورے پر وہاں گیا تھا، اس پر اعتراض کیسا؟ اس نے فدا سے پوچھا کیا رپورٹ بھیجنے والے کا نام معلوم ہو سکتا ہے؟ اس نے دیکھنے کے بعد بتایا کہ ایڈیشنل ڈائریکٹر، انٹیلیجنس بیورو کے مسٹر ناتھ کی طرف سے آئی ہے۔ فدا نے مزید انکشاف کیا کہ چند IAS کے افسروں کے بارے میں بھی ایسی رپورٹیں ملتی رہی ہیں مگر انہیں باہر جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔

کمال نے سوال کیا، ''انہیں کیسے اجازت مل جاتی ہے؟''

''حکومت پر کوئی پابندی نہیں کہ ایسی رپورٹوں پر افسروں کو اجازت دینے سے انکار کرے۔ IAS افسروں کے معاملات پر ان کی سروس کے لوگ ہی فیصلے کرتے ہیں، لہٰذا رپورٹوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے مگر آپ کے معاملہ میں اس کو بنیاد بنا پر اجازت دینے سے انکار کیا گیا ہے''۔

یہاں سے فارغ ہو کر کمال بھٹا چاریہ کے پاس پہنچا اور ساری روداد بیان کی۔ اس نے پوچھا، ''یہ رپورٹ کون دے سکتا ہے؟ کون ہے، جو تمہارے بیرونِ ملک جانے پر خوش نہیں؟''

''سر! میں نے پولیس سروس ایسوسی ایشن کی میٹنگ میں تجویز دی تھی کہ جن راشی اور بدعنوان پولیس افسروں کی وجہ سے پوری سروس بدنام ہو رہی ہے ان کے خلاف کارروائی ہونی چاہیے۔ جب کچھ افسروں نے مجھے ان کے نام افشاء کرنے پر زور دیا، اور میں بتانے ہی والا تھا کہ ایک گروپ کی طرف سے خاموش رہنے پر دباؤ ڈالا جانے لگا۔ وہی لوگ مجھ سے پُرخاش رکھتے ہیں ورنہ۔۔۔۔۔''

بھٹا چاریہ نے مسٹر ناتھ کو فون کیا، ''دادا! آپ اپنی سروس کے ڈاکٹر کمال منڈل کو جانتے ہی ہوں گے۔ اس کے خلاف رپورٹ کیوں دی گئی ہے؟۔۔۔۔۔۔ میں آپ کو ان ذرائع کا نہیں بتا سکتا جہاں سے یہ بات معلوم ہوئی ہے، لیکن آپ نے اس کی رخصت برائے تعلیم کا ستیاناس کر دیا ہے۔۔۔۔۔ نہیں، نہیں، بات کچھ اور ہے۔ آپ نے IAS کے ایک افسر کے بارے میں ایسی ہی رپورٹ بھیجی تھی، کیا اس پر اسے امریکہ جانے سے روکا جا سکا تھا؟۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے اس میں آپ کی خطا نہیں لیکن آپ کی رپورٹ پر کمال کا امریکہ جانا ممکن نہ ہو سکا۔ اس کی بیوی، جو وہیں پر ہے، وہ اور بھگوان اس کے لیے آپ کو معاف نہیں کریں گے۔۔۔۔۔ ہاں، کسی نے ایسی رپورٹ تیار کی ہو گی لیکن کیا آپ تصدیق نہیں کرتے؟۔۔۔۔۔ شکریہ دادا''۔

کمال کو مسٹر ناتھ پر بڑا طیش آیا جو اس کے اپنے صوبے اور اسی سروس سے تعلق رکھتا تھا لیکن جس انداز سے بھٹا چاریہ نے اس کی گوشمالی کی تھی وہ شدید برہمی کا اظہار تھا۔ اس نے کمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''رخصت کی اجازت نہ دینا الگ بات ہے مگر ایسی من گھڑت رپورٹ تیار کرنا تو بالکل ہی نازیبا حرکت ہے۔ یہ تو کئی برسوں تک ریکارڈ میں رہے گی۔ اس پر باریک بینی سے غور کرو''۔

اس سے اجازت لے کر کمال بنگہ بھون واپس آیا۔ وہ شدید مضطرب تھا۔ فیلوشپ کی اجازت نہ ملی، تعلیم کے لیے چھٹی مانگی تو انکار، اوپر سے یہ رپورٹ، گویا اس کے مستقبل کی ساری کاوشیں بے سود رہیں گی۔ کیا کیا جا سکتا ہے؟ ان لوگوں سے درخواست کرنا پتھر پر سر مارنے کے مترادف ہے۔ اس نے قواعد وضوابط کو پھر سے بنظرِ عمیق پڑھنا شروع کیا۔ روشنی کی اک کرن دکھائی دی۔ صدرِ مملکت کے نام ایک درخواست بھیجی جا سکتی ہے جو متعلقہ وزیر کے پاس چلی جائے گی، شاید کچھ دادرسی ہو جائے۔ اسی خیال میں اس نے صدرِ جمہوریہ ہند کے نام ایک درخواست میں تمام حقائق لکھ کر اپنے افسرانِ بالا کی وساطت سے بھیج دی۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر اسے صدرِ ہند کے دفتر سے اطلاع ملی کہ اس کی درخواست متعلقہ وزارت کو بھیج دی گئی ہے۔

اسی دوران کمال ہبرٹ ہمفرے فیلوشپ کی کوشش کرتا رہا۔ یہ اس کے لیے واقعی تعجب خیز بات تھی کہ حکومت نے امریکہ میں متعلقہ ادارے کو درخواست روانہ کردی جنہوں نے اس شرط پر اس کا انتخاب کیا کہ حکومتِ ہند کمال کو کم از کم ایک سال کی رخصت دے گی۔ اس موقع پر چند اخباری نمائندے سدِ راہ بن گئے۔ ہوا یہ کہ انہوں نے اخبارات میں نمایاں طور پر خبر شائع کردی کہ کمال منڈل جسے حکومتِ ہند دو مرتبہ اجازت دینے سے انکار کرچکی ہے، اس بار اس کا نام فیلوشپ کے لیے امریکہ بھیجا گیا ہے۔ نتیجتاً، فہرست میں سے اس کا نام نکال دیا گیا۔

ایک ماہ بعد متعلقہ وزارت نے ہوم سیکرٹری کو لکھا کہ کمال کو تعلیمی رخصت کی دوبارہ درخواست کے لیے کہا جائے۔ اس نے عمل کرتے ہوئے عرض داشت بھیج دی اور پھر تقریباً ایک مہینہ کے بعد منظوری کی اطلاع موصول ہوگئی۔ اس نے فدا صاحب کو فون پر صورتِ حال بتائی جس نے انکشاف کیا کہ کمال کی صدرِ ہند کے نام درخواست پر تحقیقات کا حکم ہوا اور رپورٹ ملنے پر اسے چھٹی دی گئی ہے۔

سارے کاموں میں اتنا وقت گزر گیا کہ مینا کی معیاد بھی قریب الاختتام ہوگئی۔ علاوہ ازیں، پے در پے انکار سننے کے بعد اس نے مایوس ہوکر ایک مقامی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا، لہٰذا اس نے وزارت کو لکھ دیا کہ بلاجواز تاخیر کے باعث اب وہ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اخبارات نے اس خبر کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ ادھر مینا کی واپس آمد میں دیر ہوتی رہی۔ ڈھائی برس گزرنے کے باوجود بھی اس کی واپسی نہ ہوئی تو کمال نے چند روز کے لیے وہاں خود جانے کا فیصلہ کیا۔ 27 ستمبر کو اس کی نشست مخصوص ہوگئی کیونکہ وہ 30 اکتوبر کو مینا کے پاس موجود ہونا چاہتا تھا۔

....

25 ستمبر، 1995، کمال اپنے دفتر میں سرکاری امور نبٹانے میں مصروف تھا۔ ابھی اسے امریکہ روانگی کی تیاری بھی کرنی تھی کہ اسے اپنے باپ کے وفات کی خبر ملی۔ تھوڑی دیر تک تو وہ گم سم بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بیچارے باپ کی صورت پھرنے لگی۔ وہ شخص جو اسے دنیا میں لایا، جس نے رات دن محنت کرکے اس کی پرورش کی، جو ابھی تک اس کا خیال کرتا رہا ہے، اب اس دنیا میں نہیں۔ موسیقی کا دلدادہ شخص جسے زندگی میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اب دنیا چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس ہمدرد شخص نے سمجھایا تھا کہ مینا کو باہر مت بھیجو۔ اس نے مینا کو اپنے باپ کی وفات کی خبر دیتے ہوئے گاؤں جانے کے متعلق بتایا۔

''مطلب یہ کہ تم میرے پاس نہیں آؤ گے؟''

''میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا''۔

پھر اس نے کمشنر کو فون پر بتایا کہ اسے فوری طور پر گاؤں جانا ہے لہٰذا وہ چھٹی کی درخواست واپس آکر جمع کرا دے گا۔ گاؤں پہنچتے پہنچتے اسے شام ہوگئی۔ بارش بھی شدید تھی، بہرطور وہ کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گیا۔ گاؤں والے اس کے منتظر تھے لیکن اس وقت تک میت کو غسل دے کر کفن پہنا کر نمازِ جنازہ کے لیے کمال کا انتظار ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ماں کا رونا دھونا زیادہ ہوگیا۔ وہ غمزدہ ماں سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن سمجھ نہ پایا کیا بات کرے۔ ساری زندگی دو چار الفاظ سے زیادہ کچھ نہ کہے تھے۔ باپ کی زندگی کے شب و روز دماغ میں گھوم گئے۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ اسکول کے دنوں میں اس کا باپ ایک بار پاٹھ شالا جانے کی بجائے مگرمچھ پکڑنے کا منظر دیکھنے چلا گیا تو واپسی پر پنڈت نے اس کی خوب پٹائی کی جس پر اس نے تعلیم ترک کردی۔ لیکن مار پٹائی کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا، نتیجتاً وہ زندگی بھر اپنی کسی خواہش کی تکمیل کا نہ سوچ سکا، ہاں البتہ ایک خواہش ضرور پلتی رہی کہ اپنے بڑے بیٹے یعنی کمال کی شادی خوب دھوم دھڑکے سے کرے مگر بیٹے نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ اسے بندوق خریدنے کا شوق تھا، کمال نہ مانا جو اس کی رائے میں خوامخواہ خطرے کی بات تھی۔ خادم نے زور نہ دیا بلکہ اپنی تمام خواہشات

ترک کردیں۔اب وہ ہمیشہ کے لیے شانت ہو گیا، کسی کے بارے میں کوئی شکایت نہ رہی۔

وہ انہی گزری باتوں میں محو تھا جب اس سے اجازت لے کر خادم کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ جنازہ اٹھایا گیا تو اس کی ما ں پچھاڑیں کھانے لگی۔ باقی لوگوں کی بھی آنکھیں بھر آئیں لیکن کمال بالکل خاموش، بلا کسی ردِعمل سب کے ساتھ قبرستان جار ہا تھا۔قبر کی پاس اس کی میت رکھی گئی، دو آدمی لحد میں اترے، اس نے چند دوسرے افراد کے ساتھ مل کر باپ کو دھرتی کی گود میں لٹایا۔ آخری دیدار کے لیے اس کے چہرے سے کپڑا ہٹایا گیا، کمال نے چہرہ دیکھا، پھر اسے دوبارہ ڈھانپ دیا گیا۔اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ باپ کی شفیق صورت پھر کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔اس نے ایک بار مزید چہرہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔اگرچہ ایسی کوئی روایت اور رواج نہیں تھا، تاہم اس کی آرزو کا احترام کرتے ہوئے خادم کے چہرے پر سے کپڑا ہٹایا گیا۔کمال خود پر قابو نہ رکھ سکا اور پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔دیگر لوگ بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔تدفین کے بعد سب نے لحد پر مٹی ڈالی اور اس کے اوپر خاردار ٹہنیاں بکھیر دیں تا کہ آوارہ کتے بے حرمتی نہ کرتے پھریں۔

قبرستان سے کمال گھر واپس آیا۔سب لوگ غم میں ڈوبے ہوئے تھے۔دیہاتی علاقوں میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ایسے مواقع پر ارد گرد کے لوگ اہلِ خانہ کے دکھ میں دلجوئی کے لیے موجود رہتے ہیں۔وہ گھر والوں کے علاوہ ان کے ڈھور ڈنگر کے بھی کھانے کا بندوبست کرتے ہیں۔نور محمد اسے زبردستی اپنے گھر لے گیا، ادھر فتح بو بو بھی کھانا لے آئی لیکن دونوں کے زور دینے پر بھی کمال کی جیسے بھوک اڑ گئی ہو۔نہ صرف باپ کی وفات بلکہ بینا کی یاد نے بھی اسے بہت دکھی کر دیا تھا۔وہ ابھی تک اس بات سے لاعلم تھا کہ والدین نے بینا کے رویئے کو کیسا محسوس کیا تھا جب وہ کمال کے ساتھ اس کے گاؤں گئی تھی۔

نصف شب تک وہ اپنی ماں کا دکھ بٹاتا اور بعد میں دوسروں کو سونے اور آرام کرنے کی تلقین کرتا رہا۔چونکہ تھکے ماندے تھے اس لیے جا کر سو گئے۔اگلے روز اپنے اپنے کام کاج میں مصروف ہو گئے جبکہ کمال سوچ رہا تھا کہ اسے امریکہ جانا چاہیے یا نہیں۔ماں کا مشورہ تھا کہ جو ہونا تھا، ہو چکا، خادم اب کبھی واپس نہیں آئے گا اس لیے کمال کو اپنی بیوی کے پاس جانا چاہیے جو طویل مدت سے وہاں اکیلی رہ رہی ہے۔اگلے روز وہ امریکہ روانہ ہونے کے لیے واپس لوٹ آیا۔سامان خریدنے کا وقت نہیں تھا لہٰذا تھوڑی بہت چیزیں اکٹھی کیں اور ہوائی اڈے کو روانہ ہو گیا۔کچھ جمع پونجی تدفین وغیرہ پر خرچ ہو چکی تھی، باقی اس نے ہوائی اڈے سے دو سو ڈالر خریدے، اور جہاز پر سوار ہو گیا۔

....

اگلے دن وہ بوسٹن ہوائی اڈے پر اترا۔ٹیکسی لے کر بینا کی رہائش گاہ جا پہنچا۔وہ بھی گھر سے باہر آ گئی لیکن کمال کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس کی آمد پر خوش نہ ہوئی ہو۔اسے تکلیف ہوئی کہ ایک تو اتنا طویل سفر، دوسرے باپ کی وفات کے فوراً بعد گاؤں سے روانگی اور اوپر سے بینا کا رویہ۔لیکن اس کا ایسا رویہ کیوں تھا، وجہ جان کر اسے بہت صدمہ ہوا۔ایک سبب بینا نے خود ہی بتایا کہ جب اس نے کمال کے لیے لیموزین کا بندوبست کیا ہوا تھا، وہ خود کیوں آ گیا؟ کمال نے وضاحت کی کہ وہ اس بات سے لاعلم تھا۔

''کیا ہوائی اڈے سے تمہیں اطلاع نہیں دی گئی تھی؟''

''نہیں، اگر مطلع کیا جاتا تو مجھے کیا ضرورت تھی ٹیکسی لے کر آنے کی؟''

''میں نے یہ سوچ کر بکنگ کرائی تھی کہ تمہیں کوئی پریشانی نہ ہو''۔

''پریشانی کوئی نہیں ہوئی۔یہاں ہر کوئی انگریزی جانتا ہے، اس لیے ٹیکسی لینے اور یہاں تک آنے میں کوئی دشواری نہیں تھی''۔

''میں جانتی ہوں تمہیں انگریزی آتی ہے، لیکن کیا میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی تھی؟''

''اس کا جواب تو وہی لیموزین دے سکتی ہے جو تم نے میرے لیے بک کروائی تھی''۔

وہ بُڑبُڑ کرتی رہی کیونکہ کمال کا خاطر خواہ استقبال نہ کر سکی تھی، ادھر وہ اس بات کو اہمیت ہی نہیں دے رہا تھا۔ مینا کی ناراضی کا دوسرا سبب کمال کے ہاتھ میں پکڑا ہوا بھدا اور پرانا بیگ تھا جسے وہ اپنے معیار سے کمتر سمجھتی تھی، لیکن جو کمال پر بیتی تھی اگر ساری صورتِ حال سے آگاہ ہوتی تو شاید ایسا رویہ اختیار نہ کرتی۔ اور یہ بیگ معیار سے کمتر تھا تو اسے پھینک کر نیا لیا جا سکتا تھا، یہ تو بالکل معمولی سی بات تھی۔ اپنے شفیق باپ کی وفات کے بعد کمال بجا طور پر پریشان تھا۔ مینا ڈھارس بندھا کر اس کی زیادہ محبوب بن جاتی، لیکن اس کا انداز اس قدر پھیکا اور تکلیف دہ تھا کہ کمال اسی لمحہ واپس آنے کی سوچ کر اپنا بیگ اٹھائے دروازے کی طرف بڑھا۔ مینا نے راستہ روکتے ہوئے کہا، ''لوگ کیا کہیں گے کہ آتے ہی تم فوراً واپس چلے گئے ہو؟''

''میرے احساسات کیا ہیں، تمہارا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہاں، تمہارے لیے یہ بات اہم ہو سکتی ہے کہ لوگ کیا سوچیں گے''۔

''ایسی باتیں میں نے تم سے ہی سیکھی ہیں''، مینا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اور میں تمہیں اس سے باہر نکلنے کا طریقہ بھی بتا دیتا ہوں۔ لوگوں کو بتا دینا کہ یہاں پہنچتے ہی مجھے اپنے والد کی وفات کی خبر ملی تھی''۔

''اوہ! تم ایک عظیم انسان ہو''، مینا نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہارے باپ کے انتقال کی خبریں اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ یہ میں کیسے کہوں، اور ہاں! یہ گمان کیسا کہ مجھے تمہارا خیال نہیں۔ میں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں کہ تمہاری وجہ سے میں آج یہاں پہنچی ہوں''۔

''میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا''۔

''فکر مت کرو۔ تمہارے واپس چلے جانے پر لوگ مجھ پر تھوکریں گے۔ یہاں تمہارے بہت چاہنے والے ہیں، وہ تم سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ پلیز، مت جاؤ''۔

''تمہاری خاطر میں یہاں چند روز رک جاؤں گا مگر تم سے الگ رہائش رکھوں گا''۔

وہ خاموش ہو گئی، کمال رک گیا۔ کمرے میں صرف ایک ہی پلنگ تھا۔ فیصلہ ہوا کہ کمال زمین پر بستر بچھائے گا۔ وہ زمین پر بستر ڈال کر سو گیا لیکن اگلی صبح اس نے مینا کو بھی اپنے ساتھ سوتے ہوئے دیکھا۔ دوسری شب اسے پلنگ پر لیٹنا پڑا۔ بعد میں وہ اکٹھے رہنے اور سونے لگے مگر تعلقات میں پہلے جیسی گرمجوشی نہ رہی۔

باپ کی وفات کے باعث کمال زیادہ پیسوں کا بندوبست نہ کر سکا تھا۔ گو مینا کے پاس معقول رقم تھی لیکن کمال کو اس سے کچھ لینا گوارا نہیں تھا۔ مینا نے اسے متعدد جگہوں پر لے جانا چاہا مگر وہ ہر بار انکار کر دیتا، اگر کہیں گیا بھی تو اپنے خرچ پر یا کسی دوست کے ساتھ۔ سارا دن گھر پر گزرتا یا لائبریری میں، یا پھر جھیل کے کنارے سیر گشت کرتا رہتا۔

....

وہ امریکہ کے اصل اور قدیمی باشندوں سے ملاقات کا خواہاں تھا۔ اس دھرتی کے پیدائشی مالک وہی تھے، یورپی لوگوں نے تو یہاں زبردستی قبضہ جما لیا تھا۔ کمال نے مسٹر برنارڈ سے اس خواہش کا اظہار کیا مگر وہ کوشش کے باوجود اصلی امریکی کو تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ کمال خود بھی اپنے وطن بھارت میں فرقہ وارانہ اختلافات کا شکار تھا۔ امریکہ میں گوروں اور کالوں کے درمیان ہونے والے امتیاز کے بارے میں مطالعہ کرنے کے بعد اس نے برنارڈ سے تفصیلی تبادلہ خیال کیا۔ سیاہ فام

لوگوں سے گفتگو کرنے کے لیے اس نے ووسیسٹر سٹیٹ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر کلیان گھوش سے رابطہ کیا جس نے اسے کالج میں مدعو کیا اور ایک سیاہ فام ماہرِ تعلیم ڈاکٹر پیٹر سائکس سے ملاقات کرائی جو گھوش کی رائے میں اس موضوع پر بات کرنے کے لیے سند کا درجہ رکھتا تھا۔

ڈاکٹر سائکس نے صاف الفاظ میں بتایا کہ ہم سب سیاہ فام باشندے تعصب اور امتیازات کے مارے ہوئے ہیں۔ یہی فرق ہماری سوچوں میں نقش ہے۔ اگر آپ کسی سفید فام کی باتیں سنیں یا ان کی تصانیف کا مطالعہ کریں تو یوں لگتا ہے کہ اس ملک میں امتیاز اور تعصب نام کی کوئی چیز ہی نہیں، لیکن اس کے برعکس سیاہ فام باشندوں کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے۔ انہیں یقین ہے کہ امریکی معاشرے میں ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے، ''اب آپ ہی بتائیں کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟''

کمال کو اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر سائکس اس موضوع پر یقیناً قابلِ قدر معلومات اور مطالعہ کا حامل ہے، اس لیے پوچھا، ''سب سے پہلے تو یہ بتائیں کہ عام سیاہ فام لوگوں کے خیالات کیا ہیں؟''

ڈاکٹر سائکس اسے اپنے کمرے میں لے گیا، الماری سے ایک کتاب نکال کر کمال کو دیتے ہوئے بولا، ''برا نہ مانئے، آپ اس کتاب کا تھوڑا سا مطالعہ کیجئے، اس وقت میری ایک کلاس ہے، میں ایک گھنٹہ میں فارغ ہو کر آتا ہوں''۔

کمال نے کتاب کا عنوان دیکھا، '' Living with Race: The Black Middle Class Experience, by Joe R. Feagin & Melvin P. Sikes'' اس نے دیباچہ پڑھنا شروع کیا:

> ''گورے امریکہ میں سیاہ فام ہونے کا مطلب کیا ہے؟ خودکشی سے محض ایک قدم کا فاصلہ۔ میرا کہنے کا مقصد ہے کہ ایک نفسیاتی حربی کھیل جو زندہ رہنے کے لیے ہمیں ہر روز کھیلنا پڑتا ہے۔ ہمیں اپنے جیسے لوگوں کی آبادی میں رہنا، کام یا کاروبار کرنا پڑتا ہے۔ ہم ہر جگہ نہیں رہ سکتے۔ میرے خیال میں ایسا سب کے ساتھ ہو سکتا ہے لیکن ہمارے ساتھ تو بالخصوص ہی ہوتا ہے۔ یہ ایک ذہنی مسئلہ ہے۔ تعجب ہے کہ ابھی تک ہم حواس باختہ ہو کر مرنے مارنے کی راہ پر نہیں چلے''۔

کمال پڑھتا رہا:

> ''سفید فام لوگوں کا ایمان کی حد تک یقین ہے کہ امتیازی سلوک کوئی ہمہ گیر اور سنجیدہ مسئلہ نہیں، اور اگر سیاہ فام شہریوں کے خلاف کوئی معاندانہ باتیں سامنے آتی ہیں تو زیادہ تر متعصب، معاشرے سے کٹے گوروں اور کلان (امریکہ کی کوکلس کلان نامی ایک خفیہ تنظیم) کا کام ہے۔ تاہم متوسط طبقے کے افریقی۔ امریکی لوگوں کے ساتھ ان کی تگ و دو، کامیابی، خصومت اور امتیاز کی گفتگو کی جائے تو وہ اپنے تجربات کی روشنی میں مختلف کہانیاں بیان کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ یہ افریقی۔ امریکی باشندے آپس کی بات چیت میں اس دکھ کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ روزمرہ زندگی میں جب انہیں مزدور اور متوسط گوروں کے طبقوں سے واسطہ پڑتا ہے تب انہیں احساس ہوتا ہے کہ معاشرتی لحاظ سے ان طبقوں کے برابر نہیں سمجھے جاتے۔ ہمارا اشارہ اس مخاصمت اور امتیازی سلوک کی طرف ہے جو عام جگہوں اور بالخصوص سفید فام لوگوں کے کاروباری مراکز، کام کاج کی جگہوں، رہائشی علاقوں اور اسکولوں کالجوں میں روا رکھا جاتا ہے۔ یہ سفید فام نسلی اور عملی سوچ کا ایک بھیانک اور دردناک پہلو ہے۔

۔۔۔۔۔ محنت ہو یا کامیابی کا حصول، یا پھر دولت، اور وسائل کی فراوانی اور جہدِ حیات میں پیشرفت، چاہے

جتنی بھی ہو، سیاہ فام شہریوں کو عام زندگی میں گوروں کی مسلسل جاری غضب ناکی سے تحفظ دلانے میں بے سود ثابت ہوتی ہے"۔

کمال کو بھارتی اور امریکی معاشروں کی مماثلت پر سخت حیرت ہوئی۔ اسے پختہ یقین ہو گیا کہ اگر اکثریتی فرقہ کے لوگ اقلیتی گروہوں کو اپنا اور اپنے مساوی نہیں سمجھیں گے، وہ کبھی بھی خود کو اوّل الذکر کے مساوی سمجھ ہی نہیں سکتے۔ دیباچے میں پڑھے ہوئے یہ الفاظ اس کے ذہن پر نقش ہو گئے کہ "محنت ہو یا کامیابی کا حصول، یا پھر دولت، اور وسائل کی فراوانی اور جہدِ حیات میں پیشرفت، چاہے جتنی بھی ہو، فرقہ وارانہ معاشرے میں وہ خود کو کبھی بھی اکثریتی فرقے کے برابر نہیں لاسکتا"۔

پڑھتے پڑھتے گوروں کی ایک مسلمہ یونیورسٹی کے طالبِ علم کے اعترافات سامنے آئے:

"دائیں، بائیں، ادھر ادھر، ہر شے، ہر جگہ، جہاں بھی نظر پڑی، سفید رنگ دکھائی دیا۔ کلِ سوسن سفید، ہر شے سفید، کتنی مضحکہ خیز بات ہے، ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ایک مضمون پڑھا کہ امریکہ اور سفید رنگ مترادف ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب یورپی، ایشیائی یا افریقی باشندے امریکہ کے بارے میں سوچتے ہوں گے تو ان کے ذہن میں گورے لوگ ہی آتے ہوں گے، کیونکہ گورے ہی تو ہر جگہ موجود ہیں۔ میرے پاپا کہا کرتے تھے، "سفید ہی حق ہے"۔ یہاں رہنے والی اکثریتی آبادی بھی تو ایسا ہی سوچتی ہے۔ اگر تم سیاہ فام ہو، اپنا حق جتاتے اور اپنی تہذیب وثقافت کا اظہار کرتے ہو تو یہ تمہاری خللِ دماغی ہے کیونکہ تم اس ایمان و ایقان کے بالکل متضاد چل رہے ہو جس کی رو سے امریکہ سفید ہے"۔

کمال سوچنے لگا کہ اگر سفید فام اور سیاہ فام کی بجائے ہندو اور مسلمان پڑھا جائے تو یہ بیان حرف بحرف اس کے اپنے وطن پر منطبق ہوتا ہے۔ اسے اپنی زندگی میں ایسی باتوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے مقالہ میں بنگال میں ہندو مسلم تعلقات اور اکثریتی فرقہ کے رہنماؤں کی ذمہ داریوں کا جائزہ اور تجزیہ پیش کیا تو اس پر شدید تنقید ہوئی اور کوئی وجہ بتائے بغیر مقالے کو مسترد کر دیا گیا کیونکہ اس میں ہندو متوسط طبقے کی اس خود ساختہ ناواجب سوچ کا تجزیہ اور ابطال کیا گیا تھا کہ فرقہ وارانہ سیاست اور تقسیمِ ہند کے ذمہ دار مسلمان تھے۔

....

ڈاکٹر سائکس واپس آئے تو کمال نے کتاب کے بارے میں پوچھا۔ اس نے ایک دو روز کے لیے کتاب عاریتاً لینے کی درخواست کی جو بخوشی منظور کر لی گئی لیکن ساتھ ہی ڈاکٹر سائکس نے کہا، "روزمرہ زندگی میں سیاہ فام باشندوں کی مشکلات اور مسائل سمجھنے کے لیے آپ کو سیاہ فام بننا پڑے گا بصورتِ دیگر آپ کچھ نہیں جان سکتے"۔

"میں آپ کی بات سے سو فیصد متفق ہوں"۔

ڈاکٹر سائکس سے رخصت لے کر گھر لوٹا۔ شام کو بینا اسے ایک بنگالی ریسرچ سکالر ڈاکٹر سین کے ہاں کھانے پر لے گئی جو کمال کو جانتا تھا۔ کھانے کے دوران بینا نے اس سے شراب طلب کی۔ ڈاکٹر سین نے فرج سے بوتل نکالی اور اسے میز پر رکھتے ہوئے بولا، "ڈاکٹر منڈل چونکہ پیتے نہیں اس لیے میں نے رکھی بھی نہیں تھی"۔

کمال کو بینا کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ وہ خود مے نوشی سے اجتناب کرتا تھا تاہم ایسا نہیں تھا کہ شراب پینے والے اس کی نظر میں برے لوگ تھے، بس وہ خود ناپسند کرتا تھا کیونکہ مے خوار اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ بینا چائے اور کافی کی رسیا تھی مگر شادی کے بعد اس نے کمال کی دیکھا دیکھی ترک کر دیا تھا لیکن یہاں اس نے سب کچھ پینا شروع کر دیا ہے۔ سب سے قابلِ اعتراض بات یہ تھی وہ ڈاکٹر سین کے ہاں مدعو تھی، اگر اس نے خود شراب پیش نہیں کی تھی تو بینا کو تقاضا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

کھانے سے واپسی پر کمال نے اس سے کہا، ''اگر تمہیں شراب پینے کا شوق ہے تو خود خرید لینی چاہیے۔ بطور مہمان درخواست کرنا اچھا نہیں''۔

بینا یکدم طیش میں آ گئی، ''ہاں، میں پیئوں گی۔ تمہارے سامنے پیئوں گی۔ مجھے بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟''

کمال نے کوئی بحث نہیں کی، بس اتنا کہا، ''معذرت چاہتا ہوں۔ آئندہ میں کسی دعوت میں نہیں جاؤں گا''۔

بینا کا نقطۂ نظر کچھ اور تھا، ''یہ عزت کا معاملہ ہے۔ تم کیوں نہیں جاؤ گے؟ لوگ کیا سوچیں گے؟''

بعد میں بھی وہ کمال کو دعوتوں میں زبردستی لے جاتی رہی۔ آخری دعوت ڈاکٹر کلیان گھوش کے گھر تھی۔ وہ کلکتہ یونیورسٹی میں کیمسٹری کا طالب علم تھا، پھر امریکہ نقل مکانی کر کے آیا اور بتدریج ترقی کر کے وہیں ایک کالج میں پرنسپل تعینات ہو گیا۔ اس کی بیوی بھی ملازم تھی۔ حال ہی میں انہوں نے بڑی دھوم دھام سے اپنے بیٹے کی شادی کی تھی۔ انہوں نے اس کی ویڈیو دکھائی، غالباً مقصد یہ تھا کہ مہمانوں کو اپنا تموّل اور شان بان دکھائی جائے۔ وہ کمال کے لیے کوئی الجھن پیدا کرنے کے متمنی نہیں تھے مگر ہونے والی بات ہو گئی۔ بینا کا رنگ ڈھنگ بدل گیا۔ اس وقت تو وہ خاموش رہی، واپس آتے ہی پھٹ پڑی، ''میری شادی بھی ایسی دھوم دھڑکے سے ہونی چاہیئے تھی''۔ کمال نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا، ''ہماری شادی کی تقریب زیادہ پُرکشش تھی، اس میں کوئی فضول خرچی اور ہلہ گلہ نہیں تھا۔ تم نے ویڈیو میں جو کچھ دیکھا وہ شادی نہیں بلکہ دولت کا اظہار تھا۔ اس میں وہ جاذبیت دکھائی نہیں دی جو ہماری شادی میں تھی''۔

بینا مگر مطمئن نہ ہوئی۔ کہنے لگی، ''میں تم سے شادی کی خواہشمند تھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تم نے مجھے کوئی تقریب کیے بغیر شادی پر مجبور کیا۔ تم نے مجھے پرتکلف اور روایتی شادی کی خوشیاں دیکھنے سے محروم رکھا''۔

اب کمال کو بھی غصہ آ گیا، ''میں صرف مذہبی رنگ و انداز کی شادی سے مجتنب تھا، مگر شادی کے لیے تمہیں مجبور نہیں کیا تھا۔ اگر ایسی ہی رنگ برنگی شادی کرنے کی خواہش تھی تو کچھ دیر انتظار کر لیا ہوتا''۔

بینا کو جواب پسند نہ آیا اور وہ چپ چاپ منہ پھیر کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد فون بجنے لگا مگر وہ نہ اٹھی۔ بالآخر کمال نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے اسے خبر سنائی گئی کہ اس کی تبدیلی انفورسمنٹ برانچ میں کر دی گئی ہے۔ اس نے بینا کی طرف دیکھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مایوس ہو کر وہ خود بھی بستر پر جا لیٹا۔

اگلے روز 30 اکتوبر تھی۔ ہر سال وہ اپنی منگنی کی سالگرہ منایا کرتا تھا لیکن گذشتہ دو برسوں سے بینا کی بیرونِ ملک موجودگی کے باعث یہ دن خاموشی سے گزر جاتا۔ پچھلے سال اس نے بینا کو لکھا تھا کہ آئندہ برس وہ دونوں مل کر سالگرہ منائیں گے، اب دونوں اکٹھے تھے مگر یہ کس قسم کی رفاقت تھی؟ کمال بوجھل دل سے دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

علی الصبح کمال کی آنکھ کھلی، گہری نیند میں سوئی بینا کے چہرے سے بے بسی عیاں تھی۔ اس نے بے چین ہو کر اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا تو وہ ترت کمال سے بغلگیر ہو گئی۔ گھٹا چھٹ گئی۔ وہ مسکراتی ہوئی اپنے کام پر روانہ ہوئی، شام کو دونوں ادھر ادھر گھومے پھرے، کھایا پیا، کمال اس کے لیے مٹھائی اور پھول خرید لایا۔ گھر پہنچے تو بینا نے تجویز دی، ''آؤ! ہم آج کی روداد، اپنے محسوسات اور جذبات ضبطِ تحریر میں لائیں، پھر کبھی بعد میں اسے پڑھیں گے''۔ کمال مان گیا اور دونوں نے قلم کاغذ سنبھال لیے۔

....

انفورسمنٹ برانچ کا قیام دوسری جنگِ عظیم کے تجربے کو مدِ نظر رکھ کر عمل میں لایا گیا تھا جس کا مقصد اشیائے ضروریہ کی بڑھتی ہوئی بلیک مارکیٹنگ کو روکنا تھا۔ اس سلسلہ میں اشیائے ضروریہ ایکٹ (Essential Commodities Act) نافذ کیا گیا جو پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں تو حسبِ حال تھا کیونکہ اس دور میں ملک اور معاشرے میں سوشلسٹ اندازِ فکر اور ملی جلی

معاشی سرگرمیوں جاری تھیں۔ لائسنس اور تجارتی اجازت ناموں کی بھرمار کی وجہ سے پولیس کی انفورسمنٹ برانچ خاص اہمیت کی حامل تھی۔ لیکن نوے کی دہائی میں لبرم ازم کی لہر آنے سے مذکورہ ایکٹ کے تحت ہونے والی متعدد پابندیاں رفتہ رفتہ ختم ہونے لگیں، لہٰذا اس برانچ کی سرگرمیاں اور اہمیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اب دو چار کام ہی باقی رہ گئے تھے جنہیں کمال باریک بینی اور تفصیل سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسے اطلاع ملی کہ گنیش سنگھ نامی ایک بدنامِ زمانہ مجرم پولیس افسر کانو گوہانی یوگی کے ساتھ مل کر خلافِ قانون کاموں میں مصروف ہے۔ گنیش کے بھانجے اور یوگی کی بیوی کے نام سے وہاں ایک صابن سازی کا کارخانہ قائم تھا جس میں گھٹیا قسم کا صابن اور کپڑے دھونے والا پاؤڈر تیار ہوتا جو مشہور کمپنیوں کے نام پر مارکیٹ میں فروخت کیا جاتا۔ قانون کی سراسر خلاف ورزی ہونے کے باوجود ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ عدالتی حکم کی رو سے ان کے ملکیتی کارخانوں اور گھروں کی تلاشی، اور ان کی گرفتاری کے لیے عدالتی اجازت نامے کی ضرورت تھی۔

اس قسم کا حکم اگرچہ جاری نہیں ہوتا لیکن عدالت کے چند جج صاحبان نے کسی خاص وجہ سے یہ حکم دے دیا تھا۔ اس عدالتی فیصلے کا کمال کو پہلی بار بیکنٹھ پور میں علم ہوا جب اس نے امیت اگروال کے خلاف کارروائی کرنا چاہی۔ اس نے فیصلے کو منسوخ کرانے کوشش کی مگر کامیابی سے پہلے ہی اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ ایسے بے ایمان اور بے اصول لوگوں کا طریقۂ کار یہ تھا کہ وکیل کے ذریعے اپنے زیرِ ممنون، دوست یا رشتہ دار جج کے پاس مقدمہ لگواتے۔ چیف جسٹس سپریم کورٹ کا واضح حکم تھا کہ زیرِ غور مقدمہ میں جج کا کوئی رشتہ دار اس کی عدالت میں مقدمہ کی پیروی نہیں کر سکتا لیکن اس حکم کو بالعموم نظرانداز کر دیا جاتا۔ بعض اوقات مدعا علیہ کو رشوت دے کر مقدمے کی پیروی سے دور یا مخالفت سے باز رکھا جاتا۔ اس طرح عدالت بظاہر قانونی اور بے ضرر سا حکمِ امتناہی جاری کر دیتی اور بعد ازاں کسی جادو کی چھڑی سے مِسل ہی غائب کر دی جاتی۔ متعلقہ فریق اس حکم امتناہی کو بے دھڑک استعمال کرتا۔ جب مجرموں اور پولیس کا گٹھ جوڑ ہو تو دونوں کی شراکت داری خوب رنگ دکھاتی ہے۔

کمال نے گنیش سنگھ کے معاملہ میں قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے آدمیوں کو محکمۂ خفیہ کی رپورٹیں اور دیگر اہم معلومات اکٹھی کرنے کو کہا۔ ناکامی کے بعد یہ کام اس نے خود شروع کر دیا۔ ایک طرف عدالت کا حکم، دوسری طرف ایک ریٹائرڈ پولیس افسر بھی غیر قانونی دھندے میں ملوث، گویا پولیس اور مجرموں کے تعلق کی نمایاں مثال۔ اس صورتِ حال میں کمال کو انتہائی احتیاط اور ناقابلِ تردید شواہد کی ضرورت تھی لیکن کوشش کے باوجود ایسے ثبوت ہاتھ نہ لگے۔

وہ اپنے دفتر میں بیٹھا اسی پر سوچ و بچار کر رہا تھا، پیچھے ہٹنا بھی گوارا نہ ہوا۔ اگر ایک مقدمے کو نظرانداز کیا جائے تو دیگر معمولی مقدمات پر ہاتھ ڈالنے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں رہ جاتا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب سے بولنے والے نے اپنا نام AKD بتایا جو اس کا مخبر تھا۔ اس نے اطلاع دی کہ گنیش اس وقت چرچ لین میں اپنے دفتر میں موجود ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ صابن اور پاؤڈر کے جعلی لفافوں اور ڈبوں کا ایک ٹرک ابھی ابھی ہنس پکوریا لین عمارت کی چھٹی منزل پر اتارا گیا ہے۔

کمال کو معلوم ہوا تھا کہ گنیش نے شہر کے مرکز ہنس پکوریا لین میں پانچ ہزار مربع فٹ زمین پر ناجائز قبضہ کر کے متعلقہ اداروں کی اجازت کے بغیر سات منزلہ عمارت تعمیر کی ہوئی ہے۔ رشوت اور دھمکیوں نے سب کا منہ بند کر رکھا تھا۔ ایک نوجوان صحافی سریندر سنگھ نے موقع پر جا کر ثبوت اکٹھا کرنے کی ''جسارت'' کی تھی۔ سنگھ کے گرگے اسے پکڑ کر اپنے باس گنیش سنگھ کے پاس لے گئے۔ اس نے سوال کیا، ''کیا تم اس پیشے میں نئے ہو؟''

''کیوں؟''، نوجوان نے پوچھا۔

گنیش کے چیلے چانٹے درشتی سے بولے، ''باس دوسروں کے سوالوں کا جواب نہیں دیتا، وہ صرف سوال پوچھتا ہے۔

جلدی سے جواب دو ورنہ۔۔۔۔۔''۔ پھر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ دوسری صورت میں اسے ختم کر دیا جائے گا۔ گنیش مسکراتے ہوئے کہنے لگا، ''یہ لوگ بڑے خطرناک ہیں، ان کے ساتھ پنگا مت لو، یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں''۔

صحافی نے پوچھا، ''کیا یہاں کوئی بااختیار محکمہ نہیں؟''

گنیش استہزائیہ ہنسی میں کہنے لگا، ''بااختیار محکمہ؟ ہاں ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی تمہیں مہلت ہی نہیں ملے گی، اور گر چلے بھی گئے تو تمہاری بات کوئی نہیں سنے گا۔ اس لڑکے کو دیکھو۔ یہ انسدادِ فتنہ گری محکمے کے ایک سپاہی کا بیٹا ہے جو میرے غنڈہ گردی محکمے میں ملازم ہے۔ کیا شاندار جوڑ ہے یہ! کیا ایسا نہیں ہے؟''

ایک غنڈہ بولا، ''یہ مت سمجھنا کہ باس کے تعلقات صرف سپاہیوں ہی سے ہیں۔ سپاہی سے لے کر تمہارے ڈپٹی کمشنر تک سب کا حصہ انہیں پہنچتا رہتا ہے، لہٰذا تمہاری مدد کو کوئی نہیں آئے گا''۔

دوسرے نے دھمکی دی، ''اگر تم اپنی پتنی کو دھوا نہیں کرنا چاہتے تو یہاں سے فوراً نکل جاؤ''۔ اور پھر انہوں نے اسے دھکے دے کر باہر دھکیل دیا اور خود سیٹیاں بجاتے رہے۔

صحافی نے ایک بار کمال سے ملاقات کے دوران یہ ساری روداد سنائی اور کہا تھا، ''مسٹر منڈل! یہ باعثِ توہین تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ایک آزاد جمہوری ملک کا صحافی ہوں جہاں پریس کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے''۔

''تم ان کے بارے میں لکھتے کیوں نہیں ہو؟''، کمال نے سوال کیا۔

''میں نے رپورٹ تیار کر کے بھیجی تھی لیکن ایڈیٹر نے شائع نہیں کی''۔

''کیوں؟''

''مجھے علم نہیں کہ خوف کی وجہ سے یا کسی باہمی مفاہمت کے تحت''۔

''اب میرے پاس کیوں آئے ہو؟''

''میری خواہش ہے کہ ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی ہونی چاہیے''۔

''لیکن تم خود ہی بتا رہے ہو کہ ان کے پاس عدالت کا حکمنامہ ہے''۔

''جی ہے''۔

''پھر؟''

''میں جانتا ہوں کہ سوائے آپ کے اور کوئی اس کام پر ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ کوئی راستہ تلاش کیجیے''۔

''فی الحال میں جنرل ایڈمنسٹریشن میں نہیں ہوں۔ انفورسمنٹ برانچ میں میرا کام متعلقہ قوانین پر عمل کرانا ہے، پھر بھی میں پوری پوری کوشش کروں گا''۔

اس گفتگو کے پس منظر میں اس نے مخبر سے بات کرتے ہوئے اسے موقع پر رہنے اور یہ دیکھنے کی ہدایت کی کہ آیا جعلی لفافے اور ڈبے وغیرہ کہیں اور تو نہیں منتقل کیے جا رہے۔ اگر ایسا ہو تو اسے موبائل فون پر مطلع کیا جائے۔

بات ختم کرنے کے بعد اس نے اسسٹنٹ کمشنر کو بلوایا اور اسے فوری چھاپہ مارنے کے لیے دس اہلکاروں، دو افسروں کے دو تین گروپ تشکیل دینے اور تین گاڑیاں تیار رکھنے کی ہدایت کی۔ پھر اس نے نقشے کی مدد سے تمام مقامات کا جائزہ لیا۔ ایک ٹیم اس کی اپنی نگرانی میں روانہ ہو گی، مگر سوال پیدا ہوا، کون سی ٹیم؟ وہ ٹیم جو گنیش سنگھ کے دفتر جائے یا وہ جسے جعلی مواد قبضے میں لینا ہے؟ گنیش کی گرفتاری ضروری تھی مگر جعلی مواد پر قبضہ بھی لازمی تھا۔ ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد اس نے جعلی سامان تحویل میں لینے کے لیے خود متعلقہ عمارت میں پہنچنا ضروری سمجھا۔ چھاپے کے مقام اور مقصد سے بے خبر رکھنے کے لیے اس نے باقی

دونوں ٹیموں کو عمارت کے سامنے والے میدان میں تعینات کیا۔

کمال نے وہاں پہنچ کر مخبر سے بات کی۔ جعلی سامان تا حال وہیں موجود تھا۔ اپنی ٹیم کو عمارت کا گھیراؤ کرنے کی ہدایت دینے کے بعد اس نے مقامی تھانے فون کر کے باوردی سپاہی بھیجنے کو کہا۔ پھر اسسٹنٹ کمشنر سے رابطہ کیا۔ پتہ چلا کہ گنیش کہیں اور نکل گیا ہے۔ کمال سمجھ گیا کہ اب اس کی تلاش بے سود ہو گی۔ لہٰذا اس کام کے لیے وہاں ایک انسپکٹر کو چھوڑنے اور اسسٹنٹ کمشنر کو اپنے پاس پہنچنے کی ہدایت کی۔

مشکوک عمارت میں کوئی شخص موجود نہ تھا اس لیے کمال نے گواہوں کے سامنے تلاشی لینا ضروری سمجھا۔ سب انسپکٹر کو دو تین گواہ لانے کو بھیجا مگر ڈر کے مارے کوئی بھی آنے کو تیار نہ ہوا۔ کمال اس کام کے لیے خود چل پڑا۔ قریب ہی کپڑوں کی ایک دکان تھی۔ وہاں جا کر مالک کا نام پتہ پوچھا اور اس سے گواہ بننے کے لیے تحریری درخواست کی لیکن وہ ہاتھ باندھ کر کہنے لگا، ''آپ چلے جائیں گے مگر یہ لوگ میری زندگی عذاب بنا دیں گے، آپ انہیں نہیں جانتے''۔

کمال کہنے لگا، ''مجھے پتا ہے یہ لوگ بڑے خطرناک ہیں۔ میرا وعدہ ہے کہ میں انہیں غنڈہ گردی نہیں کرنے دوں گا، اس مقصد کے لیے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ تم میری مدد کرو، میں تمہاری مدد کروں گا ورنہ انکار کی صورت میں تمہارے خلاف کارروائی کرنی ہو گی۔ میں سرکاری ملازم ہوں اور تمہیں تحریری درخواست کر رہا ہوں۔ تمہارے انکار پر عدالت سے رجوع کر کے قانونی کارروائی کراؤں گا''۔

وہ شخص دوسری دکان پر گیا، وہاں کچھ گفتگو کر کے لوٹا تو کمال کے ساتھ جانے کو تیار تھا۔ اس نے اپنے ہمراہ ایک اور شخص کو لے لیا۔ وہ قفل بند عمارت میں آئے اور کمال نے اپنے اہلکاروں کو دروازہ توڑنے کا حکم دیا۔ اندر تقریباً ہر مشہور برانڈ کے جعلی لفافے اور ڈبے نظر آئے۔ اپنے دس بارہ آدمیوں کو فہرست تیار کرنے کی ہدایت کرنے کے بعد خود دفتر آ گیا اور مقدمہ کے اندراج پر دیگر ساتھیوں سے مشورت کی۔ اس کی اپنی رائے تھی کہ جن کمپنیوں کے جعلی لفافے وغیرہ پکڑے گئے ہیں ان کو درخواست گزار بنایا جائے۔ اس نے ہندوستان لیور کے مقامی دفتر فون کر کے ان سے بات کی۔ وہ درخواست دینے کو بخوشی تیار ہو گئے۔ کمال نے انہیں یہ کام بلا تاخیر کرنے کو کہا، ساتھ ہی ضبط شدہ سامان کی تفصیل اور مقدمہ درج کرنے کے لیے ایک افسر کو مقامی تھانے بھیجا اور خود واپس آ گیا۔

....

تقریباً ایک گھنٹے کے اندر ہی گنیش سنگھ کا وکیل ایک مکتوب لے کر کمال کے پاس آیا جس میں لکھا تھا:

سر! آپ نے میرے مئوکل گنیش سنگھ کی گرفتاری کے لیے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر سمیر مکر جی کی نگرانی میں ایک ٹیم کو بھیجا تھا۔

اس سلسلہ میں مودبانہ گزارش ہے کہ مسٹر جسٹس جی، سی، باسک کے حکم کی رو سے گنیش سنگھ، اس کے کسی ایجنٹ، شراکت دار، ملازم، دوست اور رشتہ دار کے خلاف نہ کوئی کارروائی کی جا سکتی ہے، نہ اس کی رہائشی اور کاروباری عمارت کی تلاشی لی جا سکتی ہے تاوقتیکہ عدالت سے اجازت حاصل نہ کی جائے، اور جب تک اس کے خلاف مقدمے کا آغاز نہ ہو، اسے گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کا اقدام معزز عدالت کے حکم کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ لہٰذا آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ آئندہ سے عمداً کوئی ایسی کارروائی نہ کی جائے بصورت دیگر میرا مئوکل توہینِ عدالت پر عدالت سے رجوع کرنے کا مجاز ہو گا''۔

خط کے ساتھ عدالتی حکم نامہ بھی منسلک تھا لیکن تلاشی اور جعلی اشیاء کی ضبطگی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ کیا ان لوگوں کے ذہن

میں عمارت اور سامان کی ملکیت سے انکار کا خیال ہے؟ اس کی تصدیق کے لیے کمال نے وکیل سے کہا، ''اس حکم کے مطابق تو گنیش سنگھ کی کسی عمارت کی تلاشی یا کسی چیز کو ضبط نہیں کیا جا سکتا''۔

''جی، بالکل یہی''۔

''کیا آپ کو علم نہیں کہ میرے لوگوں نے آپ کے مئوکل کی ایک عمارت پر چھاپہ مار کر وہاں سامان ضبط کر لیا ہے؟''

وکیل کچھ نہ بولا۔ کمال نے کہا، ''اگر آپ لوگ توہین عدالت کا مقدمہ درج کرانا چاہتے ہیں تو ضرور جائیں''۔

وکیل اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ کمال پھر بولا، ''آپ نے جو سنا ہے، میرا مطلب بھی وہی ہے۔ آپ توہینِ عدالت کا مقدمہ درج کرائیں، میں اس کا سامنا کروں گا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ عدالت اس قسم کا حکم کیسے دے سکتی ہے''۔

....

25 جنوری، 1997، کھانے سے فارغ ہو کر کمال آزادیِ ہند کی پچاسویں سالگرہ کی مناسبت سے ایک مضمون لکھ رہا تھا کہ فون پر کنٹرول روم سے اسے مبارکباد دی گئی۔ استفسار پر بتایا گیا کہ ابھی ابھی موصولہ اطلاع کے مطابق اس کی متواتر اعلیٰ اور مستحسن کارکردگی پر صدرِ ہند نے اس سال یومِ جمہوریہ پر اسے انڈین پولیس میڈل دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ فون بند ہوا تو ساتھ ہی کمشنر کا مبارکبادی فون آ گیا، اور پھر ایک کے بعد ایک فون آنا شروع ہو گئے۔

کمال نے بڑے سکون سے خبر سنی مگر دل میں کوئی ہلچل، جوش یا سنسنی خیزی محسوس نہ کی۔ دراصل اسے آنند پرشکار ایوارڈ کا موقع یاد آ گیا تھا، اس وقت بھی اسے ایوارڈ ملنے یا نہ ملنے کا یقین نہ تھا۔ خیر! اس نے مینا کو خبر سنائی۔ وہ مبارک دیتے ہوئے بولی، ''اگرچہ تمہیں ایک ادبی ایوارڈ پہلے ہی ملا ہوا ہے لیکن ملازمت کے حوالے سے ایسا انعام ملنا ضروری تھا''۔

مینا سے بات کے دوران کنٹرول روم کے ذریعے سے کمشنر کا فون آ گیا جو پوچھ رہا تھا، ''کمال تم اپنے گھر کب منتقل ہو رہے ہو؟''

اس کے دل میں اک خلش سی پیدا ہوئی۔ مینا وہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ جب وہ ایک بار ترغیب اور بہلا پھسلا کے لے گیا تو گھر دیکھتے ہی اس نے وہاں رہنے کا خیال مسترد کر دیا۔ اب کمشنر کے سوال کے جواب میں کمال نے کہا، ''میں نے کل شام جا کر دیکھا تھا، مرمت کا کام ابھی باقی ہے''۔

''کوشش کرو کہ کام جلد مکمل ہو جائے، بحیثیت ڈپٹی کمشنر کہیں باہر بیٹھ کر کام کرنا مناسب نہیں''۔

''سر! اس معاملہ کو میں دیکھ رہا ہوں''۔

کمشنر کا فون منقطع ہوا تو کمال مینا سے مخاطب ہوا، ''مینا! کمشنر بلا تاخیر گھر میں منتقل ہونے پر زور دے رہا ہے''۔

''ناممکن۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی''۔

''لیکن وہ گھر ڈپٹی کمشنر کے لیے مخصوص ہے اور پھر موجودہ گھر کسی اور کو الاٹ ہو چکا ہے''۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔ اپنے کمشنر سے بات کرو''۔

''اب میں کیا بات کر سکتا ہوں؟''

''اگر تم نہیں کر سکتے تو میں بات کر لیتی ہوں''۔

''تم کیسے بات کر سکتی ہو؟ اگر کچھ کہنا بھی ہو تو میں ہی کہہ سکتا ہوں''۔

''پھر جاؤ اس کے پاس''۔

کمال پریشان ہو گیا۔ کمشنر اسے گھر منتقل ہونے پر بار بار زور دے رہا تھا اور اس میں کوئی غلط بات بھی نہیں تھی۔ اس

کے پاس مزید کہنے کو رہا ہی کیا تھا؟ وہ خود بھی وہاں منتقل ہونا چاہتا تھا، مگر مینا مان نہیں رہی تھی کیونکہ ایک تو یہ کہ زیرِ مرمت گھر اس کے انسٹیٹیوٹ سے دور تھا، لیکن یہ قابلِ قبول دلیل نہیں تھی، اور دوسرے یہ کہ رہائش باقی دفتروں کے بیچ میں تھی، وہاں حوالات بھی تھی، مجرموں کی آمدورفت گھر سے صاف نظر آتی تھی، کسی شریف آدمی یا خاتون کو وہاں رہنا پسند نہیں آسکتا تھا۔

....

ایک دن صبح کے وقت کمال نے مینا کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا تا کہ حال ہی میں خریدا گیا پلاٹ دکھا سکے جس پر مکان بنانے کا ارادہ تھا۔ مگر اس نے بالکل اجنبی لہجے میں پوچھا، ''کیوں؟''

''پلاٹ دیکھ کر تم مشورہ دے سکتی ہو کہ اس کا نقشہ کیسا ہونا چاہیے''۔

''کیا تم سچ مچ گھر بنانے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''بالکل''۔

''گھر تعمیر کرنے کے لیے پیسے ہیں تمہارے پاس؟ انعام کی رقم تم نے سوسائٹی کو دے دی ہے، اب اپنی کتابوں کی رائلٹی بھی انہیں دینے کا ارادہ ہے۔ تعمیر کے لیے رقم کہاں سے آئی ہے؟''

''میں قرضہ لے لوں گا''۔

''واہ! اپنی رقم دوسروں میں بانٹنا اور خود اوروں سے قرض لینا۔ تم خود چلے جاؤ، مجھے تمہارے منصوبے سے کوئی لینا دینا نہیں''۔

''تم کوئی پیسہ نہ دینا، صرف جا کر جگہ دیکھو اور نقشہ تیار کرو۔ باقی میں خود ہی سب کچھ کرلوں گا''۔

''میں نے تمہیں ایک خاکہ تو بھیجا تھا''۔

''وہ میں نے نقشہ نویس کو دے دیا ہے۔ پلیز! شام کو جلدی آجانا، میں نے انہیں آٹھ بجے کا وقت دیا ہے''۔

''انہیں اتنی جلدی بلانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ان کاموں میں وقت لگتا ہے۔ ہمیں نقشے کو حتمی صورت دینے میں بھی وقت لگے گا۔ پلیز! آٹھ بجے تک پہنچ جانا''۔

''کوشش کروں گی''۔

''تو آؤ، اس وقت جا کر وہاں کا ایک چکر لگا آئیں''۔

''میں نہیں جاؤں گی، تم چلے جاؤ''۔

''میں تو پہلے سے دیکھ چکا ہوں''۔

''پھر ٹھیک ہے۔ میرے جانے کی کوئی ضرورت نہیں''۔

''مینا! اگلے ہفتے ہمارے پرائمری اسکول کا افتتاح بھی ہے۔ اب تم وہاں جانے سے انکار نہیں کرسکتی ہو۔ تمہیں جانا ہوگا''۔

''کیوں؟''

''یہ میری زندگی کا یادگار دن ہے۔ میرے گاؤں میں ایک اسکول ہوگا۔ ہمیں پڑھنے کی خاطر دور جانا پڑتا تھا، اب گاؤں کے بچوں کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہوگی، وہ گاؤں میں ہی پڑھیں گے۔ یہ میرے خواب کی تعبیر ہے''۔

''یہ تمہارا خواب ہے، میرا نہیں''۔

''لیکن تم میری بیوی ہو، کوئی فرق نہیں ہم دونوں میں''۔

''میرے لیے توتم امریکہ منتقل نہیں ہوئے تھے''۔

''وہ ہمارا وطن نہیں۔ میں نے اپنے وطن اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ کچھ کرنے کا عہد کیا ہوا ہے''۔

''اسی دلیل کے تحت بسنت پور تمہارا گاؤں ہے، میرا نہیں''۔

''تم اپنے گاؤں میں بھی ایک اسکول تعمیر کرو۔ میں ساتھ دینے کا وعدہ کرتا ہوں''۔

''میرا کوئی ایسا گاؤں نہیں۔ بسنت پور میں اسکول بنانے کی وجہ یہ ہے کہ تمہاری پیدائش اور پرورش وہاں کی ہے۔ میں نے ہوڑہ میں جنم لیا تھا۔ مجھے بچپن میں شیرا لے جایا گیا، وہاں سے واپس ہوڑہ اور پھر باکل پور، لہٰذا مجھے کسی علاقے سے کوئی لگاؤ نہیں جیسا تمہیں بسنت پور سے ہے''۔

''اپنے وطن سے لگاؤ رکھو''۔

''مجھے کیا پڑی ہے؟''

''تمہارا جنم اور پرورش یہیں کی ہے''۔

''تم بسنت پور پیدا ہوئے مگر بعد میں کلکتہ چلے گئے۔ اگر تمہارا کلکتہ میں رہنا قابلِ اعتراض نہیں تو میرے امریکہ رہنے پر اعتراض کیسا؟ تم اپنے ملک میں رہتے ہو، میں اپنی دنیا میں''۔

''ہم سب کی اپنی جنم بھومی اور جائے رہائش کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں وابستہ ہیں۔ اگر تم اسے اپنا فرض نہیں سمجھتی ہو تو ان لوگوں کا بھی تمہیں اپنے جیسا نہ سمجھنا قابلِ اعتراض نہیں''۔

''مگر امریکی ایک دوسرے کو برابر کا سمجھتے ہیں''۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے''۔

''کوئی ایک مثال دو''۔

''امریکی آئین تمہیں صدارتی امیدوار بننے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ تم پیدائشی امریکی نہیں ہو''۔

''میرا صدارتی امیدوار بننے کا ارادہ نہیں۔ لہٰذا میرے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں''۔

''اگر کسی شخص میں عزتِ نفس اور انا کا فقدان ہو تو اس کے لیے کوئی مسئلہ ہوتا ہی نہیں''۔

''بالکل درست۔ میں جھوٹی انا کی قائل نہیں۔ تم رہو اپنے ملک میں، میں نہیں رہ سکتی''، یہ کہہ کر وہ کمپیوٹر والے کمرے میں چلی گئی۔

کمال پولیس ٹریننگ کالج میں دینے کے لیے تقریر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ مینا کمرے میں داخل ہوئی تو اسے قانون کا مطالعہ کرتے دیکھ کر پوچھا، ''قانون پڑھ رہے ہو؟''

''ہاں''۔

''پھر مجھے ایک قانونی سوال کا جواب دو۔ فرض کرو میری کوئی خطا نہیں، کوئی غلط حرکت نہیں کی، کیا اس پر بھی مجھے طلاق دے سکتے ہو؟''

''ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں طلاق نہ دینے کا وعدہ کر چکا ہوں''۔

''میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تم مجھے طلاق دے دو گے، صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آیا تم مجھے طلاق دے سکتے ہو یا نہیں؟''

''دے سکتا ہوں''۔

''بلاقصور بھی؟''

''بالکل۔اس صورت میں مجھے جرمانہ ہوسکتا ہے،لیکن طلاق دے سکتا ہوں''۔

''کیسے؟''

''قانون تبدیل ہوگیا ہے۔آج کے معاشرے میں کوئی کسی کو کسی کام پر مجبور نہیں کرسکتا،حتیٰ کہ شادی شدہ جوڑے کو بھی ایک دوسرے کے ساتھ جسمانی تعلقات پر مجبور نہیں کیا جاسکتا،اگر کیا جائے تو دوسرا فریق طلاق کا مطالبہ کرسکتا ہے۔سپریم کورٹ نے حال ہی میں ایک ایسا فیصلہ دیا ہے''۔

مینا کی خوشی دیدنی تھی،''واقعی؟''

''بالکل''۔

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔کمال نے کتاب بند کرکے غسل کیا،لباس بدلا اور ناشتہ کرنے کے بعد دفتر روانہ ہو گیا۔دفتر میں داخل ہوا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔لٹریری کلب سے کسی مس مدھو چندا چیٹر جی کا فون تھا۔اس نے بتایا کہ یومِ آزادی کی گولڈن جوبلی کے موقع پر''میں اور میرا وطن'' کے عنوان سے ایک سیمینار کا اہتمام کیا جارہا ہے،کمال کو کلیدی مقرر کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی دعوت تھی۔اس سلسلہ میں ایک دعوت نامہ بھی بھیج دیا گیا تھا جس سے معلوم ہوا کہ ملک کے چند نامور شخصیات کو بھی اظہارِ خیال کے لیے بلایا گیا تھا۔

کمال سوچنے لگا کہ تقریر کا آغاز کیسے ہونا چاہیے۔اچانک ایک کوندے کی سی لپک سے اسے اپنا گاؤں یاد آگیا جس کی مناسبت سے اس کا تعلق پورے ملک سے بنتا تھا،لیکن وہ ان دونوں کے تعلق کی کیسے وضاحت کرے؟ بہر حال وہ غور کرتا رہا۔شام کو دفتر سے فارغ ہوکر گھر چلا گیا جہاں اس کی ملازمہ کملا نے بتایا کہ وہی لڑکا شام کو دیدی (مینا) کے پاس آیا تھا اور کمپیوٹر روم میں ایک گھنٹے سے زیادہ بیٹھا رہا۔کمال نے کہا،''سمیت کمپیوٹر کے بارے میں اچھی جانکاری رکھتا ہے،ہوسکتا ہے کہ کمپیوٹر میں کوئی خرابی ہوگئی ہو''۔

''وہ آپ کی موجودگی میں کیوں نہیں آتا؟''

''میں صبح جلدی چلا جاتا ہوں،ممکن ہے وہ اتنی صبح نہ آسکتا ہو''۔

''دادا! آپ کچھ نہیں سمجھتے''۔

''شاید۔تمام لوگ سب باتیں نہیں سمجھتے''۔

کملا غیر مطمئن واپس چلی گئی۔

دروازے کی گھنٹی ہوئی،دیکھا کہ سول انجینئر اور ماہر تعمیرات پہنچ گئے تھے۔کمال نے اندر بلایا۔انہوں نے نقشہ میز پر پھیلایا۔کمال پہلے ہی سے دیکھ چکا تھا،اب صرف مینا کو دکھانا رہ گیا تھا مگر وہ ابھی تک واپس نہیں لوٹی تھی۔کچھ دیر منتظر رہنے کے بعد بھی وہ نہ آئی تو کمال نے انہیں نقشہ چھوڑ دینے کو کہا تا کہ بعد میں مینا کو دکھالیا جائے۔وہ رخصت ہوگئے۔مینا تقریباً ساڑھے نو بجے گھر لوٹی۔آتے ہی وہ کملا کی شکایت کرنے لگی کہ سمیت کمپیوٹر ٹھیک کرنے آیا تھا اور وہ سارا وقت اس کے آس پاس ہی گھومتی رہی۔مینا طیش میں تھی کہ کملا کی یہ حرکت اسے بہت ناگوار گزری ہے۔کمال نے جواب دیا کہ ملازمہ رکھنے کی خواہش خود اسی کی تھی،اگر اسے پسند نہیں تو کملا کو فارغ کردیتے ہیں۔مینا خاموش ہورہی۔

....

کمال کے گاؤں پہنچنے تک لوگوں نے اسکول کے افتتاح کا سارا بندوبست کررکھا تھا۔یہ انتہائی پُرمسرت،انتہائی

حوصلہ افزا دن تھا۔ تین کمروں پر مشتمل اسکول کے سامنے ڈائس اور اوپر شامیانہ تنا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر پروگرام کا اعلان ہو رہا تھا۔ سب مہمان چٹائیوں پر بیٹھے تھے۔ کمال اسٹیج کے پاس گیا جہاں اس کے پرانے استاد پال صاحب اس کی ماں کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کمال نے انہیں ادب سے سلام کیا۔ پال صاحب نے کہا، "کمال! مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے میں پھر سے جوان ہو گیا ہوں۔ میں اس اسکول میں ساری عمر پڑھاتا رہا ہوں مگر اسکول بنانے کی سعادت میرے شاگرد کے حصے میں آئی ہے۔ بھگوان تمہیں جزائے خیر دے"۔

کمال نے سعادت مندی سے جواب دیا، "سر! اسکول تعمیر کرنا آسان مگر ایک مثالی استاد بننا بہت مشکل ہے۔ آپ نے ہمیں تعلیم دی۔ یہ اسکول فی الحقیقت آپ کا کارنامہ ہے"۔

پال صاحب نے مریم کی طرف منہ کرتے ہوئے کہا، "آپ کا یہ بیٹا ایک عظیم انسان بننے کے لائق تھا۔ اسے اپنے گزرے دن نہیں بھولے"۔

"مریم کہنے لگی، "یہ آپ ہی کا بیٹا ہے۔ آپ نے اسے روشنی دکھائی، اسے آشیرباد دیجئے، آپ اس کے استاد ہیں"۔

"میری ہر آشیرباد اس کے لیے ہے، یہ میرے بیٹے سے بھی بڑھ کر ہے"، پھر کمال کو مخاطب کر کے پوچھا، "میرے بچے! بہو کی صورت نہیں دکھاؤ گے؟ میرا خیال ہے وہ بھی آئی ہوگی۔ میں اسے ملنا چاہتا ہوں"۔

"سر! وہ ایک ریسرچ اسکالر ہے۔ اس کے لیے وقت نکالنا مشکل تھا"۔

"یہ بھی تو ایک یادگار لمحہ ہے۔ اسکول کی رسم افتتاح یہاں دوبارہ نہیں ہو سکتی۔ اسے بھی یہاں ہونا چاہیے تھا"۔

"سر! میں اسے قائل نہیں کر سکا تھا"۔

"یہ تمہاری نرم خوئی ہے۔ خیر! کیا اسکول کی تعمیر کا اجازت نامہ لے لیا ہے؟"

"سر! ہائی کورٹ نے ہر پرائمری اسکول کے لیے عمومی اجازت نامہ دے رکھا ہے۔ ڈسٹرکٹ پرائمری ایجوکیشن کونسل اسے اپنا ہی اسکول تسلیم کر چکی ہے"۔

"کیا استاد بھی وہی تعینات کریں گے؟"

"جی سر! دوسرے اسکولوں سے دو اساتذہ کو تبدیل کر کے یہاں تعینات کر دیا گیا ہے۔ میں ان سے آپ کا تعارف کراتا ہوں، انہیں کچھ ہدایات دیجئے گا"۔

باقی مہمان بھی پہنچ گئے تھے۔ پال صاحب نے شمع جلا کر اسکول کی رسمِ افتتاح کا آغاز کیا۔ اگرچہ لوگوں نے مہمانِ خصوصی کے لیے متعدد نام تجویز کیے تھے مگر کمال کے خیال میں پال صاحب ہی موزوں ترین شخص تھے۔ ایک شاندار استاد کی خدمت میں یہ ایک اعزاز تھا اور توقع کی جاتی تھی کہ اسکول کے باقی اساتذہ ان کے نقشِ قدم پر چل کر خود بھی مثالی استاد کا کردار ادا کریں گے۔

اپنی صدارتی تقریر میں پال صاحب نے دل کھول کر کمال کی تعریف کی۔ دیگر مقررین بھی اس کے لیے رطب اللسان تھے۔ تقریب کے اختتام کے بعد باہمی گفتگو میں سابقہ ایم پی اے اور وزیر مملکت، مسٹر علی نے جو بر اسی اسکول میں کمال کے استاد رہ چکے تھے، تجویز دی کہ چونکہ ارد گرد علاقے میں ہائی اسکول تو ہیں مگر کالج کوئی نہیں، اس لیے ایک کالج کی تعمیر کا ڈول بھی ڈالنا چاہیے۔ کمال کو تجویز اچھی لگی، اور اس نے دوسروں کے تعاون سے یہ کام بھی کرنے کا وعدہ کر لیا۔

تقریب کے بعد مریم نے کمال سے کہا، "سنا ہے کہ تم بینا کو دوبارہ باہر بھیج رہے ہو"؟

بات درست تھی۔ بینا پھر سے باہر جانے کی کوشش میں تھی، کمال بھیجنے کے حق میں نہیں تھا لیکن ماں سے کیسے کہے، بس

اتنا کہا، ''ابھی فیصلہ نہیں ہوا''۔

''اسے مت جانے دو۔ تمہارا باپ انتقال کر گیا ہے، وہ اسے باہر بھیجنے کے حق میں نہیں تھا''۔

''میں دیکھوں گا''۔

''دیکھنا نہیں، باہر مت بھیجو''۔

''میں دیکھ لوں گا''، اور پھر بات بدلتے ہوئے پوچھا، ''کیا آپ اسکول کے قیام پر خوش ہیں؟''

''تمہارا باپ اپنی زندگی میں یہاں اسکول بنتے نہیں دیکھ سکا''۔

''اس کی زندگی میں ہم اسکول نہیں بنا سکے، لیکن آپ نے تو دیکھ لیا ہے''۔

''لوگ کہہ رہے تھے کہ تم یہاں کالج بھی بنواؤ گے''۔

''ہاں، میں کوشش کروں گا''۔

''اسکول کالج کیوں بنا رہے ہو؟ سب سے پہلے گھر بناؤ، یہ گھر چھوٹا ہے''۔

''میں گھر بھی بناؤں گا''۔

....

کمال سیمینار کے لیے پہنچا تو علم ہوا کہ وہ وقتِ مقررہ سے پہلے ہی آ گیا ہے۔ پھر بھی چند لوگ باہر استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ کمال کو اندر بٹھایا گیا۔ زیادہ تر شرکاء موجود تھے۔ چار بجے سیمینار کے آغاز کا اعلان ہوا۔ سب سے پہلے کمال کو دعوتِ خطاب دی گئی۔ اس نے ڈائس پر آ کر سب کو نمسکار کہا اور یوں گویا ہوا:

بھارت میرا وطن ہے۔ زمانہ قدیم سے یہ میرے پرکھوں کا دیش رہا ہے۔ کانسی اور حجری زمانوں سے بھی پہلے وہ یہاں کے باشندے تھے۔ انہوں نے ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح دریائے سندھ کے کنارے ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں ترقی یافتہ شہروں کی بنیاد رکھی، انہیں تہذیب وتمدن کی روشنی دکھائی جہاں اناج کو محفوظ رکھنے کے لیے گوداموں کی تعمیر کے علاوہ حفظانِ صحت کے اصولوں پر مبنی زندگی گزارنے کے طور طریقے عام تھے۔ 1500 قبلِ مسیح یہاں آریاؤں کی آمد ہوئی۔ اس نکتے پر اختلاف رائے ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیبوں کو تباہ و برباد کرنے میں ان کا ہاتھ تھا یا نہیں۔ وہ گھوڑوں اور لوہے کے علاوہ دفاعی ہتھیاروں کے استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے اہم دیوتا 'اندر' کو ''پُرندر'' یعنی 'شہروں کا بربادکنندہ' بھی کہا جاتا تھا۔ وادیٔ سندھ سے ملنے والے متعدد ڈھانچوں پر تیز دھاری آلات کے نشان بھی ملے ہیں۔

ہم سب ہندوستانی ہیں اور جس دھرتی کو 'ہندوستان' کہا جاتا ہے، ہمارے پرکھوں کے دورِ قدیم اور عہدِ وسطیٰ میں اس نام کا کوئی ملک موجود نہیں تھا۔ لوگوں کی وفاداری دھرتی کے بجائے نمک سے تھی جیسا کہ مشہور تھا، ''میں نے جس کا نمک کھایا ہے، اس کا وفادار رہوں گا''۔ یہ سرزمین متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھی۔ چند ایک ریاستوں میں عوام کی خیر خواہ اور فلاح و بہبود پر مائل حکومتیں موجود تھیں۔ فوجی قوتوں اور سیاسی حکمتِ عملیوں کے تحت اس کی سرحدیں اور بعض اوقات نام تک تبدیل ہوتے رہتے۔ آپ سب کو انگ، بنگا، کلنگا، کوشل، کمبوج، گندھار وغیرہ ناموں سے آگاہی ہوگی جنہیں تاریخ میں ''جن پد'' یعنی سات عظیم بادشاہتیں کہا گیا، ان میں سب سے زیادہ طاقتور مگدھ ریاست تھی جو بعد ازاں موریا اور گپتا بادشاہت کا دارالحکومت بنی۔

جنم لیا۔ ایران سے آتش پرستوں کی قلیل تعداد بھی یہاں آ گئی۔ بعد ازاں، مغربی یورپ سے عیسائیوں کی آمد ہوئی جن کی کوششوں سے یہاں کے لوگ عیسائیت کے دائرہ میں بھی آ گئے۔

ایک بات قابلِ توجہ ہے کہ انگریز مورخین اور پھر ان کے اتباع میں ہندوستانی تاریخ نویس بھی دورِ قدیم کو ہندو اور قرونِ وسطیٰ کو مسلمان عہد کہتے ہیں جبکہ دورِ جدید کو عیسائی دور نہیں کہا جاتا۔ انگریزوں نے دیگر استعمار پسند یورپی طاقتوں کو پچھاڑ کر میرے دیش میں اپنا راج قائم کیا اور اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی حکمتِ عملی اپنائی۔ ابتدا میں ہندوؤں کو مسلمان اشرافیہ کے خلاف بھڑکایا، ان کے ذہنوں میں یہ خوف بٹھانا شروع کر دیا کہ مسلمان اقتدار کے باعث ہندو دھرم اور تہذیب کو بہت خطرہ ہے اور یہ کہ صرف انگریزوں ہی کے طفیل وہ مکمل تباہی سے محفوظ و مامون رہ سکتے ہیں۔ اور جب باشعور ہندو طبقے نے برطانوی راج کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا تو انگریزوں نے مسلمانوں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ ذہن نشین کرانا شروع کر دیا کہ انگریزوں کی برصغیر سے روانگی کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہو جائیں گے، لہٰذا انگریزی اقتدار کی دوامی ہی ان کے لیے سود مند ہے۔ بدقسمتی سے دونوں طرف کے بہت سے لوگ اس سوچی سمجھی حکمتِ عملی کا شکار ہو گئے۔ نتیجتاً، کانگرس جیسی تنظیمیں جو ہندوستانیوں کے لیے حقوق اور آزادی کی جدوجہد میں پیش پیش تھیں، ان کے پہلو بہ پہلو مسلم لیگ، ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ جیسی فرقہ وارانہ جماعتیں بھی سامنے آ گئیں۔ ان جماعتوں کا مقصد صرف اپنے اپنے فرقوں کے مفادات کا تحفظ تھا۔ ان کے رہنما جدوجہدِ آزادی میں زیادہ پُرجوش نہیں تھے۔ ان کا زور فرقہ واریت اور مفادات کے حصول کی خاطر ان جماعتوں کی راہ میں روڑے اٹکانا تھا جو واقعتاً آزادی کی جنگ لڑ رہی تھیں۔ اس وقت کی ہماری قیادت ملک میں بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنے میں ناکام رہی۔ اس ناکامی کا انجام میرے دیش کی تقسیم تھا۔

1947 میں ہندوستان دو ٹکڑے ہو کر پاکستان اور بھارت بنا، اور پھر 1971 میں پاکستان بھی دو نیم ہو کر پاکستان اور بنگلہ دیش بن گیا۔ 1947 میں پاکستان مشرقی بنگال، مغربی پنجاب، سندھ، بلوچستان اور صوبۂ سرحد پر مشتمل تھا۔ رقبے کے لحاظ سے مشرقی پاکستان، یعنی مشرقی بنگال، نئے ملک کا پانچواں حصہ تھا لیکن آبادی پورے ملک کی 56 فیصد تھی۔ پاکستانی برسرِ اقتدار طبقہ اردو زبان کو سرکاری زبان بنانے کا خواہش مند تھا۔ انہوں نے بنگالی رہنماؤں کی اس تجویز کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا کہ اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ مآل کار، مادری زبان کی جدوجہد بالآخر ایک نئے ملک بنگلہ دیش کی صورت میں انجام کو پہنچی۔ تاریخِ عالم میں زبان کی بنیاد پر قائم ہونے والا یہ پہلا ملک تھا۔

بھارت میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لازمی نہیں کہ ایک زبان کسی خاص علاقے تک ہی محدود ہو، مثلاً، یوپی، مدھیہ پردیش، بہار اور ہریانہ میں ہندی زبان بولی جاتی ہے، تاہم ایک زبان بولنے والے لوگ زیادہ تر ایک ہی علاقے میں رہتے ہیں، یعنی، تامل ناڈو میں تامل، آندھرا پردیش میں تیلگو، کرناٹک میں کناری، کیرالہ میں ملیالم، مہاراشٹر میں مراٹھی، گجرات میں گجراتی، پنجاب میں پنجابی، کشمیر میں کشمیری، اوڑیسہ میں اوڑی، آسام میں آسامی، مغربی بنگال میں بنگالی۔

غیر منقسم بنگال کا 38 فیصد حصہ مغربی بنگال اور باقی باسٹھ فی صد مشرقی بنگال، یعنی موجودہ بنگلہ دیش پر مشتمل

ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنگال کی تقسیم کیوں ہوئی؟مذہب کے لحاظ سے یہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی، چند ایک اور صوبوں میں بھی وہ تعداد میں زیادہ تھے، لیکن صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ میں مسلمانوں کی واضح اکثریت جبکہ پنجاب اور بنگال میں نصف سے زیادہ آبادی مسلمانوں کی تھی۔ بنگال میں ان کی تعداد پچپن یا چھپن فی صد تھی لیکن ہندو ان سے تعلیم، سرکاری ملازمتوں، دیگر پیشوں اور معاشی لحاظ سے کہیں آگے تھے۔ مسلمان اگرچہ قدرے اکثریت میں تھے مگر بالغ رائے دہی نہ ہونے کے سبب وہ اقلیت میں تبدیل ہو گئے۔اس دور میں ووٹ دینے کے لیے کچھ شرائط تھیں، مثلاً، جائیداد کی ملکیت، ٹیکس دہندہ یا خاص تعلیمی معیار کا حامل ہونا۔ان تمام معاملات میں مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کو برتری حاصل تھی، لہٰذا رائے دہی میں بھی انہیں اکثریت مل گئی۔ایسی فرقہ وارانہ سیاست میں صوبے کی قیادت ان کے ہاتھوں میں تھی لیکن جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رو سے رائے دہندگان کا دائرہ وسیع ہوا تو مسلمانوں کی نشستوں میں بھی اضافہ ہو گیا۔اب سیاسی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ آ گئی۔ 1937 سے 1947 تک کے عرصہ میں بنگال کے تمام وزرائے اعظم مسلمان ہی تھے۔

یہ صورتِ حال ہندو مہاسبھا اور کانگرس کو قابلِ قبول نہ تھی۔ پہلے تو انہوں نے مسلمانوں کی نشستوں میں کمی اور ہندوؤں کے لیے اضافے کی خاطر احتجاجی مہم شروع کی لیکن اس کا مثبت نتیجہ نہ نکلا۔ 1937 میں انتخابات کے بعد مسلم لیگ نے حکومت سازی کی۔ 1940 میں ڈھاکہ اور 1947 میں کلکتہ اور نواکھلی میں پھوٹنے والے فسادات نے حالات بہت گھمبیر کر دیے۔ کیبنٹ مشن پلان کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے میں ناکامی پر گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسلم لیگ کا مطالبہ مانتے ہوئے تقسیمِ ہند کا اعلان کر دیا۔ ہندو رہنماؤں کے مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے پنجاب اور بنگال کی بھی تقسیم کر دی گئی۔

بنگال کے مستقبل کے بارے میں ہندو رہنما ایک متفقہ لائحہِ عمل دینے میں ناکام رہے۔ مسلم لیگ کے زیادہ تر زعماء تقسیمِ بنگال کے مخالف اور پورے بنگال کو پاکستان کا حصہ بنانے کے خواہشمند تھے۔ مسلم لیگ کے کچھ سیاسی رہنما، مثلاً ابوالہاشم اور سہروردی اور کانگرس کے سرت بوس، کرن شنکر رائے اور منڈل وغیرہ ایک غیر منقسم آزاد بنگال کے حامی تھے۔ ہندو مہاسبھا کے شیام پرشاد مکرجی اور کانگرسی رہنما ای، سنہا ہندوؤں کے مفادات کی خاطر تقسیمِ بنگال پر متفق ہو گئے۔ آخر کار ہندوستان کا بٹوارہ ہو کر رہا، پاکستان اور بھارت دو آزاد مملکتوں کی صورت میں سامنے آئے اور بنگال کی تقسیم کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال دو صوبے تشکیل پذیر ہوئے۔

میرا جنم مغربی بنگال کے ضلع مقصود آباد کے ایک گاؤں بسنت پور میں ہوا۔ بنگالی میری مادری زبان ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ میں خود کو بحیثیت بنگالی شناخت کرنے لگا۔ پیدائشی لحاظ سے میں مسلمان ہوں۔ مجھے طویل عرصہ تک اس حقیقت سے آگاہی نہیں ہوئی تھی کہ میں، میرے والدین اور عزیز و اقارب جس مذہب کے پیروکار ہیں اس کے علاوہ بھی دنیا میں کوئی اور دین دھرم بھی ہے۔اس حقیقت کا علم تو مجھے بعد میں ہوا کہ دنیا میں اور بھی کئی مذاہب پائے جاتے ہیں۔ مجھے یہ بھی بعد میں پتہ چلا کہ جس مذہب کا اتباع میں اپنے جنم دن سے کر رہا ہوں اس کی ابتدا عرب اور مغربی ایشیا سے ہوئی تھی۔ میں نے یہ بھی جانا کہ میرے ملک کی کثیر آبادی کسی اور دھرم کو مانتی ہے، وہ دھرم جسے ہندومت کہا جاتا ہے، اسی دھرتی میں پیدا ہوا۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب اشتراکیوں سے میل جول، قرآن اور دیگر دھرموں کی کتابوں اور سائنس کے مطالعہ سے میں اس نکتے پر پہنچا کہ اللہ اور بھگوان کی تخلیق خود انسان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ تب میں نے اپنے مذہب کے رِیت رواج سب کو تج دیا۔ اب اسلام یا کسی اور دھرم کے بارے میں میرے دل میں کوئی تعصب نہیں۔ میرے دل میں اپنے دیش کے تمام لوگوں کے لیے ایک جیسے جذبات ہیں، چاہے وہ کسی بھی دین دھرم کے ماننے والے ہوں۔

میں اپنے دیش اور ہم وطنوں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پریم کرتا ہوں۔ میرا یہ دعویٰ مبالغہ آمیز نہیں کہ سارے جگ میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جو مجھ سے زیادہ اس دھرتی سے پیار کرتا ہو، جو مجھ سے بڑھ کر یہاں کے لوگوں کی بھلائی چاہتا ہو۔

میں ذہنی طور پر سیکولر ہوں لیکن یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو فرقہ واریت کے کینسر میں مبتلا ہیں، اور میں خود بھی اس کا زخم خوردہ ہوں، یہی نہیں بلکہ بہت سے ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس دھرتی پر قبضہ کر کے انہیں اپنا غلام بنائے رکھا اور ہندو دھرم کو کچلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف عداوت اور نفرت صدیوں سے پل رہی ہے۔ میں اپنے جنم دن سے اس متعصبانہ سلوک کا شکار رہا ہوں۔ پھر یہ سوچ بھی موجود ہے کہ مسلمانوں نے بھارت ماتا کو دولخت کر کے پاکستان حاصل کیا، اور یہ کہ میں بحیثیت مسلمان ان کا دشمن ہوں۔

جب میں اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں زیرِ تعلیم تھا تو خود کو اپنے دیش کی اکائی سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اپنی قابلیت اور اہلیت کے سبب میں یہاں کا مزدور بھی بن سکتا ہوں اور وزیرِ اعظم بھی۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے، اب یہ سوچ نہیں رہی۔ دیش میں فرقہ واریت کے موجودہ ماحول نے میرے اس یقین کی بنیادوں کو اتھل پتھل کر دیا ہے۔ اب میں جان گیا ہوں کہ اس فرقہ وارانہ گرد و پیش میں مذہبی شناخت بھی کسی کی حیثیت پرکھنے کا ایک پیمانہ ہے۔ اب مجھے اس حقیقت کا علم ہوا ہے کہ آج تک کوئی غیر ہندو اس ملک کا پردھان منتری یا صوبے کا وزیرِ اعلیٰ نہیں بن پایا۔ لہٰذا میں کتنی ہی قابلیت اور اہلیت کیوں نہ حاصل کر لوں، کبھی بھی یہاں کا وزیرِ اعظم، حتیٰ کہ اپنے ہی صوبے کا وزیرِ اعلیٰ نہیں بن پاؤں گا۔ یہ صورتِ حال کسی بھی محب الوطن شہری کے لیے خوش آئند نہیں۔ یہی چیز ہے جو اسے صدقِ دل سے اپنے ملک سے محبت کرنے میں حائل ہوتی ہے۔ یہ احساس ختم ہونا چاہیے، اور صرف مکمل سیکولر سوچ ہی اس ڈھلمل کیفیت کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

سیکولرازم مذہب مخالف نہیں، اس کا مطلب ہے دنیاوی امور میں مذہبی عقائد کی عدم مداخلت۔ ذاتی طور پر ہر شخص اپنے مذہب اور عقیدہ کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دار ہے بشرطیکہ دوسروں کے حق میں دخل اندازی نہ ہوتی ہو۔ ریاست کسی طور بھی مذہب کی بندش یا ترویج کی مجاز نہیں۔ کسی شخص کو دین دھرم کی آڑ میں ملکی قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

....

کمال نے سب کو نمسکار کہا اور اپنی تقریر ختم کر دی۔ پورا ہال تالیوں اور داد و تحسین کے شور سے گونج اٹھا۔ مسز دیمانتی مکرجی نے مختصر خطاب میں کہا: ''تالیوں کا شور اس امر کا اظہار ہے کہ مسٹر منڈل کی تقریر آپ سب کے دلوں کی آواز ہے۔ اب سوال و جوابات کا وقت ہے''۔

مسز مکر جی کے خاموش ہونے سے پہلے ہی متعدد لوگ اٹھ کھڑے ہو گئے۔ یہ دیکھ کر مسز مکر جی نے کہا،'' مجھے احساس ہے کہ بہت سے سوال پوچھے جائیں گے۔ ٹھیک ہے، ایک ایک کر کے پوچھئے''۔ سب لوگ بیٹھ گئے۔ وہ پھر گویا ہوئی،'' صحافی حضرات اگلی نشستوں پر بیٹھے ہیں۔ ہم پہلی قطار کی بائیں جانب سے شروع کرتے ہیں''۔ اس نے ایک صحافی کو سوال پوچھنے کی دعوت دی۔ اس کا سوال تھا:'' آپ کی سب سے بڑی اِچھا کیا ہے؟ اور اگر آپ کو صرف ایک خواہش کے اظہار کی اجازت دی جائے تو وہ کیا ہوگی؟''

کمال نے جواب دیا،'' میں اپنے ہم وطنوں کو سائنس، ٹیکنالوجی، ادب اور آرٹ جیسے شعبوں میں ہر جگہ دوسروں کے ہم پلہ دیکھنے کا خواہش مند ہوں''۔

ایک خاتون نے سوال کیا،'' آپ اپنے آپ کو بنگالی بھی کہتے ہیں اور بھارتی بھی۔ آپ بنگالی پہلے ہیں یا ہندوستانی؟''

کمال نے سیدھے سادے انداز میں جواب دیا،'' یہ درست ہے کہ ایسے بنگالی بھی ہیں جو ہندوستانی نہیں، مثلاً بنگلہ دیش کے لوگ۔ اسی طرح تامل اور پنجابی بھی بنگالی نہیں، لیکن اس کے باوجود مغربی بنگال میں بنگالیوں اور بھارتیوں کے درمیان کوئی مناقشت نہیں۔ جب ہم ہندوستانیوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں تمام بنگالی، آسامی، اوڑیائی، پنجابی، کشمیری، تیلگو، گجراتی اور راجستھانی وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ ایک بنگالی اپنی ریاست میں لامحالہ بھارتی ہی کہلائے گا''۔

'' میں آپ کا مطلب سمجھ گئی۔ میں دوسرا سوال پوچھ رہی ہوں کہ آپ مسلمان پہلے ہیں یا بنگالی؟''

'' بنگالی ہونے اور مسلمان ہونے میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ کوئی شخص بھی بیک وقت ایک کٹر بنگالی اور کٹر مسلمان ہو سکتا ہے، لیکن میں نے پہلے اپنی زبان سیکھی اور پھر اس کے ذریعے مذہب کو جانا۔ اب میری شناخت مذہب کی بجائے زبان کے حوالے سے زیادہ مضبوط ہے''۔

'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ بنگالی پہلے اور بھارتی اور مسلمان بعد میں ہیں؟''

'' میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی''۔

'' آپ کی باتوں سے یہی اخذ ہوا تھا''۔

کمال کے جواب دینے سے قبل ہی ایک شخص نے اٹھ کر سوال کیا،'' آپ پرزور انداز میں اپنے بنگالی ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں، لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ بہت سے ہندو مسلمانوں کو بنگالی نہیں مانتے۔ اس ضمن میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

'' یہ ان لوگوں کی نا سمجھی ہے۔ یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ بنگالی مسلمانوں کی تعداد دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ اگر کچھ لوگ اس حقیقت سے لاعلم ہیں تو ان کی خاطر میں اپنے اس حق کا اظہار کیوں نہ کروں؟''

'' یہ کہتے ہوئے کہ '' کچھ لوگ لاعلم ہیں''، آپ سوال کو گول کیوں کر رہے ہیں؟ ایک ناول نگار یعنی سرت چندر نے بھی اپنے ناول '' سری کانت'' کی ابتدا مسلمان اور بنگالی طلبا کے درمیان فٹ بال میچ سے کی ہے''۔

'' وہ بھی ہماری لاعلمی ہے، ہاں البتہ اس خیال کے پسِ پردہ ایک مقصد ہے''۔

'' کیا آپ اس مقصد کی وضاحت کریں گے؟''

'' تاریخی لحاظ سے مسلمانوں میں غیر بنگالیوں کی تعداد بنگالیوں سے زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں، تمام مسلمان اشرافیہ مثلاً مرشد آباد، میسور اور اودھ کے نوابوں کی اولادیں اردو بولنے والے غیر بنگالی ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی تنظیمیں یعنی انجمنِ اسلام، محمدن لٹریری سوسائٹی اور سنٹرل نیشنل محمدن ایسوسی ایشن بنگالی زبان کی بجائے اردو، فارسی، یا پھر انگریزی زبانوں کا استعمال کرتی تھیں۔ پھر بہت سے بنگالی مسلمان خود کو اشرافیہ سے مناسبت دینے کی خاطر اردو زبان سیکھتے تھے۔ وہ اس غلط فہمی

میں مبتلا تھے کہ اردو جانے بغیر وہ ارسٹوکریٹ نہیں سمجھے جائیں گے۔ ادھر ہندو اس گمان میں تھے کہ مسلمان ہونے کا مطلب غیر بنگالی ہونا ہے"۔

"ہندو اکثر اوقات ازراہِ تفنن یا نفرت مسلمانوں کو ملیچھ، یوآن اور گنجے کہتے ہیں، اس کی وجہ کیا ہے؟"

"اس کا بھی تاریخی حوالہ ہے۔ بلاشبہ یہ الفاظ مسلمانوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان میں تفنن ہے، نفرت نہیں"۔

"کیسے؟"

"اوڑیسہ کے باسیوں کی مثال لیجیے۔ آج کل وہ تعلیم اور کل ہند ملازمتوں میں سرِ فہرست ہیں، پھر بھی انہیں "اڑی" کہا جاتا ہے۔ اوڑیسہ سے منسلک مدناپور ضلع کے لوگوں کو مذاق میں "آدھا اڑی" کہتے ہیں جس میں تعصب یا نفرت نہیں پائی جاتی۔ تقریباً ساری صنعتیں اور کاروباری ادارے مارواڑیوں کے ہاتھوں میں ہیں، جبکہ بنگالی انہی لوگوں کے پاس چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ان کو "میرو" یا "ستوخور" کہتے ہیں۔ اس کا تعلق مزاح سے ہے، نفرت سے نہیں"۔

"غیر بنگالی مسلمان بھی تو بنگالی مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتے"۔

"اس کا سبب بھی لاعلمی ہے۔ بنگالی بولنے والے مسلمانوں کی تعداد عربی بولنے والے مسلمانوں سے زیادہ ہے"۔

سامعین میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں، کیا منڈل صاحب حقیقت بیانی کر رہے ہیں؟

ایک خاتون نے پوچھا، "آپ نے ایک کتاب میں تحریر کیا ہے کہ تقسیم بنگال کا مطالبہ ہندو رہنماؤں کی جانب سے ہوا تھا، مسلمانوں کی طرف سے نہیں۔ اس کے پس منظر میں آپ تقسیم بنگال کا ذمہ دار کسے سمجھتے ہیں، ہندو رہنماؤں کو یا مسلمانوں کو؟"

"اس کی ذمہ دار دونوں طرف کی فرقہ وارانہ ذہنیت تھی"۔

"کیسے؟"

"اگر ہندو مسلمانوں کو اپنا سمجھتے تو وہ پس ماندہ نہ رہ جاتے۔ اس پس ماندگی کے باوجود مسلمانوں کی نظر میں ہندو ان سے الگ نہیں تھے۔ بااین ہمہ، اگر مسلمان رہنما مل جل کر کوئی مداوا ڈھونڈتے تو پھر بھی مسلمان علیحدگی کی راہ اختیار نہ کرتے"۔

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بھارت ماتا کے تینوں ٹکڑے پھر سے اکٹھے ہو سکتے ہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں؟ اگرچہ یہ آسان نہیں، لیکن ناممکن بھی نہیں۔ اگر دونوں جرمن ملک باہم ہو سکتے ہیں، کوریا متحد ہو سکتا ہے تو ہندوستان کے تینوں حصے بھی مل سکتے ہیں، لیکن اس کے لیے تمام جماعتوں کو فراخدلی اور وسیع القلبی سے کام لینا ہوگا"۔

ایک اور شخص نے کھڑے ہو کر شمالی ہند کے ہندی لہجے میں سوال کیا، "ابھی چند روز پہلے راشٹریہ سیوک سنگھ کے گورو سدرشن نے کہا ہے کہ بھارت کے غیر ہندوؤں کو اپنے وطن سے وفاداری اور محبت کرنا چاہیے۔ کئی دوسری جماعتوں کے رہنماؤں نے اس کی شدید مخالفت کی اور یوں اختلافات نے جنم لیا۔ اس سلسلہ میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟"

"مجھے علم نہیں کہ گورو صاحب نے کیا کہا تھا۔ کئی اخبارات نے مختلف انداز میں اس پر رائے زنی کی ہے۔ ان اخباری رپورٹوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گورو صاحب نے اور بھی کچھ کہا ہوگا، مثلاً، انہوں نے مقامی کلیساؤں کا ذکر کیا ہے، تاہم اگر انہوں نے وہی کچھ کہا ہے جو آپ فرما رہے ہیں تو میرے خیال میں اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں"۔

اس پر اسی شخص نے اگلا سوال داغا، "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے نظریات سے اتفاق کرتے ہیں"؟

"ان کی ہر بات سے مجھے اتفاق نہیں، ان کی ہر بات سے متفق ہونا ناممکن ہے"۔

''ان کی کن باتوں سے آپ متفق نہیں؟''

''راشتر یہ کے گورو گوالکر کا کہنا ہے، 'بھارت کے غیر ہندوؤں کو ہندو دھرم اور رہن سہن قبول کرنا ہوگا، ان کے دھرم کا احترام کرنا ہوگا، ہندو قوم کے علاوہ کسی اور کی عظمت اور ستائش کا خیال دل سے نکال کر، عدمِ برداشت، دھرتی ماتا اور صدیوں پرانی روایات سے ناشکر گزاری کا رویہ ختم کر کے مثبت اندازِ فکر، بھارت کے ساتھ محبت اور جان نثاری پیدا کریں۔ مختصراً، یہ کہ خود کو غیر ملکی سمجھنا چھوڑیں یا پھر اس ملک میں رہنے کے لیے خود کو مکمل طور پر ہندو قوم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں جہاں ان کو حقوق، مفادات، امتیازی سلوک، حتیٰ کہ شہری حقوق تک نہیں مل سکتے' ۔ گورو گوالکر اور دوسرے لوگوں کی ایسی باتیں نا قابلِ قبول ہیں''۔

سوال کیا گیا، '' آپ کے خیال میں اس دھرتی کی رِیتوں، رسموں اور روایتوں کا احترام کیسے نا قابلِ تسلیم ہے؟''

کمال کا جواب تھا، ''اس ملک کی روایات اور رسم و رواج میں ذات پات کا نظام بھی ہے جس کے تحت اپنے ہی لوگوں کو گھٹیا درجہ دیا اور عورتوں کو مساویانہ حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ یہ نا قابلِ قبول ہے''۔

''اگر ایسی ہی بات ہے تو بی، جے، پی میں اتنے سارے مسلمان کیوں ہیں؟''

''بالکل اسی طرح جیسے مسلم لیگ میں ہندو شامل تھے، جب اقتدار لیگ کے پاس تھا یعنی چند عہدوں کے حصول کی خاطر۔ بصورتِ دیگر، کوئی غیر ہندو جس میں ادنیٰ درجے کی بھی عزتِ نفس ہو، بی، جے، پی میں نہ رہتا''۔

سوال پوچھنے والے شخص کے لیے اس جواب کو ماننا مشکل ہو رہا تھا، لہٰذا اس نے پوچھا، ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مسلم لیگ میں کون سے ہندو لیڈر شامل تھے؟''

کمال نے انتہائی تحمل سے جواب دیا، ''جب مسلم لیگ نے مرکزی حکومت میں شمولیت اختیار کی تو بنگال سے واحد نمائندہ جے، این، منڈل ایک ہندو تھا، حکومت میں بنگال مسلم لیگ سے کوئی مسلمان شامل نہیں ہوا''۔

خبر نہیں کہ سوال پوچھنے والا جواب سے مطمئن ہوا یا نہیں لیکن اس نے ایک اور سوال پوچھ لیا، '' آپ ایسا کس بنا پر کہہ رہے ہیں کہ کوئی غیر ہندو جس میں معمولی سی بھی عزتِ نفس ہو، وہ بی، جے، پی میں نہیں رہ سکتا؟''

'' BJP کے رہنما جو مرضی کہیں حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایجنڈا RSS کی قیادت طے کرتی ہے، اور RSS کا نقطۂ نظر کیا ہے، میں اس پر پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ BJP کی اعلیٰ ترین قیادت میں RSS کے اراکین ہیں کیونکہ ان کے اقتدار کا اصل منبع راشتر یہ ہی ہے۔ RSS کے آئین کی رو سے کوئی غیر ہندو اس کا رکن نہیں ہو سکتا لہٰذا انہیں حقیقی قیادت کی چاپلوسی کرنا ہی پڑتی ہے۔ یہ کوئی باعثِ عزت چیز نہیں۔ کوئی شخص جس میں معمولی سی بھی عزتِ نفس ہو، اس صورتِ حال کو قبول نہیں کر سکتا''۔

ایک عمر رسیدہ شخص نے سوال کیا، ''حال ہی میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ایک مشہور لیڈر نے شیام پرشاد مکر جی کے جنم دن کی سو سالہ تقریب میں اس بنا پر شرکت سے انکار کر دیا کہ مکر جی ایک فرقہ پرست رہنما تھے۔ اس تقریب کے منتظمین میں سے ایک صاحب نے عالمِ طیش میں کہا کہ شرکت سے انکار کرنے والے لیڈر کو وزارتِ اعلیٰ صرف اسی وجہ سے ملی تھی کہ مکر جی نے صوبے کو تقسیم کرایا تھا بصورتِ دیگر انہیں وزارتِ اعلیٰ کیسے مل سکتی تھی۔ اس ضمن میں آپ کی رائے کیا ہے؟''

''اس امر میں تو کوئی شبہ نہیں کہ شیام مکر جی فرقہ پرست تھے۔ اس بات میں بھی وزن ہے کہ مذکورہ صاحب کو وزارتِ اعلیٰ ملی ہی اس بنیاد پر تھی کہ مکر جی نے تقسیم بنگال کے لیے بہت جدو جہد کی تھی''۔

'' آپ کس بنیاد پر مکر جی کو فرقہ پرست کہہ رہے ہیں؟''

''متحدہ بنگال میں مسلمان اکثریت میں تھے لہٰذا اقتدار انہی کو ملنا تھا۔ شیام پرشاد کو یہ منظور نہیں تھا۔ اس نے سوچا پاکستان بنتا ہے یا نہیں، تقسیم بنگال سے کم از کم ایک صوبے میں تو ہندوؤں کو حکومت حاصل ہو جائے۔ متحدہ بنگال میں مسلمانوں

کی اکثریت کی وجہ سے ہندو مفادات کا تحفظ مشکل تھا، لہٰذا بنگال کی تقسیم ضروری سمجھی گئی"۔

کمال نے اپنی بات جاری رکھی: "جناح کا رد عمل کیا تھا؟ متحدہ ہندوستان میں ہندو اکثریت میں تھے، چنانچہ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ مشکل تھا، لہٰذا ہندوستان تقسیم ہونا چاہیے۔ جناح نے مسلمانوں کے لیے جو متحدہ ہندوستان میں کیا وہی کام شیام پرشاد نے متحدہ بنگال میں کیا۔ اگر جناح فرقہ پرست ہے تو شیام پرشاد کیوں نہیں ہو سکتا؟ اگر کیبنٹ مشن پلان منظور ہو جاتا تو جناح متحدہ ہندوستان پر راضی رہتا، جبکہ شیام پرشاد کا نقطۂ نظر مختلف تھا۔ وہ ہر حال میں تقسیم بنگال پر تلا ہوا تھا۔ جناح اگرچہ 'مسلم مفادات' کے تحفظ کا مطالبہ کر رہا تھا، لیکن اس نے کبھی بھی ہندوؤں کو نظرِ حقارت نہیں دیکھا، جبکہ شیام پرشاد مسلمانوں سے انتہائی نفرت کرتا تھا"۔

"اگر یہی بات ہے تو آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مذکورہ تقریب کے منتظمین کی بات درست ہے؟"

"وہ ایسے کہ اگر بنگال کی تقسیم نہ ہوتی تو مسلمان اکثریت ہی میں ہوتے، اس صورت میں کسی ہندو کا وزیرِ اعلیٰ بننا امر محال تھا حالانکہ چند استثنائی مثالیں بھی ہیں۔ اگرچہ راجستھان، مہاراشٹر، بہار اور آسام میں ہندوؤں کی اکثریت تھی لیکن وہاں بالترتیب برکت اللہ، اے، آر، انتلے، عبدالغفور، اور بیگم تیمور کچھ عرصہ کے لیے وزرائے اعلیٰ رہے۔ یہ چند مستثنیات تھیں۔ جموں کشمیر بھارت کا حصہ ہے لیکن کوئی غیر مسلم وہاں کا وزیرِ اعلیٰ نہیں بن سکا، اور اسی طرح مغربی بنگال میں کوئی غیر ہندو اس عہدے پر تعینات نہیں ہوا جبکہ 1937 سے 1947 تک متحدہ بنگال کے تمام وزرائے اعظم مسلمان تھے۔ بھارت کو دیکھ لو، کتنے وزیرِ اعظم رہے ہیں، ان میں سے کوئی غیر ہندو تھا؟"

ایک جانب سے اعتراض ہوا: "ٹھیک ہے کوئی غیر ہندو وزیرِ اعظم نہیں بنا لیکن صدر کے عہدے پر تو غیر ہندو تعینات ہوتے رہے ہیں"۔

"بالکل درست، مگر وہ اپنی قابلیت کی وجہ سے کرسیٔ صدارت پر نہیں بیٹھے، انہیں مذہب کی بنا پر تعینات کیا گیا تھا۔ صدر ایک آئینی عہدہ ہے جبکہ تمام اختیارات وزیرِ اعظم کے پاس ہیں۔ آئینی لحاظ سے وزیرِ اعظم کی تعیناتی صدر کرتا ہے اور اگر اول الذکر کو پارلیمان میں واضح اکثریت حاصل ہو تو صدر کا چناؤ اس کی صوابدید پر منحصر ہے۔ دنیا کو دکھانے کے لیے کہ بھارت ایک حقیقی سیکولر ریاست ہے، کسی مسلمان، سکھ یا نچلی ذات والے کو صدر بنا دیا جاتا ہے۔ یہ انتخاب کسی صلاحیت یا شخصی قابلیت کی بجائے سیاسی مجبوری کی بنا پر ہوتا ہے"۔

ایک نوجوان نے پوچھا: "کچھ مسلمان اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد دوسرے ممالک سے یہاں آئے تھے، اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟"

کمال نے فوراً جواب دیا: "پھر چلے جائیں ان ملکوں میں، اس دیش کی قیادت ان ہاتھوں میں ہونی چاہیے جو اسی دھرتی کے لوگ ہیں"۔

"یہی بات ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ والے کہتے ہیں، پھر آپ ان کو برا بھلا کیوں کہتے ہیں؟"

کمال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "مجھے ان کی اس بات سے اتفاق ہے، لیکن جن باتوں سے مجھے اختلاف ہے، ان کی وضاحت کر چکا ہوں"۔

اس موقع پر ایک شخص نے اس نوجوان کو کہا: "کیا آپ نے کمال صاحب کی باتیں نہیں سنی؟ پلیز! تشریف رکھیے"۔ وہ نوجوان بیٹھ گیا۔ اس کے پہلو میں بیٹھے ایک شخص نے کہا: "حال ہی میں فضائی کثافت اور آلودگی کے ایک مقدمہ کی سماعت کرتے ہوئے معزز ہائی کورٹ نے مساجد میں اذانوں سے ہونے والے شور کو متعلقہ قانون کے تحت قابو کرنے کا حکم دیا

ہے لیکن مسلمان مذہبی رہنماؤں نے اس حکم کی خلاف ورزی کو معمول بنالیا ہے جبکہ صوبے کی بائیں بازو حکومت بھی اس سے چشم پوشی کر رہی ہے۔ آپ اس سلسلہ میں کیا کہنا چاہیں گے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ اس حکم پر عمل ہونا چاہیے۔ مسجد میں اذان دینا یا مندر میں ناقوس بجانا مذہبی حق ہے مگر اس وقت تک جب دوسروں کو پریشانی نہ ہو۔ اگر لاؤڈ اسپیکروں یا کسی اور وجہ سے لوگوں کے سکون میں خلل ہو تو یہ ناقابل قبول ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر اذان کی پابندی کسی طور بھی خلاف مذہب نہیں ہے۔ قرآن میں تو کہیں بھی اذان کے لیے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کا ذکر نہیں۔ پیغمبرِ اسلام کے دور میں تو ان آلات کا وجود نہیں تھا، اب لاؤڈ اسپیکر کے بغیر اذان کیسے خلاف دین ہو گئی؟''

ایک شخص نے سوال کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مناقشت اور مخالفت کے اسباب کیا ہیں؟ کمال نے کہا، ''چند الفاظ میں اس کا جواب دینا بڑا مشکل ہے، مختصراً یہ ہے کہ عبادت کے طریقوں اور کھانے پینے کے معاملات میں اختلاف کے علاوہ ایک دوسرے کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنا اہم اسباب ہیں''۔

''کیا آپ اس کی وضاحت فرمائیں گے؟''

''ہندو مورتیوں کو پوجتے ہیں، مسلمانوں کی نگاہ میں یہ گناہ ہے، پھر مسجدوں کے سامنے سے ہندوؤں کا جلوس لے کر گزرنا بھی اختلاف کا سبب ہے۔ مسلمان گوشت خور ہیں جبکہ ہندو گاؤ کشی پر اعتراض کرتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں پہلا ہندو مسلم فساد گاؤ کشی کی وجہ ہی سے ہوا تھا''۔

ایک عورت نے کمال کی توجہ اس اعتراض پر دلائی جو اس نے راشٹریہ اور گورو سدرشن پر کیا تھا، اور پوچھا، ''کیا آپ ایسی باتیں کہنے کے مجاز ہیں؟''

''ہاں کیوں نہیں؟ کیا گورو سدرشن مجھ سے زیادہ محب وطن ہے؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ ملک کی فلاح وبہبود کا خواہاں ہے؟ پھر میں کیوں نہ ایسی باتیں کروں؟''

''آپ کو یہ حق کس نے دیا؟''

''اس ملک اور ہم وطنوں کے ساتھ میری وابستگی نے''۔

''اگر آپ اتنی وحدت اور یگانگت کے قائل ہیں تو ہندو کیوں نہیں ہو جاتے؟''

کمال نے بڑی متانت سے جواب دیا، ''اس سوال کے جواب میں میرا ایک سوال ہے کہ کیا ہندو بننا ضروری ہے؟ میں تو کسی مذہبی روایات اور رسم ورواج پر عمل نہیں کرتا تو کیا مجھے عمل کرنا چاہیے؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر میں ہندو بنتا ہوں تو کس قسم کا؟ برہمن، کھشتری، ویش، شودر یا اس سے بھی نچلی ذات کا ہندو؟ سب سے پہلے تو آپ تمام ہندوؤں کو یکساں حقوق دیجیے۔ اگر مساوات قائم ہوتی ہے پھر تو آپ کی تجویز میں وزن ہے، بصورتِ دیگر یہ بے بنیاد تجویز ہے۔ آپ ہی بتایئے، کوئی شخص ہندومت صرف اس لیے اختیار کرے کہ اسے ذات پات کے نظام میں اسفل ترین درجہ ملے اور ہر قسم کے حقوق سے محروم کر دیا جائے؟ آپ کے گورو سدرشن صاحب نے تو اسلام یا عیسائیت چھوڑ کر ہندو دھرم قبول نہیں کیا، پھر میں کیوں ہندو دھرم اختیار کروں؟''

''کیونکہ اسلام تو بدیسی مذہب ہے، ہندو دھرم نے اسی دھرتی میں جنم لیا تھا''۔

''جب میں نے جنم لیا اسلام ہندو دھرم کی طرح اس دھرتی کا مذہب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے شروع میں علم ہی نہیں تھا کہ اسلام کے علاوہ کوئی اور بھی دین دھرم ہے''۔

''کسی زمانے میں آپ کے پرکھوں نے اسلام قبول کیا تھا''، ایک طرف سے تبصرہ کیا گیا۔

’’بالکل درست۔ میرے بڑے بوڑھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ بعد میں بہت سے عیسائی ہو گئے۔ لیکن سوچنے کی بات ہے کہ اتنے لوگوں نے اپنا مذہب کیوں تبدیل کیا؟ اس لیے کہ اونچی جاتی کے ہندوؤں نے اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔ یہ ناانصافی تا حال جاری ہے‘‘۔

ایک خاتون نے کہا، ’’میں آپ سے بالکل مختلف سوال کرنا چاہتی ہوں۔ آپ اور چند دیگر ہم نواؤں نے بنگالی سرمایہ داروں کو کاروبار میں آگے لانے کے لیے Bengali Initiative کے نام سے ایک تنظیم بنائی ہے۔ کیا اس میں سے غیر بنگالی خارج سمجھے جائیں گے؟‘‘

’’ہم بلاشبہ بنگالیوں کے حق میں ہیں مگر غیر بنگالیوں کے خلاف نہیں۔ ہمارا مقصد کسی کو پیچھے دھکیلنا نہیں بلکہ سب بنگالیوں کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ بنگالی بھی ان معاملات میں آگے آئیں تا کہ ان کی کاروباری صلاحیتیں سب پر آشکار ہوں۔‘‘

’’اگر غیر بنگالی یہ کام کرتے رہیں تو اس میں قباحت کیا ہے؟‘‘

’’فرض کیجیے آپ یک منزلہ عمارت کے مالک ہیں جس کے اوپر بعد میں بیس پچیس منزلیں تعمیر ہوگئی ہیں مگر آپ کو اس سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ کیا یہ مناسب ہوگا؟ کیا بہتر نہ ہوتا کہ آپ صرف دو منزلہ تعمیر تک محدود رہتے تا کہ آپ کا حق ملکیت قائم رہے؟ کیا ہم اپنے ہی علاقے میں ترقی نہیں کر سکتے؟‘‘

’’بالکل ایسا ہونا چاہیے لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بنگالیوں میں کاروبار میں ترقی کرنے کی اہلیت ہے؟‘‘

’’کیوں نہیں؟ بنگالی محنتی، جفاکش، ذہین اور ملک کے لیے اپنی جان خطروں میں ڈالنے کی ہمت رکھتے ہیں پھر وہ کاروباری امور میں کیوں اہل نہیں؟‘‘

’’آپ نے کہاں مشاہدہ کیا ہے کہ وہ اپنی جان پر بھی کھیل جاتے ہیں؟‘‘

’’وطن کی آزادی کے لیے بنگالیوں نے سب سے پہلے جانیں قربان کیں، اس معاملہ میں ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ انڈیمان عقوبت خانے میں جا کر دیکھیے، اس فہرست کو پڑھیے جس میں ان مجاہدینِ آزادی کے نام ہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں کا بڑا حصہ وہاں گزارا ہے، ستر فیصد سے زیادہ بنگالیوں کے نام ہیں‘‘۔

’’پھر معیشت میں آپ ترقی کیوں نہیں کر سکے؟‘‘

’’ہاں! اس معاملہ میں ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ دراصل ہم نے معاشی ترقی کا کبھی سوچا ہی نہیں تھا، اب احساس ہو رہا ہے۔ ہم کوشش کریں گے اور کامیاب بھی ہوں گے‘‘۔

’’یہ بڑی خوش آئند بات ہے مگر کیا آپ کو ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ریگستان میں بیج بوئے جا رہے ہیں؟‘‘

’’ہاں، لیکن ہم صرف بیج ہی نہیں بوئیں گے، اس کو سیراب بھی کریں گے تا کہ یہ ریگستان خوبصورت چمن میں تبدیل ہو جائے‘‘۔

خاتون بیٹھ گئی تو ایک شخص نے سوال کیا، ’’ہم نے اخبارات میں پڑھا تھا کہ آپ کو باہر جانے کا موقع ملا تھا مگر آپ نہیں گئے۔ کوئی خاص وجہ؟‘‘

’’یہ درست نہیں کہ میں باہر نہیں گیا، بلکہ چند ایک بار مختصر سفر کیا ہے۔ میں مینجمنٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دو برس کے لیے باہر جانے پر تیار تھا لیکن وہاں مستقل رہائش کے خلاف ہوں۔ غالباً آپ نے پڑھا ہوگا‘‘۔

’’کیوں؟‘‘

''پہلی بات تو یہ کہ میری وابستگی اپنے ملک اور بھائی بندوں کے ساتھ ہے کہ جہاں میرا جنم ہوا۔ دوسرے یہ کہ میں پیدائشی یہاں کا باسی ہوں، یہاں میری حیثیت ایک اعلیٰ شہری کی سی ہے جبکہ دوسرے ملک میں دوسرے درجہ کا شہری بن جاؤں گا۔''

''کوئی مثال''۔

''اگر مجھے امریکہ کی شہریت مل بھی جائے تب بھی میں صدارت کے عہدے پر انتخاب لڑنے کا اہل نہیں ہوں گا جبکہ یہاں، اپنے وطن میں، اس کا اہل ہوں''۔

''ابھی آپ نے اپنے وطن کے لیے جس عزم اور ذمہ داریوں کا ذکر کیا ہے، وہ کیا ہیں؟''

''کم از کم جو ہم کر سکتے ہیں وہ ہے اپنی جنم بھومی کی ترقی''۔

اگلا سوال قدرے چبھتا ہوا تھا، ''پھر آپ نے اپنی پتنی کو کیوں باہر بھیجا ہوا ہے؟''

''اس یقین دہانی پر کہ وہ واپس آ کر یہاں اپنی حاصل کردہ مہارت اور تعلیم کا استعمال کرے گی''۔

''اگر یہی بات ہے تو سمندر پار جانے والے دوسرے لوگوں پر اظہارِ ناپسندیدگی کیوں؟''

''مجھے کسی قسم کی ناراضی نہیں، میری تو بس اتنی خواہش ہے کہ وہ واپس آ کر اس وطن کی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں''۔

''اگر باہر جانے والے کسی شخص پر آپ ناراض نہیں تو پھر ان پر ٹیکس عائد کرنے کی تجویز کا مقصد کیا ہے؟''

''یقیناً میں اپنا نقطۂ نظر واضح نہیں کر سکا۔ ہمارے ملک میں تکنیکی تعلیم دینے والے ادارے کچھ رقم خرچ کرتے ہیں مگر حکومت کی طرف سے نسبتاً زیادہ اخراجات کیے جاتے ہیں۔ یہ پیسہ لوگوں کے ٹیکسوں سے ادا ہوتا ہے۔ مثلاً کسی انجینئرنگ کالج میں زیرِ تعلیم طالبِ علم دو ڈھائی سو روپیہ ماہوار ادا کرتا ہے جبکہ حکومت کی طرف سے ہر طالبِ علم پر ڈھائی لاکھ سے زیادہ رقم خرچ کی جاتی ہے، یعنی چار برسوں میں دس لاکھ روپیہ۔ میڈیسن یا آئی ٹی کی تعلیم پر حکومت کے اخراجات اس سے زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر ہوتا کیا ہے؟ تعلیم حاصل کی اور باہر نکل گئے۔ شروع شروع میں تو ماں باپ کو کچھ نہ کچھ بھیجا، پھر چپ سادھ لی۔ اب آپ خود ہی دیکھیں کہ ان کی تعلیم پر پیسہ کتنا خرچ ہوا اور اس کے بدلے ملک اور ہم وطنوں کو کیا ملا۔ اسی کے پیشِ نظر میں نے تجویز دی تھی کہ سرکاری اداروں میں زیرِ تعلیم ہر طالبِ علم ایک اقرار نامے پر دستخط کرے کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ملک میں کسی جگہ بھی حکومت کے حسبِ منشا ملازمت کرے گا بصورتِ دیگر وہ خود پر کیے گئے سرکاری اخراجات مع سود واپس کرنے کا پابند ہوگا۔ ہاں البتہ مختصر، یعنی زیادہ سے زیادہ دو برس، بغرضِ تعلیم جانے اور واپس آنے والے اس شرط سے مستثنیٰ ہوں گے۔ میں نے یہ تجویز بھی دی تھی کہ طویل عرصہ قیام کرنے والوں کے پاسپورٹ کی تجدید کرانے اور تمام تر تعلیمی اخراجات کی واپسی کو مؤثر بنانے کے لیے قانون سازی کی جائے''۔

''اس صورت میں تو وہ اپنے وطن کی شہریت ترک کر کے دوسرے دیش کی شہریت اختیار کر لیں گے''۔

''کرتے ہیں تو کرنے دیں۔ ان کی واپسی پر ہم ویزہ فیس تو حاصل کر سکتے ہیں۔ ان قوانین کے بغیر بہت سے لوگ دوسرے ممالک کی شہریت حاصل کرتے رہتے ہیں''۔

ایک صحافی نے سوال کیا، ''آپ وطن سے پریم کرتے ہیں، اس کی ترقی چاہتے ہیں، کیا آپ کے خیال میں عالمگیریت کے نام پر ہونے والی ترقی ہمارے وطن کے لیے سود مند ہے؟''

''کچھ معاملات میں تو فائدہ مند ہے۔ ہمارے یہاں جدید ٹیکنالوجی کی آمد ہوگی لیکن اس کے مضر اثرات بھی ہوں گے۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے صنعتی ادارے کثیر الملکی اداروں سے مسابقت میں مار کھا جائیں گے اور بڑی بڑی کمپنیاں یہاں

سے اچھا خاصا منافع کمائیں گی''۔

''اس کے مدِنظر کیا آپ کے خیال میں اندرا گاندھی دور کی عائد کردہ پابندیاں ٹھیک تھیں؟''

''ملکی صنعتوں کے تحفظ کے لیے آپ نے جن پابندیوں کا ذکر کیا ہے وہ اندرا گاندھی دور کی نہیں بلکہ ان کے پتا نہرو کے زمانے میں عائد ہوئی تھیں، لیکن ہمیں اس پر بھی توجہ دینی چاہیے تھی کہ تحفظ سمجھتے ہوئے لوگ خوامخواہ اپنا سرمایہ ضائع نہ کریں۔ ہم نے اس پر غور نہیں کیا اور نیتجتاً مخلوط معیشت ناکام ہوگئی، حالانکہ پالیسی بہت اچھی تھی''۔

ایک اور شخص نے سوال کیا، ''آپ نے فرمایا ہے کہ امریکہ کی شہریت اس لیے گوارا نہیں کہ وہاں آپ صدارتی انتخاب کے اہل نہیں۔ کیا یہاں آپ وزیرِ اعظم یا وزیرِ اعلیٰ منتخب ہو سکتے ہیں؟''

کمال نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا، ''موجودہ فرقہ واریت کے ماحول میں ایسا ہونا بہت مشکل ہے''۔

''آپ کی رائے میں کیا ایسا ماحول حب الوطنی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟''۔

''یقیناً۔ اگر کوئی شخص محسوس کرے کہ اس کو مساوی مواقع حاصل نہیں تو عدمِ تحفظ اور علیحدگی کی سوچ جنم لے سکتی ہے''۔

''کیا آپ خود اپنے بارے میں بھی ایسا ہی خیال کرتے ہیں؟''

''نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میرا وطن جلد ہی اس خامی پر قابو پالے گا۔ اس سلسلہ میں مجھے بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا، اور میں اس کے لیے کوشاں ہوں''۔

''کیا آپ کامیاب ہو جائیں گے؟''

''میں بہت پُرامید ہوں''۔

''اس خامی کو دور کرنے کے لیے کون سا طریقۂ کار ہونا چاہیے؟''

''سیکولرازم کا مکمل نفاذ جس میں دین، دھرم، مذہب کا کوئی عمل دخل نہ ہو، صرف اہلیت کو معیار بنایا جائے''۔

''ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ملک میں مکمل طور پر سیکولر نظام کا نفاذ ہو گیا ہے اور آپ یہاں کے وزیرِ اعظم منتخب ہو گئے، تو آپ کا ہدف کیا ہوگا؟''

''میرا ہدف انتظامیہ میں شفافیت، وطن اور اہلِ وطن کے ساتھ پاسداری، سب کے لیے تعلیم اور صحت، ترقی کی رفتار میں تیزی لانا، کام سب کے لیے، تقسیمِ زر میں مساوات اور اپنے ملک اور اہلِ وطن کو اگر دوسرے ممالک سے برتر نہیں تو کم از کم ان کے برابر لانا''۔

''کیا آپ کے خیال میں انتظامیہ میں شفافیت لانا ممکن ہے؟''

''بالکل ممکن ہے، بشرطیکہ سب کام درست طریقے سے ہو رہے ہوں۔ اگر ہم صحیح کام کریں تو اسے لوگوں سے پوشیدہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

سوال کیا گیا، ''اگر ایک کام کے لیے مختلف لوگوں کی رائے مختلف ہو تو پھر؟ کیا اختلافات جنم نہیں لیں گے؟''

''رازداری سے کیا گیا کام زیادہ اختلافات کا باعث بنتا ہے کیونکہ اس میں لوگ وہم و گمان سے کام لیتے ہیں۔ اگر شفافیت ہو تو اختلافات میں مثبت پہلو سامنے آتے ہیں''۔

''آپ نے تعلیم کا ذکر کیا ہے، کس درجہ کی تعلیم؟''

''پرائمری''۔

''کیوں؟''

''اسی میں پتہ چل جاتا ہے کہ طالب علم مزید تعلیم حاصل کرنے کے لائق ہے یا نہیں۔ اگر ابتدائی درجہ میں خامیاں رہ جائیں تو متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے طلبا آگے نہیں بڑھ سکتے، انہیں مجبوراً تعلیم ترک کرنا پڑ جاتی ہے''۔

''لیکن اس ناقص نظامِ تعلیم کے باوجود بہت سے طلبا اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں''، کسی نے اظہارِ خیال کیا۔

''ان طلبا کے والدین یا سرپرست خود پڑھے لکھے ہوتے ہیں، لیکن جن کے سرپرست ناخواندہ ہوں، وہ آگے نہیں بڑھ سکتے''۔

''گویا آپ تعلیم کے لیے کسی نہ کسی قسم کے انتظامات کرنے کا عندیہ دے رہے ہیں''۔

''یقیناً۔ یہ بچے ہمارے وطن کا سرمایہ ہیں، ان کے بغیر ملک کسی کام کا نہیں''۔

سوال کیا گیا، ''آپ نے اپنی تقریر میں 'عہد اور ذمہ داری' کا بار بار ذکر کیا ہے، اس کی ذرا وضاحت کیجیے''۔

''میرا مطلب ہے عہد اور ذمہ داری، اس ملک کے ساتھ۔ کوئی شخص اتنا خود غرض نہیں کہ دوسروں کا احساس نہ کرے۔ جب ہر کوئی اپنے رشتہ داروں اور ہمسایوں کا احساس کرے تو لامحالہ سبھی مجموعی طور پر اپنے بھائی بندوں کی فلاح اور بہتری کا سوچیں گے''۔

کسی ایک نے اٹھ کر کہا، ''یہی بات تو راشتریہ سیوک سنگھ کے لوگ بھی کہتے ہیں''۔

''مجھے ان کے بہت سے خیالات سے اتفاق ہے لیکن کچھ باتوں پر اختلاف بھی ہے۔ اس ضمن میں میں نے پہلے ہی وضاحت کر دی ہے۔ آپ کی الجھن کیا ہے؟''

''الجھن کوئی نہیں، میں صرف آپ کی باتوں کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ مثلاً، آپ نے دولت کی مساوی تقسیم کی بات کی ہے، کیا یہ ممکن ہے؟''

''جی ضرور۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ملک کے 20 فیصد لوگوں کے پاس اس سے زیادہ دولت ہے جو 20 فیصد امیر ترین امریکیوں کی ملکیت ہے، روس اور چین کی بات نہیں ہو رہی۔ دنیا بھر کی سرمایہ دار معیشت کے مرکز امریکہ میں جو ہو رہا ہے، وہ یہاں کیوں نہیں ہو سکتا؟''

ایک اور آدمی سوال کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہی تھا کہ اسٹیج سیکرٹری دیمنتی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، ''میں دیکھ رہی ہوں کہ منڈل صاحب سے سوالات پوچھے جانے کا کوئی انت نہیں، لیکن افسوس کہ سمے اجازت نہیں دے رہا۔ اگر سوالوں کا سلسلہ یونہی جاری رہا تو ہمارے باقی معزز مقررین اپنا نقطۂ نظر بیان نہیں کر سکیں گے۔ آپ ان سے بھی بہت کچھ جان پائیں گے''۔

اسٹیج پر بیٹھے سنیل گنگو پادھیائے نے کہا، ''انہیں سوال پوچھنے دیں، ہم بعد میں کسی موقع پر بات کر لیں گے''۔ دیمنتی نے جواب دیا، ''نہیں، ہم آپ کے خیالات سے بھی جانکاری چاہتے ہیں۔ اب مہوشا دیوی اپنے خیالات کا اظہار کریں گی''۔

کمال ڈائس سے ہٹ کر اپنی نشست پر آ بیٹھا اور باقی مقررین کی تقریریں سننے لگا۔ سیمینار کے اختتام پر واپس اپنے گھر لوٹ کر دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی سنائی دی۔ دوسری طرف سے اخبار ''دینک سمبد'' کا ایڈیٹر سواپن سین گپتا بول رہا تھا۔ اس نے کمال کو مبارک دیتے ہوئے کہا، ''میں ٹیلی ویژن پر پروگرام دیکھ رہا تھا، حقیقت یہ ہے کوئی شخص ایسی باتیں اس وقت ہی کرتا ہے جب ایک ایک لفظ اس کے من سے نکلتا ہو۔ میری نگاہ میں آپ عہدِ حاضرہ کے عظیم ترین بنگالی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں امرتیا سین اور جیوتی باسو کے نام بھی ہیں۔ اگرچہ وہ بھی عظیم ہیں مگر کسی اور میدان میں، ان میں سے کوئی بھی آپ کی طرح بنگالیوں سے اس قدر لوٹ کر پریم نہیں کرتا، ان کے بارے میں اتنا احساس نہیں کرتا اور ان کی ترقی کا اس قدر خواہاں نہیں''۔

کمال کو علم تھا کہ سین گپتا اس کا مداح ہے، دونوں کی سوچ یکساں تھی اور وہ بھی کمال کے ساتھ Bengali Initiative کی تشکیل میں شامل تھا۔ سیمینار میں کمال نے پُرجوش انداز میں Initiative کے حق میں بات کی تھی جو سین گپتا کے بھی دل کو لگی تھیں، کمال نے اس کی مدح سرائی نظر انداز کر کے اسے بتایا کہ کل وہ کلنا جا رہے ہیں، کیا وہ ساتھ جانے کو تیار ہے؟

گپتا نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہیں جا سکے گا۔

....

شام کے سات بجے تھے۔ پولیس کمشنر ابھی دفتر میں ہی موجود تھا اس لیے کمال بھی دفتری امور نبٹا کر فارغ بیٹھا رہا مبادا کسی وقت کمشنر کی طرف سے بلاوہ آ جائے۔ ویسے بھی اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ مینا گوتم کے ساتھ سینما جا سکتی تھی لہٰذا کمال کے پاس لکھنے پڑھنے کا وقت تھا۔ اس کا ذہن پیچھے لوٹ گیا۔ غربت کی وجہ سے کمال کو کالج جانے کے لیے اچھا خاصا فاصلہ طے کرنا پڑتا۔ روزانہ حاضری میں بھی رکاوٹ آنے لگی تھی۔ بس کا کرایہ پورا کرنے کی خاطر وہ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگا، اس وجہ سے اپنے مطالعہ کے لیے وقت کم ملتا تھا۔ اس نے ڈگری تو حاصل کر لی مگر اچھی پوزیشن نہیں لے سکا۔ صرف وہ نہیں بلکہ اس علاقے کے بے شمار طلبا اسی صورتِ حال سے دوچار تھے۔

گاؤں میں پرائمری اسکول کی بنیاد رکھنے کے بعد اس کا ارادہ ہائی اسکول کے قیام کا تھا لیکن اہلِ علاقہ اور اساتذہ کی خواہش تھی کہ یہاں کالج ہونا چاہیے۔ کمال نے زمین کے حصول کے لیے لوگوں سے بات چیت کی۔ جگہ ملی تو نہیں لیکن اسے اندازہ ہو گیا کہ اس میں کوئی خاص مسئلہ بھی نہیں ہو گا۔ ہاں البتہ حکومت کا اجازت نامہ اور کسی یونیورسٹی سے اس کا الحاق ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں وہ پہلے ہی کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، انسپکٹر آف کالجز اور دیگر متعلقہ عہدیداروں سے بات چیت کر چکا تھا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ جیسے ہی محکمۂ تعلیم اجازت دے گا، وہ جگہ کا معائنہ کرنے کے بعد اپنی رپورٹ جمع کرا دیں گے۔ کمال کی وزیرِ تعلیم سے بھی ملاقات ہوئی تھی لیکن صوبے میں بائیں بازو کی حکومت تھی اور کمیونسٹ پارٹی (ایم) کے شری اجیت بسواس نے حتمی فیصلہ کرنا تھا، لہٰذا کمال نے اس سے ملاقات کا وقت لیا جو فوراً ہی مل گیا۔

بسواس نے خیر خیریت کے بعد اس سے پوچھا، ''منڈل صاحب! آپ ایک پولیس آفیسر ہیں، کالج کے قیام کا خیال کیسے آیا؟''

''کیونکہ ہمارے علاقے کی ضرورت ہے''۔

''مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ نے وہاں ایک پرائمری اسکول کی بنیاد رکھی ہے، اب آپ کالج بنانا چاہتے ہیں جبکہ وہاں اور بھی تو لوگ ہیں، بحیثیت پولیس آفیسر یہ آپ کے فرائض میں تو شامل نہیں''۔

ایسے سوالات کے لیے کمال ذہنی طور پر تیار نہیں تھا، نہ وہ جان پایا کہ ان سوالات کا مقصد اسے بددل کرنا ہے یا اس کی شدتِ خواہش کا اندازہ لگانا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ پولیس آفیسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ذمہ دار شہری اور علاقے سے وابستگی کی بنیاد پر کالج بنانے کا خواہشمند ہے۔ کمال نے مزید وضاحت کی، ''میری ماہوار تنخواہ کے علاوہ پولیس اکیڈمی میں میری تربیت، اور اس سے قبل ان اداروں میں، جہاں میں تعلیم حاصل کرتا رہا ہوں، حکومت نے لاکھوں روپے خرچ کیے، یہ سارا پیسہ لوگوں کی ٹیکسوں سے ادا ہوا ہے، لہٰذا لوگوں کی خدمت کرنا اب میرا فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے پیشِ نظر میں کالج بنانا چاہتا ہوں''۔

مسٹر بسواس کو غالباً اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا، ''کیا آپ جیسے بڑے افسر عام لوگوں کی فلاح و بہبود کا بھی سوچتے ہیں؟ اگر آپ لوگ اس پر عمل کریں تو ملک کی قسمت بدل جائے گی۔ حکومتی اجازت نامے

کی فکر نہ کریں۔ جائیں، اپنے منصوبے پر کام شروع کر دیں لیکن ایک دو بیگھے زمین کافی نہیں ہوگی، اس کے لیے کم از کم تیس چالیس بیگھے زمین کی ضرورت ہے تا کہ آئندہ اس میں توسیع کی گنجائش بھی نکلتی رہے''۔

کمال اس کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گیا۔

....

وہ دونوں ایک ہی بستر پر پہلو بہ پہلو لیٹے تھے۔ مینا نے کمال کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ مینا بڑے ناگوار انداز میں بولی، ''تمہارے ساتھ ایک ہی بستر پر سونا تو مصیبت ہے۔ آدھی رات کو بھی فون بجنا شروع ہو جاتا ہے۔ کل سے میں الگ سویا کروں گی''۔ بے وقت فون کی گھنٹی نے کمال کا مزاج بھی برہم کر دیا۔ اس نے فون اٹھایا، دوسری طرف سے پوچھا گیا، ''کیا معصومہ بیگم سے بات ہو سکتی ہے؟''

اس بداخلاقی پر کمال مزید کبیدہ خاطر ہو گیا۔ اس نے مینا سے کہا، ''تمہارا فون ہے''۔

''کون ہے؟''

''میکو''۔

مینا خوشی سے اچھل پڑی، ''ہیلو میکو! کیسے ہو؟ ہاں۔۔۔۔۔ اوہ نہیں۔۔۔۔۔'' وہ یونہی ہاں نہ کرتی رہی، گویا کمال کی موجودگی میں کھل کر بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں درد کی تیز، چبھتی ہوئی لہر اٹھی۔ بستر سے اٹھ کر وہ ڈائننگ روم میں آ کر کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سارے دن کے کام کاج اور تھکن کے بعد رات کے اس سمے بلا مقصد کی خلل اندازی ناقابلِ برداشت تھی۔ بلاشبہ وہ مینا کے کہنے پر باہر نہیں آیا تھا، وہیں لیٹا رہتا، لیکن فون کی وجہ سے وہ کبیدہ خاطر ہو گیا تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر روشن اور چاندنی بکھیرتے چاند کو دیکھتا رہا۔ وہیں ناریل کے درخت پر ایک الو بیٹھا چیخ رہا تھا۔ وہ کیوں چیخ رہا ہے؟ کمال سوچنے لگا۔ اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ خود وہاں کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ بس، بے مقصد بیٹھ کر دور خلاؤں میں گھورتا رہا۔

نیشنل انسٹرومنٹ کی عمارت روشنی میں نہائی ہوئی تھی جسے دیکھ کر کوے کائیں کائیں کر رہے تھے، شاید وہ سمجھے کہ دن کا اجالا پھیل رہا ہے۔ ایک اُلو قریبی درخت سے اڑ کر عمارت کی چھت پر جا بیٹھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اچانک لان میں کسی چیز پر جھپٹا اور پھر اڑان بھر کر واپس درخت پر آ گیا۔ اس کے پنجوں میں کوئی چوہا یا مینڈک تھا۔ کمال اب اجالے اور اندھیرے میں فرق نہ کر سکا۔ وہ روشنی اور تاریکی دونوں میں خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مینا باہر آئی اور کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کمال کو دیکھتی رہی، پھر پوچھا، ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''فون ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا''۔

کمال کو خوش فہمی تھی کہ وہ اس کے باہر آنے پر گلہ کرے گی مگر اس نے صرف اتنا کہا، ''آؤ، اندر چلیں''۔ کچھ بولے بغیر وہ خواب گاہ میں آ گیا۔ وقت دیکھا تو ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ وہ مینا کی جانب مڑا اور کہنے لگا، ''یہ سمجھ کر کہ کسی نے مجھے فون کیا ہوگا تم نے بگڑ کر کہا تھا کہ کل سے تم دوسرے کمرے میں سوؤ گی، مگر فون تمہارے لیے تھا، اب بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

وہ چپ رہی۔ کمال بولا، ''رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں، جاپان میں تو غالباً پونے چار ہوں گے۔ یہ جانتے ہوئے کہ کوئی پتنی اپنے پتی کے ساتھ سو رہی ہوگی، کیا کوئی شریف آدمی اس سمے فون کر سکتا ہے؟''

''اس کا ارادہ جلدی کال کرنے کا تھا، لیکن شراب نوشی کا عادی ہونے کی وجہ سے ممکن ہے آج زیادہ پی کر مدہوشی میں سو گیا ہو اور آنکھ کھلنے کے بعد فون کر دیا''۔

کمال اس جواب سے مطمئن نہ ہوا اور چپ چاپ لیٹ گیا، وہ بھی خاموشی سے اس کے پہلو میں دراز ہوگئی۔ کمال کی جانب سے مزید کوئی بات نہ ہونے پر مینا نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور جلد ہی گہری نیند سوگئی۔ کمال کے ذہن میں آج صبح کا واقعہ تازہ ہوگیا۔ ہوا یہ تھا کہ اس نے صبح مینا سے کہا، ''میں ادھر ادھر سے کچھ باتیں سن رہا ہوں، بہتر ہوتا اگر یہ باتیں سننے میں نہ آتیں''۔

''کس قسم کی باتیں؟''

''انسٹیٹیوٹ کے چند لڑکوں کے ساتھ تمہاری دوستی اور بے تکلفی سے متعلق باتیں''۔

اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی، ''کس کے ساتھ؟''

''لوگ کہتے ہیں کہ سمیت اور سدرشن کے ساتھ تمہاری دوستی کسی حد تک قابلِ اعتراض ہے''۔

''یہ باتیں یقیناً بانانی نے کی ہوں گی۔ وہ سدرشن کو پسند کرتی ہے جبکہ وہ اس کی پروا نہیں کرتا، اس وجہ سے وہ مجھ سے جلتی ہے۔ وہ کہتی پھرتی ہے کہ میں لڑکوں کے ساتھ گھومتی رہتی ہوں۔ اگر ایک شادی شدہ عورت لڑکوں کے ساتھ میل جول رکھتی ہے تو اس میں قابلِ اعتراض بات کیا ہے؟ میں نے کیا کردیا ہے؟ ان کے ساتھ کینٹین پر جانے یا تھوڑی سی سیر کرنے کے علاوہ اور کیا کرتی ہوں؟''

''صرف اتنا ہی نہیں۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ میری عدم موجودگی میں تم انہیں یہاں بھی بلاتی ہو''۔

وہ پھٹ پڑی، ''تمہیں کملا نے بتایا ہوگا۔ ہاں ایک بار سمیت کو اپنا کمپیوٹر ٹھیک کرنے کے لیے بلایا تھا۔ میں نے تمہیں بتا بھی دیا تھا''۔

''ایک دفعہ نہیں''۔

''کملا ہی نے چغل خوری کی ہوگی''۔

''کوئی اور بھی تو بتا سکتا ہے۔ میں دوسروں سے ایسی باتیں کیوں سنتا ہوں؟''

''کیا تم میری جواب طلبی کررہے ہو کہ میں نے ساری باتیں تمہیں کیوں نہیں بتائیں؟ ہاں! تم مجھ سے پوچھ گچھ کرسکتے ہو کیونکہ یہ تمہارا گھر ہے''۔

''یہ بالکل فضول سی بات ہے کہ گھر میرے نام ہے یا تمہارے نام، ہم دونوں کا ہے''۔

''پھر؟''

''ایک بار تم گوتم کو بھی یہاں لائی ہو۔ جانتی ہو اس نے بعد میں شیلا سے کیا کہا تھا؟''

اور مینا نے گردن جھکا دی۔ کمال بولتا رہا، ''اس نے کہا تھا کہ معصومہ بے شرم عورت ہے۔ دنیا میں کوئی پتی بھی اپنی پتنی کے بارے میں ایسی توہین آمیز بات نہیں سن سکتا''۔

کوئی جواب دیے بغیر مینا نے کمال کے گلے لگ کر اسے بے تحاشہ چومنا شروع کردیا۔ اسے الجھن ہونے لگی اور منہ پھیر لیا لیکن مینا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گہری نیند سوگئی۔

صبح بیدار ہونے کے بعد کمال نے غسل کیا اور ناشتے کے لیے میز پر آ بیٹھا۔ مینا نے بات شروع کی، ''میکو نے میرے لیے جاپان میں ایک فیلوشپ کا انتظام کیا ہے''۔

''لیکن یہاں تمہاری ملازمت کا حکم نامہ جاری ہوچکا ہے''۔

''میں ایک سال بعد نوکری کرلوں گی''۔

''کسی کو کیا پڑی ہے ایک سال جگہ خالی رکھنے کی''۔

''اگر تم ڈاکٹر داس سے بات کرو تو وہ انتظار کر لیں گے''۔

''اگر باہر ہی جانا ہے تو جاپان کیوں؟ ڈاکٹر برنارڈ بھی تو تمہیں واپس لینا چاہتے ہیں''۔

''ڈاکٹر برنارڈ صرف تیس ہزار ڈالر دے رہے ہیں جبکہ جاپان سے چھتیس لاکھ ین ملیں گے''۔

''ایک ڈالر ایک سو بیس ین کے مساوی ہے، یعنی چھتیس لاکھ ین کے بھی تیس ہزار ڈالر ہی بنتے ہیں۔ جاپان والے ایک روپیہ بھی زیادہ نہیں دے رہے''۔

''پھر کیا ہے؟ میں کافی عرصہ امریکہ میں رہ چکی ہوں، اب جاپان بھی دیکھ لینا چاہیے''۔

''تو ڈاکٹر برنارڈ کو کیا جواب دو گی؟ کیا اب وہاں جانے کا ارادہ نہیں؟''

''بالکل نہیں۔ میں انہیں لکھ دوں گی کہ ویزے کا مسئلہ ہے حالانکہ میں آنا چاہتی ہوں۔ اس صورت میں میں بعد کسی وقت چلی جاؤں گی''۔

کمال کو اس کی مکاری جان کر افسوس ہوا، کہنے لگا، ''تو گویا جاپان جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''

''کیا تمہیں میرا وہاں جانا پسند نہیں؟''

''تم ریسرچ کے لیے جا رہی ہو، میں کیسے معترض ہو سکتا ہوں؟ لیکن۔۔۔ ہماری۔ زندگی کا عہدِ شباب تو پھر ایسے ہی گزر جائے گا''۔

''ہوں! عہدِ شباب گزر جائے گا''، بینا حقارت آمیز لہجے میں بڑبڑائی، ''میں ایک سال بعد واپس آ جاؤں گی۔ جوانی کا دور کیسے ختم ہو جائے گا؟''

''میری عمر اکتالیس برس ہو گئی ہے۔ تین برس بعد میں چوالیس کا ہو جاؤں گا۔ زندگی میں پھر کیا رہ جاتا ہے؟''

''تم تین سال کی بات کیوں کر رہے ہو؟ میری واپسی ایک سال بعد ہو جائے گی''۔

''تم دو برسوں کے لیے امریکہ گئی تھیں لیکن۔۔۔۔''

''میں تو شادی کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ کر تمہارے ساتھ رہنے پر تیار تھی۔ تم نے ہی مجھے مزید تعلیم حاصل کرنے کو کہا تھا''۔

''میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ تم مجھ سے محض اس لیے پریم نہ کرو کہ تمہارے اخراجات میرے ذمہ ہیں۔ میری خواہش تھی کہ تم مالی لحاظ سے خود مختار بھی ہو جاؤ اور مجھ سے پریم بھی کرتی رہو''۔

''صرف اس وجہ سے؟''

''نہیں۔ میرے مالی حالات اعلیٰ تعلیم کی راہ میں مانع تھے۔ میں خواہش کے باوجود سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر نہ جا سکا، لہٰذا میں چاہتا تھا کہ تم یہ موقع ضائع نہ کرو''۔

''اور اب میں جاپان اس سے بہتر تعلیم کے لیے جانا چاہتی ہوں''۔

کمال مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ بولی، ''دل شکستہ مت ہونا، میں جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔ اگر میری مستقل ملازمت کا تقاضا ہوا تو اس عرصہ سے قبل ہی آ جاؤں گی''۔

''کہاں جانا چاہتی ہو؟''

''اوساکا''۔

''وہیں جہاں میکو ملازمت کرتا ہے؟ تمہاری لیبارٹری اس کی رہائش اور جائے ملازمت سے کتنی دور ہو گی؟''

''مجھے کیا پتہ۔ وہاں جا کر ہی علم ہو گا لیکن تم فکرمند مت ہونا۔ وہ میرا اچھا دوست ہے، میں اسے پسند کرتی ہوں مگر تمہارا

اس کے ساتھ کیا مقابلہ؟ اس کی خاطر میں تمہیں تو نہیں چھوڑ سکتی۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی، میں کسی اور کے ساتھ نہیں رہ سکتی''۔

اس کے بعد تو کمال کے پاس کہنے کو کیا رہ گیا تھا؟ بس اتنا بولا، ''مجھے اپنے دل کی گہرائیوں سے یقین ہے کہ تم مجھے کبھی بھی اپنی زندگی سے الگ نہیں کرو گی۔ یہ برسوں پہلے کا تمہارا وچن ہے۔ اب مجھ میں تنہا رہنے کی ہمت نہیں، میں بہت تنہائی محسوس کرتا ہوں۔ اکیلا پن مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ اب مزید تنہا نہیں رہا جا سکتا''۔

''پھر ایک اور شادی کر لو''۔

کمال یہ تجویز سن کر بھونچکا رہ گیا۔ کہنے لگا، ''تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تمہیں خود بُرا نہیں لگا؟''

''مجھے کیوں بُرا لگے گا۔ قانون میں اس کی اجازت ہے''۔

''کس قانون کی بات کر رہی ہو؟''

''مسلم پرسنل لاء کی۔ تم مذہب پر عمل کرو یا نہ کرو، ہو تو تم پیدائشی مسلمان۔ لہٰذا تم ایک چھوڑ چار شادیاں بیک وقت کر سکتے ہو۔ اگر مجھے اجازت ہوتی تو میں چار مردوں سے شادی کر لیتی مگر رہتی ایک وقت میں ایک کے ساتھ''۔

کمال کو سن کر تکلیف ہوئی، ''پرسنل لاء میں کیا ہے، مجھے اس سے غرض نہیں۔ میرا اپنا مزاج ہے۔ میں انصاف اور ظلم میں تفریق کر سکتا ہوں۔ تمہیں یاد ہونا چاہیے کہ میں نے تم سے پرسنل لاء کے تحت شادی نہیں کی تھی بلکہ اسپیشل میرج ایکٹ کے مطابق ہماری شادی ہوئی تھی''۔

''ٹھیک ہے، شادی مت کرو۔ تمہاری اتنی گرل فرینڈز ہیں، کسی کو بھی بلا لینا، تنہائی محسوس نہیں ہو گی''۔

''کیا یہ تمہارا احساسِ جرم ہے کہ میں کسی اور لڑکی میں ملوث نہیں؟''

''بلا شبہ۔ اگر مجھے علم ہو کہ تمہارے کسی اور لڑکی سے تعلقات ہیں تو میں بھی اپنا جیون اپنی مرضی سے گزار سکتی۔ تم خوش، تو میں بھی خوش''۔

''مینا! تم خوش رہو، میری فکر مت کرو''۔

''اوہ! خفا کیوں ہو رہے ہو؟ اچھا چھوڑو ان باتوں کو، ناشتہ کرو''۔

کمال کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ اس نے ناشتہ کیا اور بے دلی سے دفتر چل دیا۔ آئندہ کیا ہونے والا ہے، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

....

مینا کو حمل ٹھہر گیا۔ کمال نے کہا کہ اب بچے کا جنم ہو جانا چاہیے۔ یہ سنتے ہی وہ چراغ پا ہو گئی، ''نہیں، بالکل نہیں۔ ڈاکٹر سے بات کرو، میں اسے ختم کرنا چاہتی ہوں''۔

''آخر تم بچہ جنم دینے کے خلاف کیوں ہو؟''

''کیا ہم نے پہلے ہی یہ فیصلہ نہیں کیا تھا؟''

''اب ہم دوسرا فیصلہ کر سکتے ہیں''۔

''بالکل نہیں، جو ہوا وہی حتمی ہے۔ میں اپنی مرضی کے مطابق بچے کی پیدائش چاہتی ہوں، یہ نہیں کہ اتفاق سے حمل ٹھہر گیا تو میں اس پر راضی ہو جاؤں''۔

''لیکن اب تو بہت دیر ہو چکی ہے''۔

''کوئی پروا نہیں۔ میں جاپان سے واپس آ کر ماں بن سکتی ہوں، فی الحال تم ڈاکٹر سے بات کرو''۔

''بات تو میں کرلوں گا لیکن پھر غور کرلو''۔
''غور کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔تم اسقاطِ حمل کی بات کرو''۔
''خود ہی کوئی انتظام کرلو، میں نہیں کر سکتا''۔
''تم انکار نہیں کر سکتے ہو''۔
''کیوں؟''
''کیونکہ حرکت تمہاری ہے''، یہ کہہ کر وہ اپنے کمپیوٹر روم کو چل دی۔اندر سے غصیلی آواز سنائی دی،''کمپیوٹر چل کیوں نہیں رہا؟''

کمال اس کے پاس گیا، وہ پھر بولی،''کیا ہو گیا ہے اسے، چل کیوں نہیں رہا؟''
''تمہیں پتہ ہوگا''۔
اس پر دونوں کی تکرار شروع ہوگئی۔مینا کہہ رہی تھی کہ کمال نے اسے خراب کر دیا ہے۔اس پر وہ بڑا اجز بز ہوا،''حد ہوتی ہے الزامات کی بھی، میں آئندہ سے تمہارے کمپیوٹر کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا''۔
مینا نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا،''تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ اگر تم ہاتھ نہیں لگاؤ گے تو کیا میرا کمپیوٹر چلے گا نہیں؟ مت ہاتھ لگانا اسے''۔
کمال کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے تعلقات کو کیا نام دے۔کیا مینا اب اس سے محبت نہیں کرتی؟ معمولی سا بھی احساس نہیں ہے اس کے دل میں؟

....

سیکورٹی چیک کے بعد وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔جہاز کی پرواز کا ابھی اعلان نہیں ہوا تھا۔اگرچہ سوائے مسافروں کے کسی اور کو لاؤنج میں داخل ہونے کی ممانعت تھی تاہم کمال کو خصوصی اجازت دی گئی کیونکہ وہ چند برس قبل یہاں کا انچارج رہ چکا تھا۔وہ آخری لمحات تک مینا کی قربت میں رہنا چاہتا تھا، پتہ نہیں آج کے بعد کتنا عرصہ وہ ایک دوسرے سے دور رہیں۔وہ پھر سے اکیلا رہ جائے گا، پھر وہی تنہائی، پھر خالی گھر، خالی کمرہ۔اگرچہ مینا کی موجودگی اس کے لیے باعثِ مسرت نہیں رہی تاہم کوئی تو تھا جس سے بات کی جاسکتی تھی، مگر اب وہ دن بھی نہیں رہیں گے۔وہ مینا کے چہرے سے نگاہیں نہ ہٹا سکا، اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔شدتِ جذبات سے کمال کی زبان گنگ تھی۔
جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا۔مسافروں کو جہاز میں جانے کا کہا گیا۔کمال نے مینا کا بیگ تھاما۔دونوں دھیرے دھیرے چلنے لگے۔جہاز تک لے جانے کے لیے بس کھڑی تھی۔دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر وہ بس میں سوار ہوگئی۔جہاز کی سیڑھیوں کے پاس بس کھڑی ہوئی، تمام مسافر نیچے اتر کر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔کمال مینا کو اس کے کپڑوں سے پہچان رہا تھا۔اس کا خیال تھا کہ جہاز کے اندر داخل ہونے سے قبل وہ مڑ کر اس طرف دیکھے گی مگر وہ دیکھے، مڑے بغیر جہاز میں سوار ہو گئی۔کمال نے اس کی نشست کھڑکی کے پاس مخصوص کروائی تھی، شاید وہ وہاں سے اسے دیکھ رہی ہو، لیکن وہ تو اسے کم از کم ایک سال کے لیے نہیں دیکھ پائے گا۔
وہ لاؤنج کی کھڑکی کے پاس کھڑا جہاز کو دیکھ رہا تھا۔تمام مسافر داخل ہوگئے، دروازے بند کر دیے گئے، تھوڑی دیر بعد جہاز نے آہستہ آہستہ آگے کو حرکت شروع کر دی، اور پھر ایک مقام پر پہنچ کر اس نے یکلخت رفتار پکڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں بلند ہوگیا۔جہاز بتدریج آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا مگر کمال اب بھی ٹکٹکی لگائے بیکراں آسمان پر نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔پتہ

نہیں وہ کب تک وہاں کھڑا رہا حتیٰ کہ امیگریشن کے ایک اہلکار نے آ کر اس سے پوچھا، ''سر! کیا آپ گھر نہیں جائیں گے؟''

اب اسے احساس ہوا کہ جہاز تو مینا کو لیے کب کا جا چکا ہے، اب وہ واپس نہیں لوٹے گی۔ وہاں کھڑے رہنا بے سود ہے۔ وہ دھیرے دھیرے باہر دروازے کی جانب چلنے لگا، پھر واپس گھر کی تنہائی میں، سُونے پن میں۔ کئی برس پہلے اس نے پڑھا تھا، 'آدمی مکان تعمیر کرتا ہے، عورت اسے گھر بناتی ہے'۔ اس کی رہائش گاہ ابھی تک 'مکان' تھی، 'گھر' نہیں بنا تھا، بلکہ 'گھر' کبھی بھی نہیں بنا تھا۔ کیا اینٹوں سے بنی جگہ کبھی 'گھر' بن پائے گی؟

مینا نے اپنی واپسی کا یقین تو دلایا تھا، اور یہ بھی کہ وہ واپس آ کر ایک بچے کو جنم دے گی، ماں بنے گی، کمال باپ کہلائے گا، لیکن ایک برس ایک طویل مدت ہے۔ تنہائی کا کوئی انت نہیں، لیکن اسی اکیلے پن میں جیون بتانے، مینا کا انتظار کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی تو نہیں۔

گھر پہنچ کر اس نے کنٹرول روم کو گاڑی اور چند اہلکار بھیجنے کو کہا۔ اپنے فلیٹ سے نکل کر وہ ڈپٹی کمشنر پولیس کے لیے مخصوص کردہ گھر کی جانب روانہ ہوا۔ پولیس کمشنر نے اسے کئی بار وہاں منتقل ہونے کو کہا تھا مگر وہ صرف مینا کی خاطر یہاں ٹکا رہا۔ جب وہ ہی نہیں رہی تو اب موجودہ فلیٹ میں رہنے سے مطلب؟

....

کمال اپنے دفتر میں مصروف تھا جب اس کا ایک ماتحت مسٹر حق ملزم کو پکڑے داخل ہوا۔ اس کی کمر ایک رسی سے بندھی ہوئی تھی جس کا سرا ایک سپاہی کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے ساتھ سب انسپکٹر دیا شش بھی تھا۔ ملزم ڈاکوؤں کے ایسے گروہ کا ایک رکن تھا جس نے کافی عرصہ سے پولیس کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ مسٹر حق نے بتایا کہ اس کا نام ریحان ہے۔ کمال نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور پوچھا، ''اس سے کیا معلوم کیا؟''

''سر! اس نے ابتدائی تین وارداتوں میں اپنی شرکت کا اعتراف کیا ہے۔ یہ لوگ سب سے پہلے معلومات اکٹھی کرتے، پھر جگہ کی نگرانی کے بعد واردات کرتے۔ فیڈرل بنک کی معلومات سرور نے، بجلی دفتر کی وہاں کے ڈرائیور اور گیس دفتر کی معلومات قریبی پٹرول پمپ کے مالک سومیا سنگھ نے دی تھیں''۔

''پٹرول پمپ کے مالک نے؟''، کمال نے حیرت سے پوچھا۔

دیا شش کے جواب دیا، ''جی سر! اس کا یہی کہنا ہے، اور غالباً ٹھیک ہی ہے''۔ پھر ریحان کی طرف دیکھ کو بولا، ''ہاں، تم بتاؤ''۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمہیں کیسے پتہ کہ یہ کام سومیا سنگھ کا ہے؟''، کمال نے ریحان سے سوال کیا۔

ریحان بولا، ''احد بھائی پٹرول پمپ جاتے تو پوچھتے، 'سنگھ جی! کوئی خاص خبر'۔ ایک دن میں بھی احد بھائی کے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے کہا، 'دو بنڈل تمہارے ہوں گے'۔ سنگھ ہمیں ایک طرف لے جا کر کہنے لگا، 'گیس افسر تگڑی اسامی ہے۔ احد بھائی نے کہا، 'وہاں تو بہت لوگ ہوتے ہیں'۔ سنگھ نے بتایا کہ سارے اس کے اپنے آدمی ہیں۔ پھر ہم نے وہاں خوب جانچ پڑتال کی'۔

''تمہارے ساتھ اور کون کون تھا؟''

''منوج بھی تھا''۔

''وہ کہاں رہتا ہے؟''

''احد بھائی کے ساتھ''۔

''رات کو کہاں سوتا ہے؟''
''اس کا کسی کو علم نہیں''۔
''پھر واردات کے لیے تم لوگ کیسے اکٹھے ہوتے ہو؟''
''ہمیں فون پر بتایا جاتا ہے''۔
حق نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا،''سر! لگتا ہے کہ سارے ایک ہی جگہ رہتے ہیں اور ان سب کے پاس موبائل فون ہیں''۔
کمال کو ان معلومات پر کوئی شک نہیں تھا۔ اس نے ریحان کو باہر لے جانے کا اشارہ کیا اور پھر حق کو کہا،''تم فوری طور پر ان تینوں مذکورہ آدمیوں کے لیے اپنی ٹیمیں بھیجو۔ کچھ نفری ساتھ لے جائیں تا کہ مجرم ان پر حاوی نہ ہو سکیں۔ مجھے ہر قسم کی صورتِ حال سے مطلع کرتے رہیں، چاہیں تو مجھے براہِ راست فون بھی کر سکتے ہیں''۔
ان کے جانے کے بعد کمال سوچتا رہا کہ اس میں کامیابی کے امکانات کتنے ہیں، جو بظاہر بہت کم تھے۔ اتنے میں حسبِ معمول اخباری نمائندے آ گئے۔ ایک صحافی جیتندر ریا گوش نے کہا،'' آپ تا حال ڈاکوؤں کو گرفتار نہیں کر سکے جبکہ ایس پی ساؤتھ مسٹر گوپال مہاویشوری نے کہا ہے کہ انہوں نے کچھ لوگوں کو گرفتار کر لیا ہے''۔ کمال کو اچھا نہ لگا کہ ڈاکوؤں کی گرفتاری کی خبر راز نہ رہ سکی۔ اس نے اپنے دائرۂ اختیار سے باہر جا کر احد کے بڑے بھائی سمیت کچھ ڈاکو پکڑے تھے مگر ان کا سرغنہ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ ڈکیتیاں جاری رہیں۔ پولیس نے ان کی گرفتاری پر خاموشی اختیار کر رکھی تھی تا کہ باقی لوگ محتاط نہ ہو جائیں۔ اب ایس پی نے پریس کو بھی مطلع کر دیا ہے۔ ریحان کی گرفتاری کی اطلاع بھی پریس کو مل جانے سے اخبارات میں ذکر ہو گا جس سے احد اور منوج وغیرہ محتاط ہو جائیں گے۔ ادھر کمال نے وزیرِ داخلہ کو یقین دہانی کرائی تھی کہ ڈاکوؤں کو بہت جلد پکڑ لیا جائے گا۔ اب ناکامی کی صورت میں وزیر اور وہ خود بکی محسوس کریں گے۔ لہٰذا صحافی کے سوال کو گول کرتے ہوئے اس نے جواب دیا،''میں خود معاملہ کو دیکھ کر آپ کو مطلع کروں گا''۔
ایک اور صحافی ارجن سین گپتا نے سوال کیا،''مسٹر منڈل، دیکھنے کی بات کیا ہے۔ ایس پی صاحب نے خود بتایا ہے کہ ایک ڈاکو گرفتار ہوا ہے جو اب آپ کی تحویل میں ہے۔ آپ بتائیں یہ صحیح ہے یا غلط''۔
کمال نے آدھا سچ آدھا جھوٹ بتایا،''ایک لڑکے کو چوری کے سلسلہ میں زیرِ حراست لیا گیا ہے، ڈکیتی کے الزام میں نہیں۔ آپ مسٹر مہاویشوری سے اس بابت تصدیق کر سکتے ہیں''۔
''گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس لڑکے کا ڈکیتی کی وارداتوں سے کوئی تعلق نہیں؟''
''اس کی گرفتاری دس روز قبل ہوئی تھی۔ آیا اس کا تعلق ڈکیتیوں سے ہے یا نہیں، آپ لوگوں کو جلد ہی بتا دیا جائے گا''۔
''اسے کب گرفتار کیا گیا تھا؟''
''دس دن پہلے''۔
سین گپتا نے کہا،''کہیں نہ کہیں مغالطہ ضرور ہوا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ آج کا واقعہ ہے''۔
اب ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ ان کے جانے کے بعد حق نے فون پر بتایا کہ وہ سومیا سنگھ کو لے آئے ہیں، باقی دونوں ہاتھ نہیں لگے۔ کمال نے پوچھا،''وہ کیا کہہ رہا ہے؟''
''پہلے تو وہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے کچھ علم نہیں لیکن جب اسے ریحان کے سامنے لایا گیا تو سب کچھ مان گیا''۔
''کیا اس نے احد کی قیام گاہ کے بارے میں بتایا ہے؟''

''سر! اس کا کہنا ہے کہ احد ایک ہفتے سے زیادہ کسی جگہ نہیں ٹھہرتا، نہ ہی وہ کسی کو اپنے ٹھکانے پر کبھی لے کر گیا ہے''۔

''اس صورت میں تو وہ احد کی رہائش کے بارے مزید کچھ نہیں بتا سکتا''۔

''مگر سر! اس نے کچھ نشان دہی کی ہے''۔

یہ سن کر کمال سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، ''کیا بتایا ہے اس نے؟''

''اس نے انکشاف کیا ہے کہ وہ اختری نامی ایک لڑکی کو دو دفعہ اپنے ٹھکانے پر لے کر گیا تھا''۔

''وہ لڑکی کہاں رہتی ہے؟''

اسے صحیح علم نہیں لیکن اس کا کہنا ہے کہ سونا گاچھی کے آس پاس کہیں رہتی ہے''۔

''کیا ریحان کو اس کا علم نہیں؟''

''نہیں سر! ریحان کا کہنا ہے کہ اختری نے احد سے ایک ہزار روپیہ مانگا تھا مگر اس نے صرف سو روپے دیے کیونکہ اس کی رائے میں اگر ایسی لڑکیوں کو زیادہ رقم دی جائے وہ آپ کے ساتھ نہیں رہیں گی، اگر تم انہیں قابو میں رکھنا چاہتے ہو تو کم سے کم پیسے دو۔ اس لڑکی نے تو احد کی بہت منت ساجت کی تھی مگر وہ مانا ہی نہیں''۔

''ہمارے لیے بہت اچھی خبر ہے''۔

''وہ کیسے، سر؟''

''ایک تو یہ کہ ہمیں کچھ اتہ پتہ ملا ہے، اور دوسرے یہ کہ لڑکی نے پیسے مانگے تھے جو اسے نہیں ملے، گویا وہ احد سے خوش نہیں اور اب اسے پیسوں کی بھی ضرورت ہے۔ اسے آج رات ہی تلاش کرنا ہو گا ورنہ احد ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا''۔

''لیکن آج رات اسے کیسے تلاش کیا جائے؟''

''تم مجھ سے بہتر جانتے ہو کیونکہ تمہارا تجربہ مجھ سے زیادہ ہے۔ میں زیادہ مدد نہیں کر سکوں گا۔ بنے کو بھی اپنے ساتھ رکھو''۔

''سر! میں کل اسے بلا لوں گا''۔

''نہیں۔ موجودہ صورتِ حال میں اسے آج رات ہی تمہارے ساتھ ہونا چاہیے۔ اپنے اسسٹنٹ کمشنر کو بھی بلا لو''۔

کمال نے فون ختم کیا ہی تھا کہ پھر گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے رسیور اٹھایا۔ دوسری طرف کسی عورت کی آواز تھی، ''کیا ڈپٹی کمشنر صاحب بات کر رہے ہیں؟''

''ہاں، میں بول رہا ہوں۔ کون؟''

''میرا نام ششما سنگھ ہے، ایڈووکیٹ، کلکتہ ہائی کورٹ''۔

''جی فرمائیے؟''

''آپ کے آدمیوں نے میرے بھائی سمیا سنگھ کو پکڑ لیا ہے۔ پلیز! مدد کیجیے''۔

''میں معاملہ کو دیکھ رہا ہوں''۔ کمال نے زیادہ بات نہیں کی مبادا احد کی گرفتاری کا مشن گڑبڑ ہو جائے۔ ششما سنگھ کہنے لگی۔

''آپ کے آدمیوں نے ایک بے گناہ شخص کو پکڑا ہے، کیا یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں؟''

کمال نے پھر اتنا کہا، ''میں معاملہ دیکھ رہا ہوں''۔

''کچھ کریں ورنہ ہم ہائی کورٹ سے رجوع کریں گے''۔

کمال کو غصہ تو آیا مگر جواب دینے کا موقع نہیں تھا۔ اس وقت احد کی گرفتاری ضروری تھی۔ للہذا اس نے بڑی شائستگی

سے کہا،"میں سارے معاملہ کو دیکھ رہا ہوں"۔
ششمانے فون منقطع کر دیا۔اتنے میں اسسٹنٹ کمشنر کمل بوس کمرے میں داخل ہوا۔کمال نے اسے کہا،"ایس پی صاحب نے صحافیوں کو بتا دیا ہے کہ ریحان ڈکیتی کے مقدمہ میں ملوث ہے"۔
"سر! اسی وجہ سے اس پر ڈکیتی کی بجائے چوری کا مقدمہ درج کیا گیا ہے تاکہ معاملہ غلط فہمی میں رہے، لیکن آپ نے تو ایس پی صاحب کو بتا دیا ہے"۔
"بہتر ہوتا اگر ہم بتائے بغیر اسے پکڑتے۔ بہر حال، سمیا سنگھ زیر حراست ہے۔صبح تک کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ دو پہر سے پہلے پہلے اسے عدالت میں پیش کرنا ہوگا۔ظاہر ہے شام تک یہ خبر پھیل جائے گی۔احد اور منوج بڑے شاطر ہیں، وہ فوراً غائب ہو جائیں گے، لہٰذا ہمیں آج کی رات ہی انہیں گرفتار کرنا ہوگا۔تم منوج کے چچا سے رابطہ کر رہے تھے، کیا پتہ چلا"۔
"سر! لگتا یہ ہے کہ وہ بھی ملوث ہے۔اس نے کہا تھا کہ وہ منوج کو گرفتاری دینے پر رضامند کر لے گا مگر خود بھی روپوش ہو گیا ہے"۔
"اختری کو کیسے تلاش کیا جائے؟"
"سر! میں نے آدمی بھیج دیے ہیں۔اس کی تلاش بہت مشکل ہے کیونکہ اختری نام کی اٹھارہ لڑکیاں ہیں۔ساری رات تو یہی پتہ کرتے گزر جائے گی کہ مطلوبہ اختری کون سی ہے۔میں متعلقہ تھانے کا انچارج رہ چکا ہوں یقیناً وہاں ان عورتوں کے دلال بھی ہوتے ہیں۔میں نے اپنے آدمی وہاں بھیجے ہیں۔اگر ان سے کام کی اطلاع مل جائے تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا"۔
"کیا وہ افشا تو نہیں کر دیں گے؟"
"نہیں سر! کیونکہ وہ خود بھی غیر قانونی کام کر رہے ہیں اس لیے پولیس کو ناراض نہیں کر سکتے"۔
"بہت شاندار کام کیا ہے تم نے۔اب پانچ ٹیمیں بناؤ۔ہم ہر اُس جگہ جائیں گے جہاں ان کے چھپنے کا امکان ہو سکتا ہے۔تم اسی تھانے کے علاقے میں جاؤ جہاں تمہاری تعیناتی تھی۔میں خود احد کے مکان بسندیش کھالی جاؤں گا کیونکہ وہ علاقہ ہمارے دائرۂ اختیار سے باہر ہے"، کمال نے اسی طرح باقی تینوں ٹیموں کے بارے میں بھی حکم صادر کیا۔
"سر! ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو جانے کی ضرورت نہیں۔اگر آپ یہیں رہیں تو اچھا ہے تاکہ ٹیموں کے ساتھ آپ کا رابطہ آسان رہے اور مزید کارروائی کے لیے آپ کی ہدایات حاصل ہوتی رہیں"۔
"ٹھیک ہے۔تمہیں جس آدمی کی بھی ضرورت ہو، بلا لینا۔انیل اور دیپاشش صبح سے کام کر رہے ہیں، انہیں آرام کا موقع دو۔تم لوگوں کو کامیابی ملتی ہے یا نہیں، دونوں صورتوں میں صبح بہت کام کرنا ہوگا۔انہیں کہنا کہ صبح پہنچ جائیں"۔
ہدایات سن کر کمل بوس چلا گیا۔تھوڑی دیر بعد فون بجا۔کمال نے رسیور اٹھایا۔دوسری جانب بولنے والے نے اپنا تعارف کرایا،"میں سمیر ناگ، انڈین نیشنل کانگرس کا اسسٹنٹ سیکرٹری"۔
"جی! فرمائیے؟"
"آپ کے لوگ ڈاکوؤں کو تو پکڑ نہیں سکے، بے گناہوں کو ہراساں کر رہے ہیں"۔
"کس کو ہراساں کیا ہے؟"
"آپ کے آدمیوں نے ایک مشہور بزنس مین سمیا سنگھ کو گرفتار کیا ہے، وہ ہماری جماعت کا کٹر حامی ہے۔آپ کے آدمی اس سے رشوت مانگ رہے ہیں، اور دھمکایا جا رہا ہے کہ اگر رقم نہ ملی تو اسے ڈکیتی کے مقدمہ میں پھنسا دیا جائے گا۔آپ بتائیں یہ کیسا انصاف ہے؟"

''کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟''

''بالکل، اگر ایسا نہ ہوتا تو میں آپ کو فون کیوں کرتا؟ ہر کوئی آپ کی طرح ایماندار نہیں ہے۔ آپ کا نام استعمال کر کے یہ لوگ ایسی حرکتیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے پانچ لاکھ کا تقاضا کیا ہے''۔

''کیا واقعی؟''

''جی ہاں۔ اس معاملہ کو خود دیکھئے۔ میں پانچ منٹ بعد آپ کو رنگ کروں گا''۔

''نہیں، نہیں، آپ فون کرنے کی زحمت مت کیجیے۔ میں سارا پتہ کر کے خود آپ کو مطلع کروں گا''۔

فون بند کرنے کے بعد کمال نے بوس سے رابطہ قائم کیا اور پوچھا کہ آیا اس نے سمیا سنگھ کے ملوث ہونے کی تصدیق کر لی تھی؟ کیونکہ ادھر ادھر سے فون آنا شروع ہو گئے ہیں۔ بوس نے وضاحت کی، ''سر! وہ ایک دولت مند آدمی ہے، تمام سیاسی جماعتوں کو چندہ دیتا ہے، لہٰذا ابھی آپ کو فون کریں گے۔ سر! میں نے تصدیق کر لی ہوئی ہے۔ وہ بالکل ملوث ہے اور خود اس نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ہمارے پاس اس کی احد کے ساتھ تصویریں بھی ہیں۔ ڈکیتی کے بعد اس کے اکاؤنٹ میں دو لاکھ روپے جمع ہوئے ہیں۔ آپ اس سے تفتیش کر سکتے ہیں''۔

''جب تم خود ہی تفتیش کر چکے ہو تو مجھے مزید پوچھ گچھ کی کوئی ضرورت نہیں۔ بغیر کسی تاخیر کے اپنا کام کرو۔ چھاپے کے لیے ریحان کو اپنے ساتھ رکھو''۔

''بہتر سر! ہم جا رہے ہیں۔ ریحان ساتھ ہی ہے۔ میں آپ کو اپنی کارروائیوں کی خبر دیتا رہوں گا''۔

ابھی اس نے فون منقطع نہیں کیا تھا کہ آپریٹر نے دوسرے فون پر بتایا کہ کمشنر صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔ رابطہ ہوا تو کمشنر نے سمیا سنگھ کی گرفتاری کے بارے میں پوچھا۔

''جی سر! ڈکیتی کے مقدمہ میں گرفتار کیا ہے''۔

''کون سی ڈکیتی؟''

''گیس آفس میں ہونے والی''۔

''کیا وہ اس میں ملوث تھا؟''

''بالکل سر! اس نے خود اعتراف کیا ہے۔ ہمارے پاس ثبوت بھی ہیں''۔

''ٹھیک ہے۔ ایم ایل صاحب نے وزیر داخلہ کو فون کیا تھا۔ میں انہیں بتا دیتا ہوں''۔

''سر! ابھی پلیز مت بتائیے گا ورنہ ہم احد کو نہیں پکڑ سکیں گے۔ وزیر صاحب کو بس اتنا بتائیں کہ میں معاملہ کو دیکھ رہا ہوں، ایم ایل اے یا کسی اور کو فی الحال صحیح صورتِ حال بتانے سے گریز کریں''۔

''تمہارے خیال میں کیا تم آج رات احد کو گرفتار کر لو گے؟''

''سر! بہت قوی امکان ہے''۔

''بہتر، میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں''۔

فون ختم ہوا تو ساتھ ہی ہائی کورٹ کے وکیل ابنی بوس کا فون آ گیا۔ اس نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا، ''آپ کے آدمیوں نے ایک مشہور بزنس مین سمیا سنگھ کو حراست میں لیا ہے۔ کیا ایسے مشہور شخص کو یوں پکڑنے کا کوئی جواز ہے؟ پلیز! اس کی رہائی کی یقین دہانی چاہیے''۔

''اگر وہ کسی مقدمے میں ماخوذ نہیں ہے تو اسے بالکل رہا کر دیا جائے گا''۔

''مجھے کب بتایا جائے گا؟''
''جیسے ہی تفتیش مکمل ہوگی''۔
''تفتیش کیسی؟ کیا وہ مجرم ہے؟''
''ہم چھان بین کررہے ہیں''۔
''اس کی بہن ہیومن رائٹس کمیشن جارہی تھی، میں نے اسے روکا ہے''۔
''وہ جانا چاہے تو جاسکتی ہے''۔
''گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو کمیشن کی کوئی پروانہیں''۔
''ہماری کارروائی اگر قانونی ہے تو کمیشن سے خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے''۔
''کیا سمیا سنگھ کی گرفتاری از روئے قانون ہے؟''
''میں اس معاملہ کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ کو جلد ہی علم ہوجائے گا''۔
''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اسے رہا نہیں کررہے؟''
''میں نے کہا ہے کہ تفتیش ہوجانے کے بعد''۔
ایڈوکیٹ نے مایوس ہوکر فون منقطع کردیا۔

رات کے دس بج چکے تھے، کمال گھر پہنچا اور لباس بدل کر فارغ ہوا ہی تھا کہ سب انسپکٹر بنکم سنگھ کا فون آیا۔ وہ بتارہا تھا کہ منوج کے گھر پر تالا لگا تھا، اردگرد سے معلوم ہوا کہ سب لوگ چند دن پہلے اپنے گاؤں چلے گئے ہیں۔ ''کیا تالا توڑ کر اس کے گھر کی تلاشی لی جائے؟''
''کیا اس کے گھر سے کوئی خاص چیز ملنے کا امکان ہے؟''
''سر! ہوسکتا ہے کہ کچھ کاغذات مل جائیں''۔
''کاغذات تو بعد میں بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ فوراً اپنے اسسٹنٹ کمشنر سے ملو''۔

بات ختم کرنے کے بعد کمال نے رسوئی میں جاکر کھانا گرم کیا، پیٹ پوجا کے بعد اتنی تھکن محسوس ہورہی تھی کہ خواہش کے باوجود زیر تحریر ناول کا ایک جملہ بھی نہ لکھ سکا۔ اس نے روشنی گل کی اور بستر پر دراز ہوگیا۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی نے جگادیا۔ اس نے رسیور اٹھایا تو باہر گیٹ سے چوکیدار نے بتایا کہ ہائی کورٹ کی ایک خاتون وکیل ملاقات کے لیے آئی ہے۔ کمال کا پارہ چڑھ گیا، ''کیا یہ ملاقاتیوں سے ملنے کا وقت ہے؟ اسے کہو کل صبح دس بجے آئے''۔ چوکیدار نے کہا، ''سر! میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے مگر وہ کہہ رہی ہے کہ اس کے پاس ہائی کورٹ کا ایک حکم نامہ ہے، اس لیے وہ آپ سے اسی وقت ملنا چاہتی ہے''۔

کمال کو علم تھا کہ ہائی کورٹ بالعموم رات کو حکم جاری نہیں کرتی لیکن کچھ جج کرلیتے ہیں۔ حکم نامہ جاری ہونے کے بعد پولیس کو اس پر عمل کرنا ہی پڑتا ہے۔ کمال نے چوکیدار کو کہا کہ اسے بٹھائے، میں دفتر آرہا ہوں۔ جب وہ کپڑے پہن رہا تھا تو اسی قسم کا ایک سابقہ واقعہ اس کے ذہن میں آگیا۔

شعبۂ تفتیش میں اس کی تعیناتی کے دوران ایک غیر بنگالی بزنس مین ٹیکس میں خرد برد کی وجہ سے گرفتار کرلیا گیا تھا۔ اس نے ضمانت کی درخواست کی مگر کمال نے بتایا کہ جرم ناقابلِ ضمانت ہے۔ اس نے ایک راہ تجویز کی کہ اگر اسے بیمار مان لیا جائے تو اس صورت میں اس کی ضمانت ہوسکتی ہے۔ کمال نے انکار کردیا کہ ایک تندرست شخص کو بیمار کیسے تسلیم کرلیا جائے۔ بزنس مین نے کہا کہ اگر ڈاکٹر کی جانب سے ایسا سرٹیفکیٹ مل جائے تو پھر ضمانت کی راہ نکل سکتی ہے۔ اس نے مزید وضاحت کی کہ اس کا ایک

آدمی ابھی ایسا سرٹیفکیٹ لے آئے گا۔ کمال نے حیرت سے پوچھا کہ تم تو یہاں ہو، ڈاکٹر کیسے دیکھے بغیر سرٹیفکیٹ دے سکتا ہے؟

''وہ مفت تھوڑا ہی دے گا؟ پیسے لے کر سرٹیفکیٹ دے دے گا۔ اگر آپ دیکھنا ہی چاہتے ہیں تو میں اپنے کسی آدمی کو کہہ دیتا ہوں، وہ سرٹیفکیٹ لے آئے گا''۔

کمال ششدر رہ گیا۔ کیا ڈاکٹروں کو علم ہے کہ لوگ ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ اس نے کہا، ''میں جعلی سرٹیفکیٹ کی بنا پر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا''۔

''بالکل نہیں جناب۔ سرٹیفکیٹ جعلی نہیں اصلی ہوگا''۔

کمال سمجھ گیا کہ یہ شخص قانونی حربہ استعمال کرنا چاہتا ہے، پھر بھی یہی کہا کہ میں تمہیں کسی سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر نہیں چھوڑوں گا۔

''ٹھیک ہے، سرٹیفکیٹ نہ سہی، میں ہائی کورٹ کا حکم نامہ پیش کر دوں گا، وہ تو آپ کو ماننا ہی پڑے گا''۔

''ہاں، ہائی کورٹ کا حکم ہو تو تمہیں ضمانت مل جائے گی''۔

''تو پھر مجھے تھوڑا سا وقت دیں، ہائی کورٹ کا حکم نامہ آپ کو مل جائے گا''۔

کمال سمجھ نہ پایا کہ اگر کوئی ایسا حکم نامہ اس کے پاس موجود تھا تو گرفتاری کے وقت کیوں نہیں دکھایا گیا؟ اور پھر رات کے اس سے کیسے لا سکتا ہے؟ پوچھنے پر اس نے وضاحت کی، ''میں نے اپنے وکیل سے ایک دفعہ اس کا ذکر کیا تھا کہ اگر کسی عدالتی حکم نامے کی ضرورت ہو تو کیا مل سکتا ہے، اس نے یقین دلایا تھا کہ ایسا ہونا ممکن ہے''۔

''لیکن اس وقت تو رات ہے؟''

''جج رات کے وقت اپنے گھر سے بھی حکم جاری کر سکتا ہے۔ پیسوں سے سب کچھ ہو جاتا ہے''۔

اسے لاک اپ میں بھیجنے کے بعد کمال نے اسسٹنٹ کمشنر سے پوچھا کہ یہ آدمی اس وقت کیسے عدالتی حکم حاصل کر سکتا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ''سر! کچھ ججوں کے لیے ایسا کرنا ممکن ہے''۔

کمال کے ذہن میں یہ بات گردش کر رہی تھی۔ وہ اپنے دفتر پہنچا اور مذکورہ خاتون ایڈوکیٹ کو بلایا۔ وہ عورت فاتحانہ انداز سے دفتر میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ کمال نے اس سے حکم نامے کا پوچھا تو اس نے سامنے رکھ دیا۔ اس نے پڑھ کر وصولی پر دستخط کیے اور انہیں جانے کو کہا۔ اس عورت نے کہا، ''کیا سمیا سنگھ کو عدالت میں پیش نہیں کیا جائے گا؟''

''کل صبح دس بجے کے بعد''۔

''پھر تو ہمیں توہینِ عدالت کا مقدمہ کرنا ہوگا کیونکہ اس حکم نامے میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ ملزم کو فوری طور پر عدالت کے روبرو پیش کیا جائے''۔

''لیکن یہ کہیں نہیں لکھا گیا کہ ملزم کو رات بارہ بجے پیش کیا جائے۔ نہ ہی ایسا حکم ہے کہ اسے معزز جج کی رہائش گاہ پر لایا جائے۔ اس حکم کے تحت اسے عدالت میں لانا ہے، اور عدالت اس وقت بند ہے جو کل صبح دس بجے کھلے گی۔ میں صبح ٹھیک دس بجے ملزم کو عدالت میں پیش کر دوں گا''۔

آنے والے مرد اور عورت دونوں کے چہرے اتر گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے سرگوشی کی اور کہا، ''ٹھیک ہے، کل صبح دس بجے عدالت لے آئیں۔ اس وقت ہمیں اس سے ملاقات کی اجازت دے دیں''۔

''کیسے ملاقات کی اجازت دے دوں؟ اس کی گرفتاری ایک چھاپے کے نتیجہ میں ہوئی ہے۔ چھاپہ مار پارٹی کے آنے کے بعد ہی ملاقات ممکن ہے۔ آپ کو آنے کی ضرورت نہیں، ہم خود ہی اسے کل صبح دس بجے عدالت میں پیش کر دیں گے''۔

دونوں مایوس ہوکر واپس چلے گئے۔ کمال اوپر اپنے کمرے میں آیا اور کپڑے بدل کر لیٹا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف بنے بول رہا تھا، ''سر! ہم نے احد کو پکڑ لیا ہے لیکن اس کے ساتھیوں نے فائرنگ کی ہے جس کی وجہ سے سب انسپکٹر بنکم گھائل ہوگیا ہے''۔

کمال بستر سے اٹھ گیا، ''تم لوگ اس وقت کہاں ہو؟ بنکم کیسا ہے؟''

کمال نے یونیفارم پہنی اور جائے وقوعہ پر پہنچا۔ پولیس کی چند گاڑیاں پہلے سے وہاں کھڑی تھیں۔ ان میں بیٹھی ایک عورت چلائی، ''پلیز! احد کو نہ ماریئے گا''۔ معلوم ہوا کہ یہی اختری ہے جو پولیس کو اس جگہ لائی تھی۔ بنکم کو اسپتال لے جایا جاچکا تھا، اسسٹنٹ کمشنر اور چند دوسرے اہلکار احد کے پاس اندر موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ منوج نے خود کو پولیس کے حوالے کردیا تھا مگر احد نے فائرنگ شروع کردی۔ جوابی فائرنگ میں وہ خود بھی گھائل ہوگیا۔ کمال نے اسے اسپتال لے جانے اور چند اہلکاروں کو گھر میں موجود اہم چیزوں کی فہرست بنانے کا حکم دیا۔ پھر اس نے بنے سے پوچھا کہ یہاں سے کتنی رقم برآمد ہوئی ہے۔ اس نے جواب دیا، ''ہم نے ابھی تک الماری کھول کر نہیں دیکھی لیکن پلنگ کے نیچے رکھے تھیلوں کے بنڈلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم سے کم بیس بائیس لاکھ روپیہ ہوگا''۔

پھر بنے نے کمال کو ایک طرف بلا کر کہا کہ اختری نیچے گاڑی میں بیٹھی ہے، اگر کسی نے اسے یہاں دیکھ لیا تو اس کی جان کو بھی خطرہ ہے۔ کمال نے اختری کو اپنی گاڑی میں بٹھایا اور اس کے بتائے ہوئے پتہ پر اتار دیا۔ وہاں سے کمال گورا بازار اسپتال پہنچا جہاں احد کو پہلے ہی سے لایا جاچکا تھا، اسے بتایا گیا کہ اس کی جان کو خطرہ نہیں۔ کمال کو تسلی ہوگئی۔

دفتر واپس آکر اس نے کمشنر کو مطلع کیا۔ وہ اس خبر پر بہت مسرور ہوا اور کہا کہ وہ وزیر کو بھی اس سے آگاہ کررہا ہے۔ پھر کمال نے حق کو کہا کہ چونکہ اس کے اہلکار ساری رات مصروف رہے ہیں اس لیے انہیں آرام کرنے دو، اور اگر ضروری سمجھو تو تازہ دم آدمیوں کو طلب کرلینا۔ سمیا سنگھ اور منوج کو عدالت میں پیش کرنے کے لیے ابھی کاغذات بھی تیار ہونے اور احد کے بارے میں رپورٹ دینی تھی۔ ان کاموں میں ساری رات گزر گئی۔ علی الصبح یہاں سے فارغ ہوکر کمال اپنی رہائش گاہ پہنچا ہی تھا کہ ایڈیشنل پولیس کمشنر کا فون آگیا جو کہہ رہا تھا کہ مجھے اخبارات سے علم ہوا ہے کہ تم لوگوں نے ڈکیتی کیس میں ایک اہم ملزم کو پکڑا ہے مگر تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔

ایڈیشنل کمشنر کو بے خبر رکھنے کی بھی ایک وجہ تھی۔ ہوا یہ تھا کہ جب پولیس ٹیم احد کی گرفتاری کے لیے پہنچی تو وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ مخبر نے بتایا کہ احد کے آدمی کو ایڈیشنل کمشنر کا فون آیا تھا جس کے فوراً بعد وہ گھر سے روپوش ہوگیا۔ احد کا ایک اور ساتھی غفار بھی ایسی ہی اطلاع ملنے پر غائب ہوگیا۔ ایڈیشنل کمشنر کو اس نے صاف بتادیا کہ ہم نے کارروائی کرنے سے قبل آپ کو اور کمشنر صاحب کو باخبر رکھا تھا مگر افسوس کی بات ہے کہ احد کو اس کی خبر ہوگئی تھی۔ ایڈیشنل کمشنر نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اعتراف کیا ''میں نے ایک صحافی گوتم گھوش کو بتایا تھا، کیا اسی نے یہ خبر احد تک پہنچائی تھی؟'' کمال چونکہ کمشنر سے پہلے ہی تمام معاملہ پر گفتگو کرچکا تھا لہٰذا ایڈیشنل کمشنر کو اعتماد میں نہیں گیا۔ لیکن اب تو مجرم گرفتار ہوگئے تھے اس لیے بات بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے بتادیا کہ ساری رات کارروائی کرنے کے بعد احد اور منوج کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ البتہ احد اور ایک سب انسپکٹر فائرنگ کے تبادلے میں گھائل ہوئے ہیں۔

دونوں کی گفتگو ختم ہونے کے فوراً بعد وزیر داخلہ کا فون آگیا جو اسے اور تمام متعلقہ اہلکاروں کو مبارک دے رہا تھا۔ کمشنر نے بھی زخمی سب انسپکٹر کی عیادت کے لیے اسپتال جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

گفتگو ختم ہوئی، کمال نے ناشتہ کیا لیکن متواتر سوچے جارہا تھا کہ روایت یہ رہی ہے جب ڈکیتیوں، راہزنیوں یا اسی

قسم کی وارداتیں ہو رہی ہوں تو لوگ پولیس پر تنقید کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، بلکہ کچھ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ خود پولیس یہ سب غیر قانونی کام کرا رہی ہے، دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو اچھے کاموں پر پولیس کی نہ صرف تعریف کرتے بلکہ انہیں ہیرو سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کی پولیس کمشنر بھی تعریف کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔

....

ڈاکوؤں کی گرفتاری پر میڈیا نے دل کھول کر کمال اور اس کے اہلکاروں کو داد دی۔ وہ اخبارات دیکھ رہا تھا کہ آپریٹر نے کسی ڈاکٹر مسز اختر کے فون کا بتایا۔ جب رابطہ ہوا تو دوسری طرف سے آواز آئی، ''میں ثریا بات کر رہی ہوں''۔ کمال چونکا کیونکہ آپریٹر نے مسز اختر کا نام لیا تھا، یہ ثریا کون ہے؟ لیکن فوراً یاد آ گیا کہ اس کی شادی جمیل اختر سے ہوئی تھی اس لیے اس نے خود کو مسز اختر کہہ کر متعارف کرایا ہے۔ بہر طور اس نے شائستگی سے کہا، ''جی میڈم!''

جواب میں ملامت اور شکایت بھرا جواب ملا، ''میڈم کیا؟ مجھے میڈم کیوں کہہ رہے ہو؟''

''دراصل ہر ایک کو اسی طریقے سے بلاتے بلاتے مجھے عادت سی ہو گئی ہے''۔

''کیا تم اپنی پتنی کو بھی 'یس میڈم' کہہ کر بلاتے ہو؟''

''وہ بہت دور رہتی ہے لہٰذا ایسے کسی خطاب کی ضرورت نہیں پڑتی۔ فرمایئے، میرے لائق خدمت؟''

''جب اخبارات اور ٹی وی پر تمہاری تصویر اور ستائش سے بھرپور باتیں پڑھتی ہوں تو فخر محسوس ہوتا ہے''۔

تجربے کی بنا پر کمال کو اندازہ ہو گیا کہ ثریا نے محض اس کی تعریف کے لیے فون نہیں کیا، اسے کوئی کام ہو گا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ میری تعریف چھوڑ دو، کام بتاؤ، لیکن خوش اخلاقی کا تقاضا کچھ اور تھا، لہٰذا اتنا پوچھا، ''ہاں! فطری بات ہے۔ کیسی ہو؟''

''ہر طرح سے خیریت ہے۔ دراصل جمیل کے چچا آپ کو فون کرنے کے لیے کہہ رہے تھے''۔

''کیا ہوا؟''

''احد کے گھر سے برآمد ہونے والے موٹر سائیکلوں میں ایک موٹر سائیکل ہمارا ہے۔ چچا نے وہ احد کو بیچ دیا تھا۔ اب پولیس والے چچا کو ڈرا دھمکا کر رشوت کا تقاضا کر رہے ہیں''۔

''کوئی رسید وغیرہ ہے؟''

''نہیں، کیونکہ ابھی پوری رقم نہیں ملی تھی۔ جمیل کے چچا تم سے ملنا چاہتے ہیں''۔

''وہ جب چاہیں ملاقات کر لیں، لیکن میرے خیال میں ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ میں سارے معاملہ کی چھان بین کرا لیتا ہوں، اگر وہ بے گناہ ہوئے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ انہیں تنگ نہیں کیا جائے گا''۔

''وہ آپ کو کب مل سکتے ہیں؟''

''وہ دس اور ایک بجے کے دوران مجھے مل سکتے ہیں''

''جمیل اور میں بھی ان کے ساتھ ہوں گے، چلیں اسی بہانے تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ تم اب ایک مشہور شخص ہو، ہمارے گھر کیسے آؤ گے''۔

کمال کو اس کی بات اچھی نہ لگی۔ وہ ابھی تک اپنے ساتھ روا رکھے جانے سلوک کو بھلا نہیں پایا تھا۔

....

کمال اسپتال گیا اس وقت تک احد ہوش میں آ چکا تھا مگر کمال کو دیکھ کر یوں ظاہر کیا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ تھوڑی دیر بعد سب انسپکٹر دیاشش نے آ کر بتایا کہ اسپتال والوں نے ساڑھے تین ہزار کا بل دیا ہے، مزید دواؤں کی ضرورت ہے کیسے

خریدی جائیں کیونکہ ہمارے پاس کوئی پیسہ نہیں''۔

''کیوں؟ تم نے تو کہا تھا کہ اس کی بیوی اور والدین کو خبر کر دی گئی ہے''۔

''لیکن سر! کوئی بھی نہیں آیا''۔

''پھر سے ان کا پتہ کرو''۔

سب انسپکٹر کے جانے کے بعد ایک کانسٹیبل اندر آیا اور کہنے لگا کہ خون کی چھ بوتلیں احد کو لگ چکی ہیں، تین اور لگیں گی مگر اسپتال والے پیسے پہلے مانگ رہے ہیں۔

''بلڈ بنک والوں کو کہو کہ خون کی بوتلیں دے دیں۔ اگر اس کے گھر والے نہ آئے تو قیمت میں اپنی جیب سے دوں گا۔ ضروری ہو تو لکھ کر دے دو''، کمال نے جواب دیا۔ اتنے میں دیباشش نے آ کر بتایا کہ احد کے گھر والوں نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ کمال کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ جاننے کے باوجود اس کی بیوی نے بھی آنا گوارا نہیں کیا۔ اس نے دیباشش سے کہا کہ اسپتال والوں کو کہہ دو اگر احد کے گھر سے کوئی نہ آیا تو سارا خرچ ہم دیں گے۔ یہ سن کر احد بولا، ''گھر میں سے کوئی بھی نہیں آئے گا''۔

''کیوں؟''

''انہیں خدشہ ہوگا کہیں وہ بھی پکڑے نہ جائیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ انہیں میری حرکتیں پسند نہیں''۔

''اگر ایسا ہے تو تم ڈکیتیاں کیوں کرتے تھے؟''

''مجھے خود بھی پتہ نہیں میں ایسا کیوں کرتا ہوں''۔

''یہ کیا بات ہوئی کہ تمہیں خود بھی علم نہیں؟''

''میرا باپ ایک دولتمند شخص ہے۔ مجھے فضول خرچی کی عادت تھی۔ گھر والوں سے ملنے والی رقم ناکافی رہتی۔ ہم چند دوستوں نے ایک مچھلی فارم لوٹنے کا پروگرام بنایا۔ اچھی خاصی رقم ہمارے ہاتھ لگی۔ پولیس نے مقدمہ تو درج کر لیا مگر ہوا کچھ نہیں۔ میں نے سوچا یہی کام کرنا چاہیے۔ اگر پولیس کو پتہ چل بھی جائے تو کچھ دے دلا کر معاملہ ختم کر دیں گے۔ اس طرح ہم لوگوں کو لوٹتے رہے''۔

''اور اب؟''

''مجھے اس ساری صورتِ حال کا اندازہ نہیں تھا''۔

''کیا مطلب؟''

''میرا خیال تھا کہ پیسے سے انصاف بھی خریدا جا سکتا ہے''۔

''تمہیں یہ خیال کیسے آیا تھا؟''

''آپ نے پردھان کے بیٹے کو پکڑا تھا، غفار اور اسلام بھی وہیں تھے''۔

''تمہارا سرغنہ کون تھا؟''

''سرغنہ تو کوئی نہیں تھا لیکن پردھان کے بیٹے نے سارا پلان کیا تھا''۔

''آج کل منصوبہ بندی کون کرتا ہے؟''

''میں خود''۔

''اکیلے؟''

''نہیں، منوج میری مدد کرتا ہے، لیکن وہ ڈرپوک بہت ہے، ڈرتا رہتا ہے۔ جب پولیس نے ہمیں گھیرے میں لیا تو

اس نے سب کچھ اگل دیا تھا''۔

''پھر تم اسے اپنے ساتھ کیوں رکھتے تھے؟''

''اس میں کتے کی طرح خطرہ سونگھنے کی حس ہے۔اس نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اختری کو وہاں مت بلایا کرو۔اس کے علاوہ وہ خطرہ بھانپ کر موقع سے فرار ہو جاتا ہے، وہ کہتے ہیں ناں،'جو بھاگ گیا، وہ بچ گیا'۔غفار اور اسلام خطرے کی بو پاتے ہی فرار ہو کر بنگلہ دیش جا نکلے، سو وہ بچ گئے۔منوج نے سب کچھ اگل دیا، وہ بھی بچ گیا''۔

''پھر تم اعترافِ جرم کیوں نہیں کرتے ہو؟''

''منوج نے جو کچھ بتا دیا، میں اس میں اور اضافہ نہیں کر سکتا۔ہاں، آپ کچھ پوچھنا چاہیں تو میں حاضر ہوں''۔

''کتنی ڈکیتیاں کر چکے ہو؟''

''فیڈرل بنک کے بعد ساڑھے پانچ لاکھ ہولا ڈپو سے لوٹے تھے''۔

''کیا انہوں نے پولیس کو رپورٹ نہیں کیا تھا؟''

''نہیں، کیونکہ ان کے پاس کاروبار کا لائسنس نہیں تھا۔پولیس نے بھی ان سے ایک لاکھ روپیہ بٹورا تھا''۔

''کس لیے؟''

''پولیس نے دھمکی دی تھی کہ پیسے نہ دیئے تو انفورسمنٹ ڈائریکوریٹ کو اطلاع دے دی جائے گی۔ہم ڈاکو لوگ تو سرِ عام قتل کرتے ہیں لیکن آپ لوگ اپنے دفتروں میں بیٹھے بیٹھے بڑے آرام سے مار دیتے ہیں۔اللہ ہی جانتا ہے آگے میرے ساتھ کیا ہوگا''۔

کمال سمجھ گیا کہ احد جذباتی ہو رہا ہے۔اس ے سوال کیا؛''کیا سرور بھی فیڈرل بنک میں تھا؟''

''اس کے علاوہ ریحان بھی تھا''، احد نے مختصر سا جواب دیا۔

''ادریس کو کتنے پیسے دیئے تھے؟''

''زیادہ نہیں، صرف تیس ہزار۔میں اسے پران اور لوبسٹر کھلاتا رہتا تھا مگر اس نے وعدہ خلافی کی۔مچھلی فارم میں ڈکیتی کا مقدمہ چل رہا تھا۔اس نے وعدہ کیا تھا کہ اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے اسے ختم کرا دے گا''۔

''سمیتا سنگھ کو کیا دیا تھا؟''

''اس نے دو بنڈل مانگے تھے مگر میں نے آدھا بنڈل دیا تھا''۔

کمال کے پوچھنے پر احد نے کئی اور وارداتوں کا اعتراف کیا اور بتایا کہ اس نے تقریباً پچاس لاکھ روپیہ لوٹا تھا۔''اور اتنی رقم لوٹنے کے باوجود بھی تمہارے پاس دوا خریدنے کے پیسے نہیں، پھر کیا فائدہ ایسے پیسوں کا؟''

''سر! میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔میں اس راستے کو بالکل چھوڑ دوں گا۔آپ نے میری دواؤں کے پیسے دیئے، خون کے اخراجات دیئے''۔

''کیونکہ تمہیں گھائل بھی تو ہم نے کیا تھا''۔

''سر! آپ نے اپنا فرض ادا کیا۔اب آپ چاہیں تو مجھے جان سے بھی مار سکتے ہیں''۔

....

''ہم تمہیں ہلاک نہیں کرنا چاہتے۔ہم چاہتے ہیں کہ تم صحت یاب ہو کر ایک پر امن جیون گزارو۔چنتا نہیں کرو۔ہم تمہارے لیے خون اور دواؤں کا بندوبست کریں گے''۔یہ سن کر احد نے اسے سیلوٹ کیا۔

کمال واپس اپنے دفتر آ گیا اور اپنے تمام ماتحتوں کی میٹنگ بلا کر انہیں ذمہ داری سونپی کہ احد اور اس کے ساتھیوں نے جہاں جہاں پیسے محفوظ کیے ہیں، ان سے واپس لینے کی کوشش کریں۔ ایک انسپکٹر نے پیسے واپس ملنے پر قدرے شک کا اظہار کیا لیکن اے، ایس، پی مسٹر بوس نے جواب دیا، "وہ لوگ بلا تاخیر واپس کر دیں گے کیونکہ انہیں اپنے جرم کا احساس ہے، وہ جانتے ہیں کہ انکار کی صورت میں خود بھی پھنس جائیں گے، لیکن سارے کام میں احتیاط کی ضرورت ہے کہیں کیس خراب نہ ہو جائے"۔ کمال کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا، "سر! آپ مطمئن رہیں، میں ایک ہفتے کے اندر اندر ساری تفتیش مکمل کر کے رقم وصول کر لوں گا"۔ پھر اس نے باقی اہلکاروں کو اپنے دفتر میں پہنچنے کو کہا۔

کمشنر نے فون پر بتایا کہ ہوم منسٹر نے چار بجے ایک میٹنگ بلائی ہے لہٰذا کمال کو بھی حاضر ہونے کا پیغام دیا گیا۔

"میٹنگ کس سلسلہ میں ہو رہی ہے، سر!"

"کسی نے شکایت کی ہے کہ تفتیش صحیح رخ پر نہیں ہو رہی۔ تمام ملزمان بآسانی رہا ہو جائیں گے"۔

"کیا ہماری غلطی کی نشان دہی کی گئی ہے؟"

"نہیں، اسی لیے میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ تم بہتر طور پر وضاحت کر سکو گے"۔

کمال کبیدہ خاطر ہو کر دفتر سے باہر نکلا تو مسٹر بوس سے دروازے کے قریب ملاقات ہو گئی۔ اس نے کمال کے چہرے کو دیکھ کر پوچھا، "سر! خیریت تو ہے؟ آپ کچھ متفکر دکھائی دے رہے ہیں"۔ کمال نے اسے ساری بات بتائی۔ بوس نے کہا، "اصل مسئلہ کہیں اور ہے"۔

"کہاں؟"

"یہ بہت اہم مقدمہ ہے۔ ہم نے مجرموں کو پکڑ لیا ہے جبکہ دوسرے ناکام رہے تھے، پھر آپ کی موجودگی میں کسی قسم کا لین دین نہیں ہو سکتا، اسی وجہ سے وہ پاگل ہو رہے ہیں، انہیں یہ سب کچھ برداشت نہیں"۔

"تم کس لین دین کی بات کر رہے ہو؟"

"سر، چھاپہ مارنے کے وقت تقریباً پچیس لاکھ روپیہ برآمد ہوا تھا۔ کوئی اور افسر ہوتا تو صرف تین چار لاکھ روپیہ ظاہر کرتا۔ اس کے علاوہ تقریباً پچاس لاکھ ابھی مزید وصول ہوگا۔ وہ دو لاکھ روپیہ ظاہر کر کے باقی رقم آپس میں بانٹ لیتے۔ اب یہ سب کچھ ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ ایسی باتیں ان کو ہضم نہیں ہو رہیں، سر! لیکن آپ ان باتوں پر جز بز نہ ہوں"۔

کمال کو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ بوس نے مزید کہا، "سر! میں نے ٹیم بنا دی ہے اب ہمیں آپ کا مشورہ درکار ہے کہ جن لوگوں سے رقم واپس لینی ہے انہیں ملزمان کی فہرست میں رکھا جائے؟"

"اگر ان کا تعلق گینگ سے ظاہر ہو تو انہیں ملزم بنایا جائے، اور اگر وہ وارداتوں میں کسی طور شامل یا معاون نہیں تھے تو پھر وہ ملزم نہیں، ہاں البتہ انہیں بطور گواہ شامل کیا جا سکتا ہے"۔ یہ ہدایات دینے کے بعد کمال وزیرِ داخلہ کی میٹنگ کے لیے چلا گیا۔

وزیر نے سب افسروں کی کارگزاری کی تعریف کرنے کے بعد کہا کہ اسے معلوم ہوا ہے اس تفتیش میں کہیں کہیں خامیاں رہ گئی ہیں جس کی وجہ سے استغاثہ کو مشکل ہو سکتی ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، اسی لیے آپ سب کو یہاں بلایا ہے۔ وزیر کی خاموشی کے بعد کسی افسر نے لب کشائی نہ کی۔ بالآخر کمال کہنے لگا۔

"سر! میں ابتدا ہی سے اس کیس کی نگرانی کر رہا ہوں۔ میں یہاں موجود تمام افسروں سے جونیئر ہوں، مجھے اپنے اعلیٰ افسروں کے مشورے اور رہنمائی کی ضرورت ہے اس لیے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے تفتیش از سرِ نو کرنے کو تیار ہوں، لیکن ایک بات

واضح کرنا ضروری ہے کہ میں تفتیش کے تمام مراحل سے آگاہ ہوں، اس لیے انتہائی ذمہ داری سے دعویٰ کرسکتا ہوں کہ مقدمے کے اندراج اور تفتیش میں کوئی خامی اور کوتاہی نہیں۔ تاہم اگر کسی کے خیال میں کہیں غلطی ہوئی ہے تو مہربانی فرما کر اس کی نشاندہی کردیں، میں درست کرلوں گا''۔

کمال کے خاموش ہونے پر ڈی جی نے موجود افسروں کو بات کرنے کے لیے کہا مگر سب خاموش رہے۔ وزیر معاملہ کی تہ تک پہنچ گیا، اس نے ڈی جی کو مخاطب کر کے کہا، ''یہ افسر درست کہہ رہا ہے۔ اگر کہیں کوئی غلطی اور خامی رہ گئی ہے تو اسے بتایا جائے، مجھے کیوں کہا گیا ہے؟ اسے اپنے دفتر لے جائیں''۔

سب افسر باہر آگئے۔ ڈی جی نے کمال کو اپنے دفتر آنے کا کہا۔ آمنے سامنے بیٹھنے کے بعد اس نے کمال سے پوچھا، ''کیا تم نے فلم 'مقدر کا سکندر' دیکھی ہے؟''

''نہیں سر!''۔

''تم ایک سکندر ہو اور تعجب ہے کہ یہ فلم نہیں دیکھی۔ اس میں ایک مکالمہ ہے، 'جو کامیاب ہوا، وہی ٹھیک ہے'۔ میں نے سب کو کہا تھا کہ کمال کی کامیابی کو ہدفِ تنقید مت بنائیں۔ انہیں نے میری بات سنی ان سنی کردی۔ اب اپنے دفتر جاؤ اور جیسے مناسب سمجھو، تفتیش کرو۔ تم کامیاب ہوگئے ہو''۔

کمال اسے سلیوٹ کر کے باہر آگیا۔

....

شعبۂ سراغ رسانی میں بحیثیت ڈپٹی کمشنر پولیس کام کا اتنا بوجھ تھا کہ کمال کو لکھنے پڑھنے کی فرصت نہیں ملتی تھی جس کی وجہ سے وہ اخبار میں شائع ہونے والے سلسلہ وار ناول پر زیادہ کام نہیں کرسکا۔ وہ محکمۂ پولیس میں ہونے والی تعیناتیوں کا بھی نگران تھا لہٰذا اس ضمن میں ہونے والی تمام کاغذی کارروائیوں کے ایک ایک کاغذ کو دیکھنا اور ان پر دستخط کرنا پڑتے تھے، علاوہ ازیں پولیس ٹریننگ اسکول کے نگران اور سپاہی سے لے کر سب انسپکٹر تک کی ترقیوں اور تبادلوں کا ذمہ دار بھی تھا، شہر کی پولیس فورس میں نظم وضبط، اشیائے خورونوش سے متعلقہ اداروں کو لائسنسوں کا اجرا، ہوٹلوں میں رقاصاؤں کو اجازت نامے دینا، پرانے قلعہ میں تعینات پولیس اہلکاروں کی گشت، درگا دیوی، کرسمس، محرم، عیدین اور جلسے جلوسوں کی نگرانی اور کنٹرول روم کی ذمہ داری بھی اس کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ ان سب امور کی انجام دہی، متعدد میٹنگز میں شمولیت اور سینکڑوں کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد وہ تھکا ماندہ رات کو واپس لوٹتا تو بمشکل کھانا کھا پاتا اور بستر پر گر جاتا۔ اس وجہ اس کے پاس ادبی یا تحقیقی کام کرنے کا وقت اور ہمت نہ رہتی۔

....

شام کی سیر کے لیے کمال میدان میں پہنچا تو اس نے کئی جوڑوں کو چہل قدمی کرتے یا ایک دوسرے کی قربت میں بیٹھے دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ سب بڑے مسرور نظر آرہے تھے مگر اس کا اپنا دل ملول تھا۔ بینا جلد ہی واپس آنے والی تھی۔ دونوں زیادہ عرصہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں گزار سکے تھے، بینا اپنی تعلیم میں اور وہ خود سرکاری کاموں کے علاوہ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہا، گویا دونوں کے پاس وقت کی کمی تھی۔ وہ اکثر سوچتا اور اپنے آپ سے عہد کرتا کہ اب جبکہ بینا کی واپسی جلد ہونے والی تھی، وہ اسے زیادہ وقت دیا کرے گا، اپنے آپ کو اس کی توقعات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے گا، دونوں اکٹھے پارک میں آیا کریں گے، سیر کریں گے، کھائیں پئیں گے، حالانکہ خود اسے باہر سے کھانا پینا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وکٹوریہ میموریل، میوزیم اور چڑیا گھر دیکھیں گے، [illegible] کے کنارے بیٹھ کر پرندوں کی اڑان سے محظوظ ہوں گے، اور یوں زندگی سے

لطف اندوز ہوا کریں گے۔ وہ واپس آ جائے تو اس کی معیت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارے گا۔

سیر سے واپسی پر اس نے ایک چکر دفتر کا لگایا کہ شاید کوئی خاص خبر ہو مگر خیریت تھی۔ وہ نکلنے ہی لگا تھا کہ آپریٹر نے ڈاکٹر داس کے فون کی اطلاع دی۔ حال چال پوچھنے کے بعد ڈاکٹر داس نے مینا کی واپسی کا معلوم کیا۔ کمال نے بتایا کہ تا حال اس کے پروگرام کی اطلاع نہیں ملی۔ داس صاحب نے کہا، ''اس سے کہیں کہ اب واپسی میں تاخیر نہ کرے، ڈائریکٹر ہونے کے باوجود میری کچھ مجبوریاں ہیں، سات آٹھ مہینے ہو چکے ہیں، میں کب تک پوسٹ خالی رکھوں گا۔ دوسرے لوگ مجھ پر اعتراض کر رہے ہیں۔ مینا سے کہیں کہ جلد واپس آ جائے''۔

''میں اسے کہہ دیتا ہوں، اور یہ بھی کہوں گا کہ آپ سے بات کرے''۔

گفتگو سے فارغ ہو کر وہ اپنے گھر آیا۔ بند دروازہ دیکھ کر منہ سے ایک آہ سی نکلی۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ کپڑے بدل کر غسل خانہ میں گیا، آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو عجیب سی بے بسی نظر آئی۔ کیا وہ خوش ہے؟ نہیں، بالکل نہیں۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ کنٹرول روم سے بتایا گیا کہ گراس روٹ کانگرس کا مہیلا گروپ سیکرٹریٹ اور گورنر ہاؤس پر احتجاج کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ کمال سے انتظامات کا پوچھا گیا تھا۔ اس نے ہدایات جاری کر دیں۔

وہ برآمدے میں آ کھڑا ہوا۔ بسیں آ جا رہی تھیں، لوگ اترتے اور سوار ہو رہے تھے، لیکن مینا کہاں تھی؟ آسمان پر چاند روشن تھا، چاندنی اس کے کمرے میں بھی جھانک رہی تھی مگر وہ اپنا پسندیدہ گیت گنگنا بھی نہیں سکتا تھا، ''مجھے اپنی تمناؤں سے زیادہ مل گیا ہے''۔ اس نے اب ستاروں کی مدھم روشنی کو دیکھا، پھر بچپن میں ریڈیو پر سنے ہوئے ایک گیت کی کیسٹ لگائی، ''میں ستاروں سے پوچھوں گا، کیا تم نہیں آؤ گے''۔ مینا تو نہیں آئی، لیکن کیا وہ ستاروں سے باتیں کر سکتا ہے؟''

کمال مطالعہ کے کمرے میں گیا، کمپیوٹر پر ای میل دیکھی۔ گزشتہ ہفتہ اس نے مینا کو لکھا تھا کہ ڈاکٹر داس اس کی بلا تاخیر واپسی کا کہہ رہے ہیں، ورنہ مشکل ہو جائے گی، مگر ایک ہفتہ گزرنے کے باوجود مینا کی طرف سے خاموشی تھی۔ آج کی ای میل میں جواب ملا، ''اگر ڈاکٹر داس اتنا زور لگا رہے ہیں تو ان کو کہہ دو کہ میرے لیے جگہ خالی مت رکھیں، میں یہاں ملازمت کر لوں گی''۔

کمال کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ مینا نے کیا سوچ کر یہ لکھا ہے؟ کیا یہاں اس کی واپسی کا تعلق صرف ملازمت سے تھا؟ پھر وہ کیوں اتنے عرصے سے اس کا منتظر ہے؟ کیا مینا اس کے لیے، اپنے پتی کے لیے آنا ضروری نہیں سمجھتی؟

مینا کا ایسا رویہ کچھ عرصہ سے جاری تھا۔ چند روز پہلے بھی اس نے لکھا تھا، ''کیا میں تمہیں اپنا دوست سمجھوں؟'' کمال سوچنے لگا تھا کیا پتی کی حیثیت دوست سے زیادہ نہیں؟ پھر وہ کیوں اسے پتی کی بجائے محض دوست سمجھنے پر مصر ہے؟ کمال کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اس سے پہلے کی ای میلز دیکھیں۔ ایک میں لکھا تھا، ''مجھے بتاؤ کیا تمہیں میری ضرورت ہے؟''۔ اس نے ایسا کیوں لکھا؟ کیا ہر بات، اس کی ساری خواہشیں ظاہر نہیں ہو رہیں؟ پہلے تو اس کے ذہن میں آیا کہ مینا سے پوچھے، پھر سوچا کہ اس کی واپسی پر ساری باتیں ہوں گی۔ اسی خیال سے اس نے لکھا، ''ڈاکٹر داس کو غلط مت سمجھو، وہ تمہارا ہی خیر خواہ ہے۔ جلدی سے واپس آ جاؤ اور اس کے ادارے میں ملازمت شروع کرو۔ ادھر میں بھی تنہا جیون بسر نہیں کر سکتا''۔ ای میل کرنے کے بعد اس نے کمپیوٹر بند کیا اور رسوئی میں آ کر کھانا تیار کرنے لگا۔

....

کمال کام میں مصروف تھا۔ فون کی گھنٹی نے اس کے خیالات کو منتشر کر دیا۔ جھنجھلاتے ہوئے اس نے رسیور اٹھایا، دوسری طرف سے اسے خوشخبری سنائی گئی، ''منڈل صاحب! بنگالی ادب کے سلسلہ میں آپ کی خدمات کے مدِ نظر نکھل بھارت

ساہتیہ سمّیلن نے آپ کو سوشیلا دیوی برلا سمرتی پرشکار کے اعزاز کا حقدار سمجھا ہے۔اس ضمن میں ہماری سالانہ کانفرنس 26 سے 28 دسمبر کو بھاگل پور میں منعقد ہو رہی ہے۔ ہمیں خوشی ہوگی اگر آپ 26 دسمبر کو تشریف لا کر انعام حاصل کریں۔ آپ کی جانب سے رضامندی حاصل ہونے پر آپ کے ٹکٹ اور رہائش کا بندوبست کر دیا جائے گا''۔

کمال خوش ہو کر بولا،'' آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میرے لیے اس میں شرکت باعثِ مسرت ہے لیکن ایک سرکاری ملازم ہونے کے ناتے میں اس وقت اپنی رضامندی نہیں دے سکتا۔ مجھے حکومت سے درخواست کرنا ہوگی اور جیسے ہی وہاں سے اجازت ملی، میں آپ کو مطلع کر دوں گا''۔

''کیا آپ کے خیال میں حکومت اس اعزاز کو وصول کرنے کی اجازت دینے میں مخل ہوگی؟''

''امکان تو نہیں لیکن مجھے اجازت لینا ہوگی''۔

''میں بذریعہ ڈاک اور فیکس آپ کو اطلاع دے رہا ہوں، مجھے اپنا فیکس نمبر دیجیے''۔

چند سیکنڈ بعد کمال کو فیکس بھی مل گیا۔اس نے مجاز اتھارٹی کے نام درخواست لکھی اور ساتھ فیکس کی نقل منسلک کر دی۔ وہ انتہائی مسرور تھا کہ ساہتیہ سمّیلن نے اسے اس اہم ادبی اعزاز کے لیے منتخب کیا ہے۔اس تنظیم کی تشکیل میں مشہور بنگالی شخصیتیں اتل پرشاد سین اور نوبل انعام یافتہ رابندر ناتھ ٹیگور شامل تھیں۔ ابتداً اس کا نام غیر رہائشی بنگالی ایسوی ایشن تھا، موجودہ نام بعد میں اختیار کیا گیا۔ کمال کسی قریبی اور محب ساتھی سے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کا متمنی تھا۔اس کے دل میں مینا کا خیال آیا مگر اس کا سابقہ رویہ مایوس کن تھا۔ وہ کمال کی کامیابی پر شاید خوش نہ ہو۔ خود اسے مینا کی ہر کامیابی پر فخر محسوس ہوتا لیکن وہ کیوں اس سے لاتعلق رہتی ہے؟ یہ سوچ کر کمال نے اسے فون نہ کیا بلکہ کمپیوٹر پر پیغام دینا مناسب سمجھا۔ دیکھا تو اس کی جانب سے ای میل آئی ہوئی تھی،'' میں ایک سیمینار کے سلسلہ میں اپنے باس کے ساتھ یونان جا رہی ہوں، اس لیے یکم اکتوبر کو میری آمد نہیں ہو سکے گی، اب میں اکیس نومبر کو آؤں گی۔ اور ہاں، میں تمہارے گندے کوارٹر میں آنا پسند نہیں کرتی، میرے آنے سے پہلے کسی اور رہائش گاہ کا بندوبست کر لینا''۔

کمال مینا کے رویّے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ مانا کہ اسے یہ گھر پسند نہیں مگر اس کا انداز سراسر خود غرضانہ تھا۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس شہر میں اچھا گھر لینا کتنا محال ہے۔ پھر وہ اپنی آمد میں تاخیر کیے جا رہی ہے۔ اب ڈاکٹر داس کو کیا کہا جائے؟ مینا نے خود اسے فون بھی نہیں کیا تھا، بس اتنا لکھ دیا کہ اکتوبر میں اس کی آمد ممکن نہیں اور یہ کہ اس کے آنے سے پہلے گھر بھی تبدیل ہونا چاہیے۔

کمپیوٹر بند کرنے کے بعد کمال شش و پنج میں پڑ گیا کہ اچھی رہائش گاہ کیسے تلاش کی جائے۔ سوچتے سوچتے ایک خیال اس کے ذہن میں آیا کہ ڈاکٹر داس کے انسٹیٹیوٹ میں ملازمت ملنے کے بعد شاید مینا کو وہاں گھر بھی مل جائے، لہٰذا اس نے داس کو فون کیا مگر جواب ملا کہ مینا ملازمت شروع کرنے کے بعد درخواست دے لیکن عارضی طور پر اس کی رہائش کا اس طرح بندوبست ہو سکتا ہے کہ کمال مینا کی جانب سے ایک درخواست بھیج دے، وزیٹنگ سائنسدانوں کے لیے کچھ فلیٹ مخصوص رکھے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک مینا کو بھی مل جائے گا۔

کمال نے اسی وقت مینا کو ای میل کر دی کہ دوسرا گھر مل جائے گا، تم جلد واپس آ جاؤ۔ چند دن بعد جواب آیا،'' میں جو کہتی ہوں، تم ویسا ہی کرتے ہو، یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں اتنا پسند کرتی ہوں۔ کاش تم میرے دوست ہوتے''۔ پھر وہی دوستی کی خواہش! ادھر ڈاکٹر داس کی یقین دہانی کے بعد اس نے پھر لکھا کہ گھر کا بندوبست ہو گیا ہے۔

اگلے روز کمال ڈاکٹر داس سے ملا جس نے بتایا کہ گھروں کی الاٹمنٹ ڈائریکٹر کی صوابدید ہے لہٰذا اس سے ملاقات کرنا ہوگی۔ بہر طور کافی تگ و دو اور ادھر ادھر چکر کاٹنے کے بعد بالآخر ایک فلیٹ الاٹ ہو گیا جسے بہت دیر سے بند رہنے کے

سب رنگ روغن اور کچھ مرمت وغیرہ درکار تھی۔ اب یہاں ٹھیکیدار کی منت سماجت کرنا پڑی تب جا کر اس نے جلدی کام کرنے کی حامی بھری۔ کمال نے گھر کی تمام چیزیں خریدیں اور آخر کار فلیٹ رہائش کے قابل ہو گیا۔

مینا نے اپنی آمد کی تاریخ اکیس نومبر لکھی تھی۔ ہوائی اڈے جانے سے قبل کمال نے اس کی ای میل وصول کی جس میں بس اتنا لکھا تھا کہ کام مکمل نہ ہونے کے سبب وہ مقررہ تاریخ کو پہنچنے سے قاصر ہے۔ وہ سٹپٹا گیا۔ آخر مینا چاہتی کیا ہے؟ اس نے جوابی ای میل میں اس سے پوچھا کہ اب کس تاریخ کو آئے گی؟ ایک ہفتہ بعد جواب آیا کہ وہ آٹھ دسمبر کو پہنچ رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد کمال کو ڈاکٹر داس کے دیہانت کی اطلاع ملی۔ وہ فلیٹ کے نگران سے ملا جس نے ازراہ ہمدردی یا طنزیہ انداز سے کہا، ''آپ نے فلیٹ کو سجانے سنوارنے میں اتنی کوشش کی ہے مگر آپ کی پتنی پھر بھی نہیں آئیں''۔ کمال اور کیا کہہ سکتا تھا کہ کچھ ضروری کاموں کی وجہ سے اس کی آمد میں تاخیر ہو گئی ہے۔

....

8 دسمبر مینا کی آمد کا دن تھا۔ کمال نے ای میل چیک کی۔ اسے خدشہ تھا کہ مینا نے پھر سے اپنا پروگرام ملتوی نہ کر دیا ہو مگر کوئی ایسی اطلاع نہیں تھی۔ اس نے مینا کے استعمال کی باقی چیزیں، یعنی باتھ روم کی چپل، صابن، ٹوتھ برش اور پیسٹ اور اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی اشیاء خریدنے کی فہرست تیار کی۔ ادھر کمشنر نے اسے کرسمس کے انتظامات اور بریگیڈ میٹنگ پر نظر رکھنے کی ڈیوٹی سونپ دی۔ کاغذی انتظامات سے فارغ ہو کر اس نے سرکاری کام نبٹائے، ملاقاتیوں اور صحافیوں کی باتیں سنیں اور شام چھ بجے تھکا ٹوٹا اپنی رہائش گاہ کو چل دیا۔ اسے ہلکی ہلکی حرارت اور سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ اس نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا پھر بھی بھوک کا احساس نہیں ہوا۔ وہ بڑی شدت سے آرام کرنا چاہتا تھا۔

ابھی لیٹا ہی تھا کہ سمیت کا فون آ گیا جو بتا رہا تھا کہ دیدی آج رات آ رہی ہے مگر یہاں صرف ایک ہفتہ قیام کرے گی۔ کمال کے استفسار پر سمیت نے وضاحت کی کہ دیدی آپ کو فون کر رہی تھی مگر آپ سے بات نہیں ہو سکی، اس لیے اس نے مجھے مطلع کیا ہے۔ کمال کو ناگوار گزرا کہ ایک تو مینا تاخیر کرتی رہی ہے اور پھر آ بھی رہی ہے تو صرف ایک ہفتہ کے لیے، اور یہ اطلاع بھی کسی اور کے ذریعہ سے مل رہی ہے۔ بالفرض اس سے بات نہیں ہو پائی تھی تو سمیت کو بتانے کا مقصد کیا تھا؟ اُسے تو اپنی آمد کے بعد بھی بتایا جا سکتا تھا۔

ہوائی اڈہ جانے کے لیے وہ رات آٹھ بجے فلیٹ سے نکلا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ جہاز دس بجے آئے گا۔ اگرچہ ڈی، ایس، پی نے اسے اپنے دفتر بیٹھنے کی پیشکش کی تھی مگر اس کا خیال تھا کہ کھلے آسمان تلے بیٹھنے سے شاید اس کی بے چینی کا مداوا ہو، اس لیے اس نے معذرت کی۔ باہر نکل کر وہ آسمان کی وسعتوں پر نظریں جما کر کھڑا ہو گیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ مینا آسمان سے نیچے اترے گی۔ صرف ایک ہفتہ کے بعد اس کی واپسی کا سوچ کر کمال کا دماغ درد بھری لہروں سے لبریز ہو گیا۔

وقتِ مقررہ پر جہاز ہوائی اڈے پر اترا۔ تھوڑی دیر بعد مسافر نیچے اترنے لگے۔ ایک بس بھر گئی، پھر دوسری مگر مینا دکھائی نہ دی۔ آخر وہ سیڑھیاں اترتی نظر آئی۔ کمال پہلے تو اسے پہچان نہ سکا۔ وہ جینز اور چھوٹی سی ٹاپ میں بہت نحیف دکھائی دے رہی تھی۔ کمال اس کے پاس پہنچا، بیگ تھاما اور اس کا حال چال پوچھا۔ امیگریشن سے جلد ہی فارغ ہو گئے۔ اب سامان کی آمد کا انتظار ہونے لگا۔ کمال کا بدن تھکن سے چور چور تھا، اسے آرام کی شدید ضرورت تھی۔ سامان آیا، ہوائی اڈے سے باہر نکلے تو سمیت وہاں کھڑا تھا۔ مینا نے اسے ایک بیگ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں لیبارٹری کی کچھ چیزیں ہیں، اسے انچارج کو دے دینا۔ وہ بیگ لے کر ٹیکسی میں روانہ ہو گیا۔

کمال نے مینا کو مشورہ دیا کہ آج کی شب اس کے کوارٹر میں قیام کرے، صبح فلیٹ میں منتقل ہو جائے۔ اس نے سوال

کیا، ''تم نے تو لکھا تھا کہ فلیٹ بالکل تیار ہے؟''

''ہاں، بالکل تیار ہے''۔

''تو پھر وہیں چلتے ہیں۔ دفتر کے اوپر رہائش مجھے پسند نہیں''۔

فلیٹ پہنچ کر دونوں اندر داخل ہوئے۔ کام کی ہر شے موجود تھی۔ مینا نے پوچھا، ''اتنی چیزیں میرے لیے؟''

''نہیں، ہم دونوں کی''۔

''کیا تم بھی یہیں رہو گے؟''

کمال کو اپنی توہین محسوس ہوئی۔ مینا واپس آنے میں تاخیر کرتی رہی، اس کے لیے فلیٹ اور چیزوں کا بندوبست کیا اور اب پوچھ رہی ہے آیا میں بھی اس کے ساتھ قیام کروں گا؟ ظاہر تھا کہ دونوں اکٹھے ہی رہیں گے، پھر اس کے پوچھنے کا مقصد کیا ہے؟ اس نے کہا، ''اگر تمہیں میرا یہاں رہنا پسند نہیں تو میں نہیں رہوں گا''۔ مینا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی خاموشی دیکھ کر کمال نے اس کے لیے کھانا نکالا، مچھروں سے بچاؤ کی خاطر اس کے بستر پر جالی لگائی اور ایک ہزار روپے دیتے ہوئے کہا، ''تمہارے پاس بھارتی کرنسی نہیں ہوگی، یہ رکھ لو، ضرورت پڑ سکتی ہے''۔ اور مینا نے کچھ کہے بغیر پیسے لے کر اپنے پرس میں رکھ لیے۔ کمال اسے الوداع کہہ کر لوٹنے ہی لگا تھا کہ مینا بولی، ''اگر تمہیں کچھ وقت مل جائے تو مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرنا''۔ کمال چپ چاپ سیڑھیاں اتر آیا۔ بڑی مشکل سے اپنے آنسو روکے ہوئے گھر واپس آیا اور جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، آنسوؤں کا دھارا پھوٹ بہا۔

....

ساری رات جاگتے اور پہلو بدلتے گزری۔ صبح صبح اسے مینا کا فون آیا، ''کمال! تم کسی اور لڑکی سے شادی کر لو''۔

''میڈم! کیا تم پاگل ہوگئی ہو؟''

''نہیں، میں جانتی ہوں تمہاری کتنی ہی لڑکیوں کے ساتھ دوستی ہے''۔

''نہیں، میری کسی کے ساتھ دوستی نہیں''۔

''تمہاری بات کیسے مانوں؟''

کمال ٹپٹا گیا۔ مینا کا رویہ کیسا ہے؟ کہنے لگا، ''تمہاری مرضی میری بات مانو یا نہ مانو۔ اوّل تو کوئی میری گرل فرینڈ نہیں اور بالفرض ہو بھی تو میں شادی کیوں کروں؟''

''تمہارے ساتھ اپنے جسمانی تعلقات کو میں کسی طور بھی ثابت نہیں کر پاؤں گی''، مینا کی یہ بات سن کر کمال ہکا بکا رہ گیا، ''کیا میں نے تمہیں اب جسمانی تعلقات کا کہا ہے؟ کام کی بات کرو۔ کیا تم کسی اور کے ساتھ تعلقات رکھنا چاہتی ہو؟ کیا کسی اور سے شادی کا ارادہ ہے؟ اگر نہیں تو ایسی باتیں کرنے کا مقصد کیا ہے؟''

''نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بعد میں بات کروں گی''۔

''یہ بتاؤ ملازمت کب سے شروع کر رہی ہو؟''

''سوچ رہی ہوں کہ ملازمت کروں یا نہ کروں۔ ہر کوئی ایک ہی بات کر رہا ہے کہ یہاں ریسرچ ممکن نہیں''۔

''کیا تمہیں پہلے اس کا علم نہیں تھا؟ پھر واپس کیوں آئی ہو؟''

''میں بعد میں بات کروں گی، اس وقت نہیں''۔ ساتھ ہی اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

....

بار بار فون آنے سے طبیعت بوجھل ہو رہی تھی۔ وہ نقاہت محسوس کرنے لگا۔ اتنے میں براہی سے مسٹر نیلمانی کندو کا فون آ گیا جو اسے ایک دو روز کے لیے بلا رہا تھا۔ کمال نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شام کو بات کریں گے۔ وہ جانتا تھا کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ کالج کی تعمیر کے لیے وہاں کے لوگوں نے چندہ جمع کرنے کی غرض سے ایک ثقافتی پروگرام ترتیب دیا تھا۔ بڑے بڑے فلمی فنکار مثلاً متھن چکرورتی، رانی مکرجی، بپی لہری اور سیینہ یاسمین کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان کی آمد و رفت اور رہائش کا خرچ پانچ لاکھ سے زیادہ تھا جبکہ ابھی تک ٹکٹوں کی فروخت سے کوئی تین لاکھ روپیہ حاصل ہوا تھا، اسی لیے منتظمین کمال کی موجودگی ضروری سمجھتے تھے۔ ہوائی ٹکٹ بلا تاخیر خریدنا تھے۔ تقریب 14 کو ہونی تھی، آج نو تاریخ ہوگئی ہے، کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ وہ دفتر گیا، وہاں سے فارغ ہو کر ٹکٹ خریدے اور جیسے ہی گھر داخل ہونے لگا، مینا بھاگتی ہوئی آئی اور پھولی سانسوں سے کہنے لگی،'' کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں''۔

چونکہ صبح بات ہو چکی تھی اس لیے کمال کو اندازہ تھا کہ ضروری بات کیا ہے۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ڈیڑھ سال کی جدائی کے بعد ایک دوسرے کی قربت میسر آئی مگر یہ کیسی قربت تھی؟ جذبات سے مغلوب کمال نے پوچھا'' ہاں، کیا کہنا چاہتی ہو؟''

مینا نے بلا جھجک اور تمہیدی کلمات کہے بغیر صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ کمال کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ مضطرب اور منتشر ذہن سے اس نے وجہ پوچھی۔ مینا نے صاف گوئی سے جواب دیا'' میں نے جتنے مردوں کے ساتھ جسمانی تعلقات رکھے ہوئے ہیں ان کے پیش نظر اب تمہارے پاس آنا ممکن نہیں رہا''۔

کمال کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، دل میں درد کی شدید لہر اٹھی،'' یہ کیسے ہوا؟ میں اتنے طویل عرصہ سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا''۔

'' لیکن مجھے تمہاری قربت کا انتظار نہیں تھا۔ میں میکو کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ پہلے تو اس کے ساتھ ویک اینڈ پر جاتی تھی، بعد میں اس کے گھر میں ہی رہنا شروع کر دیا''۔

کمال نے اپنے بکھرے جذبات مجتمع کرتے ہوئے کہا،'' جو ہوا، سو ہوا، اسے بھول جاؤ۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ساری زندگی تمہارا انتظار کیا، اب تو میں مان ہی نہیں سکتا کہ تم سے کوئی خطا، کوئی غیر اخلاقی حرکت سرزد ہوئی ہے۔ اتنی ظالم مت بنو۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ''۔

'' یہ سب کچھ بے ارادہ اور بے خیالی میں نہیں ہوا۔ میں نے سوچ سمجھ کے یہ قدم اٹھایا تھا''۔

'' بس کرو! میں کچھ جاننا نہیں چاہتا، مجھے اچھا نہیں لگتا''۔

'' میں جانتی تھی تمہیں اچھا نہیں لگے گا، اسی لیے واپس نہیں آنا چاہتی تھی، لیکن مجھے کم از کم اپنی ذات کے ساتھ تو مخلص ہونا چاہیے۔ صرف میکو ہی نہیں، دوسرے مردوں کے ساتھ بھی میرے جسمانی تعلقات تھے''۔

'' کون لوگ تھے وہ؟''

'' تم انہیں نہیں جانتے۔ کم از کم چودہ مردوں کے ساتھ میرے تعلقات رہے ہیں۔ جب میں نے میکو کو بتایا تو وہ بالکل معترض نہ ہوا''۔

'' تمہارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اعتراض کر رہا ہوں؟''

'' ہاں! ایسا ہی ہے۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تمہیں ہر بات صاف صاف بتا دوں۔ تم مجھے سرد مہری کا طعنہ دیتے رہے، میں نے اپنے باس کو بتایا، اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ گوتم میری سہیلی شیلا کا دوست تھا، میں نے اسے بھی بتایا، اور نتیجتاً میں اس کے ساتھ سب کچھ کرنے پر رضامند ہوگئی۔ اگر میں شیلا کو بتا دیتی تو کیا ہوتا؟ میں پھر امریکہ چلی گئی۔ ہوائی اڈے پر ہری

مجھے لینے آیا۔ چند روز وہ مجھے ادھر ادھر سیر کراتا رہا۔ ایک رات مجھے اس نے اپنی بیماری کا بہانہ کر کے بلایا اور میرا بلاتکار کیا۔ اگر چہ مجھے اس سے نفرت تھی پھر بھی جسمانی تعلقات جاری رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان اس راہ پر چل پڑے تو پھر کوئی انت نہیں۔۔۔۔۔''۔

''مینا! پلیز چپ ہو جاؤ۔ یہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی میں تم سے الگ نہیں ہونا چاہتا۔ تمہیں چھوڑنے کا مطلب ہے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنا''۔

''مجھ پر ترس نہ کھاؤ، میں میکو کے پاس چلی جاؤں گی''۔

''کس لیے؟''

''کیونکہ اس کی پرورش ایک مختلف ماحول میں ہوئی ہے۔ وہ یہ ساری باتیں دل سے قبول کر سکتا ہے۔ تم دل سے نہیں، محض منطق اور دلیل سے مان سکتے ہو، لہٰذا ہمارے تعلقات میں رخنہ پڑنے کا اندیشہ رہے گا۔ میں تمہارے ساتھ اب نہیں رہ سکتی''۔

کمال مینا کو گلے لگانے کے لیے اٹھا لیکن اس نے یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک دیا، ''مجھے ہاتھ مت لگانا، میں تم سے نفرت کرتی ہوں، تم پرلے درجے کے جھوٹے ہو''۔ وہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا، سمجھ میں نہ آیا کیا کرے، کیا کہے؟ آخر بے بسی کے عالم میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ مینا اشک بار ہوگئی۔ کمال نے اسے مخاطب کیا، ''مینا بتاؤ، میرے جیون میں کیا رہ گیا ہے؟ میں کیسے زندہ رہوں گا، میں نے تمہارے وعدوں پر بھروسہ کیا، اتنا عرصہ تنہا رہا، تمہارا انتظار کرتا رہا''۔

''میں نے تمہیں کون سا وچن دیا تھا؟''

''کیا یہ وچن نہیں تھا کہ تم سارا جیون میرے ساتھ بتاؤ گی؟ میرے ساتھ جیو مرو گی؟ اور اب جبکہ میں بالکل اکیلا ہوں تم کسی اور کے پاس جا رہی ہو''۔

''ہاں! میں نے میکو سے وعدہ کیا ہے، اور تمہیں پتہ ہی ہے کہ مجھے اپنا وعدہ نبھانا آتا ہے''۔

''میں دیکھ رہا ہوں''۔

مینا ان طنزیہ الفاظ کی تہ تک نہ پہنچ سکی۔ کمال کا ذہن ماؤف تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مینا کی وجہ سے صورتِ حال انتہائی تکلیف دہ ہوگئی تھی۔ اگر وہ اس کے پاس رہنے پر رضامند ہو بھی جائے تب بھی کمال ہر پل دکھ اور تکلیف میں رہے گا، دوسری طرف اس کے جانے کے خیال سے دل پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا، ''مینا، چھوڑ کے مت جاؤ۔ میں نے اپنے دل و دماغ میں تمہارے ساتھ تاحیات رہنے کی صورت گری کی ہے، تمہارے بغیر سب کچھ ادھورا ہے''۔

''کیا تم مجھے میکو کے ساتھ جیون گزارنے کی اجازت دو گے؟''

کمال کی سوچیں مختل ہوگئیں۔ ایک عورت جو پندرہ سال سے اس کی پتنی ہے کس دل سے یہ پوچھ رہی ہے؟ غالباً وہ واحد پتی ہے جس کی پتنی ایسی اجازت مانگ رہی ہے۔ وہ کچھ نہ سوچ سکا۔

دروازے کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ مینا اور کمال دونوں اشک بار تھے۔ کمال نے آنسو پونچھے اور دروازہ کھولا۔ اردلی نے کہا، ''سر! بہت فائلیں اکٹھی ہوگئی ہیں، سٹاف پوچھ رہا ہے آپ نیچے کب آئیں گے؟'' کمال نے غصہ میں جواب دیا، ''میری طبیعت ٹھیک نہیں، آج میں دفتر نہیں آؤں گا''۔

اس کی طبیعت بلاشبہ خراب تھی، کمزوری اور ناتوانی بھی محسوس ہو رہی تھی، صرف اپنی قوتِ ارادی کے سہارے کام کر رہا تھا مگر اب تو وہ بھی چور چور ہوگئی۔ اس نے مینا کو دیکھ کر کہا، ''مجھے بیٹھنا اور کھڑے ہونا محال ہو رہا ہے، میں ذرا لیٹنے لگا ہوں''۔

وہ اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ مینا اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر پوچھنے لگی، ''میں تھوڑی سی شراب لے لوں؟''

''شراب خانے جا کر پی لو، میرے گھر نہیں''۔

''تم اچھے بھلے تھے، میرے آنے پر تمہاری طبیعت خراب ہو گئی ہے، لوگ سمجھیں گے میری وجہ سے ہوئی ہے''۔

''میں وچن دیتا ہوں کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم فکر مت کرو''۔

مینا کے کچھ بولنے سے قبل ہی گھنٹی پھر بجی۔ کمال اٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگا تو مینا بولی، ''میں جا رہی ہوں''۔

اتنے میں ڈپٹی کمشنر نیان بوس پہنچ گیا اور کہا، ''کمشنر صاحب بتا رہے تھے کی آپ کی طبیعت ناساز ہے۔ سر! کیا ہوا؟''

اس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا، ''کوئی خاص بات نہیں۔ میں نے ایک ناول لکھا تھا لیکن اسے ہارڈ ڈسک کی بجائے فلاپی میں محفوظ کر لیا۔ اب فلاپی کھل نہیں رہی۔ کمپیوٹر کی دکان پر بھی بھیج کر دیکھ لیا ہے، کچھ نہیں ہوا۔ میری ساری محنت غارت ہو گئی ہے''۔

نیان بوس بولا، ''ہاں، ایسا ہو جائے تو بہت پریشانی ہوتی ہے۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ کرشن داس کوی راج نے اس صدمے سے دریا میں کود کر خودکشی کر لی تھی کہ اس کا ایک مسودہ گم ہو گیا تھا''۔

کمال نے جو کچھ کہا اس میں مبالغہ اور جھوٹ نہیں تھا، کسی حد تک حقیقت بیانی تھی۔ واقعی ایسا ہوا تھا کہ ناول کا مسودہ فلاپی میں خراب ہو گیا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود بھی اس کی بازیابی نہ ہوئی جس کی وجہ سے وہ کئی دنوں سے پریشان تھا۔ ناول تو دوبارہ لکھا جا سکتا تھا لیکن جس کی محبت میں اس نے اتنے برس گزارے، وہ نقصان ناقابلِ علاج تھا۔ وہ دکھ اور تکلیف میں سوائے کراہنے اور پریشان رہنے کے اور کیا کر سکتا تھا؟ نیان بوس نے کہا، ''کسی ڈاکٹر کو بلاتے ہیں، اگر آپ مسودے کے گم ہونے پر فکرمند ہوتے رہے تو طبیعت اور خراب ہو جائے گی''۔

کمال نہیں مانا، ''بس تھوڑا سا آرام کرنے سے میں ٹھیک ہو جاؤں گا''۔

''سر! اگر ہماری مدد کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔ کیا آپ اکیلے رہتے ہیں، سر!''

''نہیں، میری پتنی واپس آ گئی ہے''۔

نیان واپس چلا گیا۔ مینا کھڑی ساری باتیں سن رہی تھی۔ نیان کے جانے کے بعد اس نے کہا، ''میں بھی اب چلتی ہوں''۔ کمال لجاجت سے بولا، ''میں طویل عرصہ تنہا رہا ہوں۔ شادی سے پہلے بھی میں اکیلا تھا، شادی کے بعد بھی چودہ برس تنہائی میں گزرے ہیں، لیکن اب تو بالکل ہی بے یار و مددگار رہوں۔ کل تک یہ آس تھی کہ ہم دونوں اکٹھے رہیں گے مگر اب آس بھی ٹوٹ گئی ہے۔ جیون میں پہلی بار مجھے اپنے اکیلے پن سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔ مینا! مت جاؤ، کچھ دن تو میرے پاس رک جاؤ''۔

''اگر میں یہاں ٹھہر گئی تو میکو سے رابطہ نہیں ہو پائے گا، اسے میرے متعلق بدگمانی ہو جائے گی''۔

ان لفظوں نے تو گویا کمال پر بم گرا دیا۔ تکلیف ناقابلِ برداشت ہو گئی، دل سے جیسے لہو ٹپک رہا ہو۔ اس کے جذبات پر برف کی سل پڑ گئی۔ کتنی دوڑ دھوپ کے بعد اس نے مینا کی خوشی کے لیے نئے گھر کا بندوبست کیا تھا۔ اپنے پسینے کی کمائی سے اس گھر میں جس ٹیلیفون کا کنکشن لیا تھا اب اس پر مینا کا عاشق باتیں کیا کرے گا! کیا مینا، اس کی پتنی، یہاں کبھی نہیں رہے گی۔ دکھ سے مغلوب اس نے ڈرائیور کو بلایا۔

تکلیف سے کمال کا برا حال تھا۔ دل اس کو حقیقت ماننے پر تیار نہیں تھا۔ جو کچھ بھی ہوا، کیا وہ خود اس کا ذمہ دار ہے؟ لیکن مینا کے فیصلہ کا اسے آخری لمحہ تک علم نہ ہو سکا۔ اس نے اپنا فیصلہ کمال پر ٹھونس دیا۔ کمال کی وسعتِ قلبی کا نتیجہ تھا کہ ترازو کا پلڑا مینا کی سمت جھک گیا جبکہ اسے ایک لمحہ کے بھی احساس نہ ہوا کہ اس کے رویئے اور بے وفائی کا کمال پر کیا اثر ہو گا۔ اس قسم کا صدمہ

اور دھچکا کوئی دشمن بھی کمال کو نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے مینا کو کہا،" جو کچھ تم مجھ پر ٹھونس رہی ہو میں اسے نہیں مان سکتا۔ میں ہر بات بھول جانا چاہتا ہوں، مجھے نیند کی ضرورت ہے لیکن یہاں میں نہیں سوسکتا۔ مجھے اسپتال جانا ہے، وہ مجھے گہری نیند سلا دیں گے"۔

"اور اس طرح سب جان جائیں گے کہ تمہاری حالت میری وجہ سے ہوئی ہے؟"

کمال حیران تھا، کیا کوئی عورت، اور وہ عورت جو برسوں سے اس کی پتنی ہے، آج بھی اس کی پتنی ہے، اتنی خودغرض ہو سکتی ہے؟ اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا،" مینا! تمہارا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم جاؤ، میں اسپتال نہیں جاؤں گا"۔ یہ سن کر وہ وہاں سے چلی گئی۔ کمال زخمی جانور کی طرح بستر پر گر کر تڑپنے لگا۔ اچھا ہوا یا برا، وہ بالکل بے حس تھا۔ اب ہر شے، حتیٰ کہ زندگی بھی اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی۔ اسے شدید سردرد ہونے لگا، اوپر سے فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوگئی۔ آپریٹر نے بتایا کہ ایس پی مقصود آباد بات کرنا چاہتے ہیں۔ فون ملانے پر دوسری طرف سے ڈپٹی کمشنر سمن کی آواز آئی جو کہہ رہا تھا،" سر! یہ آپ نے کیا کر دیا ہے؟ آپ نے تھانے میں ٹکٹ دیئے ہیں؟"

کمال نے نقاہت سے جواب دیا،" آپ غلطی پر ہیں، پہلے تفتیش تو کر لینی تھی، آپ کو علم ہو جاتا کہ میں نے تھانے والوں کو ٹکٹ نہیں دیئے"۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا آپ صدر تھانے نہیں گئے تھے؟"

"پہلے ان سے پوچھ لیں، پھر مجھ سے بات کریں"۔

"میں پوچھ گچھ کر چکا ہوں، ٹکٹ آپ ہی نے دیئے ہیں۔ وہ آگے سے شراب کی دکانوں اور سٹے والوں کو بیچ دیں گے۔ آپ خود کو ایماندار کہتے ہیں، کیا ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آئی؟"

کمال کو بہت برا لگا مگر اس وقت اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا،" آپ کو بلا تفتیش کیے ایسی باتیں اور اپنے رویے پر شرم آنی چاہیے"۔

سمن نے ترکی بہ ترکی جواب دیا،" میں یہ ٹکٹ دہلی بھیج رہا ہوں، پھر میں دیکھوں گا کس کو شرم آنی چاہیے"۔

"جو کرنا ہے کرو، میں فون منقطع کر رہا ہوں"۔ کمال جانتا تھا کہ سمن اس سے بدلہ لے رہا ہے۔

....

کچھ عرصہ پہلے سمن اس کی ماتحتی میں کام کر رہا تھا۔ وہ ناجائز طور پر کئی سرکاری گاڑیاں اپنے خاندان کے لیے استعمال کرتا جبکہ دفتر والوں کو سرکاری فرائض کی بجا آوری کے لیے گاڑی نہیں ملتی تھی۔ اس نے کئی بار سمن کو سمجھایا تھا مگر وہ اپنی روش پر چلتا رہا۔ پھر ایک وجہ اور بھی تھی۔ ڈیپارٹمنٹ کے پاس انٹیلی جنس کاموں کے لیے رقم رہتی تھی مگر کچھ افسر خرچ کا حساب کتاب نہیں دکھاتے تھے۔ وجہ صاف ظاہر تھی، یعنی یہ پیسہ ناجائز طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کمال اسے جائز کاموں پر خرچ کرنے پر یقین رکھتا تھا لہٰذا وہ سمن کے مطالبے پر رقم دینے میں احتیاط برتتا، بلکہ اسے سمجھاتا بھی رہتا کہ یہ رقم ادھر ادھر کی بجائے مخصوص کاموں پر خرچ کی جائے، اس وجہ سے سمن کے دل میں کمال کے لیے گرہ بندھ گئی تھی۔ لیکن کیا بدلے کی آگ میں وہ اس قسم کے الزامات لگانے میں حق بجانب تھا؟

کمال کو یہ باتیں سن کر دکھ ہوا کیونکہ سمن جس الزام کا ذکر کر رہا تھا، اسے سرے سے اس کا علم ہی نہیں تھا۔ تھانے جا کر کسی کو ٹکٹ دینا تو کجا وہ اس روز اپنی گاڑی سے اترا ہی نہیں تھا۔ ہفتہ اتوار کی چھٹیوں میں وہ گاؤں چلا جاتا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ کالج کی تعمیر کے سلسلہ میں مختلف لوگوں سے ملتا رہا۔ رات نو بجے کے قریب گاؤں میں واپسی ہوئی، اگلے روز چونکہ اسے دفتر آنا تھا اس لیے اس نے رات گیارہ بجے کی گاڑی سے سفر کرنا مناسب سمجھا، مگر کندو نے اسے مشورہ دیا کہ صدر تھانے سے ہو

کر چلتے ہیں کیونکہ وہاں پانچ سوٹکٹ بیچنے کی بات ہو چکی ہے۔ کمال کندو کے ساتھ جانے پر معترض تھا لیکن پرشانت کے اصرار پر وہ تیار ہو گیا۔ پرشانت کمال کو بیٹے سمان سمجھتا تھا بلکہ اس کی وصیت تھی کہ دیہانت ہونے پر اس کو چتا کو کمال ہی آگ لگائے حالانکہ اس کے دو بیٹے موجود تھے۔ لہٰذا وہ مجبوراً اس کے ساتھ چل دیا۔ بس اتنی سی بات تھی جس کو سمن نے داستان بنا دیا۔

....

ایثار الدین فقیر کا انتقال ہو چکا تھا۔ کمال اس کی باتیں یاد کر رہا تھا کہ ایک خوشی کے جلو میں متعدد خوشیاں چلتی ہیں اور اسی طرح ایک دکھ کے ساتھ مزید کئی دکھ بھی ملتے ہیں۔ زندگی بھی یہی ہے کہ ہر شخص کو کئی قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی موقع اس کا آزمائش کا تھا، اب اپنے مخالفین سے ڈٹ کر مقابلے کا وقت تھا، لیکن کیسے مقابلہ کرے؟ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے گہرے اندھیرے سمندر میں ناؤ چلا رہا ہو۔ اسے چاروں طرف گھپ اندھیرا دکھائی دینے لگا تھا۔

سوچوں میں گم کمال فون کی گھنٹی سن کر چونکا۔ دوسری طرف ایک صحافی الوک رائے بول رہا تھا کہ بھوپن پور سے موصولہ خبر کے مطابق وہاں کے ایس پی نے الزام لگایا ہے کہ کمال نے اپنے کالج کی تعمیر کے سلسلہ میں ہونے والی تقریب کے لیے مقامی تھانے کو ٹکٹ دیئے ہیں۔ الوک رائے اس پر کمال کا ردِ عمل پوچھ رہا تھا۔

''میرا واحد بیان یہ ہے کہ آپ خود جا کر تھانے سے چھان بین کریں''۔

''بہتر ہے، میں اپنے رپورٹر کو کہہ دیتا ہوں''۔

فون رکھا ہی تھا کہ ایک اور صحافی سمیت مکر جی نے بھی یہی سوال کیا۔ کمال کا جواب بھی وہی تھا۔ سمیت نے پوچھا آیا کسی اور صحافی کا فون بھی آیا تھا؟ کمال نے بتایا کہ کچھ دیر پہلے الوک رائے نے بھی یہی پوچھا تھا۔ سمیت نے کہا، ''اب میں سمجھ گیا کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ الوک اور سمن اسکول اور کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ مجھے خبر ملی تو میں نے ادھر ادھر سے معلومات حاصل کیں۔ پتہ چلا ہے کہ خود سمن نے صحافیوں سے ایسی باتیں کی ہیں''۔

تھوڑی دیر بعد ایک اخباری رپورٹر دیا پریا بوس کا فون آیا جو کہہ رہی تھی، ''مسٹر منڈل! آپ نے تو نہیں بتایا لیکن مجھے بھابھی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ آپ سے یہ ساری باتیں کر چکی ہے''۔ کمال سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے، اس لیے اسے کہا کہ اس موضوع پر کوئی بات مت کرے۔ لیکن وہ چپ نہ رہی، ''مسٹر منڈل! آپ کی پتنی با ہمت ہے مگر آپ کا رویہ تو عورتوں کی طرح ہے۔ وہ آپ کے قابل نہیں ہے، اسے اپنے جیون سے باہر پھینک کیوں نہیں دیتے؟ اگر آپ شادی کے خواہشمند ہیں تو اس سے بہت بہتر لڑکیاں مل جائیں گی''۔

کمال جانتا تھا کہ اس کے عہدے اور اوپر سے بحیثیت ایک قلم کار شہرت کی وجہ سے متعدد لڑکیاں اس کی پتنی بننے کو تیار ہیں، لیکن اس کا دل مینا کی باتوں پر ابھی بھی یقین نہیں کر رہا تھا، وہ سوچتا رہا کیا کوئی شخص اس حد تک پہنچ سکتا ہے۔ اسے ٹیگور کی نظم سے ایک مصرع یاد آ گیا، ''اچھا ہے یا بُرا، حقیقت کو آرام سے مان لو''۔ آرام سے تسلیم کرنا تو الگ کمال حقیقت ہی کو نہیں مان رہا تھا۔ دیا پریا کہہ رہی تھی، ''مت پروا کیجیے اس کی''۔

کمال نے بے چارگی سے کہا، ''پلیز! ختم کرو اس بات کو۔ میرے لیے آپ کو اپنی حالت سمجھانا ممکن نہیں''۔

فون بند ہونے کے بعد اس نے سوچا کہ وہ ایک ایسے بلند قامت درخت کی مانند ہے جس کا بالائی حصہ تو آسمان کو چھو رہا ہے مگر جڑوں کو دیمک نے کھوکھلا کر دیا ہو۔ ذرا ہوا کا جھونکا آیا، اور وہ ٹوٹ کر نیچے گر گیا، پھر سے جی اٹھنا ممکن نہیں۔ اسے اپنے جیون کے بیتے لمحات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔

....

12دسمبر 1998 کا دن آن پہنچا۔ دوروز بعد بسنت پور میں تقریب کا انعقاد ہونا تھا۔ اگلے دن سے تمام فنکار آنا شروع ہوجائیں گے۔ کمال ان سے رابطہ کر رہا تھا کہ وہ کس گیسٹ ہاؤس یا ہوٹل میں قیام کرنا چاہیں گے۔ گلوکارہ سبینہ یاسمین نے ہوٹل کا نام بتایا جس کا کرایہ واجبی تھا۔ رانی مکرجی کے باپ نے گرینڈ یا تاج میں رہائش کا عندیہ دیا، ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اگر کرایہ زیادہ ہو تو دو کمروں کی بجائے ایک کمرہ ہی مناسب ہوگا۔ کمال کو بتایا گیا کہ متھن چکرورتی نے Peerless ہوٹل میں رہنے کو کہا تھا اور وہ آ بھی چکے ہیں۔ ادھر مینا کا فون آ گیا،'' پلیز! میرے لیے الگ سے انٹرنیٹ لگوادو، سٹوڈنٹس انٹرنیٹ مناسب کام نہیں کر رہا''۔

کمال نے فوراً فیس جمع کرائی۔ تھوڑی دیر بعد مینا نے کنکشن ملنے کی اطلاع دی لیکن ساتھ کمپیوٹر میں خرابی کا بتایا کہ اسے ٹھیک کرانا ہے۔ وہ مینا کے فلیٹ سے جا کر کمپیوٹر لایا، دکاندار کو ٹھیک کرنے کے لیے دیا، واپس پہنچا تو سبینہ یاسمین کے مینیجر کا فون آیا جو بتا رہا تھا کہ میڈم کے ساتھ ان کا بھائی بھی آ رہا ہے، اس کے لیے ریل کے ٹکٹ کا بندوبست کیا جائے۔ ٹکٹ کا بندوبست کیا گیا اور وہ خود متھن سے ملنے اس کے ہوٹل چلا گیا۔ واپسی پر کمال نے مینا کو فون کر کے پوچھا آیا وہ اس کے فلیٹ میں آ سکتا ہے، مگر وہاں سے کورا جواب آ گیا،'' آنے کی کوئی ضرورت نہیں''۔ دل شکستہ کمال نے اپنا ہارمونیم نکالا اور گیت گنگنانے لگا،'' تم بدل گئے ہو، دل کیوں نہیں مانتا''، مگر آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ ہارمونیم کو ایک طرف رکھ کر وہ کھانے کی میز پر جا بیٹھا لیکن کچھ کھا نہ سکا۔ ملازمہ نے سرزنش کی،'' کیا فاقہ کشی سے کچھ حاصل ہوگا؟ اگر آپ مر بھی گئے تو مینا پر کوئی اثر نہیں ہوگا''۔

جواب دینے اور کھانے کی بجائے کمال نے ملازمہ کو ہدایت کی،'' تم کل صبح اس کے فلیٹ جاؤ، صفائی ستھرائی کرو اور اس کے لیے کھانا پکا کر واپس آ جاؤ''۔

'' مجھے وہاں جانے کے لیے مت کہیں، مجھے اچھا نہیں لگتا۔ وہ بدل چکی ہے۔ آپ بھی مت جائیں۔ وہاں تو دوسرے لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ وہ گنجا سا شخص اکثر وہاں جاتا ہے، بلکہ وہ تو یہاں بھی آ کر سارا سارا دن اور بعض اوقات ساری رات یہیں ٹھہرتا تھا۔ لوگ کیا کہیں گے؟؟؟''

کمال نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا،'' تمہیں وہاں زیادہ دیر رکنے کی ضرورت نہیں، کھانا پکا کر واپس چلی آنا''۔

وہ خاموش ہوگئی۔ کمال بھی بستر پر لیٹ گیا مگر نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ صبح اٹھ کر اس نے فنکاروں کی رہائش وغیرہ کا جائزہ لیا۔ واپس آیا تو مینا نے فون پر تقریب کے آغاز کا وقت پوچھا۔ کمال نے بتایا، دس بجے۔ اس پر اس نے کہا کہ اسے ساڑھے نو بجے گاڑی بھیج دے۔

'' ٹھیک ہے گاڑی آ جائے گی لیکن میں تمہیں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اگر تم مجھ سے علیحدگی کا فیصلہ کر چکی ہو تو میرے گاؤں آنے کی ضرورت نہیں''۔

'' ابھی تک میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا''۔

تقریب شروع ہونے سے بہت پہلے کمال نے تمام فنکاروں سے پھر رابطے کرنا چاہے۔ معلوم ہوا کہ متھن شانتی نکتین گیا ہوا ہے، سبینہ یاسمین اور آرتی مکرجی شیڈول کے مطابق پہنچ چکی تھیں، رانی مکرجی کا جہاز اگرچہ وقت پر لینڈ کر گیا تھا اور وہ ہوٹل میں تھی مگر یہی سننے میں آ رہا تھا کہ بس وہ چند منٹ میں کمرے سے نکل رہی ہے، اور گھنٹوں گزرنے کے بعد بھی وہ 'چند منٹ' ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔ پپی لہری کا پتہ چلا کہ وہ ابھی سوئے ہوئے ہیں، ان کے دروازے پر'' ڈونٹ ڈسٹرب'' کا کارڈ

لٹکا ہوا تھا، حالانکہ گذشتہ شب کمال کی اس سے گفتگو ہوئی تھی اور اس نے دس بجے پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔ کمال حیران و پریشان تھا کہ یہ لوگ وقت کی پابندی کیوں نہیں کرتے۔ پونے دس بجے وہ لوگ بھی پہنچ گئے جنہوں نے کمال کے ساتھ مل کر کام کرنا تھا۔

دس بجے قمیص اور پینٹ میں ملبوس مینا بھی آ گئی۔ بہی لہری سب سے آخر میں پہنچا۔ کمال کو اسٹیج پر بلایا گیا، اس نے مینا کو اپنے ساتھ کھڑا کر کے تقریب کے آغاز کا اعلان کیا۔ کمال نے مینا سے شکریہ کے چند کلمات بولنے کو کہا۔ اس نے کہا، ''میں اس گاؤں کی بہو ہوں مگر آپ نے میرے لباس سے اندازہ کر لیا ہوگا کہ میں یہاں نہیں، بلکہ دوسرے دیش میں رہتی ہوں''۔

کمال پریشان ہو گیا۔ وہ سمجھ نہ پایا کہ اس موقع پر اپنے لباس اور دیارِ غیر میں رہائش کے تذکرے کا مقصد کیا ہے۔ ہندوستان کی دو اہم ترین اور مشہور ترین شخصیات یعنی رابندر ناتھ ٹیگور اور مہاتما گاندھی نے کبھی بھی بدیشی لباس نہیں پہنا تھا، وہ ہمیشہ اپنے وطن کا بنایا ہوا کپڑا استعمال کرتے رہے ہیں۔ مینا بول رہی تھی، ''میں ملک سے دور رہتی ہوں، کمال آپ ہی کے ساتھ رہتا ہے، یہ آپ کا اور آپ اس کے ہیں، پلیز! اس کی خیال رکھیے گا''۔

وہاں موجود ہزاروں لوگ اس شخص کی پتنی کو سن رہے تھے جو سب کے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔ انہوں نے مینا سے بہت سوال پوچھے۔ ایک نے پوچھا، ''ہماری بھابھی کے میکے والے کہاں کے ہیں؟''

''جہاں ٹیگور نے وشوا بھارتی قائم کیا تھا''۔

اتنے بڑے مجمع نے یقیناً مینا کو متاثر کیا تھا حالانکہ وہ اس جگہ کالج بنانے کے خلاف تھی۔ باتوں کے دوران اس نے کہا، ''یہاں کالج بنانے کا فائدہ کیا ہے؟ ہزاروں برسوں میں بھی یہ ترقی یافتہ ممالک کے اداروں کی ہمسری نہیں کر پائے گا''۔

یہ سن کر کمال کو بہت دکھ ہوا۔ مینا تاریخ سے بالکل نابلد تھی۔ ہزار برسوں میں تو صورتِ حال مکمل طور پر بدل سکتی ہے۔ ایک زمانے میں تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھارت تمام ملکوں سے آگے تھا، اب جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے امریکہ، مغربی یورپ اور جاپان سبقت لے گئے ہیں۔ اس امر کا امکان ہے کہ مستقبل میں ان کا اپنا وطن ان ممالک سے بازی لے جائے۔ اس کا ایک اور پہلو بھی تو ہے۔ مانا کہ ہمارے تعلیمی ادارے مغرب کے اداروں جیسے نہیں لیکن کم از کم عام لوگوں کے بچے تو انہیں اسکولوں کالجوں میں پڑھتے ہیں، وہ دوسرے ملکوں میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کے جی میں آئی کہ مینا کو کہے، ''اگر ٹیگور نے شانتی نکیتن میں وشوا بھارتی یونیورسٹی قائم نہ کی ہوتی تو تم بی، ایس سی، اور ایم، ایس، سی کیسے کرتیں؟ پی، ایچ، ڈی کرنے اور امریکہ جاپان جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں کے ادارے ناخواندہ اور غیر تعلیم یافتہ عورتوں کو داخلہ نہیں دیتے۔ دیکھ لینا کہ اس ادارے کے فارغ التحصیل طلبا تم سے زیادہ مشہور اور قابل سائنسدان بنیں گے''۔

لیکن یہ باتیں اس عورت کو سنانے کا کیا فائدہ جس پر کوئی دلیل، کوئی منطق اثر نہیں کرتی۔ یہ سوچ کر وہ خاموش رہا۔

اپنی تقریر کے بعد کمال نے کالج کا ایک چکر لگایا۔ قریبی گاؤں کے ایک طالبِ علم نے خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بھی اپنے علاقے میں اسی قسم کا ایک کالج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے کمال سے رہنمائی اور اعانت کی درخواست کی جو اس کے لیے یقیناً باعث مسرت تھا۔ لڑکے کے جانے کے بعد مینا نے کہا، ''تم جب بھی باہر نکلتے ہو، لوگ تمہیں گھیر لیتے ہیں، تم لوگوں کی نگاہوں اور ملاقاتوں کا مرکز بنے رہتے ہو، لہٰذا میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی''۔

کمال نے جواب دیا، ''اگر لوگ سمجھتے ہیں کہ میں ان کی رہنمائی اور مدد کر سکتا ہوں تو اس میں تمہارا نقصان کیا ہے؟''

''تم لوگوں اور ملک کی بھلائی کا سوچتے رہو، میں یہ نہیں کر سکتی، اس لیے میرا راستہ تم سے الگ ہے''۔

کمال نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ لوگوں کے ساتھ رہنے سہنے میں اس کی زندگی تلخ نہیں ہو گی، لیکن وہ اس سے

ستفق نہیں تھی۔ اتنے میں فریدہ نے آ کر مینا کو اپنے ساتھ لیا اور دونوں ایک طرف چل پڑیں۔ جب کمال اگلے فنکار کی آمد کا اعلان کرنے اسٹیج پر گیا تو مینا غائب تھی۔ وہ پریشان کہ مینا کہاں چلی گئی، بھاگم بھاگ گھر آیا تو دیکھا کہ مینا کمال کی ماں کے پاس بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔

....

تقریب ختم ہوتے ہوتے آدھی رات بیت گئی۔ صبح سویرے وہ واپس پہنچے۔ مینا نے کمال سے کہا کہ اسے فلیٹ پر اتار دیا جائے مگر اس کا کہنا تھا کہ اس وقت کھانا وغیرہ نہیں ملے گا، کملا نے کچھ پکایا ہوگا، اس لیے غسل اور کھانے کے بعد چلی جائے۔ گھر آ کے مینا نے پوچھا کہ غسل کے لیے کون سے کپڑے پہنے۔ کمال نے اسے پاجامہ اور کرتہ دیا جسے دیکھ کر وہ طیش میں آ گئی، ''کیا میں یہ گھٹیا اور گندے کپڑے پہنوں گی؟''

کمال نے آرام سے کہا، ''جن کپڑوں کو تم گھٹیا کہہ رہی ہو، یہ بالکل نئے، سو فیصد سوتی اور ایکسپورٹ کوالٹی کے ہیں۔ میں نے ابھی انہیں پلاسٹک پیکٹ سے نکالا ہے۔ یہ کرتے ان ملکوں کو بھیجے جاتے ہیں تم جن پر فخر کرتی ہو۔ جس گندگی کی تم بات کرتی ہو وہ کپڑوں میں نہیں، تمہارے دماغ میں ہے۔ چلو آؤ، میں تمہیں فلیٹ پر چھوڑ آؤں، وہ صاف ستھرا ہوگا''۔

بادلِ نخواستہ مینا نے کپڑے لیے، غسل کر کے کھانا کھایا اور لیٹ گئی۔ کمال تھوڑی دیر بعد دفتر چلا گیا، شام کو واپس آیا تو مینا کو اس کے فلیٹ بھیج دیا۔ خود تھکا ماندہ لیٹ گیا۔ صبح ذرا دیر سے اٹھا۔ کملا کو کہا کہ مینا کے لیے بھی کوئی چیز تیار کر دے۔ اخبارات دیکھے تو سبھی کالج کی تعمیر، افتتاح اور مینا اور کمال کی تصویروں سے بھرے پڑے تھے۔ اس نے نہا دھو کر کھانا اور اخبارات اٹھائے اور مینا کے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اس گمان میں تھا کہ دونوں مل کر ناشتہ کریں گے مگر اس نے تھوڑا سا کھانا لے کر باقی ایک طرف رکھ دیا۔ کمال سے اتنا بھی نہ پوچھا کہ آیا اس نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں، وہ بھی خاموش رہا۔ پھر اس نے اخبارات دکھائے لیکن وہ دیکھتے ہی چراغ پا ہو گئی، ''کیا تصویریں چھاپنے کے لیے انہیں اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی؟'' اور پھر سارے اخبارات کمال کے منہ پر دے مارے، ''انہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤ''۔ اس بے چارے نے اخبارات اٹھائے اور دفتر کو چل دیا۔

....

شام کو دیا پریا کا فون آیا، ''مسٹر منڈل! آپ مجھے سچ بات نہیں بتا رہے۔ خواہ مخواہ آئیں بائیں شائیں کر رہے ہیں۔ مینا نے مجھے بالکل مختلف بات بتائی ہے''۔

''اس نے کیا کہا ہے؟''

''آپ نے مجھے یہ کہا تھا کہ وہ باہر اس لیے رہنا چاہتی ہے کہ وہاں ریسرچ کی زیادہ سہولتیں میسر ہیں، لیکن اس کا کہنا ہے کہ وہاں وہ ایک شخص سے محبت کرتی ہے۔ عشق کی یہ داستان امریکہ سے شروع ہوئی تھی۔ صرف یہی نہیں، یہاں رہتے ہوئے بھی کئی مردوں کے ساتھ اس کے جسمانی تعلقات تھے، حتیٰ کہ اپنے پی، ایچ، ڈی کے گائیڈ سے بھی وہ ملوث رہی تھی حالانکہ وہ عمر میں مینا کے باپ سے بھی کافی بڑا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ساری باتیں تمہارے علم میں ہیں۔ اگر ان باتوں میں حقیقت ہے تو آپ کس طرح اس قسم کی عورت کے ساتھ رشتہ رکھے ہوئے ہیں؟ اگر وہ اپنی مرضی سے جا رہی ہے تو آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ایک لعنت دور ہو رہی ہے؟ دوسری صورت میں آپ خود پر ظلم کریں گے''۔

کمال کچھ نہ کہہ سکا۔ فون منقطع کر کے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد کمشنر نے اسے اپنے دفتر بلایا۔ وہاں پہنچا تو کمشنر نے کہا، ''مجھے مسز منڈل کا فون آیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک سمجھدار عورت ایسے کام کرنے کے علاوہ اس طرح کی

باتیں بھی کر سکتی ہے۔ مجھے تو بہت دکھ ہوا ہے، اور تمہاری حالت پر افسوس بھی ہے۔ اس کی بہن اور ماتا پتا کے لیے تم نے ویلور جانے کی مجھ سے رخصت لی، تم اسپتال میں رہے اور پھر انہیں اپنے گھر لے آئے۔ کہیں نہ کہیں تو معاملات میں گڑ بڑ ہوئی تھی''۔

یہ سن کر کمال نے نہ صرف سبکی محسوس کی بلکہ اسے دکھ بھی ہوا، شرم سے سر جھکائے واپس اپنے کمرے میں آ کر مینا کو فون کیا، ''تم یہ باتیں دوسروں کو کیوں بتا رہی ہو؟ اپنے بارے میں سکینڈل اچھال کر تم کیا حاصل کرنا چاہتی ہو؟ کیا تم یہ سب کچھ میرے احساسات اور جذبات گھائل کرنے کے لیے کر رہی ہو؟''

''نہیں، میں کوشش کے باوجود تمہیں سمجھا نہیں سکی کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ جن لوگوں سے میں نے باتیں کی ہیں وہ تمہیں جانتے ہیں، شاید وہی لوگ تمہیں سمجھائیں''۔

''اچھا مجھے بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟ میں کیا کروں؟ مگر یہ سکینڈل مت پھیلاؤ، یہ باتیں تمہارے لیے سودمند نہیں''۔

''مجھے چھوڑ دو''۔

کمال کچھ نہ کہہ سکا لیکن یہ واضح تھا کہ لوگوں کو اپنے جسمانی تعلقات کے بارے میں بتانے کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ الگ ہونے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ انہی سوچوں میں تھا کہ انسٹیٹیوٹ سے سہاس بوس کا فون آیا، ''کیا آپ کو علم ہے کہ ڈائریکٹر کو مینا کے سکینڈلوں سے متعلق ایک گمنام خط ملا ہے؟''

''کون بھیج سکتا ہے؟''

''اسے آپ پر شبہ ہے''۔

کمال سمجھ نہ پایا کہ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ غالباً مینا نے خود ہی خط لکھ کر سب کو بتایا ہے کہ اس کے متعدد مردوں سے جسمانی تعلقات ہیں تا کہ کمال اسے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور نہ کرے، یعنی اسے یہاں سے جانے کا بہانہ مل جائے۔ انہی باتوں کے مدِنظر اس نے دینا پر یا اور اس کے کمشنر کو بھی خود ہی بتایا تھا۔ کیا وہ اتنی چلتر عورت ہے؟ اگر وہ اس حد تک آ گئی ہے تو یہاں نہیں رکے گی، بہر طور کمال نے اسے فون کر کے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ اس کا جواب بڑا مختصر تھا، ''تا کہ تم مجھے چھوڑ دو''۔

چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کا ابھی تک اس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اگلے روز وہ پھر ملازمہ کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا لے گیا۔ مینا نے ایک رکابی میں ڈال کر کھانا شروع کر دیا۔ کھاتے کھاتے ہاتھ روک کر کمال سے کہا، ''تم کل کھانا لائے تھے، میں نے تمہیں پوچھے بغیر کھا لیا۔ آج بھی تم لائے ہو اور میں اکیلی کھا رہی ہوں۔ میں تم سے بالکل نہیں پوچھوں گی کہ تم نے کھایا ہے یا نہیں، یہ میرا کام نہیں۔ چند روز یہی کچھ کرتے رہو، خود بخود مایوس ہو جاؤ گے''۔

وہ چپ چاپ اٹھا، کھانے کے برتن لیے اور گھر آ گیا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کیا لوگ اس حد تک بھی کٹھور اور برے ہوتے ہیں۔ دفتر میں کام پر توجہ نہ دے سکا۔ ذہن بار بار بھٹک رہا تھا، کیا مینا دیکھنا چاہتی ہے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے؟ چلیں، یہ بھی کر کے دیکھ لینا چاہیے۔ اس نے کمشنر سے رخصت لی اور مینا کے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کار میں بیٹھے ہوئے اس کے دماغ میں بلاوجہ ایک رنگین تصویر بن گئی۔ تصور میں وہ مینا سے گفتگو کر رہا تھا، ''میں اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا کہ تم میری پتنی ہو۔ تم نے اپنی رضامندی سے شادی کی تھی۔ میں برسوں سے تمہاری آمد کا منتظر تھا۔ مجھے تم سے شدید پریم ہے، میں جانتا ہوں تم بھی مجھے چاہتی ہو، تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی ہو، میرے ساتھ رہنا ہوگا''۔ خیالوں میں کمال نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اسے یوں لگا کہ مینا کہہ رہی ہو، ''بس مجھے بھی اسی چیز کی طلب تھی، میری شدت سے خواہش ہے کہ تم مجھے ٹوٹ کو پیار کرو، مجھ پر اپنا حق جتاؤ۔ تم نے اتنا کچھ کیا ہے میرے لیے، میں تمہاری ہوں، میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟ تم میرے پتی ہو، میں تمہیں وچن دیتی ہوں کہ کبھی تم سے جدا نہیں ہوں گی، میرا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہے''۔

جاگتی آنکھوں سپنا اس وقت ختم ہوا جب گاڑی فلیٹ کے نیچے پہنچ گئی۔ گاڑی سے اتر کر اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ مینا نے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی کمال نے اس کا ہاتھ تھاما اور کہا،"میں تمہیں لینے آیا ہوں"۔

"کہاں؟"

"اپنے گھر"۔

"میں نہیں جاؤں گی"۔

"پھر میں یہیں رہوں گا"۔

"اگر تم نے مجھے تنگ کیا تو میں فی الفور جاپان چلی جاؤں گی"۔

"میں بھی تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا"۔

"رہو گے کہاں؟"

"تمہارے ساتھ"۔

"میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گی"۔

"جو چاہو، کرنا"۔

"میرا ہاتھ چھوڑو"۔

"میرے ساتھ چلو"۔

"میں بالکل نہیں جاؤں گی چاہو تم مجھے جان سے مار دو"۔

وہ ششدر رہ گیا۔ سندر سپنا کرچی کرچی ہوگیا۔ اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ مینا نے فون ملایا،"سمیت، فوراً یہاں آؤ"۔ اس کے پہنچنے پر مینا نے اسے چلنے کو کہا۔ بیچارہ کمال اس حقیقت کو نہ سمجھ سکا کہ جب رشتے ٹوٹتے ہیں تو باقی کچھ نہیں بچتا۔ وہ گاڑی میں آ بیٹھا۔ سمیت اور مینا بھی بیٹھ گئے۔ گاڑی پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچی۔ سب لوگ نیچے اترے۔ مینا اور سمیت کمال کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے، خود کمال اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مینا نے حقارت سے کہا،"یہ گنجا آدمی یہاں آ گیا ہے، تم اسے گولی نہیں مار سکتے ہو؟ کیا تم مرد ہو؟"

کمال نے ان کے لیے چائے بنوائی۔ پھر سمیت نے اجازت چاہی۔ مینا بولی کہ وہ بھی اس کے ساتھ جائے گی۔ کمال صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ لیکن وہ سمیت کے ساتھ نہیں گئی۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگی،"آؤ، نیچے چلیں۔ میں تمہارے کمشنر سے ملنا چاہتی ہوں"۔ کمال اسے ساتھ لے گیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد اس نے کمشنر کو مخاطب کیا،"پلیز! کمال کو سمجھائیں۔ وہ اپنا کام کرنے کی بجائے مجھے تنگ کر رہا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ نہ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہوا ہے۔ اسے سمجھائیں کہ مجھے تنگ نہ کرے"۔

کمشنر نے مینا سے کہا،"ممکن ہے تم دونوں کی آپس میں کوئی غلط فہمی ہو۔ اتنی جلدی حتمی فیصلہ کرنے سے گریز کرو"۔

"مگر میرا فیصلہ اٹل ہے۔ آپ کمال کو سمجھائیں"۔

کمشنر بے بسی سے اسے دیکھنے لگا، اور پھر دونوں وہاں سے اٹھ کر باہر آ گئے۔ کمال کو یقین ہو گیا کہ جتنا زیادہ مینا کو سمجھائے گا، اسی حساب سے اس کی اپنی عزت مٹی میں ملتی جائے گی۔ وہ اپنے ناجائز تعلقات کا ڈھنڈورا پیٹنے سے باز نہیں آئے گی۔ وہ بار بار سوچتا، ایسی باتیں کر کے کیا مینا خود اپنی تذلیل نہیں کرا رہی؟ اب اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا، لہٰذا اس نے مینا کو طلاق کے کاغذات تیار کرا [illegible] مینا کے پاس گیا، اس نے طلاق نامے پر دستخط کیے لیکن، خود کمال نے دستخط نہ

کیے۔ شام کو پھر مینا کے پاس گیا اور اسے طلاق نامہ پھاڑنے کو کہا۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی، ''میں نے تو دستخط کر دیے ہیں۔ تم بھی دستخط کرو اور انہیں عدالت میں پیش کر دو''۔

''مجھ میں اتنی ہمت نہیں''۔

''وہ تمہارا مسئلہ ہے''۔

''جب تک میرے دستخط نہیں ہوں گے، تمہیں طلاق نہیں ہو سکتی''۔

مینا استہزاء سے بولی، ''مجھے کوئی پروا نہیں، میں طلاق کے پیچھے نہیں پھر رہی۔ ڈیڑھ سال میں میکو کے ساتھ رہی ہوں، پھر کیا ہوا؟''

وہ کاغذات لیے واپس آ گیا۔ دو دن بعد اس کا سسر چھوٹی بیٹی رینا کے ساتھ کمال کے گھر آیا۔ رینا ایک امتحان کے لیے آئی تھی۔ ڈاکٹر حسین نے اسے کمرۂ امتحان میں چھوڑا اور خود مینا کے گھر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد کمال بھی وہاں جا پہنچا۔ ڈاکٹر حسین اس سے کہنے لگا، ''میں اب کیا کر سکتا ہوں؟ تمہارا نہ ذاتی گھر، نہ گاڑی، اور اوپر سے ساری رائلٹی اور انعامی رقم تم نے کالج کی تعمیر میں دے دی''۔ کمال خاموش رہا۔ مینا نے مشورہ دیا، ''تم رینا سے شادی کر لو۔ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہو''۔ یہ سن کر کمال کو دکھ ہوا کہ آیا وہ اس حد تک گر چکا ہے کہ مینا جو چاہے کہتی رہے؟ اس نے جواب دیا، ''میں رینا سے شادی کروں یا نہ کروں، یہ ایک مختلف بات ہے، اور اگر تم نے مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ایسے مشورے دینے کا بھی تمہیں کوئی حق نہیں۔ بس یہ بتاؤ اپنے متعلق کیا کہنا چاہتی ہو''۔

''میں نے طلاق کے کاغذات پر دستخط کر دیے ہوئے ہیں''۔

باقی بات کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کمال بخوبی سمجھ گیا کہ وہ آگے کیا کہے گی اس لیے گفتگو کو طول دینے کی بجائے اس نے وہاں سے واپس آنا بہتر جانا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب تکلیف اور دکھ برداشت کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا، جتنا زیادہ مصالحت کی کوشش کرے گا، اتنا ہی ذلیل ہوتا جائے گا۔ یک طرفہ تعلقات کبھی بھی دیر پا ثابت نہیں ہوتے۔

اگلی صبح مینا کا فون آیا کہ وہ اس سے ایک بار ملنا چاہتی ہے۔ کمال نے وجہ پوچھی تو جواب ملا کہ ملاقات کے وقت ہی بتائے گی۔ کمال نے روکھے پن سے جواب دیا، ''جب تم فیصلہ کر چکی ہو کہ میکو کی خاطر مجھے چھوڑ دو گی تو اب ملاقات کی کیا ضرورت ہے''۔

بڑا عجیب جواب ملا، ''علیحدگی کے بعد بھی میں تم سے ملتی رہوں گی، تمہارے پاس آ کر رہا کروں گی''۔

''تم اپنی مرضی سے چھوڑ کر جا رہی ہو۔ تمہارے لیے شاید یہ خوشی کی بات ہو مگر میرے لیے تکلیف دہ ہے، لہٰذا اب تم سے کسی قسم کا تعلق مجھے دکھ دے گا۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ تمہیں میری کیفیت کا اندازہ نہیں، اگر تمہیں ذرا بھر بھی خیال ہوتا تو مجھے اس قسم کی ظالمانہ تجویز نہ دیتیں۔ بہت سے ایسے خوش قسمت لوگ ہیں جو دکھ درد کا احساس نہیں کرتے، تم بھی ویسی ہی ہو۔ خیر! بتاؤ، کب ملنا چاہتی ہو؟''

''فوراً''۔

''کیا میں آؤں یا تم؟''

''میں آؤں گی، مجھے گاڑی بھیج دو''۔

کمال نے گاڑی بھیج دی۔ تھوڑی دیر بعد مینا آ گئی۔ اس نے وہی ساڑھی پہن رکھی تھی جو کمال نے اسے تحفتہً دی تھی۔ اس نے کمال کے پاؤں چھوئے اور کہنے لگی، ''میں آج ملازمت کا آغاز کر رہی ہوں۔ میں جہاں کہیں بھی گئی، تمہاری اشیر

باد میرے ساتھ تھی۔ اس وقت بھی تمہاری اشیرباد چاہیے تاکہ میں دل جمعی سے اپنا کام کروں''۔

کمال اس کے رویّے کو بالکل نہ سمجھ سکا۔ مینا کی بات سن کر وہ جذبات سے مغلوب ہوگیا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ سائنسدان بنے، مگر نہ بن سکا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس نے مینا پر محنت کی اگرچہ اپنی عائلی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ آج وہ بحیثیت سائنسدان ملازمت کا آغاز کررہی تھی۔ یہ کمال کی زندگی کا سب سے اہم اور شاندار دن تھا۔ وہ انتہائی خوش تھا مگر اسے اپنی بانہوں میں نہ لے سکا، بلکہ اسے چھونے سے بھی گریز کیا۔ صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی۔ بہرطور، اس نے لباس بدلا اور مینا کو لے کر انسٹیٹیوٹ روانہ ہوگیا۔ فارغ ہوکر وہ فلیٹ میں چلے گئے۔ بالکونی میں کھڑے ہوکر مینا کہنے لگی، ''پلیز! یہ نہ سمجھنا کہ میں محض تمہاری اشیرباد کے لیے تمہارے پاس آئی تھی، میں واپس تمہارے پاس ہی آؤں گی''۔

''واپس کیوں نہیں آؤ گی؟ تمہارے دل میں میرے لیے اب بھی محبت ہے ورنہ میرے پاؤں چھونے نہ آتیں''۔

''بالکل، میرے دل میں تمہارے لیے جگہ ہے۔ تمہاری وجہ ہی سے میں آج اس مقام پر پہنچی ہوں، لیکن اس کے باوجود میں تمہیں اپنا پتی نہیں مان سکتی۔ میرے دل میں جو کشش میکو کے لیے ہے، تمہارے لیے نہیں''۔

''تمہیں اندازہ ہی نہیں یہ سب کچھ کتنا تکلیف دہ ہے''۔

''میں جانتی ہوں، تمہاری حالت کا مجھے اندازہ ہے، تم مجھے ہمیشہ کے لیے کھو رہے ہو۔ میری حالت بھی زیادہ اچھی نہیں۔ میرا نام بدل جائے گا، میں معصومہ میاموتو کہلاؤں گی''۔

''کوئی تمہیں مجبور نہیں کررہا''۔

''لیکن میرے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں۔ میں اس کے ساتھ وعدہ کرچکی ہوں''۔

کمال کے دل میں آئی کہ اسے کہے، ''وعدہ تو تم نے میرے ساتھ بھی کیا تھا''، لیکن کہہ نہ سکا، کوئی فائدہ ہی نہیں۔ مینا کہہ رہی تھی، ''مجھے فائدہ ہی ہوگا، میں جاپانی شہری بن جاؤں گی۔ ہر قسم کی معلومات تک رسائی ہونے سے بہتر طور پر کام کر سکوں گی''۔

کمال کو ٹیگور کی ایک کہانی یاد آگئی جس میں ہیروئن محض یہ ثابت کرنے کے لیے مرجاتی ہے کہ وہ زندہ ہے۔ مینا بھی صرف اس لیے جاپانی شہری بننے کی خواہشمند ہے کہ بصورتِ دیگر وہ جاپانی نہیں کہلا پائے گی۔ وہ جیئے اور مرے گی مگر غیر جاپانیوں کی طرح۔ لیکن کمال یہ سب کچھ اسے نہ کہہ سکا۔ ادھر وہ کہہ رہی تھی، ''تم کسی اچھی لڑکی سے شادی کرلو۔ فریدہ کو پتنی بنالو، وہ بہت سندر ہے، اس کا بیٹا تم سے پریم کرتا ہے، وہ بھی تمہیں بہت پسند کرتی ہے، تم دونوں خوش باش رہو گے''۔

''میری اپنی پتنی ہے، فریدہ بھی شادی شدہ ہے، کیوں ایسی باتیں کرتی ہو؟ فریدہ کی بات کرتے ہوئے کیا تمہاری آنکھوں کے سامنے اس کے پتی اور بیٹے کا چہرہ نہیں آیا؟ بہرحال، تمہیں یہ سب کچھ کہنا بے سود ہے۔ اب تمہیں سوائے میکو اور کچھ سوجھتا نہیں۔ اس کے بھی تو بیوی بچے ہیں، ادھر تمہارا پتی سامنے کھڑا ہے، اس کے باوجود تمہیں اس کے ساتھ بار بار شب بسری کرنے میں عار محسوس نہیں ہوئی۔ کیا مجھے اکیلے دیکھ کر تمہیں قلق نہیں ہوتا؟''

''ہے تو سہی''۔

''اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ مجھے ہلاک کردو''۔

''اس صورت میں ہمارے تعلقات پر لعن طعن ہوتی رہے گی۔ اگر تم شادی کرلو، خوش باش رہو تو اچھا ہوگا''۔

''یہ تو مگرمچھ کے آنسو بہانے والی بات ہے۔ اپنی ذات کا سوچو۔ جسے تم بے خطا چھوڑے جارہی ہو اسے جیون گزارنے کی راہیں مت سجھاؤ''

وہ نزدیک ہوکر کہنے لگی، ''تمہیں چھوڑتے ہوئے مجھے افسوس ہو رہا ہے، تم بہت شفیق، ذمہ دار اور ہمدرد پتی ہو''۔

کمال سمجھ نہ پایا کہ بینا دل سے کہہ رہی ہے یا اوپر اوپر سے۔ کیا ایک بیوی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا خاوند ہمدرد، ذمہ دار اور محبت کرنے والا ہے، اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے؟ انہی سوچوں اور ذہنی کشمکش میں گم وہ گھر پلٹ آیا، لیکن اس کے باوجود اس نے بینا سے قطع تعلق نہ کیا۔ اس نے مجوزہ گھر کا نقشہ لیا اور بینا کو ساتھ لے کر ٹھیکیدار کے پاس چلا گیا۔ کمال نے ایسا کیوں کیا، خود بھی سمجھ نہ پایا۔ کیا بینا کے پاؤں چھونے کی وجہ سے وہ جذباتی ہو گیا تھا ورنہ بار بار ذلیل ہونے کی تُک کیا تھی؟ وہ کمال کے ساتھ چلی تو گئی مگر ٹھیکیدار سے کوئی بات نہیں کی۔ واپسی پر وہ بادلِ نخواستہ کمال کے ساتھ گھر آئی۔

آتے ہوئے کمال نے ایک کیک خریدا، کملا کو کھانا تیار کرنے کو کہا اور خود کیک کاٹنے لگا۔ بینا نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا، ''نو بج رہے ہیں، مجھے اب گھر چلنا چاہیے۔ اس کا فون آنے پر اگر میں گھر پر نہ ہوئی تو خواہ مخواہ کی غلط فہمی پیدا ہو جائے گی''۔

''تم اس کے پاس ہمیشہ کے لیے جا رہی ہو مگر یہ کیسا نازک تعلق ہے کہ اگر ایک بار تم فون پر نہ ملیں تو اسے غلط فہمی ہو جائے گی''۔

''تم چاہتے ہو کہ مجھے یہاں مصروف رکھو تا کہ میرے بارے میں اس کے دل میں وسوسے آئیں''۔

کمال نے کیک پیک کر کے اسے دیا اور ڈرائیور کو بلا کر اسے گھر چھوڑنے کو کہا۔

....

اگلے دن امیت مکرجی نے اسے فون کیا اور کہا، ''میں نئی نئی باتیں سن رہا ہوں، اس سلسلہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں، کیا تم میرے پاس آ سکتے ہو؟'' یہ وہی امیت تھا جس نے امریکہ قیام کے دوران بینا کے وظیفہ کا بندوبست کیا تھا۔ کمال اس کے پاس گیا۔ وہ کہنے لگا، ''یہ بات بالکل غیر مناسب سی تھی اس لیے میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔ بینا کی حرکات وہاں بھی قابلِ اعتراض تھیں۔ میں نے اسے سمجھایا تھا مگر وہ الٹا مجھ سے ناراض ہو گئی''۔

کمال دھیرے سے بولا، ''اب وہ باتیں دہرانا بے سود ہے۔ میں ابھی بھی اسے کھونا نہیں چاہتا''۔

''چلو، ٹھیک ہے، میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا''۔

کمال وہاں سے نکلا تو راستے میں بینا کے فلیٹ چلا گیا۔ وہ دروازہ کھولتے ہی آگ بگولہ ہو گئی، ''میں نے تمہیں کہا تھا کہ آنے سے پہلے مجھے فون کرنا۔ کیا تمہیں اپنی عزت کا بھی کوئی خیال نہیں؟ بدتہذیب! میں اس وقت مصروف ہوں، تم سے بات کرنے کی فرصت نہیں''۔ اتنا کہہ کر اس نے زور سے دروازہ بند کر لیا۔ کمال نے اپنی توہین محسوس کی۔ گھر آ کر اس نے بینا کو فون کیا۔ اس نے فون اٹھایا تو سمیت کو کچھ کہتے سنا۔ کمال نے فون تو کر لیا مگر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ بینا سے کیا کہے۔ بمشکل اتنا بولا، ''تم سمیت کی وجہ سے مصروف تھیں اور مجھے اسی وجہ سے نکالا تھا''۔

''سمیت مجھ سے چھوٹا ہے، تم کیوں الٹی سیدھی باتیں سوچ رہے ہو؟''

''تمہارے خیال میں مجھے بالکل نہیں سوچنا چاہیے؟''

اس نے جواب دیئے بغیر منقطع کر دیا۔ کچھ دیر بعد مسز فوزیہ عالم کا فون آیا جو ڈھاکا میں سائنسدان اور اس کا خاوند ایک کالج کا پرنسپل تھا۔ ماں کی طرف سے وہ بینا کا رشتہ دار بھی تھا۔ جب وہ ڈھاکا گئے تھے ان کے گھر قیام کیا تھا۔ وہ پوچھ رہی تھی، ''کمال بھائی، بسواروپ نے جو بتایا ہے کیا درست ہے؟'' کمال نے مختصراً ساری بات بتا دی۔ شام کو اس نے پھر فون کیا، ''میں بینا کے گھر گئی تھی۔ امید تو ہے کہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ میں کل پھر جاؤں گی۔ ہو سکتا ہے وہاں سے میں آپ کو فون کر کے بلاؤں''۔ کمال کو یقین نہیں آیا کیونکہ اس کے خیال میں سب دروازے بند ہو چکے تھے۔ بہر حال، اس نے

آنے کا وعدہ کر لیا۔

اگلے روز کوئی دس بجے کے قریب فون سن کر کمال وہاں پہنچا۔ مسز عالم کے علاوہ اس کا خاوند، مسٹر اور مسز باسک اور ان کی بیٹی بھی وہاں موجود تھے۔ اس کو دیکھتے ہی مینا آتش پا ہو گئی، ''میری زندگی کے چودہ برس ضائع ہوئے ہیں، باقی کا جیون بھی یونہی گزر جائے گا''، یہ کہتے ہوئے اس نے میز پر سر مارنا چاہا، کمال نے منع کیا تو وہ انتہائی درشتی سے بولی، ''مجھے ہاتھ مت لگانا، میں تم سے نفرت کرتی ہوں''۔

کمال کو کچھ سجھائی نہ دیا کہ آخر وہ مینا کو لے جانے آیا ہی کیوں تھا؟ وہ اسی حیص بیص میں تھا کہ مینا کمرے سے باہر آ گئی۔ کمال نے پوچھا، ''کہاں کا ارادہ ہے؟''

''تمہارے گھر''۔

''کب تک رہو گی؟''

''اپنے مرنے تک''۔

اور پھر اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ روتے روتے وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ راستے میں اس کا رونا دھونا تو ختم ہو گیا لیکن جیسے ہی گھر پہنچے، وہ پھر آنسو بہانے لگی۔ باقی لوگ بھی پہنچ گئے۔ کملا مینا سے باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں پروفیسر دیباشش بینرجی بھی آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد کمشنر نے کمال کو بلایا، ''میں نے تمہاری پتنی کو فون کیا تھا، غالباً اس کی طبیعت ناساز ہے، کبھی روتی ہے، کبھی ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اس سے اپنے تعلقات کا بار بار ذکر مت کرو کہیں وہ ذہنی توازن نہ کھو بیٹھے۔ اس وقت اسے ہمدردی کی ضرورت ہے۔ جاؤ، اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرو''۔

واپس گھر آ کر اس نے دیکھا، مینا اور پروفیسر بینرجی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کمال بھی ان کے پاس جا بیٹھا۔ مینا اسے کہنے لگی، ''تم میری بات تو سنتے سمجھتے نہیں ہو، کم از کم پروفیسر صاحب کی بات سے تو انکار نہیں کرو گے''۔ پروفیسر صاحب نے کمال کو مخاطب کیا، ''جب یہ وہاں خود کو زیادہ خوش سمجھتی ہے تو اسے جانے دو''۔

''مجھے اس کے وہاں جانے پر اعتراض نہیں۔ مگر میں انتظار کرتا رہوں گا''۔

''کب تک؟''

''جب یہ آپ کہے کہ میں واپس آنا چاہتی ہوں، چاہے سارا جیون بیت جائے''۔

''اور اگر وہ ایسا نہ کہے تو؟''

''میں پھر بھی اس کا منتظر رہوں گا''۔

''ایسے تعلقات کی وجہ سے تم دونوں میں کوئی بھی خوش نہیں رہ پائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اسے جانے دو''۔

مینا بول اٹھی، ''دیکھو کمال! پروفیسر صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اور میں یہ بات بار بار کہہ چکی ہوں کہ میں وہاں زیادہ خوش رہوں گی، لیکن تمہاری ایک ہی رٹ ہے، مت جاؤ، مت جاؤ''۔

دل شکستہ کمال کہنے لگا، ''ہاں! مجھ سے خطا ہو گئی تھی۔ تم چلی جاؤ''۔ اتنا کہہ کر وہ باتھ روم چلا گیا۔ مینا اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ جب وہ باہر آیا تو مینا کو یہ کہتے سنا، ''اس نے مجھ سے کبھی بھی محبت نہیں کی، ہمیشہ نظر انداز کرتا رہا ہے''۔

پروفیسر صاحب نے حیرت سے کہا، ''تم نے تو آج تک کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ کیا کبھی کسی سے بات کی تھی؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا یہ اپنے آپ کو بدل لے گا؟ میں وہی کر رہی ہوں جو میرے لیے بہتر ہے''۔

''ٹھیک ہے تم اپنے لیے بہتر فیصلہ کر رہی ہو مگر تمہاری عدم موجودگی میں یہ شخص تمہارا انتظار کرتا رہا ہے، تم جانتی بھی

تھیں، اس میں تمہاری رضا بھی شامل تھی۔ تم نے اسے اپنی واپسی کا یقین دلایا تھا۔ اگر اس کے ساتھ رہنا نہیں تھا تو کیا تم نے ایک بار بھی اسے بتانا گوارا کیا؟ کیا اسے ایک موقع نہیں ملنا چاہیے تھا؟''

یہ سنتے ہی وہ ہتھے سے اکھڑ گئی، ''ہاں، ہاں، آپ کو تو اس کی حمایت کرنا ہی چاہیے کیونکہ اس کے دوست ہو، میرے نہیں''۔

کمال نے مینا کو مخاطب کر کے کہا، ''جب تک پروفیسر صاحب تمہارے مطلب کی بات کرتے رہے، یہ ٹھیک تھے، اور جیسے ہی کوئی بات تمہیں پسند نہیں آئی، یہ ناانصاف ہو گئے''۔

مینا تلخی سے بولی، ''بکواس بند کرو۔ مجھے تم سے نفرت ہے، تم پرلے درجے کے جھوٹے ہو''۔

اس کے الفاظ نہیں تھے، ایک برچھی تھی جو سیدھی کمال کے دل کو جا لگی۔ اسے سمجھ میں نہ آیا آخر وہ کیوں اپنی اتنی تذلیل برداشت کر رہا ہے۔ اس کے افسرانِ بالا نے بھی کبھی اس ہتک آمیز انداز میں اس سے بات نہیں کی تھی۔ مینا کی ساری باتیں اس لیے برداشت کر رہا تھا کیونکہ اس سے شدید محبت تھی۔ کیا محبت انسان کو اتنا مجبور اور لاچار کر دیتی ہے؟ بے چارگی اور شکست خوردہ لہجے میں پوچھا، ''کیا چاہتی ہو؟''

''میں فوراً تم سے آزاد ہونا چاہتی ہوں''۔

''چلو! اٹھو چلتے ہیں''۔

مینا چلنے ہی والی تھی کہ کمال نے اسے کھانے کے لیے کہا۔ کھانے کے بعد دونوں چل دیے۔

اگلے روز مینا نے پروفیسر بینر جی کو بلایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ آ گئے۔ دونوں کی بات چیت ختم ہوئی تو پروفیسر صاحب نے آ کر کمال کو بتایا کہ مینا فی الحال طلاق نہیں چاہتی، وہ حتمی فیصلے کے لیے ایک ہفتہ کی مہلت مانگ رہی ہے۔

''وہ پہلے بھی کئی بار ایسی باتیں کر چکی ہے''۔

''چونکہ اب اس نے مجھ سے کہا ہے اس لیے ہفتہ بھر کی مہلت دے دو''، کمال مان گیا۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد پروفیسر صاحب نے فون پر بتایا کہ مینا چند روز اور مانگ رہی ہے۔ کمال پھر مان گیا۔ فون منقطع ہوتے ہی فریدہ کی کال آئی، ''میں مینا کے گھر گئی تھی، کافی باتیں ہوئیں، واپس آنے لگی تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ کمال کا خیال رکھنا۔ میں نے پوچھا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ یہی کر سکتے ہیں نا کہ اسے بار بار فون کریں، اور جب وہ کہہ دے کہ کہانی ختم، تو ختم۔ اس پر وہ کچھ نہ بول سکی۔ مجھے یقین ہے وہ اب بھی تم سے پریم کرتی ہے''۔

''ہو سکتا ہے''۔

''تم بھی اس سے پریم کرتے ہو، پھر سمجھ میں نہیں آتا مسئلہ کیا ہے؟''

''ہو سکتا ہے اسے مجھ سے پریم ہو، مگر میں اس سے محبت نہیں کرتا''۔

''میں نے تمہیں اس کے لیے آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ شیر کی آنکھوں میں آنسو پہلی بار دیکھے تھے''۔

فوراً بعد لینا کا فون آ گیا جو کہہ رہی تھی، ''کل مجھے آپ پر بہت ترس آیا۔ آپ کی آنکھوں میں پہلے والی چمک نہیں تھی۔ آپ عام لوگوں کی طرح نظر آ رہے تھے، بالکل میری طرح، کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا وہ کیوں آپ کو چھوڑنے پر تلی ہوئی ہے۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو پانی پر دم جھاڑا کروا کر آپ پر چھڑکتی''۔

کمال نے طیش میں آ کر مینا کو فون کیا۔ اس کی ایک ہی بات تھی، کچھ وقت چاہیے۔

''کتنا وقت چاہیے؟ جاپان سے واپس آنے تک؟''

''فی الحال میں کچھ نہیں بتا سکتی''۔

''بس اتنا کہہ دو کہ تم واپس آنے کی کوشش کرو گی''۔

''میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی''۔

''پھر مجھے کیا پڑی ہے کہ تمہارے جاپان سے واپس آنے کا انتظار کروں؟''

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی''۔

کمال سارا پلان سمجھ گیا کہ وہ اپنے جاپان سے واپس آنے تک اسے بے یقینی کی کیفیت میں رکھنا چاہتی ہے۔ اور پھر اس نے طلاق کے کاغذات پر دستخط کر کے وکیل کو دے دیے۔ اگلے روز اسے مینا کا فون آیا جو پوچھ رہی تھی آیا اس نے واقعی دستخط کر دیے ہیں؟ کمال نے ہاں میں جواب دیا جس پر اس نے پھر پوچھا، ''کیا اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے؟''

''اب مزید سوچنے کو کیا رہ گیا ہے؟ قربانی والے جانور کی اپنی مرضی کیا ہوتی ہے؟ گلے پر تیز دھاری چھری پھری اور بس۔ وہ بیچارہ مارے تکلیف کے تڑپے گا اور پھر بے جان ہو کر گر جائے گا۔ تم نے تو میرے ہاتھ پاؤں بھی باندھ دیے ہیں۔ میں کیا سوچ سکتا ہوں؟''

''اگر تم مجھے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہو تو رکھ لو''۔

''جب سے تم واپس آئی ہو یہ پہلا موقع ہے کہ انسانوں کی طرح بات کر رہی ہو۔ اگر تم خود رہنا چاہتی ہو تو میں بھی تمہیں چھوڑنے کا خواہشمند نہیں''۔

''لیکن فی الحال میں نہیں رہ سکتی''۔

''پھر کون ہے میرے پاس؟''

''طلاق نہیں دو گے تو کوئی بھی تمہارے پاس نہیں آئے گی''۔

''کیا تم میکو کے پاس نہیں جاؤ گی؟''

''اسی نے تو مجھے ساری شکتی دی ہے۔ اس نے میری خاطر اتنا کچھ کیا ہے کہ میں ہزاروں یگ بھی اس کا انتظار کر سکتی ہوں''۔

''ہزاروں یگ انتظار کرنے کی کیا تُک ہے، ابھی چلی جاؤ۔ جاؤ، اس کے ساتھ خوش باش رہو۔ لیکن جانے سے پہلے قانونی کارروائی مکمل کرتی جانا''۔ پھر کمال نے فون منقطع کر دیا۔ شام کو مینا کا فون آ گیا، ''پلیز! مجھے اپنے پاس رہنے دو''۔

''کمال نے درشتی سے جواب دیا، ''اگر رہنا ہے تو خود ہی مجھ سے رابطہ کرو۔ تم نے ہر بار میری ہتک کی ہے۔ میری جان چھوڑو۔ آئندہ سے مجھے فون مت کرنا''۔

اس کے بعد بھی وہ کال کرتی رہی لیکن کمال کا دل اس قدر گھائل ہو چکا تھا کہ شاید کسی دشمن کے ساتھ بھی ایسا نہ ہوا ہو۔ دشمن تکلیف دیتے ہیں مگر جتنا دکھ ایک دوست دے سکتا ہے، اور کوئی نہیں دیتا۔ بالکل سامنے سے لگا ہوا خنجر فاصلے سے مارے جانے والی برچھی سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

....

طبیعت کی ناسازی کے سبب کمال بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ فون کی گھنٹی بجنے لگی، بجتی رہی، اس کا من اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ ہفتہ کے روز چھٹی کے باوجود کچھ روزمرہ معمول کے کام نبٹانے پڑتے تھے۔ اگر کہیں امن و امان کا مسئلہ ہو تو اسے پولیس کا انتظام کرنا پڑتا۔ وائرلیس سے بھی پیغام آ رہے تھے۔ اسے نیچے دفتر جانا پڑا۔ صحافیوں سے مختصر گفتگو کی اور پھر ورزش کے لیے

میدان کی طرف روانہ ہوگیا۔

راستے میں قلعہ کے پاس ایک جوڑے کو انگ سے انگ ملائے آپس میں باتیں کرتے دیکھا۔ کمال کو جیسے دکھ بھرا تیر لگا۔ کیا یہ حسد تھا یا رشک؟ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں تھی، اسے بھی اپنا من چاہا ایک ساتھی چاہیے تھا، اگرچہ وہ اس جوڑے کی طرح یوں کھلے عام بیٹھ نہیں سکتا تھا مگر کوئی تو ہو جسے اپنا کہہ سکے۔ میدان میں جا کر یادوں کے دریچے کھل گئے۔ مینا بھی کبھی کبھی اس کے ساتھ یہاں آیا کرتی تھی۔ وہ تو اس خوش فہمی میں تھا کہ اس کی واپسی کے بعد دونوں اکٹھے سیر کیا کریں گے، کبھی آموں کے درختوں تلے، اور کبھی چشمے کے پاس بیٹھا کریں گے، لیکن سارے سپنے بکھر گئے۔ وہ تھی تو یہیں مگر اب اس کو اپنا نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ کسی اور کے پاس جانا چاہتی تھی مگر کیوں؟ وہ کچھ نہ سمجھ پایا۔

میدان میں اس نے حسب معمول دوڑ لگانا شروع کر دی، بھاگتا رہا، بھاگتا رہا لیکن من کے درد سے نہ بھاگ سکا۔ دکھ ہر قدم، ہر لمحہ اس کے ساتھ تھا۔ تھک ہار کر وہ گاڑی میں آ بیٹھا۔ ڈرائیور نے پنکھا چلایا تو کمال کو سردی محسوس ہوئی، اس لیے اس نے پنکھا بند کرنے کو کہا۔ بے دم ہو کر سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ چڑیوں اور پرندوں کی چہچہاہٹ، گنگناہٹ، پتوں کی دھیمی دھیمی آہٹ، ہوا کی مدھم سرسراہٹ، کچھ بھی اس کے من کو نہ لبھا پائی۔ ساری دنیا کسی جادوئی اثر سے مرگھٹ میں بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ وہ مینا کی جلائی چتا میں سلگ رہا تھا۔

کھلا میدان ہونے کے باوجود کمال کو گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اور جب گاڑی چلی تب بھی اسے ہوا کا احساس نہ ہوا، اس کی سانس رکنے لگی۔ یہ کیفیت گذشتہ چند روز سے طاری تھی اور اسی وجہ سے وہ تن دہی اور توجہ سے فرائض کی ادائیگی بھی نہ کر پا رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی وہ بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد فون پر کسی نے ایک قتل کی اطلاع دی۔ اس کا بولنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لہٰذا دو حرفی بات کی، ''مجھے نہیں پتہ۔ اگر امن و امان کا مسئلہ ہو تو مجھے اطلاع دی جاتی ہے، ورنہ اس قسم کی وارداتوں سے مجھے آگاہ کرنا ضروری نہیں''۔

....

کمال آرام کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے فون کا رسیور نیچے رکھ دیا۔ ایکسچینج کے فون کی گھنٹی نے اسے سخت بے آرام کیا۔ وہ فون سننا نہیں چاہتا تھا مگر اپنی شہرت کا خیال آ گیا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ کسی وقت بھی فون کریں، وہ لازماً سنتا ہے۔ یہ ذہن میں آتے ہی اس نے ایکسچینج بات کی۔ آپریٹر نے بتایا، ''سر! آپ کے رشتہ دار پرا جنا بسواس کا فون ہے''۔ وہ سوچنے لگا کہ تمام رشتہ دار گاؤں میں رہتے ہیں اور وہاں کسی کے پاس بھی فون نہیں، پھر یہ کون ہے؟ بہر طور، اس نے فون ملانے کو کہا۔ دوسری طرف سے ایک خاتون کی آواز آئی، ''میں نمگرام سے مانا بات کر رہی ہوں، سنگیتا کی چھوٹی بہن''۔ کمال کو یاد آ گیا۔ کوئی پندرہ سال پہلے اس نے سنگیتا کے گھر والوں سے شادی کی بات کرنا چاہی تھی لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ اس وقت مانا کی عمر سات آٹھ برس ہوگی۔ تب سے ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں رہا۔ مانا پوچھ رہی تھی، ''کیا آپ نے مجھے پہچانا؟''

''ہاں، بالکل۔ آج کل کیا کر رہی ہو؟''

''میری عمر بائیس برس ہے، قد پانچ فٹ چار انچ، اور کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کر رہی ہوں''۔

''بہت بڑی ہو گئی ہو۔ میرے لائق خدمت؟''

''آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں''۔

''کیوں؟''

''ایک کام ہے''۔

''کیسا کام؟''

''میں ملاقات کے وقت بتاؤں گی''۔

''کسی دن بھی دس سے ایک بجے کے دوران میرے دفتر آسکتی ہو''۔

''میں آپ کے گھر آنا چاہتی ہوں''۔

''کیوں؟''

''میں نے بتایا نا کہ دوبدو بات کرنا ہے''۔

''ٹھیک ہے۔ میری رہائش دفتر کی اوپری منزل میں ہے۔ کسی دن صبح نو بجے سے پہلے یا رات نو بجے کے بعد آجانا''۔

''چھٹی والے دن؟''

''چھٹی والے دن بالعموم باہر کی مصروفیات ہوتی ہیں اور اگر باہر کی مصروفیات نہ ہوں تو وہ میرے لکھنے پڑھنے کا وقت ہوتا ہے، اس دن میں کسی سے نہیں ملتا''۔

''مجھ سے بھی ملاقات نہیں کریں گے؟''

''کب آنا چاہتی ہو؟''

''کل ہفتہ ہے، آپ کی چھٹی کا دن، اس لیے کل ہی آجاؤں گی''۔

''ٹھیک ہے، آجانا''۔

''اکیلی آنا مشکل ہے۔ بہت سے سپاہی وہاں کھڑے رہتے ہیں۔ میں دو دفعہ آئی ہوں اور دونوں مرتبہ مارے ڈر کے واپس آگئی تھی۔ آپ آکر مجھے لے جائیں''۔

''کہاں سے؟''

''میں ساڑھے بارہ بجے تک تیار ملوں گی''۔

''میرا ڈرائیور تمہارے پاس پہنچ جائے گا''۔

''آپ خود آئیں۔ میں آپ کے کسی آدمی کو نہیں جانتی، اس لیے کسی کے ساتھ نہیں جاسکتی''۔

''گاڑی کا نمبر لکھ لو۔ اپنا نام بتانا، ڈرائیور تمہیں لے آئے گا''۔

''اگر آپ کے لیے ممکن ہو تو پلیز خود آجائیں''۔

''میں کیسے پہچانوں گا؟''

''آپ کو سفید رنگ بہت پسند ہے۔ کل میں سفید کپڑوں میں ہوں گی''۔

''کیا گارنٹی ہے کہ کل کسی اور لڑکی نے سفید کپڑے نہیں پہنے ہوں گے۔ فرض کرو کسی اور نے بھی سفید لباس پہن رکھا ہو اور میں اسے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کو کہوں، جانتی ہو اس کی دوستوں کے ہاتھوں میری کیا درگت بنے گی؟''

''فکر نہ کریں، آپ کا ایسا استقبال کوئی نہیں کرے گا۔ آپ کی ہونے والی سالی، معاف کیجیے، جو سالی بن سکتی تھی، خود ہی آپ کی گاڑی میں بیٹھ جائے گی۔ میں آپ کو پہچان لوں گی۔ کیا میں آپ کی مسز سے بات کر سکتی ہوں؟''

کمال کو دکھ ہوا۔ درد بھرے لہجے میں کہنے لگا، ''وہ یہاں نہیں رہتی''۔

''اوہ ہاں! آپ نے ایک کتاب میں ذکر کیا تھا کہ وہ باہر رہتی ہیں، لیکن ہمارے علاقے کی ایک عورت اس کے انسٹیٹیوٹ میں ملازمت کرتی ہے۔ وہ بتا رہی تھی کہ آپ کی بیگم واپس آچکی ہیں''۔

''ہاں! انسٹیٹیوٹ میں واپس آئی ہے، میرے پاس نہیں۔ وہ الگ گھر میں رہتی ہے''۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ اتنے برسوں بعد واپس آئی ہیں اور الگ رہتی ہیں''۔

''میں سچ بتا رہا ہوں''۔

''مجھے ان کا فون نمبر دیں''۔

''کوئی فائدہ نہیں بات کرنے کا۔ وہ جلد ہی واپس لوٹ جائے گی''۔

''وہ میرا کام ہے، بس آپ مجھے ان کا نمبر دے دیں''۔

کمال نے اس کا نمبر دیتے ہوئے کہا، ''یہ خیال رہے کہ میں نے تمہیں اس سے بات کرنے کو نہیں کہا''۔

''کیا آپ اس سے ڈرتے ہیں؟''

''میں خدا کو نہیں مانتا لیکن خود خدا بھی تو بُرے لوگوں سے ڈرتا ہے''۔

''اوکے۔ ہم کل دوپہر کو ملیں گے۔ بردی بھی یہیں پر ہے۔ کیا آپ اس سے بات کرنا چاہیں گے؟''

''نہیں''۔

''کل میں اسے اپنے ساتھ لے آؤں؟''

''نہیں''۔

''کیا آپ ابھی تک اس سے خفا ہیں؟''

''مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں''۔

''میں سمجھ گئی۔ تو پھر کل ملاقات ہوگی''۔

گفتگو ختم ہونے کے بعد کمال نے کچن میں جا کر کھانا تیار کرنے کے لیے پتیلی چولہے پر رکھی اور خود باہر برآمدے میں نکل آیا۔ آسمان پر دو ایک تارے نظر آئے۔ سڑک پر بسیں اور ٹرامیں ادھر ادھر آ جا رہی تھیں۔ ہولے ہولے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، لیکن وہ اس سے لاتعلق سمندر میں یکا و تنہا جزیرے کی مانند کھڑا تھا۔ کچن میں واپس آ کر کھانا تیار کیا اور زہر مار کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ نیند آنکھوں سے روٹھ چکی تھی۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا، پھر اٹھ کر بتی جلائی۔ وقت دیکھا تو پتہ چلا کہ تقریباً دو گھنٹوں سے سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ آخر کتنی راتیں وہ یونہی جاگ کر گزارے گا؟ کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑے گا۔ اس نے ڈاکٹر قاضی کا نمبر ملایا۔ اس نے رات گئے فون کرنے کی وجہ پوچھی۔ کمال نے اسے اپنے رتجگوں کے بارے میں بتایا اور پوچھا کہ کس ماہرِ نفسیات سے بات کرنی چاہیے؟

''منڈل صاحب! آپ نے میری بات پر کبھی توجہ نہیں دی۔ میں نے بار بار کہا تھا کہ اکیلے مت رہیے۔ آپ شادی کر لیجیے، بہت سے لوگ اس عمر میں شادی کرتے ہیں۔ آپ میری بات ہی نہیں سنتے۔ بہر حال، میں مسٹر ال یا مسز کرشنا سے بات کرتا ہوں، دونوں میں سے جو بھی مل جائے''۔

اگلے روز صبح آٹھ بجے ڈاکٹر قاضی سے ملنے کا وقت طے ہوا۔ کمال نے سونے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ آخر اکتا کر اٹھا، ہاتھ منہ دھویا اور ہارمونیم لے کر بیٹھ گیا۔ قریبی چرچ کے گھنٹے نے بارہ بجائے، گویا آدھی رات بیت گئی ہے۔ اسے یاد آیا کہ یہ وقت بہاگ راگ کا ہے، لہٰذا اس نے دھیمے سروں گنگنانا شروع کر دیا مگر جلد ہی تھک گیا۔ کھانے کی پابندی نہ کرنا اور رتجگوں نے اپنا آپ دکھانا تو تھا۔ تھکن سے چور بستر پر لیٹ گیا۔ ہارمونیم بھی وہاں سے اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔

....

ایک ہفتہ بعد پروفیسر بینرجی مینا کا پیغام لے کر کمال کے پاس آئے، ''وہ کہتی ہے کہ طلاق کے کاغذات پر دستخط تو ہو گئے ہیں مگر بار بار کوشش کے باوجود بھی تم اس سے بات نہیں کر رہے ہو''۔ کمال نے جواب دیا کہ اگر وہ اس کے پاس لوٹ آنے کا وعدہ کرے تو بات کرے گا، ورنہ نہیں۔ لیکن نہ تو مینا نے کوئی ایسا وعدہ کیا اور نہ ہی کمال نے اس سے بات کی۔ اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ کمال نے بے کلی میں ایک صبح اسے فون کیا اور سوچا کہ اسے واپس آنے کا کہے گا۔ فون پر دوسری طرف سے مردانہ آواز سن کر اس نے گمان کیا کہ غالباً غلط نمبر مل گیا ہو۔ دوبارہ فون کیا تو پھر وہی آواز سنائی دی۔ اتنے میں مینا کی آواز سنائی دی، ''سمیت! رسیور مجھے دو''۔ کمال نے فون کاٹ دیا۔ صبح سویرے سمیت اس کے گھر کیا کر رہا ہے؟ شاید اسے کوئی کام ہو، بہر حال، کمال نے مینا سے بات نہیں کی۔

ایک مہینہ مزید گزر گیا۔ مینا کے انسٹیٹیوٹ سے سبھاش داس کا فون آیا جو کہہ رہا تھا کہ ''مینا بات کرنا چاہتی ہے مگر آپ گریز کر رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے بات کرنے سے شاید برف پگھل جائے''۔ کمال ایسا نہیں سمجھتا تھا اس لیے داس کو جواب دیا، ''آپ اس سے بات کریں۔ اگر وہ میرے پاس واپس آنا چاہے تو میں تیار ہوں ورنہ معاملہ یونہی رہے گا''۔

''میں نے اسے سمجھایا تھا لیکن اس کا کہنا ہے کہ میں بھی کمال کی طرح شرطیں عائد کر رہا ہوں۔ پلیز! آپ اس سے بات کر لیں''۔

''بات کیا کروں؟''

''منڈل صاحب! آپ بھی تو اپنی انا ختم نہیں کر رہے''۔

''یہ میری انا کا سوال نہیں، بات کرنے کا فائدہ کیا اگر اس طرف سے مصالحت کا ارادہ ہی نہیں''۔

''چلیں، پھر بھی بات تو کر لیں''۔

کمال نے مینا کو فون کیا مگر اس نے یہ کہتے ہوئے بات کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ فی الوقت لیب جا رہی ہے۔ دوپہر کو اس نے لیب میں فون کیا مگر مینا نے کہا کہ وہ رات کو بات کرے گی۔ رات کو فون کیا تو گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی۔ کمال فکر مند کہ مینا فون کیوں نہیں اٹھا رہی۔ اگلی صبح اسے پولیس کے تمام محکموں کی مشترکہ پریڈ کے لیے میدان میں پہنچنا تھا لیکن جانے سے پہلے پھر فون کیا، گذشتہ شب کی طرح فون کی گھنٹی بجتی رہی، جواب نہ ملا۔ اس کا ذہن بری طرح الجھ رہا تھا۔ ایک تو صبح سے خالی پیٹ اور اوپر سے سورج کی حدت بڑھتی جا رہی تھی، کمال بے دم سا ہونے لگا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب گرا سو گرا۔ اچانک اسے کہیں سے تازہ اور نیم سرد ہوا کا احساس ہوا، شاید اب اسے پیاس کی بھی اتنی شدید طلب نہیں رہی۔

پریڈ سے فارغ ہو کر وہ بھاگم بھاگ مینا کے فلیٹ کو گیا مگر وہ مقفل تھا، لیب سے معلوم کیا، وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ سبھاش بوس کو فون کیا، اس نے سمیت سے رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ باکل پور گئی ہے۔ کمال نے وہاں فون کیا لیکن رینا نے بتایا کہ وہ یہاں نہیں پہنچی۔ کمال نے سمیت کو پھر فون کیا تو علم ہوا کہ مینا کل رات جاپان جا چکی ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس خطا کی سزا مل رہی ہے۔ مینا کی منت سماجت پر وہ شادی کے لیے تیار ہوا تھا، پھر اس کی ہتک آمیز اور تلخ و ترش باتیں برداشت کیں، دل شکن رویئے کو نظر انداز کیا، اس کی اپنی اور اس کے باپ کی خواہش کے باوجود بھی وہ طلاق دینے پر رضامند نہیں ہوا، اور اب یہ کہ بتائے بغیر جاپان چلی گئی ہے۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ دونوں اکٹھے رہیں، اپنا گھر بنائیں، مینا کی ہر بات مانی، ہر خواہش پوری کی، اپنی جوانی کی بھینٹ دی، لیکن صلہ کیا ملا؟ اب کیا ہو سکتا ہے؟ وقت گزر گیا، بجھے کوئلوں کو پھونکیں مارنے سے آگ پیدا نہیں ہوتی۔ ساری امیدیں، آشائیں، ختم ہو گئیں۔

کمال نے ٹی وی لگایا۔ آزادیٔ ہند اور بھگت سنگھ کی زندگی کے بارے میں فلم چل رہی تھی۔ وہ دلچسپی سے دیکھنے

لگا۔ جس جوانمردی اور متبسم چہروں سے بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گورو نے پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالا، کمال دیکھ کر انتہائی متاثر اور جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ وہ بھی انہی متوالوں کی نسل میں سے تھا مگر وہ اپنے ذاتی اور گھریلو معاملات میں الجھا رہا۔ ان کی راہوں پر چلتے ہوئے اسے اپنے دیش کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔

....

16 اپریل 1995، بسنت پور میں کالج کے سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب جس میں مہمانِ خصوصی وزیرِ تعلیم سچند آنند جبکہ صدارت مقامی وزیر کر رہے تھے۔ مشہور گائیک اجیت پانڈے نے افتتاحی نغمہ گانے کے بعد اظہارِ خیال کیا کہ ''تا حال عمارت کا ڈھانچہ تک کھڑا نہیں ہوا لیکن کہا جا رہا ہے کہ کالج میں تعلیم کا آغاز اسی سیشن سے ہوگا۔ چونکہ کمال منڈل صاحب کا دعویٰ ہے اس لیے ہم اسے مان لیتے ہیں تاہم مجھے ذاتی طور پر اس کا امکان کم ہی نظر آ رہا ہے''۔ کمال نے وضاحت کی، ''بلا شبہ ابھی تک کالج کا ڈھانچہ تک نہیں بنا، لیکن آج کی تقریب تو سنگِ بنیاد رکھنے کے سلسلہ میں ہے، تعمیر تو بعد میں ہوگی۔ تاہم میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نہ صرف تعلیم کا آغاز اسی سیشن سے ہوگا بلکہ کالج کی تعمیر بھی مکمل ہو چکی ہوگی۔ اگر چہ آپ کو شک ہے لیکن ہم ثابت کریں گے کہ ہمیں اپنے وعدے اور دعوے نبھانے آتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ کالج بنانے کا خیال کیسے آیا؟ اپنی زندگی سے میں نے سیکھا ہے کہ جب تک تعلیمی ادارے قرب و جوار میں قائم نہیں ہوں گے، ہمارے زیادہ تر نوجوان تعلیم سے بے بہرہ رہیں گے۔ ایک امیر شخص اپنے بچوں کو دور علاقوں، بلکہ بیرونِ ملک بھی بھیج سکتا ہے مگر عام آدمی زیادہ اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا، اسے نزدیکی علاقوں میں اسکول کالج کی ضرورت ہے، اسی وجہ سے ہم یہاں کالج قائم کر رہے ہیں۔ مقامی طلبا اپنے گھروں میں رہتے ہوئے نہ صرف تعلیم بلکہ شام کے اوقات میں کوئی کام بھی کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بھی قابل ہو جائیں گے۔ تمام مقامی لوگوں کی مدد و استعانت سے ہم وقت پر کالج کا آغاز کر دیں گے''۔

کمال کی تقریر کے بعد صدرِ تقریب نے اپنے خطبہ میں کہا، ''اس علاقے میں پہلا اسکول لکشمی پور میں قائم ہوا، جو زمینداروں کا علاقہ تھا لیکن عام لوگوں کے لیے کالج یہاں تعمیر ہو رہا ہے۔ یہ تبدیلی ہماری پارٹی لا رہی ہے''۔ مہمانِ خصوصی نے سنگ بنیاد رکھنے کے بعد تقریر کرتے ہوئے کہا، ''ہماری حکومت ہر طرف تعلیمی ترقی کے لیے کوشاں ہے، اسی وجہ سے ہم نہ صرف شہری علاقوں بلکہ دیہی علاقوں میں بھی ادارے قائم کر رہے ہیں۔ ہماری حکومت عوامی حکومت ہے لہٰذا ہم ان کے لیے کام کریں گے۔ آپ ہماری مدد کریں، ہم آپ کی مدد کریں گے''۔

لوگوں نے فراخ دلی سے چندہ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دو لاکھ روپے جمع ہو گئے۔ تقریب کے اختتام سے پہلے براہی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

کمال گھر گیا تو اس کی ماں نے شکایت کی، ''تم نے مجھے بینا سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ مجھے وہاں لے جاؤ، میں خود اس سے بات کروں گی۔ کیا وہ میری بے عزتی کرے گی؟ کرنے دو، وہ میری بیٹی ہے۔ مجھے اس کے پاس لے جاؤ''۔ کمال نے بتایا کہ وہ جاپان واپس چلی گئی ہے۔ یہ سن کر مریم نے رونا شروع کر دیا، ''اگر مجھے پتہ ہوتا تو میں پہلے ہی اس سے بات کرتی۔ وہ مجھے مشورہ دے رہی تھی کہ میں کوئی سندر سی لڑکی ڈھونڈ کر تمہاری اس سے شادی کر دوں۔ میں نے اسے ڈانٹا، کیا تم پاگل ہو گئی ہو، کیا کمال نے تمہیں اس لیے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی تھی کہ تم اس کی کسی اور سے شادی کراؤ؟ اس نے کوئی جواب نہ دیا، میں یہ سمجھی کہ عجیب سی لڑکی ہے، اسی لیے ایسی باتیں کر رہی ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ سنجیدہ ہے۔ کمال کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ واپسی کی تیاری کرنے لگا۔

....

ڈپٹی کمشنر سیکورٹی مسٹر درگا پرساد دھریندر نے کمال کو فون پر بتایا کہ اس کی مسز یہاں دفتر میں آئی بیٹھی ہے۔ کمال کے وجہ پوچھنے پر بتایا گیا: ''پاسپورٹ آفس نے تصدیق کے لیے اس کے کاغذات بھیجے تھے۔ ہمارا افسر کئی بار اس پتہ پر گیا مگر گھر مقفل ہونے کے سبب پاسپورٹ آفس کو مطلع کر دیا گیا، اس کے باوجود بھی اسے پاسپورٹ جاری کر دیا گیا تھا۔ بہرحال، ان کا اتہ پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ کاغذات میں چونکہ آپ کا حوالہ تھا اس لیے جب آپ سے رابطہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ طلاق کی کارروائی ہو رہی ہے۔ کل جب وہ ہوائی اڈے پہنچیں تو امیگریشن نے ان کا پاسپورٹ ضبط کر لیا۔ اب وہ پاسپورٹ کے لیے آئی ہیں لیکن ہمیں تھوڑی سی چھان بین کرنی ہے''۔

کمال وہاں پہنچا۔ مینا کو دھریندر کے دفتر کے باہر بیٹھے دیکھا، سمیت اس کے ساتھ تھا۔ چونکہ طلاق ابھی تک مؤثر نہیں ہوئی تھی اس لیے تا حال وہ اس کی قانونی پتنی تھی۔ دھریندر نے مینا کو بھی اندر بلا لیا۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد پاسپورٹ پر گفتگو ہوئی۔ کمال نے اس سے پاسپورٹ واپس کرنے کی درخواست کی لیکن دھریندر نے کہا کہ قانونی کارروائی مکمل ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ کمال نے کہا کہ اگر اس سے کچھ لکھوانا ہو تو وہ تیار ہے۔ دھریندر نے اتنی بات کو کافی سمجھا اور پاسپورٹ واپس کر دیا۔

باہر نکل کر کمال نے مینا سے پوچھا کہ وہ کیسے آئی ہے؟ اس نے جواب دیا، ٹیکسی سے۔ کمال نے اسے اپنی گاڑی پر چھوڑنے کی پیشکش کی۔ مینا نے جواب دیا کہ سمیت بھی اس کے ساتھ ہے، لیکن وہ کمال سے قدرے خوفزدہ ہے۔ ''مجھ سے خوف کی وجہ؟''، کمال نے پوچھا۔ مینا نے سمیت کو آگے بلا کر تسلی دی کہ کمال سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس پر وہ بھی مینا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں کو ہوٹل پر اتارا اور خود دفتر روانہ ہو گیا۔

کمشنر کو غالباً دھریندر سے مینا کی آمد کا علم ہوا تھا۔ اس نے کمال سے کہا کہ وہ مینا سے ملنا چاہتا ہے۔ کمال کا خیال تھا کہ اس سے ملاقات بے سود ہوگی۔

''پھر بھی مجھے ایک بار کوشش کر لینے دو''۔

کمال نے ہوٹل فون کر کے مینا کو کمشنر سے ملاقات کے لیے بلایا۔ کمال بھی وہیں موجود تھا۔ طویل گفتگو کے بعد بھی مصالحت کی کوئی صورت دکھائی نہ دی تو کمشنر نے ہمت ہار دی۔ دفتر سے باہر نکل کر دونوں کمال کے گھر آ گئے۔ اس نے مینا کو مخاطب کر کے کہا: ''میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہم دونوں میں سے قصوروار کون ہے۔ معاملات بگڑنے کی ساری ذمہ داری میں اپنے سر لیتا ہوں۔ کیا میں تم سے اتنی توقع نہیں کر سکتا کہ اپنے رشتہ کی خاطر تم بھی تھوڑی سے قربانی دو؟''

''اگر قربانی ہی دینی ہے تو تم خود کیوں نہیں دیتے، اسی میں میری خوشی ہے''۔

''چلو، خوش رہو''۔

''اگر مجھے کوئی مسئلہ ہوا تو تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی''۔

کمال کی سمجھ میں نہ آیا کہ آیا کوئی شخص اتنا بے شرم اور خودغرض بھی ہو سکتا ہے۔ ایک طرف تو اپنے پتی کو کسی دوسرے شخص کی خاطر چھوڑ رہی ہے اور دوسری طرف اسی سے مدد مانگ رہی ہے۔ مینا کہہ رہی تھی: ''میرے والدین اور بہن یہیں پر ہیں، اگر انہیں کسی مدد کی ضرورت ہو تو پلیز ان کا خیال کرنا''۔

کیا مینا ٹھیک کہہ رہی ہے یا سب کچھ جان بوجھ کے کر رہی ہے؟ اگر وہ اتنی پستی تک گر سکتی ہے تو اس سے ہر بات ممکن ہے۔ وہ الٹا شکایت کر رہی تھی: ''تم نے میرے باس کو کیوں لکھا تھا، مجھے لکھ دیتے''۔

''کس پتے پر بھیجتا؟''

''اوساکا کے پتے پر''۔

''مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ تم وہاں چلی گئی ہو''۔

''کیا سمیت نے نہیں بتایا تھا؟''

''کیا غیروں سے اپنی پتنی کے بارے میں پوچھنا کسی پتی کے لیے باعثِ عزت ہے؟''

''اب ہمارا رشتہ ہی ایسا ہو گیا ہے''۔

''پھر مجھے کیا پڑی ہے کہ تمہیں لکھوں''۔

''اگر یہی بات ہے تو میرے باس کو کیوں لکھا تھا؟ مجھے فون کر دیتے''۔

''میں نے فون بھی کیا تھا لیکن تمہارا اتہ پتہ ہی نہیں چلا''۔

''یہ ہو ہی نہیں سکتا''۔

''میرے فون سے ایس۔ٹی۔ڈی کال نہیں ہوتی اس لیے بک کرانا پڑی۔ اس کی رسید ابھی تک میرے پاس ہے۔ چونکہ مجھے پتہ تھا کہ تم ایسی باتیں بناؤ گی اس لیے وہ رسید سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ کہو تو دکھا دوں؟''

مینا نے اس پر تو کچھ نہ کہا البتہ کمال کا تحریر کردہ خط اسے دکھاتے ہوئے بولی، اس میں ایک غلطی ہے۔ وہ بڑا محظوظ ہوا کیونکہ شادی کے بعد تو اسے ایک فقرہ بھی ٹھیک سے نہیں لکھنا آتا تھا، کمال نے اسے صحیح زبان لکھنا سکھایا تھا، بلکہ اس کے پی، ایچ، ڈی مقالے کی زبان کی نوک پلک بھی اسی نے درست کی تھی، اب وہی مینا اس کی غلطیوں کی نشاندہی کر رہی ہے، اس لیے وہ اپنی غلطی جاننے کا خواہشمند تھا۔ بہر حال، اس نے دیکھا اور مزید محظوظ ہوا۔ مینا نے جس 'غلطی' کی نشاندہی کی تھی وہ انشا پردازی کے لحاظ سے کوئی 'غلطی' نہ تھی۔ انگریزی اور مقامی زبان میں گرائمر اور ترتیبِ لفظی کی وجہ سے ہم کئی مقامات پر ترجمہ کرتے ہوئے ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ مذکورہ خط میں بھی مینا نے ایک ایسی ہی 'غلطی' کی نشاندہی کی تھی جو کسی بھی ماہرِ لسانیات کی نظر میں 'غلطی' کہلانے کی سزاوار نہیں ہو سکتی۔ کمال نے اسے سمجھایا کہ اس کی لکھی ہوئی انگریزی میں بالکل کوئی خامی نہیں اور یہ کہ یہی صحیح زبان ہے۔ مینا نے جواب دیا کہ اس نے ایک جگہ کچھ اور لکھا دیکھا تھا۔ کمال کو سمجھانا پڑا کہ بعض اوقات ایک زبان کے حشو وزوائد دوسری زبان میں ترجمہ نہیں ہو سکتے اور یہ کہ جہاں سے اس نے پڑھ کر 'غلطی' کی نشان دہی کی ہے، دراصل لسانی خطا اس شخص سے ہوئی ہے۔ مینا لاجواب ہو گئی۔

کمال دل ہی دل میں کہنے لگا، ''اگر کوئی ایسا شخص جسے میں نے تعلیم دی ہو، میری غلطیوں کی نشاندہی کرے تو مجھے اس پر ناز ہونا چاہیے، لیکن افسوس! تمہیں تو ابھی تک لفظوں کو صحیح ترتیب دینا اور اچھا جملہ بنانا نہیں آیا، اور اوپر سے اترا رہی ہو کہ میں بہت بلند مقام پر پہنچ گئی ہوں، بہت اہمیت ہے میری''۔ پھر مینا کو مخاطب کر کے بولا، ''پہلے سیکھو، پھر دوسروں کی خطائیں ڈھونڈو۔ میرا تلفظ انگریزی دانوں جیسا نہیں لیکن جہاں تک انشا پردازی کا تعلق ہے، تم تو کیا، اپنے معلموں اور ان کے معلموں سے کہو کہ میری تحریر میں غلطی نکالنے سے پہلے دو دفعہ سوچیں''۔

....

مینا کھانا وغیرہ کھا کر چلی گئی۔ ان کی اگلی ملاقات عدالت میں ہوئی۔ کمال کے ایک دو بہی خواہوں نے مینا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر ناکامی ہوئی۔ مینا نے اپنی پیشی کے موقع پر وہی شلوار کرتا پہن رکھا تھا وہ دونوں نے مل کر خریدا تھا۔ کمال سمجھ نہ پایا کہ اس نے جان بوجھ کر پہنا تھا یا اتفاقاً۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، مینا نے سر جھکا لیا۔ کمال نے غور سے دیکھا، اس وقت تک وہ اس کی قانونی بیوی تھی، تھوڑی دیر بعد ان کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جج کے سامنے کاغذات پڑے تھے،

اس نے مینا سے دو چار سوال پوچھے اور طلاق نامے پر اس کی رضامندی کے بعد دستخط کر دیے۔ یوں دونوں کا رشتہ اب ماضی کی داستان بن کر رہ گیا۔ کمال اپنے آنسو نہ روک سکا۔

واپس اپنے دفتر آیا تو مینا نے بات کرنا چاہی مگر کمال نے فون سننے سے انکار کر دیا۔ بعدازاں انسٹیٹیوٹ سے سبھاش بوس کا فون آیا جو کہہ رہا تھا کہ مینا اس (کمال) سے آخری بار ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ کمال نے سبھاش کو انکار کر دیا، ''اگر کوئی اور مجھ سے یہ درخواست کرتا تو میں شاید مان جاتا لیکن آپ تو سب کچھ جانتے ہیں، پھر کیوں ایسی بات کر رہے ہیں؟'' بات ختم ہو گئی لیکن کچھ دیر بعد وکیل کا فون آ گیا جو یہی درخواست کر رہا تھا۔ کمال نے اپنے تجربے سے اندازہ لگایا کہ مینا کو شاید یہ اندیشہ ہو کہ جاپان واپسی کے سفر میں اس کو کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہ آ جائے۔ اس کا پاسپورٹ ضبط ہوا جو کمال کی ضمانت پر واپس ملا، شاید اسے خدشہ ہو کہ دوبارہ ایسا ہوا تو پھر کیا ہو گا؟ شاید اس کے پیشِ نظر وہ واپس جانے تک کمال کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کا رابطہ رکھنا چاہتی ہے۔ چنانچہ اس نے وکیل سے کہا کہ مینا سے کہہ دیں واپسی پر اسے اگر پاسپورٹ کے سلسلہ میں کوئی مسئلہ پیش آیا تو آپ سے بات کرے، اور آپ مجھے مطلع کر دیں، میں کام کرادوں گا، لیکن مجھے ملاقات کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔

....

کمال تھکن سے چور تھا پھر بھی کام کرتا رہا۔ پچھلے ہفتے نئے کالج کی رجسٹریشن اور دیگر متعلقہ کارروائیوں کی تکمیل کے لیے ایک سے دوسرے دفتر میں دوڑ دھوپ ہوتی رہی۔ اب اس کا منصوبہ انجینئرنگ کالج کا قیام تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے جتنا کشٹ اٹھایا، وہ ہی جانتا ہے۔ کالج کے لیے بنائی گئی سوسائٹی سے کاغذات پر دستخط کرانے چند گھنٹوں کے لیے گاؤں بھی جانا پڑا۔ واپس اپنے گھر پہنچتے پہنچتے آدھی رات بیت گئی، بدن بری طرح ٹوٹ رہا تھا لیکن ابھی کھانا بھی پکانا تھا۔ چولہے پر پتیلی رکھ کر وہ بستر پر دراز ہو کر سوچتا رہا کہ وہ اتنا غیر مطمئن، اتنا دکھی کیوں ہے؟ شاید اس لیے کہ کوئی شخص اپنی من پسند اور مطلوبہ شے حاصل نہیں کر پاتا تو اس شے کی وقعت اور قدر و قیمت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، اور اس کے برعکس آسانی سے ہاتھ آنے والی چیز کی قدر کم ہوتی ہے۔ اس وقت اسے اگر ضرورت تھی تو اپنے پیارے اور دل کے قریب کسی میت کا پریم بھرا ہاتھ، کسی کا نرم لمس، کسی کومل انگلیوں سے چھوئے جانے کا احساس، لیکن اس کا جیون ان خوشیوں، ان محسوسات سے خالی تھا۔ کیا اس کے لیے کوئی اور جیون ہے؟

....

کمال کا ماضی مینا کے وجود، اس کی سوچوں اور بیتے دنوں کی یادوں سے روشن تھا، اس کے علاوہ وہ کسی اور کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا، جبکہ مینا نے انتہائی بے دردی سے اسے دھوکہ دیا۔ اس نے کمال کی زندگی میں دکھ، درد اور تکلیفوں کے سوا کچھ نہ رہنے دیا۔ وہ کتنی مکار اور چلتر ثابت ہوئی ہے، پتہ نہیں کب سے منصوبے بنا رہی تھی؟ اسے بہت سی چالبازیاں یاد آنے لگیں۔ مثلاً، ایک روز کمال سے کہنے لگی، ''ایک انگریز شاعر، کیا نام تھا اس کا، وہ جو اپنے عشق معاشقے کی وجہ سے بڑا بدنام تھا، اس نے کہا تھا کہ 'اگر دنیا میں کوئی جنت ہے تو وہ جوان لڑکی کی ٹانگوں کے بیچ ہے'، دیکھو! کیسی شاندار بات کی ہے اس نے''۔

کمال نے پوچھا، ''کس کتاب میں پڑھا ہے؟''

''پڑھا تو نہیں، سنا ہے''۔

وہ یہ تو نہ پوچھ سکا کس سے سنا ہے، لیکن ایک بات واضح تھی کہ کوئی شریف لڑکا یا لڑکی ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کسی عیاش طبع لڑکے نے مینا سے یہی کہا ہو اور وہ اس فقرے سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ امریکہ قیام کے دوران جب ایک بار مینا نے اسے فون پر نائٹ کلب جانے کے بارے میں بتایا تھا اس وقت وہ دراصل ایک دوست کے ساتھ ہم بستری سے فارغ ہوئی تھی۔ فون کرنے کا مقصد کمال کا ردعمل جانچنا تھا جسے وہ اس وقت سمجھ نہیں پایا۔ پھر ایک موقع پر کمال نے اسے بتایا کہ ادھر

ادھر سے اس کے بارے میں کچھ باتیں سنی ہیں تو جس طرح وہ اس سے کرید کرید کر تفصیل پوچھ رہی تھی، اصل میں وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ کمال کو اس کے رنگین شب و روز کی کن باتوں کا علم ہے، لیکن کمال تب بھی اندازہ نہ کر سکا تھا۔ اور جب وہ امریکہ گیا تو مینا نے جان بوجھ کر اس کی ملاقات مکان کی مالکہ سے نہیں کرائی تھی مبادا اس کا بھید کھل جائے۔ امریکہ سے واپس آنے کے بعد ایک دفعہ کہنے لگی، 'امریکی بڑے منہ پھٹ ہیں، لڑکی سے بآسانی پوچھ لیتے ہیں، کیا تم میرے بستر کی زینت بنو گی'؟۔ کمال اب سمجھا کہ اس نے کسی سے سنا نہیں، ہوسکتا ہے کہ کسی امریکی نے اسی سے پوچھا ہو، اور ایسی بات اجنبی لڑکی سے نہیں بلکہ اچھی خاصی جان پہچان والی سے کی جاتی ہے۔ کمال نے اس سے پوچھا بھی کہ تمہیں کیسے پتہ ہے؟ لیکن اس نے صاف جواب دینے سے گریز کیا اور بس اتنا کہا کہ میں نے سنا تھا۔ جاپان سے واپس آنے میں بھی وہ اس لیے ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی اور کمال کو ادھر اس حقیقت کا وہم و گمان تک نہیں تھا۔

اب وہ سوچ رہا تھا، کیا مینا اس کی زندگی کو جہنم بنا کر خوش رہ پائے گی؟ اس کی آشائیں، اس کے سپنے، اس کے من کی ترنگیں سب کچھ مٹی میں ملا کر خوش ہو جائے گی؟ کیا یہ دنیا اتنی خود غرض ہے؟ کیا اتنے اخلاقی جرائم کے بعد بھی کوئی شخص سر اٹھائے رہ سکتا ہے؟ اس کے دل سے دعا نکلی، 'ایسی پتنی کسی جانی دشمن کو بھی نہ ملے'۔

وہ اپنے غلط انتخاب کی سزا بھگت رہا تھا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ناشکرا پن انسانیت کے ساتھ غداری ہے۔ وہ اسی بے وفائی اور احسان فراموشی کا شکار تھا، ایک ناقابلِ قبول عذاب، ناقابلِ برداشت دکھ۔ کسی کے ساتھ بے وفائی کتنی دل شکن ہوتی ہے، ساتھ نبھانے اور وفا کے وچن کو یوں بھول جانا ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ مینا نے اس کے ساتھ کیا کیا عہدُ و پیمان کئے تھے، جیون بھر ساتھ رہنے کی قسمیں کھائی تھیں، اور پھر اپنا مفاد حاصل کرنے کے بعد اسے ٹھکرا دیا، اب اسے کس نام سے پکارا جائے؟ یہ وہی ذات تھی جس نے اس کے ساتھ جینے مرنے کی سوگند کھائی تھی!

اس کی اپنی حماقت سے مینا نے اپنا مستقبل سنوار لیا، اگر وہ اس سے بیاہ نہ کرتا تو کیا ہوتا؟ جب اس کے سسر نے مینا کو طلاق دینے کا مشورہ دیا تھا اگر وہ اس وقت عمل کرتا تو آج اتنی تڑپ نہ ہوتی۔ اس نے دن رات محنت کی تا کہ مینا کسی مقام پر پہنچ جائے۔ اس نے تو جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں اور کمال نے اتنے برس ان پر اعتبار کیا، اس کا انتظار کیا، اور وہ کتنی بے رحمی سے اس کے مخلصانہ جذبات کو کچل کر چل دی۔ مینا کے اس رویے نے کمال کو کرچی کرچی کر دیا، اسے ریزہ ریزہ کر دیا، ذہن تلپٹ ہو کے رہ گیا۔ اس شدید صدمے کی گرفت سے نکلنا محال دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے زندگی کا ایک طویل اور سنہرا دور، اپنے احساسات اور جذبات کی دولت اس بے وفا پر لٹا دی، اس کے علاوہ کسی اور کا خیال پاس نہ پھٹک سکا، اپنا جیون اپنی مرضی سے نہ جی سکا۔

فلم اور حقیقی زندگی میں واحد فرق یہ ہے کہ فلم میں غلطیوں پر ری ٹیک، اسے درست کرنے کی مہلت اور سہولت ہوتی ہے جبکہ زندگی میں جو ایک بار ہو گیا، سو ہو گیا۔ ایک قدم غلط اٹھ گیا، پھر اس کی واپسی نہیں، کوئی حل نہیں، ساری زندگی بھگتنا پڑتا ہے، اور جیون اتنا مختصر ہے کہ اپنے ہاتھوں باندھی گئی گرہیں کھولتے کھولتے سانسیں ختم ہو جاتی ہیں، مداوا پھر بھی نہیں ہوتا۔

....

ڈاکٹر قاضی کمال کو ساتھ لیے مشہور ماہرِ نفسیات ڈاکٹر کرشنا چٹوپادھیائے کے کلینک آیا اور کہنے لگا "میڈم! یہ رہا آپ کا وی، آئی، پی مریض۔ اب آپ کے حوالے، مجھے اپریشن تھیٹر جانے کی جلدی ہے"، یہ کہہ کر وہ وہاں سے باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر کرشنا کمال سے مخاطب ہوئی، "میں نے ٹی وی کے کئی پروگراموں میں آپ کی باتیں سنی ہیں، آپ کی کتابیں، ناول اور اخبارات میں کالم بھی شوق سے پڑھتی ہوں"۔ وہ دن بھی تھے کہ اپنی کتابوں اور تحریروں کے بارے میں توصیفی کلمات سن کر

کمال کو احساسِ کامرانی ہوتا تھا مگر آج اپنی معالجہ کے منہ سے یہ باتیں سن کر اس پر گویا بے حسی کی کیفیت رہی۔ اب اس کے لیے ہر شے بے معنی بن کے رہ گئی تھی۔ بہر طور، اس نے کسرِ نفسی سے کام لیا، ''اجی نہیں، میں نے کچھ زیادہ نہیں لکھا''۔

''لیکن آپ کی حقیقت نگاری سو فیصد ٹھوس اور جاندار ہے۔ لوگ پسند کرتے ہیں''۔

''سارے تو نہیں، مجھے اپنی کتاب 'احساسِ تحفظ کی تلاش' پر دھمکیوں بھرے بہت سے خطوط بھی ملے تھے''۔

''ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ بنیاد پرست بڑی شدت سے اس کتاب کے خلاف باتیں کر رہے ہیں۔ اسی سے آپ کے قلم کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے''۔

''مجھے آپ کی بات سے اتفاق نہیں۔ لوگ تو کمتر درجہ کی کتابوں پر بھی اتنے ہی شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں''۔

''ہو سکتا ہے۔ چلیں! اب اپنے بارے میں بتائیں، کیا مسئلہ ہے؟''

کمال بے چینی محسوس کرنے لگا۔ ڈاکٹر کرشنا نے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا، ''کمال صاحب! میں معالج نہیں بلکہ آپ کی تحریروں کی دلدادہ ہوں۔ آپ کھل کر بتائیے، معاملہ کیا ہے؟''

''میرا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنی پتنی کو نہیں بھول سکتا حالانکہ وہ مجھے چھوڑ کر جا چکی ہے۔ یہ حقیقت میں ابھی تک قبول نہیں کر سکا۔ سارا وقت کام میں گزر جاتا ہے لیکن راتیں کٹنے کا نام نہیں لیتیں۔ آنکھیں بند ہوتی ہیں تو وہ تصور میں سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ میں درد کے مارے سو نہیں سکتا۔ یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت ہو رہا ہے''۔

''آپ کی شادی کب ہوئی تھی؟''

''پندرہ برس پہلے''۔

''اور علیحدگی؟''

''اس کی طرف سے تو بہت عرصہ پہلے ہو چکی تھی مگر مجھے علم نہیں تھا، اب آ کر معلوم ہوا ہے''۔

''اگر ممکن ہو تو مجھے تفصیل بتا دیں''۔

وہ سوچنے لگا کہاں سے ابتدا کرے۔ شاید ڈاکٹر کرشنا سمجھ گئی اس لیے دوسرا سوال پوچھا، ''شادی کیسے ہوئی تھی؟'' اس پر کمال نے ساری کہانی سنائی۔ وہ توجہ سے سنتی رہی، پھر پوچھا، ''اب بے آرامی اور بے چینی کا سبب کیا ہے؟''

''میرا ذہن ابھی تک اس علیحدگی کو قبول نہیں کر سکا''۔

''کیوں؟''

''کیا کوئی شخص اتنا بے حس، ظالم اور کٹھور ہو سکتا ہے؟''

''اب آپ کو شبہ کیا رہ گیا ہے؟ اس نے جو کرنا تھا، کر لیا''۔

''اس نے ساری زندگی میرے ساتھ رہنے کا وچن دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں پہلے مر گیا تو وہ بھی زندہ نہیں رہے گی۔ میں برسوں اس کا انتظار کرتا رہا اور وہ کسی اور کی بانہوں میں جھولتی رہی۔ کیا اس کے دل میں معمولی سا بھی احساسِ ذمہ داری نہیں تھا، کوئی شکر گزاری نہیں تھی، بالکل احسان مندی نہیں تھی؟''

''میں مانتی ہوں۔ اسے ذمہ داری اور احسان مندی کچھ تو یاد رکھنی چاہیے تھی، لیکن دیکھ لیں، وہ ان احساسات اور جذبات سے بالکل تہی ہے۔ پھر آپ کیوں اس حقیقت کو قبول نہیں کر لیتے؟''

''میں نے اس کے ہر لفظ پر اعتبار کیا لیکن اس نے میرے یقین کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے''۔

''اگر آپ کسی غلط شخص سے توقعات وابستہ کر لیں تو انجام کار سوائے تکلیف کے حاصل کچھ نہیں ہوتا''۔

اگر چہ کمال کے دل میں بینا کے لیے بہت رنجش اور سرگشتگی تھی لیکن ڈاکٹر کرشنا کے الفاظ اسے اچھے نہ لگے۔ کمال کے تاثرات سے اندازہ لگا کر وہ کہنے لگی، ''آپ اس سے بہت پریم کرتے تھے لیکن اس نے پروا نہیں کی۔ اب آپ کیا کر سکتے ہیں؟''

''اگر کوئی اور شخص ایسا سلوک کرتا تو مجھے بالکل تکلیف نہ ہوتی، لیکن میری ساری کوشش اس کو اپنے برابر لانے کے لیے تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ مجھے یوں دھوکہ دے جائے گی، یہی بات میرا ذہن قبول کرنے سے انکاری ہے''۔

کرشنا کہنے لگی، ''ٹیگور نے کہا تھا۔۔۔۔۔''۔

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کمال بول اٹھا، ''ٹیگور نے کہا تھا، 'اچھا یا برا، جو بھی ہے، حقیقت کو قبول کر لو'، مگر میرے لیے اسے ماننا بہت مشکل ہے''۔

''مسٹر منڈل! آپ کے ساتھ جو ہوا وہ واقعی تکلیف دہ ہے۔ کسی کی یاد آنا ایک فطری عمل ہے۔ جب بھی اس کی یاد آتی ہے آپ دکھ محسوس کرتے ہیں، اور اگر آپ خود کو تندرست اور ہشاش بشاش رکھنا چاہتے ہیں تو اس حقیقت کو ماننا ہی ہوگا۔ صحت کی بحالی کے لیے ہم آپ کو کچھ دوائیں تجویز کرتے ہیں، پھر آپ کو آرام کی بھی ضرورت ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی دوا نہیں جو آپ کو یادوں کے بھنور سے باہر نکال سکے، میرے خیال میں ایسا لازمی بھی نہیں۔ آپ صاحب قلم ہیں، اپنی تکلیف اور دکھ درد کو کاغذ پر منتقل کر کے شاندار فن پارے تخلیق کر سکتے ہیں''۔

''میں نے بہت کوشش کی تھی''۔

''پھر کیا ہوا؟''

''اس دل شکن اور دردناک حادثے نے میرا ذہن بالکل شل کر دیا ہے، لکھنے پڑھنے پر بالکل توجہ نہیں دے پا رہا، لکھنے بیٹھتا ہوں تو آنسوؤں سے آنکھیں دھندلا جاتی ہیں''۔

''اسی کی ضرورت ہے۔ لوگوں سے باتیں کریں، رونے کو جی چاہے تو ضرور روئیں۔ یہی علاج ہے''۔

کمال کو تجویز کردہ علاج پسند نہ آیا۔ ڈاکٹر کرشنا نے نسخہ لکھ کر کمال کو استعمال کا طریقہ بتایا اور کہا، ''تنہا مت رہیں، دوسروں سے باتیں کریں۔ بہتر ہوگا اگر گھر میں کسی اور کو بھی اپنے ساتھ رکھیں۔ نسخے پر میرا ٹیلیفون نمبر لکھا ہوا ہے، جب چاہیں مجھ سے بات کر لیں''۔ نسخہ دے کر وہ پھر بولی، ''آپ کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ کم از کم ایک ہفتہ جی بھر کے سوئیں، بالکل ٹھیک ہو جائیں گے''۔

اتنے میں ڈاکٹر قاضی نے دروازہ کھول کر پوچھا، ''علاج ہو رہا ہے؟''

وہ بولی، ''ڈاکٹر قاضی! یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میں نے انہیں دو قسم کی دوائیں دی ہیں، ایک سونے کے لیے اور دوسری بھوک بڑھانے کے لیے۔ میری رائے میں اور کسی دوا کی ضرورت نہیں''۔

پھر کمال اور ڈاکٹر قاضی شکریہ ادا کر کے باہر نکلنے ہی لگے تھے کہ ڈاکٹر کرشنا نے قاضی صاحب کو اندر بلایا۔ کمال باہر انتظار کرتا رہا۔ چند منٹ کے بعد ڈاکٹر قاضی نے آ کر کہا، ''ارے بھائی! آپ میری بھی نہیں سن رہے تھے۔ کرشنا بھی یہی کہہ رہی تھی کہ اکیلا پن آپ کو کھائے جا رہا ہے۔ بہتر یہی ہے شادی کر لیں۔ آپ کو خود کچھ نہیں کرنا پڑے گا، صرف ہاں کہہ دیں، باقی ہمارا کام ہے''۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب! شادی کا تعلق بدن کے ساتھ نہیں ہوتا۔ میرے دل میں کسی اور کے لیے اب کوئی گنجائش نہیں۔ میں شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں''۔

''اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ایک عورت مرد کی زندگی سنوار بھی سکتی ہے اور بگاڑ بھی دیتی ہے، عورت مرد کو بلندیوں پر

لے جاسکتی ہے یا گہری کھائیوں میں گرا سکتی ہے۔ بینا نے تمہیں دل شکستہ ہی نہیں کیا، توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے''۔

اگر پہلے جیسا وقت ہوتا تو کمال اس پر شدید اعتراض کرتا اور کہتا، ''صرف کمزور دل و دماغ کے لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کی قوتِ ارادی مضبوط اور دماغی جیون کی عمارت پائیدار ہو، ان پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا''۔ لیکن اب سوائے چپ رہنے کے کیا کر سکتا تھا؟ گھر کو روانہ ہوا تو یہ جملہ اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا، ''ایک عورت مرد کی زندگی سنوار بھی سکتی ہے اور بگاڑ بھی دیتی ہے''۔

....

کمال کلکتہ یونیورسٹی پہنچا۔ طلبا و طالبات باہر نکل رہے تھے۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ اتنے میں سفید شلوار قمیص میں ملبوس ایک لڑکی کندھے پر شانتی نکیتن کا بیگ لٹکائے اس کی گاڑی کے پاس آئی۔ کمال نے اس سے پوچھا، ''کیا آپ پرگنا بسواس ہیں؟'' وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ کر بولی، ''کیا اب بھی کوئی شک ہے؟ میں پرگنا بسواس، یعنی مانا ہوں۔ اب چلیں''۔ ڈرائیور اور گارڈ بھی اندر آ بیٹھے۔ گھر پہنچ کر کمال نے مانا سے پوچھا کہ وہ کیا لے گی، روٹی یا چاول؟

''جو بھی اس وقت موجود ہو''۔

''تیار تو کچھ بھی نہیں ہے''۔

چاول پکانے پر اتفاق ہوا، کمال نے گارڈ کو دہی اور کچھ شیرینی لانے کو بھیجا اور خود چاول ابالنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کھانا تیار ہو گیا۔ کھانے کے بعد کمال نے پوچھا، اب بتاؤ، کیا کہنا تھا؟ مانا نے اپنی سالگرہ کا کارڈ دیتے ہوئے اسے دعوت میں شریک ہونے کی درخواست کی۔ کارڈ 'جگ بندھو بسواس' کی طرف سے تھا۔ نام دیکھتے ہی کمال کے دل میں ناگواری کی لہر اٹھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ خط آ گیا جو اس شخص نے برسوں پہلے اسے لکھا تھا اور جو بعد ازاں سنگیتا لے گئی تھی۔ کمال کیسے بھول سکتا تھا؟ مانا نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا، ''کیا ہوا؟'' کمال نے اسے سالگرہ کی مبارکباد دی تو وہ کہنے لگی، ''صرف زبانی مبارکباد؟ آپ کو دعوت میں بھی آنا پڑے گا''۔ وہ خاموش رہا۔ مانا نے خاموشی کا سبب پوچھا تو کمال نے جواب دیا، ''تم خود ہی فیصلہ کرو، مجھے دعوت میں تمہارے گھر آنا چاہیے یا نہیں؟''

''کسی اور دعوت کا میں نہیں کہہ سکتی لیکن میری سالگرہ پر آپ کو آنا ہی ہوگا''۔

''نہیں مانا! میں نہیں آسکوں گا''۔

وہ مایوسانہ لہجے میں بولی، ''میں سمجھ سکتی ہوں لیکن اس دن آپ کو وہاں موجودگی میری سب سے بڑی خواہش ہے''۔

کمال سمجھ گیا کہ مانا پر کسی دلیل یا منطق کا اثر نہیں ہوگا۔ موضوعِ گفتگو بدلنے کی خاطر اس سے پوچھا، ''کتنے دن باقی ہیں؟ اور ہاں! تمہاری شادی کب ہو رہی ہے؟''

اس نے شرم سے لال ہوتے ہوئے جواب دیا، ''ایک رشتہ آیا تو ہے، آپ ہی نے سب کچھ کرنا ہے''۔

''لڑکا کیسا ہے؟ کیا کرتا ہے؟''

''وہ ایک اسپتال میں ڈاکٹر ہے۔ میں نے دیکھا نہیں''۔

پھر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ کمال زیادہ تر ہوں، ہاں میں جواب دیتا رہا۔ ایک موقع پر تو مانا تنگ آ کر بولی، ''آپ کو کیا ہو گیا ہے، کھل کر بات ہی نہیں کرتے، کیا آپ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے؟''

''نہیں، ایسا تو نہیں''۔

کمال کے رویے سے وہ دل برداشتہ ہو کر کہنے لگی، ''شام ہو گئی ہے، اب مجھے واپس جانا چاہیے''۔

''میں ڈرائیور کو کہتا ہے تمہیں چھوڑ آئے''۔

''نہیں، آپ چھوڑ کر آئیں''۔

''میں نہیں جاسکتا''۔

''پھر میں بس پر چلی جاؤں گی۔ میں یہاں آئی ہوں تو آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آسکتے؟''

''وجہ تم جانتی ہو''۔

''مجھے پتہ ہے لیکن قصوروار میں نہیں۔ میں تو اس وقت چھوٹی بچی تھی۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہوا کیا ہے؟ اگر میں آپ کی بہن ہوتی تو کیا پھر بھی اس طرح روکھے پن سے برتاؤ کرتے؟''

''مانا! کون کس کا چہیتا ہے، یہ رشتوں پر منحصر ہوتا ہے''۔

''گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارا رشتہ اب اچھا نہیں رہا؟''

کمال خاموش رہا۔ اس کے ذہن میں وہ چھوٹی سی بچی آگئی جسے کسی اور بچے کے ساتھ اس کا بات چیت کرنا اچھا نہیں لگتا تھا، اس بات پر وہ دوسروں سے لڑ پڑتی تھی۔ وہی بچی اب ایک بھرپور عورت کے روپ میں سامنے بیٹھی تھی، جس کی شادی طے ہو رہی ہے، لیکن وہ اسی پرانے بچگانہ انداز میں اس کے ساتھ جھگڑا کر رہی تھی، اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ خود چھوڑ کر آئے۔ کیا اسے مایوس کرنا چاہیے؟ شاید وہ دوبارہ اس طرح ضد نہ کر پائے۔ یہ سوچ کر کمال نے اسے خود چھوڑنے پر رضامندی کا اظہار کیا تو وہ کھلکھلا اٹھی۔

کمال کا خیال تھا کہ مانا کو اتارنے کے فوراً بعد واپس چلا آئے گا لیکن وہ نہ مانی اور اس کا بازو پکڑ کر، تقریباً کھینچتے ہوئے، گھر کے اندر لے گئی اور داخل ہوتے ہی شور مچادیا، ''پاپا! ماما! دیکھیں کون آیا ہے''۔ اور پھر اپنی ماں کو بھی کمرے میں لے آئی۔ کمال اپنے سامنے بیمار اور لاغر عورت کو دیکھ کر حیران رہ گیا، وہ تو اب پہچانی بھی نہیں جا رہی تھی۔ چند لمحوں بعد مانا کا پتا بھی آ گیا۔ وہ اپنی بیوی سے بھی زیادہ کمزور اور ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ کمال کو ان پر بہت ترس آیا۔ وقت نے کیا سے کیا کر دیا ہے۔

مانا کی ماں نے گفتگو شروع کی، ''تم پورے ملک میں مشہور ہو، کئی اعزازات مل چکے ہیں تم نے اپنے گاؤں میں ایک اسکول بھی تعمیر کیا ہے، اخبارات تمہارے کارناموں اور تصویروں سے بھرے ہوتے ہیں، ٹی وی چینلز تمہارے انٹرویو دکھاتے رہتے ہیں، مانا بڑے عرصے سے تمہاری باتیں کر رہی ہے، آخر کار آج وہ خود تم سے ملنے چلی گئی''۔

کمال خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر مانا اسے اپنے کمرے میں لا کر کتابیں دکھانے لگی۔ اس نے اپنی تمام طبع شدہ کتابیں بک شیلف میں رکھی دیکھیں۔ ''بڑی دیدی نے کتاب فروش کو کہا ہوا ہے کہ آپ کی ہر تازہ تصنیف اس کے پاس پہنچنی چاہیے، پھر وہ مجھے بھیج دیتی ہے''۔

مانا کی ماتا شیرینی کی ایک رکابی لے آئی۔ کمال نے یہ کہتے ہوئے معذرت کی کہ دوپہر کو وہ میٹھا کھا چکا ہے۔ اتنے میں اس کے باپ نے اندر آ کر پوچھا، ''کیا تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟'' کمال چپ رہا۔ بسواس صاحب بولتے رہے، ''میں اتنا کٹر اور تنگ نظر نہیں پھر بھی تمہیں دھرم کے حوالے سے لکھ دیا تھا۔ اگر میں جانتا کہ تم اس قدر زود حس اور مخلص ہو تو کبھی بھی ایسا خط نہ لکھتا۔ لیکن اب اپنی ندامت اور پشیمانی کے اظہار کا میں کوئی ثبوت بھی نہیں دے سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ کسی کے بارے میں قائم کردہ تاثر ختم کرنا بڑا مشکل ہے، پہلا تاثر کبھی بھی دھندلا نہیں پڑتا''۔

ان لفظوں کے خلوص اور سچائی نے کمال کے دل کو چھولیا۔ واپسی پر وہ سوچتا رہا کہ پہلا تاثر دائمی تو ہوتا ہے مگر بعض اوقات حقیقی نہیں ہوتا۔ کسی کی شخصیت بعد میں کھلتی ہے۔ مینا کے ساتھ اس کے تعلقات اور رشتہ کی دراڑ بھی پہلے تاثر سے بڑھتا

شروع ہوئی تھی۔ جب مینا کے والدین نے کمال سے اس کی شادی کی بات چھیڑی تو اس نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ سنگیتا سے شادی کا خواہشمند ہے، اور جب بعد میں سنگیتا کی بجائے مینا اس کی پتنی بنی تب سے اس کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ سنگیتا سے مایوس ہونے کے بعد ہی کمال نے اسے اپنی پتنی سیو کار کیا ہے، گویا وہ کمال کی پہلی نہیں، دوسری ترجیح تھی، سنگیتا نہیں ملی تو چلو، مینا سے بیاہ کرلو۔ ہوسکتا ہے کہ مینا کی اخلاقی لڑکھڑاہٹ اور کمال کے ساتھ بے رخی میں اس تاثر کا بھی بڑا ہاتھ ہو۔

گھر واپس پہنچ کر اس کی بے چینی اور بے قراری فزوں تر ہوگئی۔ مینا کی یاد دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ اس نے اپنا جیون مینا کے اچھے مستقبل کے بدلے رہن رکھ دیا تھا، اور جب آشاؤں کا، سپنوں کا محل دھڑام سے نیچے گرا تو اس کے ساتھ وہ خود بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ تنہا اور مینا کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور تک ختم ہوگیا لیکن تنہائی بھی جان لیوا تھی۔ اکیلا پن اس کی نس نس کو نچوڑ رہا تھا، لیکن دل کے کسی کونے میں زندہ رہنے کی خواہش ہنوز باقی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے بار بار سمجھایا تھا کہ کسی کا ساتھ اس کے زخم کے لیے پھاہا ثابت ہوگا، اسے شادی کر لینا چاہیے۔

کمال نے اس تجویز پر غور کیا تو اس کے ذہن میں پہلا نام ریتا کا آیا جو خود بھی اس سے شادی کی آرزومند تھی۔ چونکہ کمال شادی شدہ تھا اس لیے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی حالانکہ وہ دوستی کا رشتہ بھی رکھنا چاہتی تھی۔ وہ تا حال غیر شادی شدہ تھی۔ کمال نے اس سے بات کرنا چاہی۔ آواز سنتے ہی اس نے پہچان لیا۔ کمال نے اس سے دوبدو ملاقات کا اظہار کیا جس پر وہ حیرت سے کہنے لگی، ''بڑی عجیب بات ہے! منڈل جیسا پاک باز شخص ایک کنواری، نوجوان لڑکی سے بات کرنے کا تمنائی ہے۔ خیر! بتائیں، میں کب آپ کے دفتر حاضر ہو جاؤں''۔

''دفتر میں نہیں، میں کہیں اور ملنا چاہتا ہوں''۔

''آپ دفتر کے علاوہ لوگوں سے اور کہیں نہیں ملتے، چلیں، بتائیں میں کہاں آؤں؟''

''میرے گھر''۔

''مجھے یقین نہیں آرہا۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''وہی جو تم نے سنا''۔

''تو پھر میں آج شام ہی کو آرہی ہوں، اوہ ہاں، اگر ارادہ بدل جائے تو مجھے بتا دیجیے گا''۔

کمال نے فون منقطع کر دیا۔

....

شام کو ریتا کمال کے گھر آئی اور اس سے ملاقات کا مقصد پوچھا۔ کمال نے الٹا اس سے سوال کیا، ''تمہارے گھر میں کون کون ہے؟''

''میں اور میرے ماتا پتا''۔

''کوئی بھائی، بہن؟''

''نہیں، کوئی نہیں''۔

''تم نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد حیدر آباد سے انگریزی زبان کا کورس کیا، تمہارے پتا سیلز ایگزیکٹو ہیں اور ماں ایک کالج میں پڑھاتی ہے''۔

''باتیں تو ٹھیک ہیں مگر آج سے پہلے تم نے کبھی بھی میرے اور خاندان کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا''۔

''کیا یہ پوچھنا ناگوار گزر رہا ہے؟''

''بالکل نہیں۔میرے بارے میں جو جاننا چاہتے ہو، پوچھ لو''۔

''صرف ایک بات پوچھوں گا۔کیا اپنی شادی کے متعلق تم خود فیصلہ کروگی؟''

''بلاشبہ''۔

''کیا مجھ سے شادی کروگی؟''

''کیا مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟''

''نہیں، میں سنجیدہ ہوں''۔

''مگر تم تو شادی شدہ ہو''۔

''اب نہیں ہوں۔ہم میں طلاق ہوگئی ہے''۔

''اوہ!اب میں سمجھی''۔

''اب تمہارا جواب کیا ہے؟''

''کیا یاد ہے کہ میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا وہ تمہارے ساتھ نہیں رہے گی''۔

''بالکل یاد ہے، اور میں نے جواب دیا تھا کہ وہ میرے جیون کا حصہ ہے۔اس وقت میں یہی سمجھتا تھا''۔

''اب بھی کہو' وہ میری زندگی ہے، اگر دوسروں کے ساتھ سوتی ہے تو کیا ہوا'، ذرا پھر سے کہو، وہ میری زندگی ہے''۔

''پلیز!میں بہت تنہا ہوں۔میرے جیون کا حصہ بن جاؤ''۔

''تنہا ہو؟ جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں تنہا ہوں، اس سے کہاں تھے تم؟ میں تمہاری دوست بننے کی خواہش مند تھی، پتنی نہیں، مگر تم نے میری دوستی کا ہاتھ جھٹک دیا''۔

''تم نے کہا تھا۔۔۔۔۔''۔

کمال کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ پھٹ پڑی،''یاد ہے تم نے مجھے کیا کہا تھا؟ میرے ایک سوال کا جواب دو۔اگر تمہاری پتنی تمہیں چھوڑ کے نہ جاتی تو کیا تم پھر بھی میرے پاس آتے؟''

''نہیں''۔

''یعنی تم ایک آئیڈیل پتی بنے رہو اور میں تنہا، اکیلی جیون گزاروں۔اور جب تمہاری پتنی نے تمہیں کسی اور کی خاطر چھوڑ دیا ہے تو میرے پاس آ گئے ہو۔تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں ایک ضدی اور دھتکارے ہوئے شخص کو قبول کرلوں گی؟''

''مگر تم۔۔۔۔۔''۔

''ہاں، اگر تم اس وقت میرے پاس آتے تو میں تمہیں ضرور سیو کار کر لیتی۔اب تم کیا ہو؟ ایک کھرچن، ایک جوٹھن، ایک فالتو شخص!اب جاؤ اس کے پاس جس کا تم نے برسوں انتظار کیا تھا، وہ بے شرم، احسان فراموش، خودغرض، غیر ذمہ دار، فاحشہ، ایک رنڈی۔ایک ایسی عورت جس نے ساری زندگی تمہیں دھوکہ دیا، ایک چونچلے باز، دوسروں کے بستر گرم کرنے والی، چلتر باز۔اور تم نے سارا جیون اس کے نام وقف کر دیا۔کیا تمہیں ان باتوں کا علم نہیں تھا؟ اس کے چال چلن سے بے خبر تھے؟''

''پلیز''۔

''اوہ!ابھی تک اس کے لیے نرم گوشہ!پھر کسی اور کے ساتھ شادی کا کیسے سوچ لیا؟ کیا تمہارے ذہن میں کسی اور کے لیے معمولی سی بھی جگہ ہے؟ کیا شادی کا مطلب صرف جنسی تسکین ہے؟ اگر جنسی طلب ہے تو شہر میں کسبیوں اور ویشیاؤں کی کمی نہیں۔پہلے بھی تو ایک ایسی ہی عورت کے ساتھ رہتے تھے، لہٰذا اب کوئی مشکل نہیں ہوگی''۔

''ریتا۔۔۔۔۔''۔

''میرے نزدیک مت آنا۔ آخری لمحوں تک تم اس کی منت سماجت کرتے رہے ہو، اور جب اس نے تمہیں بھیک نہ دی تو میرے پاس آ گئے ہو۔ کیسے آ گئے ہو؟''

''ریتا! مجھے بہت بڑا اسبق مل گیا ہے''۔

''کون سا سبق؟ کیا تمہارے خیال میں شادی اور کسی مجرم کو گرفتار کرنے میں کوئی فرق نہیں؟ یونیفارم پہنو، بندے کو پکڑو اور جیل میں ڈال دو۔ شادی دو دلوں، دو ذہنوں کا ملاپ ہے۔ تمہارے پاس ہیں یہ چیزیں، مسٹر منڈل؟''

ریتا کی جلی کٹی اور طیش سے بھری باتیں سن کر کمال کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ دھیرے سے بولا ''جس طرح بندوق سے نکلی ہوئی گولی واپس نہیں آتی، اسی طرح منہ سے نکلے الفاظ بھی واپس نہیں پلٹائے جا سکتے۔ پلیز! میں اپنی تجویز واپس لیتا ہوں''۔

''کیا ایسی تجویز بچوں کا کھیل ہے؟ جب چاہا کسی کو ٹھکرا دیا، جب چاہا شادی کی تجویز دے دی، پھر واپس لے لی''۔

''پلیز! چپ رہو، مجھے معاف کر دو۔ مہربانی سے مجھے اکیلا چھوڑ دو''۔

ریتا نے غصے میں اپنا بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ کمال کو احساس ہوا کہ وہ ساری عمر لفظوں اور وعدوں پر بھروسہ کرتا رہا ہے۔ مینا کے وعدوں پر اس نے ایمان کی حد تک یقین کیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اسے دھوکہ دے گی۔ ادھر ریتا تھی جو کسی زمانے میں اس کے ساتھ دوستی کی خواہاں تھی مگر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے کمال نے مثبت جواب نہیں دیا تھا، اب اس کا خیال تھا کہ شادی کی پیشکش پر وہ خوش ہو گی لیکن اس کا ردِعمل شدید زہریلا تھا۔ وہ ابھی تک انسان کی حقیقت نہ سمجھ پایا، اسی وجہ سے مینا نے اس کی سادگی کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اب ریتا نے اس کی اتنی بے عزتی کی ہے تو اسی سبب سے۔ دوبارہ شادی کرنے کی خواہش اور امید دم توڑ گئی، اب تو اس کے بارے میں سوچنا ہی فضول اور بے سود تھا۔ اکیلا رہنا ہی مقدر بن گیا تھا۔ کیا اپنی پتنی کا اتنے برس انتظار کرنا حماقت نہیں تھی؟

ریتا کے رویئے کا ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ کمال کا اس حد تک مینا کی رضا جوئی اور فرمانبرداری کرنا اس کے لیے بالکل ناقابلِ قبول تھا، اور پھر مینا کا چال چلن بھی اس کی نفرت کا باعث بنا۔ جب کبھی اس نے مینا کی بے راہ روی کے متعلق اشارہ کیا، کمال کو بات پسند نہیں آئی۔ مینا کے بارے میں کوئی منفی بات اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ ریتا سے شادی کر کے اس کی اپنی زندگی مزید اجیرن ہو جاتی۔ ممکن ہے کوئی اور لڑکی بھی اسی قسم کا ردِعمل ظاہر کرتی۔ دوبارہ شادی نہ کرنا ہی واحد حل تھا۔

....

ریتا کی بدسلوکی کمال کے دل پر نقش ہو کے رہ گئی۔ وہ اسے موردِ الزام بھی نہیں ٹھہرا سکا کیونکہ اس کے خیال میں ریتا کی شدید ناراضی درست تھی۔ اپنی حماقت کا سوچ سوچ کر وہ اور زیادہ پریشان ہو جاتا۔ اس کے جذبات اور انا دونوں بری طرح گھائل ہوئے تھے۔ سارا قصور تو مینا کا تھا جس نے اس کے ساتھ بڑے وعدے اور دعوے کیے تھے، وہ اسی خوش فہمی میں اس کا انتظار کرتا رہا اور وہ دھوکہ دے کر چلتی بنی۔ مینا کے ساتھ اس کی وفاداری بالآخر حماقت ثابت ہوئی۔ وہ مرنے کے قریب جا پہنچا، ریتا سے شادی کی درخواست کر کے ذلیل ہوا۔ مینا کو بھی زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں، اسے سزا بھگتنا چاہیے۔ پھر اگلے لمحے ذہن میں آیا کہ اسے سزا کیسے مل سکتی ہے، وہ تو اس سے رشتہ توڑ کر چلی گئی، اور پھر یہ کہ ایک آزاد فرد ہونے کے ناتے اس نے اپنا حق استعمال کیا ہے۔

کمال کا ذہن دو نیم تھا، ایک طرف قانونی سوچ اور دوسری طرف اخلاقیات، دونوں میں ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اخلاقی پہلو اسے کچوکے دیتا کہ مینا نے اس کے خلوص کا ناجائز اور بھرپور فائدہ اٹھایا اور پھر رس چوس کر چھلکے کی مانند پھینک دیا۔ اس قسم کے بے وفا اور اخلاقی قدروں سے عاری لوگوں کو معاف کر دینا غلط مثال ہو گی۔ دوسری طرف قانونی شخصیت مینا کا دفاع کر رہی تھی، ''مانا کہ اس نے بے وفائی کی، وہ احسان فراموش اور غیر ذمہ دار تھی لیکن اس نے کسی غیر قانونی حرکت کا ارتکاب نہیں کیا''۔

اخلاقیات نے یاد دلایا، ''زنا کاری، دھوکہ دہی اور تمہاری زندگی اور عزت سے کھیلنا کیا جرم نہیں؟''

قانون کا جواب تھا، ''پھر اس کے خلاف قانونی کارروائی کرو، لیکن یہ بھی تو تمہارا پاگل پن تھا کہ اتنا عرصہ گزرنے پر بھی تمہیں ہوش نہیں آیا، اب اسے سزا دینے کا کیا سوچ رہے ہو؟ اگر چاہتے تو اسے ساری زندگی رونے دھونے پر مجبور کر سکتے تھے''۔

''وہ کیسے؟''

''تم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جسے بنیاد بنا کر وہ تم سے طلاق کا مطالبہ کر سکتی۔ اگر تم اسے طلاق نہ دیتے تو وہ آج بھی تمہاری بیوی ہوتی۔ اس نے تمہاری شہرت، عزت اور عائلی زندگی پر جو داغ لگائے ہیں تم ان کا بدلہ اس طرح لے سکتے تھے کہ ساری زندگی اسے اپناتے، نہ چھوڑتے، بیچ منجدھار میں چھوڑ دیتے''۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ وہ میری بیوی تھی، کیا مجھے اس کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کرنا چاہیے تھی؟ یہ میرے وقار کے خلاف ہے''۔

''پھر اسے سزا دینے کا کیوں سوچ رہے ہو؟''

''میرے بارے میں سوچو۔ اس نے میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے، کچھ تو سزا ملنی چاہیے اسے''۔

''بہت دیر ہو چکی ہے۔ قانون تمہاری مدد نہیں کر سکتا''۔

''اگر قانون میں گنجائش نہیں تو میں خود منصف بن کر اسے سزا دوں گا''۔

''اس کی بھی قانون میں کوئی اجازت نہیں''۔

''میں نے سارا جیون قانون کی پاسداری میں گزارا ہے، اب میں اسے سبق سکھانے کے لیے قانون اپنے ہاتھ میں لینے کو تیار ہوں''۔

''ایسا کرنے سے تمہیں خود بھی سزا ہو سکتی ہے''۔

''ٹھیک ہے۔ میرا جرم ثابت ہو گا تب ہی مجھے سزا ملے گی''۔

''تمہارے خیال میں کیا قانون تمہیں پکڑ نہیں سکتا؟''

''غالباً نہیں''۔

''اگر تم پکڑے گئے تو؟''

''چوبیس گھنٹے یہ اذیت، یہ دکھ درد برداشت کرنے سے تو بہتر ہے کہ میری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزر جائے یا موت مجھے سکون دے دے''۔

''اگر اسے سزا مل جائے تو کیا تمہیں چین آ جائے گا؟''

''ہاں، شاید''۔

''ہو سکتا ہے تمہاری تکلیفوں میں اضافہ ہو جائے''۔

''وہ کیسے؟''

’’مان لیا، قانون شکنی پر تم صاف بچ نکلتے ہو، کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا، لیکن تمہارا ضمیر تو تمہیں چر کے دیتا رہے گا۔ مجھے تمہارے ذہن اور سوچوں کا علم ہے، تم کبھی بھی اپنے آپ کو معاف نہیں کرسکو گے۔ اس وقت تمہیں کم از کم یہ تسلی تو ہے کہ تم نے اس کے ساتھ کوئی ظلم، کوئی ناانصافی نہیں کی۔ کوئی ایسی ویسی حرکت کرو گے تو بچا کھچا سکون بھی غارت ہو جائے گا‘‘۔

’’سکون تو مجھے اب بھی نہیں ہے‘‘۔

’’وہ اس لیے کہ تمہیں اس سے شدید پریم تھا، مگر اس نے دھوکہ دیا۔ اس تکلیف اور بے سکونی کا سبب تمہاری اپنی انا ہے۔ اگر کسی اور کے ساتھ تم شادی کر لیتے تو بے چینی اور تڑپ میں کمی ہو جاتی‘‘۔

’’تمہیں علم ہی ہے کہ ریتا نے میرے ساتھ کیا کیا ہے‘‘۔

’’تم نے بھی تو اس کے جذبات، اس کی دوستی کی مخلصانہ خواہش کو رد کر دیا تھا۔ اسے بھی تو بہت دکھ ہوا ہوگا، لہٰذا جب اسے موقع ملا، اس نے تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کیا، لیکن میرے خیال میں اندر سے وہ تمہیں پریم کرتی ہے اسی لیے تو اس کے لہجے میں اتنی تلخی تھی‘‘۔

’’واہ! کیا شاندار منطق ہے! اسے مجھ سے پریم ہے اس لیے میری اتنی تذلیل کی۔ کیا کوئی شخص اپنے پریمی کو اس طرح اذیت اور دکھ دیتا ہے؟ نہیں‘‘۔

’’پھر جب تم نے اس کی دوستی کا ہاتھ جھٹک دیا تھا، بعد میں اس نے کسی اور کے ساتھ شادی کیوں نہیں کی؟‘‘

’’مجھے نہیں پتہ‘‘۔

’’یہی تو تمہارا مسئلہ ہے۔ تمہیں کبھی جاننے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ تمہاری ساری مصروفیت سرکاری معاملات، رفاہِ عامہ کے کاموں یا پھر لکھنے پڑھنے تک محدود تھی۔ کیا اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کبھی سوچا تھا؟ تم نے کبھی نہیں سوچا، اور اس کے باوجود چاہتے ہو کہ سب لوگ تم سے پریم کریں۔ یہ ہے اصل سبب تمہاری بے چینی، دکھ درد اور بے کلی کا‘‘۔

’’کیا مطلب؟‘‘

’’تم نے دوسروں سے محبت نہیں کی، بس یہ خواہش تھی کہ تم سے پریم کیا جائے، لوگ تمہیں پیار کریں۔ تمہارے ذہن میں تھا کہ ایمانداری، صاف گوئی اور کام کاج کی وجہ سے لوگ خود بخود تم سے محبت کریں گے، تمہارا احترام کریں گے، لیکن تمہیں اس معیار کی محبت اور چاہت نہیں ملی جس کے تم خواہاں تھے‘‘۔

’’تو میرے قانونی ہمزاد! مجھے اپنی زندگی ایسے ہی گزارنی پڑے گی‘‘۔

’’نہیں مسٹر منڈل! اپنی ترجیحات بدلو۔ سرکاری کام اتنا کرو جتنا تمہیں کہا گیا ہو، اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعمیر اور انتظامات میں بلاضرورت وقت ضائع مت کرو، اپنی ذات کے لیے بھی کچھ وقت نکالو، عام لوگوں کی مانند زندگی بسر کرو، کسی ناری سے پریم کرو، اس کے ساتھ کچھ سمے بتاؤ، دیکھ لینا من آنگن میں کتنی خوشیاں ہوں گی۔ مگر تم ایک طرف اپنے معمول سے ہٹنا نہیں چاہتے اور پھر اوروں کی محبت کے متلاشی بھی ہو۔ یہ ناممکن ہے۔ اب فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ ہے‘‘۔

قانونی اور اخلاقی ہمزاد کی باہمی کشمکش جاری رہی۔

....

کمال گہری نیند میں تھا کہ فون کی گھنٹی نے اسے جگا دیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر بینر جی بتا رہے تھے کہ اس کی ماں سخت بیمار ہے، فوراً آ جاؤ۔ وہ چند روز سے بیمار تھی اور علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا مگر طبیعت زیادہ خراب ہونے کی وجہ سے اسے اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ اتنی صبح سویرے کمشنر کو فون کرنا مناسب نہیں تھا لہٰذا پیغام چھوڑ کر وہ گاؤں نکل گیا۔ باپ کی

وفات کے وقت ماں نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ شاید اپنے آخری وقت وہ کمال کو اپنے پاس نہ دیکھ پائے۔ اس کی بیماری کی اطلاع ملنے پر بھی وہ کام کاج کے سبب گاؤں نہ جاسکا تھا۔ ماں کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ اب جبکہ وہ دنیا میں نہیں رہی، رشتہ داروں نے پیغام بھیجا کہ تدفین پر اس کا انتظار ہورہا ہے۔ گھر پہنچا تو ماں کی میت صحن میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کی اجازت سے نمازِ جنازہ ادا ہوئی۔ میت کو قبرستان لے جایا گیا۔ دفن کرنے سے قبل اس کے چہرے سے کفن ہٹا کر سب کو دیدار کرایا گیا۔ کمال نے دیکھا تو آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس چہرے کو وہ دوبارہ کبھی نہ دیکھ پائے گا۔

تدفین کے بعد کمال نے گھر آ کر سب بھائی بہنوں اور رشتہ داروں کو پرسا دیا۔ یقین کی ایک لہر دل میں اٹھی کہ اب کوئی نہیں جو اسے گھر رہنے پر مجبور کرے، کوئی نہیں جو اس کے دیر سے آنے کی شکایت کرے، اب کوئی نہیں جو اسے بھائی بہنوں کا خیال رکھنے کی تلقین کرے گا۔ بعض اوقات ماں کی باتیں اور دخل اندازی اس کی طبیعت پر گراں گزرتیں لیکن اب وہ ہستی بھی نہ رہی جسے اپنا کہہ سکے، سب کچھ ختم ہو گیا۔

....

واپسی پر ماں کی یادیں، باتیں، شفقت، اس کے ذہن میں تازہ ہو رہی تھیں۔ اس کے پاس بیٹھ کر اس نے حروفِ تہجی سیکھے، اسی نے کمال کے ہائی اسکول میں داخلہ کی حمایت کی تھی، میٹرک کرنے کے بعد ماں کی خواہش تھی کہ گھریلو اخراجات کے لیے کہیں نوکری کرلے، وہ گھر بار کو خوشحال دیکھنے کی آرزومند تھی۔ ایک بار ایک نجومی نے اس کا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ یہ لڑکا ایک شاندار عمارت کھڑی کرے گا، یہ سن کر مریم بہت خوش ہوئی تھی۔ جب وہ رات گئے کالج سے واپس آتا تو ماں اس کی منتظر بیٹھی ہوتی۔ منہ اندھیرے وہ اٹھ کر اس کے لیے کچھ نہ کچھ پکاتی تا کہ وہ کھائے پیئے بغیر کالج نہ جائے۔

شادی کے بعد مینا سے اختلافات کا سن کر کمال کو بار بار سمجھاتی کہ آپس میں صلح صفائی اور پیار سے رہیں۔ یہاں تک بھی ہوا کہ ایک بار ماں نے کمال کے بھائی کو مینا کی والدہ کے پاس بھیجا کہ دونوں کسی طور ہنسی خوشی زندگی بسر کریں۔ کمال کو الٹا افسوس ہوا تھا اور اس نے گھر سے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ ماں اکثر اسے سمجھاتی کہ اگر مینا تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تو تم دوسری شادی کرلو، تنہا جیون کیسے گزرے گا؟ جب جوانی ڈھل جائے گی تب تمہارے پاس کون ہوگا؟ اب ایسی باتیں کون کرے گا، کون سمجھائے گا؟

وہ اپنے آپ کو بالکل اکیلا، تنہا محسوس کر رہا تھا، نہ کوئی دوست، نہ کوئی اپنا جس سے دکھ سکھ کی بات ہو سکے، یہی سوچتے سوچتے گھر پہنچا اور بے دم، دل شکستہ آ کر بستر پر گر گیا۔ تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے مانا بول رہی تھی،

''منڈل! کل شام اپنے گھر پہ ہی رہنا''۔

''کیوں؟''

''باردی تم سے ملنا چاہتی ہے''۔

''وہ میرے پاس نہ آئے''۔

''کیوں؟''

''وہ کسی زمانے میں مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی، اب وہ کسی اور کی پتنی ہے۔ اس کا آنا مناسب نہیں''۔

''اس سے خود ہی بات کرنا۔ میرا فرض تھا تمہیں مطلع کردینا، سو میرا فرض ادا ہو گیا ہے''

اتنا کہہ کر اس نے فون منقطع کر دیا۔

....

مانا اخبار پڑھ رہی تھی کہ دوسرے کمرے سے اسے سنگیتا کے بولنے کی آواز آئی جو اس وقت کمال سے بات کر رہی تھی، ''کمال! مانا سے شادی کرلو''۔

''کیا میرے ساتھ مذاق کر رہی ہو؟''

''نہیں، میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں''۔

''میری اور مانا کی عمر میں فرق معلوم ہے؟''

''مانا کو پتہ ہے، اور اسے اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہیں''۔

''تمہاری شادی مجھ سے نہیں ہوئی تھی، پھر تمہاری بہن کیسے کرسکتی ہے؟ جو حالات اس وقت تھے، آج بھی ویسے ہی ہیں''۔

''میں اس وقت فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں تھی، اب فیصلہ میرا ہوگا''۔

''کیا اپنے ماتا پتا سے بات کی ہے؟ کیا وہ رضامند ہیں؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مانا راضی ہے''۔

''تمہاری کل کی اور آج کی سوچ میں بہت فرق ہے، لیکن تم میری شادی کے معاملہ میں اتنی فکرمند کیوں ہو؟''

''تم ایک شریف اور بھلے انسان ہو مگر جیون میں اکیلا پن اور سونا پن ہے۔ میں آج کل اپنے پتی اور بچوں کے ساتھ نہیں، لہٰذا جانتی ہوں کہ تنہائی کتنی کربناک ہوتی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ تمہارے دکھ درد کی ذمہ دار میں بھی ہوں۔ پتہ نہیں تم نے میرے ساتھ اپنے تعلقات کی بات مینا سے کیوں کی تھی۔ کوئی لڑکی یہ برداشت نہیں کرسکتی۔ یہ تمہاری غلطی تھی جس کی سزا تم بھگت رہے ہو۔ اور زیادہ دکھ نہ اٹھاؤ۔ مانا سے شادی کرلو۔ ہم سب تمہارا بہت خیال رکھیں گے۔ وہ مجھ سے بہتر ہے''۔

''اچھے یا برے کی بات نہیں۔ میں تمہارا شکرگزار ہوں کہ تمہیں میری خوشی کا احساس ہے لیکن تم خود میرے بارے میں کیا رائے رکھتی ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''مجھے تم سے پریم تھا، شادی کی خواہش تھی، وہ تمہاری بہن ہے، ہم دونوں کی شادی کی صورت میں وہ میری سالی ہوتی، گویا میری بہن کی مانند۔ میں اس کو اسی نظر سے دیکھتا ہوں، اب شادی کیسے کرسکتا ہوں؟''

''یہی تو تمہارا مسئلہ ہے۔ میں آج تک تمہارے اصولوں کو نہیں سمجھ سکی کہ تم کیا چاہتے ہو اور کیا نہیں''۔

''خیر، اب تو سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں لیکن تمہیں بخوبی علم ہونا چاہیے کہ میں اس سے شادی نہیں کرسکتا''۔

''ٹھیک ہے، اس سے شادی مت کرو، کسی اور سے کرلو''۔

''فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا''۔

''کمال! پلیز! مانا کو علم نہ ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی ایسی بات کی ہے''۔

''بالکل ایسا ہی ہوگا''۔

....

سرکاری امور نبٹانے کے بعد کمال دفتر سے اٹھنے ہی والا تھا کہ اچانک اسے یاد آیا کہ آج کی ڈاک میں تین ذاتی خطوط آئے پڑے ہیں۔ اس نے پہلا خط کھولا۔ اندازِ تحریر بہت صاف تھا۔ اس نے پڑھنا شروع کیا:

''مسٹر منڈل!

''شاید آپ مجھے پہچان جائیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ نہ پہچانا ہو کیونکہ سارا دن آپ کے پاس نت نئے لوگ

آتے رہتے ہیں، پھر سوشل ورک اور دیگر کاموں کی وجہ سے بہت سے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔
میری آپ سے پہلی ملاقات Bengali Initiative کی تقریب میں ہوئی تھی۔ آپ کی تقریر اس قدر پر اثر، منطقی اور معلومات سے بھر پور تھی، اور مجھے اس سے اتنی تحریک حاصل ہوئی کہ میں نے اپنی ہمت اور شکتی سے بھی بڑھ کر وہ کام کیا جس کا قبل ازیں تصور بھی نہیں کیا تھا۔
آپ اسٹیج سے نیچے اترے تھے تو میں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا تھا۔ اگر چہ آپ نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا مگر رویے میں شائستگی نمایاں تھی۔ میں نے آپ کو اکیڈمک سٹاف کالج میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے لیے ہونے والے ایک کورس میں بحیثیت مہمان مقرر تشریف لانے کی دعوت دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آپ سے وہی بصیرت افروز باتیں سنی جائیں جو آپ نے مولالی یوبا کیندر کی تقریب میں کی تھیں لیکن ہمارے شرکا آپ سے جرائم اور متعلقہ معاملات پر سننا چاہتے تھے۔ آپ نے ان کی خواہش پر فی البدیہہ تقریر کی۔ میں سائنس کی استاد ہوں اس لیے قانون اور سماجیات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی، تاہم میں پہلی بار گناہ، جرم اور برائی کے مفہوم سے شناسا ہوئی۔ مجھے پہلی مرتبہ کریمنل اور سول جرائم میں فرق کا علم ہوا۔ پھر قابل دست اندازی اور ناقابل دست اندازی پولیس مقدمات کا تعارف اتنا علمیت سے بھر پور اور دلکش تھا کہ سامعین انتہائی انہماک سے سنتے رہے۔
اسی روز میں آپ کی محبت میں گرفتار ہو گئی لیکن بعد میں علم ہوا کہ آپ شادی شدہ ہیں، لہٰذا میں نے اپنے جذبات دل ہی میں دفن کر دیے، پھر یہ بھی تھا کہ میں شادی کی عمر سے بھی گزر چکی تھی۔
میرا تعلق بردوان کے ایک دور افتادہ گاؤں سے ہے۔ میرے والدین آپ کے ماتا پتا کی طرح بہت غریب نہیں تھے۔ پتاجی ایک پرائمری اسکول میں استاد تھے۔ میٹرک کے بعد میں کلکتہ ایک ہوسٹل میں رہنے لگی اور وہیں سے پی، ایچ، ڈی تک باقی کی تعلیم مکمل کی۔ اگر چہ بہت سے لڑکے اور لڑکیاں میری دوست تھیں لیکن ان میں سے کسی کے ساتھ گہری دوستی اور قربت نہیں تھی کیونکہ کسی کو بھی میرے جیسے عام لوگوں کی زندگی سے غرض نہیں تھی، وہ اخلاقیات سے تہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ذہنی طور پر سب سے دور دور رہی۔ میرے پتا اور ماموں نے چند ایک لڑکوں کے بارے میں مجھ سے بات کی لیکن میں کسی سے شادی پر تیار نہ ہوئی کیونکہ جسے میں جانتی ہی نہیں، اس کے ساتھ سارا جیون نباہ کرنا مشکل لگ رہا تھا، لہٰذا میری شادی نہ ہوئی۔ پتاجی پچھلے سال سورگباش ہو گئے، ماتا جی میرے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ ایک الگ گھر ہونے کے باوجود میرے جیون میں خلا ہے، میں بھی تنہا اور اکیلی ہوں۔
حال ہی میں میری دوست کرشنا نے آپ کی عائلی زندگی اور پتنی سے علیحدگی کے بارے میں بتایا۔ میں نہیں جانتی مستقبل کے متعلق آپ کا کیا ارادہ ہے۔ اگر علم ہو جاتا تو بہتر تھا، بہر حال اب چونکہ آپ بھی اکیلے ہیں اس لیے کھل کر لکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ آپ رضامند ہوں تو ہم دونوں شادی کے بندھن میں جڑ سکتے ہیں۔
مین نے آپ کا ناول 'مساوات کی تلاش' بڑے غور سے پڑھا ہے اور اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ کی سابقہ پتنی کے خیالات جاننے کی کوشش بھی کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کی زندگی میں کوئی ایسا موڑ اور مسئلہ نہیں ہو گا۔ میں آپ کی قلمی کاوشوں کی مداح ہوں۔ میں آج کل بھی سائنس کالج میں تعلیم دے رہی ہوں۔ میری عمر اکتالیس برس ہے (آپ غالباً چوالیس برس کے ہیں)۔

اگر آپ کو میری پیشکش منظور ہوتو براہِ کرم مجھے مطلع فرمائیں، اور اگر قبولیت نہ ہوتو یہی سمجھیں کہ میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ایک ماہ کے اندر جواب نہ آنے کی صورت میں میں سمجھ جاؤں گی کہ آپ کو یہ رشتہ قبول نہیں۔

مخلص

شاہانہ۔

خط پڑھنے کے بعد کمال کے ذہن میں پہلا تاثر یہ پیدا ہوا کہ غالباً یہ واحد خاتون ہے جس کے اندازِ فکر میں اتنی پختگی، شائستگی، قدرتِ بیان اور دوسروں کے بارے میں اچھے جذبات پائے جاتے ہیں۔وہ ایک ایسی عورت نظر آرہی تھی جس کے سپنے وہ ساری عمر دیکھتا رہا، وہ بلاشبہ اس کی جیون ساتھی بننے کے لائق تھی لیکن اندر سے خوفزدہ بھی تھا کہ مبادا زندگی پھر سے کٹھن بن جائے۔ ریتا سے ملاقات کے بعد وہ شادی کے نام سے بدکنے لگا تھا۔اب اور زیادہ کرب، دکھ برداشت کرنے کی ہمت نہیں رہی، بہتر یہی ہے کہ محبت اور احترام کا رشتہ دور سے رکھا جائے، کسی کی زندگی کو اپنی خوشیوں کی قربان گاہ پر کیوں چڑھایا جائے؟

وہ فیصلہ نہ کر پایا آیا اس کے رومانی جذبات پھر سے پیدا ہو رہے ہیں؟ رومان پسند تو وہ ہمیشہ سے تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ کبھی بھی اپنے جذبات کا کھل کر اظہار نہیں کر سکا تھا، اب بھی اس نے یہی سوچا کہ شاہانہ کے خط کا جواب نہ دیا جائے۔

باہر گیٹ سے اس کو فون پر اطلاع دی گئی کہ ڈاکٹر حسین کا کوئی آدمی ملاقات کے لیے آیا ہے۔ بوجھل دل سے کمال نے اسے بلالیا۔وہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص آیا۔اس نے اپنا مسئلہ بیان کیا،"میری سولہ سالہ بچی کو ہمسائے نے اغوا کر کے دیش بندھو اسپتال کے ایک کوارٹر میں اپنے بھائی کے ہاں رکھا ہوا ہے۔ میں تھانے گیا تھا، انہوں نے مجھے یہاں کا نمبر دے دیا۔ میں ڈاکٹر حسین کے پاس کام کرتا ہوں، ان سے آپ کے نام کا ایک سفارشی خط لکھنے کو کہا مگر ان کا کہنا تھا کہ منڈل صاحب کے پاس چلے جاؤ، وہ تمہاری ہر ممکن مدد کریں گے"۔کمال نے متعلقہ تھانیدار کو فون پر ہدایت دی کہ خود جا کر چھان بین کرے۔

....

ریتا کا فون تھا،"میرج رجسٹرار کے دفتر سے فارم لے کر مجھے بھیج دو"۔

"کیوں؟"

"میں تم سے شادی کروں گی"۔

"لیکن میں شادی نہیں کر سکتا"۔

"کیا مطلب؟ تم نے خود ہی تو پیشکش کی تھی"۔

"بالکل پیشکش کی تھی مگر اس سے دستبردار بھی تو ہو گیا تھا"۔

"کیا یہ چاکلیٹ تھی کہ دے کر واپس مانگ لی جائے؟"

"سوری! میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں"۔

"میں نے تمہیں انکار کیا کیا، تمہاری انا پر چوٹ لگی ہے، اور جب تم اپنی پتنی کے قدموں پر گر کر بھیک مانگ رہے تھے، اس وقت کہاں تھی تمہاری انا؟ کیا اس وقت اپنی عزت، وقار بھول گئے تھے؟"

"وہ میرا ذاتی معاملہ ہے، میں کسی کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا"۔

"تم نے خود ہی شادی کی پیشکش کی تھی، اب مجھے کسی اور کے ساتھ مت ملاؤ"۔

"سوری! میں اپنی پیشکش پر معذرت خواہ ہوں"۔

"تم ایسا برتاؤ کیوں کر رہے ہو؟ کیا مجھے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی مہلت نہیں دے سکتے تاکہ میں اپنے آپ کو

تمہارے لائق بنانے کی کوشش کروں؟''

''سوری''۔

''لیکن میں نے کیا کیا تھا؟ میں تو پچھلے کئی مہینوں سے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی اور آج تم نے صاف انکار کر دیا ہے''۔

''میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں شادی نہیں کروں گا''۔

''میں مانتی ہوں کہ اس روز میرا رویہ ٹھیک نہیں تھا، لیکن میرے احساسات کو بھی تو مدِ نظر رکھو''۔

''میں سمجھتا ہوں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کسی اور کے لیے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی''۔

''کیا تم میرے الفاظ ہی میرے منہ پر مار رہے ہو؟''

''یقین کرو ایسی بات نہیں۔ میں وہی کہہ رہا ہوں جو اس وقت میرے دل میں ہے۔ تمہارے لیے میرے دل میں کوئی بغض نہیں۔ تم نے صحیح کہا تھا بلکہ تمہاری وجہ سے میں زندگی کا دوسرا پہلو دیکھنے کے قابل ہوا ہوں، تمہارا شکریہ''۔

''میں ایک بار تم سے مل کر دو بدو بات کرنا چاہتی ہوں''۔

''کسی دن آ جانا مگر شادی کی بات نہیں کرو گی''۔

''تو پھر آنے کی ضرورت ہی کیا ہے''۔

'تمہاری مرضی''۔

پھر سلسلۂ کلام ختم ہو گیا۔

....

شام کی ورزش کے بعد کمال گھر لوٹا تو طبیعت ناساز تھی۔ ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا سے اسے سارا دن غنودگی رہتی لیکن راتوں کو نیند غائب ہو جاتی۔ دفتر میں بھی کام کرتے آنکھیں بند ہونے لگتیں۔ بیٹھنا اور کھڑے ہونا دوبھر ہو رہا تھا، کسی سے بات چیت کرنے کو جی نہ چاہتا۔ اگرچہ مینا کی یاد پہلے جیسی تکلیف دہ نہیں رہی مگر اس کے علاوہ اسے کچھ اور یاد بھی نہ رہتا۔ کام کاج میں دل جمعی نہ رہی۔ جی چاہتا تھا کہ آنکھیں موندھے لیٹا رہے۔ فون کی گھنٹی بجنے لگی لیکن کاہلی اتنی کہ ہلنا دشوار ہو رہا تھا۔ کب دن ڈھلا، اسے خبر نہ ہوئی، رات کا سناٹا اور اندھیرا گہرا ہوا تو وہ اسی گھپ اندھیرے کو اوڑھ کر سویا رہا۔

نیم خوابی کی کیفیت میں اسے یوں محسوس ہوا کہ وسیع و عریض ساگر کے دوسرے کنارے سے کوئی چلا آ رہا ہے، یوں لگا جیسے بجرے کی گھنٹیاں بج رہی ہوں، وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ گھنٹی کی آواز قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ غنودگی کی وجہ سے اندازہ نہ ہو پا رہا تھا کہ آواز کس سمت سے آ رہی ہے۔ غور کیا تو پتہ چلا دروازے کی گھنٹی تھی۔ رات گئے کون ہو سکتا ہے؟

بڑی مشکل سے اٹھ کر دروازہ کھول کر دیکھا تو باہر سفید کپڑوں میں ملبوس ایک عورت کھڑی تھی۔ مدتوں پہلے کس کہانی میں پڑھی سفید پری ذہن میں آ گئی۔ اگر پری تھی تو وہ کھڑکی کے راستے بھی آ سکتی تھی، گھنٹی بجانے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر نہیں، سامنے کھڑی پری کے تو پر ہی نہیں تھے۔

پری کی آواز آئی، ''مجھے پہچانا نہیں؟ میں ثریا خان ہوں''۔

''ڈاکٹر ثریا خان؟''

''بالکل''۔

''رات کے اس سمے؟ کہاں سے آ رہی ہو؟ کس لیے؟''

''رات گئے؟ ابھی تو شام کے ساڑھے سات بجے ہیں، بتی جلاؤ''۔

کمال نے بتی جلائی۔ روشنی ہوتے ہی وہ اندر داخل ہوئی۔ کمال بے سدھ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ ثریا نے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا، ''ڈرائنگ روم کدھر ہے؟'' کمال نے آنکھ کے اشارے سے بتایا۔ دونوں اندر آئے، نقاہت اور کسلمندی اپنا رنگ دکھا رہی تھی، کمال کا جی لیٹنے کو چاہتا تھا لیکن ثریا نے اسے بستر تک نہ جانے دیا۔ پھر اس سے باتھ روم کا پوچھا۔ کمال نے بولے بغیر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ اسے لے کر باتھ روم گئی، ہاتھ منہ دھلا کر واپس کمرے میں لے آئی۔ کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا، ''یہاں بیٹھو۔ تم سے بہت باتیں کرنی ہیں''۔

''میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ میرا تم سے اب کوئی تعلق نہیں''۔

ثریا نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا، ''تم ایک بار میرے گھر درگا روڈ آئے تھے''۔

''کیا پھر آؤں؟''

''نہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ اس روز میرا رویہ ٹھیک تھا، اگر تمہیں سارے پس منظر کا علم ہوتا تو مجھ سے اس قدر ناراض نہ ہوتے''۔

''پتہ نہیں کہ میں تمہاری بات سمجھ سکوں گا یا نہیں، لیکن تم جو کہنا چاہتی ہو، کہہ دو''۔

''تو سنو۔ تمہیں علم ہے کہ میں تم سے پریم کرتی تھی، تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میں نے تمہیں شادی کی تجویز دی، تم نے بھی مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا''۔

''لیکن میں اپنے وعدے سے پھرا نہیں تھا''۔

''ہاں، میں مکر گئی تھی، مگر جانتے ہو کیوں؟''

''تم خود ہی جانتی ہو''۔

''میں نے تمہارے بارے میں سپنے دیکھے تھے کہ تم مشہور ڈاکٹر یا انجینئر بنو گے، لیکن تم اتنے ضدی نکلے کہ اپنے تمام ہمدردوں اور بہی خواہوں کی خواہشوں کو پاؤں میں روندھ کر صرف بی اے، ایم اے کرنے کو اپنی منزل سمجھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ ایک ڈاکٹر ہوتے ہوئے میں نے عام شخص سے شادی کرنے کا سوچا تک نہیں تھا، لہٰذا جب جمیل کا پیغام آیا، میں نے ہاں کہہ دی''۔

''اس کے لیے میں نے تمہیں کبھی بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا، نہ کبھی ایسا کروں گا۔ تمہارا جمیل سے شادی کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم نے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا تھا''۔

''کمال! تم نے تو اعتراف کر لیا ہے مگر انہوں نے کبھی بھی میرے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا''۔

''کس نے؟''

''دادا ابو نے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ شادی کی تجویز خود ان کی جانب سے تھی، کمال مان گیا تھا، اب تمہاری شادی کسی اور سے اس صورت ہو سکتی ہے اگر کمال خود انکار کرے''۔

''مجھے علم نہیں تھا لیکن یہ بات سن کر میرے دل میں ان کے لیے احترام کئی گنا بڑھ گیا ہے''۔

اسے یاد آ گیا کہ ثریا کی شادی کا دعوت نامہ شاہد خان نے اپنے نام سے بھیجا تھا۔ اس وقت کمال یہ سمجھا کہ شاید اس کو جتانے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ دیکھو تم نے شادی سے انکار کیا تو ثریا کے لیے کتنا اچھا رشتہ مل گیا ہے۔ کمال کو اب احساس ہوا کہ اس کے پیچھے دراصل شفقت اور پیار چھپا تھا۔ اگر اس وقت حقیقت کا علم ہوتا تو شادی میں ضرور شرکت کرتا، ثریا کو عروسی لباس میں ملبوس دیکھتا، مگر کمال نے شاہد خان کو بالکل غلط سمجھا تھا۔ صحیح صورتِ حال کا علم نہ ہونے کے سبب بہت سے لوگ بدگمانی میں

مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ثریا پوچھ رہی تھی، ''کیا اسی وجہ سے تمہاری نظر میں میری وقعت نہیں رہی؟''

''نہیں، یہ بات نہیں۔ ایک ڈاکٹر یا انجینئر نا خواندہ لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ میں نے پولیس آفیسر ہوتے ہوئے ایک ایسی لڑکی سے شادی کی جو گریجویٹ بھی نہیں تھی، پھر محض میڈیکل کالج کی طالبہ ہوتے ہوئے تم نے ایک عام بی اے پاس لڑکے سے کیوں رشتہ رکھنا مناسب نہیں سمجھا؟ اس کی وجہ جانتی ہو؟''

''کیا؟''

تمہارا احساسِ کمتری''۔

''کیا مطلب؟''

''نیم خواندہ لڑکیوں میں یہ احساس نہیں ہوتا جو تم جیسی پڑھی لکھی لڑکیوں میں پایا جاتا ہے، لیکن بہت سی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں احساسِ کمتری کی ماری ہوتی ہیں۔ تم جیسی عورتیں زبانی زبانی مساوات اور آزادی کی بات کرتی ہیں جبکہ فی الحقیقت وہ اپنے سے زیادہ پڑھے لکھے شوہروں کی غلامی کو ترجیح دیتی ہیں۔ اگر تم واقعتاً آزاد اور خود مختار زندگی کی خواہشمند ہوتیں تو ایم بی، بی، ایس کے باوجود عام لڑکے سے شادی کر لیتیں اور بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ شادی کی پیشکش خود تمہاری طرف سے ہوئی تھی۔ پھر بھی میں کہوں گا کہ جمیل سے شادی کا تمہارا فیصلہ خود بینی اور سمجھداری پر مبنی تھا''۔

''مگر میرا خیال مختلف ہے''۔

''تمہارا خیال کیا ہے؟''

''میں اب سوچتی ہوں کہ وہ فیصلہ درست نہیں تھا۔ میں جب بھی تمہاری کوئی تحریر یا تم پر لکھی ہوئی باتیں پڑھتی ہوں تو مجھے یاد آجاتا ہے کہ یہ شخص کبھی میرے دل میں بستا تھا، میرا نام بھی اس سے وابستہ ہو سکتا تھا۔ خیر! کیا ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو''۔

''کیا میرے فیصلے سے تمہیں دکھ نہیں ہوا تھا؟ شادی کی بات تم سے کی اور پتنی کسی اور کی بن گئی''۔

''نہیں''۔

''کیوں؟''

''کیونکہ شروع ہی سے یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ ہم دونوں کے درمیان جنت اور جہنم کا سا فرق ہے، تم لوگ ٹھہرے دولت مند، جبکہ میں مفلس تھا۔ میں تعلیم میں اچھا تھا اس لیے تم سمجھتی تھیں کہ میں کامیاب شخص بنوں گا اسی وجہ سے مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ تم لوگوں کے پاس دولت تھی لہٰذا اسے استعمال کر کے مجھے اپنے لائق بنانا چاہتی تھیں۔ میں اپنے پاؤں پر، اپنی محنت اور قابلیت کے سہارے کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ شروع شروع میں ناکامیاں میرا مقدر بنیں، اور فطرتاً تم میری کامیابی کے حصول تک انتظار نہیں کر سکتی تھیں۔ اس وقت کسی قسم کی ضمانت بھی نہیں تھی کہ میں زندگی میں کامیاب ہو سکوں گا، اتنا بھروسہ تو تمہیں مجھ پر تھا ہی نہیں۔ پھر تم نے سوچا کون اور کیوں اتنا خطرہ مول لیا جائے۔ اسی وجہ سے تمہارے فیصلے پر میرے دل میں کوئی ملال نہیں آیا تھا''۔

''اگر میں اس وقت تم سے شادی کر لیتی تو؟''

''میں یقیناً بہت خوش ہوتا''۔

''کس وجہ سے؟''

''مجھے احساس ہوتا کہ تمہیں میری قابلیت، میری محنت پر اعتماد ہے کہ میں ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہوں گا، اور

پھر یہ احساسِ کمتری نہیں کہ میرا پتی بہت تعلیم یافتہ ہے''۔

''کمال! میری ایک درخواست ہے''۔

''کیا؟''

''مجھے اپنا دوست سمجھو''۔

''کیوں؟''

''مجھے امید ہے کہ میں نے جو کچھ کیا، تم اس کا مطلب سمجھ گئے ہو''۔

''شاید''۔

''کیا میں فون سے اپنے گھر بات کر سکتی ہوں؟''

''ہاں، ہاں، بالکل''۔

ثریا نے نمبر ملایا اور نینا آپی سے بات کی، ''نینا! انکل کو بتانا کہ میں کمال کے گھر آئی ہوں۔ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں رات یہیں ٹھہروں گی، صبح سیدھا اپنے کلینک چلی جاؤں گی۔ انہیں بتا دینا۔ میں پھر فون کروں گی''۔

جیسے ہی اس نے فون بند کیا، کمال بول پڑا۔ ''میری طبیعت اتنی خراب نہیں کہ تمہیں یہاں رکنا پڑے''۔

''میں رہنا چاہتی ہوں، تمہیں کیا اعتراض ہے؟''

''اعتراض تو کچھ نہیں لیکن میری طبیعت اتنی خراب نہیں کہ تمہیں رکنے کی ضرورت ہو''۔

''ڈاکٹر میں ہوں، تم نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ مجھے یہاں رکنا چاہیے۔ اب مطلب کی بات کرو۔ تم نے ہری پور کی ایک مغنیہ کے ساتھ بھی تو دوستی کی تھی، اس نے بھی تم سے شادی کا وعدہ کیا تھا، لیکن نہیں کی۔ کیا تمہیں اس کا دکھ ہوا تھا؟''

''مجھے برا ضرور لگا تھا لیکن دکھ نہیں ہوا کیونکہ اس کے ساتھ تعلق بہت مختصر عرصہ کے لیے تھا، پھر یہ بھی تھا کہ اس نے رشتہ داروں اور ماں باپ کی خیالی عزت کا سہارا نہیں لیا تھا۔ وہ ان سب کی رضامندی چاہتی تھی جو نہیں مل سکی۔ آخری بات یہ کہ میری شادی ہونے تک اس نے بیاہ نہیں کیا''۔

''پھر اپنی پتنی کے چلے جانے پر تمہیں اس قدر دکھ کیوں ہوا؟''

''کیونکہ اس نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی، جیون بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا، یہ دعویٰ کیا تھا کہ میرے مرنے پر وہ بھی زندہ نہیں رہے گی، میں نے اسے زندگی بھر کا ساتھی بنا لیا تھا۔ میں چودہ برس اس کی باتوں اور وعدوں پر یقین کرتا رہا، اس کی واپسی کا منتظر رہا، یہ سمجھتا رہا کہ وہ میری ہے۔ لیکن وہ سارے وچن بھول گئی، سارے وعدے توڑ دیئے، مجھے دھوکہ دیا۔ میرا دل و دماغ اس کی وعدہ خلافی، احسان فراموشی اور عدمِ ذمہ داری کو قبول نہیں کر سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ سزا کی حقدار ہے، لیکن دوسری طرف مجھے انفرادی آزادی کا بھی احساس ہے۔ وہ فیصلہ کرنے میں میری رضا یا پسند ناپسند کی محتاج نہیں، اس لیے اسے محض اس وجہ سے نقصان پہنچانے کا روادار نہیں کہ وہ میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ میرے اندر کی کشمکش مجھے مارے جاتی ہے۔ لیکن تمہیں ان باتوں کا کیسے علم ہوا؟''

''مشہور لوگوں کی کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی''۔

''لیکن یہ واقعہ کہیں بھی لکھا نہیں گیا، نہ کسی ٹی وی نے خبر نشر کی''۔

''مجھے حیرت ہے کہ ابلاغِ عامہ کے ذرائع خاموش کیوں رہے، انہیں تو علم ہو گا ہی''۔

''شاید وہ مجھے دکھ نہ دینا چاہتے ہوں''۔

''لیکن اس سے افواہیں توختم نہیں ہوئیں۔ بیٹی کی چھٹیوں کے دوران میں براہی گئی تھی، وہاں سے سنا''۔

''کیا سنا؟''

''تم نے ہر طرف سے خودکو چھپانا چاہا لیکن تمہاری شہرت کی طرح سب کچھ پھیلتا رہا۔تم نے اپنی زندگی بیوی کی خوشی کے لیے گروی رکھ دی، مگر اس نے دھوکہ دیا۔تم دونوں کے تعلقات میں کشیدگی آتی رہی کیونکہ تم اپنے والدین، رشتہ داروں اور ہمسایوں کے ساتھ اچھے مراسم رکھنا چاہتے تھے، مگر ہوا کیا؟ وہ بھی خوش نہ ہوئے''۔

''وہ کیسے؟''

''تمہاری ماتا کا خیال تھا کہ تمہیں اس کی خوشی کی پروانہیں۔ایک بھائی کو شکایت تھی کہ تم نے اس کے بیٹے کو اچھی ملازمت نہیں دی، تمہارے سب سے چھوٹے بھائی کی بھی یہی شکایت تھی، تمہاری بڑی بہن اپنے بیٹے کو مالی نہ بنانے پر تم سے گلہ مند تھی، چھوٹی بہن اپنے پتی کی بے روزگاری پر تم سے ناراض رہی، اور زیادہ کیا سننا چاہتے ہو؟''

کمال حیران رہ گیا کہ ثریا نے اندر کی ساری باتیں کہاں سے اور کیسے سنیں۔وہ مزید بتا رہی تھی، ''پھر مجھے ڈاکٹر کرشنا سے معلوم ہوا کہ تم اس کے پاس اپنے علاج کی غرض سے گئے تھے، اس لیے مجھے یہاں آنا پڑا ہے''۔

''کیا یہ اس نے تمہیں خود بتایا تھا؟''

''اگر تم جیسی مشہور شخصیت کسی کے پاس جائے تو وہ کیوں نہ بتائے گا؟ اگر میرے پاس کوئی مشہور شخص آئے تو میں بھی سب کو بتاؤں گی۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے، کچھ کھانے کو ہے؟''

''ریفریجریٹر میں کچھ مٹھائی پڑی ہے''۔

''رات کے کھانے کو کیا ہے؟ کیا تم نے کھانا کھالیا؟''

''نہیں''۔

''پھر کچھ تو رکھا ہوگا''۔

''نہیں، کچھ بھی نہیں ہے''۔

''کیوں؟''

''واپس آکر کچھ پکانے کو جی نہیں چاہا تھا''۔

''کسی آدمی کو کہہ کر باہر سے کھانا منگوا لیتے''۔

''باہر کا کھانا مجھے پسند نہیں۔میرا خیال تھا کہ کچھ پکالوں گا لیکن دل نہ مانا۔اور کسی کو کہہ کر کوئی چیز منگوانا مجھے اچھا نہیں لگتا''۔

''اور تم کھائے پیئے بغیر لیٹ گئے؟ افسوس کی بات ہے! ڈپٹی کمشنر ہیڈ کوارٹر! سارے شہر کے امن و امان کی ذمہ داری تمہارے کندھوں پر ہے، ماہانہ تنخواہ تیس ہزار کے لگ بھگ، اور کھانے کو کچھ نہیں۔ بھوکے لیٹے رہے ہو! کیا ہے یہ زندگی؟ میں نے سنا تھا کہ تمہارے ہاں ایک ملازمہ بھی ہے؟''

''میں نے اسے فارغ کر دیا ہے''۔

''کیوں؟''

''اسے میری پتنی نے رکھا تھا''۔

''پھر کیا ہوا؟''

''میرے منع کرنے کے باوجود بھی وہ اس سے رابطے میں تھی''۔

''کسی اور کا بندوبست کیوں نہیں کیا؟''

''تم کر دو''۔

''بہتر، میں کوئی ملازمہ ڈھونڈ لوں گی۔ اب یہ بتاؤ میرے پہننے کے لیے تمہارے پاس کوئی کپڑے ہیں؟''

''بہت ہیں۔ لیکن وہ سارے میری سابقہ پتنی کے ہیں۔ چاہو تو تم میری دھوتی یا جامہ استعمال کر سکتی ہو''۔

ثریا الماری سے دھوتی پاجامہ نکال کر باتھ روم چلی گئی، کپڑے بدلے، رسوئی میں جا کر چاول چولہے پر رکھے اور سبزی کاٹنے لگی۔ کمال بھی اس کی مدد کرنے لگا۔ دونوں نے مل کر کھانا پکایا اور کھایا۔ پھر ثریا نے پوچھا،''میں کہاں سوؤں؟''

''ساتھ والے کمرے میں سو جاؤ لیکن اس کے ساتھ باتھ روم نہیں ہے۔ باہر دروازے سے ملحق باتھ روم ہے''۔

''میں ذرا دیکھ لوں''۔

کمال حسب معمول دوا کھانے لگا ہی تھا کہ ثریا نے منع کر دیا اور اس کے ہاتھ سے دوا پکڑ کر کہا،''مجھے دو، میں کسی اور کو دے دوں گی''۔

''یہ مجھے ڈاکٹر کرشنا نے تجویز کی تھی''۔

''کرشنا نے تم سے صرف چند منٹ بات کی تھی جبکہ میں تمہیں پچیس برس سے جانتی ہوں، لہٰذا میرا علم زیادہ ہے''۔

''پھر میں کون سی دوا استعمال کروں؟''

''اس کا بندوبست میں کر دوں گی''۔ یہ کہہ کر وہ رسوئی سے گرم پانی کی ایک پتیلی لائی، اسے بالٹی میں ڈال کر کمال سے کہا،''اب جا کر نیم گرم پانی سے غسل کرو، پھر اجلے کپڑے پہن کر، صاف تازہ پانی پیو اور چپکے سے بستر پر لیٹ جاؤ۔ ہر رات گیارہ بجے سے پہلے تمہیں ہر حال بستر پر ہونا چاہیے۔ اس کے بعد کمپیوٹر پر کام کرنا، ٹی وی دیکھنا یا ہارمونیم بجانا سب کچھ ختم۔ نیند آئے یا نہ آئے، تمہیں بستر پر لیٹ جانا چاہیے''۔

''گر نیند نہ آئے تو لیٹے رہنا چہ معنی دارد؟''

''تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ ہم سوتے کیوں ہیں؟ آرام کے لیے۔ لیٹنے سے تمہارے پٹھوں اور بدن کے تناؤ میں کمی ہو گی اور تم بآسانی سو جاؤ گے، لیکن بیٹھے رہنے سے تمہیں نیند نہیں آ سکتی۔ چلو اب اٹھو اور جیسا کہا ہے، ویسا کرو''۔

....

کمال نہا دھو کر، کپڑے بدل کر باہر نکلا اور بستر پر بیٹھ گیا۔ ثریا نے اپنے بیگ سے پرفیوم کی ایک شیشی نکالی اور کمال کے کپڑوں پر ہلکا سا چھڑکاؤ کیا۔ اسے بچپن ہی سے خوشبو اچھی لگتی تھی، اب ثریا نے اسے خوشبو لگائی تو سوچنے لگا، اسے یہ بھی یاد ہے! مگر پوچھ نہ سکا۔ ادھر وہ سمجھا رہی تھی،''صبح اٹھ کر ہاتھ منہ دھوؤ، ناشتہ کرو، لکھنا پڑھنا یا فون کرنا، جو جی چاہے کرو۔ وقت پر دفتر جاؤ، شام کو حسب معمول باہر جا کر ورزش یا سیر کرو، پھر دوستوں سے ملاقات کرو اور اگر کوئی دل مانے تو ہمارے گھر بھی آ جایا کرو۔ کبھی کبھار دوستوں کا اکٹھ کرو، گپ شپ لڑاؤ۔ خیال رہے بوجھل من لیے، چپ چاپ بیٹھے رہنا، کسی طور بھی تمہاری صحت کے لیے مناسب نہیں۔ تمہیں لوگوں سے گھل مل کر رہنا ہو گا۔ اپنی شادی کے بارے میں سوچو لیکن سب سے پہلے کسی ملازمہ کا انتظام کرو جو تمہارے لیے کھانا پکانے کے علاوہ باتیں بھی کرے''۔

''اور دوا؟''

''بحیثیت ڈپٹی کمشنر نارکوٹکس کیا تم نے انسداد منشیات پر کام نہیں کیا؟ منشیات کیا ہیں؟ وہ کیمیائی اجزا جو ذہن یا بدن

کی حالت میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جس کو'مزاج کی بحالی' کہتے ہیں وہ دراصل نشہ آور دوا کا اثر ہوتا ہے۔ایسی دوا عارضی طور پر انسان کو راحت اور سکون بخشتی ہے، جیسے ہی دوا کا اثر ختم ہوا، مایوسی اور جھنجھلاہٹ پھر سے طاری ہو جاتی ہیں۔ اگر اس کی اشد ضرورت نہیں ہے تو میں کیوں خوامخواہ تمہیں استعمال کرنے کا مشورہ دوں۔ نشاط انگیز دوائیں رگ و پے میں اثر انداز ہو کر سوچنے اور کام کرنے کی صلاحیتوں کو کمزور کر دیتی ہیں۔ ان کے استعمال سے تم اپنے فطری معمولات سے ہٹ جاؤ گے، ایک عام اور تندرست شخص کی طرح سونا محال ہو جائے گا۔ اب سمجھ میں آیا میں کیوں تمہیں ان دواؤں کے استعمال سے منع کر رہی ہوں؟''

''اگر مجھے نیند نہ آئے پھر میں کیا کروں؟''

''نیند کیوں نہ آئے؟ کیا تم بچے ہو؟ ایک جوان شخص ہو، زندگی کی حقیقتوں سے بخوبی آگاہ ہو، حقیقی زندگی یہی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے تمہیں چھوڑ گئی ہے، تم نے اسے اپنے جیون سے نہیں نکالا، اسے یہاں سے چلے جانے کو نہیں کہا، اور یہ بھی غلط فہمی ہے کہ تمہاری زندگی میں اور کوئی نہیں آسکتی۔ اگر اسے تم سے حقیقی پریم ہوتا پھر تو تمہارا رونا دھونا بجا تھا۔ کیا تمہیں شرم نہیں آتی کہ ایک ایسی عورت کے لیے اپنی یہ حالت بنا رکھی ہے جسے تم سے پریم تھا نہ پروا؟ حقیقت میں تمہاری انا پر چوٹ لگی ہے، لیکن اس وجہ سے کڑھنے اور پریشان ہونے کی کوئی تک نہیں۔ اس عورت کے بارے میں کیوں سوچتے رہتے ہو جسے لمحہ بھر بھی تمہارا خیال نہیں آیا؟''

''ثریا! میں تمہیں اپنی بات نہیں سمجھا سکتا''۔

''مجھے قائل کرنے کی ضرورت بھی نہیں، اپنے آپ کو سمجھاؤ۔ اب سو جاؤ۔ اگر کچھ کہنا بھی ہے تو صبح بات کرنا۔ اب کچھ نہیں بولنا۔ چلو، سو جاؤ''۔

کمال اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور وہ ملحقہ کمرے میں چلی گئی۔

....

ڈپٹی انسپکٹر جنرل کے عہدے پر ترقی پانے کے بعد کمال کو موجودہ محکمے سے تبدیل کر دیا گیا۔ وہ بہت مطمئن تھا کیونکہ موجودہ تعیناتی میں مصروفیت کے باعث لکھنے پڑھنے کے علاوہ کالج اسکول کی تعمیر اور انتظام کی طرف زیادہ توجہ نہ دے پا رہا تھا۔ اب سب سے پہلے اس نے ادھورے ناول، ''تحفظ کی تلاش'' کو مکمل کیا۔ شائع ہوتے ہی یہ اختلافی مباحث کا موضوع بن گیا۔ جلد ہی اس کے انگریزی اور ہندی ترجمے بھی سامنے آئے۔ یہ جان کر اس کی خود اعتمادی میں بہت اضافہ ہوا کہ اس ناول کو ملک کے اعلیٰ ترین ادبی ایوارڈ کا مستحق سمجھا گیا ہے۔ خبر پھیلتے ہی صحافی کمال کا انٹرویو لینے پہنچ گئے۔ اس سے سوال کیا گیا کہ آنند پرشکار کی ساری رقم اس نے اسکول کی تعمیر کے لیے مختص کر دی تھی، موجودہ ایوارڈ کی رقم کا کیا مصرف ہوگا؟ کمال نے جواب دیا کہ اس کے علاقے میں اسکول اور انجینئرنگ کالج کے بعد میڈیکل کالج زیرِ تعمیر ہے، اب اس کا ارادہ یونیورسٹی بنانے کا ہے جس کے لیے وہ جلد ہی یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو درخواست جمع کرا دے گا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ صرف تعلیم کے شعبے میں اس کی دلچسپی کی خاص وجہ کیا ہے، کمال نے وضاحت کی، ''میں ایک سائنسدان اور ریسرچر بننے کا خواہش مند تھا لیکن نہ بن سکا، اب میں دوسروں کی راہ سہل بنانے کے لیے کوشاں ہوں، علاوہ ازیں، صحت اور تعلیم کے شعبے ملک کی ترقی کے لیے انتہائی اہم ہیں۔ صحت کے بارے میں فہم و شعور کا تعلق بھی سائنسی تحقیق و تعلیم سے ہے۔ میں اپنے ملک کی ترقی چاہتا ہوں اسی لیے میں ہر ممکن حد تک تعلیمی شعبے میں سہولیات کے پھیلاؤ کی خاطر کام کر رہا ہوں''۔

ایک صحافی نے اس سے بالکل ذاتی سوال کیا، ''آپ کی پتنی کیوں چھوڑ کر چلی گئی ہے؟''

کمال نے لگی لپٹی بغیر کہا، ''اس کا جواب تو وہی دے سکتی ہے۔ میں صرف اندازہ لگا سکتا ہوں''۔

''آپ کا اندازہ کیا ہے؟''

''وہ مجھے پسند نہیں کرتی تھی''۔

''انہوں نے تو دوبارہ شادی کر لی ہے، آپ نے کیوں نہیں کی؟''

''میری نااہلیت''۔

''آپ کھل کر جواب نہیں دے رہے''۔

''شاید میرے پاس اس کا جواب نہیں ہے''۔

''کیا آپ نہیں چاہتے کہ بچے ہوں، آپ کے نام لیوا ہوں؟''

''یہ معاشرہ، یہ سماج، کالج اسکول میرے نام لیوا ہی تو ہیں''۔

''آپ پھر سوال گول کر گئے''۔

''بتائیں میں آپ کے ان سوالات کا کیا کروں جن کا میرے پاس جواب نہیں''۔

''کیا آپ اپنی زندگی سے خوش ہیں؟''

کمال نے چند لمحے تامل کے بعد کہا، ''اس سوال کا جواب بڑا مشکل ہے''۔

''کیا مطلب؟''

''کوئی شخص پہلے خوش تھا، نہ آج کل ہے، نہ آئندہ ہوگا، ہاں لوگوں کے پاس اپنی تسلی کے لیے خوش فہمی ضرور ہوتی ہے، میرے پاس تو وہ بھی نہیں، پھر میں خوش کیسے رہ سکتا ہوں؟''

''یہ افواہ گردش کر رہی ہے کہ شاید آپ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لیں''۔

''ہوسکتا ہے؟''

''کیا آپ مزید ملازمت نہیں کریں گے؟''

''میرا مطمعِ نظر یونیورسٹی کا قیام ہے''۔

''لیکن ملازمت میں ہوتے ہوئے بھی آپ لوگوں کی مدد اور سماجی کام کر سکتے ہیں''۔

''اگر صورتِ حال میں اچانک تغیر آ جائے تو پھر ملازمت اور سماجی کام شانہ بہ شانہ نہیں کیے جا سکتے، لیکن موجودہ تناظر میں اعلیٰ افسر زیادہ کام نہیں کر سکتے۔ ہم جیسے جیسے اوپر چڑھتے ہیں اسی تناسب سے کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ برسرِ اقتدار سیاسی جماعتوں کے چند رہنماؤں کی خواہش پر ہم آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیتے ہیں''۔

''اسی لیے تو لوگ چاہتے ہیں کہ آپ جیسے مضبوط کردار کے لوگ اعلیٰ عہدوں پر تعینات ہوں''۔

''مضبوط ارادوں اور کردار کے لوگوں کو کھڈے لائن لگا دیا جاتا ہے۔ انہیں کبھی بھی ایسے عہدوں پر تعینات نہیں کیا جاتا جہاں وہ لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کر سکیں''۔

''آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں کہ اقتدار ایک ہی جماعت کے پاس رہے گا؟ تبدیلی بھی تو آسکتی ہے''۔

''اس سے ہمارے سیاستدانوں کے کردار اور سوچ میں تبدیلی نہیں آئے گی۔ دوسری جماعت کے برسرِ اقتدار آتے ہی سابقہ جماعت کے حامی اور بہی خواہ راتوں رات رنگ بدل کر نئے حکمرانوں سے جا ملیں گے، وہ اسی جماعت کے حامی اور مددگار بن جائیں گے، لیکن میرا پاؤں نہیں ڈگمگائے گا''۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد صحافی چلے گئے۔ کمال فائلیں دیکھنے میں مصروف تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے تعارف کرایا گیا، ''میں خیر الانعام کونسل کا میئر بات کر رہا ہوں۔ اسلام علیکم''۔ مسلمان ایک دوسرے سے بات کرتے

ہوئے اسلام علیکم اور وعلیکم اسلام کہتے ہیں۔ کمال اس کی بجائے صرف ''نمسکار'' کہنے پر اکتفا کرتا تھا۔ دوسری طرف سے اسلام علیکم سننے کے بعد اس نے صرف ''وعلیکم'' کہا۔ ادھر سے کمال کو اگلے جمعہ ایک افطار پارٹی میں مدعو کیا گیا، ''ہماری کونسل کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے، آپ کی شرکت پر ہمیں انتہائی مسرت ہوگی''۔

کمال پریشان ہوگیا۔ وہ کن الفاظ میں دعوت قبول کرنے سے انکار کرے، بہرطور اس نے کہا، ''افطار کا مطلب ہے روزہ کھولنا جبکہ میں روزہ نہیں رکھتا، لہٰذا افطار کیسا؟ میرے خیال میں روزہ رکھے بغیر افطار پارٹی میں شرکت غیر مناسب ہے، اس لیے میری طرف سے معذرت''۔

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟ بہت سے بے روزہ دار بھی افطار پارٹیوں میں چلے آتے ہیں۔ کیا ہمارے وزیرِ اعظم صاحب روزے رکھتے ہیں؟ پھر بھی وہ ایسی دعوتیں قبول کر لیتے ہیں''۔

''معاف کیجیے، انہیں ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے وہ صبح کے وقت ہندوؤں کے اجتماع میں کھڑے ہو کر متنازعہ جگہ پر مندر کی تعمیر کا اعلان کرتا ہے اور شام کو ٹوپی پہن کر افطار پارٹی میں موجود ہوتا ہے۔ میں اس حد تک نہیں جاسکتا، مجھے ایسی منافقت سے نفرت ہے۔ مجھے علم نہیں کہ اللہ ہے یا نہیں، اور اگر وہ موجود ہے تو اس قسم کی منافقت اسے بھی پسند نہیں ہوگی کہ روزہ رکھے بغیر افطاری کی جائے''۔

''آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے لیکن لوگ یہ نہیں سمجھتے۔ کچھ لوگ یہ گمان کریں گے کہ ہم نے آپ کو دعوت نہیں دی''۔

''اگر آپ افطار میں کسی قسم کے ثقافتی پروگرام یا کوئی ملتی جلتی تقریب کا انعقاد کریں تو میں آنے کی کوشش کروں گا''۔

''کیا اس صورت میں آپ تشریف لے آئیں گے؟''

''ہاں، میری پوری کوشش ہوگی''۔

رسیور رکھنے کے بعد وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میٹرک کے دوران اس کے چاروں طرف مذہبی تعلیمات اور خیالات کا ہجومِ بے کراں رہتا تھا، ان سے اکتا کر وہ سیکولر زندگی کی جانب جھک گیا۔ کالج کے دنوں میں پروفیسر شانتی جاہ، دپینکر چکرورتی اور پروفیسر دباشش بینرجی جیسے اساتذہ سے متاثر ہو کر اپنے سیکولر وچاروں پر اور زیادہ ڈٹ گیا۔ تب سے اس نے ہر قسم کی مذہبی تقریبات اور رسموں میں شریک ہونا چھوڑ دیا۔ لیکن ان آدرشوں کے باعث وہ کافی حد تک معاشرے میں یک وتنہا ہو کر رہ گیا۔ ملک میں ہونے والی تقریباً تمام سماجی تقریبات میں کسی نہ کسی مذہب اور دھرم کا دم چھلا لگا رہتا۔ جب اپنے گاؤں میں ایسی تقریبات سے دور دور رہتا تو اس کے سماجی کاموں کی وجہ سے پردہ پڑا رہتا لیکن ملازمت اور رہائش کی جگہوں پر لوگوں سے کیسے اوجھل ہوسکتا تھا۔ طویل عرصہ سے مذہب کے نام پر ہونے والے اجتماعات میں عدمِ شرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رفتہ رفتہ سب سے پیچھے ہٹ گیا۔

ان کا تشکیل کردہ Bengali Initiative سیکولر موضوعات اور تقریبات، مثلاً ٹیگور کی سالگرہ، مادری زبانوں کے دن وغیرہ منانے میں فعال تھا جن میں لوگ اپنے دین دھرم اور ذات پات سے قطعِ نظر آزادانہ شرکت کرتے تھے۔ کمال ان کا کٹر پرچارک تھا کیونکہ سیکولرازم کے پھیلاؤ میں ان اجتماعات کا اہم کردار ہوتا ہے۔

فون کی گھنٹی ہوئی۔ دوسری طرف انسداد ڈکیتی محکمہ کے بی ساہا نے خبر دی کہ جن پانچ ڈکیتوں پر مقدمہ چل رہا تھا انہیں عدالت سے سزا ہوگئی ہے۔ کمال نے اسے مبارک دی تو وہ کہنے لگا، ''سر! یہ صرف آپ ہی کی وجہ سے ممکن ہوسکا ہے''۔ کمال نے جواب دیا، ''میں اکیلا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ سب نے ٹیم کی طرح کام کیا ہے، دیکھا جائے تو آپ لوگوں کی کوششوں اور ہمت سے ہمیں کامیابی ملی ہے۔ یہ کامیابی میری نہیں، آپ کی ہے''۔

....

30 اکتوبر 2002، کمال پراویڈنٹ فنڈ مقدمے کی فائل دیکھ رہا تھا لیکن دماغ میں ایک اور نقشہ ابھر ابھر کر اس کو دکھی کر رہا تھا۔ برسوں پہلے اسی تاریخ کو ایک یادگار تقریب تھی جواب اس کی زندگی میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ اتنے میں اردلی نے موقر روزنامے انڈیا ٹوڈے کے بھاسکر پال کا وزیٹنگ کارڈ اس کو دیا۔ کمال کے پاس آج کل سٹیٹ انفورسمنٹ ڈیپارٹمنٹ کا کام تھا جہاں مصروفیات قدرے کم تھیں۔ اس نے ملاقاتی کو بلایا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے کہا، ''میرے باس نے مجھے کسی ایسے معاملہ پر رپورٹ لکھنے کو کہا ہے جس پر بھارت کی تمام سیاسی جماعتیں یک زبان ہوں۔ میں نے بہت سوچا ہے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اسی غرض سے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ کیا آپ کی نگاہ میں کوئی ایسا مسئلہ یا معاملہ ہے؟ میں نے بہت دماغ لڑایا ہے مگر ہر معاملہ میں سیاسی جماعتیں ایک دوسرے سے اختلاف کرتی ہیں، حتیٰ کہ ان معاملات پر بھی وہ مختلف آراء کی حامل ہیں جہاں اختلاف کی کوئی گنجائش اور ضرورت نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک دوسرے کی مخالفت کرنا ان کی فطرت بن چکی ہے۔ آپ اس سلسلہ میں میری کچھ مدد کیجیے''۔

کمال سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بولا، ''ہاں! ایک موضوع ایسا ہے جس پر تمام سیاسی جماعتیں متفق ہو سکتی ہیں۔ اور وہ ہے انتخابی اصلاحات''۔

''کیسے؟''

''تمام جماعتیں زبانی زبانی انتخابی اصلاحات کی بات کرتی ہیں جبکہ کوئی جماعت بھی عملی طور پر اپنے آپ کو بدعنوان اور جرائم پیشہ افراد سے لاتعلق نہیں کرتی''۔

''یہ تو صحیح مگر اس کو ثابت کرنا بہت مشکل ہے''۔

''اخبارات میں اس نوعیت کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کے دفتر میں ان کے تراشے ضرور ہوں گے''۔

''مجھے چند ایک نکات بتا دیجیے''۔

''آپ کو یاد ہوگا کہ اس سال مئی میں سپریم کورٹ نے الیکشن کمیشن آف انڈیا کو ہدایت کی تھی کہ پارلیمنٹ اور ریاستی قانون ساز اسمبلیوں کے تمام امیدواروں سے کاغذاتِ نامزدگی کے ساتھ حلف نامے بھی لیے جائیں جس میں ان کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد، تعلیم اور ان پر قائم کردہ مقدمات کی تفصیل درج ہو۔ لیکن ہوا کیا؟ ساری جماعتوں کے نمائندے اس کے خلاف اکٹھے ہو گئے جس پر حکومت کو ایک آرڈیننس کے تحت اس حکم نامے کو کالعدم قرار دینا پڑا''۔

''کمال صاحب! میں نے یقیناً پڑھا تھا لیکن سچ بات ہے کہ یہ نکتہ میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ آپ تو لکھتے رہتے ہیں، کیا اس پر مجھے کچھ مواد مل سکتا ہے؟''

کمال قدرے متذبذب ہوا کیونکہ ایسا مواد ایک دفعہ کسی کو دے دیا جائے تو مشکل ہی سے واپس ملتا ہے۔ تاہم بھاسکر پال کی بات کچھ اور تھی، وہ کاغذات دبا کے نہیں بیٹھ جاتا تھا، لہٰذا اس نے اپنی فائل سے متعلقہ تراشے اور کاغذات اسے دیے۔ ان میں سپریم کورٹ کا سول اپیل نمبر 7178/2001 پر فیصلہ بھی موجود تھا جس کے مطابق الیکشن کمیشن کو مذکورہ حلف نامہ لینے کا پابند کیا گیا تھا۔ اس فیصلے کی روشنی میں کمیشن نے 28 جون، 2002 کو آرڈر نمبر 3/ER/2002/JS-II/Vol.III جاری کر دیا تھا، کمال نے اس کی نقل بھی بھاسکر کو دے دی۔ صرف یہی نہیں، بلکہ اس کی خواہش پر حکومت کی جانب سے جاری کردہ آرڈیننس کی نقل دیتے ہوئے بھاسکر کو آخری جملہ توجہ سے پڑھنے کا مشورہ دیا جہاں واضح الفاظ میں درج تھا، ''آرڈیننس تمام سیاسی جماعتوں کی متفقہ رائے اور رضا سے جاری کیا جا رہا ہے''۔ (ناول نگار نے سپریم کورٹ کے فیصلے اور الیکشن کمیشن آف انڈیا کے جاری کردہ حکم نامے کو لفظ بہ لفظ نقل کیا ہے جس کا طوالت کی وجہ سے ترجمہ نہیں کیا)۔

یہ کاغذات دینے کے بعد کمال نے بھاسکر کو کہا،''اب آپ کا باس آپ کی مرتب کردہ رپورٹ پر کوئی اعتراض نہیں سکتا''۔

''بالکل درست۔کمال صاحب! پلیز مجھے تھوڑا سا سمجھا دیجیے کہ اس میں قابلِ اعتراض باتیں اور نکات کون سے ہیں''۔

''برسوں سے انتخابی اصلاحات پر بحث و مباحثہ اور گفتگو ہو رہی ہے کہ سیاست کو کس طرح بے انت دولت اور طاقت کے استعمال سے پاک کیا جائے کیونکہ ناجائز دولت اور غنڈہ گردی کا سہارا لے کر جرائم پیشہ افراد بھی انتخابی مہم میں حصہ لینے اور کامیابی کے بعد قانون ساز اسمبلیوں، حتیٰ کہ وزارتوں پر بھی قابض ہو جاتے ہیں۔ یہ سارے حقائق سپریم کورٹ کے سامنے آئے تو اس نے 2 مئی 2002 کو ایک ایسا فیصلہ دیا جو رائے دہندگان کی امنگوں اور خواہشوں کے عین مطابق تھا۔انہیں ہر امیدوار کے ذرائع آمدن، تعلیمی معیار اور اگر کبھی کسی نے غیر قانونی حرکت کا ارتکاب کیا ہو تو اس کی تفصیل سے بھی آگاہی ہو جاتی،لیکن تمام سیاسی جماعتیں اسے منسوخ کرانے پر تلی ہوئی تھیں،اور تماشا یہ کہ کامیاب بھی ہو گئیں''۔

''مگر آرڈیننس میں تو درج ہے کہ یہ سپریم کورٹ کے فیصلے کو مؤثر بنانے کے لیے جاری کیا جا رہا ہے''۔

''بظاہر تو اس کے اجرا کا مقصد عدالتی فیصلے کو تقویت دیتا ہے لیکن فی الحقیقت اس کے چیدہ چیدہ نکات سے وہ مقصد ختم ہو جاتا ہے''۔

''اس کی وضاحت فرما دیں''۔

''مثلاً یہ دیکھیے۔عدالتی فیصلے اور الیکشن کمیشن کے حکم نامے میں واضح ہے کہ امیدوار اپنی اور اپنے زیرِ کفالت تمام افراد کے نام جائیداد کی تفصیل دینے کا پابند ہے لیکن آرڈیننس کے مطابق کامیاب امیدوار اسمبلی میں حلف اٹھانے کے نوے دن کے اندر اندر اسمبلی کے صدرِ اجلاس (سپیکر) کو اپنی جائیداد کی تفصیل سے آگاہ کریں گے۔اس میں زیرِ کفالت افراد کا کوئی ذکر نہیں۔اس طرح بدعنوان ارکینِ اسمبلی ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ دولت اپنے کسی عزیز، رشتہ دار یا ملازم وغیرہ کے نام منتقل کر کے خود پاک صاف بن کر سامنے آتے ہیں''۔

''گویا آپ کے خیال میں یہاں بدنیتی پوشیدہ ہے،لیکن آرڈیننس کا اجرا تو حکومت کا قانونی اختیار تھا''۔

''میرے خیال میں ایسا نہیں''۔

''وہ کیوں؟''

''آرڈیننس کا اجرا بالعموم غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے۔یہاں الیکشن کمیشن کے حکم نامے کی منسوخی کے وقت کون سی ناگہانی صورتِ حال درپیش تھی؟ سوائے اس کے اور کیا تھا کہ جرائم پیشہ اور بدعنوان لوگ مشکل میں پھنس رہے تھے۔یہ ذہن میں رکھیں کہ کمیشن کا حکم نامہ ان کی اپنی صوابدید نہیں تھا بلکہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق تھا جو بنیادی شہری حقوق کی ترجمانی کرتا تھا۔عدالتِ عظمیٰ کے فیصلے کے خلاف حکومت نے اپیل میں جانے کی بجائے از خود آرڈیننس جاری کر دیا۔ایسا اختیار تو قانون ساز اسمبلی کو بھی حاصل نہیں،وہ بھی عدالتی فیصلے کو منسوخ یا کالعدم قرار نہیں دے سکتی،اور پھر بنیادی شہری حقوق کی ضمانت تو آئین میں موجود ہے،اور پارلیمنٹ یا حکومت محض آرڈیننس کے ذریعے آئین میں ترمیم نہیں کر سکتی۔عدالتی فیصلے میں انتہائی واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ''ہمارے آئین کے آرٹیکل (a) (1) 19 میں آزادیِ اظہار کی ضمانت دی گئی ہے، بالفاظِ دیگر، رائے دہندگان کی انتخابات کے موقع پر آزادیِ اظہار کا مطلب یہ ہے کہ کامیاب امیدوار کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہر ووٹر کا حق ہے یعنی اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ امیدواروں کی زندگی، دولت، ذرائع آمدن اور کسی کردہ جرم کی بابت معلومات تک رسائی حاصل کرے۔یہ جمہوریت کی بقا کے لیے بنیادی اور ضروری نکتہ ہے۔آرڈیننس کا مسودہ صدرِ جمہوریہ کو بھیجا گیا مگر انہوں نے احتیاط اور دانشمندی

سے کونسل آف منسٹرز کو واپس کر دیا کہ ان کے اٹھائے گئے نکات، بالخصوص سپریم کورٹ کے فیصلے میں دی گئی ہدایات اور رہنما اصولوں کے مدِ نظر کسی ممکنہ غلطی یا تحریف و ترمیم پر غور و خوض کر لیا جائے۔ مگر حکومت نے عہدۂ صدارت کے آداب کو نظر انداز کرتے ہوئے اور اٹھائے گئے نکات پر وضاحت پیش کرنے کی بجائے پہلے والا مسودہ یہ لکھ کر صدر کو واپس بھیج دیا کہ اس کا متن تمام سیاسی جماعتوں کی متفقہ رائے اور خواہش کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ اس سے ہر بات واضح ہو جاتی ہے''۔

''کمال صاحب! ساری جماعتوں کے رہنما سپریم کورٹ کے فیصلے سے خائف کیوں ہوئے تھے؟''

''بھاسکر صاحب! کیا آپ نے حکمران جماعت کے سربراہ کے ہاتھوں میں بطور رشوت میں بانٹے جانے والے نوٹوں کے بنڈل نہیں دیکھے تھے؟ کیا آپ کو علم نہیں کہ ہمارے نائب وزیرِ اعظم کس طرح بابری مسجد کے انہدام میں پیش پیش تھے؟ پھر مجھے یہ بتائیں کہ ہمارے ایک سابقہ وزیرِ اعظم کے خلاف کتنے مقدمات ابھی تک زیرِ سماعت ہیں؟ کیا یہ سب سیاستدان سپریم کورٹ کے فیصلے اور الیکشن کمیشن کے حکم نامے پر خوش ہوں گے؟''

ابھی اتنی بات ہو رہی تھی کہ اردلی نے ڈائریکٹر کے بلاوے کا پیغام دیا۔ کمال بھاسکر سے معذرت کر کے ڈائریکٹر حلیم سرفی کے کمرے میں گیا۔ اس نے سوال کیا، ''تم ہمیشہ اصولوں کی بات کرتے ہو۔ بتاؤ یہ کیا ہے؟''

کمال نے اس کے چہرے پر استفہامیہ نگاہ ڈالی۔ سرفی نے کہا، ''تمہارا وزیرِ اعلیٰ مجھے پسند نہیں کرتا۔ اس نے مجھے کمشنر یا ڈی جی نہیں بنایا۔ ڈی جی رینک پر ترقی کا وقت آیا تو اس وقت مجھے یہ عہدہ دیا جا سکتا تھا مگر کسی نے پروا نہیں کی۔ میری بات سے اتفاق کرتے ہو یا نہیں؟''

''میں بالکل اتفاق کرتا ہوں''۔

''ہوا کیا، ڈائریکٹر آئی بی کا عہدہ ختم کر کے ڈائریکٹر انفورسمینٹ کا عہدہ تخلیق کر دیا۔ جانتے ہو کیوں؟''

''نہیں سر''۔

''محض اس لیے کہ میں مسلمان ہوں۔ پاکستانی ایجنسی آئی، ایس، آئی اس خطے میں بہت فعال ہے اور وزیرِ اعلیٰ نہیں چاہتا کہ کوئی مسلمان یہاں انٹیلی جنس ونگ کا سربراہ ہو، اور تم کہا کرتے تھے کہ وہ بڑا اچھا شخص ہے''۔

کمال کو یاد آ گیا کہ اس نے موجودہ وزیرِ اعلیٰ کے بارے میں یہ الفاظ اس کے اس عہدے پر تعینات ہونے سے پہلے کہے تھے۔ اس وقت کمال اس گمان میں تھا کہ حالات میں نمایاں تبدیلی آ جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ خود بھی کسی قسم کی تبدیلی نہ دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ مسٹر سرفی کا اشارہ اسی بات کی طرف تھا۔

کمال مسٹر سرفی کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس کے جذبات نے اس کے دل کو چھو لیا۔ وہ خود من پسند یا ناپسندیدہ افسروں کی اکھاڑ پچھاڑ کے حق میں نہیں تھا لیکن ایسا ہوتا آیا تھا۔ مسٹر سرفی کے ساتھ یہی ہوا کہ اسے ڈائریکٹر انٹیلیجنس ونگ لگانے کی بجائے عہدہ ختم کر کے موجودہ عہدہ تخلیق کیا گیا تاہم اصل سبب وہ نہیں تھا جس کا ذکر سرفی صاحب نے کیا تھا۔ پھر بھی کسی نہ کسی حد تک اس بات میں وزن تھا۔ انہوں نے مزید کہا، ''اگرچہ اس طرح سوچنا نہیں چاہیے لیکن حالات ایسے ہو جائیں تو سوچیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں''۔

کمال کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

....

16 دسمبر 2002ء کمال دفتر جلد آ کر اخبارات دیکھنے لگا۔ ایک اخبار ''Asian Age'' میں ایس نہال سنگھ کا کالم ''خطرناک عشرہ'' پڑھا اس نے گجرات ریاست کی قانون ساز اسمبلی کے لیے ہونے والے حالیہ چناؤ میں بی، جے، پی کی کامیابی

پران الفاظ میں تجزیہ کیا تھا، ''سارا ملک اس کامیابی کا نتیجہ بھگت رہا ہے۔ یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں: اوّلاً، کیا بی۔جے۔پی کی نفرت کی سیاست پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی، ثانیاً، کیا اس جماعت کا کٹر اور سخت گیر حلقہ فیصلہ کن حیثیت کا مالک بن گیا ہے؟'' آگے چل کر ایک سوال اور اٹھایا گیا، ''بھارت جس سیکولرازم پر ناز کرتا ہے، کیا اب اس کی جگہ ہندوواتا ریاست کی بنیاد پڑنے جا رہی ہے جہاں دس کروڑ سے زیادہ مسلمان اور ایک قابلِ ذکر اقلیت خود کو غیر محفوظ سمجھنے پر مجبور ہو؟''

کمال معاشرے میں ایک باعزت مقام پر فائز ہونے کے باوجود گجرات کے واقعات اور حکمرانوں کے رویّے پر خود کو بھی غیر مامون سمجھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں گذشتہ دن کے اخبارات کی سرخیاں تازہ ہو گئیں۔ ایک سرخی تھی، ''اقلیتوں کو زیادہ احتجاج کرنا چاہیے تھا۔ گودھرا سانحہ کے بعد اقلیتوں کی جانب سے زیادہ مخالفت دیکھنے میں نہیں آئی۔ وزیرِ اعظم''۔ ایک بیان ہندو وشوا پرشاد کے ایک لیڈر سے منسوب تھا، ''مسلمان یہاں اسی طریقے سے رہ سکتے ہیں جیسے پاکستان میں ہندو رہتے ہیں''۔

گودھرا سانحہ 27 فروری 2002 کو پیش آیا جب سابرمتی ایکسپریس کے ایک ڈبے میں آگ لگنے سے اٹھاون لوگ ہلاک ہو گئے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد ان کارسیوکوں کی تھی جو رام مندر کی تعمیر کے سلسلہ میں احتجاج کر کے ایودھیا سے واپس لوٹ رہے تھے۔ کچھ اخباری اطلاعات کے مطابق اسٹیشن پر ان کا مسلمان خوانچے والوں سے جھگڑا ہوا تھا۔ یہ علم نہیں ہو سکا کہ آیا جھگڑے کی وجہ سے یہ سانحہ ہوا یا سانحہ کے لیے جھگڑا کھڑا کیا گیا۔ جیسے ہی یہ خبر پھیلی، سنگھ پریوار کی جماعتوں یعنی بھارتیہ جنتا پارٹی، بجرنگ دل، وشوا ہندو پرشاد اور راشٹریہ سیوک سنگھ نے مشترکہ طور پر احمد آباد، برودا اور متعدد شہروں میں مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں پر حملے، توڑ پھوڑ اور آتش زنی شروع کر دی۔ بے شمار عورتوں کا بلتکار کیا اور حاملہ عورتوں کے پیٹ چیر کر جنین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ بی۔جے۔پی سرکار کا کردار از حد قابلِ مذمت تھا۔ ملکی اور غیر ملکی میڈیا نے اس منظم قتلِ عام کی شدید مخالفت کی۔

سرکار نے سانحہ پر تحقیقات کا حکم دیا۔ رپورٹ آنے کے بعد ہی حقائق کا علم ہو سکے گا تاہم ان میں سے کوئی ایک سبب ضرور ہو سکتا ہے:

اوّل۔ سانحہ کے پس پردہ کوئی سازش یا منظم منصوبہ بندی نہیں تھی۔ اچانک ہونے والے جھگڑے نے آگ پکڑ لی۔

دوم۔ ایک فرقے نے دوسرے فرقے کو سبق سکھانے کے لیے جھگڑا شروع کیا۔

سوم۔ برسرِ اقتدار جماعت کو دھبہ لگانے کے لیے مخالف جماعتوں نے منصوبہ بندی کی۔

چہارم۔ کسی غیر ملکی ایجنسی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

پنجم۔ حکمران جماعت کے حامیوں نے انتخاب میں اپنی فتح کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ حرکت کی۔

تحقیقاتی رپورٹ ابھی تک نہیں آئی (اب یہ رپورٹ منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ دیکھئے: حواشی۔ مترجم) لیکن میڈیا میں فورنسک تجزیے کے جن جستہ جستہ نکات کا انکشاف ہوا ہے اس سے علم ہوتا ہے کہ آگ باہر سے نہیں بلکہ ڈبے کے اندر ہی سے لگائی گئی تھی۔ اس صورتِ حال میں ملک کا پردھان منتری کیسے کہہ سکتا ہے کہ سانحہ کے بعد اقلیتوں کی جانب سے خاطر خواہ احتجاج نہیں ہوا؟ اقلیتوں پر ہی کیوں انگلی اٹھائی گئی ہے؟ کیا سانحہ کے بعد ہونے والی مخالفت صرف اقلیتوں کی جانب سے ہونا چاہیے تھی؟ اس کے بیانات بھی گمراہ کن تھے، مثلاً، انڈونیشیا کے دورے پر غیر ملکی میڈیا کے سامنے اس کی سبکی ہوئی جبکہ گوا میں اپنی جماعت کی میٹنگ میں اس نے کہا تھا کہ ''یہ مسلمان کہیں بھی امن سکون سے نہیں رہ سکتے''۔ میڈیا کے ایک حلقے نے اسے سنگھ پریوار میں اسے اعتدال پسند رہنما کی حیثیت سے پیش کیا تھا لیکن کمال کے خیال میں ایک جیسے خیالات کے حامی سیاسی اکٹھ کی یہ

حکمتِ عملی تھی کہ چناؤ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایک گروپ بھائی چارے کی باتیں کرے اور دوسرا نفرت کا پرچار۔

کمال کو وشوا پرشاد پارٹی کے اس بیان پر سخت دھچکا لگا کہ ''مسلمان یہاں اسی طریقے سے رہ سکتے ہیں جیسے ہندو پاکستان میں رہتے ہیں''۔ اس بیان کے بعد ان کے اس دعویٰ کی کیا وقعت رہ جاتی ہے کہ کشمیری، جن کی اکثریت مسلمان ہے، بھارت میں رہ سکتے ہیں؟ پاکستان میں تو کوئی وسیع القلب مسلمان بھی مطمئن نہیں، ہوسکتا ہے وہ سیکولر بھارت میں رہنا پسند کریں مگر ہندو بھارت میں نہیں رہ سکتے۔ کیا وشوا رہنماؤں نے یہ نہیں سوچا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے؟

....

پاکستان کا قیام برصغیر اور بالخصوص ہندوستان کے لیے ایک المیہ تھا۔ ہر واقعہ اور سانحہ کا ردِعمل ناگزیر ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی حب الوطنی اور بھارت کے ساتھ وفاداری کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کے لیے پاکستان کا حوالہ لازمی ہے۔ پاکستان کا وجود بلاشبہ ہندوؤں کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مسلم لیگ کی قیادت میں مسلمانوں نے ان علاقوں پر مشتمل نیا ملک حاصل کیا جہاں وہ اکثریت میں تھے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت نہ ہوتی تو پاکستان کا قیام ناممکن تھا۔ ایک بار مہاتما گاندھی نے جناح کو پورے ملک کا سربراہ مقرر کرنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا، اگر ایسا ہوتا تو مسلمان تقسیم ہند کے شکار نہ ہوتے۔

کیا مسلمان غیر منقسم ہندوستان میں زیادہ خوش رہتا؟ اگر اس کے پُرکھوں نے اسلام قبول نہ کیا ہوتا تو کیا وہ بہتر حیثیت میں زندگی بسر کرتا؟ کمال نے اس پر بہت غور کیا لیکن جواب نفی میں ملا۔ غیر منقسم ہندوستان میں بھی تو فرقہ وارانہ فسادات اور خون خرابہ ہوتا رہتا۔ اگر ان کے آبا و اجداد اسلام قبول نہ کرتے تو مسلمان زیادہ سے زیادہ اچھوتوں جیسی زندگی گزارتے، انہیں ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں مخصوص نشستوں کی بنیاد پر حصہ ملتا لیکن سماجی لحاظ سے وہ کبھی بھی ہندو کے ہم پلہ نہ ہوتے۔

پاکستان ایک مذہبی ریاست ہے جہاں مذہب کے باوجود شہریوں کو قانونی طور پر مساوات حاصل نہیں۔ 1971 میں مجیب الرحمٰن کی قیادت میں پاکستان سے الگ ہونے والے بنگلہ دیش نے سیکولر ریاست ہونے کا اعلان کیا لیکن جلد ہی وہ اسلامی دائرہ میں داخل ہوگیا۔ وہاں غیر مسلموں کو برابر کا نہیں سمجھا جاتا لہٰذا ہندو فطری طور پر ایک ہندو ریاست کے خواہشمند تھے، لیکن انہیں اخیل منڈل کا شاہد خان کو تحریر کردہ خط پڑھ لینا چاہیے۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کی طرح بھارت میں بھی فرقہ وارانہ سوچ پر مبنی ریاست کی باتیں قابلِ افسوس ہیں۔ فرقہ واریت کے آگے بند باندھنے کے لیے سیکولرازم کے حامیوں کی تعداد میں اضافہ ناگزیر ہے۔

....

کل سے اس کا تعلق انڈین پولیس سروس سے ختم ہوجائے گا کیونکہ وہ اپنی مرضی سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے رہا ہے۔ کل کلاں کو اس کا فیصلہ درست ثابت ہو یا نہ ہو، فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا، پھر بھی مثبت اور منفی نکات اس کے سامنے تھے۔ پولیس سے متعلق کسی مشکل کام اور مسئلہ کے لیے جو شخص بھی اس کے پاس آیا، کمال نے ہمیشہ مدد کرنے کی کوشش کی لیکن محض اسی جذبے کی خاطر اب وہ مزید پانچ چھ سال ملازمت نہیں کرسکتا۔ برسرِ اقتدار جماعت اسے ایسی تعیناتی دینے کو تیار نہیں جہاں وہ لوگوں کی خدمت کرسکے، نہ ہی اسے کمشنر اور ڈی جی جیسے عہدوں پر لگایا جاتا جہاں رہ کر وہ علمۃ الناس کی بھلائی کے لیے انتظامی ڈھانچے میں خاطر خواہ تبدیلی لاسکتا۔ ملک میں کسی قسم کی تبدیلی لانا محض خوش فہمی اور سپنا ہی ہے کیونکہ بلند بانگ دعوؤں کے برعکس ہر سرکار جی حضور افسروں کو پسند کرتی ہے۔ ملازمت میں رہتے ہوئے اسے اچھے عہدوں کے مساوی تنخواہ مل جاتی مگر کام نہ ملتا، اور اتنی بات کے لیے مزید ملازمت کرنے کی ضرورت اور خواہش نہیں۔ اب فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے اسکول، کالج اور

یونیورسٹی کے لیے زیادہ وقت نکال سکے گا۔

بہت سی یادیں اور واقعات اس کے دل و دماغ میں چلے آرہے تھے۔ اسے یاد آرہا تھا کہ ملازمت میں کیسے آیا، حیدر آباد میں گزارے ہوئے دن آنکھوں کے سامنے آئے، فوج کے ساتھ کشمیر میں زیر تربیت عرصہ جیسے کل کی بات ہو، بیکلنتھ پور میں تعیناتی کے دوران کیسے اسے لوگوں کی بے پناہ محبت اور عزت ملی، اور اس کے برعکس کیپیٹل پولیس میں گزارا ہوا وقت کتنا بے سود اور دکھ بھرا تھا۔ یادوں نے پلٹا کھایا اور وہ گورنر کے ہاتھوں پولیس میڈل وصول کر رہا تھا۔ سروس کا ایک ایک دن، ایک ایک لمحہ اس کی یادوں، اس کے جیون کا حصہ تھے۔ اسی دوران مینا بھی اس کی زندگی میں داخل ہوئی، پھر دور چلی گئی، اور بالآخر ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو گئی۔ سروس حاصل کرنے کے بعد اسے موسیقی سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ قاضی نذر الاسلام کا لکھا ہوا گیت جو اس نے پہلی بار گنگنایا تھا، آج بھی ذہن میں گونج رہا تھا ''میں عندلیبِ گلشن ہوں، محبت کے رنگین نغمے گاتا ہوں'' لیکن اب اگر اس سے کوئی گیت گانے کی فرمائش کی جائے تو کون سا نغمہ گائے گا؟ ہاں! وہ سوبیر سین کا یہ گیت ضرور گائے گا، ''اگر یہ سُر، یہ نغمہ کسی دن رک گیا، تم مجھے اس دن بھول جانا''۔ اور یہ بھی دل میں آرہا تھا کیا اس کے دوست، سنگی، ساتھی اسے بھول جائیں گے؟ دنیا میں کون کس کو یاد رکھتا ہے!

....

پہاڑی کے دامن میں ایک جھیل، اس کے کنارے رنگ برنگے پھولوں سے سجا باغ، باغ کے بیچوں بیچ ایک فوارہ، اور موسیقی کی دھن پر رقصاں پانی کی پھواریں، فوارے کے کنارے کنارے دودھیا سفید کپڑوں میں ملبوس خراماں خراماں ایک لڑکی، کون تھی وہ؟ کمال پہچان نہ سکا۔ پہلے تو اسے سپنا لگی، جب اس نے تھوڑا سا رخ بدلا تو ثریا کی جھلک نظر آئی، موسیقی کی مدھر آواز نے سنگیتا کا روپ دھار لیا، اور جب وہ لڑکی نزدیک آئی تو یوں لگا کہ جیسے مینا ہو۔

اسے وہ لمحات یاد آگئے جب مینا سفید ساڑھی پہنے، اس کی طرف رخ کیے، ساتھ لیٹی ہوئی تھی، پھر وہ اسے چھوڑ کر جاپان جانے لگی۔ کمال کے سینے میں درد اٹھا، وہ کہنے لگا، ''اگر تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی تو میں پھر کس کے سہارے جیون گزاروں گا؟''

''کیا تم مجھے میکو کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دو گے؟''

وہ اس سوال کا کیا جواب دے؟ پندرہ سال تک اس کی پتنی رہنے والی پوچھ رہی تھی، ''کیا تم مجھے میکو کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دو گے؟'' اور پھر کمال پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ مینا نے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا، ''رو کیوں رہے ہو؟'' اور اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ ننھی یاسمین، کنڈرگارٹن کی چھوٹی سی طالبہ اس کا ہاتھ پکڑے پوچھ رہی تھی، ''آپ رو کیوں رہے ہیں؟ آپ اٹھتے کیوں نہیں؟ کیا آج اسکول نہیں جانا؟ ہیڈ مسٹرس نے مجھے آپ کو بلانے کے لیے بھیجا ہے۔ صبح کی دعا کرنی ہے''۔

کمال جلدی سے اٹھا، اپنے آنسو پونچھے اور یاسمین کو گلے لگا کر پیار کیا اور کہا، ''تم چلو، میں شتابی سے آرہا ہوں''۔ یہ کہہ کر اس نے باتھ روم جا کر غسل کیا، کپڑے پہنے اور تیزی سے چلنے لگا، مگر ڈھلتی عمر اور نقاہت اپنا آپ دکھا رہی تھی۔ تیزی سے چلا نہ گیا۔ ''کیا عمر ہے میری؟''، اس نے اپنے آپ سے خاموش لہجے میں پوچھا، ''ستر سال''۔ اس کے اپنے ماں باپ بھی تو اس عمر تک پہنچنے سے پہلے انتقال کر گئے تھے۔ اب اس کے بھی چل چلاؤ کا وقت آگیا ہے۔ بس ایک ہی دکھ مارے جا رہا تھا کہ وہ اپنے دیش کو دوسرے دیشوں کی طرح ترقی یافتہ نہیں دیکھ سکا، لیکن یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کا سپنا ضرور پورا ہو گا۔ اسی آشا، اسی واسنا کو من میں لیے وہ مر جائے گا۔ اسے علم نہیں تھا کہ آیا کوئی ''دوسری دنیا'' بھی ہے، اور اگر کسی اور دنیا کا وجود ہے تو مرنے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہو گا؟ اس کا ایک ہی سپنا تھا کہ آنے والی نسلوں کے لیے اسی دنیا کو سکون بخش اور قابلِ رہائش بنایا جائے۔ انہی سوچوں میں غرق وہ اسکول پہنچ گیا۔

بچے قطاروں میں کھڑے تھے، دعا کے بعد سبق کا دور چلا۔ چھوٹے بچے اس کے گرد دائرہ بنا کر بیٹھ گئے، دو چار تو

اس کی گود میں آ بیٹھے۔ان کو لکھنے کی ترغیب دینے کے لیے ان سے پوچھا،'' مجھے لکھنا کون سکھائے گا؟'' سب ہم آواز ہو کر بولے،''میں''۔

''نہیں ایسے نہیں، ہاتھ اٹھا کر بتاؤ''۔

کچھ بچوں نے ہاتھ کھڑے کیے۔اس نے ایک بچے کو مخاطب کیا،''ربیع! تم بہت پیچھے بیٹھے ہو، میرے پاس آؤ''۔اس نے آ کر ننھے ہاتھ میں پنسل پکڑی۔کمال کے دل میں دفعتاً روشنی کا جھماکا سا ہوا،''یہی ہاتھ اس دیش کی، اس سنسار کی تقدیر بدلیں گے، اسے سنواریں، بنائیں اور سجائیں گے''۔

اسکول میں وقت گزارنا اسے بہت اچھا لگتا تھا، مسرت اور سکون کا احساس رہتا، ایک عجیب سی سرخوشی جو اسے یونیورسٹی میں بھی حاصل نہ ہوتی۔ ننھی کلیوں اور کونپلوں کو دیکھ کر، تصور ہی تصور میں انہیں خوبصورت، رنگ برنگے پھولوں میں کھلتے دیکھ کر بڑی شانتی، بڑا سکون محسوس ہوتا، اس لیے وہ سوائے چھٹی کے، ہر روز یہاں آتا، بچوں کے درمیان بیٹھتا، ان کے ساتھ ہنستا، کھلکھلاتا، کچھ انہیں پڑھاتا، کچھ ان سے سیکھتا، ان سے مل کر گیت گاتا، رقص کرتا۔وقت یونہی گزرتا جا رہا تھا۔

اسکول ایک کنول کا پھول تھا، سینکڑوں پنکھڑیوں سے کھِلا ہوا، مسکراتی، قہقہے لگاتی، دوڑتی بھاگتی، گنگناتی اور ناچتی ہوئی پنکھڑیاں۔فی الحال یہ ادھ کھِلا تھا، جلد ہی ایک خوبصورت، پُرشباب سندر پھول بن جائے گا۔

....

کمال اپنے چھوٹے سے گھر کے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ اس کی ملازمہ نے اطلاع دی کہ ایک عمر رسیدہ عورت ایک بچے کے ساتھ اس سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔اس نے دونوں کو اندر بلا لیا۔عورت مسکراتی ہوئی پوچھنے لگی،''تم نے مجھے پہچانا؟'' کمال کو اس کی اندازِ تخاطب پر حیرت ہوئی کیونکہ یہاں کوئی بھی اسے ''تم'' کہہ کر مخاطب نہیں کرتا تھا، ہر شخص بڑے احترام اور عزت سے بلاتا تھا۔اس نے غور سے اسے دیکھا۔عورت بولی،''تم نے مجھے نہیں پہچانا''۔کمال نے ہاں میں سر ہلایا،''واقعی، میں آپ کو پہچان نہیں سکا''۔وہ بولی،''میں سپنا ہوں، اب پہچانا؟'' مگر وہ ہنوز الجھن میں تھا۔پہچانتا بھی کیسے؟

ایک قریبی گاؤں ہتکھولا کی لڑکی اس کے ساتھ اسکول میں پڑھتی تھی۔پڑھائی میں اچھی ہونے کے باعث کمال کی اس سے دوستی ہو گئی۔میٹرک کے لیے اس نے جس اسکول میں داخلہ لیا وہاں تک پہنچنے کے لیے اسے ہتکھولا سے ہو کر جانا پڑتا تھا جس کے لیے روزانہ کئی فرلانگ چلنا بھی پڑتا۔وہ اس لڑکی کو پسند کرتا تھا لیکن نویں جماعت میں آ کر اس کی پسند نے نیا روپ دھار لیا۔اب وہ اس کے ساتھ باتیں کرنا، وقت گزارنا، اس کی قربت میں رہنا، اور اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کا سوچنے لگا۔کمال کو خبر نہیں تھی کہ یہ محسوسات اور جذبات دوسری طرف بھی ہیں یا نہیں کیونکہ اس لڑکی نے کبھی اشارہ تک نہیں دیا تھا۔ دونوں کے مالی حالات اور مذہب کے فرق کی وجہ سے کمال کو بھی اپنی چاہت کے اظہار کی ہمت نہ ہوئی۔

اسے گمان بھی نہ ہوا کہ کل کی الھڑ، سندر اور جوان لڑکی آج ایک ادھیڑ عمر کی خاتون کے روپ میں اس کے سامنے بیٹھی ہے۔برسوں پہلے اگر یہ کمال کے گھر آئی ہوتی تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں لیکن آج جبکہ وہ سامنے بیٹھی تھی، کمال کو سوائے ہلکے سے دکھ کے اور کچھ نہ ہوا۔وقت کیسے انسان کو بدل کر رکھ دیتا ہے! وہ خود بھی تو بہت بدل گیا تھا۔چونکہ اس کی اپنی شکل وصورت میں دھیرے دھیرے تبدیلی ہوئی تھی اس لیے خود اندازہ لگانا مشکل تھا، لیکن آج سپنا کے آئینے میں اس نے اپنے آپ کو بھی دیکھ لیا۔

سپنا نے اپنا نام بتایا تو کمال نے جذبات سے مغلوب پوچھا،''کیا تم سپنا ہو؟ ہتکھولا کی سپنا؟''

''ہاں، تمہاری کلاس فیلو سپنا''۔

دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ کمال نے اس کے پتی کی خیریت دریافت کی تو وہ کہنے لگی، ''شاید تمہیں خبر نہیں، اس کا پچھلے سال دیہانت ہو گیا تھا''۔ یہ سن کر اسے اپنے بارے میں بھی یقین ہو گیا کہ اب اس کا چل چلاؤ ہونے والا ہے۔ اس نے بچوں کا پوچھا، ''ایک بیٹی ہے۔ یہ لڑکا میرا نواسہ ہے''۔

''کیا نام ہے اس کا؟''

''رادھے شیام چکرورتی''۔ مزید کہنے لگی، ''یہ آئی ٹی پڑھنا چاہتا ہے، سنا تھا کہ یہاں آئی ٹی کی تعلیم بہت اچھی ہوتی ہے۔ یہ اسی سلسلہ میں آیا ہے''۔

''ہوسٹل نزدیک ہی ہے، بہتر ہے کہ طالب علموں سے معلوم کرو، وہ صحیح بتائیں گے۔ بلکہ غلطیوں اور خامیوں کی بھی نشان دہی کر دیں گے''۔

سپنا نے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''تم ہوسٹل جا کر چند لڑکوں سے ملاقات کر لو''۔

''تم خود بھی ساتھ چلی جاؤ''، کمال نے مشورہ دیا۔

''نہیں، لڑکوں کے ہوسٹل میں نہیں جاؤں گی''۔

''کیوں؟''

''لڑکیوں کو لڑکوں کے ہوسٹل جانے کی اجازت نہیں ہوتی''۔

''کیا تم اب لڑکی ہو؟''

''سارے سنسار میں بس ایک ہی لڑکی ہے اور وہ ہے ڈولا رانی''۔

''نانو ماں! آپ۔۔۔۔۔''، لڑکا آگے کچھ اور کہنے والا تھا کہ سپنا نے اسے کہا، ''جلدی سے اٹھو، ورنہ میں سارے بھید کھول دوں گی''۔

لڑکے نے سر جھکایا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد کمال نے پوچھا، ''یہ ڈولا کون ہے؟''

''دونوں اسکول میں اکٹھے پڑھتے تھے، ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ اپنی ماتا کو تو کچھ نہیں بتا سکا لیکن اسے ایک روز میرے پاس لے آیا تھا''۔

''اور اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تم نے اس بیچارے کو شرمندہ کر دیا ہے''۔

''تم بتاؤ میں کیا کروں؟ بڑا ہو گیا ہے لیکن ضدی بہت ہے۔ وہ اکیلا یہاں کبھی نہ آتا۔ ابھی تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ ہوسٹل بھی میرے ساتھ ہی جانا چاہتا تھا۔ اسے جوانوں کی طرح رہنا چاہیے، بچوں کی طرح نہیں''۔

''اگر کوئی ساتھ دینے والا ہو تو کون اکیلے جانا پسند کرتا ہے''۔

''تم بھی تو سارا جیون اکیلے ہی رہے ہو''۔

''میں کیا کر سکتا ہوں؟ کوئی میرا ساتھ دینے کو تیار ہی نہیں تھا''۔

''تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری اس بات پر یقین کر لوں؟''

''تم مانو یا نہ مانو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن سچ یہی ہے''۔

وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ملازمہ کچھ کھانے پینے کے لیے لے آئی۔ کمال نے اسے میز پر چیزیں رکھنے کو کہا اور اسے سپنا کے لیے چائے لانے کو بھیجا۔ وہ چائے لانے چلی گئی۔

....

کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑی مینا کپڑے تبدیل کر رہی تھی، کمال کو اچھا نہ لگا۔ پھر وہ اس کے پاس آئی، پلنگ پر بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسے کچھ کچھ یاد آ رہا تھا کہ وہ میکو کی خاطر اسے چھوڑے جا رہی ہے۔ کمال نے اسے کہا، ''حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار کھل کر بات کرو''۔

''فی الحال نہیں۔ ہولی کے بعد بات کریں گے۔ ہولی پر ہم شانتی نکیتن جائیں گے''۔

''کون کون؟''

''ہوسکتا ہے مالا کے علاوہ دو چار اور بھی ہوں۔ شاید میکو بھی''۔

اسے اچانک یوں لگا جیسے مینا میکو کو جال میں پھنسا رہی ہو۔ اسے اپنے سینے میں درد کی لہر اٹھتی محسوس ہوئی، اور ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ کمرے میں کرسی پر اکیلا ہی تھا، گویا بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور مینا سپنے میں آ گئی۔ بڑھاپے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ کسی لحہ بھی اس کی سانسیں ختم ہو جاتیں، لیکن اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ مینا کو نہ بھول پایا تھا۔ وہ کیسے بھول گئی؟ کیا مینا کے دل و دماغ میں اس کے لیے کوئی جذبہ نہیں تھا؟ کیا ایسا ممکن ہے؟

کمال کو یاد آیا کہ اسے شام ساڑھے چار بجے میڈیکل کالج کے بورڈ آف گورنرز کی میٹنگ میں جانا ہے۔ اس نے الماری سے قمیص نکالی، اور پھر یاد کا ایک جھونکا آیا۔ یہ قمیص دونوں نے اکٹھے جا کر خریدی تھی۔ رنگ مینا کی پسند کا تھا، اس کے جانے کے بعد سے کمال نے یہ قمیص دوبارہ نہیں پہنی تھی۔ کیا اسے آج پہننا چاہیے؟ اتنا عرصہ اس کو اپنے پاس رکھنے کا کیا جواز ہے۔ یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی۔ جب وہ کوئی ایسی چیز دیکھتا جس کا تعلق مینا سے ہو، اس کا دل درد سے بھر جاتا۔ کیا مینا کو ایسا محسوس نہیں ہوتا؟ اس نے ساڑھیاں اور دوسری چیزیں دیکھ کر اپنے آپ سے سوال کیا، وہ اب انہیں کیسے استعمال کرے گی؟ کیا اس نے پہلے بھی استعمال کی تھیں یا نہیں؟ کیا اس کا دل اس قدر بے حس تھا؟

یہ خیالات ذہن میں آئے تو کمال نے قمیص واپس الماری میں رکھ دی۔ دوسری قمیص پہن کر میٹنگ کے لیے باہر نکلا اور میدان کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ ایک طرف کچھ لڑکے والی بال کھیل رہے تھے۔ کتنی شاندار زندگی ہے! اس نے سوچا۔ جیون کے یہ دن کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ جب وقت تھا، اسے کھیلنے کا موقع نہیں ملا حالانکہ اس زمانے میں بھی گاؤں میں کھیلوں کا میدان تھا۔ اسے اپنی تعلیم کے علاوہ گھر کے دیگر کام بھی کرنے ہوتے تھے، لیکن اس وقت وہ مسرور تھا کہ اب یہاں کے بچے بچپن کی تفریحات اور کھیلوں وغیرہ سے محروم نہیں رہے۔ صرف یہی نہیں، دوسرے میدانوں میں بھی وہ جلد ہی باقی بچوں کی ہمسری کے قابل ہو جائیں گے۔ اسی اثنا میں اس کی نظر بائیں طرف گئی۔

ایک لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے سے باتیں کرتے چہل قدمی کر رہے تھے۔ شاید وہ میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ ان کی قربت اور گفتگو کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ ان کی آپس میں گہری دوستی ہے۔ باتیں کرتے کرتے لڑکی کسی بات پر خم کھاتے ہوئے ہنسنے لگی جیسا کہ وہ بہت خوش ہو۔ لڑکے کے چہرے پر سکون اور پریم کی لہریں رقصاں تھیں۔ دونوں بہت مسرور تھے۔ کمال کے دل سے دعا نکلی، خوش رہو بچو! تمہیں کبھی بھی دکھ اور پریشانی نہ ہو۔

کمال نے سوچا کہ اس کی اپنی زندگی بھی ایسی ہوسکتی تھی، لیکن نہیں ہوسکی۔ موسم بار بار لوٹ کر آتے ہیں مگر جیون کے بیتے پل ایک دفعہ گئے سو گئے۔ اس نے اپنی زندگی ایک ایسی ذات کے لیے گروی رکھ دی تھی جو واپس نہیں آئی۔ اس کا بھی ایک جیون تھا مگر بے رنگ، بے کیف۔ اب وہ ایک خستہ حال اور بے روح زندگی کے ساتھ وقت پورا کر رہا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے وہ آڈیٹوریم کے قریب جا پہنچا۔

....

اپنے دالان میں بیٹھا کمال اخبار دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر پر نظر پڑی۔ کوریا اور فلپائن کی چند خواتین نے جاپانی حکومت پر مقدمہ دائر کیا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جاپانی فوجیوں نے انہیں عصمت فروشی پر مجبور کیا تھا۔ عدالت نے اس بنیاد پر مقدمہ خارج کر دیا کہ اگر حکومت کی جانب سے دوسرے ملک میں کوئی شرانگیزی اور غیر اخلاقی حرکت ہوئی ہے تو ایک فرد یا افراد کی بجائے متعلقہ حکومت کو مقدمہ کرنا چاہیے۔ دوسری خبر بھی جاپان ہی سے متعلق تھی کہ ایک ادارے کے سربراہ پر دیگر سائنسدانوں نے الزام لگایا ہے کہ اس نے ایک بھارتی سائنسدان خاتون کو محض اس وجہ سے ناجائز ترقی دی ہے کہ اس کے خاتون سے جنسی مراسم تھے، لیکن سربراہ کا موقف ہے کہ اسکی بیوی بچے ہیں لہٰذا اس الزام میں کوئی حقیقت نہیں۔ بالفاظِ دیگر، بال بچوں اور بیوی والا شخص بے ایمان اور غیر اخلاقی حرکات کا مرتکب نہیں ہوتا، جبکہ کمال کا اپنا تجربہ بالکل مختلف تھا۔ اکیلا رہنے والا شخص انتہائی محتاط رہنے کے علاوہ متعدد اصولوں کی پاسداری بھی کرتا ہے۔ اس کے برعکس شادی شدہ لوگ زیادہ مشکلات اور مسائل پیدا کرتے ہیں۔ ینا کی مثال سامنے تھی جو شادی شدہ ہونے کے باوجود دوسرے مردوں کے ساتھ دادِ عیش دیتی رہی اور اب اسے چھوڑ کر جاپان چلی گئی مگر اس کی یادیں ابھی تک دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ہیں۔ وہ خود کو کتنا بے بس اور لاچار محسوس کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد پلاش آ کر کہنے لگا، ''دادا ابو! آپ کا حکم تھا کہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپس آ جاؤں۔ میں آ گیا ہوں لیکن کیا آپ کا فیصلہ درست تھا؟''

کمال نے سکھ کا سانس لیا اور کہا، ''تمہارا تعلق اسی دھرتی سے ہے۔ تم واپس آ کر یہاں کام کرو گے، اس میں برائی کیا ہے؟''

''آپ اس دیش کے لوگوں اور بالخصوص بنگالیوں کے لیے دن رات کام کرتے رہے، حاصل کیا ہوا ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''کیا آپ کو کلکتہ میں ہونے والی عالمی بنگالی کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا؟''

''کون کس کو اور کیوں مدعو کرے؟ یہ ہماری اپنی کانفرنس تھی، مجھے خود شامل ہونا چاہیے تھا''۔

''میں نہیں مانتا، دادا ابو! آپ صحیح بات کیوں چھپا رہے ہیں؟''

''صاف بات کرو، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''کانفرنس میں نیئی بھومک کو بلایا گیا حالانکہ وہ باہر رہتا ہے۔ وہاں اس نے اچھی خاصی دولت جمع کی۔ بنگالیوں کے لیے اس نے کیا کیا ہے؟ وہ تو بنگالی بول بھی نہیں سکتا۔ کانفرنس میں بھی اس نے بنگالی میں چند ٹوٹے پھوٹے جملے بولے اور پھر انگریزی پر آ گیا''۔

''اس نے بنگالیوں کا نام روشن کیا ہے''۔

''اس کے بنگالی ہونے کا سوائے خود اس کی اپنی ذات کے اور کسی کو علم ہی نہیں۔ وہ تو اپنے آپ کو بنگالی سمجھتا ہی نہیں ورنہ اپنی مادری زبان کے بارے میں وہ اتنا بے حس نہ ہوتا، یہ وہی زبان ہے جو اس نے سرکاری اخراجات پر یہاں رہ کر اسکول میں پڑھی اور سیکھی تھی''۔

''لیکن اس کے باوجود وہ ہے تو بنگالی''۔

''سوبھندو چکرورتی کو دیکھیں۔ وہ امریکہ میں کاروبار کرتا ہے، اسے بھی بلایا گیا تھا۔ سواپن رائے نے باہر رہ کر دولت اکٹھی کی، اس کو بھی دعوت دی گئی۔ اور آپ، جس کی ساری زندگی بنگالیوں کی خدمت کرنے اور ان کی حالت سنوارنے میں گزر گئی، بلایا ہی نہیں گیا''۔

''میرے بچے! پچھلے سال مجھے چین بلایا گیا تھا''۔

''دادا ابو! آپ حقیقت کی پردہ پوشی کر رہے ہیں۔ ساری زندگی محنت اور خدمت کا آپ کو صلہ کیا ملا؟''

''میں پردہ پوشی نہیں کر رہا۔ چلو تم ہی مجھے سمجھا دو''۔

''جن لوگوں کو دوسرے ملکوں سے بلایا گیا، وہ سب دولتمند ہیں۔ آپ کے پاس کچھ نہیں، لہٰذا دعوت بھی نہیں دی گئی۔ یہ ہے حقیقی وجہ''۔

''یہ فطری بات ہے۔ کانفرنس کے منتظمین کو اخراجات کے لیے روپے پیسے کی ضرورت تھی، اگر ان امیر لوگوں کو نہ بلایا جاتا تو رقم کہاں سے آتی؟ اب دوسرا پہلو بھی دیکھو۔ باہر رہنے کی وجہ سے وہ قابلِ کشش ہیں۔ میں یہیں رہتا ہوں، اس لیے توجہ کے لائق نہیں۔ سفیر علی کی مثال لے لو''۔

''وہ کیا؟''

''اس کا بڑا بیٹا مانک ایک مقامی اسکول میں استاد ہے۔ والدین اس کے ساتھ رہتے ہیں، دال بھات اور دوا دارو کا خیال رکھتا ہے، ان کے انتقال کے بعد یہی بیٹا ماں باپ کے کفن دفن کا انتظام کرے گا۔ چھوٹا بیٹا انیس امریکہ میں رہتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ خط پتر لکھ کر ان کی خیریت پوچھ لیتا ہے۔ سال میں ایک بار چھٹیوں میں آ کر انہیں کچھ قیمتی تحائف دے دیتا ہے۔ یہ اس کے لیے، بہت آسان ہے، نہ قربانی، نہ کوئی کشٹ۔ مانک یہاں ماتا پتا کے لیے سب کچھ کرتا ہے لیکن سفیر کی نظر میں یہ اس کا حق ہے، اور وہ مانک کی خدمت کا نہیں، بلکہ اٹھتے بیٹھتے انیس کے تحفوں کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ وہ انہیں اپنے پاس کبھی بھی نہیں لے کر گیا اور یہ صرف اس لیے اس کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ دور رہتا ہے۔ سفیر کے ساتھ دونوں بھائیوں کی بات کرو تو وہ انیس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے جبکہ مانک اور اس کی بیوی کے متعلق بس شکایتیں ہی شکایتیں ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مانک کی نسبت انیس ماں باپ کی زیادہ سیوا اور دیکھ بھال کرتا ہے؟''

''جی نہیں، میں نے جن لوگوں کا نام لیا ہے وہ ساری دنیا میں مشہور ہیں''۔

''بالکل ایسا ہی ہے۔ ہم ان کی عزت کرتے ہیں۔ باہر رہنے والے بھارتی اگر معمولی سا بھی اچھا کام کریں تو ہم ان کا فخر سے ذکر کرتے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ہم بھکاریوں کی طرح انہیں اپنا کہتے اور سمجھتے ہیں جبکہ وہ ہمیں اپنا نہیں سمجھتے۔ ان ملکوں میں رہنے والے یا تو ہمیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے یا ان کا ہمارے ساتھ رویہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا رجحان اور جھکاؤ گدائی کی جانب نہیں ہوتا''۔

''کیا ان کا وہاں قیام مناسب ہے؟''

''مناسب تو نہیں لیکن ایک قابل اور محنتی انسان کے لیے ٹھیک ہے۔ پسماندہ ملک کے اخراجات پر تعلیم حاصل کر کے وہاں دولت کمانا آسان ہے، لیکن وہاں کی نسبت وہ لوگ یہاں زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ پھر ان کی کرنسی ہماری کرنسی سے کئی گنا طاقتور ہے، ان کا معیارِ زندگی ہم سے بدرجہا بہتر ہے، ایک ہی جیسے کام کا انہیں ہم سے زیادہ معاوضہ ملتا ہے''۔

''اگر یہی بات ہے تو آپ وہاں قیام کو اچھا کیوں نہیں سمجھتے تھے؟''

''ہاں! میں اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ وہاں رہنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں البتہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اپنے ملک اور ہم وطنوں کی بھلائی کا نہیں سوچتے۔ کچھ ملکوں کی معاشی حالت ہم سے بہتر ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے ممالک میں رہ کر وہاں کی زندگی سے لطف اندوز ہونا ہی ان کے اپنے جیون کا واحد مقصد ہے، وہ اپنے بے شمار ہم وطنوں کے حالاتِ بد سے بالکل غافل ہو جاتے ہیں''۔

''اور آپ؟''

''میں اپنے ملک اور لوگوں کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں''۔

''آپ کی کوششوں سے کیا لوگوں کی مشکلات کم یا ختم ہو جائیں گی؟''

''میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا، ہاں البتہ باقی لوگ بھی ایسی ہی کوشش کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے''۔

''وہ کیسے؟''

''اپنے ملک کو ترقی دیں، میعارِ زندگی بلند کریں اور اپنی کرنسی کو مضبوط کریں تو باہر رہنے والوں اور یہاں سے جانے والوں کے لیے وہاں کوئی کشش نہیں رہ جائے گی۔ اگرچہ کچھ لوگ پھر بھی جائیں گے لیکن وہاں سے بھی تو لوگ آیا کریں گے۔ افرادی آمدورفت یک طرفہ نہیں بلکہ دوطرفہ ہوگی''۔

''کیا آپ کے خیال میں مستقبل قریب میں ایسا ہونا ممکن ہے؟''

''مستقبل قریب میں تو نہیں لیکن آگے چل کر ایسا ہونا ممکن ہے''۔

''دادا ابو! آپ اس عمر میں اتنی ذہنی مشقت کیسے کریں گے؟''

''اپنی دھرتی اور لوگوں سے پریم کرو، پھر دیکھو کیا ہوتا ہے''۔

پلاش کمال کی باتوں سے مطمئن اور قائل ہو کر وہاں سے چل دیا لیکن اس کا اپنا ذہن پریشان ہو گیا۔ پلاش سے جو مرضی کہے، اس نکتے نے اسے جیون بھر خلش میں مبتلا رکھا۔ پلاش نے نینی بھومک کا نام لیا تھا۔ کمال جانتا تھا کہ وہ ذہین اور محنتی طالبِ علم تھا۔ مقامی اہلِ ثروت لوگوں نے غربت میں اس کی مدد کی، پھر وہ امریکہ چلا گیا۔ وہاں اس نے کوئی چیز ایجاد کی جس کی وجہ سے دولت اس کے پاؤں چھونے لگی۔ اس قسم کے وہاں بے شمار لوگ ہیں لیکن ان کے دلوں میں دوسروں کی مدد اور بالخصوص اپنے ملک کی بھلائی کا جذبہ مفقود ہے۔ بھومک کے دل میں کیا ہے؟ ہم نہیں جانتے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں پر ہم اس جیسے لوگوں پر چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں، کیونکہ یہ ہماری گدائی کی خصلت ہے۔ ہم محنت نہیں کرتے، اور یوں ہم جیسے بے شمار لوگ کسمپرسی کی زندگی گزارتے ہیں۔

ایک شخص کا جنم یہاں ہوتا ہے مگر وہ شہریت کسی دوسرے ملک کی لے لیتا ہے، وہ نوبل پرائز بھی حاصل کرتا ہے۔ اپنے ملک میں قابل اور محنتی لوگوں کا ہجوم ہے لیکن ان کی پروا نہیں کی جاتی۔ ہم بھکاری لوگ کامیاب لوگوں کے ساتھ پرانے تعلقات اور رشتے جوڑ کر ان کی زندگی میں بھی لاتعداد بکھیڑے اور مشکلات کھڑی کر دیتے ہیں، لیکن ہم اس شخص کو بالکل بھول جاتے ہیں جس نے زندگی بھر کی کمائی یہاں ایک اسکول قائم کرنے میں خرچ کر دی۔ احساسِ کمتری کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر ہمیں اپنی عظمت، یا کم از کم مساوات کا احساس ہوتا تو ایسا کبھی نہ کرتے۔ کمال کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ احساسِ کمتری کب ختم ہوگا، بایں ہمہ، وہ اس کے خاتمے کے لیے کام کرتا رہے گا۔

صرف یہی نہیں، اور بھی بہت سی باتیں اس کے سکون اور ذہن کو تلپٹ کیے جاتی تھیں۔ مثلاً، دولت مند گھرانے میں جنم لینے والا بچہ عظیم کرکٹر یا فلم سٹار بن جاتا ہے۔ اس میں اس کی اپنی محنت کم اور دنیا بھر میں اس کی تشہیر کا کردار زیادہ ہے۔ اس کے برعکس ایک غریب گھر میں پیدا ہونے والا بچہ زیادہ سے زیادہ کسان یا مزدور بن پاتا ہے۔ وہ کرکٹر اور فلم سٹار کی نسبت بہت زیادہ محنت کرتا ہے لیکن لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے۔ کتنی بڑی ناانصافی ہے یہ!

کسان یا مزدور کی بات چھوڑیئے، یہاں تو سائنسدان، فلسفی یا لکھاری کی بھی پہچان اور شہرت نہیں ہوتی۔ یہ سراسر زیادتی ہے جس کے پسِ پردہ لوگوں کی ذہنیت اور غلط سوچ کارفرما ہے۔ ایک نظر دوسری جانب ڈالیں تو کھدری رام دکھائی دیتا

ہے جس نے ملک کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔ پھر جواہر لال نہرو ہے جو اس ملک کا پردھان منتری بنا، برکت نے مادری زبان کی خاطر قربانی دی، شیخ مجیب الرحمٰن بنگلہ دیش کا وزیر اعظم بنا، اس کے بعد اس کی بیٹی بھی یہاں تک پہنچی، لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ برکت کے خاندان والے کہاں ہیں۔

کمال نے سوچا کہ اگر وہ چاہتا تو باہر جا کر خوشحال زندگی بسر کر سکتا تھا، چلیں مستقل نہ سہی، تھوڑے عرصہ کے لیے چلا جاتا۔ کچھ لوگ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ چونکہ وہ خود نہیں گیا اس لئے دوسروں کو بھی جانے سے منع کرتا ہے۔ لیکن اس کا نقصان کیا ہوا؟ کیا بہتر نہیں کہ دوسرے بھی اسی انداز سے سوچیں۔ ان سب باتوں کے باوجود کمال یہ نہ جان سکا کہ باہر جانے والے بھی اسی طرح خوش تھے جیسے یہاں قیام کرنے والے، پھر وہ خود کیوں خوش نہیں تھا؟ کمال نے اس پہلو پر بار بار غور کیا، پھر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی افسردگی اور آزردگی کی بس ایک ہی وجہ ہے کہ اس نے ہمیشہ دوسروں پر سبقت لے جانا چاہی۔

یہاں کے لوگ اپنی قناعت کے سبب خوش تھے، انہوں نے دوسرے ملکوں کے معیارِ زندگی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ جو لوگ ترکِ وطن کر گئے انہوں نے مسابقت کی دوڑ میں حصہ لینے کی خواہش نہیں کی، اپنی دھرتی اور ہم وطنوں کے لیے ان کے دل میں کام کرنے کا جذبہ مفقود تھا جبکہ کمال کے دل میں یہ جذبہ انتہا تک پہنچا ہوا تھا، وہ اپنی دھرتی کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا دیکھنا چاہتا تھا۔ راستے میں بکھرے کانٹوں اور مشکلات کا علم ہونے کے باوجود وہ اپنی دھن میں لگا رہا، اس نے راہ کی رکاوٹیں ہٹانے کی کوشش کی جس کا نتیجہ وہ بھگت رہا تھا۔ اس کی دل شکستگی اور مایوسی کی وجہ بھی یہی تھی۔

اس کا جنم ایک معمولی کسان اور مزدور گھرانے میں ہوا تھا۔ اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح خود بھی محنت مزدوری کرتا تو دکھ کی کوئی بات نہیں تھی، لیکن اس نے سائنسدان بننے کی کوشش کی۔ ناقابلِ بیان غربت اس کی راہ کا روڑا بنتی رہی، محنت سے وہ انڈین پولیس سروس میں آ گیا۔ اس ملازمت کے حصول کے بعد بھی وہ خوش باش زندگی گزار سکتا تھا۔ اپنے خاندان سے دوری اختیار کر کے، کسی امیر کبیر سندر اور معمولی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کر لیتا اور اپنا جیون سکون سے گزارتا۔ یا یہ بھی ممکن تھا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کی بجائے کسی ایسی لڑکی کا چناؤ کرتا جو اس کے خاندان میں آسانی سے گھل مل جاتی۔ لیکن اس نے تو دونوں انتہاؤں پر پُل باندھنے کی کوشش کی تھی، لہٰذا اس کی قیمت بھی چکانا پڑی۔ مینا نے اسے باہر کسی ملک میں مستقل قیام پر بہت ورغلایا، بڑے سبز باغ دکھائے، اور اگر وہ اس کی بات مان کر باہر چلا جاتا، اپنے ملک کی ترقی سے متعلق لیکچر وغیرہ دیتا تو شاید خوش رہتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، اور نتیجتاً وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ چلی تو گئی مگر یادوں کے انمٹ نقوش باقی رہ گئے، اب انہیں حقیقت اور سچ سمجھنے کے علاوہ اور کیا تھا۔

مینا کے جانے کے بعد اس نے ہمت نہیں ہاری اور ملک کی بہتری، بھلائی اور خوشحالی کے لیے اور زیادہ کام شروع کر دیا۔ اگر وہ ملک کا معیارِ زندگی قدرے بلند دیکھ پاتا تو اسے خوشی اور تسلی ہوتی، لیکن اس نے تو عالمی معیار کو مدِ نظر رکھا تھا۔ اپنی تکلیفوں اور دکھوں کو چھپایا، اور یوں نقصان اٹھاتا رہا۔ اس نے ساری صورتِ حال کا جائزہ لیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ترقی یافتہ ممالک ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر غریب ملکوں کا استحصال کرتے ہیں۔ وہ انسانی حقوق کے نعرے لگاتے جبکہ خود سب سے زیادہ ان حقوق کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ انہوں نے ترقی پذیر ملکوں کی ترقی روکنے کے لیے ناروا پابندیاں ہی نہیں لگائیں بلکہ انہیں امن اور چین سے بھی نہیں رہنے دیا۔ کمال اس خوش فہمی میں تھا کہ ان ملکوں کو اپنے ہی تباہ کن ہتھیاروں سے برباد ہونا چاہیے، ہم ان کی ٹیکنالوجی پر اجارہ داری ختم کر کے ان سے سب کچھ سیکھیں گے اور پھر ان پر سبقت لے جائیں گے۔ آخر ہم کامیاب کیوں نہیں ہوتے؟ اگر امریکہ میں قدرتی ذرائع موجود ہیں تو پھر کیا، ہمارے ملک میں بھی یہ سب کچھ پایا جاتا ہے۔ جاپان جیسا ملک امریکہ سے معدنیات درآمد کر کے ان سے مختلف اشیاء بناتا اور واپس انہی کو برآمد کرتا ہے۔ ہم کیوں ایسا نہیں کر

تے؟ ہمیں اپنی معدنیات نہیں، تیار شدہ مال برآمد کرنا چاہیے، ہمیں ٹیکنالوجی سیکھنا ہوگی، لہٰذا ٹیکنالوجی کالج کا قیام درست سمت پر شاندار پیشرفت ہے، اسے اس منصوبے پر کام کرنا ہوگا۔

....

کمال کمپیوٹر پر بیٹھ کر اپنے خیالات قلمبند کرنا چاہتا تھا لیکن کمپیوٹر کی سکرین دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ عینک صاف کرنے کے باوجود دھندلاہٹ میں کمی نہ ہوئی۔ اچانک اسے وہ دن یاد آ گیا جب پہلی بار کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر مینا کی مدد سے کام کیا تھا۔ اب وہ کہاں ہے؟ اسے علم نہیں تھا۔ کمپیوٹر بند کر کے اس نے سوچا کہ اپنی آنکھوں کا معائنہ کرانا ہوگا۔

جیون کی ڈور اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ سانسوں کی پتنگ کسی وقت بھی کٹ کر گر جاتی۔ کمال سوچ رہا تھا کہ اس کے سپنے ہنوز نامکمل ہیں۔ اس نے اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل کے لیے دن رات محنت کی۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مشن تھا کہ اپنے ملک کو ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ، اور اگر ممکن ہو تو ان سے بھی آگے لے جائے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ اتنی اونچی چوٹی سر نہ کر سکا۔ ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزارتا رہا اور اسی حالت میں اس کا آخری وقت آ جائے گا۔ اپنے ہم نواؤں کی مدد سے اس نے علاقے میں چند اسکول، کالجز اور یونیورسٹی کے علاوہ الیکٹرونکس کی مصنوعات، ایک بسکٹ فیکٹری اور ایک آٹے کی مل بھی لگائی تھی۔ سڑکیں اور دیگر ذرائعِ آمد و رفت میں خاطر خواہ بہتری ہوئی جس سے کاروباری سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ وہ سوچتا کہ اگر اور لوگ بھی سامنے آئیں تو بلاشبہ ملک کی قسمت بدل جائے گی۔

کمال کی ان کاوشوں کے سبب مختلف طبقوں کے لوگ اسے جاننے لگ گئے تھے۔ وہ تمام لوگوں میں تحفظ اور مساوات کا احساس پیدا کرنا چاہتا تھا۔ کیا وہ اس میں کامیاب ہو پائے گا؟ یہ اس کے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کے سر میں شدید درد اٹھا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

....

آنکھیں کھول کر جاننے کی کوشش کی کہ وہ اس وقت کہاں ہے، لیکن سمجھ نہ پایا۔ ایک بار تو یوں لگا جیسے بستر پر لیٹا ہو۔ ہاتھ بڑھا کر لیمپ جلانا چاہا لیکن وہاں تو دیوار تھی، یہ کیا؟ اس کے بستر کے ساتھ تو کوئی دیوار نہیں تھی۔ فرش پر ہاتھ لگا تو ٹائلوں کی ملائمت محسوس ہوئی، لیکن یہ کیا؟ اس کے گھر میں، سوائے باتھ روم فرش کے، کہیں بھی ٹائلیں نہیں لگی تھیں۔ کمال نے لیٹے لیٹے سوچنے کی کوشش کی کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے۔ اسے اتنا یاد آیا کہ رات گیارہ بجے کے قریب وہ دودھ پی کر لیٹ گیا تھا، پھر باتھ روم کیسے اور کب آیا؟ دماغ لڑانے پر یادداشت میں کچھ بلبلے سے اٹھے جیسے ساگر کی سطح پر ہلکے ہلکے ہلکورے پیدا ہو رہے ہوں۔

اسے یاد آیا کہ وہ کئی دنوں سے سونے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزر جاتی۔ رات کو کسی سمے اسے باتھ روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی، اٹھ کر روشنی کی لیکن بستر سے اٹھتے ہی لڑکھڑا کر گر گیا۔ اس کے لیے ہلنا دوبھر ہو گیا تھا لیکن کسی نہ کسی طور اپنے بھاری بھر کم بدن کو کھینچ کھانچ کر باتھ روم کے دروازے تک لے آیا پھر شاید اس کے حواس جواب دے گئے تھے۔ اسے علم نہیں کتنی دیر بے سدھ اور بے جان فرش پر پڑا رہا۔ تھوڑے سے حواس بحال ہوئے تو اس نے دھوتی کو چھو کر دیکھا جو گیلی ہو گئی تھی، گویا مدہوشی میں پیشاب خارج ہو گیا تھا۔ بیٹھنے کی کوشش بھی ناکام ہوئی۔ سارا بدن بے جان تھا۔ اسی حالت میں اس نے دروازے کی سمت جاننے کی کوشش کی مگر کچھ سجھائی نہ دیا۔ اسے اتنا یاد تھا کہ اس نے روشنی کی تھی لیکن اس وقت تو ہر سو اندھیرا تھا۔ کیا لوڈ شیڈنگ ہوئی ہے؟ وہ انتہائی بے بسی اور لاچاری کی حالت میں سوچنے لگا کہ اگر کسی نہ کسی طور باہر نہ نکلا تو یہیں پڑا پڑا مر جائے گا۔ فون بستر کے پاس تھا لہٰذا وہاں تک جانا ضروری تھا۔ تھوڑی کوشش کرنے کے بعد اسے دروازے کی سمت کا اندازہ ہوا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس میں کھڑا ہونا تو کجا، بیٹھنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ آخر بڑی مشکلوں سے

اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا بستر تک پہنچا۔ اتنے میں دیواری گھڑی نے دو بجنے کا اعلان کیا، گویا وہ کم وبیش تین گھنٹے باتھ روم میں پڑا رہا تھا۔ بدحواسی میں اس نے بستر کے ساتھ لگے سوئچ کو ہاتھ لگایا لیکن روشنی ندارد، یعنی لوڈ شیڈنگ تھی اندھیرے میں فون کرنا مشکل تھا لیکن فون کرنا چاہیے، مگر کس کو؟ اتنی رات گئے؟

اس کا اپنا کوئی بھی نہیں تھا۔ دوسرے بھائی کا پوتا پلاش البتہ اس سے محبت کرتا تھا۔ حال ہی میں اس کی شادی ہوئی تھی لیکن اس کی بیوی کو کمال کے ساتھ پلاش کا اتنا لگاؤ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ چھوٹے بھائی کے بچے اس کی دکھ بھال کرتے تھے مگر اب وہ بھی نہیں تھے۔ انہیں آشا تھی کہ کمال کے مرنے کے بعد کچھ نہ کچھ انہیں مل جائے گا مگر جب اس نے ساری پونجی اور مال منال رفاہی کاموں کے لیے عطیہ کیا تو انہوں نے بھی ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ اس نے کنڈر گارٹن اسکول کی پرنسپل کو فون کرنا چاہا لیکن ہچکچایا کہ رات ڈھائی بجے کسی خاتون کو فون کرنا انتہائی غیر مناسب ہے۔ اس کی ملازمہ پارول اور اس کا بیٹا زمان اسی گھر میں رہتے تھے لیکن یہ جاننے کے بعد کہ کمال نے اپنا سب کچھ دان کر دیا ہے، وہ بھی دور دور رہنے لگے۔

....

ایک روز پارول نے کمال سے پوچھا تھا، ''لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے یہ گھر سوسائٹی کے نام کر دیا ہے؟ کیا واقعی؟''

''ہاں، بالکل۔ میری زندگی اب تھوڑی ہے، یہ گھر سوسائٹی کے کام آئے گا''۔

''پھر ہم کہاں جائیں گے؟''

''کیا مطلب؟ تم لوگوں کا اپنا گھر ہے نا''۔

''پھر ٹھیک ہے، میں آج سے اپنے گھر ہی رہا کروں گی۔ اتنے بڑے گھر میں رہنے کی ہمیں کیا ضرورت ہے؟''

کمال کو بہت دکھ ہوا۔ اپنا گھر سوسائٹی کے نام کرنے کے بعد اسے ایسے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا، یہ کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔ اس نے پارول سے پوچھا، ''کیا یہ گھر تم لینا چاہتی تھیں؟''

''اگر ایسی بات نہ ہوتی تو ہم یہاں کام کیوں کرتے ہیں؟ اور زمان، جس کے پاس اپنا گھر نہیں، وہ بھی آپ کی خدمت کیوں کرتا ہے؟ آپ نے کبھی اپنوں کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ اسی وجہ سے آپ کی پتنی بھی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ پہلے میں اکثر سوچتی تھی اس نے ایسا کیوں کیا، اب مجھے یقین ہوا کہ اس نے بالکل درست فیصلہ کیا تھا، اور اسی سبب آپ کے بھائی بھی آپ کی پروا نہیں کرتے، انہیں کیا پڑی ہے آپ کا خیال رکھنے کی؟''

کمال سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا، پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا، ''تم لوگوں کو بھی یہاں رہنے کی ضرورت نہیں''۔

''میں یہاں رہ کے کروں گی بھی کیا؟ میں نے بالکل صحیح کہا ہے۔ سچ بات سب کو بہت بری لگتی ہے، وہ کہتے ہیں نا کہ 'گرم چاول بلیوں کو پسند نہیں'۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ یہاں کام نہ کرنے کی وجہ سے میں فاقوں مروں گی۔ میں جا رہی ہوں''۔

پارول نے دوبارہ وہاں قدم نہ رکھا۔ اس وقت کمال سوچ رہا تھا ممکن ہے اس بار بلانے پر آجائے لیکن بلانے کو دل نہ چاہا۔ وہ خود بازار سے جا کر سودا سلف لاتا اور کھانا پکاتا، اور اگر کبھی کسی وجہ سے کھانا تیار نہ ہو سکتا تو وہ خالی پیٹ رہتا۔ ایک دفعہ تو وہ مسلسل دو دن کھائے پیئے بغیر بیٹھا رہا۔ پھر اس کی خوراک تھی بھی کیا؟ ابلے چاول اور بسکٹ۔ پریشانیوں، دکھوں اور کم خوری کی وجہ سے وہ جسمانی لحاظ سے کمزور اور نیم دیوانہ سا ہو گیا۔ پارول کی باتی باتیں تو شاید اتنی تکلیف دہ نہیں تھیں جتنا دکھ اسے بینا کے حوالے سے بات سن کر ہوا تھا۔ کئی سال گزرنے کے بعد بھی اسے بینا کا یوں آسانی سے چھوڑ کر چلے جانا سچ معلوم نہیں ہوتا تھا، اسی طرح پارول کی ہتک آمیز باتیں بھی دل میں تیر کی مانند لگیں، لیکن کہا تو اس نے ٹھیک ہی ہے۔ یہ اس کے

جیون کا انتہائی دکھ بھرا باب تھا۔

یہ ساری باتیں کمال کے ذہن میں آئیں تو اس نے کسی کو بھی نہ بلانے کا فیصلہ کیا۔ بڑی مشکل سے اپنے گیلے کپڑے اتارے لیکن نقاہت کے مارے الماری سے دوسرے کپڑے نکالنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کسی نہ کسی طور خود کو کھینچ تان کر بستر پر چڑھا اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔

کتنی بے بس زندگی تھی اس شخص کی! وہ ایسے حالات کا مارا ہوا تھا جس کا کوئی علاج نہیں۔ مینا کا چلے جانا بھی ایک ایسی ہی پہیلی تھی جسے ابھی تک نہ جان پایا۔ مینا کس وجہ سے میکو کے پاس گئی تھی؟ جاتے ہوئے اس نے کمال سے کہا تھا، 'تم نے ٹکڑے ٹکڑے جوڑ کے مجھے بنایا لیکن میکو نے ان ٹکڑوں کو جینا سکھایا ہے، اب میں اس کی ہوں۔ تمہارے ساتھ میں خوش نہیں تھی، اس نے میرے جیون میں خوشیاں بھر دی ہیں'۔ کمال آج تک سمجھ نہیں سکا کہ میکو نے اپنی بیوی اور تین بچوں کے ہوتے ہوئے کون سی ایسی راحتیں اور آسودگی دی جو وہ خود مینا کو نہیں دے سکا تھا۔ کیا کوئی شخص صرف خوشیوں کا متمنی ہوتا ہے؟ کیا اس کی نگاہ میں ذمہ داری اور ادائیگی فرض کی اہمیت کچھ بھی نہیں؟ سوچتے سوچتے اس کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ بچپن میں پارس اور پری کی سنی کہانی اب یاد آ رہی تھی۔

....

کسی زمانے میں دور دراز ایک گاؤں میں پارس نامی نوجوان رہتا تھا، وہیں پری نامی ایک بڑی سندر لڑکی بھی رہتی تھی۔ نام تو اس کا کچھ اور تھا مگر اس کی سندرتا کی وجہ اسے پری کہا جاتا تھا۔ دونوں بچپن ہی سے کھیلتے کودتے جوان ہوئے تو دلوں میں پریم کی جوت جاگی۔ دونوں نے جیون بھر ساتھ نبھانے اور مرنے کی سوگند کھائی۔ ایک روز ایک شہزادہ شکار کھیلتے ہوئے وہاں آیا۔ پری کا حسن دیکھتے ہی وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔ راجہ کو علم ہوا تو پری کے ماتا پتا سے اس کا رشتہ مانگا۔ یہ سن کر سارے رشتہ دار بہت خوش ہوئے لیکن پری نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ وہ پارس کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ اس کی دادی کو ایک تجویز سوجھی۔ اس نے پری کو کہا کہ پہلے ایک بار راجہ کے محل کا چکر لگا کر واپس آ جاؤ اگر پھر بھی پارس سے شادی کرنا چاہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

پری مان گئی، چند دن بعد پارس کو علم ہوا کہ پری تو شہزادے کے ساتھ بیاہ رچانے والی ہے۔ اسے یقین نہ آیا لہٰذا وہ اس سے بات کرنے محل چلا گیا لیکن محل کی شان و شوکت اور سج دھج دیکھ کر وہ خود بھی مسحور ہو گیا۔ ادھر پری بھی اتنا بدل گئی تھی کہ اس نے پارس کو نہ پہچانا۔ جب کافی کوششوں کے بعد اس نے پری کو اپنی محبت اور اس کی سوگند یاد دلائی تو وہ بولی، ''کیا تم مجھے یہ سارا عیش و عشرت اور دولت دے سکتے ہو؟'' یہ سن کر پارس گنگ ہو گیا۔ وہ پھر کہنے لگی، ''تم میری اتنی شاندار زندگی میں روڑا کیوں بن رہے ہو؟''

پارس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کوئی شخص اتنا بھی خودغرض ہو سکتا ہے۔ مایوسی اور نیم دیوانگی کی حالت میں واپس آ گیا۔ اس کے دادا نے اسے تسلی دی، ''جانور کی دو ٹانگیں اسے انسان نہیں بناتیں۔ بہت سے لوگ بڑے خودغرض ہوتے ہیں۔ وہ عہد و پیمان کرتے ہیں، قسمیں کھاتے ہیں اور اگر حالات من پسند ہوں تو ٹھیک ورنہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ تم بھاگوان ہو، تمہاری پسند ہی غلط تھی''۔

پارس ہمسایہ ریاست میں جا کر وہاں کے راجہ سے ملا اور ساری داستان سنائی۔ اس نے سن کر کہا، ''میری مدد سے تم اس لڑکی اور وہاں کے راجہ سے بدلہ لے لو گے مگر مجھے کیا فائدہ ہوگا؟''

''آپ کو اس کی راجدھانی اور مجھے میرے دل کی رانی مل جائے گی''۔

راجہ رضامند ہو گیا۔ اس نے حملہ کر کے دوسرے راجہ اور شہزادے کو قتل کرنے کے بعد اس ریاست پر قبضہ کر لیا۔ تھوڑے دنوں بعد پارس کو پری کا خط ملا جس میں اس نے انکشاف کیا تھا کہ اب فاتح راجہ کی نیت خراب ہو گئی ہے اور وہ خود اس سے شادی رچانا چاہتا ہے۔ اس نے تجویز دی کہ آدھی رات کو وہ محل سے نکل کر پارس کے ساتھ کسی دوسری راجدھانی میں چلے جائیں گے۔ ایسا ہی ہوا۔ راستے میں گہرا، چوڑا دریا عبور کرنا پڑتا تھا۔ پری بولی کہ اسے تو تیرنا نہیں آتا۔ پارس حیرت زدہ رہ گیا کیونکہ وہ دونوں کئی بار قریبی ندی میں تیرتے رہا کرتے تھے۔ بہر حال، طے ہوا کہ پری پارس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ تیرتی جائے گی۔ دریا کا پاٹ چونکہ بہت چوڑا تھا، پارس تھک کر چور ہو گیا لیکن کسی نہ کسی طرح دوسرے کنارے تک پہنچ ہی گئے۔ اب پارس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے پری سے کہا کہ خشکی پر پہنچ کر وہ پارس کو اوپر کھینچے۔ جیسے ہی پری کے پاؤں خشکی پر لگے اس نے تھکے مارے پارس کو پاؤں کی ٹھوکر سے واپس پانی میں دھکیل دیا۔ اتنے میں فاتح راجہ نے وہاں آ کر پری کا ہاتھ تھاما اور بیچارہ پارس دریا میں ڈبکیاں کھاتا نہیں دیکھتا رہ گیا۔

کمال کے ذہن میں آیا کہ جیسے وہ بھی پارس ہو۔ مینا کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیا اور جب وہ ایک مقام پر پہنچ گئی، اس نے کمال کو ٹھوکر مار دی۔ درد اور بے بسی کی لہریں اسے ڈبوئے جا رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے مرنے سے ملک کو کیا نقصان ہو گا؟ لہٰذا کسی کو فون کرنے، بلانے کا بھی کیا فائدہ ہے۔

....

درختوں پر کھلے سفید پھول خوشبو بکھیر رہے تھے۔ زمین پر گرے تو ایسے لگا جیسے سفید قالین بچھا ہو۔ کمال پھولوں کو لتا کی بیلوں میں لگا رہا تھا تاکہ وہ سارا دن ان کی بھینی بھینی خوش بو سے مسرور ہوتا رہے۔ ایک آواز آئی، ''کیا کر رہے ہو؟'' اس نے مڑ کر دیکھا تو ایثار الدین فقیر حسبِ معمول سیاہ جبہ پہنے اس سے پوچھ رہا تھا، ''کیا کر رہے ہو؟''

''ایک ہار بنا رہا ہوں''۔

''کیا تم نماز نہیں پڑھو گے؟''

''اوہ! ہاں، ہاں''۔

وہ فوراً اٹھا مگر اچانک یاد آیا کہ اس نے نماز تو چھوڑ دی ہوئی ہے۔ سوچنے لگا کہ فقیر کو کیسے کہے۔ اتنے میں وہ جنگل کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے رکا، پھر اسے آواز دے کر کمال سے پوچھا، ''کیا تم میرے ساتھ نہیں چلو گے؟''

''ہاں! میں بھی چلتا ہوں''۔

جیسے ہی اس نے تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی، زمین پر گر گیا۔ سپنا بکھر گیا، اس کی آنکھ کھل گئی۔ یاد آیا کہ ایثار الدین فقیر کو انتقال کیے تو ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ فوت شدگان سپنوں میں آئیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ کمال کا اس پر یقین نہیں تھا، نہ یقین کرنے کی کوئی سائنسی بنیاد تھی۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے، پھر بھی اس خواب نے اس کے دل و دماغ میں سنسنی سی پیدا کر دی۔ فقیر اس سے بہت محبت کرتا تھا، وہ کسی حد تک کمال کی سوچوں اور خیالوں سے آگاہ تھا، کوئی دوسرا شخص اس کی دلی کیفیت نہیں جانتا تھا۔ اب تو شاید سپنے میں بھی فقیر سے ملاقات نہ ہو پائے، اور پھر پھولوں سے لدے درخت بھی تو دو تین برس ہوئے کٹ چکے تھے، لیکن ان کی خوشبو یادوں میں ابھی تک تازہ تھی۔ اس نے اپنا آسن بدلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کسی زمانے میں وہ اونچے اونچے درختوں، حتیٰ کہ پہاڑوں پر بھی بآسانی چڑھ جایا کرتا تھا، اور اب بستر پر پہلو بدلنا بھی مشکل تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے مریل ہاتھوں سے رسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی، ''جنم دن مبارک! میں نے مٹھائی اور پھول خریدے ہیں، ستر موم بتیاں بھی جلائی ہیں، لیکن تم تو بہت دور ہو، اس لیے فون پر جنم دن کی مبارک دے رہی ہوں۔ بھگوان ایسے، بہت سے دن مبارک کرے''۔

کمال نے ریتا کی آواز پہچان لی۔ وہ ہر سال اس کے جنم دن کی مبارک دیا کرتی تھی۔ اس نے نقاہت سے اس کا شکریہ ادا کیا، اور اس کی خیریت پوچھی۔ ریتا نے سوال کیا، ''تمہیں اب اس سے کیا واسطہ؟''

''اوہ! سوری۔ میں چونکہ تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا اس لیے واقعی کوئی واسطہ نہیں۔ کیا بات ختم کر دوں؟''

''بلاشبہ''، اور پھر اس نے فون منقطع کر دیا۔

....

رات گزرنے میں نہیں آ رہی تھی۔ کمال بستر پر کروٹیں بدلتا تنگ آ گیا۔ ساری دنیا گویا دشمن بن گئی تھی، وہ کتنا بے بس تھا۔ دور سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں، دوسری طرف مرغوں نے بانگیں دینا شروع کر دیں۔ رات کا اندھیرا دھیرے دھیرے ملگجا ہونے لگا۔ اذان کی آواز سنائی دی۔ ٹھنڈی ہوا ہولے ہولے چل رہی تھی، اسے غنودگی سی ہونے لگی۔ اچانک دروازے کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا، مگر یہ کیا؟ بسنت پور اس کے گھر میں اس سے کون گھنٹی بجا رہا ہے؟ پھر یاد آیا کہ بسنت پور تو بہت بدل گیا ہے۔ گھنٹی پھر ہوئی، اس نے گھڑی دیکھی، نو بج رہے تھے۔ کمال سے اٹھا نہ گیا لیکن دیکھنا تو تھا۔ کپڑے درست کر کے بستر سے اٹھنے ہی کو تھا کہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد حواس بحال ہونے پر پھر سے اٹھنا چاہا مگر اٹھا نہ گیا۔

اب تو اسے یقین ہو گیا کہ اس کی جسمانی حالت بہت بگڑ چکی ہے۔ انا پرستی اور عزتِ نفس کی آواز آئی کہ اب زندگی میں کچھ نہیں رہ گیا، جتنی جلدی موت آ جائے، بہتر ہے۔ وہ اپنے آپ کو گھسیٹ کر دروازے تک لے گیا۔ بڑی مشکل سے کھڑے ہو کر دروازے کی کنڈی کھولی اور پھر زمین پر بیٹھ گیا۔ باہر جھانک کر دیکھا مگر کوئی بھی نہ تھا۔ اتنے میں ایک عورت گود میں بچہ لیے سامنے آئی اور کمال کو یوں زمین پر بیٹھے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ وہ اسے پہچان نہ سکا۔ پوچھنے لگا لیکن اپنی ہی غرغراہٹ سنائی دی۔ اس نے اپنا نام بتایا، ''سرسوتی''۔ لیکن وہ پھر بھی نہ پہچان پایا اور ٹک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ وہ کہنے لگی، ''سر! میں سرسوتی ہوں، میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی''۔

اب اس نے پہچانا، ''اوہ! سرسوتی! کیا تم اپنے پتی کے ساتھ ویلور نہیں گئی تھیں؟ کیا اب بھی وہیں ہو؟''، ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کمال نے اس سے سوال کیا۔

''نہیں سر! ہم ایک سال بعد مالدہ آ گئے تھے، لیکن سر! آپ زمین پر کیوں بیٹھے ہیں؟''

اس کا جواب وہ کیا دیتا، چپ ہو رہا۔ سرسوتی نے آگے بڑھ کر ہاتھ دیکھا جو بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس نے پارول اور زمان کو آوازیں دینا شروع کر دیں، لیکن آوازیں دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئیں۔ کمال نے بے جان لہجے میں کہا، ''وہ نہیں ہیں۔ کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ''۔

وہ تشویش سے بولی، ''سر! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اس حالت میں آپ بالکل اکیلے ہیں؟ یہ مناسب نہیں''۔

''تم اپنی کہو۔ کیا بات ہے؟ میں ٹھیک ٹھاک ہوں''۔

اس کا یہ کہنا کہ ''میں ٹھیک ٹھاک ہوں''، اس کی حالت سے میل نہیں کھاتا تھا، الفاظ بے ربط تھے۔ سرسوتی نے بچے کو زمین پر لٹایا اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کو کمال کر بستر تک لے آئی۔ لیٹنے کے بعد اس نے کہا، ''میں ٹھیک ہوں، ایسا کیوں کر رہی ہو؟''

وہ سرزنش کرتے ہوئے بولی،''ہاں ہاں! آپ بالکل ٹھیک ہیں، جب تک آپ کی سانسیں ہیں، ٹھیک ہی رہیں گے۔ میں آپ کو بڑے عرصہ سے جانتی ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ مجھ سے مت پوچھیں میں یہ سب کیوں کر رہی ہوں۔ بس آپ تھوڑی دیر انتظار کریں، میں ابھی آئی''۔

بچے کو اٹھا کر جانے ہی لگی تھی کہ کمال کے کراہنے کی آواز سن کر واپس آئی۔ کمال کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے غور کیا تو علم ہوا کہ وہ سرسوتی سے اس کی آمد کا مقصد پوچھ رہا تھا۔

''میں ابھی آ کر بتاتی ہوں''۔

مگر کمال نے کہا کہ پہلے بتائے، پھر جہاں جانا ہے، چلی جائے۔ اس نے بتایا،''سر! یہ میری بیٹی بھشوتی ہے۔ میں اسے آپ کی اشیرباد کے لیے لائی تھی''۔

کمال نے بچی کو اپنی گود میں لیا۔ بچی نے بھی اپنے کومل ہونٹ کمال کے گالوں پر لگا دیے۔ وہ ساری زندگی ایک بیٹی کے لیے ترستا رہا تھا۔ سرسوتی اس کے نزدیک بیٹی ہی تھی، وہ اپنی بچی کو لے کر اس کے پاس آئی تھی۔ اسے پیار کرتے ہوئے کمال کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ اب تو اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ آخری مرتبہ وہ کب رویا تھا۔ سرسوتی نے آگے بڑھ کر اس کی آنکھیں خشک کیں اور پوچھا،'' آپ رو کیوں رہے ہیں؟''

اس کا جواب دینے کی بجائے کمال نے اتنا کہا،''سرسوتی، تم دیکھ لینا تمہاری بیٹی بڑی بھاگوان ہوگی، بڑا نام پیدا کرے گی''۔

سرسوتی کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا،''پلیز! بھشوتی میرے حوالے کریں، میں ابھی آتی ہوں''۔

''کچھ دیر یہاں رک جاؤ، شاید دوبارہ ملاقات نہ ہو''۔

''آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں، بالکل نہیں جچتیں''۔

''میری بیٹی! میں بھی آخر ایک انسان تھا۔ لیکن کوئی شخص نہیں سمجھا۔ میں نے خود کو اس سانچے میں ڈھال رکھا تھا کہ سب لوگ مجھے دیوتا سمان سمجھنے لگے لیکن کچھ لوگوں کی نظر میں میں ایک شیطان تھا، راکھشس تھا''۔

''اس نے اعتراض کیا،''نہیں، نہیں۔ سب لوگ آپ کو دیوتا سمجھتے ہیں، کوئی بھی راکھشس نہیں کہتا، کوئی ایسا سوچ ہی نہیں سکتا''۔

''لیکن مجھے کوئی شخص بھی انسان نہیں سمجھتا۔ میں دیوتا بننے سے تنگ آ گیا ہوں''۔

وہ جانتی تھی کہ اس شخص نے کیا کچھ نہیں کیا مگر اپنے ذاتی زندگی میں ہمیشہ محرومیوں کا شکار رہا ہے۔''بس ایک منٹ رکیے، میں ابھی آئی''، یہ کہتے ہوئے اس نے بچے کو اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ کمال بے سدھ ہو کر بستر پر گر گیا۔ لحظہ بہ لحظہ اس کے بدن پر بے حسی طاری ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ہلا کر دیکھا، جنبش ہوئی تو جان لیا کہ وہ تا حال زندہ ہے۔ اپنی آنکھیں موندھ لیں، اور پھر اسی لحہ اس نے کچھ آوازیں سنیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھا کہ سرسوتی کے ساتھ دو ڈاکٹر اور نرسیں وہاں کھڑی تھیں۔ معائنہ سے علم ہوا کہ خون کی شدید کمی اور نقاہت کی وجہ سے کمال کی یہ حالت ہوئی تھی۔ انہوں نے فوری طور پر ایمبولینس منگوانے اور اسے اسپتال منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ تنہائی، بیماری، خوراک کی کمی سب نے مل کر کمال کی یہ حالت کر دی تھی۔ چند منٹ کے اندر اندر ایمبولینس پہنچ گئی۔

....

کمال بنگالی یونیورسٹی کے دفتر میں بیٹھا تھا۔مختلف ممالک کے نامور محققین، اہلِ علم، شعبۂ طب سے متعلق ڈاکٹرز، کمپیوٹر سائنس کے ماہرین، غرضیکہ علم کے جویاؤں کی کہکشاں سجی تھی، ہر کوئی اس یونیورسٹی کے معیار اور تعلیمی عروج پر رطب اللسان تھا۔کمال انتہائی مسرور تھا کہ اچانک سینے میں درد کی لہر اٹھی۔اس کی آنکھ کھل گئی، گویا وہ سپنا دیکھ رہا تھا۔اس کا ملک، ہم وطن، تا حال بہت پسماندہ تھے۔اس نے خالی خالی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔کنڈر گارٹن کی پرنسپل نے اپنی ساتھی کو دھیرے سے کہا،''رتنا! دیکھو، ایسا لگتا ہے کہ سرکسی کو ڈھونڈ رہے ہیں''۔رتنا نے قریب آکر دیکھا کہ کمال کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔کمال کی آنکھیں کیا تلاش کر رہی تھیں؟ وہ کچھ نہ سمجھ پائی۔اس نے پلاش کو بلوایا۔وہ بھاگا بھاگا آیا اور اس کے بستر کے پاس آکر پوچھنے لگا،''دادا ابو! کیا چاہیے؟ آپ کسے ڈھونڈ رہے ہیں؟'' مگر کوئی جواب نہ ملا۔پلاش نے ہلا کر دیکھا، جسم بے جان تھا۔اس کا چہرہ سفید کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا۔اب یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لوگوں سے چھپ گیا، دوبارہ نہ دِکھنے کے لیے۔

یہاں آنے سے قبل پلاش یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے پاس بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا،''تمہارے دادا یہ جان کر بہت خوش اور شانت ہوں گے کہ اس سال دوسرے ملکوں کے چھبیس طالب علموں نے ہماری یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے، ان میں سے چند ایک برطانیہ، فرانس اور جاپان سے بھی آئے ہیں''۔پلاش سوچ رہا تھا کہ یہ حوصلہ افزا خبر وہ کمال کو سنائے گا، لیکن موقع ہی نہ مل سکا، اب وہ کبھی بھی خوشخبری نہ سن پائے گا۔صرف یہی نہیں، اور بھی چند ایک باتیں سننے سے محروم تھا۔کیا مینا اپنی نئی زندگی میں خوش باش ہے؟ وہ آج کل کہاں ہے؟ اب اس کا دیش کون سا ہے، اس کے ہم وطن کون ہیں؟

کمال کو کتنی گہری نیند آئی ہے! اسے گہری نیند سونا بھی چاہیے کیونکہ بڑے عرصہ سے وہ سکون اور اطمینان کی میٹھی گہری نیند کے لیے ترس رہا تھا۔اس کے سرہانے کے پاس چھوٹا سا کاغذ پڑا تھا۔رتنا نے دیکھا، لکھا تھا،

> ''یہ وہ شخص ہے جس نے ہمیشہ اپنے ملک اور اپنے لوگوں سے پریم کیا، دل کی گہرائیوں سے محبت کرتا رہا۔وہ انہیں دین دھرم، ذات پات اور دیگر امتیازات سے پاک یک جان دیکھنے کا خواہش مند تھا۔اس کی تمنا تھی کہ اپنے ملک کو دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا دیکھے، اور۔۔۔۔۔''۔

تحریر نامکمل تھی لیکن کمال مرتے سمے بھی اپنی دھرتی، اپنے لوگوں کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔

□ □ □

حواشی

آزادہند (فوج اور حکومت)

دوسری جنگِ عظیم کے دوران آزادیِ ہند کے کچھ متوالوں نے جاپان میں آزاد ہند کے نام سے 21 اکتوبر 1943 کو ایک جلا وطن حکومت کا اعلان کیا جس کا سربراہ سبھاش چندر بوس تھا۔ ان انقلابیوں نے آزاد ہند فوج کے نام سے ایک لشکر تیار کر کے محوری طاقتوں کی طرف سے اتحادی فوجوں کے خلاف جنگ میں حصہ بھی لیا۔ اس کے تمام اخراجات جاپانی حکومت نے برداشت کیے تھے۔ اس کا کمانڈر انچیف موہن سنگھ تھا۔ جاپان کی شکست اور سبھاش چندر بوس کی موت کے بعد آزاد ہند حکومت اور فوج بھی ختم ہوگئی۔

آنند پرشکار ایوارڈ

بنگالی زبان میں لکھی گئی ادبی کتابوں پر سب سے بڑا ایوارڈ۔ اس ناول کے لکھاری ڈاکٹر نذرالاسلام کو 1995 میں اس کے بنگالی ناول ''بکُل'' (مولسری کا درخت) پر اس ایوارڈ کا حقدار ٹھہرایا گیا۔

ابوالہاشم (1905-1974)

بنگالی سیاستدان، قوم پرست، دانشور اور لکھاری۔ مغربی بنگال کے ضلع بردوان میں جنم لیا۔ 1937 میں قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈسٹرکٹ کورٹ میں وکالت کا آغاز کیا۔ 1936 میں بردوان سے بنگال قانون ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہوا۔ پھر مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد اس کا پُرجوش رکن رہا۔ 1940 میں مسلم لیگ کی منعقدہ لاہور کانفرنس میں شرکت کی۔ 1944 میں بنگال مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری منتخب ہوا اور شبانہ روز محنت کر کے جماعت کو مضبوط کیا۔ وہ متحدہ بنگال کا کٹر حامی تھا تاہم تقسیمِ بنگال کے بعد مغربی صوبے میں رہائش رکھی۔ وہاں مغربی بنگال کی قانون ساز اسمبلی میں حزبِ مخالف کا پارلیمانی سیکریٹری بنا۔ 1950 میں ترکِ وطن کر کے مشرقی بنگال منتقل ہوگیا۔ بنگالی زبان کو سرکاری درجہ دینے کے سلسلہ میں ہونے والی تحریک میں سرگرم کردار ادا کیا۔ دیگر بنگالی سیاستدانوں سے اختلافات کی وجہ سے ہم خیال اسلامی جماعتوں سے مل کر خلافتِ ربانی جماعت قائم کی۔ 1940 کے عشرہ میں بینائی کا مسئلہ پیدا ہوا جو بالآخر چند سال بعد بالکل ختم ہوگئی۔ ابوالہاشم نے بنگالی اور انگریزی میں متعدد کتابیں اور مضامین بھی لکھے۔

ابوالمنصور احمد (1898-1979)

ضلع میمن سنگھ کے ایک گاؤں دھن کھولا میں پیدائش۔ ڈھاکا کالج سے بی اے کے بعد رپن لاء کالج، کلکتہ سے 1929 میں قانون کی ڈگری حاصل کی اور 1938 تک وکالت کرنے کے بعد صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ سیاست میں بھی سرگرم حصہ لیا تاہم تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدم تعاون کے بعض پہلوؤں سے اختلاف کیا۔ اگرچہ ابوالمنصور کانگرس سے وابستہ تھا لیکن سیاسی اختلافات کے باعث سوراج پارٹی کی حمایت کی۔ بعد ازاں، اے، کے، فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی کے ساتھ تعاون کیا اور 1937 کے انتخابات میں میمن سنگھ میں ان تھک محنت سے پارٹی کو کامیابی دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ خیال تھا کہ کانگرس اور کرشک پرجا ایک مخلوط حکومت پر رضامند ہوں گے لیکن ایسا نہ ہوا تو ابوالمنصور دل برداشتہ ہو کر مسلم لیگ کی طرف جھک گیا اور مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کے مطالبے کی شد و مد سے حمایت کی، لیکن 1946-47 میں سہروردی کی زیرِ قیادت ایک متحدہ بنگال کی مہم میں حصہ لیا۔ جب یہ مہم کامیاب نہ ہوئی تو تقسیمِ ہند کی

صورت میں کلکتہ کومشرقی بنگال میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا جو بوجوہ قبولیت حاصل نہ کر سکا۔
قیامِ پاکستان کے کچھ عرصہ بعد ابوالمنصور نے عوامی مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور 1953 سے 1958 تک اس کا نائب صدر رہا۔ یونائیٹڈ فرنٹ کے انتخابی 21 مطالبات ترتیب دینے میں اس کا کردار قابلِ تحسین تھا۔ 1954 کے صوبائی انتخابات میں فرنٹ کے امیدوار کی حیثیت سے کامیابی حاصل کی اور فضل الحق کی حکومت میں وزیرِ صحت کا حلف اٹھایا۔ 1955 میں مشرقی پاکستان کے نمائندوں نے اسے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا رکن منتخب کیا۔ ادھر مشرقی پاکستان کی صوبائی حکومت میں مختلف وزارتوں میں وزیر کی حیثیت سے کام کرتا رہا حتیٰ کہ ایوب خان کے مارشل لاء میں اسے گرفتار کرلیا گیا جہاں سے 1962 میں رہائی ملی، اور پھر اس نے سیاست کو خیر باد کہہ دیا۔
سیاست کے علاوہ ابوالمنصور نے طنز نگاری اور شگفتہ نگاری میں بھی نام پیدا کیا۔ وہ متعدد کتابوں کا مصنف تھا۔ اس کی سیاسی اور ادبی خدمات کے سلسلہ میں اسے متعدد اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا۔

اتل پرشاد سین (1871-1934)

مشہور بنگالی نغمی نگار، موسیقار، گائیک، قانون دان، ماہرِ تعلیم اور فلاحِ عامہ پر دل کھول کر خرچ کرنے والا شخص۔

اختر موکل، ایم، آر (1929-2004)

مشہور بنگالی صحافی، اس نے بنگلہ دیش کی تحریکِ آزادی کے دوران قائم ہونے والی جلاوطن حکومت کے خفیہ ریڈیو اسٹیشن سے لاتعداد خاکے، پاکستان کے اہم سیاستدانوں اور فوجی جنتا کے خلاف مضامین اور تضحیک آمیز مضامین نشر کئے۔ اس نے اپنی ذات کا انکشاف بنگلہ دیش حکومت کے باضابطہ اعلان کے بعد کیا لیکن 1975 میں حکومت کی تبدیلی کے بعد تمام مواد تلف کر دیا گیا۔ موکل نے 2000 میں اپنی نشریات کو تحریری صورت میں شائع کیا۔
1960 اور 2000 کے دوران اس نے تیس کے لگ بھگ کتابیں تحریر کیں جو زیادہ تر 1952 میں آغاز لینے والی بنگالی زبان کو قومی درجہ دینے کی تحریک سے بنگلہ دیش آزادی کی جدوجہد کی روداد بیان کرتی ہیں۔ آزادی کے بعد موکل کو بنگلہ دیش ریڈیو کا سربراہ اور بعد ازاں سفارتی مشن پر برطانیہ میں بنگلہ دیشی ہائی کمیشن میں تعینات کیا گیا۔ مجیب الرحمن اور اس کے خاندان کے قتل کے بعد موکل کو سفارتی ذمہ داریوں سے برطرف کر دیا گیا جس پر وہ خود ساختہ جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوا اور کوئی ذریعۂ معاش نہ ہونے کے سبب وہیں پر ایک ملبوسات کی فیکٹری میں ملازمت کرنا پڑی۔ کچھ عرصہ بعد بنگلہ دیش میں واپسی ہوئی، ایک سرکاری محکمہ میں نوکری کی لیکن جلد ہی خیر باد کہہ کر ڈھاکا میں کتابوں کی دکان کھولی اور ساتھ تصنیف و تالیف کرتا رہا۔

ادریس علی

بنگالی مصنف جس نے بنکم چیٹر جی کے ناول ''آنند مٹھ'' کے جواب میں ''بنکم دوہتا'' کے عنوان سے ناول لکھا تھا۔

اکرم خاں، مولانا محمد (1969-1868)

بنگالی سیاستدان اور صحافی۔ انگریزی تعلیم سے نابلد لیکن اسلامی علوم پر دسترس تھی۔ مسلم لیگ کے قیام ہی سے اس کا فعال رکن رہا۔ تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدمِ تعاون میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ ہندو مسلم اتحاد کا داعی ہونے کے سبب 1922 میں چترنجن داس کی سوراج پارٹی میں شمولیت اختیار کی لیکن 27-1926 کے فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوؤں کی متعصبانہ پالیسی کی وجہ سے سوراج سے علیحدگی کرلی۔ 1926 سے 1935 تک کرشک پرجا پارٹی میں شامل رہا، پھر اس سے قطع تعلق کر کے دوبارہ مسلم لیگ میں شمولیت کرلی۔ اسی برس بنگالی اخبار ''آزاد'' کا اجرا کیا۔ بنگالی زبان کو آئینی حیثیت دینے کی تحریک میں پرجوش حصہ لیا۔ ڈھاکا میں رہائش رکھی، 1960 میں سیاست کو خیر باد کہہ دیا۔ 1962 میں اسلامی

نظریاتی کونسل کے رکن کی حیثیت سے تعیناتی ہوئی۔

امرتیا سین

1933 میں بنگال میں جنم لینے والا بھارت کا نوبل انعام یافتہ ماہرِ معاشیات جس نے اس موضوع کی ان جہتوں پر دانشورانہ تحقیق کی جن کا تعلق لوگوں کی فلاح و بہبود، سماجی انصاف، قلت وقحط کے اسباب اور ان کا مداوا، عمومی صحت، سماجی ترقی اور لوگوں کی خوشحالی سے ہے۔ وہ آج کل ہارورڈ یونیورسٹی میں فلسفے اور معاشیات کا پروفیسر ہے۔ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں سے اسے اب تک نوے اعزازی ڈگریاں مل چکی ہیں۔

انور پاشا (1971-1928)

بنگالی لکھاری، ناول نگار جسے دسمبر 1971 میں ''البدر'' کی نشاندہی پر یونیورسٹی میں اس کے فلیٹ سے باہر لے جا کر قتل کر دیا گیا۔

انوشلن سمیتی

1902 بنگال میں قائم ہونے والی انقلابی نوجوانوں کی زیرِ زمین تنظیم جو حکومت کے خلاف دہشت گردی میں مصروف رہتی تھی۔ 1912 میں انوشلن نے وائسرائے ہند پر حملہ کی سازش تیار کی جو بے نقاب ہو گئی۔ 1920 کی دہائی میں کانگرس کے دباؤ اور ترغیب پر دہشت پسندانہ کارروائیاں روک دی گئیں، لیکن چند برس بعد انوشلن نے پھر سے اپنی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔

ایشور چندر گپتا (1859-1812)

بنگالی شاعر، مصنف، صحافی۔ قدامت پرست تنظیم Young Bengal اور ودیا ساگر کی ترقی پسندانہ سوچ، بالخصوص ہندو بیواؤں کو دوسری شادی کی اجازت دینے کی جدوجہد کا سخت مخالف تھا لیکن بعد ازاں کنواری بیواؤں اور تعلیمِ نسواں کا حامی ہو گیا۔

بابری مسجد

مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کے عہد میں اتر پردیش کے مقام ایودھیا میں تعمیر ہونے والی مسجد۔ ہندوؤں کے دعوٰی کے مطابق بابر نے رام کی جنم بھومی کو مسمار کر کے اس مقام پر مسجد تعمیر کی تھی لہٰذا یہاں اب مندر کی دوبارہ تعمیر ہونی چاہیے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے ایل کے ایڈوانی کی قیادت میں دیگر سخت گیر تنظیموں وشوا ہندو پرشاد، بجرنگ دل اور شیوسینا سے مل کر رام مندر کی تعمیر کے لیے تحریک چلائی۔ 6 دسمبر 1992 کو ہندو سیوکوں نے ان تنظیموں کے ہزاروں مسلح کارکنوں نے نیم مسلح فوجی دستوں کی موجودگی میں مسجد کو مسمار کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی بھارت کے مختلف شہروں میں مسلم کش فسادات پھوٹ پڑے جس میں تقریباً تین ہزار مسلمانوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ تنازعہ بھارتی عدالتِ عظمٰی کے سامنے زیرِ تفتیش رہا جس نے 9 نومبر 2019 کو ہندوؤں کے حق میں فیصلہ دیا۔ 5 اگست 2020 کو بھارتی وزیر اعظم نے یہاں رام مندر کا سنگِ بنیاد رکھا۔

بدر الدین عمر (پیدائش 1931)

مشہور بنگالی سیاسی رہنما اور دانشور عبد الہاشم کا بیٹا جو خود بھی سیاسی طور پر فعال اور مارکسی لیننی تعلیمات کا زبردست حامی۔ علاوہ ازیں اس نے بطور مورخ، مصنف اور دانشور کے اپنا مقام پیدا کیا۔ بنگلہ دیش کمیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ، لیننسٹ) کا سرگرم رہنما تھا۔

آکسفوڈ سے بی اے (آنرز) کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم اے کیا۔ وہیں سے ملازمت کا آغاز کیا پھر جلد

ہی راجشاہی یونیورسٹی میں معلمی کے فرائض ادا کرنا شروع کئے لیکن اپنی بائیں بازو کی سرگرمیوں کے باعث حکومتِ وقت سے اختلافات پیدا ہوگئے اور یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑ دی۔

سو سے زیادہ کتابوں اور لاتعداد مضامین کے مصنف بدرالدین عمر نے اشتراکی اور دیگر بائیں بازو کی فکری تحریکوں پر پُر مغز کتابیں اور مقالے تحریر کیے ہیں۔ بنگلہ دیش کے قیام سے قبل اس نے بنگالی زبان میں ''ثقافت کا بحران'' (1967) اور ''ثقافتی فرقہ واریت'' (1969) کے عنوان سے شاندار تصانیف کے علاوہ بنگالی قوم پرستی کے نقطۂ نظر سے بہت علمی اور فکری کام کیا۔ فروری 1970 میں ایسٹ پاکستان کیمونسٹ پارٹی میں شمولیت کے بعد (متحدہ) پاکستان میں اشتراکیت کے مسائل اور امکانات پر بہت مضامین تحریر کیے۔

بارگی

1741 سے 1751 کے دوران مرہٹوں نے بنگال پر چھ مرتبہ فوج کشی کی، اگرچہ بنگال کے نواب علی وردی خان نے کامیابی سے اپنا دفاع کیا لیکن خود اسے بھی بہت مالی اور جانی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ آخر مرہٹوں کے ساتھ معاہدہ طے پا گیا جس کے مطابق علی وردی نے ہر سال بارہ لاکھ روپیہ بطور تاوان یا معاوضہ مرہٹوں کو دینا منظور کیا۔ ان مہم جوئیوں کے دوران بارگی نام کے ایک جتھے نے بنگال کے مغربی حصہ میں لوٹ مار کا بازار گرم کئے رکھا۔ یورپی وقائع نویسوں کے مطابق بارگیوں نے تقریباً چار لاکھ افراد کو قتل کیا۔ ہم عصر شاعر گنگا رام نے ان کے مظالم اور دہشت سے متعلق بڑی خیرہ کن تصویر کشی کی ہے۔

بپن چندر پال (1858-1932)

بنگالی لکھاری، صحافی، قوم پرست، سماجی مصلح، سودیشی تحریک کا اہم نیتا، تقسیمِ بنگال 1905 کا شدید مخالف۔ کانگرس سے اختلافات کے باعث الگ ہو کر تمام تر توجہ اصلاحی کاموں پر مبذول کر دی۔ ذات پات کے خلاف تھا اور بیواؤں کی شادی کا زبردست حامی، اس کا عملی نمونہ اس نے خود پیش کیا کہ پہلی بیوی کی وفات کے بعد ایک بیوہ سے شادی کی تھی۔ برہمو سماج میں شمولیت اختیار کی۔

برگدار

دوسروں کی زمین پر فصل کے عوض کٹائی کرنے والے۔

بنکم چندر چٹرجی (1838-1894)

ہندوستان کا پہلا گریجویٹ۔ سرکاری ملازمت میں ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی کمشنر تعینات رہا۔ متعدد ناولوں اور مضامین کا لکھاری۔ مشہور نظم ''بندے ماترم'' کا خالق جو بعد ازاں بھارت کا قومی ترانہ بنا۔

بنگہ بھون

دہلی میں مغربی بنگال کا سرکاری گیسٹ ہاؤس۔

بھگت سنگھ (1907-1931)

پیدائش ضلع لائلپور (موجودہ فیصل آباد) کا موضع بنگہ۔ جلیانوالہ باغ کے خونیں واقعہ اور تحریکِ عدم تعاون نے اس کے خیالات میں انقلابی تبدیلی پیدا کی۔ اسکول کی تعلیم چھوڑ کر نیشنل کالج میں تعلیم شروع کر دی۔ 1927 میں دسہرہ بم کیس میں گرفتاری ہوئی۔ ضمانت کے بعد نوجوان بھارت سبھا بنائی۔ دہلی میں پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران ایک ساتھی سے مل کر بم پھینکا۔ دونوں گرفتار کر لیے گئے۔ 1928 میں سائمن کمیشن کی ہندوستان آمد موقع پر زبردست ہنگامہ آرائی ہوئی جس میں مشہور نیتا لالہ لاجپت رائے پولیس کی لاٹھیاں لگنے سے شدید گھائل ہوا۔ بھگت سنگھ وغیرہ نے بدلہ لینے کی خاطر

ایک پولیس افسر سانڈرس کو قتل کر دیا۔ پولیس نے ان کا پیچھا کیا تو ایک حوالدار کو بھی گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ لاہور کی سنٹرل جیل کے کمرۂ عدالت میں تین سال تک مقدمہ چلتا رہا جس میں بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں، سکھ دیو اور راج گورو کو سزائے موت سنائی گئی۔ 23 مارچ، 1931 کو تینوں کو پھانسی دے دی گئی۔

بیکنتھ پور

مغربی بنگال کے ضلع کوچ بہار میں ایک چھوٹا سا قصبہ

پنچنن ترکارتن (1866-1940)

بنگالی زبان کا مشہور عالم Panhanan Tarkaratna جس نے متعدد مذہبی کتابوں کا سنسکرت سے بنگالی میں ترجمہ کیا۔ جس پنڈت سے اس نے تعلیم حاصل کی تھی اس نے ''ترکارتن'' کا خطاب دیا تھا۔ اس ناول میں جس کتاب، منوسنہتا، کا ذکر ہے وہ اسی نے ترجمہ کی تھی۔

تلسی داس (1497-1623)

مشہور منظوم داستان ''رام چرت مناس'' کا مصنف۔ اتر پردیش کے علاقہ راجا پور میں پیدا ہوا۔ ساری عمر خدا پرستی اور حقیقت نوازی میں گزاری۔ رامائن اگر چہ مدتوں قبل والمیکی نے 30 قبل مسیح میں قلمبند کی تھی لیکن تلسی داس نے رامائن کو از سرِ نو ''رام چرت مناس'' کے عنوان سے لکھ کر رام چندر جی کی حیات کو ایک انوکھے انداز سے تحریر کیا۔ تلسی داس نے اکبر اعظم اور جہانگیر کا زمانہ پایا۔ راجہ مان سنگھ اور عبدالرحیم خانخاناں اس کے قدردانوں میں سے تھے۔
اس نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ ورناسی (سابقہ بنارس) اور فیض آباد میں گزارا۔ ورناسی میں دریائے گنگا کے کنارے تلسی گھاٹ اسی کے نام پر مشہور ہوا۔ روایات کے مطابق رام لیلا کے نام سے ہونے والے ناٹک کا آغاز تلسی داس نے کیا تھا۔ اسے رامائن کے مصنف شاعر والمیکی کا دوسرا جنم بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی تاریخِ پیدائش متفق علیہ نہیں۔ کچھ محققین کے مطابق اس نے 1497 اور کچھ نے جنم کا سال 1623 بیان کیا ہے۔ تاہم حکومتِ ہند نے تلسی داس کا 500 واں جنم سال سرکاری طور پر 1997 کو منایا، گویا 1497 ہی کو اس کا جنم سال تسلیم کیا گیا۔

تلک، بال گنگادھر (1856-1920)

پیدائشی نام کیشو گنگادھر تلک، بمبئی پریزیڈنسی (موجودہ مہاراشٹر) کے رتنا گری ضلع میں جنم لیا۔
پونا سے بی اے کرنے کے بعد ایم اے کو ادھورا چھوڑ کر قانون کی تعلیم حاصل کی۔ پھر پونا ہی میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا لیکن کچھ رفقائے کار سے مخالفت کی وجہ سے معلمی چھوڑ کر صحافت کی طرف آ گیا تاہم تعلیم سے ناتا نہ ٹوٹا اور چند ساتھیوں سے مل کر 1880 میں ایک انگریزی اسکول کی بنیاد رکھی جس کا مقصد نئی نسل کو معیاری تعلیم دینا تھا۔ اسکول کی کامیابی سے اس نے 1884 میں دکھن ایجوکیشن سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن بنائی جس کے تحت اگلے ہی برس فرگوسن کالج کا آغاز ہوا۔ خود تلک نے کالج میں حساب کی تعلیم دینا شروع کی۔ تاہم چند برس بعد سوسائٹی کو خیر باد کہا اور وسیع تر بنیادوں پر فلاحی اور تعلیمی کاموں کی طرف توجہ دی۔ اب اس کا مطمعِ نظر برطانوی چنگل سے نجات اور نوجوانوں میں ثقافتی اور مذہبی جذبات کا احیاء تھا۔
سیاست کے میدان میں تلک کی آمد معرکہ خیز تھی۔ ہندوؤں نے اس کو آزادی کا علمبردار کہا جبکہ انگریزوں کے نزدیک وہ شورش پسندوں کا سرخیل تھا۔ 1890 میں کانگریس میں شمولیت کی لیکن اعتدال کی راہ پر چلنے کی بجائے انقلابی اقدامات پر یقین رکھتا تھا۔ کانگریس میں دھڑے بندی اور تقسیمِ بنگال کے بعد تلک نے سودیشی اور عدمِ تعاون کی تحریکوں میں سرگرم حصہ لیا۔ اس پر تین دفعہ 1897، 1909 اور پھر 1916 بغاوت کے مقدمات درج ہوئے۔ آخری دو میں قائدِ اعظم محمد علی

جناح نے تلک کے مقدمات کی پیروی کی۔ 1909 کے متنازعہ فیصلے میں اسے چھ برس کی سزا ہوئی اور برما میں نظر بند کر دیا گیا لیکن 1916 میں جناح کی شاندار وکالت کے باعث تلک کو الزامات سے بری کر دیا گیا۔ گاندھی سے اختلافات نے تلک کو آل انڈیا ہوم رول لیگ کی طرف مائل کیا۔ دوسری طرف اس نے دھرم کے روایتی اور بنیادی اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے تعلیم نسواں اور اعلیٰ جاتی ہندوؤں کی نچلی ذاتوں میں شادی کی سخت مخالفت کی۔ ہندو لڑکیوں کی شادی کی عمر دس سال سے بارہ برس ہونے پر بھی تلک نے اختلاف کیا لیکن عملی لحاظ سے وہ دیگر سماجی زندگی میں اصلاحات کا حامی تھا اور خود اپنی بیٹی کی شادی پندرہ برس کی عمر میں کی۔ اسی طرح وہ بیواؤں کی شادی کا بھی حامی تھا۔

ٹیگور، جیتندر ناتھ (1849-1925)

مشہور بنگالی نوبل انعام یافتہ بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کا بڑا بھائی جو خود ایک اچھا ڈرامہ نگار، موسیقار اور مصور تھا۔ تعلیم نسواں کا زبردست حامی۔ قوم پرست اور متعدد انجمنوں کا بانی۔

ٹیگور، رابندر ناتھ (1861-1941)

شاعر، فلسفی، ماہر تعلیم، لکھاری، ناول نگار۔ 1901 میں اس نے تعلیمی ادارے شانتی نکیتن کی بنیاد رکھی، بعد ازاں وشوا بھارتی یونیورسٹی قائم کی۔ شاعری کی مجموعہ ''گیتا نجلی'' پر 1913 میں نوبل پرائز ملا۔

تقسیم بنگال 1905 کی مخالفت میں رکھشا بندھن میلے کا اجرا کیا۔ 1915 میں انگریز حکومت نے ''سر'' کا خطاب دیا جو ٹیگور نے بعد میں جلیانوالہ باغ کے واقعہ کی وجہ سے واپس کر دیا۔ اس کے لکھے گیت کو 1950 میں بھارت نے اپنا قومی ترانہ قرار دیا جبکہ 1971 میں بنگلہ دیش نے بھی ٹیگور کے لکھے ہوئے ایک گیت کو اپنا قومی ترانہ منتخب کیا۔ یہ گیت اس نے 1905 کی تقسیم بنگال کی مخالفت میں لکھا تھا۔

Cunningham, Joseph Davey

پہلا انگریز مورخ جس نے 1849 میں History of Sikhs لکھی۔ ہندوستان میں ملازمت کے دوران ریاست بہاولپور اور پھر بھوپال میں پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر تعینات رہا۔ 1851 میں انبالہ میں انتقال کیا۔

Duff, James Grant

سپاہی اور مورخ۔ اسکاٹ لینڈ کا باشندہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں تھا۔ 1805 میں ہندوستان آمد ہوئی۔ مرہٹوں کے خلاف فوج کشی میں حصہ لیا، پھر 1818 میں مرہٹہ ریاستی انتظامیہ سے منسلک ہوا۔ اسی دوران مرہٹوں کے بارے میں مواد جمع کرتا رہا۔ خرابی صحت کی بنا پر مستعفی ہو کر واپس اسکاٹ لینڈ چلا گیا جہاں History of Mahrattas مکمل کی جو 1826 میں شائع ہوئی۔ ہندوستان کی متعدد زبانوں میں اس کے تراجم بھی ہوئے۔ 1858 میں انتقال ہوا۔

Todd, James(1782-1835)

اس نے William Crooke (1848-1923) کی اعانت سے تین جلدوں میں Annals & Antiquities of Rajasthan - Central Western Rajput States of India مکمل کی۔ Todd بطور کیڈٹ 1799 میں ہندوستان آیا۔ بعد ازاں راجپوتانہ (راجھستان) کے کچھ علاقوں میں پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے تعینات رہا۔ 1826 میں خرابی صحت کی وجہ سے مستعفی ہو کر واپس برطانیہ چلا گیا جہاں اس نے راجپوتانہ کی تاریخ اور جغرافیہ پر متعدد مضامین لکھے۔

جزائر انڈمان

خلیج بنگال میں واقع جزائر۔ ناکام جنگ آزادی کے بعد 1858 میں دو سو سزا یافتہ باغیوں کو یہاں بھیجا گیا۔ اس وقت یہ

جزائر گھنے جنگلوں اور مچھروں کے سبب پیدا ہونے والی ملیریا بیماری کی وجہ سے تقریباً ناقابلِ رہائش تھے۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں یہ ہندوستان کا بدترین عقوبت خانہ تھا جہاں خطرناک قیدیوں اور مجرموں کو لایا جاتا تھا کیونکہ ان کے فرار کے تمام راستے بند تھے۔ 1938 میں تمام سزا یافتہ قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ 1947 کے بعد بھارتی حکومت نے ان جزائر کو باضابطہ اپنی تحویل میں لے لیا۔

جگنتار

انوشلن سمیتی کی مغربی بنگال کی صوبائی تنظیم کا نام۔ 1938 میں اسے ختم کر دیا گیا۔ آزادیِ ہند کے بعد انوشلن سمیتی نے انقلابی سوشلسٹ پارٹی کے نام سے مغربی بنگال کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔

جن پد

اسے ''مہا جن پد'' بھی کہا جاتا ہے، یعنی قدیم شمالی ہند میں قائم سولہ عظیم بادشاہتیں جو ویدی (Vedic) دور یعنی کانسی کے زمانے سے لوہے کے دور، 1500 قبل مسیح تا چھٹی صدی قبلِ مسیح کے دوران وسیع وعریض علاقوں پر موجود تھیں۔ ان عظیم الشان مملکتوں میں انگ، مگدھ، بنگ، کالنگا (یا کنگ) کوشل، کمبوج اور گندھارا اپنے اپنے عہد میں وسعت، طاقت اور تہذیب وتمدن کے لحاظ سے تاریخِ ہند کا اہم باب ہیں۔

ریاست انگ (انگا)

قدیم دور میں مشرقی بھارت میں قائم وسیع ریاست جس کا ذکر رامائن میں بھی آیا ہے۔

ریاست مگدھ

جنوبی بہار کی ایک قدیم ریاست۔ بدھ مت اور جین مت نے یہاں عروج پایا، علاوہ ازیں موریہ اور گپتا شہنشائیت دونوں نے یہاں جنم لیا۔ علمی ترقی کی وجہ سے انہیں ہندوستان کا زریں دور کہا جاتا ہے۔ پانچویں صدی قبل مسیح سے یہاں شاندار تہذیب کا آغاز ہوا۔ مگدھ ریاست کی وسعت کا اندازہ یہاں سے لگایا جا سکتا ہے کہ دورِ حاضر کی بھارتی ریاستیں بہار، جھارکھنڈ، اوڑیسہ (موجودہ نام اودیشہ)، مغربی بنگال، اترپردیش کا مشرقی حصہ، آج کا بنگلہ دیش اور نیپال قدیم ریاست مگدھ کا حصہ تھیں۔ 326 قبلِ مسیح میں سکندرِ اعظم کی فوجیں ریاست کی مغربی سرحدوں تک پہنچ گئیں لیکن یونانی فوج ہمت ہار گئی کہ ایک طاقتور فوج سے مقابلہ مشکل دکھائی دیا اور یوں سکندر واپس پلٹ گیا۔

ریاست بنگ (بنگا)

موجودہ بنگال کے نام کی وجہ تسمیہ کا علم نہیں ہو سکا لیکن ایک خیال یہ ہے کہ لفظ ''بنگ'' ایک قدیمی دراوڑی قبیلہ کے نام سے موسوم ہے جو یہاں تقریباً ایک ہزار برس قبل مقیم تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ لفظ ''بنگو''، جو بعد میں ''بنگال'' مشہور ہوا، قدیم بادشاہت ''بنگ'' سے اخذ شدہ ہے۔ ابتدائی دور کی سنسکرت ادبیات میں یہ لفظ پایا جاتا ہے، تاہم اس نام اور حکومت کی حتمی تاریخ تاحال غیر واضح ہے۔

ریاست کالنگا

اس کا شمار بھی دورِ قدیم کی عظیم مملکتوں میں کیا جاتا ہے جو مہاندی اور گوداوری دریاؤں کے درمیانی اور مشرقی ساحلی علاقوں پر محیط تھی۔ مختلف زمانوں میں اس کی حدود تغیرات کا شکار ہوتی رہیں۔ مہابھارت میں اس کا ذکر ایک اہم قبیلہ کے طور پر آیا ہے۔ مشہور عالم جنگِ کالنگا تیسری صدی قبلِ مسیح میں وقوع پذیر ہوئی جس کے نتیجہ میں موریہ خاندان کے عظیم شہنشاہ اشوک نے اسے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ موریہ خاندان کے زوال کے بعد کالنگا متعدد ریاستوں میں تقسیم ہو گیا لیکن چوتھی صدی عیسوی میں اس پر گپت خاندان کا قبضہ ہوا جو ان کے زوال تک جاری رہا۔ بعد ازاں اس کے حصے

بکھرے ہوتے گئے۔

ریاست کوشل

رامائن، مہابھارت اور پُرانوں میں قدیم ہندوستان کے شمال میں واقع کوشل مملکت کے متعدد حوالے ملتے ہیں۔ شری رام چندر کوشل کا بادشاہ رہا تھا جس سے منسوب متعدد داستانوں اور کردار پر رامائن کی تخلیق ہوئی۔ روایات میں ہے کہ رام کی وفات پر کوشل مملکت دو حصوں میں تقسیم ہو کر اس کے دونوں بیٹوں، لاوا اور کش، کے حصے میں آئی۔ شمالی کوشل کا حکمران لاوا بنا اور اس حصے کو دکھشن کوشل کہا جانے لگا جو تاریخ میں مملکتِ کوشل کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کی حدود موجودہ بھارتی ریاست ستیش گڑھ اور اودیشہ (سابقہ اوڑیسہ) کے مغربی حصے پر مشتمل تھیں۔

ریاست کمبوج

قدیم دستاویزات میں کمبوج کا تعلق گندھارا، دردا اور باختر کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ اس دور کے کمبوج ہندوکش کے دونوں جانب آباد تھے لیکن اس سے بھی قدیمی لوگ دریائے آمو کے مشرقی علاقوں میں رہتے تھے چند قبائل ہندوکش عبور کر کے جنوب میں بھی آباد ہو گئے۔ ان کا تعلق گندھارا اور دردا لٹریچر کے علاوہ اشوک اعظم کے فرامین میں بھی پایا جاتا ہے۔ کمبوج مملکت کا صدر مقام کشمیر کے جنوب مغربی شہر راجپورہ (موجودہ راجوڑی) تھا۔

ریاست گندھارا

روایات کے مطابق مہابھارت کی لڑائی میں گندھاروں نے پانڈوؤں کے خلاف کوروؤں کا ساتھ دیا تھا کیونکہ یہ بڑے تند خو اور لڑنے مرنے والے لوگ تھے۔ پُرانوں اور رگ وید کی رو سے اس مملکت کی بنیاد راجکمار گندھار نے رکھی تھی جو اسی کے نام سے موسوم ہو کر گندھارا سلطنت مشہور ہوئی۔ یہ موجودہ خیبر پختونخوا اور پوٹھوہار کے کچھ علاقوں پر محیط تھی۔ ایودھیا کے راجہ رام چندر کے چھوٹے بھائی بھرت کے دو بیٹوں، تشکا اور پشکار کے نام پر سلطنت کے دو مشہور شہروں کو تکشلا اور پشکلاوتی کہا گیا جو بعد ازاں ٹیکسلا اور چارسدہ کہلائے جانے لگے۔ گندھارا سلطنت چھٹی صدی قبلِ مسیح سے گیارہویں صدی عیسوی تک قائم رہی۔

زمانہ قدیم ہی سے یہ تہذیب و تمدن اور علم کا مرکز رہا ہے۔ مشہور فلسفی چانکیہ کوٹلیا یہاں درس و تدریس دیا کرتا تھا۔ سکندرِ اعظم بھی یہاں آیا تھا۔ بدھ مت کو یہاں بہت اہمیت حاصل تھی لیکن پانچویں صدی عیسوی میں ہن حملہ آوروں کی وجہ سے اسے زوال آنا شروع ہوا، پھر محمود غزنوی کے حملوں کے بعد گندھارا تہذیب مٹتی چلی گئی۔

جوگندر ناتھ منڈل (1904-1968)

پیدائش باریسال، موجودہ بنگلہ دیش۔ دلت کمیونٹی سے تعلق رکھنے والا یہ سیاستدان ڈاکٹر امبیڈکر سے بہت متاثر تھا کیونکہ ڈاکٹر صاحب بھی دلت کمیونٹی سے تھے۔ 1937 کے انتخابات میں منڈل نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب میں کامیابی حاصل کی اور سہروردی کی کابینہ میں صوبائی وزیر مقرر ہوا۔ 1946 میں ہندو مسلم فسادات میں منڈل نے دلتوں کو ہندوؤں کا ساتھ دینے سے منع کیا اور مسلم لیگ کے حامی کے طور پر شہرت پائی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اسے مرکزی وزیرِ قانون کا عہدہ دیا گیا۔ 1950 میں وہ ہندوؤں کے ساتھ روا رکھے تعصبانہ برتاؤ پر احتجاج کرتے ہوئے مستعفی ہو کر بھارت چلا گیا اور ایک گمنام زندگی گزارنے کے بعد 1968 میں انتقال کر گیا۔

جتیندر موہن سین گپتا (1885-1933)

تحریکِ آزادی کا ایک سرگرم اور انقلابی خیالات کا حامل سیاستدان، جس کی پیدائش چٹاگانگ میں ہوئی۔ برطانیہ سے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وکالت کا آغاز کیا۔ کانگرس میں شمولیت اور تحریکِ عدمِ تعاون میں حصہ لیا اور پھر

وکالت چھوڑ کر ہمہ وقت سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ 1923 میں بنگال قانون ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہوا۔ 1925 میں چترنجن داس کے دیہانت کے بعد بنگال سوراج پارٹی کا صدر چنا گیا۔ 30-1929 میں کلکتہ کا میئر رہا۔ رنگون میں ایک جلسے میں باغیانہ خطاب کی وجہ سے اسے گرفتار کرلیا گیا۔ 1931 میں برطانیہ میں گول میز کانفرنس میں شرکت۔ واپسی پر اپنی سرگرمیوں کی بنا پر چند بار نظر بند رہا اور نظر بندی ہی کے دوران انتقال کیا۔

جیوتی باسو (1914-2010)

ہندوستانی سیاستدان اور دانشور جو 1977 سے 2000 تک مغربی بنگال کا وزیرِ اعلیٰ رہا۔ وہ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) کے بانی اراکین میں سے تھا۔

چترنجن داس (1870-1925)

دیش بندھو کے لقب سے مشہور تھا۔ صفِ اوّل کے بنگالی سیاستدانوں میں شمار ہوتا تھا۔ قوم پرست، لکھاری، شاعر، وکیل، کانگرس سے اختلافات کے باعث نہرو، سہروردی وغیرہ کے ساتھ سوراج پارٹی کے بانیوں میں سے ایک۔ عدمِ تشدد اور ہندو مسلم اتحاد کا حامی۔ کلکتہ میونسپل کارپوریشن کا پہلا میئر۔

چٹاگانگ سلاح خانہ ڈکیتی

نوجوان انقلابی بنگالیوں نے 18 اپریل 1930 کو چٹاگانگ کے اسلحہ سازی کارخانے پر قبضہ کی ناکام کوشش کی تاہم ذرائع آمدورفت کو بہت نقصان پہنچانے کے بعد قریبی جلال آباد پہاڑیوں میں جا چھپے۔ بہر حال ان کا محاصرہ کر کے بہت لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا اور مقدمات چلانے کے بعد انہیں کالے پانی کی سزا سنائی گئی۔

دِوِج

دوبار پیدا ہونے والا، یعنی برہمن، چھتری، اور ویش۔ چونکہ پہلے ان کا جنم ہوتا ہے اس کے بعد جگیو پوت (زنار) پہنایا جاتا ہے، بغیر اس کے خواہ وہ برہمن کے نطفہ سے کیوں نہ پیدا ہو، برہمن نہیں ہوتا، بلکہ شودر کہلاتا ہے۔ علیٰ ہذا جگیو پوت انسان کا دوسرا جنم مانا گیا ہے۔

رام چرت مناس

اودھی زبان میں رام کی جنم کتھا جسے سولہویں صدی کے بھگتی شاعر تلسی داس (1623–1532) نے لکھا تھا۔

رتھ یاترا

ستمبر سے اکتوبر 1990 میں رام مندر کی تعمیر کے سلسلہ میں کے ایل ایڈوانی اور دیگر انتہا پسند مذہبی رہنماؤں کی قیادت میں نکالے جانے والے مذہبی سیاسی جلوس کو رتھ یاترا کا نام دیا گیا (مزید دیکھئے، بابری مسجد)۔ اس کے نتیجہ میں بھارت بھر میں ایک سو سولہ ہندو مسلم فسادات ہوئے اور 567 لوگ ہلاک ہو گئے۔

رضاالکریم (93-1902)

محمد جواد رضاالکریم، بنگالی دانشور، ماہرِ تعلیم، مصنف، مغربی بنگال میں بردوان ڈویژن کے شمالی ضلع بربھوم میں پیدا ہوا۔ کلکتہ مدرسہ سے 1920 میں میٹرک اور کرشن ناتھ کالج سے بی اے (آنرز) کرنے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے 1934 اور 1936 میں بالترتیب ایم اے اور قانون کی ڈگریاں حاصل کیں۔ 1947 تک وکالت کرنے کے بعد ایک کالج میں پروفیسر ہو گیا جہاں اپنی ریٹائرمنٹ تک درس وتدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔

یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران، اور پھر تقسیمِ ہند تک سیاست میں بھی حصہ لیا۔ رضاالکریم ہندو مسلم اتحاد کا مبلغ اور فرقہ وارانہ سیاست کے سخت خلاف تھا۔ 1938 کے لگ بھگ اس نے اپنے ایک مضمون، اور پھر ایک کتاب میں بنکم چندر چیٹر جی

کی حمایت میں لکھا کہ عام فہم خیال کے مطابق وہ مسلمانوں کا مخالف اور متعصب نہیں تھا۔

اس کی علمی اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کے اعتراف میں کلکتہ یونیورسٹی نے اسے 1984 میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری، اور مغربی بنگال حکومت نے 1991 میں ودیا ساگر میموریل ایوارڈ سے نوازا۔

رحیم، ایم، اے (1921-1981)

پیدائش چٹا گانگ ڈویژن کے ضلع چاند پور کا ایک گاؤں موہن پور۔ 1936 میں میٹرک کرنے کے بعد ایم اے تک تعلیم ڈھاکا میں حاصل کی۔ 1943 سے 1949 تک دو کالجوں میں فریضۂ تدریس ادا کرنے کے بعد ڈھاکا یونیورسٹی میں بطور لیکچرار تعیناتی ہوئی۔ یہیں سے اس نے پہلے امریکہ اور پھر لندن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ڈاکٹریٹ کے بعد ڈھاکا سے ملازمت چھوڑ کر 1954 میں کراچی یونیورسٹی میں ملازمت شروع کی۔ بنگلہ دیش کی آزادی پر اس نے کراچی کو خیر باد کہا اور ڈھاکا آ گیا۔ یہاں اسے یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ اپنی ریٹائرمنٹ 30 جون، 1981 پر اسے ملازمت میں توسیع دی گئی لیکن اگلے ہی مہینے، یعنی 31 جولائی، 1981 کو وفات ہوگئی۔

اس کی تحقیقی تصانیف میں ''بنگال کی سماجی اور ثقافتی تاریخ'' (دو جلدیں)، ''تاریخ، مسلمانانِ بنگال''، ''بنگال میں مسلمان معاشرہ اور سیاست'' کے علاوہ ''ڈھاکا یونیورسٹی کی تاریخ'' بہت مشہور ہیں۔

رنگلال، بندو پادھیائے (1827-1887)

شاعر، مصنف اور اخبار نویس۔ سرکاری ملازمت میں ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے تک پہنچا۔

سبھاش چندر بوس (1897-1945)

نیتا جی کے لقب سے یاد کیے جانے والا انقلابی لیڈر۔ اس کی پیدائش اوڑیسہ کے علاقے ''کٹک'' میں ہوئی۔ کلکتہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1919 میں برطانیہ روانگی، اسی دوران اس نے انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا لیکن تربیت مکمل کیے بغیر واپس ہندوستان آ گیا۔ گاندھی سے متاثر ہو کر تحریکِ آزادی کا سرگرم رکن بن گیا۔ 1921 میں پرنس آف ویلز کی ہندوستان آمد کے موقع پر احتجاجی تحریک کی وجہ سے گرفتاری۔ چند برس بعد کلکتہ کا میئر منتخب ہوا۔ 1938 میں انڈین نیشنل کانگرس کا صدر، اگلے برس پھر صدر منتخب ہوا لیکن گاندھی کی سیاست سے اختلافات کے باعث 1939 میں ''فارورڈ بلاک'' قائم کر کے حکومت کے خلاف تحریک شروع کر دی جس پر اسے 1940 میں گھر پر نظر بند کر دیا گیا لیکن کچھ عرصہ بعد فرار ہو کر نومبر 1941 میں برلن پہنچ گیا۔ وہاں سے ملایا پہنچ کر ''آزاد ہند فوج'' کی تشکیل کی۔ پھر جاپان جا کر وہاں کی حکومت سے مدد کا طلبگار ہوا۔ 21 اکتوبر 1943 میں سنگا پور میں بیٹھ کر آزاد ہند کی صوبائی حکومت کا اعلان کیا۔ مسلح جدوجہد کا دائرہ پھیلا تو آزاد ہند فوج نے جزائر انڈیمان اور نکوبار پر قبضہ کر لیا۔ جاپان کی شکست کے بعد آزاد ہند فوج کی مسلح جدوجہد بھی دم توڑ گئی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ 18 اگست 1945 کو فارموسا کے نزدیک جہاز گرنے سے نیتا جی کی وفات ہوگئی۔ بے شمار لوگوں کو یقین تھا کہ سبھاس چندر کا دیہانت نہیں ہوا بلکہ وہ کسی خفیہ مقام پر موجود ہے۔ یہ گمان اور اس کی واپسی کا انتظار برسوں قائم رہا۔

سکھارام گنیش دیوسکر (1869-1912)

بے باک انقلابی لکھاری، ادیب، مورخ، صحافی، قوم پرست۔ مراٹھی تاریخ سے متاثر لیکن اس کی تمام نگارشات بنگالی زبان میں تھیں اس لیے اسے مہاراشٹر اور بنگال کے درمیان ایک پل سمجھا جاتا تھا۔

سرت چندر بوس (1889-1950)

سبھاش چندر بوس کا بڑا بھائی۔ بنگال کی سیاست میں سرگرم اور فعال کردار۔ کانگرس میں شمولیت۔ بھائی کے فرار کے فوراً

بعد اسے گرفتار کر لیا گیا، ساڑھے چار سال قید کے بعد ستمبر 1945 میں رہائی۔ نیتا جی کی بنائی ہوئی آزاد ہند فوج اور متحدہ بنگال کا حامی۔

سرت چندر چٹوپادھیائے چٹرجی (1876-1938)

بنگالی ناول نگار اور افسانہ نویس۔ اس نے متعدد ناول لکھے جن میں ''دیوداس'' کو انتہائی شہرت ملی اور اس پر بنگالی، ہندی، اردو کے علاوہ تیلگو زبانوں میں سولہ فلمیں بنی ہیں۔ چیٹر جی نے زیادہ تر دیہاتی زندگی اور غربت و افلاس کے موضوعات پر لکھا۔ غالباً یہ ان معدودے چند ادبی قدآور شخصیات میں سے ہے جس کی کتابوں کے تراجم نہ صرف مختلف زبانوں میں ہوئے بلکہ اس کی نگارشات متعدد لوگوں نے اپنے ناموں سے شائع کرائیں۔

سردار پٹیل، ولبھ بھائی (1875-1950)

تعلق بھارتی صوبہ گجرات سے۔ کانگرس میں شمولیت اور تحریکِ آزادی بالخصوص ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد وزیرِ داخلہ اور نائب وزیرِ اعظم مقرر ہوا۔ اس نے کئی ریاستوں کو بھارت میں ضم کرنے کا کام سرانجام دیا۔ اپنی پالیسیوں کی وجہ سے اسے ہندوستان کا ''مردِ آہن'' بھی کہا جاتا تھا۔

سراج الدولہ (1733-1757)

علی وردی خان کی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ اس کی وفات کے بعد اس کے نواسے سراج الدولہ کو بنگال کا نواب مقرر کیا گیا لیکن اس کا نوابی دور بڑا مختصر رہا، یعنی اپریل 1756 سے جون 1757 تک، جب جنگِ پلاسی میں اس کے ایک سردار میر جعفر کی غداری سے نواب کو شکست ہوئی اور اسے جعفر ہی کی حویلی میں قتل کر دیا گیا۔

سریش چندر نندی، مہاراج (1897-1952)

قاسم بازار راج کا آخری زمیندار۔ 1936 میں بنگال قانون ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہوا اور فضل الحق کی حکومت میں وزیر مقرر ہوا۔ سیاست کے ابتدائی دور میں ہندو مہاسبھا کے ساتھ تعلق رہا لیکن بعد ازاں کانگرس میں شمولیت اختیار کر لی۔ تصنیف و تالیف اور ڈرامہ نویسی سے بھی لگاؤ رہا۔

سکندر مرزا (1899-1969)

میر جعفر کا پڑپوتا۔ مرشد آباد، مغربی بنگال میں پیدا ہوا۔ رائل ملٹری کالج، سینڈ ہرسٹ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف مقامات پر فوجی خدمات سرانجام دیں، 1926 میں انڈین پولیٹیکل سروس میں شامل ہوا۔ قیامِ پاکستان کے بعد نئی حکومت کا پہلا سیکرٹری دفاع۔ مئی 1954 میں بحیثیت گورنر مشرقی پاکستان تعیناتی۔ 6 اگست 1955 گورنر جنرل غلام محمد کی خرابیٔ صحت کے سبب سکندر مرزا کو قائم مقام گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ 5 مارچ 1956 اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پہلے صدر کی حیثیت سے حلف اٹھایا (ناول نگار نے اسے ''وزیرِ اعظم'' لکھا ہے جو درست نہیں)۔ 27 اکتوبر 1958 کو مارشل لاء حکومت نے صدر کو برطرف کر دیا۔ لندن روانگی اور وہیں پر انتقال۔ وصیت کے مطابق ایران میں تدفین ہوئی۔

سلیم اللہ خاں، نواب آف ڈھاکہ (1871-1915)

1893 میں سرکاری ملازمت شروع کی لیکن دو سال بعد ہی 1895 میں مستعفی ہو کر خاندانی کاروبار سنبھالا۔ بنگال سیاست میں متحرک۔ تقسیمِ بنگال کے لیے فعال کردار ادا کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام ان کی صدارت میں ہونے والی میٹنگ کا نتیجہ تھا۔ تاحیات مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور سیاسی و معاشی ترقی کے لیے سرگرم رہے۔

سوبیر سین (1934-2015)

بنگالی اور ہندی زبانوں کا مشہور پلے بیک سنگر جو نئے انداز یعنی شوخ اور چلبلے گیت گانے میں منفرد تھا۔ فروری 1954 میں

اس کا پہلا پلے بیک ریکارڈ مارکیٹ میں آیا۔ بعد میں مشہور فلمساز، اداکار اور ہدایتکار گورودت نے اسے بمبئی بلالیا۔ اس کے سنگیت اور گائیکی کا انداز دیکھ کر مشہور موسیقار شنکر جے کشن کی جوڑی نے اسے باقاعدہ بالی وڈ انڈسٹری میں داخل کیا اور اوم پرکاش کی فلم ''آس کا پنچھی'' میں راجندر کمار پر سوبیر سین کا گایا ہوا گیت فلمایا گیا۔ بعد میں اس نے ''چھوٹی بہن'' اور ''پاسپورٹ'' میں بھی گیت گائے۔ سلیل چوہدری اور دیگر نامور موسیقاروں کے ساتھ بمبئی اور کلکتہ فلموں میں گائیکی کی۔ 1967 میں پہلی بار بنگالی فلم میں موسیقی دی۔ 1972 میں ہندی فلموں میں موسیقی دینے کا سلسلہ شروع کیا اور کئی فلموں میں گلوکاری بھی کی۔

سوراج

گاندھی کی شروع کی ہوئی سودیشی تحریک جس میں سوراج، یعنی خوداختیاری حکومت (self-rule) کو بنیادی اور مرکزی نکتہ بنایا گیا تھا۔ بنگال اس تحریک کا مرکز تھا۔ اسے عام زبان میں بندے ماترم تحریک بھی کہا جاتا تھا۔

سوشلسٹ یونی سنٹر آف انڈیا

1948 میں اس کی تشکیل ہوئی جو اپنے پروگرام کی وجہ سے خود کو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) سے الگ کہتی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ کارل مارکس، لینن، سٹالن اور ماؤزے تنگ کے فلسفے پر عملی اور حقیقی معنوں میں عمل پیرا واحد جماعت ہے۔ اس کا فلسفہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ)، یا نکسالیوں کی طرح عوامی جمہوری انقلاب نہیں بلکہ سوشلسٹ انقلاب کی راہ ہموار کرنا ہے۔ چند برس بعد جماعت کے نام میں لفظ ''کمیونسٹ'' کا اضافہ کر کے اسے سوشلسٹ یونی سنٹر آف انڈیا (کمیونسٹ) کردیا۔ ہر پارلیمانی چناؤ میں شرکت کر کے یہ ابتدائی دور ہی سے مغربی بنگال کی یونائیٹڈ فرنٹ حکومتوں کا حصہ رہی ہے۔ اس کا اسمبلی میں آخری نمائندہ 2009 میں منتخب ہوا، بعد کے دونوں انتخابات میں کوئی امیدوار کامیاب نہیں ہوسکا۔

شانتی نکیتن

مغربی بنگال میں کلکتہ سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر بولپور شہر کے نواح میں واقع شانتی نکیتن دراصل ایک آشرم تھا جسے مہارشی دویندر ناتھ ٹیگور نے تعمیر کیا تھا۔ بعدازاں اس کے بیٹے رابندر ناتھ ٹیگور نے 1901 میں اسے ایک مدرسے کی صورت دی جہاں مخلوط تعلیم رائج ہوئی۔ یہ اسکول بعد ازاں کالج اور بالآخر یونیورسٹی بن کر اہم درسگاہ کے طور پر سامنے آیا۔ ابتدا میں رابندر ناتھ نے ایک قدرتی ماحول میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ طلباء کھلے میدان میں گھنے درختوں تلے تعلیم حاصل کرتے تھے۔

عبدالودود، قاضی (1970-1894)

پیدائش فرید پور، بنگالی مضمون نگار، نقاد، مصنف اور ڈرامہ نویس۔ ڈھاکا سے میٹرک کرنے کے بعد باقی ایم اے تک کی تعلیم کلکتہ سے حاصل کی۔ 1920 میں کلکتہ ٹیکسٹ بک بورڈ میں ملازمت کی لیکن بعدازاں ڈھاکہ انٹرمیڈیٹ کالج میں تدریس شروع کردی۔ تقسیم ہند کے وقت ڈھاکا یونیورسٹی نے اپنے ہاں ملازمت کی پیشکش کی لیکن قاضی عبدالودود نے کلکتہ میں تصنیف وتالیف کو ترجیح دی اور باقی ماندہ زندگی وہیں گزاری۔

عزیز الرحمان ملک (1997-1918)

پیدائش ڈھاکا لیکن ساتویں جماعت تک رنگون میں بچپن گزارا۔ واپس آنے پر ڈھاکا میں تعلیم مکمل کی اور 1940 میں ڈھاکا یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد وہیں لیکچررشپ اختیار کی لیکن کچھ عرصہ چٹاگانگ اور راجشاہی میں بھی پڑھاتا رہا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد لندن روانگی جہاں سے 1953 میں ڈاکٹریٹ کرنے کے علاوہ لندن یونیورسٹی کے

اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز میں مزید تعلیم حاصل کی۔ واپس آ کر راجشاہی یونیورسٹی میں سلسلۂ تدریس جاری رکھا۔ ملک نے بنگلہ دیش کی جدوجہدِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور 1971 کے بعد اہم سرکاری تعیناتیوں، یعنی ملک کا پہلا سیکرٹری تعلیم مقرر ہونے کے علاوہ بھارت، نیپال اور بھوٹان میں سفیر بھی رہا۔ 1974 میں وزیر خزانہ مقرر ہوا۔ اس کی اہم تصانیف میں British Policy and the Muslims in Bengal اور ''میرا جیون اور بنگلہ دیش کی تحریکِ آزادی'' (بنگالی زبان میں) شامل ہیں۔

علی وردی خان

1740 تا 1756 بنگال کا نواب تھا۔

فرائضی تحریک

اس کے بانی حاجی شریعت اللہ 1764 میں فرید پور، بنگال، میں پیدا ہوئے۔ تحریک کا مقصد مسلمانوں کو فرائض، یعنی نماز، زکوۃ، روزہ، حج وغیرہ کی ادائیگی اور گناہوں اور فسق و فجور سے توبہ کرنے کی تلقین کرنا تھی۔ وہ حج کی غرض سے حجاز روانہ ہوئے اور تقریباً بیس برس وہاں قیام کرنے کے بعد واپس لوٹے۔ خیال ہے کہ اپنے قیام کے دوران انہوں نے وہابی تعلیمات سے متاثر ہو کر فرائضی تحریک شروع کی تھی۔ ان کی وفات 1840 میں ہوئی۔

کار سیوک

مذہبی خدمات کے لیے بلا معاوضہ کام کرنے والے۔

کارنوالس، لارڈ چارلس

12 ستمبر 1786 سے 28 اکتوبر 1793 تک گورنر جنرل رہا۔

کرشک پرجا پارٹی

اس کی بنیاد 1936 میں بنگالی مزارعین انجمن نے رکھی تھی۔ اے، کے، فضل الحق بھی اس میں شامل تھا لیکن اختلافات کی وجہ سے اپنے ہم خیال مشرقی بنگالی کے سیاستدانوں سے مل کر کرشک پرجا پارٹی قائم کی۔ اس کا منشور اور نعرہ ''دال بھات'' تھا۔ 1937 کے انتخابات میں حریف جماعتوں، کانگرس اور مسلم لیگ کے مقابلہ میں 36 نشستیں جیتیں جن میں 33 مشرقی بنگال سے تھیں۔ انتخابات کے بعد مسلم لیگ اور چند چھوٹی جماعتوں سے مل کر مخلوط حکومت قائم کی۔ جلد ہی کرشک پارٹی کے اندر دھڑے بندی شروع ہوگئی اور فضل الحق الگ ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گیا اور پھر 1940 میں قراردادِ لاہور پیش کر کے تاریخ میں اپنا نام لکھوالیا۔ کرشک پرجا پارٹی کی فعالیت اور مقبولیت میں کمی ہونے لگی یہاں تک کہ 1946 کے انتخابات میں اسے صرف چار نشستیں ملیں جبکہ مسلم لیگ نے 114 پر کامیابی حاصل کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد فضل الحق نے پھر سے کرشک پرجا میں شمولیت اختیار کر کے اسے فعال کیا لیکن 1958 میں مارشل لاء کے ساتھ ہی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگنے سے جماعت ختم ہوگئی۔

کرشن داس کوی راج

سنِ پیدائش 1496 لیکن وفات نامعلوم ہے۔ اپنے زمانے کا مشہور شاعر جس کے حالاتِ زندگی معلوم نہیں۔

کرن شنکر رائے (1891-1949)

ہندو اسکول، کلکتہ، میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ کالج کے زمانے میں انتہا پسند تنظیموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی جس پر 1909 میں اسے بغرضِ تعلیم برطانیہ بھیج دیا گیا۔ 1913 میں آکسفورڈ سے بی اے (آنرز) کرنے کے بعد واپسی ہوئی اور شعبۂ تعلیم سے منسلک ہو گیا۔ ملازمت کے دوران رولٹ ایکٹ کے خلاف ایک احتجاجی جلسہ میں تقریر کرنے پر محکمہ

کی جانب سے جواب طلبی ہونے پر مستعفی ہو کر مزید تعلیم کے لیے لندن روانگی لیکن مکمل کیے بغیر واپس آ گیا۔ کانگرس میں شمولیت اور ساتھ ہی درس و تدریس کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ 1921 میں سبھاش چندر بوس اور دیش بندھو چترنجن داس کے ساتھ مل کر تحریکِ عدمِ تعاون میں بھر پور حصہ لیا۔ کانگرس سے اختلافات کی وجہ سے سوراج پارٹی میں شمولیت کی اور سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں گرفتار ہو گیا۔ 1937 کے انتخابات میں بنگال قانون ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد مشرقی بنگال آمد اور پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی میں حزبِ مخالف، پاکستان نیشنل کانگرس میں کردار ادا کیا لیکن جلد ہی، یعنی مارچ 1948 میں مغربی بنگال چلا گیا جہاں اسے صوبائی حکومت میں وزیرِ داخلہ مقرر کیا گیا چند ماہ بعد فروری 1949 میں دیہانت ہو گیا۔

کلینیت (کُلین، بمعنی شریف، نجیب، معزز خاندان)

Kulinism۔ ایک اصول اور رواج جس کے تحت برہمنوں کی بالادستی مذہبی معاملات کے علاوہ سماجی امور، مثلاً شادی اور جہیز میں بھی قائم ہوئی۔

کندی

مغربی بنگال کے ضلع مرشد آباد کی ایک سب ڈویژن۔

کھدری رام (1889-1908)

پورا نام کھدری رام بوس، مدنا پور (بنگال) میں انقلابی سرگرمیوں اور سودیشی تحریک میں حصہ لیا۔ ایک سرکاری گاڑی پر بم حملے کی منصوبہ بندی کے جرم میں گرفتاری اور پھر سزائے موت۔

گروکل

قدیم اور قبل از عہدِ جدید ہندوستان کے بعض تعلیمی اداروں میں طلباء اپنے اساتذہ ہی گھروں میں قیام کرتے تھے۔ اپنے استاد، یعنی ''گورو'' کے ہاں قیام و طعام کی وجہ سے ان اداروں کو ''گروکل'' کہا جانے لگا۔ اگرچہ آج کل بھی ایسے ادارے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔

گریش چندر بوس (1844-1912)

شاعر، موسیقار، ڈرامہ نگار، ناول نگار، اداکار، اسے بنگالی ڈرامہ انڈسٹری کا باپ بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے تقریباً چالیس ڈرامے لکھے اور اسٹیج پر پیش کیے۔ خاندانی مصائب، بیویوں، بیٹوں اور بالخصوص سب سے چھوٹے اور چہیتے بیٹے کے دیہانت کے بعد دھرم سے برگشتگی نے اسے الحاد، شراب نوشی اور ویشیاؤں کے ساتھ جنسی مراسم میں محو کر دیا لیکن پھر مشہور بنگالی سادھو شری رام کرشنا کا معتقد ہو گیا۔

گنپتی تہوار

اسے شیوا جی تہوار بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے اس مذہبی تہوار کی ابتدا مرہٹہ راجہ شیوا جی (1630-1680) کے عہد میں ہوئی۔ پہلے یہ مہاراشٹر میں منایا جاتا تھا بعد ازاں پورے ہندوستان میں منایا جانے لگا۔

گورکھا نیشنل لبریشن فرنٹ

مغربی بنگال کے ضلع دارجلنگ میں 1980 میں قائم ہونے والی سیاسی جماعت جس کا مطالبہ گورکھا لینڈ کے نام سے بھارت کے اندر ایک الگ ریاست کا قیام تھا۔ بھارت اور نیپال میں رہنے والے گورکھا خود کو ایک نسل اور تہذیب سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ فرنٹ کی کارروائیاں پُرتشدد تھیں جو 86-1985 میں شدت اختیار کر گئیں۔ 1988 میں ایک معاہدے کی رو سے دارجلنگ گورکھا ہل کونسل قائم ہوئی جس کے تحت فرنٹ نے اپنی کارروائیاں ختم کر دیں۔ 1991 میں ہونے

والے ریاستی انتخابات کا فرنٹ نے بائیکاٹ کیا لیکن بعد کے انتخابات میں حصہ لینے لگے۔

لیکھ راج

ایسی زمین جو ریاست یا حکمران کی طرف سے دی گئی ہو اور اس پر کوئی ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔

مالویہ، مدن موہن (1861-1946)

سکالر، مصلح اور سیاستدان۔ جدید تعلیم کے فروغ کے لیے کوشاں رہا۔ 1909 سے 1918 تک کانگرس کا صدر، اور 1912 سے 1926 تک لیجسلیٹو اسمبلی کا رکن۔ 1916 میں بنارس یونیورسٹی قائم کی اور 1919 تا 1939 اس کا وائس چانسلر رہا۔ انگریزی اخبار Leader کا بانی اور 1924 سے 1946 تک ہندوستان ٹائمز کا چیئرمین۔ ہندوستان میں اسکاؤٹنگ کا آغاز کیا۔ تحریکِ عدم تعاون میں سرگرم حصہ لیا۔ کانگرس سے اختلافات کے باعث کانگرس نیشلسٹ پارٹی قائم کی اور 1934 کے انتخابات میں بارہ نشستیں جیتیں۔ اس سے قبل 1909 میں آریا سماج نیتاؤں نے پنجاب ہندو مہاسبھا کی بنیاد رکھی جس کے پہلے اجلاس کی صدارت مدن موہن مالویہ نے کی تھی۔ اس کے علاوہ اکالی بھارتیہ ہندو مہاسبھا اور آل انڈیا برہمن مہاسبھا کی بنیاد رکھی۔

مقصود آباد

موجودہ ضلع مرشد آباد کا پرانا نام۔ کہا جاتا ہے کہ اس شہر (مقصود آباد) کی بنیاد مغل شہنشاہ اکبر کے عہد میں رکھی گئی تھی۔ 1702 میں اورنگ زیب عالمگیر نے صوبائی دارالحکومت ڈھاکا سے یہاں منتقل کیا اور صوبیدار کو مرشد قلی خان کے خطاب سے سرفراز کیا جس نے شہنشاہ کی اجازت سے 1704 میں مقصود آباد کا نام بدل کر مرشد آباد رکھا۔ ملک، اے، آر دیکھیے، عزیز الرحمٰن ملک

مکرجی، شیام پرشاد (1901-1953)

متحدہ بنگال کی سیاست میں فعال کردار ادا کیا۔ 1939 میں ہندو مہاسبھا میں شمولیت۔ جنوری 1941 میں اس نے بانگِ دہل اعلان کیا کہ اگر مسلمان مجوزہ ملک پاکستان میں جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔ تقسیم بنگال کا زبردست حامی۔ آزادی کے بعد نہرو حکومت میں وفاقی وزیر مقرر ہوا لیکن جموں کشمیر تنازعہ پر حکومت کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے الگ ہو گیا اور 1951 میں بھارتیہ جن سنگھ کی بنیاد ڈالی۔ حکومت سے علیحدگی کے بعد جموں کشمیر دورے میں گرفتاری اور دورانِ حراست بظاہر دل کا دورہ پڑنے سے دیہانت ہو گیا۔ برسوں بعد اٹل بہاری واجپائی نے اسے نہرو سازش قرار دیتے ہوئے کہا کہ شیام مکرجی کو قتل کیا گیا تھا۔

منیر الزمان، محمد (1936-2008)

بنگالی شاعر، نغمہ نگار، مصنف، ماہرِ تعلیم اور بنگلہ دیش کی آزادی کا فعال کردار۔ ضلع جیسور کے ایک موضع میں پیدائش۔ 1969 میں ڈھاکا یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد "جدید بنگالی شاعری میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات" پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ڈھاکا یونیورسٹی میں تدریس کا عمل جاری رکھا۔ اسی دوران مزید تحقیق کے لیے لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز میں گیا۔ اپنی ریٹائرمنٹ تک وہ ڈھاکا یونیورسٹی کے بنگلہ ڈیپارٹمنٹ میں معلم رہا۔ اس کی زیرِ نگرانی چالیس امیدواروں نے پی، ایچ، ڈی مکمل کی۔

فلمی گیتوں اور وطن پرستانہ شاعری نے اس کی مقبولیت میں بے انتہا اضافہ کیا، اور عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ ٹیگور اور قاضی نذر الاسلام کی صف میں جگہ پانے کے لائق ہے۔ 1970 میں شروع ہونے والی بنگلہ دیش کی جدوجہد میں گمنام مگر فعال کردار ادا کیا لیکن انکشاف ہونے پر مشرقی پاکستان کی حکومت نے اسے چھ ماہ کے لیے نظر بند کر دیا۔ اس کی علمی

اور ادبی خدمات کے اعتراف میں اسے متعدد اعزازات سے نوازا گیا۔

مہاراجہ آف قاسم بازار

ناول نگار کا اشارہ غالباً مہاراجہ مانندر چندر نندی کی طرف ہے جس کا عرصۂ حیات 1860 سے 1929 تک محیط ہے۔ یہ 1889 میں قاسم بازار کا نواب بنا جسے انگریزوں نے چند سال بعد مہاراجہ کے خطاب سے نوازا اور پھر 1915 میں ''سر'' کا خطاب بھی دیا۔ اس نے اپنے نوابی دور میں متعدد اسکول کالج اور دیگر فلاحی ادارے قائم کیے۔ وہ برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کا صدر اور 1913 سے 1921 تک امپیریل لیجسلیٹو کونسل رکن بھی رہا۔

میر جعفر (1691-1765)

سراج الدولہ کے ساتھ غداری اور جنگ پلاسی میں فتح کے بعد صلہ کے طور پر میر جعفر کو جولائی 1757 کو بنگال کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ انگریزوں کے مطالبات پورا نہ کرنے کی پاداش میں اسے فروری 1760 میں معزول کر کے اس کے داماد میر قاسم علی کو گدی نشین کیا گیا لیکن وہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی توقعات پر پورا نہ اترا کیونکہ وہ ان کا حاشیہ بردار نہ بن سکا تھا، لہٰذا میر جعفر کو دوبارہ جولائی 1763 میں نواب بنایا گیا۔ وہ اپنی وفات پر اس نمائشی عہدے پر تعینات رہا۔ میر جعفر کی وفات کے ساتھ بنگال میں مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو گیا۔

نکسل وادی

یعنی نکسلائٹ (Naxalite) تحریک جس کا آغاز مئی 1967 میں مغربی بنگال کے علاقے نکسل باڑی سے ہوا۔ کسانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف تحریک نے جلد ہی دیگر پسماندہ طبقات کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ 1969 میں مختلف گروپوں نے مل کر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (ماؤ لینن) کی بنیاد رکھی۔ 1980 تک نکسل وادی گروپوں کی تعداد تیس کے لگ بھگ تھی جو بعد ازاں بتدریج کم ہوتی رہی۔ اس وقت ایک اندازے کے مطابق بھارت کے 160 اضلاع میں ان کا اثر و رسوخ ہے۔

نکھل بھارت ساہتیہ سمیلن

1923 میں بنارس میں منعقدہ کُل ہند بنگالی ادبی کانفرنس، جس کی صدارت رابندر ناتھ ٹیگور نے کی۔ بنگالی ادیبوں، شاعروں اور دیگر ادبی لکھاریوں کی حوصلہ افزائی، باہمی بحث و تمحیص، تبادلۂ خیالات اور بنگالی ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے ہر سال ایک اکٹھ کا انتظام کیا جانے لگا۔ اس میں دیگر مخیر حضرات کے علاوہ اتل پرشاد سین جیسی شخصیتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تقسیم ہند کے بعد اس کا دائرہ وسیع کر دیا گیا کہ کُل ہند بنیادوں پر بنگالی ادیبوں کی کانفرنس ہونے لگی جو آزادی سے پہلے صرف بنگال میں مقیم ادیبوں کے لیے مخصوص تھی۔

نوشیر علی، سید (1891-1972)

بنگالی سیاستدان۔ جیسور میں پیدائش، کھلنا کے بعد کلکتہ سے قانون کی ڈگری حاصل کی اور 1921 میں وکالت کا آغاز کیا۔ اسی سال بنگال قانون ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہوا۔ 1936 میں کرشک پرجا پارٹی میں شمولیت۔ 1937 میں فضل الحق کی مخلوط حکومت میں بحیثیت وزیر شامل ہوا۔ اپنی وزارت میں مسلمانوں کو مخصوص کوٹہ سے زیادہ ملازمتیں دینے پر کابینہ میں اس پر شدید نکتہ چینی ہوئی اور دو برس بعد جب وزارتوں میں ردوبدل ہوا تو نوشیر علی کو شامل نہ کیا گیا۔ 1939 میں اس نے کانگرس میں شمولیت اختیار کی اور پھر 46-1943 میں بنگال قانون اسمبلی کا سپیکر منتخب ہوا۔
بنگال کے اتحاد کا زبردست حامی تھا۔ تقسیم ہند کے بعد مغربی بنگال میں مستقل سکونت پسند کی اور تادمِ آخر وہاں کی سیاست میں فعال کردار ادا کرتا رہا۔

نریندر ناتھ چکرورتی (1924-2018)

بنگالی زبان کا مشہور اور ہردلعزیز شاعر۔ 1974 بھارت کا مؤقر ساہتہ اکیڈمی ایوارڈ حاصل کیا۔ کلکتہ یونیورسٹی نے 2007 اسے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔

نوین چندر سین (1847-1909)

بنگالی مصنف اور شاعر۔ رابندر ناتھ ٹیگور سے پہلے اسے بنگال کا عظیم ترین شاعر سمجھا جاتا تھا۔

نیل ودروہ

فرائضی تحریک کے بانی حاجی شریعت اللہ کا بیٹا حاجی محسن، عرف دودھومیاں، باپ کی وفات کے بعد تحریک کا سربراہ بنا۔ اس نے اسلامی مذہبی تعلیمات کے ساتھ ساتھ کسانوں کو زمینداروں اور حاکموں کی چیرہ دستیوں کے خلاف منظم کرنا شروع کیا۔ اسی دوران 1846 میں دودھومیاں کی تحریک پر پنج چور میں واقع نیل کے کارخانے کو نذر آتش کر دیا گیا۔ اس کا مالک ڈنلوپ نامی ایک انگریز تھا۔ دودھومیاں اور اس کے باسٹھ ساتھی گرفتار ہوئے۔ ماتحت عدالت نے انہیں سزائیں بھی دیں لیکن بعد ازاں سب کو رہا کر دیا گیا۔ چونکہ انگریز اور ہندو زمیندار نیل کی کاشت کے ذریعے اچھی خاصی دولت اکٹھی کر رہے تھے جبکہ غریب کاشتکار اور ان کے اہلِ خانہ اور اولاد مقروض ہونے کی وجہ سے تنگ دستی کی زندگی گزارتے تھے، ان حالات میں نیل کے کاشکاروں میں بے چینی پھیلنا ایک قدرتی امر تھا۔ 1859 میں نیل پیدا کرنے والے علاقوں میں ہنگامے اور بغاوت نے سر اٹھایا۔ کچھ مورخین کے مطابق یہ بغاوت متشددانہ نہیں بلکہ پرامن تھی۔ بہر طور، حکومت نے اگلے سال ایک ''نیل کمیشن'' مقرر کیا جس کے بعد نیل کے کاشتکاروں میں بہتر معاوضوں کی وجہ سے حالات قابو میں رہے۔

وارن ہیسٹنگز

1773 سے 1785 تک بنگال کا پہلا گورنر جنرل۔

ودیاساگر ایشور چندر بندھو پادھیائے (1820-1891)

بنگال کے ضلع مدناپور کے ایک گاؤں میں جنم لیا۔ بچپن ہی میں کلکتہ روانگی جہاں تعلیم کا آغاز کیا۔ سنسکرت کالج میں قیام کے دوران سنسکرت گرائمر، ادب، اندازِ گفتگو، ویدانت، اسمرتی اور فلکیات وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ 1839 میں قانون کا امتحان پاس کیا، اور دو برس بعد فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ سنسکرت میں ملازمت کی۔ عورتوں اور بالخصوص ان کی عائلی اور سماجی زندگی میں بہتری لانے کے لیے متعدد اقدامات کیے جن میں بیواؤں کی شادی قابلِ ذکر ہے۔ تعلیمی میدان میں اس نے بنگلہ حروفِ تہجی کو بہتر بنایا۔ بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ وسیع علم کی بنا پر اسے ''ودیا ساگر'' کہا جانے لگا، یعنی علم کا سمندر۔ اگرچہ تعلق ایک برہمن خاندان سے تھا لیکن ظاہری شکل وصورت آزادانہ تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، بالخصوص سنسکرت ادبیات اور لسانیات میں بلند پایہ مقام کا حامل، باایں ہمہ، مشرقی خیالات اور نظریات کی قبولیت میں کوئی تردد نہیں تھا۔

وجے دشمی

اسے دسہرہ بھی کہا جاتا ہے جو اشون، یعنی بکرمی تقویم کی رو سے جیٹھ کے مہینے کی دسویں تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ جو روایات کے مطابق اس دن ایک طرف گنگا کی پیدائش ہوئی اور دوسری طرف درگا دیوی کی راکھشسوں کے خلاف کامیابی اور رام کی راون پر فتح کے بعد واپسی کی یاد میں جشن کا انعقاد ہوتا ہے۔ دیوالی کا مشہور تہوار دسہرہ کے اختتام سے بیس روز بعد شروع ہو جاتا ہے۔

وشوابھارتی یونیورسٹی

ٹیگور نے شانتی نکیتن ہی میں 1921 میں اسکول کو بتدریج ایک یونیورسٹی کے مقام تک پہنچایا جسے آزادی کے بعد 1951

میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت یونیورسٹی تسلیم کیا گیا۔ اس میں متعدد شعبے قائم ہیں اور طلباء کی موجودہ تعداد تقریباً سات ہزار ہے۔

ہمایوں آزاد (1947-2004)

اصل نام ہمایوں کبیر، بنگالی شاعر، ناول نگار، افسانہ نویس، ماہر لسانیات، نقاد اور محقق، ڈھاکا یونیورسٹی کا پروفیسر۔ ستر سے زیادہ کتابوں کا مصنف، کچھ کتابوں پر سخت تنقید ہوئی، مثلاً پہلا ناول ''ناری'' بنگلہ دیش میں فیمینسٹوں کی حمایت میں تھا جس میں ٹیگور اور بنکم چیٹر جی جیسے مشہور مصنفین اور شاعروں پر تنقید کی گئی تھی۔ ایک اور ناول ''پاک سرزمین شاد باغ'' کے نام سے لکھا جس میں بنگلہ دیش میں مسلم انتہاپسندوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ 27 فروری 2004 کو اس پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ شدید زخمی ہونے کے باعث مقامی اسپتالوں میں علاج کے بعد اسے تھائی لینڈ لے جایا گیا جہاں صحت یاب ہونے کے بعد وہ مزید تحقیق کے لیے جرمنی گیا لیکن 12 اگست 2004 کو وہ میونخ میں اپنے فلیٹ میں مردہ حالت میں پایا گیا۔ دو سال بعد دوران تفتیش بنگلہ دیش کی انتہاپسند مذہبی جماعت المجاہدین کے ایک رہنما نے اعتراف کیا کہ ہمایون آزاد پر حملہ جماعت کے کارکنوں نے کیا تھا۔ 1986 میں بنگلہ دیش حکومت نے ہمایوں آزاد کی لسانی تحقیقات اور خدمات کے نتیجہ میں بنگلہ اکیڈمی لٹریری ایوارڈ سے نوازا اور 2012 میں بعد از مرگ ملک کا دوسرا سب سے بڑا سول ایوارڈ Ekushey Padak دیا گیا جو 1952 میں شروع ہونے والی متحدہ پاکستان میں بنگالی زبان کو سرکاری زبان تسلیم کرنے کی تحریک میں جان قربان کرنے والوں کی یاد میں دیا جاتا ہے۔

ہندو مہاسبھا

آریا سماج لیڈروں نے 1909 میں پنجاب ہندو مہاسبھا کی بنیاد رکھی جس کی دیکھا دیکھی متعدد مہاسبھائیں وجود میں آ گئیں لیکن ان کی سرگرمیاں بہت محدود تھیں۔ 1913 میں پنجاب مہاسبھا نے ایک قرارداد کی رو سے آل انڈیا مہاسبھا قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور یوں ہردوار میں 1915 میں منعقدہ کھمب میلے میں کل ہندوستان مہاسبھا کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ایک کٹر ہندو جماعت ہونے کی وجہ سے مہاسبھا کا پروگرام ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کا تھا۔ 1948 میں گاندھی کے قتل میں ملوث نتھو رام گوڈسے اور اس کے تین ساتھیوں کا تعلق مہاسبھا سے تھا۔

ہوا محل

بھارت کی ریاست راجستھان کے مرکزی شہر جے پور میں ایک محل جس کی تعمیر 1799 میں مکمل ہوئی۔ اس کی پانچوں منزلوں میں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں ہیں جنہیں ''جھروکہ'' کہا جاتا ہے۔ ان کھڑکیوں کی خوبی یہ ہے کہ اندر سے باہر تو دیکھا جاسکتا ہے لیکن باہر سے دیکھنا ممکن نہیں۔ یہ ڈیزائن دراصل راجپوت عورتوں کو بے پردگی سے محفوظ رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ پھر ان کھڑکیوں کے ذریعے ہوا کا ایسا گزر تھا کہ محل کے اندر درجہ حرارت شدید گرمیوں میں بھی معتدل رہتا ہے۔ محل کے سامنے نظر آنے والا حصہ درحقیقت عقبی حصہ ہے، آمدورفت کا دروازہ پچھلی طرف ہے۔

ہیم چندر قانون گو (1871-1951)

قوم پرست بنگالی، 1907 میں فرانس جا کر روسی جلاوطن انقلابیوں سے بم سازی کی تربیت حاصل کی۔ واپس آ کر شری آربندو گوش سے مل کر کلکتہ کے نزدیک بم فیکٹری بنائی۔ تقسیم بنگال 1905 کی مخالفت میں سودیشی تحریک کا سرگرم رکن رہا اور پہلی بار کلکتہ بار میں ترنگا لہرایا۔ اشترا کی تعلیمات سے متاثر ہو کر دھرم سے لاتعلق ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ بنگالی قوم پرستوں نے ہندو دھرم پر زور دے کر مسلمانوں کو تحریک آزادی سے دور کر دیا ہے۔

□ □ □
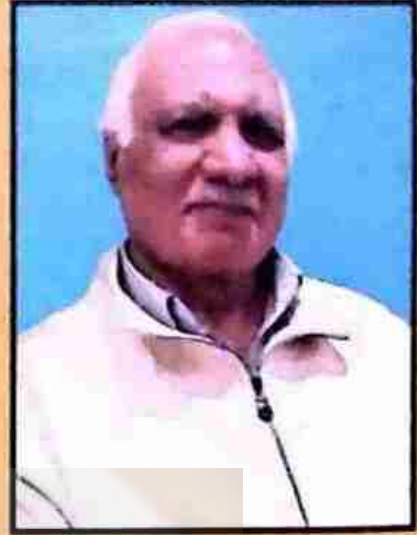
ریاض اختر لاہور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعدسی ایس ایس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور مختلف محکموں، وزارتوں اور صوبوں میں ملازمت کرتے رہے۔ دورانِ ملازمت اٹلی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا اور یوں اس زبان سے بشد بد کے علاوہ وہاں کے رہن سہن، تہذیب اور کلچر کا مشاہدہ خاص دلچسپی کا حامل تھا۔

ریاض اختر مختلف موضوعات پر لکھتے ہیں۔ ان کے مضامین مشہور رسائل وجرائد، مثلاً 'تاریخ'، 'ترجمان القرآن'، اور 'گاش' وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔ ان کی دو تحقیقی کتابیں ''النساء فی القرآن'' اور ''عورت کہانی داستانِ عروج وزوال'' طبع ہو چکی ہیں جنہیں اہلِ علم نے بہت سراہا ہے۔ علاوہ ازیں، دو نیم سوانحی ناولوں کے تراجم اور سماجی موضوع پر ایک تحقیقی کتاب ''اجتماعیت اور انفرادیت'' کے عنوان کے تحت منتظرِ اشاعت ہیں۔

(ادارہ)

لاہور • حیدر آباد • کراچی •

@fictionhousepublishers www.fictionhouse.com.pk

ISBN 978-969-562-767-9